شرح
کشف المحجوب
(اردو)
تصنیف
حضرت سید علی بن عثمان الہجویریؒ
المعروف بہ
داتا گنج بخش
تحقیق، ترجمہ و شرح
مولانا الحاج کپتان واحد بخش سیال
چشتی صابری

شرح
کشف المحجوب (اردو)
تصنیف
حضرت سید علی بن عثمان الہجویریؒ
المعروف بہ داتا گنج بخش لاہوریؒ
تحقیق، ترجمہ و شرح
مولانا الحاج کپتان واحد بخش سیال
چشتی صابری
الفیصل ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

اپریل ۱۹۹۵ء
محمد فیصل نے
تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی
قیمت ۲۵۰ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازو

یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

حمد باری تعالیٰ

سورۂ فاتحہ (منظوم)

مترجم حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

سبھی خوبی سبھی تعریف ہے اللہ کو زیبا ۔۔۔ بزرگی ہے اُسی آقا کے عالی جاہ کو زیبا

وہ ہے سارے جہانوں کا خدائے برتر و بالا ۔۔۔ برابر ساری مخلوقات کا ہے پالنے والا

بہت ہی مہرباں ہے، وہ بڑا ہی مہرباں ہے وہ ۔۔۔ سدا رحمت فشاں رحمت فشاں رحمت فشاں ہے وہ

وہی روزِ قیامت کا اکیلا حکمراں ہوگا ۔۔۔ کسی کا مشورہ ہوگا نہ کوئی درمیاں ہوگا

خداوندا ترے آگے ہم اپنا سر جھکاتے ہیں ۔۔۔ تجھی کو پوجتے ہیں بس تجھی سے لو لگاتے ہیں

خداوندا تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری ۔۔۔ تجھے آتی ہے اپنے آرزومندوں کی دلداری

دکھا دے ہم کو سیدھی راہ سیدھی راہ پر لے چل ۔۔۔ جنہیں تو نے نوازا ہے انہی کی راہ پر لے چل

نہ ان کی راہ پر لے چل خدائی مار ہے جن پر ۔۔۔ تری پھٹکار ہے جن پر تری دھتکار ہے جن پر

نہ ان کی راہ پر لے چل بھٹک کر رہ گئے ہیں جو

ملمع کی طرح چمکے چمک کر رہ گئے ہیں جو
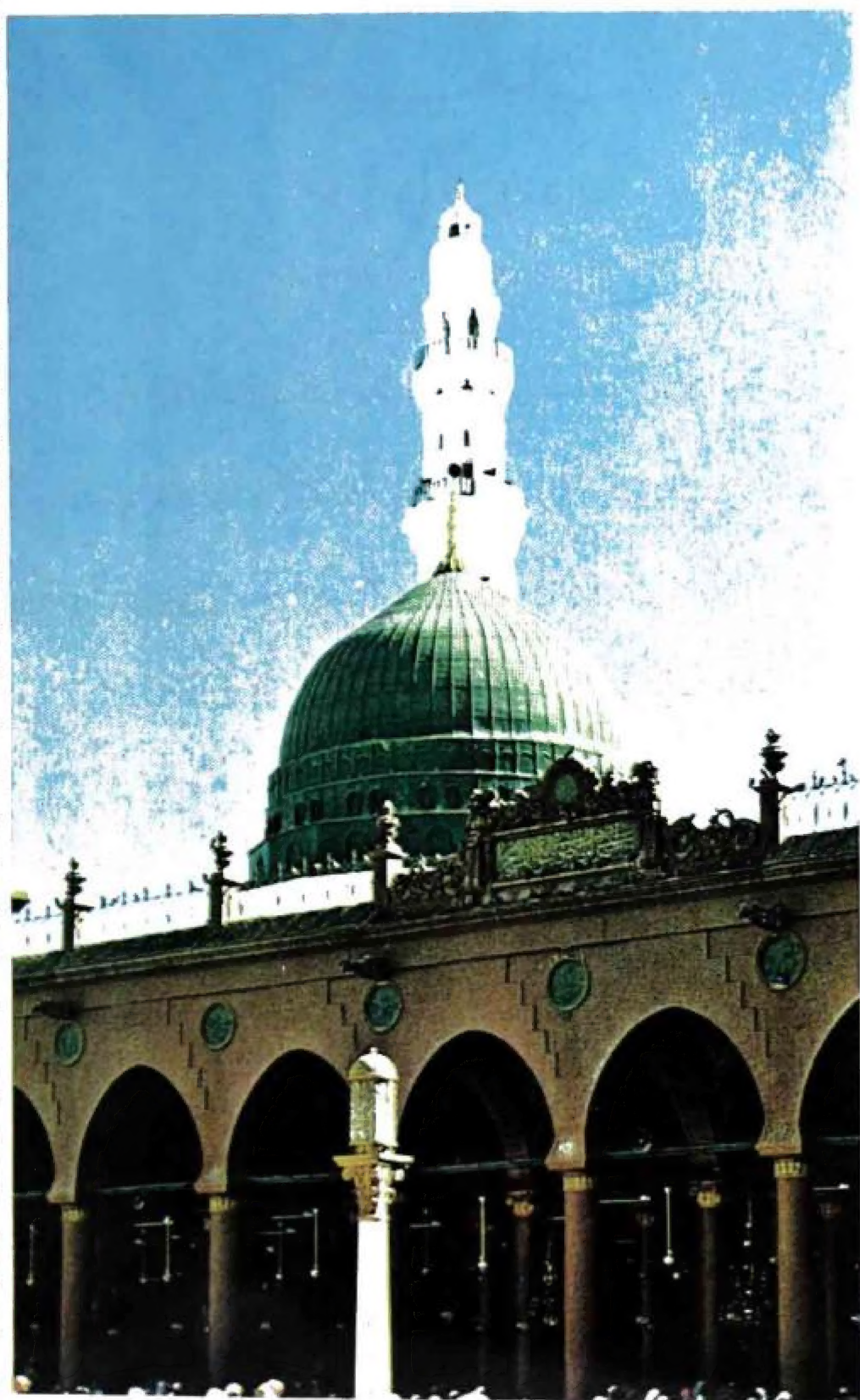
یا رسول اللہ حبیبِ خالقِ یکتا توئی
برگزیدہ ذوالجلالِ پاکِ بے ہمتا توئی
نازنینِ حضرتِ حق صدر و بدرِ کائنات
چشم و چراغِ انبیاء، نورِ چشمِ ما توئی
شمس تبریزی چہ داند نعتِ تو پیغمبرا
مصطفیٰ و مجتبیٰ و سرورِ اعلیٰ توئی
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
از: حضرۃ شمس الدین شمس تبریز
رحمۃ اللہ

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

فہرست مضامین

مقدمہ از شارح

(مصنف علیہ رحمہ کی حیات، تعلیمات، مسلک و عالی مقام)

حضرت مخدوم سید علی ہجویری قدس سرہ کے متعلق کچھ کہنا اور لکھنا آفتاب کو چراغ کی روشنی میں دیکھنے کے مترادف ہے تاہم آفتاب کو دیکھنے اور اس سے متمتع ہونے کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ حضرت اقدسؒ کی نامور کتاب "کشف المحجوب" کے ذریعے آپ کے بلند روحانی مقام کو دیکھنے کی بے شمار اصحاب قلم نے کوشش کی ہے۔ جو کتاب مذکور کے لفظی تراجم سے آگے نہیں بڑھی۔ لیکن تحت اللفظ تراجم سے اس عظیم الشان کتاب کا حق ادا نہیں ہو سکا۔

بقول عارف رومی رحمتہ اللہ علیہ ۔

ہر کسے از ظن خود شد یارِ من
وز درونِ من نجست اسرارِ من

اور سچ پوچھیں تو تراجم سے حق ادا ہو بھی نہیں سکتا۔

ہر چند اس کتاب کی شرح بزبان فارسی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن سوائے ملا عبدالغفور کے حواشی کے باقاعدہ شرح کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ نیز ملا عبدالغفور کے حواشی بھی اب شاید صفحہ ہستی پر موجود نہیں ہیں۔ ڈاکٹر نکلسن کے انگریزی ترجمہ کشف المحجوب کا بھی یہی حال ہے تحت اللفظ ترجمہ سے کتاب کے حقائق و معارف بیان نہیں ہو سکے۔ نیز متعدد مقامات پر فاضل سکالر غلط فہمی کا شکار بھی ہوئے ہیں۔ یہ احقر بھی اس عظیم کتاب کے حقائق و معارف کو کماحقہٗ سمجھنے سے قاصر ہے۔ تاہم پچھلی نصف صدی کے دوران شیخ کامل کے زیر تربیت عملی تصوف کے میدان میں جس قدر تعلیم و تربیت حاصل ہوئی اس کی بدولت جو حقائق کچھ نہ کچھ سمجھ میں آئے ہیں کتاب ہذا کے سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کے علاوہ اور تشریحات کے ذریعے منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

حضرت مصنّف علیہ رحمہ کے حالات زندگی

حضرت مخدوم سید علی ہجویری قدس سرہٗ کی زندگی کے حالات ہمیں زیادہ معلوم نہیں ہو سکے۔ جو کچھ ہمیں آپ کے متعلق معلوم ہوا۔ آپ کی کتاب کشف المحجوب سے معلوم ہوا ہے ۔ کتاب مذکور کے مطابق آپ کا پورا اسم گرامی سید علی بن عثمان الہجویری' الجلابی' الغزنوی رحمتہ اللہ علیہ ہے اور آپ کا لقب داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ ہے جس کا مطلب ہے روحانیت کے خزانے عطا کرنے والا۔ اور یہ لقب بالکل صحیح ثابت ہوا ہے کیونکہ گذشتہ ایک ہزار برس سے آپ کے مزار مقدس پر روحانیت کے پیاسوں کا ہر وقت میلہ لگا رہتا ہے اور ہر جمعرات' جمعہ اور عرس کے ایام میں تو خانقاہ معلٰی میں تل دھرنے کی جگہ نہیں

ہوتی۔ دور دور سے علماء' مشائخ' ادیب' دانشور اور عوام و خواص کھچے چلے آتے ہیں اور والہانہ طور پر مزار مقدس کی زیارت اور روحانی فیوض و برکات سے مستفیض ہوتے ہیں۔ آپؒ ہجویری' جلابی اور غزنوی اس لئے کہلاتے ہیں کہ آپ کا وطن غزنی اور جائے رہائش قصبہ ہجویر اور محلّہ کا نام جلاب تھا۔

انگلستان کے نومسلم نوجوان جناب شہید اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے بھائی جناب فاروق احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ جو وہاں کے ایک امیر خاندان لینارڈ سے تعلق رکھتے تھے اپنے متعدد دوستوں سمیت کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر ۱۹۴۶ء میں مسلمان ہوئے۔ یہ دو بھائی اپنا وطن عزیز چھوڑ کر تلاش شیخ میں ہندوستان آئے اور ملک کا چپہ چپہ چھاننے کے بعد بالآخر حیدرآباد دکن میں حضرت مولانا سید محمد ذوقی شاہ علیہ رحمہ کے مرید ہوئے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے شیخ علیہ رحمہ کے زیر تربیت سلوک الی اللہ طے کیا۔ فاروق احمد صاحبؒ نے ہمارے ملک کی گرمی کی تاب نہ لا کر اسلامی زندگی کے آٹھویں برس جام شہادت نوش کیا اور حضرت داتا گنج بخش قدس سرہٗ کے آستانہ مبارک میں دفن ہوئے۔

اور چھوٹے بھائی حضرت شہید اللہ فریدی رحمتہ اللہ علیہ نے اٹھارہ برس کی ریاضات و عبادات کے بعد سلوک الی اللہ میں تکمیل حاصل کی اور خلافت سے نوازے گئے۔ آپ عرصہ تیس برس تک مریدین کی تربیت میں مشغول رہے لیکن اس ملک کی گرم آب و ہوا اور روحانی مصروفیات کے بوجھ کی وجہ سے دل کے مریض ہو گئے اور ۱۹۷۸ء میں واصل باللہ ہوئے۔ آپ کا مزار کراچی کے قبرستان سخی حسن میں مرجع خلائق ہے۔

حضرت شہید اللہ صاحبؒ نے کشف المحجوب مطبوعہ مکتبہ المعارف لاہور کے دیباچہ میں حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

"حضرت مخدوم سید علی ہجویری علیہ رحمہ کی شہرت کا دارومدار کشف المحجوب ہی نہیں ۔ ہے بلکہ آپ کا لاہور میں وہ مزار مبارک ہے جہاں پر ملک ہندوستان اور دیگر ہمسایہ ملکوں کے زائرین کا ہجوم رہتا ہے اور روحانیت کے پیاسے اپنی روحانی پیاس بجھاتے ہیں۔ کشف المحجوب کو تو چند لوگوں نے پڑھا ہو گا لیکن آپ کی روحانیت سے لاکھوں سیراب ہو رہے ہیں لہذا آپ کی شہرت اور عظمت کا دارومدار صرف کتابیں اور تذکرے نہیں بلکہ آپ کی وہ بے پناہ روحانی قوت اور کشش ہے جس سے ہر کس و ناکس آپ کی طرف کھچا چلا آرہا ہے"

آپ کی تاریخ ولادت اور وصال کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا۔ قرائن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں پیدا ہوئے اور اواخر میں اس دارفانی سے رحلت فرمائی۔ آپ حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن **الختلی** قدس سرہٗ کے مرید و خلیفہ تھے جو حضرت شیخ حصری رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے اور آپ حضرت شیخ نصر آبادی رحمتہ اللہ علیہ کے پیر بھائی اور حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ اور آپ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔ آپ حضرت ابوالقاسم قشیریؒ حضرت ابوالقاسم گرگانیؒ حضرت شیخ عبداللہ انصاری ہرویؒ اور حضرت شیخ ابوعلی فارمدیؒ کے ہمعصر تھے۔ حضرت ابوعلی فارمدیؒ حضرت ابوالقاسم گرگانیؒ کے مرید اور حضرت امام غزالیؒ کے پیرو مرشد تھے۔ کشف المحجوب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم سید علی ہجویری قدس سرہٗ عہد شباب میں داخل سلسلہ ہوئے۔ اس کتاب کے

مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ظاہری علوم اسلامیہ سے مکمل طور پر آراستہ تھے اور اپنے زمانے کے نامور مشائخ کے فیض صحبت سے روحانیت کے بلند ترین مقامات پر پہنچ کر نہ صرف حقائق و معارف سے آگاہ ہوئے بلکہ بڑے بڑے مشائخ کے معارف و نظریات کو زیر بحث لا کر حقیقی اسلامی نظریات پیش کئے۔ یہ آپ کی عظمت اور معرفت کی دلیل ہے کہ اگرچہ آپ نے روحانیت کے ہر مسئلہ پر مختلف مشائخ کا موقف بیان فرمایا ہے تاہم نہ کسی کی ہجو سے کام لیا ہے نہ مذمت کی ہے بلکہ ہر شیخ کے مسلک کے متعلق قرآن و حدیث سے حوالہ جات دے کر ان کے نقطۂ نظر کو بھی صحیح قرار دیا ہے اور پھر اپنے نقطۂ نگاہ کو قرآن و سنت سے ثابت کر کے یہ بتایا ہے کہ جو کچھ ان بزرگوں نے فرمایا ہے اپنے نقطۂ نظر سے صحیح فرمایا ہے لیکن ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے۔ اختلافی مسائل کے متعلق مختلف الخیال ارباب تصوف کے ساتھ اس قسم کی رواداری اور اختلاف میں اخلاص کا یہ اظہار یقیناً حضرت مخدوم کے بلند کردار اور بلند روحانی مقام کی دلالت کرتا ہے۔

حضرت مصنف علیہ رحمہ کے مسائل تصوف پر عبور اور معرفت کا کمال یہ ہے کہ اگرچہ آپ کی تمام کتب غزنی میں رہ گئی تھیں تاہم آپ مشائخ اسلام کے مختلف عقائد' نظریات' نقطہائے نظر اور دقائق اس آسانی اور روانی سے بیان کرتے جاتے ہیں اور ان پر رائے زنی کر رہے ہیں جیسے ایک حافظ قرآن قرأت کر رہا ہے۔ کتاب کے آخری سے پہلے باب میں جہاں آپ نے اصطلاحات تصوف پر روشنی ڈالی ہے وہاں تو یہ کمال کیا ہے کہ بادی النظر میں جو اصطلاحات ہم معنی نظر آتی ہیں آپ نے ان کے درمیان بھی نہایت باریک اور لطیف فرق نکالا ہے۔ مثلاً وقت اور حال تصوف کی دو عام اصطلاحات ہیں اور اکثر صوفیاء کرام ان کو ہم معنی خیال کرتے ہیں لیکن آپ نے ان دونوں کے درمیان نہایت ہی لطیف فرق

بیان فرمایا ہے یہ آپ کی معرفت کا کمال ہے اسی طرح آپ نے محبت اور انس کے درمیان جو لطیف فرق بیان فرمایا ہے یہ بھی اکثر مشائخ کے نزدیک نئی بات ہے۔

سب سے بڑی بات جو حضرت مصنف کے کمالِ معرفت پر دلالت کرتی ہے یہ ہے کہ آپ نے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ جیسے بلند پایہ مشائخ کے بظاہر اختلافی نظریات اور مسالک پر بحث کر کے ان کے درمیان یگانگت اور ہم آہنگی ثابت کی ہے اور اختلاف کو اتفاق ثابت کیا ہے۔ مثلاً حضرت بایزید بسطامی علیہ رحمہ کا مسلک سکر ہے اور ان کے نزدیک آخری مقام فنا فی اللہ ہے اور حضرت جنید علیہ رحمہ کا مسلک صحو (ہوشیاری) ہے اور ان کے نزدیک بقا باللہ آخری مقام ہے لیکن حضرت مخدوم علی ہجویریؒ اگرچہ ان دونوں مشائخ سے کئی پشت بعد میں ہیں لیکن آپ نے ان دونوں مسالک کے متعلق اس خوبیٔ استدلال سے کام لیا ہے کہ ان میں تطبیق ثابت کر کے دونوں کو برحق قرار دیا ہے حالانکہ ان حضرات کے درمیان یہ اختلاف آخر تک قائم رہ چکا تھا۔ آپ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو بزرگ فانی فی اللہ ہوتا ہے وہ باقی باللہ بھی ہوتا ہے اس مقام کو جامعیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض ہمیشہ کے لئے مقام فنا میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور بعض مقام بقا کو زیادہ پسند فرماتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے دیگر مشائخ کے باہمی اختلافات کو اتفاق کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے جو آپ کے بلند روحانی مقام اور کمال معرفت کی دلیل ہے۔

کتاب کشف المحجوب کے متعلق

یہ کتاب حضرت شیخؒ کے ایک ہم وطن ابو سعید غزنویؒ کی استدعا پر لکھی

گئی جنہوں نے آپ کی خدمت میں تصوف اور مشائخ عظام کی تعلیمات پر ایک مکمل اور مفصل کتاب لکھنے کی درخواست کی تھی۔ اگرچہ آپ کا ذخیرہ کتب غزنی میں رہ گیا تھا آپ نے اپنی بے پناہ قوت حافظہ اور مسائل تصوف پر عبور کی بدولت ایسی مکمل اور جامع کتاب لکھی ہے کہ جس کی برابری فن ثقافت کے ایک ہزار سالہ دور ارتقاء کے بعد بھی کوئی کتاب نہیں کر سکی۔ حالانکہ فارسی زبان میں تصوف پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے اور ماہرین فن کا قول ہے کہ پہلی کوشش کرنے والا ہمیشہ پرخار راستے سے گزر کر آنے والی نسلوں کے لئے راہ ہموار کرتا ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ حضرت مصنف کی یہ پہلی کتاب ایک ہزار سال کے فنی ارتقاء کے باوجود بھی اب تک آخری کتاب یا حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔

کتاب کی زبان

اس کتاب میں حضرت شیخ علیہ رحمہ نے جو زبان استعمال فرمائی ہے' سعدیؒ اور حافظؒ کی قدیم فارسی زبان سے ہٹ کر ملک خراسان کی زبان ہے جس کا محاورہ سمجھنے میں کافی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس زمانے کے فن تحریر کے مطابق حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے کافیہ سنجی سے بھی کام لیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کی عبارات بڑی حد تک منظوم نثر کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ اگرچہ فارسی دان طبقہ کیلئے یہ کتاب فصاحت و بلاغت کا بیش بہا مرقعہ ہے' آج کل کی کور ذوقی کے دور میں اس کا سمجھنا کچھ مشکل ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس احقر نے ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کتاب کے غوامض اور دقائق کو عام سمجھ بنانے کے لئے ایک تو عام مترجمین کی طرح تحت اللفظ ترجمہ کی بجائے سلیس اور بامحاورہ زبان اختیار کی ہے۔ دوسرے مشکل مقامات کی حتی الوسعت تشریح بھی کر دی ہے لیکن اس بات کا اعتراف ہے کہ پھر بھی بعض نہایت ہی ادق عبارات کے مطالب سمجھ میں نہیں آسکے۔ بمصداق ۔

آفتاب کجا و ذرہ ناچیز کجا

کتاب ہذا کی اہم ترین خصوصیت

کتاب ہذا کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ حضرت شیخ علیہ رحمہ نے تصوف کے ہر مضمون کو یہاں تک کہ وحدت الوجود اور قضا و قدر جیسے مشکل مضامین کو بھی قرآن و سنت سے ثابت کیا ہے اور شریعت کے خلاف جتنے مکاتیب فکر اور نظریات اس زمانے میں مروج تھے سب کی تردید کر کے حقیقی اسلامی تصوف کو پیش کیا ہے اس میں شک نہیں کہ اسلامی دنیا میں بعض باطل فرقے مثل معتزلہ و قرامطہ وجود میں آچکے تھے جن کی وجہ سے چند نام نہاد صوفیوں نے غیر شرع عقائد اختیار کر رکھے تھے لیکن حضرت مخدوم علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ ایسا کلہاڑہ لے کر آئے کہ تمام باطل فرقوں کا قلع قمع کر کے تصوف کو حقیقی اسلامی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے دوسری بات یہ ہے کہ حضرت شیخ نے اسلام کی ہر بات اور ہر رکن کے حقیقی باطنی معانی و مطالب بیان فرمائے ہیں جیساکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

"قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن' اس باطن کا اور باطن ہے سات بواطن تک۔"

چنانچہ حضرت سید علی ہجویریؒ نے اپنے کمال معرفت کی بناء پر نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ تمام ارکان اسلام کے باطنی مطالب بھی بیان فرما کر قرآن کی جامعیت اور حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔

لیکن حضرت شیخ کی اس حقیقت بیانی کو نہ سمجھتے ہوئے ڈاکٹر نکلسن نے اپنے ترجمہ میں بعض مقامات پر ٹھوکر کھائی ہے۔ ڈاکٹر نکلسن کی غلط فہمی یا الزام تراشی کو ان کے ہم وطن حضرت شہید اللہ فریدیؒ نے خوب پکڑا ہے۔ کیونکہ آپ

شیخ کامل کے زیر تربیت رہ کر تمام روحانی مقامات و منازل سے گزر چکے تھے۔ آپ لکھتے ہیں :

"نکلسن نے یہ الزام تراشی کی ہے کہ مصنف نے حج کے باب میں بڑی جرأت سے لکھا ہے کہ اسلام کے ظاہری ارکان کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ لیکن ادنیٰ درجے کا عقل رکھنے والا بھی نکلسن کے اس بیان کی تردید کر سکتا ہے۔ کیونکہ کتاب کے شروع سے آخر تک مصنف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ تصوف کی کوئی بات شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ نکلسن نے حضرت مصنف کی یہ بات سمجھنے میں غلطی کھائی ہے کہ اسلام کے ہر رکن کے حقیقی معانی سمجھ کر ظاہری عبادت کرنا افضل ہے اس سے نکلسن نے یہ مطلب نکالا ہے کہ ظاہری عبادت بے کار ہے حالانکہ ظاہری عبادت ہر حال میں فرض ہے۔ حضرت مصنف کا مطلب یہ ہے کہ ہر عبادت کے لئے باطنی معانی سمجھنے اور حضور قلب کی ضرورت ہے طوطے کی طرح رٹنا کافی نہیں ہے ۔"

حضرت شہید اللہ فریدیؒ نے نکلسن کی ایک اور غلطی بھی پکڑی ہے اور یہ غلطی صرف عارف باللہ ہی پکڑ سکتا ہے عام علماء اور ادیب اور تصوف کو باہر سے دیکھنے والے دعویدار نقاد یہ قابلیت نہیں رکھتے۔ حضرت شہید اللہ فریدی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ :

"حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ علم الکلام کے بہت بڑے ماہر تھے اگرچہ آپ نے اپنی کتاب میں جا بجا علم الکلام اور منطقی استدلال سے کام لیا ہے تاہم آپ کے

تمام فیصلے آپ کی باطنی قوت اور خداداد بصیرت کا نتیجہ ہیں۔ آپ بہت بڑے مؤحد ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں ذات حق کا مشاہدہ آپ پر غالب تھا۔ اس مقام کو تصوف کی اصطلاح میں فنا فی اللہ کہا جاتا ہے اور یہ مقام اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک انسان اپنی صفات کو صفاتِ حق میں فنا نہ کر دے۔ اس کے بعد مقامِ بقاباللہ ہے جس کا مطلب ہے فنا کے استغراق سے نکل کر اپنی خودی میں واپس آنا اور حق عبودیت ادا کرنا۔ نکلسن کا خیال خام یہ ہے کہ یہ بات اسلامی عقائد کے خلاف ہے لیکن یہ اس کی غلط فہمی ہے کیونکہ جیسا کہ اس نے خود کہا ہے اور حضرت مصنف نے بھی فرمایا ہے کہ فنا فی اللہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خدا بن جاتا ہے بلکہ فنا کی حالت میں وہ صفات الٰہی سے متصف ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقتِ انسانی بدستور قائم رہتی ہے اس سلسلے میں حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ آگ اور لوہے کی مثال دے کر سمجھاتے ہیں کہ جس طرح لوہا جب تک آگ کے اندر رہے وہ آگ کی صفت اختیار کر لیتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ **"انا النار"** (میں آگ ہوں) لیکن جب آگ سے باہر آتا ہے تو وہی سرد اور سیاہ لوہا ہے چنانچہ حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ "مقام فنا میں سالک کی صفات تو صفات باری تعالیٰ میں گم ہوجاتی ہیں لیکن اس کی ذات بدستور قائم رہتی ہے"۔ اگرچہ مقامِ فنا فی اللہ کی یہ توضیح کافی نہیں ہے کیونکہ یہ حقائق

انسانی زبان میں بیان نہیں ہو سکتے تاہم اس سے کافی شکوک دور ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے صوفیاء تک اس سے راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں"......... (ختم ہوا حضرت شہید اللہ فریدیؒ کا بیان)

اس لئے حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ پر یہ شعر صادق آتا ہے ۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

یعنی پیران کامل کے بھی آپ راہنما ہیں۔

حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک

آپ فرماتے ہیں کہ "تصوف کا انکار ساری شریعت کا انکار ہے"

اب ہم حضرت مصنف علیہ رحمہ کے مسلک تصوف پر روشنی ڈالتے ہیں کیونکہ آج کل کے زمانے میں یورپ کے متعصب مصنفین نے جن کو عرف عام میں "مستشرقین" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے عیسائی مذہب کو اسلام سے افضل ثابت کرنے اور عیسائی اقوام کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا جواز پیدا کرنے اور ان کو حکومت کا مستحق ثابت کرنے کے لئے اسلام کی ہر چیز کی مذمت کی ہے اور چونکہ اسلام دنیا بھر میں صوفیائے کرام کی بدولت پھیلا ہے۔ نام نہاد مستشرقین نے صوفیائے کرام اور ان کے مسلک تصوف کو خاص طور پر مذمت کا نشانہ بنایا ہے تاکہ ایک تو اسلامی ممالک پر اقوام مغرب کی حکومت برقرار رہے۔ نیز عیسائی لوگ آئندہ مسلمان ہونے سے رک جائیں کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ اب بھی یورپ اور امریکہ میں خشک مادیت اور لادینیت کی وجہ سے لوگ سکون قلب کھو بیٹھے ہیں اور اولیائے اسلام مثل امام غزالیؒ، ابن عربیؒ، رومیؒ اور جنیدؒ کی

کتابوں کے مطالعہ سے سکون قلب حاصل کر کے اسلام قبول کر رہے ہیں۔

تصوف کے خلاف عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ لفظ تصوف رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں مروج نہیں تھا۔ اگر تصوف اس وجہ سے غیر اسلامی ہے کہ یہ لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ مبارک میں مروج نہیں تھا تو تمام اسلامی علوم مثل تفسیر' حدیث' فقہ' معانی' بیان اور صرف و نحو بھی غیر اسلامی ہوئے کیونکہ یہ الفاظ بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں مروج نہیں تھے۔ کیونکہ صحابہ کرام ہر وقت جہاد میں مصروف تھے اور ان علوم کو باقاعدہ علم کی صورت میں مرتب کرنے کی ان کو فرصت نہیں تھی۔ لیکن جب جہاد کا زمانہ ختم ہوا تو صحابہ کرام' تابعین اور تبع تابعین ان علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ جن حضرات نے قرآن کے معانی و مطالب پر کام کیا وہ مفسرین کے نام سے موسوم ہوئے اور ان کے علم کا نام علم تفسیر ہوا۔ جنہوں نے حدیث پر کام کیا وہ محدثین کہلائے اور ان کا علم' علم حدیث کے نام سے موسوم ہوا جن حضرات نے اسلام کے قانون پر کام کیا وہ فقہا کہلائے اور ان کے مرتب کردہ علم کا نام فقہ ہوا۔ جن حضرات نے اصحابِ صفہ کی دیکھا دیکھی میں تزکیۂ نفس اور روحانیت میں کمال حاصل کیا وہ صوفی کہلائے اور ان کا علم تصوف کے نام سے موسوم ہوا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ صحابہ کرام علم تفسیر' حدیث' فقہ اور تصوف سے بے بہرہ تھے بلکہ وہ سب سے بڑے مفسر' محدث' فقیہ اور صوفی تھے لیکن ان ناموں سے موسوم نہیں تھے بالفاظ دیگر ان کے ہاں حقیقت تھی نام نہیں تھا اور آج کل نام ہے حقیقت بہت کم پائی جاتی ہے۔

تصوف کی دوسری وجہ تسمیہ یہ ہے کہ متقی لوگ نفس کشی کی خاطر اکثر اون کا لباس پہنتے تھے جسے عربی زبان میں صوف کہا جاتا ہے اس لئے وہ لوگ

صوفی کے نام سے موسوم ہونے لگے۔

لیکن تصوف کی حقیقت دراصل مرتبہ احسان ہے جس کی تشریح رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے حدیث جبریل میں یوں فرمائی ہے کہ :

"اس طرح عبادت کرو کہ تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اگر دیکھ نہیں سکتے تو پھر یہ خیال کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

چنانچہ یہی مشاہدۂ حق صوفیائے کرام کا منتہائے نظر رہا ہے جس کے حصول کے لئے انہوں نے غلبۂ نفس کو کم کرنے کے لئے مجاہدات اور ریاضات سے کام لیا۔ لیکن بعض علمائے ظواہر جو "مولانا" کے القاب سے آراستہ پیراستہ ہیں کے ان کلمات کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے کہ اسلامی عبادات کا پروگرام تو بہت مختصر تھا صوفیوں نے خواہ مخواہ مجاہدات و ریاضات کر کے اپنے آپ کو سزا دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان مولانا صاحبان نے قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیت کو نہیں پڑھا جس میں حق تعالیٰ نے اپنے ان مخلص بندوں کی تعریف فرمائی ہے جن کے بدن رات کو بستروں سے علیحدہ رہتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں :

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ

معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے قرآن کی یہ آیت بھی نہیں پڑھی :۔

يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا (اللہ کے مخلص بندگان رات بھر اپنے رب کے حضور میں سجود و قیام میں بسر کرتے ہیں)

اور نہ ہی شاید کبھی اس آیت پر عمل فرمایا ہے :

"رات کو اٹھو لیکن کم، نصف رات ہو یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور تلاوت قرآن کرو اچھی طرح کیونکہ رات کا جاگنا نفس کشی کے لئے بہت سخت ہے اور بات کو مضبوط کرتا ہے یعنی آدمی مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے۔"

تصوف کسی نئے مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ قربِ حق کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل حدیث قدسی (بخاری) کے مطابق فرائض اور واجبات کے علاوہ زائد عبادت کا اصطلاحی نام تصوف پڑ گیا ہے۔ جس طرح قرآن کے مطالب پر غور کرنے کا نام علم تفسیر ہو گیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم الٰہی ہوا کہ میرے بندوں کو بتا دیں کہ :

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا جو بندہ نوافل (زائد عبادت) کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں (یعنی وہ میرا محبوب بن جاتا ہے) اور اس سے اس قدر قریب ہو جاتا ہے کہ اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے دیکھتا ہے (بی یبصر)۔ میں اس کے کان بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے سنتا ہے (بی یسمع) اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں اور میری طاقت سے کام کرتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں اور مجھ سے چلتا ہے اور مجھ سے جو کچھ طلب کرتا ہے اس کو دیتا ہوں اور جب میری پناہ طلب کرتا ہے تو پناہ دیتا ہوں ۔ "

علم روحانیت کی اصطلاح میں اس قسم کے قرب کو فنا فی صفاتِ اللہ کہا جاتا ہے۔ اس سے اوپر کا درجہ فنا فی ذاتِ اللہ ہے اس کے بعد فناء الفناء ہے جہاں پر یہ شعور بھی مٹ جاتا ہے کہ وہ فانی فی اللہ ہے۔ اس کے بعد مقامِ بقاباللہ ہے کہ جب سالک نزول کر کے اپنی خودی میں واپس آجاتا ہے اور فرائض زندگی انجام دیتا ہے۔ یاد رہے کہ جہاں مقامِ فنا میں استغراق اور محویت ہے' مقامِ بقا میں ہوشیاری ہے۔ اس لئے مقامِ فنا کے سالک کو ابن الوقت اور مقامِ بقا کے سالک کو ابوالوقت کہا جاتا ہے۔ مقامِ فنا پر سالک مغلوب الحال ہوتا ہے۔ مقامِ بقا پر غالب الحال ہوتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ فنا فی اللہ کا سالک ہمیشہ فنا میں اور بقاباللہ کا سالک ہمیشہ بقا میں رہتا ہے بلکہ جب چاہتا ہے فنا میں چلا جاتا ہے اور

جب چاہتا ہے بقا میں واپس آجاتا ہے۔ مقامِ فنا کو عروج اور مقامِ بقا کو نزول اور عبدیت کے ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اور مقام عبدیت یا عبودیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا خاصہ ہے۔ جہاں پہلی امتوں میں فنا فی اللہ آخری مقام تھا۔ اسلام میں بقا باللہ آخری مقام ہے کیونکہ اس مقام پر سالک بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ وہ بیک وقت ذاتِ حق کے ساتھ وصال کے مزے بھی لیتا ہے اور درد و فراق کی لذت سے بھی محظوظ ہوتا ہے اس لئے اس مقام کو جامعیت کہا جاتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ۔

من لذتِ دردِ تو بہ درماں نفروشم
کفرِ سرِ زلفِ تو بہ ایماں نفروشم

عارف شیرازی رحمتہ اللہ علیہ نے مقام جامعیت کو یوں بیان فرمایا ہے ۔

عجب ایں نیست کہ سرگشتہ بود طالب دوست
عجب این است کہ من واصل و مہجورم

عارف رومی رحمتہ اللہ علیہ نے اس مقامِ جامعیت کو یوں بیان فرمایا ہے ۔

دل آرام دربر دل آرام جوئے
ہمچو مستسقی تشنہ برآب جوئے

نیز عارف شیرازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

جب حضرت صدر الدین قونوی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے مندرجہ ذیل رباعی کا مطلب دریافت کیا۔

صوفی چہ فغان است من این الیٰ این
کیں نکتہ عیان است من العلم الیٰ العین

ما الحاصل فی بحر چہ پرسی سفرے کن
چوں خضر بجوئے گوہر از مجمع بحرین

تو آپ نے مندرجہ ذیل جواب دیا :

تجد د نسبتہ جامعتہ بین الطرفین ظاہرۃ بالحکمین

اس سے مراد وہی مقامِ جامعیت ہے کہ جس وقت سالک بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔

حضرت خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ نے اس مقامِ جامعیت کو یوں بیان فرمایا ہے۔ ؎ شدہ عکس در عکس ایں بنا کہ فنا بقا ہے بقا فنا

جب حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ اس مقام پر پہنچے تو اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ کو خط لکھا کہ اب میری حالت یہ ہے کہ قرب بھی بُعد بن گیا ہے۔ قرب کا بعد بن جانا اس وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب انسان کی ان مقامات تک رسائی ہوتی ہے۔

خلافتِ الٰہیہ

حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے :

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً

خلیفہ کا مطلب ہے نائب۔ نائب وہ ہوتا ہے جو بادشاہ کی طرف سے اختیارات لے کر حکومت کرتا ہے۔ چنانچہ انسانِ کامل جب مقامِ فنا فی اللہ پر مندرجہ بالا حدیث قدسی کے مطابق صفاتِ اللہ سے متصف ہوتا ہے تو اس کے

سر پر خلافتِ الٰہیہ کا تاج رکھ کر اسے دنیا پر بطور خلیفۃ اللہ حکومت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ آج کل جو لوگ خلافت الٰہیہ کے قیام کے نعرے لگا رہے ہیں جب تک وہ مقامات فنا اور بقا تک رسائی حاصل نہیں کرتے خلافت کے قابل نہیں ہو سکتے۔

مقاماتِ فنا و بقا کس طرح حاصل ہوتے ہیں

اب ہم قارئین کو بتانا چاہتے ہیں کہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ جیسے بلند مقامات قرب و وصال کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔

یاد رہے کہ انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا۔ جسم کا تعلق اس مادی دنیا سے ہے اور **کل شئی یرجع الی اصلہ** کے مطابق جسم یعنی جسمانی خواہشات یا نفسانی خواہشات انسان کو نیچے کی جانب کشش کرتی ہیں اس کے برعکس روح کا تعلق بمصداق آیہ مبارک وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي عالم بالا یعنی حق تعالیٰ سے ہے اس لئے وہ انسان کو اوپر کی جانب کشش کرتی ہے چنانچہ روح اور جسم کے درمیان اس کشمکش اور جنگ کا نام زندگی ہے۔ جب نفسانی خواہشات غالب آجاتی ہیں تو انسان گر کر تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور جب روحانی قوت غالب آجاتی ہے تو انسان واصل باللہ ہو کر زندگی کی جنگ جیت لیتا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے اندر انسانی جسم اور روح دونوں کی ضروریات اور تقاضات کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے۔ برعکس ہندو' بدھ اور عیسائی مذہب کے کہ جن میں گوشہ نشینی کے ذریعے روح کی پرورش کے لئے جسم کو بھوکوں مارا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ جسم کی مثال گھوڑے کی طرح ہے اور روح بمنزلہ سوار ہے۔ گھوڑے کو بھوکا مار کر آدمی کس طرح منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اسلام اس لئے دین فطرت ہے کہ

اس میں روح اور جسم (سوار اور سواری) دونوں کی پرورش کا انتظام موجود ہے اسلام میں نہ گھوڑے کو اتنا موٹا ہونے دیا جاتا ہے کہ سوار کو لے کر بھاگ جائے اور تباہ کر دے' نہ سوار کو اتنا کمزور کیا جاتا ہے کہ گھوڑے کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ سواری اور سوار کے درمیان توازن کا نام اسلام ہے اور یہی صراط مستقیم ہے۔ جس پر گامزن ہو کر انسان منزل مقصود یعنی قرب حق میں پہنچ جاتا ہے۔

انسانی فطرت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح جسم کو خوراک کی ضرورت ہے اور خوراک کے بغیر لاغر ہو کر مر جاتا ہے اسی طرح روح کو بھی خوراک کی ضرورت ہے۔ جسم مادی ہے اس لئے اس کی خوراک بھی مادی ہے اور روح نور ہے اس کی خوراک بھی نورانی یعنی حق تعالٰی کی محبت اور قرب اور معرفت ہے۔ جس طرح جسم غذا نہ ملنے سے بے قرار ہو جاتا ہے اسی طرح روح بھی غذا نہ ملنے پر بے قرار اور بے چین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آج کل دنیا میں خاص طور پر مغربی دنیا میں مال و دولت کے انبار کے باوجود جو بے چینی لاحق ہے اس کی وجہ یہی اور صرف یہی ہے کہ جہاں جسم کو خوراک پہنچانے کی خاطر زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں روح کو غذا بہم پہنچانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا رہا۔

انسانی فطرت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح جسم کے پانچ یا چھ حواس ہیں جن کے ذریعے اس ظاہری دنیا کی اشیاء کا ہمیں شعور حاصل ہوتا ہے اسی طرح انسانی روح کے بھی چھ حواس ہیں جن کو تصوف کی اصطلاح میں لطائف ستہ کہا جاتا ہے اور جن کے ذریعے باطنی دنیا کا ہمیں شعور حاصل ہوتا ہے۔ یہ لطائف جسم کے اندر مندرجہ ذیل مقامات پر ہیں۔

۱۔ لطیفۂ نفس : اس کا مقام زیر ناف ہے اور اس کے نور کا رنگ زرد ہے

۲۔ لطیفۂ قلب : اس کا مقام بائیں چھاتی ہے اور اس کے نور کا رنگ سرخ

ہے۔

۳۔ لطیفۂ روح : اس کا مقام دائیں چھاتی ہے اور اسکے نور کا رنگ سفید ہے

۴۔ لطیفۂ سر : اس کا مقام وسط چھاتی ہے اور اس کے نور کا رنگ سبز ہے

۵۔ لطیفۂ خفی : اس کا مقام وسط پیشانی ہے اور اس کے نور کا رنگ نیلگوں ہے۔

۶۔ لطیفۂ اخفیٰ : اس کا مقام سر کی چوٹی ہے اور اس کے نور کا رنگ سیاہ ہے۔

جب ذکر الہی اور مراقبات کی مختلف مشقوں کے ذریعے ان روحانی حواس کو زندہ کیا جاتا ہے تو جس طرح ہم کو جسمانی حواس کے ذریعے مادی دنیا کا شعور حاصل ہوتا ہے اسی طرح روحانی حواس کے ذریعے ہمیں روحانی یعنی باطنی دنیا کا شعور حاصل ہوتا ہے اور قرب حق کے منازل طے ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ ایمان کے تین مدارج ہیں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ جب ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ حق تعالیٰ موجود ہے تو یہ خبر پا کر ہم کو ذاتِ حق کے متعلق علم الیقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جب عبادات و ریاضات کے ذریعے ہم تزکیۂ نفس حاصل کرتے ہیں تو لطائف ستہ زندہ ہو جاتے ہیں اور ذاتِ حق کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور ایمان کے اس درجہ کو عین الیقین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یقیناً علم الیقین سے عین الیقین کے درجہ کا ایمان زیادہ قوی ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قوی ایمان کا جو درجہ ہے اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ لیکن مرتبہ حق الیقین کا سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ امید ہے اس مثال سے مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ فرض کرو آپ نے آگ نہیں دیکھی اور کوئی شخص آپ کو آکر کہتا ہے کہ آگ جلاتی ہے تو آگ کے متعلق آپ کا یہ یقین علم الیقین کہلائے گا۔ اگر کوئی شخص آپ کے سامنے آگ جلا دے تو آگ کے متعلق

آپ کو عین الیقین کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ لیکن جب آپ اپنا ہاتھ آگ میں دے دیں تو آپ کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ اسی طرح جب ہمیں خداوند تعالیٰ نے قرآن کے ذریعے اپنی ہستی کی خبردی ا ب ر ہم نے یہ بات مان لی تو ہمارے ایمان کا درجہ علم الیقین ہو گا لیکن جب عبادات و ریاضات کے ذریعے آپ کا تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے اور ذاتِ حق کا مشاہدہ ہوتا ہے تو ایمان کے اس درجے کو عین الیقین کہا جائے گا یعنی آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لے آنا۔ اور جب قربِ حق کی وہ منزل حاصل ہو گی جس کی خبر ہم کو قرآن نے آیہ مبارکہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ میں دی ہے تو ہمیں ایمان کا وہ درجہ نصیب ہو گا جسے حق الیقین کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو خبر ملی تھی کہ حق تعالیٰ انسان کی شہ رگ سے بھی اس سے زیادہ قریب ہے وہ خبراب خبر نہیں رہی بلکہ آپ اپنے اندر ذاتِ حق کو موجود محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہے مقامِ حق الیقین۔

ان مقاماتِ قرب کو حاصل کرنے کے لئے نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کی پابندی ضروری ہے۔ لیکن روحانی ترقی کی رفتار تیز کرنے کی خاطر قرآن حکیم اور حدیث نبویؐ میں جابجا نوافل یعنی نفلی نماز' نفلی روزے اور نفلی زکوٰۃ یعنی مقررہ زکوٰۃ سے زیادہ راہ حق میں خیرات کرنے کی تاکید آئی ہے۔ جس سے نفس کا زور کم ہوتا ہے اور روحانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان قربِ حق کی منازل طے کرتا ہے اور واصل باللہ ہو جاتا ہے۔ اور یہی انسانی زندگی کا مدعا اور مقصد ہے۔ چنانچہ تصوف نام ہے اس زائد عبادت' ریاضت اور مجاہدہ کا جس کی تاکید قرآن و حدیث میں جا بجا وارد ہوئی ہے۔ اور تصوف کے متعلق جو یہ الزامات لگائے گئے ہیں کہ ہندو مت' بدھ مت' عیسائیت اور فلسفۂ یونان سے حاصل کیا گیا ہے یہ سراسر لغو اور بے بنیاد الزامات ہیں جو دشمنانِ اسلام نے

لگائے ہیں۔ ان تمام الزامات کے جوابات ہم نے اپنی انگریزی کتاب "اسلامک صوفی ازم" اور اس کے اردو ترجمہ "روحانیت اسلام" میں تاریخی شواہد سے دے دیئے ہیں بلکہ منصف مزاج ہندوؤں اور عیسائیوں نے اپنے بیانات اور تصانیف میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ الٹا ہندو اور عیسائی اربابِ روحانیت نے اولیائے اسلام سے زبردست استفادہ اور اخذِ فیض کیا ہے۔

تصوف کے متعلق جن لوگوں نے اعتراضات کئے ہیں وہ تصوف کو باہر سے کھڑے ہو کر دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ اندر آکر دیکھنے سے کچھ اور ہی نقشہ نظر آتا ہے یعنی اسلام ہی اسلام نظر آتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت پر حقیقی معنوں میں صوفیائے کرام نے عمل کیا۔ نہ کہ علمائے ظواہر نے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ہے کہ **لا یومن احد کم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ** (تم میں کوئی مومن ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو کچھ اپنے لئے پسند کرتا ہے) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس پر عمل کر کے دکھایا آپ نان جویں پر اس لئے اکتفا فرماتے تھے کہ ہر شخص کو سفید روٹی نہیں مل سکتی۔ چنانچہ صوفیاء کرام نے اس سنت پر عمل کیا۔ آپ زمین پر سوتے تھے کیونکہ ہر شخص کو پلنگ حاصل نہ تھا۔ صوفیاء کرام نے اس سنت پر بھی عمل کیا لیکن علمائے ظواہر نے عیش و عشرت میں زندگیاں گزاریں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم راتوں کو جاگتے اور نمازیں پڑھتے تھے۔ صوفیاء کرام نے بھی اس سنت پر اس سختی سے عمل کیا کہ بعض حضرات نے تو پچاس پچاس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا گھر ایک کچی جھونپڑی تھی جس کی نہ چھت تھی نہ در دروازہ۔ صوفیاء کرام نے آپ کی اس سنت پر بھی شدومد سے عمل کیا اور علمائے ظواہر محلات میں عیش کرتے رہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ

وسلم شدید عبادات' ریاضات اور مجاہدات کے ذریعے قربِ حق کی منازل طے کر کے آخر معراج کو پہنچے۔ صوفیاء کرام نے بھی شدید مجاہدات کئے اور حق تعالیٰ کے قرب و معرفت سے مالامال ہوئے۔ ان حضرات کے مشاہدات اور کشف و کرامات سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ لیکن علمائے ظواہر جنہوں نے صرف پانچ وقت نماز پر اکتفا کیا ان بلند مقاماتِ قرب سے محروم رہے اور اس محرومی پر آنسو بہانے کی بجائے الٹا صوفیاء کرام کی عبادات' ریاضات' اور مجاہدات کا مذاق اڑاتے رہے حالانکہ صوفیاء کے مجاہدات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مجاہدات کے مطابق تھے۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ علماء ظواہر اور یورپ کے مستشرقین کا یہ الزام بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے کہ لفظ تصوف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں مروج نہیں تھا۔ کیونکہ حضرت مخدوم سید علی ہجویری علیہ رحمہ نے کشف المحجوب کے تیسرے باب کے شروع میں مندرجہ ذیل حدیث نقل کی ہے۔

من سمع صوت اھل التصوف فلا یومن علی دعائھم کتب عندا للہ من الغافلین (جس نے اہل تصوف کی آواز سنی اور ان کی پکار پر ایمان نہ لایا اللہ تعالیٰ کے ہاں غافلوں میں لکھا جاتا ہے۔) نیز لفظ طریقت "تصوف" خود قرآن کی اس آیت میں موجود ہے :-

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا یعنی اگر وہ طریقت "تصوف" پر قائم رہے تو ہم ان کو خاص پانی "روحانیت" سے سیراب کر دیں گے۔ نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے : **الفقر فخری** "فقر میرا فخر ہے" فقر کیا ہے تصوف ہی تو ہے۔ نیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے : **الفقر وطن غیب** "فقر عالم غیب کا وطن ہے"

علاوہ ازیں یاد رہے کہ تصوف مشتمل ہے چار ارکان پر۔ شریعت' طریقت' حقیقت اور معرفت۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت ایک راستہ ہے۔ راستے پر چلنے کا نام طریقت ہے اور اس راہ پر چل کر جس منزلِ مقصود پر رسائی ہوتی ہے اس کا نام حقیقت ہے اور منزلِ مقصود پر جو اسرار و رموز بتائے جاتے ہیں ان کا نام معرفت ہے مندرجہ ذیل حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تصوف کے ان چاروں ارکان کا ذکر فرمایا ہے۔

الشریعتہ اقوالی' والطریقتہ افعالی' والحقیقت احوالی' و المعرفتہ سرّی (شریعت میرے اقوال کا نام ہے' طریقت میرے اعمال کا نام ہے' حقیقت میرے باطنی احوال ہیں اور معرفت میرا راز ہے)

یہ حدیث علمائے دیوبند جیسے سخت گیر حضرات نے شرح مثنوی مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ میں نقل کی ہے جو ان کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ کی شرح ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح نہ ہوتی تو علمائے دیو بند ہرگز اس کو نقل نہ کرتے۔ نیز حضرت امام مالکؒ جو صحابی نہیں بلکہ **تابعی** ہیں اور جو ساری عمر مدینہ منورہ میں رہے ان کا مندرجہ ذیل قول بھی ظاہر کرتا ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین کے زمانے میں بھی لفظ تصوف مروج تھا۔ آپ فرماتے ہیں کہ **من تصوف ولا تفقھہ تذ ندق من تفقھہ ولا تصوف تفسق من جمع بنھما تحقق** (جس نے تصوف سیکھا لیکن فقہ نہ سیکھا گمراہ ہوا۔ جس نے فقہ سیکھا لیکن تصوف نہ سیکھا فاسق ہوا۔ جس نے دونوں کو جمع کیا حقیقت کو پہنچا)

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جس شدومد' جوش و خروش اور ذوق و شوق سے اہل تصوف نے شریعت پر عمل کیا ہے اس کے عشر عشیر پر بھی علمائے ظواہر عمل نہیں کر سکے۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک رات باہر سے کھانا آیا۔ چونکہ کھانا بھیجنے والا سرکاری ملازم تھا آپ نے کھانا نہ کھایا۔ اس خیال

سے کہ سرکاری خزانے کا مال مخدوش ہوتا ہے۔ اور نہ ہی آپ نے وہ کھانا کسی اور کو کھانے دیا۔ بلکہ دریا میں پھینک دیا اور اس روز سے اس دریا کی مچھلی کھانا ترک کر دیا کہ ممکن ہے کہ اس مچھلی نے وہی چیز کھائی ہو۔ یہ ہے صوفیاء کرام کا اتقیٰ اور پابندیٔ شریعت جس کی گرد کو بھی علمائے ظواہر نہیں پہنچ سکے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے ساری عمر خربوزہ نہ کھایا کیونکہ ان کو کسی حدیث سے یہ معلوم نہ ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خربوزہ کس طرح کاٹا اور کس طرح کھایا اور ممکن ہے کسی اور طرح کاٹ کر کھانے سے سنتِ رسولؐ کا خلاف ہو۔ صوفیاء کرام کی شریعت پر شدید پابندی کی داستانوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں اور پھر بھی یار لوگ الزام لگاتے ہیں کہ تصوف کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ تصوف عین شریعت ہے اور اسلام کی روح رواں ہے۔ روح کو اسلام سے خارج کر دیا جائے تو وہ ایک مردہ ڈھانچہ بن کر رہ جاتا ہے جیسے آج کل علمائے ظواہر نے بنا رکھا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری زندگی روحانیت سے لبریز تھی۔ آپ کے معجزات' آپ کی وحی' آپ کا تعلق باللہ اور حق تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت' قرب و معرفت اور آپ کا معراج' یہ تمام بھرپور روحانیت کے دلائل اور تصوف کی جان ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں پیچھے کی طرف بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح آگے کی طرف۔ آپ فرماتے ہیں کہ مومن کی فراست یعنی باطنی بصیرت سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب بندہ قربِ حق میں پہنچتا ہے تو اللہ کی آنکھوں سے دیکھتا ہے' اللہ کے کانوں سے سنتا ہے اور ہر کام اللہ کی طاقت سے کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ انسان کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ نماز مومن کی معراج ہے۔ تصوف سے مراد یہی روحانی زندگی' روحانی عروج اور روحانی قرب و معرفت الٰہی ہے۔ دعا ہے کہ ہم سب کو

حق تعالیٰ یہی مقامات و مراتبِ قرب و معرفت عطا فرمائیں۔ آمین۔ وباللہ التوفیق ۔

سلوک الی اللہ کا خاکہ

جن منازل سلوک یعنی فنا فی اللہ ' بقاباللہ وغیرہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس کا ایک نقشہ درج ذیل ہے جس سے سالک راہِ طریقت کے عروجی اور نزولی سفر کا کچھ اندازہ لگایا جا سکے گا :-

سالک نقطۂ (ب) سے روحانی سفر کی ابتدا کرتا ہے اور جب نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' اوراد ' اذکار' مشاغل اور مراقبات کے ذریعے اس کا تزکیہ نفس ہو جاتا ہے تو وہ نقطۂ (ج) کے راستے نقطۂ (الف) کی طرف پرواز کرتا ہے۔ جب مقام (الف) تک پہنچتا ہے تو فنافی اللہ کا آغاز ہوتا ہے۔ ب سے ج اور الف تک کے سفر کو "سیر الی اللہ" یا "عروجی سفر" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مقامِ الف پر پہنچ کر ذاتِ حق میں پرواز شروع ہو جاتی ہے۔ ذاتِ حق میں سفر کو سیر فی اللہ اور فنا فی اللہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اب چونکہ ذاتِ حق کی کوئی انتہا نہیں' اس لیے سیر فی اللہ کی بھی کوئی انتہا نہیں سالک چاہے تو ساری عمر بلکہ ہزاروں' لاکھوں برس ذاتِ حق میں سفر کرے' سفر کی انتہا نہیں ہوتی۔ بلکہ جس
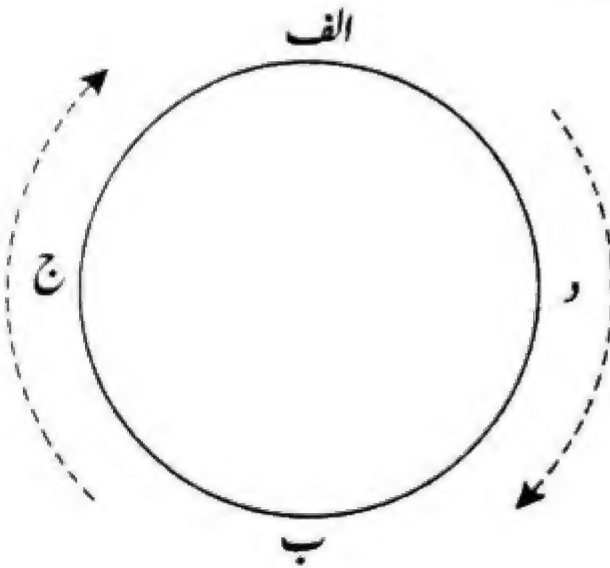
خوش نصیب شخص کی ذات حق میں سیر شروع ہو جاتی ہے' تو موت کے بعد قیامت تک اور قیامت کے بعد بہشت میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سیر فی اللہ میں منہمک رہتا ہے۔

بقاباللہ

لیکن جہاں دیگر مذاہب میں آخری مقام فنا فی اللہ تھا اور ہندو' بدھ' عیسائی راہب ترک دنیا کر کے غاروں اور جنگلوں میں رہ جاتے تھے اسلام نے آکر مقامِ بقاباللہ کی راہنمائی کی۔ بقاباللہ سے مراد ہے مقامِ فنا کی محویت' مستی اور استغراق سے نکل کر ہوش میں آنا اور فرائض زندگی ادا کرنا۔ لیکن چونکہ مقامِ فنافی اللہ میں سالک بمصداق حدیث **بی یبصرو و بی یسمع** صفاتِ الٰہی سے متصف ہو جاتا ہے اس لئے مقامِ بقاباللہ پر پہنچ کر اس کے سر پر تاجِ خلافتِ الٰہیہ رکھا جاتا ہے۔ جہاں مقامِ فنا پر سراسر سکر' محویت' استغراق اور لاشعوری ہے مقامِ بقا پر صحو' ہوشیاری اور شعور ہے اس لئے مقامِ فنا کے سالک کو "مغلوب الحال" اور مقامِ بقا کے سالک کو "غالب الحال" کہا جاتا ہے۔ نیز مقامِ فنا کے سالک کو "ابن الحال" اور بقا کے سالک کو "ابوالحال" بھی کہا جاتا ہے۔ مقامِ بقا کا دوسرا نام "نزول" اور "عبدیت" یا "عبودیت" ہے جہاں پہنچ کر سالک پہلے سے زیادہ ذوق و شوق' خشوع و خضوع اور عجز و نیاز سے عبادت کرتا ہے۔ اس وجہ سے کہ اس کو ذاتِ حق کی عظمت کا پہلے سے زیادہ علم ہو جاتا ہے۔

اب ہم پھر مندرجہ بالا نقشہ کی طرف آتے ہیں۔ جب سالک اپنی جبلی فطرتی استعداد اور صلاحیت کے مطابق فنا فی اللہ کے ذریعے قربِ حق کی بلند سے بلند منزل پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کو اپنی خودی کی طرف لوٹ کر مقامِ بقا باللہ پر فائز کیا جاتا ہے نزول اور واپسی کا یہ سفر نقطۂ (الف) سے شروع ہو کر نقطۂ (د) کے

ذریعے نقطۂ (ب) پر ختم ہوتا ہے یعنی جہاں سے سفر شروع کیا تھا پھر وہاں واپس آنا پڑتا ہے اس لئے حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا ہے کہ **النہایتہ رجوع الی بدایہ** (آخری مقام کیا ہے مقام ابتدا پر واپس آنا) لیکن بقاباللہ کا مطلب یہ نہیں کہ اب وہ فنا فی اللہ نہیں ہے بلکہ وہ بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ یعنی وہ بیک وقت قرب و وصال کے مزے بھی لیتا ہے اور ہجر و فراق کی آگ میں بھی جلتا رہتا ہے۔ اس مقام کو جامعیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یعنی بیک وقت فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہونا۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ دیگر مذاہب کی یہاں تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ اور اب جبکہ حضرت خاتم المرسلینؐ کے بعثت پر تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں دیگر مذاہب کی مقامِ فنا تک بھی رسائی ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب جو کچھ ان کو حاصل ہوتا ہے ریاضت اور مجاہدات کے ذریعے قدرے استدراج یعنی معمولی قسم کے فوق العادت امور ہیں جن کو اسلام میں زیادہ وقعت نہیں دی جاتی کیونکہ کشف و کرامات سے روحانی ترقی میں رکاوٹ آجاتی ہے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں عہدِ شباب میں کشف و کرامات سے پرہیز کرتا تو مجھے اس سے بھی زیادہ ترقی ہوتی۔

اولیائے اسلام کے اثرات ہندو اربابِ روحانیت پر

یہ جو یورپ کے مصنفین نے جن کو عرف عام میں مستشرقین کہا جاتا ہے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے کہ تصوف اور صوفیائے کرام ہندو اور عیسائی فلسفۂ روحانیت (Mysticism) سے متاثر ہوئے ہیں سراسر لغو اور بے بنیاد ہے ہم نے اپنی انگریزی کتاب "اسلامک صوفی ازم" اور اردو کتاب "روحانیت اسلام" میں اسلامی تصوف اور ہندو اور عیسائی مسٹی سزم پر طویل ریسرچ کی ہے اور عیسائی اور ہندو دیانتدار اور منصف مزاج ریسرچ سکالروں کی ان کتابوں کے حوالہ جات

پیش کیئے ہیں جن میں ثابت کیا گیا ہے کہ صوفیائے اسلام دیگر مذاہب سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ دیگر مذاہب کے اربابِ روحانیت نے صوفیائے اسلام سے زبردست استفادہ کیا ہے۔

مثلاً ہندو ریسرچ سکالر ڈاکٹر تاراچند نے تحقیق کے ذریعے اپنی کتاب (Influence of Islam on Hindu Culture) میں ثابت کیا ہے کہ نامور ہندو ارباب روحانیت مثل شنکر آچاریہ' رامانوجا' رامانندا' کبیر اور ان کے چیلوں نے صوفیائے اسلام سے روحانی تعلیمات حاصل کیں یہاں تک کہ انہوں نے تمام مشرکانہ ہندو عقائد مثلاً بت پرستی' تناسخ' ذات پات' مردوں کو جلانا وغیرہ ترک کر کے اسلامی عقائد اختیار کر لئے تھے اور مندروں اور برہمنوں کی سخت مذمت کرتے تھے۔

ہندو اربابِ روحانیت میں سے شنکر آچاریہ اور راما نوجا کے نام سر فہرست ہیں۔ راما نوجا اور شنکر آچاریہ اور صوفیاء اسلام کی تعلیمات کے درمیان زبردست یگانگت اور مشابہت دیکھ کر بعض سطح بین لوگ جن میں یورپ کے چند سکالر اور مسلمان بھی شامل ہیں یہ خیال کرتے ہیں کہ تصوف شنکر آچاریہ کی تعلیمات کی پیداوار ہے یہ نہایت ہی لغو اور بے بنیاد نظریہ ہے۔ اگر وہ راما نوجا اور شنکر آچاریہ کی تعلیمات کا غور سے اور صدق دل سے مطالعہ کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ ان دونوں اربابِ روحانیت کی تعلیمات میں سب سے بڑا عنصر نظریہ "ادو یتہ" ہے جس کا مطلب ہے توحید یعنی ایک خدا کی عبادت۔ اب ساری دنیا جانتی ہے کہ نظریہ ادو یتہ کہو یا توحید' یہ ہندو دھرم کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ ہندو دھرم کی بت پرستی کے بالکل برعکس ہے۔ لہٰذا اگر صوفیائے اسلام راما نوجا اور شنکر آچاریہ سے متاثر ہوتے تو ہندو دھرم کی بت پرستی کو اپنا شعار بناتے لیکن یہاں تو معاملہ برعکس ہے۔ راما نوجا اور شنکر آچاریہ کا نظریۂ توحید قبول کرنا صاف

بتا رہا ہے کہ یہ صوفیائے اسلام کا عطیہ ہے چنانچہ ڈاکٹر تارا چند جو زمانہ حال کے بہت بڑے ریسرچ سکالر ہیں کتاب مذکور میں لکھتے ہیں کہ :

شنکر آچاریہ

"جنوبی ہند میں شنکر آچاریہ اور ان کے شاگردوں کی روحانی تعلیمات اور اسلامی تصوف کی تعلیمات میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔ شنکر کی پیدائش کے وقت تک اسلامی نظریۂ توحید (Monotheism) جنوبی ہند میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ اس لحاظ سے شنکر آچاریہ اپنے عہد کی پیداوار تھے اور ایک نئے مذہب یعنی مذہب توحید کے بانی تھے۔ جو برہمنوں کی بت پرستی کے برعکس تھا۔ شنکر کے اس نظریۂ توحید کو اسلام کے سخت توحید پسند مذہب سے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ شنکر اس وقت پیدا ہوئے جب مسلمانوں نے جنوبی ہند میں قدم جما کر وہاں کے ایک راجا کو مسلمان کر لیا تھا اور اپنی تبلیغی کوششوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ ان کی جائے پیدائش بھی وہ جگہ تھی جہاں عربستان اور ایران سے جہاز آکر ٹھہرتے تھے۔ لہٰذا اگر شنکر کا نیا نظریۂ توحید اسلامی توحید کی ایک گونج قرار دیا جائے تو کوئی نئی اور حیرت کی بات نہ ہو گی۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے اثرات ہندو ازم میں پوری قوت سے داخل ہوئے اور اس پر اسلامی رنگ چڑھا دیا"۔

آگے چل کر ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں :

راما نوجا

" راما نوجا کے وقت میں مسلمان کارو منڈل ساحل پر آباد ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں مسلم اولیاء مثل ناصر ولی وغیرہ اسلام کی تبلیغ میں مصروف تھے اور ہندوؤں اور ان کے حکمرانوں مثل راجا کنپوریا وغیرہ کو مسلمان بنا رہے تھے اور ان سے مساجد کے لئے زمینیں حاصل کر رہے تھے۔ ہندو مذہب پر اسلام کا اتنا اثر ہوا کہ شنکر آچاریہ اور راما نوجا کے وقت میں قدیم ہندو ذات پات کی رسم' عقیدۂ تناسخ اور بت پرستی وغیرہ کا خاتمہ ہو گیا۔ راما نوجا کے فلسفہ کے مطابق خداوند عالم صفات حسنہ کا مالک سمجھا جانے لگا اور انہوں نے خدائے واحد کی عبادت میں ذوق عمل اور حسن عقیدت کو شامل کر دیا۔ انہوں نے مذہب کے وہ دروازے ان قوموں کے لئے بھی کھول دیئے جن کو اب تک برہمنوں نے بند کر رکھا تھا۔ عابد و معبود کے باہمی تعلق میں عشق کو بڑا دخل حاصل ہوا بلکہ انسان بھائی کی محبت بھی جزو ایمان بن گئی لیکن اس معاملہ میں پیش رفت ذرا کم تھی۔ اور وشنو سوامی' نمبارکا اور مہادیو کے بحث و مباحثے وہ شکل اختیار کر گئے جو نظام' اشعری اور غزالی کے مابین ہوا کرتے تھے"

آگے چل کر ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں :

" نانویں صدی کے جنوبی ہند کے دیگر عقائد پر بھی اسلام کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے مثلاً خدائے واحد لا شریک کی

عبادت٬ عبادتِ الٰہی میں عشق و محبت کا زور٬ تزکیۂ نفس٬
گورو یا پیر و مرشد کا احترام٬ ذات پات کا ترک وغیرہ"

ڈاکٹر تارا چند ان اصلاحات کو اسلام اور صرف اسلام کی پیداوار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

" چنانچہ راما نوجا نے شودروں کو مندروں میں داخل ہونے کی اجازت دے رکھی تھی ان اصلاحات کو جین مت اور بدھ مت سے ہرگز منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان مذاہب میں بھی ذات پات اور بت پرستی کی لعنت گھس چکی تھی۔ بھگتی یعنی محبت اور پاراپتی (اطاعت) کا عنصر خالص اسلامی اثرات کا نتیجہ ہے"

ڈاکٹر تارا چند مزید لکھتے ہیں کہ :

" مصنف .ممدار کار کا خیال ہے کہ ہندو ازم پر یہ اثرات عیسائی مذہب کا نتیجہ ہیں۔ لیکن زیادہ یقینی بات یہ ہے کہ یہ اثرات اسلامی ہیں۔ کیونکہ محبت اور اطاعت دونوں اسلام کا جزو اعظم ہیں۔ لفظ اسلام کے معنی بھی فرمانبرداری یعنی اطاعت کے ہیں اور ایک مسلمان سچا پارا پنا (مطیع) ہوتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی رضا کے آگے سر جھکا دینا اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ تاریخ کی رو سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ راما نوجا نے یہ عقائد اسلام سے حاصل کئے۔ امام (گرو) کے ذریعے حق تعالیٰ کی عبادت میں منہمک ہو جانا بھی اسلام کے اہم عقائد میں سے ہے۔ احترام شیخ کا یہ اصول قرون وسطیٰ کے ہندو ازم کے اندر صوفیاء اسلام کے ذریعے

داخل ہوا۔ شنکر کا نظریہ انانداگیری' یعنی شوا میں فنا ہو جانا اور الورا اور اچارو کاوشنو میں فنا ہونا اور اناپاتھی کا گرو وادا' یہ تمام نظریات صوفیانہ ہیں اور صوفیاء کے ذریعے سارے ہندوستان میں پھیل گئے۔ چنانچہ عصرِ۔نہ کا ایک ہندو سکالر لکھتا ہے کہ ہندو مذہب میں یہ جو استاد کو اتنا اونچا مقام دیا گیا ہے میرے نزدیک یہ اسلام کا اثر ہے۔ راما نوجا اور آرتھا پنچیکا کا عقیدہ آچاریہ بھیما بھی اسلام سے ماخوذ ہے نہ کہ عیسائیت سے یہ تمام اثرات جنوبی ہند میں ظاہر ہو رہے تھے نہ کہ شمالی ہند میں جہاں ابھی تک اسلام نہیں پہنچا تھا۔"

ہندو فرقے لنگا (جگناماس) اور سدھار پر صوفی اثرات

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ :

" جنوبی ہند کا ذکر چھوڑنے سے پہلے دو اور ہندو فرقوں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان فرقوں پر اسلامی اثرات سب مذکورہ بالا فرقوں سے زیادہ ہوئے ہیں ان فرقوں کے نام لنگایت (جگنا ماس) اور سدھارا ہیں۔

ہندو مت کے ان دونوں فرقوں کی عادات و خصائل' عقائد و اعمال برہمنوں سے اس قدر مختلف اور اسلام سے اس قدر مشابہ ہیں کہ ہندو اور یورپین موٴرخ اسلامی اثرات کی ہرگز نفی نہیں کر سکتے۔"

ڈاکٹر تارا چند مزید وضاحت کرتے ہوئے اسلامی تصوف کے مندرجہ ذیل اثرات بیان کرتے ہیں :

" لنگایت فرقہ کے لوگ خدائے واحد لا شریک کی پرستش کرتے ہیں جسے وہ پاراشوا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ بلند ترین تجلیات اور کمالات کا مرکز' وہ تمام خوشیوں کا منبع' وہ لازوال ہستی' جو ہر مادی تغیرات سے پاک ہے وہ ایک عالمگیر ہادی ہے جسے وہ لوگ علامہ پربھو کہہ کر پکارتے ہیں۔ انسان کی شکل میں جو ہادی آیا وہ اس ستار و غفار کا نائب ہے جسے وہ اپنی زبان میں بساوا کہتے ہیں۔ ان نائب ہادیوں کے نام ان کی زبان میں یہ ہیں۔ ریوان' مارول' اکوراما اور پنڈت۔ پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ یہ مسلمانوں کے چار پیر ہیں جو روحانی تربیت پر مامور ہیں۔ اور جن کی مرید بنانے کی رسومات اس قوم کے چار پیشوا بعینہٖ گمنام (چیلہ) بناتے وقت ادا کرتے ہیں۔ ان کے چیلہ بنانے کے قواعد بھی وہی ہیں جو مسلم صوفیاء کے ہیں۔"

آگے چل کر ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ ان کے حسب ذیل عقائد بھی مسلمانوں جیسے ہیں :

" ان میں کوئی ذات پات کا امتیاز نہیں ہے۔ جب ایک پاریا (غلام) ان کے سلسلے میں داخل ہوتا ہے تو وہ برہمن سے کسی حالت میں کم نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی ان کے ہاں امیر و غریب یا مرد و عورت کا فرق ہے تمام لوگ اپنے اعمال کے مطابق معزز سمجھے جاتے ہیں۔"

آگے چل کر ڈاکٹر تارا چند ان کے رسوم و رواج اور معاشرتی اصول بیان کرتے ہیں۔ جو خالص اسلامی ہیں :

> " ان کے ہاں شادی اختیاری چیز ہے اور دلہن کی رضامندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ بچپن کی شادی کو وہ غلط سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں طلاق جائز ہے۔ وہ لوگ بیواؤں کی عزت کرتے ہیں اور ان کو دوبارہ شادی کی عام آزادی ہے۔ وہ لوگ مردوں کو جلاتے نہیں دفن کرتے ہیں اور مردے کو غسل دیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں برہمنوں کی طرح موت کی رسومات نہیں ہیں۔ وہ تناسخ (آواگون) کے قائل نہیں ہیں۔ وہ سب مل کر کھانا کھاتے ہیں' باہم شادی بیاہ کرتے ہیں اور اتفاق سے رہتے ہیں۔ وہ بہت مخلص اور متقی و پرہیزگار ہوتے ہیں اور مجاہدانہ زندگی بسر کرتے ہیں ۔ وہ ٹیلیگو علاقے میں رہتے ہیں۔ جہاں بلگام' بیجاپور اوردھار واڑ کے ضلعوں میں ان کی ۳۵ فیصد اور میسور اور کلما پور میں دس فیصد آبادی ہے"

قارئین غور فرمائیں کہ یہ تمام اصول اور عقائد اسلامی ہیں اور ہندو مذہب کے بالکل خلاف ہیں۔ آگے چل کر ڈاکٹر تارا چند یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ عقائد انہوں نے کہاں سے اپنائے ہیں اور پھر خود ہی پروفیسر براؤن کی تردید کرتے ہوئے جواب دیتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کا اثر ہے جن کی نو آبادیاں ساحل سمندر کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر تارا چند کہتے ہیں کہ مؤرخ نائران *(Nairn)* کا بھی یہی خیال ہے اس کے بعد ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں :

> " اس نظریہ کو رد کرنا مشکل ہے کہ لنگایت فرقہ اسلامی اثرات کی پیداوار ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا کہ جس سے ان کی عادات و عقائد میں اس قدر انقلاب واقع ہو سکے۔ کیونکہ تناسخ جیسے مضبوط ہندو عقیدہ'

مردہ جلانے جیسی قدیم ہندو روایت' ذات پات جیسی پرانی
رسم' شادی بیاہ جیسی اہم رسومات کا ترک اور ان لوگوں کی
سخت مجاہدانہ اور دلیرانہ زندگی جو انہوں نے اپنے ہادی علامہ
سے سیکھی صاف گواہی دے رہے ہیں کہ یہ اسلام کا فیض
ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر تارا چند اس قوم کے اسلامی عقائد تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ جن میں سے چند باتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں : "اے انسان اگر تو نے گناہ کا ارتکاب کر لیا ہے تو تو ایک دفعہ کہہ دے کہ میں ایمان لایا پس تمام گناہ ختم ہو جائیں گے"۔

غیر اسلامی رسومات چھڑانے کے لئے ان کے راہنما یہ دعوت دیتے ہیں :

"گھوڑوں کی قربانی بند کر دو۔ اجلپا منترا کی بیعت چھوڑ دو۔
آگ کی پوجا چھوڑ دو' گیاتری جادو کی رغبت ترک کر دو'
لوگوں پر جادو مت کرو' خدا کی پرستش کرو اور ذات پات کا
چکر چھوڑ دو۔ کیونکہ سب سے اعلیٰ ذات اس کی ذات ہے جو
خدا کا بندہ ہے۔"

یہ تمام اسلامی عقائد ہیں اور آخری عقیدہ تو قرآن مجید کی اس آیت کا ترجمہ ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (تم میں سے سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے) مندرجہ ذیل عبارت تو بعینہٖ صوفیاء کرام کے مقام فنا فی اللہ کا بیان ہے :

"آہ میں وہ لذت کیسے بیان کروں کہ جب میرا وجود
برف کی طرح گھل کر پانی کے ساتھ یک جان ہو جاتا ہے۔

جیسے آگ کے اندر لاکھ کی مورتی۔ آہ ! میں کیسے کہوں کہ میں خدا سنگنام ڈیرا کے ساتھ ایک ہو جاتا ہوں۔ جب آسمان ' زمین سب کچھ گم ہو جاتا ہے۔ ساری کائنات خدا کے وجود کے اندر برف کے ٹکڑے کی طرح ہے میں ایسے سمندر میں پہنچ چکا ہوں جہاں لذت ہی لذت ہے اور دوئی کا نام نہیں"۔

اس قوم کے بزرگوں کی یہ عبارت قابل غور ہے :

"خدا وہ نور ہے جو نہ آسمانوں میں سما سکتا ہے نہ زمین میں' وہ میرا بادشاہ ہے جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے"

یہ عبارت حدیث ذیل کا عین ترجمہ ہے :

لا یسعنی ارضی ولا سمائی و یسعنی قلب عبدی المومن"

اور لفظ بادشاہوں کا بادشاہ ترجمہ ہے قرآن کے الفاظ احکم الحاکمین کا۔ صوفیاء کرام ذاتِ حق کو ذاتِ وریٰ الوریٰ کہتے ہیں۔ فرقہ لنگایت کے الفاظ ذیل بھی بعینہٖ وہی ہیں۔

خدا کی ذات منزہ ہے اور پردوں کے پیچھے دور دور ہے اور ہر چیز سے دور ہے۔ اور پھر ہمارے اندر بھی ہے (جیسے قرآن کہتا ہے وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اور نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ)

آگے چل کر ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ :

" وہ ایک خدا یعنی ست گرو کو مانتے ہیں اور بار بار جنم لینے کے ہندو عقیدہ کی تردید کرتے ہیں اور نہ ہی وہ ہندو مقدس کتابوں کو مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو لوگ چار

ویدوں' چھ شاستروں اور ذات پات اور ایک سے زیادہ خداؤں
میں یقین رکھتے ہیں وہ دوزخ کی آگ میں جھونکے جائیں
گے۔ ان کے عقائد خالصتاً اسلامی ہیں۔"

ذات پات اور چھوت چھات کی تردید میں وہ لوگ کہتے ہیں :

" ارے برہمن ! میری بات سنو اور اگر بن پڑے تو
جواب دو۔ کیا بارش اور ہوا بھی اونچی ذات کے لئے آتی ہے
اور نیچی ذات کو چھوڑ دیتی ہے ؟ کیا جب شودر لوگ زمین پر
چلتے ہیں تو زمین ان کی نفرت میں پھٹ جاتی ہے ؟ کیا سورج
کی کرنیں نیچی ذات پر نہیں چمکتیں ؟ خدایا ! کب یہ ذات
پات ختم ہوگی اور بنی نوع انسان ایک ہو جائے گی۔"

ان عقائد کے اسلامی ہونے کے متعلق ڈاکٹر تارا چند مزید لکھتے ہیں :

" ان تمام اقتباسات سے ظاہر ہے کہ سارا قوم کے لوگ
خدائے واحد لا شریک پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ویدوں اور
شاستروں کو نہیں مانتے تھے' بت پرستی کے مخالف تھے' تناسخ
میں یقین نہیں رکھتے تھے' ان کے گیتوں میں اسلامی عقائد کی
تختی سے جھلک رہی ہے۔ ان کا تصور ذات باری تعالیٰ اور
ذاتِ حق میں فنا کا نظریہ صوفیاء اسلام کا نظریہ ہے۔ کیونکہ
دونوں ذات حق کو نور کہتے ہیں اور دونوں کے نزدیک عشق کو
بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ بلاشبہ
مسلمانوں کے شاگرد ہیں"۔

آخر میں ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں :

"مختصر یہ کہ جنوبی ہند کے مذہبی عقائد سے یہ بات واضح ہے کہ اسلامی عقائد ہندو مذہب کے اندر گھس گئے تھے۔ لہٰذا اگر ان کے حق میں کوئی فیصلہ دیا جا سکتا ہے۔ تو یہ ہے کہ وارسیوا اور سدھارا قومیں اسلامی اثرات سے گہرے طور پر متاثر ہوئیں"

رامانند اور بھگت کبیر

اس کے بعد پروفیسر تارا چند شمالی ہند میں اسلامی اثرات بیان کرتے ہوئے رامانند اور بھگت کبیر جیسے نامور روحانی پیشواؤں کی مثال پیش کرتے ہیں جو تصوف سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"رامانند جنوبی اور شمالی ہند کے درمیان بھگتی تحریک کا پل (واسطہ) ہے بھنڈارکر اور گریسن (Grieson) جیسے سکالروں کا خیال ہے کہ رامانند، رامانوج سے چوتھی پشت پر ہے۔ میکن لیف (Macanlife) کہتا ہے کہ وہ ۱۳۹۹ء میں پریاگ (الٰہ آباد) کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک آزاد ذہنیت کے مالک تھے اور اپنے علم کو بڑھانے کے لئے انہوں نے سارے ملک کا سفر اختیار کیا۔ میکن لیف کہتے ہیں کہ اس سفر کے دوران وہ مسلم علماء و صوفیاء سے ملتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اپنے پرانے مذہب کے خیالات ترک کر دیئے۔ رامانند کے بارہ چیلوں کے نام یہ ہیں۔ اننتا نندا، کبیر، پیپا، بھاوانند، سوکا، سرسورا، پدماوتی، نرہاری، رائیداس، دھانا، سینا اور سرسورا کی بیوی، کبیر ۱۳۹۸ء

میں پیدا ہوئے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ ان کو اپنے استاد رامانند کی زیادہ صحبت نہیں ملی تھی۔ وہ اکثر پھرتے رہتے تھے اور نیک لوگوں سے ملتے تھے۔ وہ زیادہ تر مسلم صوفیاء کی صحبت میں رہے جس کا ذکر وہ اپنی نظم رامائنی میں بھی کرتے ہیں۔ ان کی رہائش مانک پور میں تھی جہاں وہ مدت تک شیخ تقی کی صحبت میں رہے۔ اسی طرح بھگت کبیر نے جام پور اور جھانسی کے علاقے میں مسلم پیروں سے تصوف کی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس علاقے میں بیک وقت اکیس پیر رہتے تھے جو مساجد میں خطبات بھی دیا کرتے تھے۔ بھگت کا ایک بیٹا تھا۔ اس کا نام باپ کی طرح اسلامی نام تھا۔ بیٹے کا نام کمال اور بیٹی کا نام کمالی تھا۔"

یاد رہے کہ رامانند اور کبیر ہندوؤں کے پیرانِ پیر ہیں جنہوں نے مسلم صوفیاء کرام سے تصوف کی تعلیمات حاصل کیں۔ ان تینوں باپ بیٹے اور بیٹی کے اسلامی نام تھے اور اس قدر اسلامی زندگی بسر کرتے تھے کہ جب کبیر کا انتقال ہوا تو مسلمان ان کو دفن کرنے اور ہندو جلانے کے لئے جنازہ پر پہنچ گئے لیکن جب دیکھا تو پھولوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

بھگت کبیر کے اسلامی عقائد

بھگت کبیر کے عقائد کے متعلق ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ :

"کبیر کا مذہب کیا تھا۔ نابھا جی کہتے ہیں کہ کبیر ذات پات کے منکر تھے اور نہ ہی ہندومت کے چھ مکاتیب فکر کو مانتے تھے اور نہ برہمنوں کے بنائے ہوئے زندگی کے چار حصوں میں

یقین کرتے تھے۔ ان کا مذہب بھگتی (محبت) تھا۔ جو صوفیاء سے اخذ کیا۔ کبیر کی تعلیمات وہی تھیں جو صوفیاء کی تھیں۔ ہندو دھرم میں ان کا کوئی پیشوا نہیں تھا۔ مسلم صوفیاء ہی ان کے پیشوا تھے۔ ان کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شیخ فرید الدین عطار کا پند نامہ بھی پڑھا تھا۔ اور جلال الدین رومی اور سعدی کے کلام سے بھی آشنا تھے۔ مثلاً کبیر کہتے ہیں کہ جب تم دنیا میں آئے تو لوگ ہنستے تھے اور تم رو رہے تھے۔ تم دنیا اس طرح گزارو کہ تمہاری موت پر لوگ روئیں اور تم ہنسو۔"

یہ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کی رباعی کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے۔

ڈاکٹر تارا چند کہتے ہیں کبیر نے انسان اور خدا کے باہمی تعلق کو شیخ عبدالکریم جیلی اور دوسرے صوفیاء کی طرح بیان کیا ہے مثلاً ایک جگہ پر کبیر کہتے ہیں :

"یہ زندگی ایک بحر بے کراں میں ایک حباب کی مانند ہے جس کا وجود سمندر سے علیحدہ نہیں۔ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن"۔ کبیر عبدالکریم جیلی اور دیگر صوفیاء کی طرح ذاتِ حق کو سمندر اور انسان کو سمندر کی لہر کی مثال دیتے ہیں اور اکثر بادہ و ساغر، عاشق و معشوق، محب اور محبوب کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ نیز وہ گل و بلبل اور حال و مقام جیسے صوفیانہ الفاظ بھی اکثر استعمال کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑی حد تک صوفیاء کے احسان مند ہیں۔ احمد شاہ نے کبیر کے کلام کا ترجمہ کیا ہے جس میں

دو سو سے زائد عربی اور فارسی کے الفاظ ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تصوف کا ان پر کتنا گہرا اثر تھا۔ کبیر پر صوفیاء کرام کے اثرات کا سب سے بڑا ثبوت ان کی تعلیمات ہیں۔ مثلاً وہ خدا کو ان ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اللہ' بے چوں' خدا' سائیں' گوبندا وغیرہ۔ سب سے زیادہ پیارا خدا کا نام ان کے نزدیک صاحب ہے جو ہر وقت وہ استعمال کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ذاتِ حق وریٰ الوریٰ ہے۔ وہ پاک ذات ہے' وہ کہتے ہیں خدا کا وجود نور ہے اور یہ گہرا صوفی اثر ہے کبیر کہتا ہے ذاتِ حق ایک نور ہے جو ساری کائنات کو سموئے ہوئے ہے۔ سنو بھائی سادھو حقیقی ہادی خالص نور ہے۔ یہ شیخ عبدالکریم جیلی اور بدر الدین شیخ کے الفاظ کی گونج ہے"۔

ایک عجیب بات جو کبیر کی صوفیانہ تعلیمات کے اندر دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مسلم صوفیاء کی طرح مقامِ فنا فی اللہ کا تو اکثر ذکر کرتے ہیں لیکن بقا باللہ کا کہیں نام نہیں لیتے جو صوفیاء کرام کے نزدیک سب سے اونچا اور آخری مقام ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے شاید ان کو صرف فنا کا مقام حاصل ہو سکا اور ظاہری طور پر ہندو بن کر رہنے کی وجہ سے ان پر بقا باللہ کا دروازہ نہ کھل سکا۔ یاد رہے کہ بقا باللہ اسلام کا خاصہ ہے اور آخری منزل ہے اور جب تک خدا کے آخری نبی کی پوری متابعت نہ کی جائے آخری مقام حاصل نہیں ہوتا۔ ہر زمانے کے نبی کی متابعت ضروری ہوتی ہے ورنہ فیضانِ الٰہی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور خاص لوگوں پر صرف قطرات کی صورت میں فیضان کا ترشح ہوتا رہتا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی عادت ہے کہ سب سے پرانے مذہب کو پرانی شراب کی طرح بہترین سمجھتے ہیں اور اپنے قدیم ترین مذہب پر فخر کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں

سمجھتے کہ سب سے پرانا مذہب پرانی شراب کی طرح سب سے زیادہ بگڑا ہوا ہوگا۔ پرانی شراب بھی اسی لئے پسند کی جاتی ہے کہ سب سے زیادہ بگڑی ہوئی ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ دماغ کو بے ہوش کر دیتی ہے۔ اس پر فخر کی کون سی بات ہے۔

ڈاکٹر تارا چند آگے چل کر کبیر کی صوفیانہ کیفیات بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ :

"کبیر اپنی روحانی کیفیات کو حال کا نام دیتے ہیں (صوفیاء کی طرح) کبیر غم کو دکھ کا نام دیتے ہیں۔ امید کو آشا کہتے ہیں۔ خوف کو ڈراسا' خوبصورتی کو جمال' رعب کو جلال مہربانی کو مہر' جدائی کو ورابا' حیرانگی کو حیرت' اتحاد کو میلان' غیر حاضری کو غیب اور موجودگی کو حضور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ روحانی سفر کو منصور حلاج کی طرح اپنے اندر کا سفر کہتے ہیں۔ وہ حلاج کی طرح ناسوت کو تاریکی' ملکوت کو فرشتہ پن' جبروت کو نورِ جلال' لاہوت کو نورِ جمال اور ہاہوت کو ذاتِ محض کا نام دیتے ہیں"

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ کبیر اپنے دس مقام ریختہ میں محمدؐ کا پورا سفر معراج بیان کرتے ہیں۔ کبیر اپنے ہندو بھائیوں کو یہ تلقین کرتے ہیں :

"برہمانہ رسومات ترک کر دو۔ بتوں پر قربانیاں چھوڑ دو' جادوگری چھوڑ دو' بت پرستی چھوڑ دو' زبانی عبادت چھوڑ دو' برہمن راج ختم کرو' ذات پات اور چھوت چھات بند کرو' اوتار کا عقیدہ غلط ہے' روح (جیارا) مہمان ہے جو دوسری بار نہیں آئے گا"

دوسرے الفاظ میں کبیر ہندوؤں کو اسلام کی دعوت دے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کو اپنا پیشوا ماننے والے ہندو صاحبان ان کی دعوت کو کیوں نہیں قبول کرتے۔

گورو نانک

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ گورو نانک جو سکھ مذہب کے بانی ہیں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے اُن کی ہمشیرہ کے خاوند کا نام جے رام تھا جو نواب دولت خان لودھی کا ملازم تھا۔ نواب دولت خان سلطان بہلول لودھی کا رشتہ دار تھا۔ ہمشیرہ نے نانک کو بُلا کر نواب دولت خان کے ہاں مال زکوۃ کا منشی تعینات کرایا۔ تیس سال کی عمر میں انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور گھر بار چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی۔ گورونانک نے ہندوستان' لنکا' ایران اور عرب کے چار سفر کیے اور چالیس سال تک ان ملکوں میں مقدس مقامات کی زیارت میں مشغول رہے۔ شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی کے آستانہ پر وہ ایک مدت تک رہے۔ علاوہ ازیں وہ مشائخ ملتان کی صحبت میں بھی رہے۔ اور بابا فرید کے خاندان میں شیخ ہرام (ابراہیم) فرید چشتی سے بھی فیض حاصل کیا۔ نانک کا مشن ہندو اور مسلمانوں کو ایک کرنا تھا۔ صوفیائے اسلام کی صحبت میں رہ کر انہوں نے ہندو عقائد مثل بت پرستی' اوتار وغیرہ عقائد ترک کر دیے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ "خدا ایک ہے اور اس کا خلیفہ نانک سچ بولتا ہے"۔

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ :

> "اس سے صاف ظاہر ہے کہ گورو نانک پیغمبر اسلام کو اپنا راہبر سمجھتے تھے اور ان کی تعلیمات پر بھی یہی اسلامی رنگ ہے۔ پیغمبر اسلام کی طرح نانک بھی اپنے پیروکاروں سے

خدائے واحد کی اطاعت کا مطالبہ کرتے تھے۔ صوفیوں کی طرح نانک بھی گرو (راہبر) کی متابعت ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک روحانی سفر کے چار مراحل تھے سرن کھنڈ' انان کھنڈ' کرم کھنڈ اور سچ کھنڈ' کتاب نانک پرکاش کے مصنف لکھتے ہیں کہ گورونانک کے یہ چار مراحل صوفیاء کے چار مقامات شریعت' طریقت' معرفت اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ اسلام کا گورونانک پر کتنا گہرا اثر ہوا یہ بات خودبخود ظاہر ہے بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور ان کے اقوال اور افعال اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صوفی رنگ میں پوری طرح رنگے جا چکے تھے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آیا انہوں نے ہندوازم سے بھی کوئی فائدہ حاصل کیا"۔ ختم ہوا ڈاکٹر تارا چند کا بیان۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ ابراہیم فرید چشتیؒ جو حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے بارہویں پشت پر تھے کی تعلیم و تربیت سے وہ مقامِ فنا فی اللہ میں تو پہنچ گئے لیکن ان پر مقامِ بقا پر لوٹنے کی بجائے شاہ بو علی قلندر کا قلندری رنگ چھا گیا اور دائمی استغراق میں رہنے لگے جس کی وجہ سے آپ کو نہ حجامت بنوانے کا ہوش تھا اور نہ دنیا کے دیگر کاموں کا۔ وہ بادۂ توحید اور فنا میں مست ہو چکے تھے۔ نماز روزہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جیسا کہ سکھ حضرات مانتے ہیں وہ حج بیت اللہ کے لئے مکہ مکرمہ بھی تشریف لے گئے سنا ہے امرتسر کے مندر میں آپ کے تبرکات میں سے ایک آپ کا کرتہ ہے جس پر کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہے۔

سکھ حضرات سے یہ بھی سنا ہے کہ ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں حج کے دوران آپ کعبہ شریف کی طرف ٹانگیں دراز کر کے سوئے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا کہ کعبہ کی طرف ٹانگیں مت کرو تو آپ نے فرمایا کہ اچھا میری ٹانگیں اس طرف کر لو جدھر خدا نہ ہو۔ جب اس نے آپ کی ٹانگیں دوسری طرف کیں تو کعبہ بھی اسی طرح مڑ گیا۔ یہ کہانی سکھ حضرات بیان کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

گورونانک کے کلام کے مجموعے کا نام گرنتھ صاحب ہے۔ جو حضرت شیخ ابراہیم فرید کی شاعری سے لبریز ہے بعض کا خیال ہے کہ یہ حضرت بابا فرید کا کلام ہے جس کے ہر شعر کے آخر میں فرید تخلص استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ آپ کمال استغراق کی وجہ سے نماز روزہ کی پابندی نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی حجامت بنوا سکتے تھے۔ ان کے پیروکاروں نے ان کی سنت پر عمل کرتے ہوئے نماز روزہ کی پابندی کو ضروری نہ سمجھا اس لئے ایک نئے مذہب کی بنیاد پڑ گئی اور مغل بادشاہوں اور سکھوں کے درمیان سیاسی جنگوں کی وجہ سے دونوں مذاہب کے درمیان کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی۔

سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب' حضرت بابا گورو نانک کے پیر و مرشد حضرت شیخ ابراہیم فرید ثانیؒ کے جد امجد حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے اشعار سے لبریز ہے اور کتاب کے ہر بند کے آخر میں حضرت شیخ کا تخلص فرید گونج رہا ہے۔ ان اشعار کی شرح فارسی زبان میں پائی جاتی ہے جو اس زمانے کے مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں سب کی مشترکہ علمی و ادبی زبان تھی۔

بعض کا خیال ہے کہ گرنتھ صاحب میں فرید تخلص کے ساتھ جتنے اشعار ہیں وہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر قدس سرہٗ کے نہیں بلکہ آپ کے خلیفہ جانشین حضرت شیخ ابراہیم فرید رحمتہ اللہ علیہ کے ہیں جو حضرت بابا گورونانک کے پیر و مرشد تھے اور حضرت بابا فرید گنج شکر قدس سرہٗ سے بارہویں پشت پر تھے۔

لیکن صفحات ہذا میں شارح گلونت سنگھ جیت سنگ نے ان اشعار کو حضرت بابا فرید الدین گنج شکر قدس سرہٗ سے منسوب کیا ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان سکھ حضرات کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ

"حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ یکے از معروف ترین صوفیائے سلسلہ چشت است کہ نامش در تمام ہندوستان بہ عزت و احترام می برند۔ در واقع شیخ یک نابغۂ عظیم روحانی بود کہ زہد و ریاضت ، فقر و درویشی، علم و انکسار و عشق حقیقی و شعر و سخن در ذات و شخصیت او تجسیم تام یافتہ۔"

"پدرش جمال الدین کہ خواہر زادۂ سلطان غزنوی بود در عہدِ شہاب الدین غوری از کابل بہ لاہور وار دشد۔ چندے بہ قصور اقامت گزید و بعد بہ ملتان رسید۔ بنا برگفتۂ مفتی غلام سرور لاہوری شیخ فرید الدین ۵۸۵ھ تولد یافت و ۶۷۰ھ واصل بحق شد۔"

"شیخ فرید بدست خواجہ قطب الدین بختیار کاکی بیعت نمود و بہ سلسلہ چشتیہ پیوست۔ فطرتاً شیخ فرید بہ زہد و ریاضت رغبت داشت و اکثر در مجاہدت و عبادت مشغول ماند، استغراقِ فریدؔ بہ زہد و عبادت بحدّے بود کہ می گویند ضعف و نقاہت برو مستولی گردید و چوں سرخیل اولیائے ہند۔

خواجہ معین الدین مؤسس سلسلۂ چشتیہ بمرید خویش یعنی خواجہ بختیار کاکی بیامد۔ شیخ برائے احترام خواجہ بزرگوار نتوانست برخاست و اشک از چشمش جاری گشت کہ حالت درونی را ظہار کرد خواجہ بزرگوار آثار بزرگی در ناصیہ شیخ فرید ملاحظہ نمود و فرمود بابا بختیار ! شہباز عظیم را بقید آوردہ ای کہ بجز سدرۃ المنتہیٰ آشیانے نگیرد۔"

شخصیت شیخ فرید مکمل ترین مظہر تصوف است و می تواں گفت کہ ابیات زیبا و اشعار دلاَویز کہ بزبان پنجابی از قلمش تراوش یافتہ مکمل ترین نمونۂ شعر و سخن است کہ مشحون بہ حلاوت و عذوبت است کہ خوانندہ راسر شار و مجذوب و مسوری سازد۔ فصاحت وبلاغت درکلامِ الہام التیام شیخ بحدیست کہ کسے بہ پایۂ اونمی رسد۔

ناگفتہ نماند کہ شیخ فرید در اشعار افکار عالیہ را مجسم ساختہ و اہمیت بردباری و تحمل و مروت وژرف نگاہی و عشق الٰہی رابروز دادہ۔ شیخ یکے از ہادیانِ اخلاق فاضلہ است کہ تلقین بہ حسن اندیشہ و حسن عمل و حسن معاشرت می کند۔ از ہمیں جہت است کہ کلامش در کتابِ مقدس مذہب سکھاں شمول یافتہ۔ می تواں گفت کہ شاید حضرت گنج شکر صوفی بے نظیر است کہ ذات و کلامش مقبول و محبوب ہر وہ عوام است و محدود بہ فرقۂ مخصوص نیست۔ الحق شیخ یکے از پیغام گزاران عشق و محبت است و تمام بنی نوع انسان را بہ یک رشتۂ وحدت منسلک می سازد۔

اشعار یکہ شیخ بزرگوار بزبانِ پنجابی سرودہ شعلہ جاوید است کہ انوارِ اقدارِ عالیہ منتشری سازد و ظلمات اوہام و ظنون ازودۂ قلب و ضمیر را مجلی و مزکی می کند۔ در تاریخ تصوف و شعر افکارِ عمیق کہ شیخ فرید بہ طور خصوصی آوردہ عبارت است از "، و عقل و عمل کہ اہمیت جاودانی دارد برائے بنی نوع انسان کیمیائے سعادت است ۔ ایں شعر سنائی بحق او صادق و احسن است ۔

ہمہ لفظ او قوتِ جانست و بس
ہر شعر او فضل را کیمیاست

ڈاکٹر تلدا چند کتاب مذکور میں آگے چل کر لکھتے ہیں کبیر کے نو چیلے تھے جن میں سے ایک دادو دیال تھا۔ ڈاکٹر تارا چند نے اپنی کتاب میں دادو دیال کے

کچھ اقوال نقل کئے ہیں جو خالص اسلامی تعلیمات ہیں۔

سولھویں صدی کے ہندو فقیر

اس کتاب کے اس باب میں ڈاکٹر تارا چند رامانند اور کبیر کے پیروکاروں کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ رامانند کے مندرجہ ذیل چیلے تھے :

۱۔ دھنان = جو جاٹ قوم سے تعلق رکھتے تھے اور راجپوتانہ کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے وہ بنارس گئے اور رامانند کے شاگرد ہوئے۔ وہ بھی خدائے واحد لاشریک کی تعلیم دیتے تھے۔

۲۔ پیپا = جو ریاست گراؤں گڑھ کے راجا تھے۔ وہ بھی صوفیوں کی طرح ذات حق کو ہر چیز کی اصل سمجھتے اور گورو کے ذریعہ خدا تک رسائی کے قائل تھے۔

۳۔ سائیں = ایک حجام تھے جو راجا بھنڈار گڑھ کے دربار میں رہتے تھے اس جگہ کو آج کل ریوا کہتے ہیں۔ بعد میں وہ راجا کے روحانی پیشوا ہوئے۔

۴۔ رائیداس = کا تعلق شودر قوم سے تھا اور چمڑے کا کام کرتے تھے۔ ان کی جائے پیدائش بنارس ہے ان کے اصول وہی ہیں جو کبیر کے تھے اور ان کی طرح وہ بھی ریختہ کلام کہتے تھے بلکہ ان کے کلام میں اکثر فارسی اور صوفیانہ اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔

کبیر کے چیلے

کبیر کے بے شمار چیلے تھے جن کے ذریعے ان کی تعلیمات شمالی ہند اور دکن میں پھیل گئیں۔ ان کے روحانی سلسلے میں بارہ شاخیں تھیں اور ہر شاخ کا علیحدہ سربراہ تھا۔ کبیر کے مندرجہ ذیل چیلے (خلفاء) تھے۔

۱۔ سرت گوپال داس جن کا مرکز بنارس تھا۔

۲۔ گھر۔

۳- جگن ناتھ۔

۴- دوارکا۔

۵- بھگو داس جنھوں نے کبیر کی نظم بیجک کو مرتب کیا۔

۶- دھرنا داس جن کی نظموں میں کبیر ان کے سوالات کا جواب دیتے ہیں۔

۷- جیون داس جو ست نام فرقہ کے بانی ہیں۔

۸- کمال ابن کبیر کے مریدین زیادہ تر مغربی ہند میں رہتے تھے۔

۹- داد و دیال جو کبیر کے خلفاء میں سے سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ حلاج (روئی دھننا) کا کام کرتے تھے۔ ان کا وطن نریانہ (ماڑواڑ) ہے۔ ان کا کلام پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ وہ فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ ان کے چند فارسی اشعار یہ ہیں۔

بے مہر گمراہ غافل گشت خوردنی
بے دل بدکار عالم حیات مردنی

کل عالم یکے دیدم ارواح اخلاص
بدعمل بدکار دوئی پاک یاراں پاس

موجود خبر' معبود خبر' ارواح خبر
وجود مقام چہ چیز است دانی بجود

نوٹ فارسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمے میں اشعار کی حالت بگڑ گئی ہے اور مفہوم کم فہم ہو گیا ہے۔

داود دیال کے مندرجہ ذیل اقوال بالکل صوفیانہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں:

"جب نفس غالب آجاتا ہے تو تکبر' غصہ' خودی' دوئی'

جھوٹ، حرص، ضد، ابھر آتے ہیں اور نیکی ختم ہو جاتی ہے
ارواح کا مقام یہ ہے کہ جب محبت، عبادت، اطاعت،
وحدت، تزکیہ، رحم، مہر، حق اور نیکو خوئی جمع ہو جاتے ہیں تو
آدمی راہ راست پر آجاتا ہے"۔

یہ صوفیاء کرام کی اصطلاحات تزکیۂ نفس اور تصفیہ قلب کے سوا اور کیا ہے۔ ایک جگہ پر تو وہ صاف صوفیانہ انداز میں کہتے ہیں کہ "میں نے صاف بتا دیا کہ مجھے کیا مقام حاصل ہے۔ "پیر" کے ذریعے "مرید" کو "محبوب" کا راستہ ملتا ہے۔"

ایک مقام پر وہ کہتے ہیں کہ :

"دوست کی طلب دادو کے قلب میں ہے اور وضو کر کے وہ "اللہ پاک" کے سامنے نماز پڑھتا ہے۔" دادو کا جسم "مسجد" ہے جہاں وہ "جماعت" کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے۔ امام کے پیچھے وہ خدا جس کی تعریف الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی کے سامنے ہے اور دادو "رکوع و سجود" کرتا ہے۔ دادو کا پورا جسم "تسبیح" ہے جس پر وہ "کریم کریم" پکارتا ہے۔ وہ اکیلا ہے اور اس کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں "کلمہ خود آپ ہے" دادو مکمل توجہ کی بدولت اللہ کی طرف پرواز کرتا ہے جس کے لئے "مکمل توجہ" کی ضرورت ہے۔ پھر وہ عرش سے بھی اوپر چلا جاتا ہے وہ عرش جہاں "رحمٰن" رہتا ہے (یہ قرآن کی آیت الرحمٰن علی العرش استویٰ کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے)
خط کشیدہ الفاظ دادو کے اپنے ہیں۔

نوٹ: اس عبارت سے ظاہر ہے کہ وہ وضو بھی کرتے تھے اور نماز بھی

پڑھتے تھے۔ آگے چل کر ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں :

" اپنے بزرگوں کی نسبت دادو دیال کو تصوف کا زیادہ علم حاصل تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ کبیر کے فرزند کمال کے مرید تھے جن کے تمام تر اقوال و افعال صوفیانہ تھے۔ کمال پر مغربی ہندوستان یعنی اجمیر' احمد آباد کے صوفیاء کا گہرا اثر ہوا"

ایک نظم میں دادو دیال کہتے ہیں :

"یا الٰہی تم رحمٰن بھی ہو رحیم بھی اور کریم بھی (خط کشیدہ الفاظ اس کے اپنے ہیں)

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ :

"دادو تناسخ کے خلاف تھے وہ کہتے ہیں کہ زندگی کا مکمل چکر ایک ہی جنم میں طے ہوتا ہے"

کلہا اور ملک داس

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ : " دادو دیال کا چیلہ (خلیفہ) کلہا تھا اور کلہا کا خلیفہ ملک داس تھا۔ انہوں نے بھی دادو کا مسلک اختیار کیا"۔ ایک مقام پر ملک داس لکھتے ہیں کہ : "وہ شخص جو پانچ عناصر کی حد سے باہر نکل جاتا ہے خدا کا محبوب بن جاتا ہے۔ وہ شخص جو پیاسے کو پانی پلاتا ہے۔ اس کا یہ کام محمدؐ کے نزدیک بڑی عبادت ہے"

سندر داس

دادو دیال کے ایک اور نائب سندر داس ہیں۔ آپ سال ۱۵۹۶ء میں جے

پور کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے فتح پور سیکری میں اقامت اختیار کی اور صوفی شاعر نواب الف خان اور ان کے بیٹے دولت خان اور صابر خان کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔ ان کا انتقال ۱۶۸۹ء میں ہوا۔ وہ سنسکرت کے بڑے سکالر تھے اور فارسی بھی جانتے تھے۔ ان کا مسلک بھی کبیر کا مسلک تھا۔

وریر بھان

داود دیال کے ہمعصر ایک فقیر وریر بھان تھے جو سادھو اور ستنامی فرقے کے بانی ہیں وہ رائے داس کے شاگرد تھے اور ان کا مسلک بھی تصوف تھا۔ وہ گرو (مرشد) کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اس کو "مالک کا حکم" قرار دیتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کا مجموعہ ایک کتاب ہے جس کا نام پوتھی ہے جو روزانہ جملہ گار (جماعت) کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ ان کی تعلیمات کا علاقہ دہلی' رہتک' آگرہ' فرخ آباد' مرزا پور اور جے پور تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر تارا چند نے اپنی کتاب میں ان کے "دس حکموں" کی تفصیل لکھی ہے جو اسلام اور تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

لال داس اور بابا لال

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ یہ دو فقیر سترہویں صدی عیسوی میں مشہور ہوئے لال داس کا مرکز الور تھا جو میو قوم کا علاقہ ہے۔ اس کی تعلیمات وہی ہیں جو کبیر کی تھیں۔

بابا لال جہانگیر کے عہد حکومت میں مالوہ کے علاقے میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے گرو چیتن داس کے ہمراہ لاہور گئے اور سرہند کے قریب دھیان پور میں مقیم ہو گئے۔ دارا شکوہ بابا لال کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس کی صحبت سے متاثر ہو

کر دارا شکوہ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام نادر النکات ہے۔ جب دارا شکوہ نے بابا لال سے پوچھا کہ آپ کا مذہب کیا ہے تو انہوں نے خواجہ حافظ شیرازی کا ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ ہے "تمام مذاہب کا مقصد ایک ہے۔ سب ایک ہی محبوب کے طالب ہیں' ساری دنیا عاشقوں سے بھرپور ہے کیا مسجد کیا مندر"

آگے چل کر ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ لال داس اور بابا لال کے علاوہ اور درویش بھی پیدا ہوئے جن کا مقصد ہندو مسلم اتحاد تھا۔ انہوں نے تمام ہندوانہ عقائد ترک کر دیئے تھے اور دن میں پانچ وقت عبادت کرتے تھے۔ خدا اور محمدؐ کا نام ان کی زبان پر رہتا تھا اور وہ اکثر جبرائیل' میکائیل' عزرائیل اور محمدؐ کے ناموں کا ورد رکھتے تھے۔ وہ مردوں کو جلانے کی بجائے دفن کرتے تھے اور اپنے آپ کو درویش کہتے تھے۔ وہ اکثر بھیک مانگتے تھے اور جو کچھ جمع کرتے غرباء اور مساکین میں تقسیم کرتے تھے۔

دھرنا داس اور پران ناتھ

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ سترہویں صدی عیسوی کے آخر میں دھرنا داس اور پران ناتھ آئے ان کے سلسلے کے لوگ آج تک سارے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کے چند اصول یہ ہیں۔

"چراغ انسان کے جسم میں ہے جو نہ بتی کا محتاج ہے نہ تیل کا"

یہ قرآنی آیت اللہ نور السمٰوات والارض کا ترجمہ ہے جس میں آگے چل کر یہ لکھا ہے کہ انسان کے اندر ایک طاق ہے اس طاق کے اندر ایک شیشہ ہے جس میں چراغ ہے جو مشرقی ہے نہ غربی ہے جس کو نہ تیل کی ضرورت ہے نہ بتی کی۔ ڈاکٹر تارا چند نے اس فرقے کا ایک اور قول یہ نقل کیا ہے۔

"اے دھنی! جسم تخت ہے اور اس پر سلطان بیٹھا ہے"۔

یہ بھی مندرجہ ذیل حدیث کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے۔

قلب المومن عرش اللّٰہ تعالیٰ (مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے)

پران ناتھ

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ :

"پران ناتھ دھرنی فرقہ کے بانی ہیں۔ ان کا مسلک بھی وہی تھا جو کبیر کا تھا۔ وہ علوم اسلامیہ سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "قلزم سروپ" ہے اس کتاب میں وہ قرآنی آیات اور وید نقل کرتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے بت پرستی بند کرو' ذات پات ختم کرو' برہمنوں کی پیروی چھوڑ دو' انہوں نے ایک اور کتاب بھی لکھی جس کا نام ہے "قیامت نامہ" وہ کہتے ہیں :

"امت کے پاس جا کر کہو کہ قیامت قائم ہو چکی ہے۔ میں یہ قرآن کی خبر دے رہا ہوں"

وہ کہتے ہیں کہ :

"پہلے عیسیٰ علیہ السلام آئے' ان کے بعد محمدؐ آئے اور محمدؐ کے بعد امام ہیں"۔

"دونوں جہانوں میں تہلکہ مچ گیا اور کاسہ کنده اور شریعت کا قانون مسلط ہو گیا جس میں حقیقت اور معرفت کا راستہ ظاہر ہوا" (زیر خط الفاظ ان کے اپنے ہیں)

اٹھارویں صدی کے فقیر

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں مندرجہ ذیل فقیر ہو

گزرے ہیں : جگ جیون' بلا صاحب' کیسارا' چندر داس ' سہجوبائی' دیا بائی' غریب داس' شونرائن اور رام صاحبی۔

جگ جیون کا قول ہے :

" فکر چھوڑ کر ذکر میں مشغول ہو جاؤ" (خط کشیدہ الفاظ ان کے اپنے ہیں)۔ یہ ایک حدیث نبوی کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے۔

بُلاّ صاحب

ان کا اصلی نام بلاقی رام ہے۔ وہ یاری صاحب کے شاگرد ہیں جو مسلمان ولی اللہ تھے۔

چندر داس

چندر داس میوات میں ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے ان کی تعلیمات وہی ہیں جو کبیر کی ہیں۔

غریب داس

غریب داس ۱۷۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۷۸ء میں فوت ہوئے۔ وہ رہتک کے رہنے والے تھے وہ بھی کبیر کے مسلک پر تھے اور قوم کے جاٹ تھے غریب داس کا ایک قول یہ ہے :

"اے صاحب ! میری دعا کو اپنے عرش پر سنو۔ آپ میرے پدر ہیں اور میری مادر ہیں' آپ کریم ہیں مجھے اپنا دیدار کرائیو۔"

رام چرن

رام چرن ایک فرقے کے بانی ہیں۔ جس کا نام رام سانجی ہے۔ آپ جے پور کے قریب ۱۷۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کی

عبادت کے طریقے مسلمانوں کی طرح کے تھے اور دن میں پانچ وقت عبادت کرتے تھے۔

انیسویں صدی کے فقیر

ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ انیسویں صدی میں یہ فقیر آئے۔

سوھا جانند' دولنداس' گلال' بھیکا اور پالتو داس یہ سب کبیر کا مسلک رکھتے تھے

آگے چل کر ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ :

" اس سے ظاہر ہے ہندو ازم نے کس قدر اسلامی اثرات قبول کئے اور کس طرح اسلام کے اثر سے ہندو دھرم میں بت پرستی' ذات پات کا خاتمہ ہوا اور عبادت میں خلوص پیدا ہوا' استاد (مرشد) کو اہمیت حاصل ہوئی۔ مشکلات کا ازالہ ہوا' یہاں تک کہ تلسی داس اور سورداس جو راما نند کے پیروکار تھے کی تعلیمات میں اسلامی اثر سب سے زیادہ نظر آتا ہے۔ ہندو فقیر تکا رام کا قول یہ ہے "اے دوست ! اللہ کا ذکر کرو سب سے بڑا نام اللہ ہے' اسے مت بھولنا"۔ (خط کشیدہ الفاظ ان کے اپنے ہیں) ۔

ایک جگہ پر تکا رام کہتے ہیں :

"اللہ ایک ہے نبی ایک ہے بھول نہ جانا"

عیسائی ارباب روحانیت پر اسلامی تصوف کے اثرات

اب ہم مستشرقین کے خصوصی الزامات کا جائزہ لے کر قارئین کرام کے

سامنے ان الزامات کے وہ جوابات پیش کرتے ہیں جو خود منصف مزاج اور اعتدال پسند مستشرقین نے دیئے ہیں۔

رچرڈ ہارٹ مین کے عائد کردہ الزام

Richard Hertman نے اپنی کتاب
Al Qushairis Dastellung Des Sufilmus میں لکھا ہے۔

"چونکہ ابو علی سندیؒ مشہور صوفی بزرگ بایزید بسطامیؒ کے استاد تھے اس سے قطعی اور بین طور پر ثابت ہوا کہ تصوف کی اصل ہندو مذہب ہے؟"

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا بڑا عالم فاضل اور اس قسم کا بودا استدلال کہ چونکہ شیخ بایزیدؒ کے استاد ابو علی سندیؒ تھے۔ اس لئے تصوف ہندو مذہب کی پیداوار ہے۔ کیا تمام مسلمان جو برصغیر ہند و پاکستان میں رہے ہیں یا رہتے ہیں ہندو مذہب کے مرہون منت ہیں۔ اگر ہارٹ مین صاحب نے تاریخ اسلام کے ورق الٹانے کی زحمت گوارا کی ہوتی تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ برصغیر کے علماء مشائخ نے ہندوؤں کے ساتھ کفر و اسلام کی کتنی جنگیں لڑی ہیں خاص طور پر برصغیر کے صوفیاء کرام نے ہندو جوگیوں اور روحانی پیشواؤں کو نیچا دکھا کر ہزاروں لاکھوں ہندوؤں کو نور اسلام سے مشرف کیا۔ لیکن ساری تاریخ اسلام پر پانی پھیر کر ہارٹ مین صاحب کو صرف یہی کمزور ترین شہادت کا سہارا ملا ہے کہ چونکہ ابو علیؒ سندھ کے باشندہ تھے اس لئے ساری اسلامی دنیا یعنی عرب' ترکستان' افریقہ' چین ہر جگہ کے صوفیاء پر صرف ایک صوفی بایزید بسطامیؒ چھا گئے اور سب پر ابو علی سندیؒ کا مسلک مسلط کر دیا۔ کیا ہم فاضل مصنف سے پوچھ سکتے ہیں کہ بایزید بسطامیؒ سے پہلے جو صوفیاء کرام ہو گزرے ہیں ان پر ابو علی سندی اور بایزید بسطامیؒ کے اثرات کیسے چھا گئے اور انہوں نے کس طرح تصوف کا مسلک اختیار کر لیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی دنیا اور اسلامی تاریخ میں کہیں حضرت بایزید بسطامیؒ کے شیخ ابو علی سندھیؒ کا نام نہیں ملتا۔ معلوم نہیں جرمنی کے ہارٹ مین صاحب نے یہ بات کہاں سے حاصل کی۔ تاریخِ اسلام تو یہ کہتی ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کو حضرت امام جعفر صادقؓ کی روحانیت سے فیض حاصل ہوا ہے۔

انگلستان کے نامور مصنف اور مستشرق اعتدال پسند پروفیسر آربری نے بھی اسی بات پر ہارٹ مین کو چیلنج کیا ہے اور اپنی کتاب مقدمہ تاریخِ تصوف میں لکھا ہے :

> " معلوم نہیں کس وجہ سے ہارٹ مین نے یہ سمجھ لیا کہ "نسبت" سندی کا مرجع ہندوستان کا صوبہ سندھ ہے۔ اس سے زیادہ قرین قیاس تو یہ بات ہے کہ سند ایک بستی کا نام ہے جو بسطام کے قریب ہے اور ابی ورد سے زیادہ دور نہیں ہے جیسا کہ "یاقوت ماجم البلدان" کی جلد پانچ ص ۱۵۲ میں درج ہے۔ چونکہ سند اور بسطام دونوں گاؤں ایک دوسرے کے قریب صوبہ خراسان میں واقع ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ بایزید ساکن بسطام نے ابو علی ساکن سند سے سبق حاصل کیے ہوں"

ہارٹ مین کے دیگر الزامات

ہارٹ مین نے تصوف کے خلاف دیگر الزامات یہ لگائے ہیں کہ تصوف کی اصل زرتشت ہے۔ یہودی قبالہ ہے' عیسائی مسٹی سزم ہے اور نوافلا طونیت ہے۔ دیکھئے ایک ہی سانس میں انہوں نے تصوف کے کتنے باپ گنوا دیئے ہیں۔ کیا یہ تضاد بیانی نہیں ہے اور کیا ان کا ایک نظریہ Theory دوسرے نظریات کو

خود بخود ختم نہیں کر دیتا۔ افسوس ہے کہ اپنی تضاد بیانی Self Contradication کو فاضل مصنف نے محسوس نہ کیا۔

ہارٹ مین کے اس الزام کے متعلق پروفیسر آربری کتاب مذکور میں لکھتے ہیں کہ :

" یہ دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اول تو یہ تمام نظریات ایک دوسرے کی نفی کرنے والے یعنی *Hetrogeneous* ہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ان متضاد نظریات کو کیسے یکجا کیا جا سکتا ہے اور کیسے اس چوں چوں کے مربے کو تصوف کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب ہارٹ مین یہ دیتے ہیں کہ اس کام کے ذمہ دار جنید بغدادیؒ ہیں۔ لہٰذا ہارٹ کا مقصد یہ ہے کہ اب ان تمام شواہد کو جمع کر کے تجزیہ کیا جائے۔ ممکن ہے کہ شاید ہمیں تصوف کی اصل کا کوئی ثبوت مہیا ہو سکے"

کمال ہے ہارٹ مین کی منطق کا ایک طرف تو وہ "قطعی اور بین طور" پر ثابت کر چکے ہیں کہ تصوف کی اصل ہندو مت ہے۔ دوسری طرف یہ بات کھڑی کر دی کہ تصوف کی اصل یہودی قبالہ ہے اور زرتشت ہے اور عیسائی مسٹی سزم' اور نوافلاطونیت *Neoplatonism* ہے۔ اب تیسری بات کہہ کر انہوں نے اپنی تمام باتوں پر پانی پھیر دیا ہے یعنی اب وہ یہ کہتے ہیں کہ اب ہم تمام یورپین سکالروں کو مل کر اس بات کا کھوج لگانا چاہئے کہ تصوف کی اصل کیا ہے۔ سبحان اللہ ! کیسی منطق ہے اور کیسا استدلال ہے ایک طرف تو "قطعی اور بین طور" پر فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ تصوف کی اصل ہندو ازم ہے' اس کے بعد پھر شک میں پڑ جاتے ہیں اور یہودی قبالہ' زرتشت' عیسائی مسٹی سزم اور نوافلاطونیت کو

تصوف کا ماٰخذ قرار دیتے ہیں اور آخر میں یہ قلابازی کھاتے ہیں کہ ان تمام نظریات کو جمع کر کے تجزیہ کرنے اور تصوف کی اصل معلوم کرنے کی ضرورت بھی باقی ہے۔ فاضل مصنف کی یہ منطق تو ہمارے ایشیائی دماغ ہرگز قبول نہیں کر سکتے اور نہ ہی ڈاکٹر آربری جیسے یورپی دماغ نے قبول کی ہے۔

مسٹر ہارٹ مین کو تاریخ تصوف میں یہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوئی کہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ جن کو وہ دنیا کی تمام روحانی تحریکوں یعنی زرتشت' یہودی قبالہ' عیسائی مسٹی سزم اور نوافلاطونیت کا مرہون منت قرار دیتے ہیں کون تھے اور ان کا سلسلہ طریقت کیا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ عرب تھے اور ان کی رگوں میں ایرانی خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے ماموں حضرت شیخ سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید و خلیفہ تھے' جو حضرت شیخ معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید و خلیفہ تھے' وہ داوَد طائیؒ کے' وہ حبیب عجمیؒ کے وہ خواجہ حسن بصریؒ کے اور آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اور آپ سرور کائنات فخر موجودات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت شیخ جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ شریعت اسلامیہ کے اس سختی سے پابند تھے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ساری عمر میں مجھ سے شریعت کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ترک نہ ہوئی۔ ایک دفعہ ان کے ایک رشتہ دار نے جو سرکاری ملازم تھے۔ آپ کی خدمت میں کچھ کھانا بھیجا جو آپ نے اس لئے تناول نہ فرمایا کہ یہ سرکاری خزانے کا مال ہے اور اس کی حلت یا حرمت مشتبہ ہے۔ اس لئے انہوں نے وہ کھانا دریا میں پھینک دیا اور پھر ساری عمر اس دریا کی مچھلی نہ کھائی۔ اس خیال سے کہ دریا کہ مچھلیوں نے وہ مشکوک غذا کھائی ہوگی۔ اسی طرح بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کی پابندئ شریعت کا یہ حال تھا کہ

انہوں نے ساری عمر خربوزہ نہ کھایا کیونکہ ان کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خربوزہ کس طرح کاٹا اور کس طرح کھایا ہو گا اور ممکن ہے کہ کسی دوسرے طریقے سے خربوزہ کھانے سے وہ خلاف سنت عمل کر بیٹھیں۔ پھر بھی اس قدر متباعانِ اسلام اور محبانِ شریعت پر اہل مغرب یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے دوسرے مذاہب کے کافرانہ اور مشرکانہ نظریات کو اپنایا۔ کس قدر ظلم، اندھیر اور غضب، جہالت اور تعصب ہے۔

ولیم جونز کے الزامات

ولیم جونز William Jones ایک اور مستشرق ہیں جو تصوف کو ہندو ویدانیت کا مرہون منت قرار دیتے ہیں اس وجہ سے کہ دونوں میں مشابہت بہت ہے۔ پروفیسر آربری اس اعتراض کا یوں جواب دیتے ہیں :

"لیکن ولیم جونز کی قیاس آرائی کی بنیاد ایرانی شعراء کا کلام ہے۔ ان کو اصل عربی دستاویزوں کے مطالعہ کا موقعہ ہی نہیں ملا جن کے تجزیہ کی اشد ضرورت ہے تاکہ تصوف کی اصل پر مزید روشنی پڑ سکے۔"

جان میلکم کے الزامات

جان میلکم John Malcolm کا شمار ان مستشرقین میں ہوتا ہے جو ہندو ازم کو تصوف کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ ان کے متعلق پروفیسر آربری لکھتے ہیں :

"سر جان میلکم نے اپنی کتاب تاریخ فارس History Of Persia میں تصوف کے بنیادی اصولوں پر طویل بحث کی ہے جو طویل غلط فہمیوں کا پلندہ ہے۔ میلکم کی ریسرچ کا ماخذ کیپٹن گراہام Graham کا وہ لیکچر ہے جو

انہوں نے ۱۸۱۱ء میں بمبئی کی ادبی سوسائٹی میں دیا۔ جہاں تک خود گراہام کی معلومات (مآخذ) کا تعلق ہے وہ ایسی کم مایہ اور کم پایہ ہیں کہ ان کی طرف ذرہ بھر التفات نہیں کیا جا سکتا ہے نیز میلکم نے جو صوفیاء کے سلاسل کی فہرست اور ان کے تمام اعداد و شمار دیئے ہیں وہ بھی بہت بے تکے ہیں"

تصوف پر ایرانی اثرات کے برعکس پروفیسر آربری کتاب مذکور میں یہ ثابت کرچکے ہیں ایران کے صوفی شعراء کے عارفانہ کلام کا یورپ پر گہرا اثر ہوا۔ وہ لکھتے ہیں :

" ایران کا عارفانہ کلام کافی مدت سے جرمنی پر اثر انداز ہو رہا تھا اور جرمنی کے نامور شاعر گوئٹے Goethe اس سے بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ فرانس میں وہاں کے مایہ ناز بزرگ سلوسٹر ڈے سیکی Silvester De Sacy پر بھی تصوف کا بڑا اثر ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے ۱۸۱۹ء میں شیخ فرید الدین عطارؒ کے پند نامہ کا متن اور ترجمہ شائع کیا۔"

تھالک کے الزامات

تھالک (Tholuck) کے متعلق پروفیسر آربری لکھتے ہیں کہ :

" میلکم کی تاریخ فارس کے بعد یورپ میں تصوف کے متعلق سب سے بڑی تصنیف ایف آر ڈی تھالک کی صوفیمس (Sufimius) ہے جو عصر حاضر کی صحافت کے معیار کی رو سے ایک معمولی چیز ہے۔ تھالک اپنے قارئین پر اپنی عظیم

ریسرچ اور لسانی قابلیت کا رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کام میں وہ ناکامی کا شکار ہو جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لئے ان کو جو مواد حاصل ہوا وہ بالکل ناکافی تھا۔ ان کے مواد کا زیادہ تر ذخیرہ ایران سے لیا گیا جو بہت ہی عامیانہ (Primitive) ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کا مطالعہ تک نہیں کیا۔ تھالک کو ان مشکلات کا سامنا ہوا جو ہر ریسرچ سکالر کو پیش آتی ہیں۔

ریسرچ کی شاہراہ کو چھوڑ کر وہ مختلف شکوک و شبہات کے چنگل میں پھنس گئے اور شروع میں یہ نظریہ قائم کیا کہ تصوف مشتق ہے لفظ صوف (اون) سے اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ پہلے میرا خیال یہ تھا کہ تصوف کا ماخذ مجوسی فلسفہ روحانیت ہے۔ لیکن اس نظریہ کا ان کو نہ کوئی ثبوت مل سکا اور نہ علمی دنیا میں اسے کسی نے قبول کیا۔ اس لئے اسے ترک کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تصوف کی اصل عربستان کی عزلت نشینی ہے۔ اس کے بعد حلاج کے نظریۂ توحید کے متعلق تھالک یہ ثابت کرتے ہیں کہ انا الحق جیسا بظاہر غیر شرع کلمہ بھی پیغمبر اسلام کی تعلیمات سے ثابت ہوتا ہے۔ اس بارے میں انہوں نے اس حدیث کا حوالہ دیا ہے۔ "لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی نبی المرسل و ملک المقرب" (بعض اوقات مجھے حق تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق ہوتا ہے جہاں نہ کسی نبی مرسل یا مقرب فرشتہ کی رسائی ہو سکتی ہے) آخر

میں تھالک قطعی طور پر یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ تصوف پیغمبر اسلام کی اپنی روحانیت کی پیداوار ہے"۔

تھالک کی یہ قلابازیاں دیکھ کر پروفیسر آربری لکھتے ہیں کہ :

"مختلف مذاہب کے روحانی نظریات میں مشابہت ایسا جال ہے کہ اس میں سب پھنس جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مشابہت کی بناء پر تصوف کی تاریخ مرتب کرنا بے کار ہے۔ ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ فی الحال ان تمام قیاس آرائیوں کو ختم کر کے کم از کم ایک نسل تک ہم سب کو اس بات پر متفق ہو جانا چاہئے کہ اگر تصوف کی تاریخ مرتب کرنا مطلوب ہے تو ہمیں تصوف سے متعلق اسلامی اور صرف اسلامی ذرائع اور وسائل پر بھروسہ کرنا ہو گا"۔

اس کتاب میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :

"براؤن کی ریسرچ اور ان کی تصوف کے متعلق گہری نظر کا مقابلہ آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ ان کی تمام تصانیف میں اسلامی تصوف کے ساتھ محبت اور گہری دلچسپی روح رواں کی طرح نظر آتی ہے۔ بالخصوص ان کی کتاب "فارس کی ادبی تاریخ" ریسرچ کے میدان میں ایسا شاہکار ہے کہ جس سے بڑھ کر کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے عالمانہ اور محققانہ انداز میں ثابت کیا ہے کہ تصوف کا فارسی شاعری پر کتنا بڑا اثر ہے"۔

آخر میں آربری اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "تصوف کی تاریخ مرتب کرنے کے قابل صرف وہ لوگ ہیں جو تصوف کی تعلیمات کو خلوص اور محبت کی نگاہ سے

دیکھتے ہیں"۔

عیسائی پادری میکڈانلڈ کا اعتراض اور اعتراف

انگلستان کے مشہور پادری ڈی بی میکڈانلڈ (D. B. Macdonald) بہت بڑے عیسائی مبلغ (Missionary) ہیں جو عرصہ دراز تک مصر وغیرہ میں عیسائیت کی تبلیغ میں مشغول رہے اور تصوف کا گہرا مطالعہ کیا اپنی اوائل عمر کی تصنیف (Religious Attitudes and Research in Islam) میں وہ تصوف کو عیسائی مسٹی سزم اور نوافلاطونیت (Neoplatonism) کا ممنون منت قرار دیتے ہیں لیکن بعد کی ریسرچ کے نتیجے میں اپنا یہ نظریہ ترک کر کے اپنی کتاب Aspects Of Islam میں لکھتے ہیں :

"اب مجھے تصوف کی اصل کے مطابق کچھ کہنا ہے اسلام کی ہر بات کی طرح تصوف کا تخم محمدؐ کے دل میں تھا۔ میرے نزدیک محمدؐ کی عظمت کا ثبوت اسلام کی عظمت ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر تصوف کی ہر چیز موجود ہے۔ قرآن میں ایسی عبارات بھی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ محمدؐ پکے صوفی تھے۔ جو حقیقت کے بحر بے کراں میں بغیر کسی ظاہری راہ دکھانے والے اور نشان دہی کرنے کے آسانی سے سفر کر رہے تھے۔ قرآن میں ایسے الفاظ بھی موجود ہیں کہ جن سے وحدت الوجود کی تائید ہوتی ہے"۔

میکس ہوڑٹن کے الزامات

میکس ہوڑٹن (Max Horten) کا شمار ان مستشرقین میں ہوتا ہے جو

نظریہ ہندو اثرات کے قائل ہیں۔ لیکن پروفیسر آربری جیسے سخت گیر ریسرچ سکالر ان کی یوں خبر لیتے ہیں :

" ہوڑٹن سے زیادہ کسی سکالر نے تصوف پر ہندو اثرات کا نظریۂ ثابت کرنے میں زور نہیں لگایا لیکن ان کے استدلال اور یک طرفہ فیصلوں کو کسی نے قبول نہیں کیا۔ جب میکس ہوڑٹن لکھتے ہیں کہ منصور حلاج برہمن انداز فکر کا مالک تھا ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ آیا انہوں نے حلاج کے متعلق پروفیسر ماسینوں (Massignon) اور ڈاکٹر نکلسن کی رائے کا بھی کبھی مطالعہ کیا جنہوں نے ثابت کیا ہے کہ حلاج ایک سچا مؤحد تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہوڑٹن کی تصانیف کا مقصد کھلم کھلا اکابر اسلام پر کیچڑ اچھالنے کے سوا کچھ نہیں"۔

آسن پلے سیوس کے الزامات

مائیگل آسن پلے سیوس (Migul Asin Placios) سپین (اندلس) کے ایک مشہور مصنف ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ تصوف عیسائیت کا ممنون منت ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کی پینتالیس ایسی آیات جمع کی ہیں جن کا مطلب انجیل کی پینتالیس عبارتوں سے ملتا جلتا ہے اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خود قرآن انجیل سے ماخوذ ہے۔ پروفیسر آربری نے اپنی کتاب مذکور میں اس کی یوں تردید کی ہے :

" قرآن خود صاف طور پر بیان کرتا ہے کہ جو وحی محمدؐ پر نازل ہوئی وہ تصدیق کرتی ہے اس وحی کی جو آپ سے پہلے انبیاء پر نازل ہوئی (۳:۸۵–۹۱' ۳:۸۰ وغیرہ) اس لئے اگر اسلامی

تعلیمات اور عیسائی تعلیمات میں کوئی مشابہت نہ ہوتی تو الٹا
یہ حیرانی کی بات ہوتی اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں مذاہب
کے قوانین اور روحانی اصولوں میں کافی یکسانیت ہے۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ حقیقت ایک اور غیر منقسم ہے۔ لہٰذا بلند
روحانی مقامات پر یکسانیت کا ہونا ناگزیر تھا۔ انصاف کی بات
کرنا علم و ادب کا بہترین اصول ہے لیکن مجھے افسوس سے
کہنا پڑتا ہے کہ ایک بھی غیر مسلم سکالر نے اس پر عمل نہیں
کیا اور ہر شخص نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ
اسلام میں جو بھی اچھائی ہے وہ دوسرے مذاہب سے حاصل
کی گئی ہے۔ یہ دیانتدارانہ ثقافت نہیں ہے بلکہ بدترین قسم کا
مذہبی تعصب ہے ہر چیز کی اچھائی ثابت کرنے کا بہترین
طریقہ یہ ہے کہ اسے منطق کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ آیئے
ہم پلے سیوس کے بیانات کی اسی انداز سے تنقید کرتے ہیں۔"

اس کے بعد پروفیسر آربری ایک طویل بحث کے ذریعے پلے سیوس کے
الزامات کا جواب دیتے ہیں جن کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس کتاب میں آربری نے
یہ بھی لکھا ہے کہ پلے سیوس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے اسلام اینڈ
ڈیوائن کامیڈی اس کتاب میں انہوں نے بین دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اٹلی
کے مایہ ناز شاعر ڈانٹے (Dante) کی مشہور تصنیف کامیڈیا ڈیوائنا
(Comedia Devina) میں سپین کے صوفی بزرگ ابن عربی کی کتاب فتوحات
مکیہ کی نقل لگائی گئی ہے۔ اس سے اگرچہ اٹلی کے ادبی حلقوں میں کافی شور و غل
برپا ہوا لیکن کسی سے اس کی تردید نہیں ہو سکی۔ اس پر آربری کہتے ہیں کہ یہ

کتاب لکھ کر آسن پلے سیوس نے اپنی آپ تردید کی ہے کہ کیونکہ ایک طرف تو ان کا خیال یہ ہے کہ صوفیائے اسلام عیسائیوں سے متأثر ہوئے اور کتاب مذکور میں ثابت یہ کرتے ہیں کہ عیسائی ارباب روحانیت نے مسلم صوفیاء سے بہت بڑی حد تک اثرات قبول کیے ہیں۔ آربری کے اپنے الفاظ یہ ہیں :

" لیکن اپنی کتاب ڈیوائین کامیڈی میں پلے سیوس اپنے آپ کو الٹے گیئر (Reverse Gear) میں ڈال کر ثابت یہ کر بیٹھے کہ ابن عربی جیسے مسلم صوفیاء کا ڈانٹے پر گہرا اثر ہوا ...... یہ کہنے سننے کے بعد جو حقیقت باقی رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ابن عربی جیسے بلند ترین اسلامی جوہر' پر ہماری ریسرچ تا حال الف با تک محدود ہے۔ ابن عربی کی مثال ایک عظیم الشان پہاڑ کی ہے کہ جس کی چوٹی اب تک کسی سے سر نہیں ہو سکی۔ حتیٰ کہ یہ بھی کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اس چوٹی کے گرد کا علاقہ کیسا ہے اور وہاں تک رسائی کا راستہ کیا ہے۔ ہمیں تو آج تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ابن عربی کے علوم' حقائق و معارف کے چشمے کہاں پھوٹتے ہیں کہ جن سے ایک عظیم الشان دریا نے نکل کر اسلام اور عیسائی سرزمین کو برابر سرسبز و شاداب کر دیا ...... اس سے ظاہر ہے کہ مستشرقین کی تصانیف میں جو فیصلے صادر کیے گئے ہیں ان سے کوئی مفید مطلب نہیں نکل سکتا"

آسن پلے سیوس کی کتاب اسلام اینڈ ڈیوائین کامیڈی کے متعلق آربری نے مزید کہا ہے کہ :

" فاضل مصنف آسن پلے سیوس نے اپنی کتاب اسلام اینڈ

ڈیوائین کامیڈی میں عظیم الشان شواہد سے ثابت کیا ہے کہ ڈانٹے اسلامی اصطلاحات سے بخوبی واقف تھے اور انہوں نے اپنی طویل نظم میں اگلے جہان کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کے لئے وہ ہسپانیہ کے عظیم صوفی ابن عربی کا مرہون منت ہے۔ یہ ایک منفرد مثال ہے' اسلامی دنیا کے اس عظیم الشان تہذیب و تمدن کے دریا کی جو یورپ کی طرف بہہ رہا تھا۔ مثلاً سپین کے روحانی شاعر (Mystic) سینٹ جان آف دی کراس کا کلام پڑھنے کے بعد ممکن ہی نہیں کہ ہم اس نتیجے پر نہ پہنچیں کہ یہ سب سپین کے مسلم صوفیاء کا اثر ہے جہاں تک کٹلان ریمانڈ لولی (Catalan Remond Lully) کا تعلق ہے اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ انہوں نے مسلم صوفیاء سے گہرے اثرات قبول کئے کیونکہ وہ عربی زبان اچھی طرح جانتے تھے اور انہوں نے روم میں علوم اسلامیہ کی ایک درس گاہ قائم کر رکھی تھی"

ڈاکٹر نکلسن کا اعتراف

اسلامی اثرات کے موضوع پر ڈاکٹر نکلسن Nicholson لکھتے ہیں :

" روحانی سائیکالوجی اور روحانی بلندیوں کے متعلق اب بھی اہل مغرب اسلام سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ عیسائی یورپ نے تہذیب و تمدن کے میدان میں اسلام سے کتنا بڑا قرض حاصل کیا اس کی تفصیل معلوم کرنے میں ہم تاحال قاصر رہے ہیں۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرض بہت بڑا تھا۔

ہم لوگ یہ خیال بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارے اکابر مثل تھامس ایکوئی ناس (Thomas Acquinas) ایکہارٹ (Eckhart) اور ڈانٹے (Dante) اسلامی اثرات سے محروم رہے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روحانیت وہ علاقہ ہے کہ جہاں اسلامی تصوف اور عیسائی روحانیت کا گہرا میلاپ ہوا اگرچہ ہماری ریسرچ اب تک نامکمل ہے۔ پھر بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسلام کی فتاویٰ تحریک کا قرون وسطیٰ میں یورپ کی گلڈ تحریک پر گہرا اثر ہوا۔"

آگے چل کر نکلسن اپنی کتاب Idea of Personality of God میں لکھتے ہیں :

"یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ تصوف کی اصل قرآن اور سنت ہے اور جب تک ہم اسے اس کے اصلی مآخذ (قرآن و سنت) کی روشنی میں نہ دیکھیں اسے سمجھنے سے قاصر ہیں اب میں ایک اور بات کہتا ہوں وہ بات جس کی بعض نے تردید کی ہے یا شک و شبہ سے دیکھا ہے وہ یہ کہ محمدؐ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کی وحی خدا کی سچی وحی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ساری اسلامی دنیا کا اس بات پر اتفاق ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حقیقت کے بغیر اسلامی تاریخ ہرگز اس قدر شاندار نہیں ہو سکتی تھی۔ لوگ خواہ کچھ کہیں قرآن میں بے شمار ایسی باتیں ہیں جو تصوف کی بنیاد ہیں"۔

اپنے شاگرد آربری کے خط کے جواب میں ڈاکٹر نکلسن نے حدیث نبویؐ اور تصوف کی شان میں جن جذبات کا اظہار کیا اس کا خلاصہ یہ ہے :

" سر عبداللہ سہروردی نے انڈیا اور انگلینڈ میں علمی و ادبی کارناموں کے ذریعے اسلامی زندگی اور اسلامی تہذیب و تمدن کو جس طرح زندہ کیا ہے اس سے مغربی دنیا میں صدیوں سے جو لاعلمی اور تعصب چلا آرہا تھا اب وہ دور ہو رہا ہے اور اسلام کی عظمت کا مہذب دنیا میں صحیح اندازہ ہونے لگا ہے خاص طور پر ان کا ترجمہ حدیث نبوی ہے جس کا نہ صرف روس کے ادیب ٹالسٹائے (Tolstoy) پر گہرا اثر ہوا ہے بلکہ میرے اپنے ہم وطن مفکرین کو بھی پیغمبر اسلام کی ان روحانی اور عملی زندگی کی بے بہا حکمتوں سے آگاہ کیا ہے جو رسول عربی کے متبعین کا مایہ ناز ورثہ ہے جو انہوں نے بطریق احسن جمع کیا اور باقی دنیا تک پہنچایا اور یہ ان حضرات کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج یہ ورثہ نبوی ساری دنیا کا مشترکہ سرمایہ بن گیا ہے صوفیاء کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت مجھ پر بھی منکشف ہو چکی ہے کہ قرآن و حدیث کی دوہری بنیاد Twin Foundation کے بغیر نہ تصوف کی یہ خوبصورت اور عالی شان عمارت تعمیر ہو سکتی تھی نہ قائم رہ سکتی تھی جس فقر کو پیغمبر اسلام نے اپنا فخر قرار دیا وہ دراصل روحانی فقر تھا جس کی وجہ سے آپ خدا کے سوا سب کچھ ترک کر سکتے تھے۔ اس فقر کا ظاہری نشان یہ تھا کہ آپ کو مادی دنیا سے کوئی رغبت نہ تھی"۔

ڈاکٹر نکلسن آگے چل کر لکھتے ہیں :

" بعض مصنفین نے تاریخ تصوف لکھنے کی ناکام کوشش کی

ہے لیکن کوئی اطمینان بخش نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کی وجہ معلوم کرنا مشکل نہیں۔ اب میں ایک قطعی بات کہتا ہوں وہ یہ کہ اس وقت تصوف کے متعلق ہم جزوی طور پر بھی کچھ نہیں لکھ سکتے کیونکہ بد قسمتی سے تصوف کی بنیادی کتابیں تا حال غیر مطبوعہ نسخوں کی صورت میں پڑی ہیں جن کے بغیر تصوف کا تنقیدی جائزہ ناممکن ہے ماسینوں (Massignon) کی کتاب لا پیشان ڈے الحلاج

(La Passion De Alhallaj) کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ جن دستاویز پر ان کا انحصار رہا ہے وہ اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی سکالر کے لئے اس وقت تصوف کے متعلق کوئی فیصلہ دنیا ناممکن ہے۔ اس لحاظ سے ماسیوں کا یہ کارنامہ ہمارے لئے ایک ٹسٹ کیس (Test Case) ہے"۔

لوئی ماسینوں کا اعتراف

فرانس کے فاضل مصنف ڈاکٹر لوئی ماسینوں Luis Massignon یورپ میں شیخ منصور حلاج (رحمتہ اللہ علیہ) پر سند (Authority) مانے جاتے ہیں ۔ ماسینوں نے جان بوجھ کر حلاج کو اپنی ریسرچ کا مضمون اس لئے بنایا ہے کہ حلاج ایک اختلافی (Controversial) شخصیت ہیں اور اکثر مستشرقین نے ان کی طرف جست لگا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وحدت الوجود کی وجہ سے وہ عیسائی مذہب کی طرف راغب ہو گئے تھے اور اسلام ترک کر دیا تھا اسلامی وحدت الوجود اور حلاج کی اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ حالانکہ غلبۂ استغراق میں بھی وہ قید خانہ کے اندر ہر

رات پانچ سو رکعت نفل ادا کرتے رہے جب کہ ان کو گرفتار کرنے والے خود کم سے کم فرائض اور سنن موکدہ پر اکتفا کرتے تھے۔ ماسینوں کی دیانت اور محققانہ کاوشوں کے متعلق پروفیسر آربری لکھتے ہیں :

" مستشرقین کے لئے یہ کہہ کر خاموش ہو جانا کافی نہیں کہ حلاج نے نظریہ فنا ہندوؤں کے فلسفہ "دھیان" اور "پتنجلی" سے اخذ کیا۔ یہ نظریہ قبول کرنے سے پہلے چند امور کا ثابت کرنا ضروری ہے ان میں سے زیادہ اہم یہ اصول ہے کہ آیا اس زمانے میں اسلام اور ہندو مذہب کے درمیان تبادلہ خیالات ممکن بھی تھا۔ ماسینوں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس اصول کے مطابق تصوف کی اصل کے متعلق تمام نظریات (Theories) پر ریسرچ کی ہے مثلاً تصوف پر ہندو اثرات کا نظریہ' عیسائی اثرات کا نظریہ' ایرانی اثرات اور نوافلاطینت کا نظریہ اور مجوسی اثرات کا نظریہ۔ اس تنقید' قطع و برید اور تعدیل کے بعد ماسینوں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ :

" اسلامی تصوف کی ابتداء قرآن ہے جو ہمیشہ پڑھا جاتا ہے جس پر ہمیشہ غور و خوض کیا جاتا ہے اور جس پر ہمیشہ مسلمانوں کا عمل رہا ہے قرآن سے تصوف کا نشوونما ہوا اور قرآن ہی تصوف کے تمام مقامات و منازل کا سرچشمہ ہے۔ یہاں تک کہ شطحیات (بظاہر غیر شرع اقوال مثل انا الحق وغیرہ) بھی قرآن سے ثابت کئے جا سکتے ہیں کہ جب صوفی ذات حق میں فنا ہو کر اپنی انا اور ذات حق کی انا میں فرق محسوس نہیں کرتا

اور صیغہ واحد متکلم استعمال کرتا ہے"۔

مارگریٹ سمتھ کا اعتراف

مارگریٹ سمتھ کا شمار بھی یورپ کے اہم سکالروں میں ہوتا ہے۔ یورپ میں وہ حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ پر اتھارٹی سمجھی جاتی ہیں۔ انہوں نے امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ پر بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "الغزالی" ہے۔ اس کتاب کے تیرہویں باب میں انہوں نے مسلم اور غیر مسلم ارباب روحانیت پر امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کے اثرات اور احسانات کا ذکر کیا ہے۔ یہاں ہم صرف ان بڑے بڑے غیر مسلم روحانی پیشواؤں کا ذکر کرتے ہیں جو مارگریٹ سمتھ کی تحقیق کے مطابق امام موصوف سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ کتاب مذکور کے صفحہ ۲۱۹ پر مارگریٹ سمتھ لکھتی ہیں :

> " قرون وسطیٰ کے یہودی فکر و فلسفہ پر بھی امام غزالی (رحمتہ اللہ علیہ) کا بہت بڑا اثر ہوا۔ کیونکہ ان کی اخلاقی تعلیمات اپنے معیار میں یہودی فکر و نظر کے بہت مشابہ تھیں۔ چنانچہ ان کی تصانیف سے یہودی حلقہ ہائے علم و ادب بہت متاثر ہوئے اور امام غزالی کی نہ صرف روحانی تعلیمات سے انہوں نے استفادہ کیا بلکہ ان کے فلسفیانہ نظریات کا بھی ان پر گہرا اثر ہوا جیسا کہ میمونا ئیڈس (Maimonides) وغیرہ نے بے حد اثرات قبول کئے۔ امام غزالی کی موت کے ایک سو سال کے اندر اندر امام غزالی کی تصانیف کے عبرانی اور لاطینی تراجم وجود میں آگئے مثلاً مشہور یہودی فاضل ابن داؤد (Avendeath) جو ٹولاڈو (Toledo) کا باشندہ تھا اور

۱۰۰۹ء سے ۱۱۶۵ء تک حین حیات میں رہا امام غزالی کی تعلیمات سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسلام قبول کر کے ڈومنک گنڈی سلوس (Dominic Gindisalvus) اور آرچ ڈیکن آف سیگوویہ (Archdeacan of Segovia) کی سعیت میں ان کی فلسفہ کی تصانیف کے لاطینی زبان میں تراجم کئے اسی طرح یہودی سکالر ابراہیم بن حسدائی (Hasadi Abraham Ibn) ساکن بار سلونہ (Barcelona) نے تیرھویں صدی عیسوی میں امام غزالی کی کتاب میزان العمل کا عبرانی زبان میں ترجمہ کیا۔ امام غزالی کی کتاب مشکوٰۃ الانوار بھی یہودی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی اور اسحاق الفاسی نے اس کا ترجمہ کیا جس کے اقتباسات سولھویں صدی کے ایک یہودی سکالر موسیٰ ابن حبیب (Moses Ibn Habib) ساکن لزبن نے اپنی تصانیف میں پیش کئے ہیں موسیٰ ابن حبیب خود بھی شاعر' ادیب اور فلسفی تھا"۔

آگے چل کر مارگریٹ سمتھ نے لکھا ہے کہ یہودی فلسفۂ روحانیت قبالہ کے دس نکات امام غزالیؒ کی کتاب المعارف العقلیہ میں موجود ہیں اور قبالہ کے تین مقامات عالم ناسوت' عالم مثال اور عالم علوی امام غزالیؒ کے عالم ملکوت' عالم جبروت اور عالم شہادت کی گونج ہیں۔ نیز یہودی روحانی کتاب زوھار بھی امام غزالیؒ کے فلسفۂ روحانیت سے بہت مشابہ ہے اور زوھار کی اصطلاحات "Nephesh" "Ruah" اور "Neshama" اور امام غزالیؒ کی اصطلاحات "روح" "نفس" اور "نسمہ" مندرجہ رسالہ لدنیہ سے متعلق ہیں۔

عیسائی ارباب روحانیت پر امام غزالیؒ کے اثرات

آگے چل کر ص ۲۱۹ پر مارگریٹ سمتھ امام غزالیؒ کی ان تعلیمات کا ذکر کرتی ہیں جن سے عیسائی روحانی پیشوا متاثر ہوئے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں :

" قرون وسطیٰ کے عیسائی ارباب روحانیت پر بھی امام غزالی کا گہرا اثر ہوا اور سب سے پہلے عیسائی فاضل یوحنا ابو الفرج بار جبرائس (Yuhanna Abulfarraj Barhebraeus) المعروف گریگوریس (Gregorious) ساکن ایشیا کوچک نے (تاریخ پیدائش ۱۲۲۶ء) امام غزالی کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا اور مسلم صوفیاء سے تربیت حاصل کر کے طرابلس میں سکونت اختیار کی۔ وہ عربی کے علاوہ قدیم شامی زبان (Syriac) اور فارسی بھی جانتا تھا اور بغداد میں رہنے کی وجہ سے امام غزالی کی تصانیف سے استفادہ کیا۔ بعد میں وہ یکے بعد دیگرے گیوبا (Guba) لکابہ (Lakaba) اور حلب (Allepo) کا بشپ ہوا۔ انہوں نے علم روحانیت پر دو کتابیں لکھیں۔ ایک کا نام (The Book of Dove) ہے اور دوسری کا نام (Ethikon) ہے اور دونوں امام غزالی کی تعلیمات سے لبریز ہیں۔ اس کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے امام غزالی کی کتب "میزان العمل" "احیاء العلوم" اور "کیمیائے سعادت" سے بھی گہرا اثر قبول کیا"۔

" لیکن امام غزالی کا اثر صرف مشرقی عیسائیت پر نہیں ہوا بلکہ مغربی ممالک اٹلی، سپین کے ارباب روحانیت

(Mystics) بھی بہت متاثر ہوئے اور بارہویں صدی سے عربوں کے اثرات زیادہ تر صلیبی جنگوں کے ذریعے مغربی دنیا میں پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں شاہ فریڈرک ثانی نے نیپلز (Neples) میں ایک یونیورسٹی قائم کی جہاں عربی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس کے اثرات پالرمو (Palermo) اور سالرمو (Salermo) تک پھیل گئے۔ یہاں تک کہ جب ایک سو تیس سال کے بعد سسلی میں اسلامی دور حکومت کے بعد عیسائی تسلط ہو گیا تب بھی عیسائی اربابِ روحانیت اسلامی کتابوں سے استفادہ کرتے رہے"۔

"اگرچہ ٹالوڈو پر ۱۰۸۵ء میں پھر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا پھر بھی یہ شہر اسلامی علوم کا مرکز رہا اور وہاں مشہور بشپ ریمانڈ Raymond نے عربی کتب کو اطالوی زبان میں تراجم کرانے کا ایک مرکز قائم کیا۔ اس کے علاوہ ٹالوڈو میں علوم اسلامیہ کا ایک اور مرکز بھی قائم ہو گیا۔ جس کے اثرات جنوبی یورپ سے گزر کر شمالی یورپ تک پھیل گئے تھے۔ ان تمام مراکز میں امام غزالی کی تعلیمات پیش پیش تھیں اور اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عیسائی علم الکلام اور عیسائی مسٹی سزم کو اسلامی تعلیمات سے جو کچھ حاصل ہوا اس میں امام غزالی کا بہت بڑا حصہ ہے"۔

آگے چل کر مارگریٹ سمتھ نے لکھا ہے کہ :

"امام غزالی کا سب سے زیادہ اثر یورپ کے روحانی پیشوا

سینٹ ایکوئی ناس (Thomas Acquiunas) پر ہوا جو ۱۲۲۵ء سے ۱۲۷۴ء تک زندہ رہے۔ جنھوں نے اپنی کتاب سُمہ تھیول (Summa Theol) میں مسلم اربابِ روحانیت سے فیض یاب ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ جن میں امام غزالی بھی شامل ہیں۔ سینٹ ایکوئی ناس کی اس کتاب میں جا بجا امام غزالی کی کتُب "احیاء العلوم" اور "کیمیائے سعادت" کے حوالہ جات ملتے ہیں ...... سینٹ ایکوئی ناس نظریۂ معرفت اور مشاہدۂ حق میں سب سے زیادہ فیض یاب صوفیائے اسلام اور بالخصوص امام غزالی سے ہوئے ہیں جن کے علم لدنیہ کا ان پر گہرا اثر ہوا۔ اپنی کتاب سُمہ تھیول میں سینٹ ایکوئی ناس جس مقام مشاہدہ اور فنا کا ذکر کرتے ہیں وہ لفظ بلفظ امام غزالی کا نظریہ ہے"۔

آگے چل کر ص ۲۲۳ پر مارگریٹ سمتھ لکھتی ہیں کہ :

"عیسائی اربابِ روحانیت میں سے ریمانڈ مارٹن پر بھی امام غزالی کا گہرا اثر ہوا ہے جس نے اپنی تصانیف میں امام غزالی کی کتب "مقاصد الفلاسفہ" "احیاء العلوم" اور "میزان العمل" کا ذکر کیا ہے"۔

کتاب مذکورہ میں مارگریٹ سمتھ نے لکھا ہے کہ :

"قرون وسطیٰ کے ایک اور روحانی پیشوا ڈانٹے الیگوری (Dante Aligeieri) ہیں جن کی تصانیف میں نہ صرف امام غزالی کے اثرات نمایاں ہیں بلکہ انہوں نے امام غزالی اور دیگر مسلم اربابِ روحانیت کے احسانات کا بھی اعتراف

کیا ہے۔ ان کی نظم (Paradiso) میں جو مراحل عروج
پائے جاتے ہیں وہ پیغمبر اسلام کے واقعہ معراج کے مطابق
ہیں۔"

کتاب کے ص ۲۲۵ پر مارگریٹ سمتھ لکھتی ہیں کہ :

"زمانۂ قریب میں جس عظیم شخصیت نے امام غزالی سے
اثرات قبول کئے وہ فرانس کے مشہور روحانی پیشوا (Blase
Pascal) بلائی پاسکل (۱۶۲۳ء تا ۱۶۶۲ء) ہیں جن کو ریمانڈ
مارٹن کی کتاب پوگی فیڈی (Pogi Fidie) کے ذریعے امام
غزالی کی تعلیمات حاصل ہوئیں ...... ذات باری تعالیٰ کے
ثبوت میں بھی پاسکل نے امام غزالی کے دلائل پیش کئے
ہیں"۔

مارگریٹ سمتھ نے اپنی مشہور تصنیف "الحارث المحاسبی" میں ثابت کیا ہے
کہ تصوف کا منبع و مصدر قرآن و حدیث نبوی ہے اور تصوف کے تمام ارکان مثل
زہد، عبادت، ورع، قناعت، صبر و شکر، فنا اور بقا وغیرہ کو قرآن و حدیث سے ثابت
کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک مقام پر وہ لکھتی ہیں کہ "حارث محاسبی کے تصوف
کا پہلا منبع قرآن ہے اور دوسرا سنت نبوی ہے جس کا نام شریعت ہے۔"

ولیم سٹوڈارڈ کا اعتراف

ولیم سٹوڈارڈ (William Stodard) کا شمار منصف مزاج اور اعتدال
پسند مصنفین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب صوفی ازم (SUFISM) میں
لکھا ہے کہ :

"اسلام کے بغیر کوئی تصوف نہیں ہے۔ تصوف اسلام کی

روح اور جان کی حیثیت رکھتا ہے روحانیت ہر مذہب کی جان اور بطون ہے۔ جسم کو جان سے جدا کرنا ایسا ظلم ہے کہ جس سے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ماضی قریب میں اسلامی تصوف کو مغربی دنیا میں جس قدر اس ظلم سے نقصان پہنچا ہے کسی اور چیز کو نہیں پہنچا۔ آج بعض لوگ کہتے ہیں کہ تصوف کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں گویا وہ لوگ ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ انسان روح کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ ہم یہ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ ایک عیسائی مسٹک (Mystic) عیسائی مذہب کے بغیر یا ایک صوفی اسلام کے بغیر وجود میں آسکتا ہے' اسلام کے بغیر تصوف ہرگز وجود میں نہیں آسکتا"۔

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :

" اسلام مجموعہ ہے ظاہر و باطن کا۔ ظاہر اور باطن کا آپس میں گہرا تعلق ہے اس تعلق کو ایک مثال سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے ظاہری حصے یعنی شریعت کو ایک دائرہ کے محیط اور اس کی حقیقت یا بطون کو اس دائرہ کے مرکز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور دائرہ کا قطر وہ راستہ ہے کہ جس کے ذریعے محیط یعنی شریعت سے ہو کر انسان مرکز یعنی حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ یعنی عمل سے یقین تک اور یقین سے مشاہدہ تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے شریعت یعنی اسلام کے ظاہری جسم کے بغیر حقیقت تک رسائی حاصل کرنا محال ہے"۔

آج کل کے مستشرقین کے احساس برتری Superiority Complex پر ضرب لگاتے ہوئے ولیم سٹوڈارڈ لکھتے ہیں :

" ایک متوسط یورپین جو دور حاضر کی پیداوار اور ذہنی شکنجے میں گرفتار ہے دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں ایک گونا فخریا احساس برتری میں مبتلا ہے۔ بعض لوگ شعوری یا لاشعوری طور پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ تہذیب حاضر عیسائی مذہب کا ظہور ہے اس لئے وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب باقی مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے۔ تقابلِ ادیان کے میدان میں اس سے بڑھ کر کوئی غلطی ممکن نہیں"۔

شریعت اور حقیقت کے باہمی تعلق کے متعلق ولیم سٹوڈارڈ مزید کہتے ہیں کہ "دراصل شریعت ظہور ہے حقیقت کا' یہی وجہ ہے کہ صوفیاء ہمیشہ شریعت کی حمایت میں کمربستہ رہے ہیں"۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت بایزید بسطامی (رحمتہ اللہ علیہ) نے ساری عمر خربوزہ اس خوف سے نہ کھایا کہ ممکن ہے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسی اور طرح سے اسے کاٹا اور تناول فرمایا ہو اور میں سنت رسول کی عدم پیروی کا مرتکب ہو جاؤں۔ شریعت اور تصوف کی ہم آہنگی کے متعلق ولیم سٹوڈارڈ مزید لکھتے ہیں کہ :

" مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تصوف شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ لوئی ماسینوں اور دوسرے دانشوروں نے ثابت کیا ہے تصوف کی ہر چیز اور صوفیاء کا ہر فعل قرآن پر مبنی ہے اور قرآن ہی پر

شریعت کا مدار ہے۔ اس سے ان تمام الزامات کی تردید ہوتی ہے کہ تصوف بیرونی اثرات کا ممنون ہے مثلاً نوافلاطونیت عیسائیت یا ہندو مذہب کا۔"

ولیم سٹوڈارڈ اس الزام کی بھی پرزور تردید کرتے ہیں کہ تصوف کے اندر ابن عربی کا وحدت الوجود عیسائی اور نوافلاطونی اثرات کا نتیجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :

" تصوف کا بنیادی اصول وحدت الوجود ہے جس سے مراد وجودِ حق ہے۔ حالانکہ وحدت الوجود کی اصل شہادہ (یا مشاہدہ) ہے جو لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم ہے کیونکہ لا الٰہ الا اللہ کا مطلب صرف یہ نہیں کہ سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ خدا کے سوا کوئی وجودِ حقیقی نہیں ہے۔ یاد رہے کہ خدا تعالیٰ کے اسمائے گرامی میں سے ایک نام حق بھی ہے جس کا مطلب ہے حقیقت یا سچائی (Reality or Truth) صوفیاء کا عقیدہ ہے کہ اضافی یا اعتباری وجود (وجود کائنات) کالعدم ہے اور جزو (Finite) کا بغیر کل (Infinite) کوئی وجود نہیں۔ اسلام میں انسان صرف قرآن کے ذریعے جو خدا کا کلام ہے یا پھر پیغمبر اسلام کے ذریعے حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے قرآن کا خلاصہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اس شہادت کے ذریعے انسان ایک تو خدا کی وحدانیت دوسرے نبی کی نبوت میں سے حصہ لے سکتا ہے"۔

ایچ - سی - ہاپولڈ کا اعتراف

ایچ - سی - ہاپولڈ (Happold) کا شمار مستشرقین میں نہیں بلکہ روحانی لوگوں میں ہوتا ہے وہ اپنی کتاب مسٹی سزم میں لکھتے ہیں کہ :

"اسلام جیسے سب سے زیادہ تنزیہی (Transcendental) مذہب کے اندر شاندار روحانی عروج کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اگرچہ صوفیائے اسلام کے مشاہدات عام طور پر وہی ہیں جو دوسرے مذاہب کے اربابِ روحانیت کے ہوتے ہیں لیکن صوفیاء میں چند ایسے خاص عناصر ہیں جو روحانیت کے طالب علم کے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ صوفی کے لئے ترک دنیا ضروری ہے لیکن صوفی کا ترک اور قسم کا ہے۔ صوفی طالب مولا ہوتا ہے اور طلب مولا میں صوفی کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کو ترک کر کے پس پشت نہ ڈال دے بلکہ دنیا کے اندر گھس کر اس کی حقیقت اور ماہیت کو پالے۔ یہ بات باقی اربابِ روحانیت میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ صوفی کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دنیا کے اندر گھس کر اس کی حقیقت معلوم کرے اور اس بات کے لئے اسے تزکیۂ نفس کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ تکبر سے بالا تر ہو کر رائے قائم کرے' اور نفسانیت سے بالاتر ہو کر لوگوں سے معاملہ کرے اور اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو پا سکے۔ اور یہ بات دنیا میں رہ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ خدا تک پہنچنے کا یہی اور صرف یہی راستہ ہے جس کے بعد وہ ذاتِ حق کے ساتھ ایک ہو کر حقیقت اشیاء کو سمجھتا ہے اور سورج اور ستاروں کی حرکات

کو اسی نور سے دیکھتا ہے چونکہ صوفی ذاتِ حق میں گم ہو جاتا ہے وہ دنیا کے حقیقت کو بہتر سمجھ سکتا ہے اور کائنات کو ایسے دیکھتا ہے جیسے خدا (یعنی خدا کی بصیرت سے دیکھتا ہے) (حدیث میں بھی بی یسمع اور بی یبصر آیا ہے) اس کے بعد دنیا اس کو کچھ اور نظر آتی ہے۔ اس کو دنیا کی قباحت کے نیچے حُسن اور نقائص کے نیچے کمال نظر آتا ہے۔ وہ ہر چیز میں نیا راگ سنتا ہے' ہر شے میں نیا رنگ دیکھتا ہے اور ہر جگہ اس کو نئی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ یہاں پر دونوں قسم کے مشاہدات جمع ہو جاتے ہیں۔ مشاہدۂ حق اور مشاہدۂ کائنات۔ بعض صوفیاء کے منہ سے بے ساختہ غیر شرع کلمات نکل گئے۔ لیکن امام غزالی جیسے اکابر صوفیاء نے میدان میں آکر تصوف اور شریعت کو ایک ثابت کیا اور فنا فی اللہ جیسے مشکل مقامات کو ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے جو شریعت سے متصادم نہیں ہوتے"۔

کیسے سنہری الفاظ میں مصنف نے اسلامی تصوف اور دیگر مذاہب کے فلسفۂ روحانیت میں فرق بیان کیا ہے۔ چونکہ ہاپولڈ خود ایک روحانی پیشوا ہیں انہوں نے تصوف کی وہ خصوصیات بتائی ہیں جو تصوف کے حقائق سے ناواقف آدمی نہیں بتا سکتا خواہ ظاہری عالم دین کیوں نہ ہو۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ تزکیہ نفس کئے بغیر لوگ تصوف کے متعلق رائے زنی شروع کر دیتے ہیں۔ اگر تزکیۂ نفس جس کا وہ دعوہ کرتے ہیں صحیح معنوں میں ہوتا تو کبھی انکار نہ کرتے۔

میکڈانلڈ پر صوفی مجالس کا اثر

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ڈی - بی - میکڈانلڈ ایک بہت بڑے

عیسائی مشنری تھے جو مصر میں تبلیغ عیسائیت پر مامور تھے اگرچہ انہوں نے بھی اوائل عمر میں صوفیاء پر اعتراض کئے ہیں تاہم وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جب وہ صوفیاء کی مجالس میں شریک ہوتے تھے تو ان پر ان کا بڑا روحانی اثر ہوتا تھا۔ ایک دفعہ وہ مسلمانوں کے شکار کو نکلے تو ان کو محسوس ہوا کہ وہ خود شکار ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی اس حالت کو اپنی کتاب (Aspects of Islam) میں یوں بیان کرتے ہیں :

" جہاں تک زندہ اولیاء کا تعلق ہے ہماری مغربی دنیا میں ان کا بہت فقدان ہے اس لئے میں اکثر متوفی اولیاء کی تلاش میں رہتا تھا جن کی اسلامی دنیا میں کوئی کمی نہیں۔ ان کے مزارات پر میں احترام سے جاتا تھا اور فاتحہ پڑھتا تھا۔ معلوم نہیں قبر والوں کو اس سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ جو لوگ وہاں جاتے ہیں ان کو بھی کوئی فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ البتہ مجھے یہ معلوم ہے کہ مجھے اس سے بہت فائدہ ہوا اور میں نے وہاں (یعنی مزارات پر) جا کر خدا کا قرب محسوس کیا"۔

دیکھئے ایک غیر مسلم پادری کو بھی مزارات سے فیض حاصل ہوا اور اس کو محسوس بھی ہوا کہ مجھے فیضان (Inspiration) ملا ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجلس ذکر میں شمولیت کی اور یہ ان کے تاثرات ہیں :

" میں یہ نہیں کہتا کہ وہاں مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ میں پرزور الفاظ میں کہتا ہوں کہ مجھ پر بہت اثر ہوا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ غیب سے میرے سمیت تمام حاضرین پر ایسی روحانیت چھا رہی تھی جو اور کسی جگہ نہیں ملتی"۔

یہ ہیں مجالس ذکر کے فیوض و برکات جو ایک عیسائی کو بھی محسوس ہو رہے تھے۔ کاش کہ ہمارے مسلمان اس قدر تزکیۂ نفس کر لیتے۔ میکڈانلڈ نے بیان کیا ہے وہ ایک صوفی کو عیسائی بنانے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن وہ ہمیشہ مغموم رہتا تھا اور اپنے کئے پر پچھتاتا رہا۔ میکڈانلڈ کے الفاظ یہ ہیں :

> "دراصل مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ آدمی اپنی سابقہ مذہبی زندگی پر نظر ڈال کر پچھتاتا تھا کہ اب مجھ پر وہ حالت طاری نہیں ہوتی جو اسلامی زندگی میں ہوتی تھی۔ کیونکہ اسلامی زندگی میں درویشی کی حالت میں اس پر کشف بھی ہوتا تھا جس سے اسے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ کہیں دور کے فاصلے پر کیا ہو رہا ہے اور دور کی آوازیں سن بھی سکتا تھا۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ آدمی اب افسوس کر رہا ہے اب وہ ان نعمتوں سے محروم ہو گیا ہے۔ اگرچہ وہ یہ بات زیادہ واضح طور پر نہیں کہتا تھا۔ لیکن وہ اس چیز کی کمی بہت محسوس کرتا تھا"۔

سپنسر ٹرنگھم کا اعتراف

Spencer Tringham نے سلاسل طریقت پر ریسرچ کی ہے اور اپنی کتاب موسومہ (Spiritual Orders) میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمام سلسلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں اور تمام سلاسل طریقت کا منبع اور مرکز پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ یہ بہت اہم تصنیف ہے جس کی عدم موجودگی میں مستشرقین غلط فہمی میں مبتلا ہو کر تصوف کا منبع اور مصدر دیگر مذاہب میں تلاش کرتے پھرتے تھے۔ بلکہ فاضل مصنف نے خود مستشرقین کی اس

غفلت اور غلط فہمی کی شکایت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" جہاں اسلامی تصوف کی طرف مستشرقین نے زبردست
کشش محسوس کی ہے انہوں نے تصوف کے تنظیمی پہلو یعنی
سلاسل طریقت کو بری طرح نظرانداز کر رکھا ہے"

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اگر وہ سلاسل طریقت کی بے مثال تنظیم کا پتہ لگاتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اسلامی دنیا میں مشائخ نے اس پر کس قدر کاوش اور جانفشانی سے کام کیا ہے اور اپنے اپنے روحانی شجرۂ نسب کو کس طرح محفوظ رکھا ہے۔ علاوہ ازیں بچارے مستشرقین کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جب کسی بزرگ کو مجاہدات اور ریاضات کے بعد تکمیل کا شرف حاصل ہوتا ہے تو اس کو خلافت تو اپنے شیخ سے ملتی ہے لیکن منظوری اوپر کے مشائخ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دی جاتی ہے اور ان چودہ صدیوں میں اسلامی دنیا میں ہر جگہ اسی اصول پر خلافتیں ملتی رہی ہیں اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ خانقاہی نظام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ بعض جگہوں پر نام نہاد پیروں نے اپنے مریدین کو نام نہاد خلافتیں عطا کی ہیں لیکن چند ایک کالی بھیڑوں کی وجہ سے سارا ریوڑ کالا نہیں بن سکتا۔ ہر مذہب و ملت میں گناہگار سیہ کار افراد کا وجود پایا جاتا ہے لیکن اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا وہ مذہب و ملت خراب ہے۔ کتاب مذکور میں فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ :

" جس حسن و خوبی سے اسلامی تصوف کی تحریک نے عوام اور
خواص کی ہدایت کی اس کی مثال عیسائی دنیا میں نہیں ملتی
جہاں اب تمدن جدید نے مزید تباہی مچا دی ہے"

سپنسر ٹرمنگھم بھی تصوف پر بیرونی اثرات کی تردید کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"صوفی ازم (تصوف) اسلام کی اپنی چیز ہے جو بیرونی اثرات
سے بالکل متأثر نہیں ہوئی یادِ الٰہی کی بدولت صوفیاء کو
اندرونی بصیرت حاصل ہوئی جس سے ان کی زندگیاں منور ہو
گئیں"۔

اینی میری شیمیل کا اعتراف

جرمنی کی مشہور سکالر اور مستشرق (Annemarie Schimmel) نے تصوف کا سب سے زیادہ گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے سیکنڈ ہینڈ مستعار اطلاعات پر انحصار نہ کرتے ہوئے خود اسلامی ممالک میں ریسرچ کا فریضہ ادا کیا ہے، علماء و مشائخ اسلام سے تبادلہ خیال کیا ہے۔ راقم الحروف سے بھی ان کی ملاقات ہوئی اور مسائل تصوف زیر بحث آئے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے دلی خلوص اور محبت سے تصوف کا مطالعہ کیا ہے اور جہاں بھی اکابر صوفیاء کا ذکر کرتی ہیں۔ ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھتی ہیں اس کے برعکس بعض مستشرقین نے اکابر اسلام کے حق میں قدرے گستاخانہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انہوں نے مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ، غالب، اقبالؒ، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور خواجہ میر درد کے صوفیانہ کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے اور داد دی ہے۔ انہوں نے اس عمیق ریسرچ کے نتیجے میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے
(Mystical Dimensions of Islam) سب سے پہلے انہوں نے پروفیسر آربری کی طرح یہ اعتراف کیا ہے کہ صوفیاء کا کلام سمجھنا ناممکن کے برابر ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ :

" روحانی مشاہدات کا تجزیہ ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے کیونکہ حقیقت کو الفاظ میں نہیں بیان کیا جا سکتا"۔

دیگر منصف مزاج اور اعتدال پسند مستشرقین کی طرح انی میری شیمیل بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہیں کہ الٹا تصوف سے عیسائی اربابِ روحانیت نے اثرات قبول کیے ہیں وہ لکھتی ہیں کہ :

"یورپ پر سب سے پہلے تصوف کا اثر ریمانڈ لل (Remond Lull) پر ہوا جن کا سن انتقال ۱۳۱۶ء ہے اس سے ایک صدی بعد ولیم جونز (William Jones) نے فارسی شاعری کا مطالعہ کیا اور بالآخر خواجہ حافظ کے دیوان کا ترجمہ کیا۔ خواجہ حافظ کا انگریز مستشرقین پر بڑا اثر ہوا لیکن بعض انیسویں صدی کے مصنفین نے ان کی شاعری سے غلط معنی لئے اور غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ ان لوگوں نے خواجہ حافظ کے کلام کے ظاہری معنی لئے اس لئے تصوف کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہوئے"۔

آگے چل کر وہ لکھتی ہیں کہ :

"انیسویں صدی میں تصوف کے متعلق اس قدر مواد جمع ہو گیا کہ اہل قلم اس کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے لگے۔ ہاں بعض کتابیں ایسی بھی لکھی گئیں جن میں متقدمین صوفیاء کے تذکرے نہیں ملتے جس کی وجہ سے ان کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اسلام کی سر زمین بنجر اور روحانیت سے خالی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے متعلق نہ ان لوگوں کو علم تھا اور نہ سمجھ سکتے تھے ...... جرمنی کے فاضل پروفیسر مذہبیات تھالک نے ۱۸۲۱ء میں تصوف پر پہلی تفصیلی کتاب لکھی۔ حیرت کی بات ہے کہ پروفیسر تھالک اگرچہ کٹر

پروٹسٹنٹ ہیں جو روحانیت کے حامی نہیں ہوتے تاہم انہوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ :

"تصوف محمدؐ کی اپنی روحانیت کی پیداوار ہے اور اسی سے اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے"۔

پروفیسر شیمیل کتاب مذکور میں تصوف پر ہندو اثرات کی یوں تردید کرتی ہیں :

" میکس ہارٹن سمیت بہت سے سکالروں نے تصوف پر ہندو اثرات کا نظریہ پیش کیا ہے لیکن اس کے متعلق کوئی واضح ثبوت نہیں لا سکے"۔

تصوف کے متعلق پروفیسر شیمیل کی اپنی رائے یہ ہے :

" تصوف کا منبع پیغمبر اسلام ہیں اور تصوف کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے جو پیغمبر اسلام کے ذریعے قرآن کی صورت میں نازل ہوئی۔ قرآن مسلمانوں کے نزدیک غیر مخلوق ہے اور سب کے لئے خاص کر صوفیاء کے لئے رشد و ہدایت کا مینارِ نور رہا ہے۔ قرآنی علوم اور حقائق کے بیان کرنے میں صوفیاء اسلام نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اور قرآن کے الفاظ نے ان کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیا ہے۔ مزید برآں یہ قرآن ہی ہے جس سے صوفیاء کو روحانی احوال و مقامات حاصل ہوئے اور کشف و کرامات اور استغراقی کیفیات نمودار ہوئیں۔ صوفی ازم کی اصل محمدؐ ہیں اور محمدؐ ہی سلسلہ روحانیت کی پہلی کڑی ہیں اور محمدؐ سے علوم ولایت ان کے چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالب کو حاصل ہوئے"۔

آگے چل کر اینی میری شیمل لکھتی ہیں :

" اہل مغرب اصحاب قلم کے سامنے محمدؐ کی وہ تصویر رہتی ہے جو صدیوں کی نفرت و عداوت سے پیدا ہوئی۔ ان کے نزدیک وہ محض ایک ہوشیار سیاستدان تھے یا زیادہ سے زیادہ ایک جھوٹے مذہب کے بانی تھے جنھوں نے تورات و انجیل کی نقل لگائی۔ لیکن آپ کے روحانی کمالات کا علم کسی کو نہیں ہے"۔

اس کے بعد وہ ان صحابہ کرام کا ذکر کرتی ہیں جن کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی فیض حاصل ہوا اور ان کا ذکر جن کو صحابہ کرام سے فیض حاصل ہوا غرضیکہ انہوں نے فیضان نبویؐ کا ایک مسلسل شجرہ نسب بنا کر پیش کیا جن کو سلاسل طریقت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ :

" اس سلسلہ طریقت میں وہ اصحاب رسول شامل ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ اصحاب صفہ' ابوذر غفاری' سلمان فارسی اور اویس قرنی (رضی اللہ عنہم) ہیں جن کا مسلک آنے والے صوفیاء نے اختیار کیا اور جو اسلام' ایمان و احسان پر مبنی ہے۔ ایک حدیث میں احسان کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ خدا کی اس طرح عبادت کرو کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر دیکھ نہیں سکتے تو یہ کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے"۔

تصوف پر مجوسی اور عیسائی اثرات کی پر زور نفی کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں۔ " صوفیاء نے مجوسی دوئی دو خدا یعنی یزدان و اہرمن اور عیسائی تثلیث (تین خدا) کے عقائد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کیونکہ یہ ان کے نزدیک شرک تھا"۔

اس سلسلے میں پروفیسر شیمل ایک اور مستشرق پیری نویا (Pere Nwya)

کا مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرتی ہیں :

"پیغمبر اسلام کے اہل بیت میں امام جعفر صادق (رضی اللہ عنہ) تصوف کے سب سے بڑے معلم ہیں۔ امام صاحب کی تفسیر جو سلیمی کی تفسیر میں محفوظ ہو چکی ہے حقائق تصوف کا بہترین خزانہ ہے امام جعفر صادق (رضی اللہ عنہ) کے نزدیک قرآن کے چار مطالب ہیں۔ قرآن کا ظاہر عوام کے لئے ہے، اشارات خواص کے لئے، لطائف اولیاء کے لئے اور حقائق انبیاء کے لئے"۔

کاش کہ ہمارے علمائے ظواہر قرآن کے متعلق مندرجہ بالا حقائق سے آگاہ ہوتے۔ اگر ہوتے تو آج یہ تفرقہ بازی نہ ہوتی۔ پروفیسر شیمیل نے ایڈوارڈ براؤن اور نکلسن جیسے اکابر کی بھی تردید سے دریغ نہیں کیا۔ وہ لکھتی ہیں :

"ہمیں براؤن کے اس قول سے اتفاق نہیں کہ ذوالنون مصری (رحمتہ اللہ علیہ) پہلا شخص ہے جس نے نظریۂ وحدت الوجود پیش کیا اور نہ ہی ہم نکلسن کے اس قول سے متفق ہیں کہ تصوف کی اصل فلسفہ یونان ہے۔ کیونکہ حدیث قدسی **بی یسمع** اور **بی یبصر** میں کوئی فلسفیانہ بات نہیں ہے اور نہ ہی ذوالنون مصری (رحمتہ اللہ علیہ) کے اس قول میں کوئی فلسفہ کی بات ہے کہ :

"میں نے خدا کو خدا سے جانا"

اسی طرح شیمیل نے اپنے ہم وطن سکالر روڈ الف آٹو (Rudolf Otto) کی بھی تردید کی ہے۔ نیز انہوں نے پروفیسر ہلمٹ ریٹر (Helmutritter) اور آر۔ سی۔ زہنر (Zaehner) کے اس قول کی تردید

بھی کی ہے کہ ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کے تصوف کی اصل وجہ ہندو مذہب ہے۔ انہوں نے یورپ کے ان مصنفین کی بھی تردید کی ہے جنہوں نے حلاجؒ پر الزام تراشی کی ہے مثلاً ایڈوارڈ پیکاک، کریمر، ہارٹن، میکڈانلڈ وغیرہ۔ اور نکلسن اور ماسینیوں کے اس قول کی تائید کی ہے کہ حلاجؒ کا تصوف قرآن و حدیث پر مبنی تھا۔ یہ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔

اہل یورپ پر تصوف کے اثرات بیان کرتے ہوئے پروفیسر شیمل لکھتی ہیں :

> " پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا ہے کہ **موتوا قبل انت موتوا** (مرجاؤ مرنے سے پہلے) فارسی شاعری کے ذریعے یہ تمثیل یورپ میں جا پہنچی جس کے نتیجے میں گوئٹے نے اپنی مشہور نظم (*Selige Schnsutcht*) میں موت قبل از موت کا ذکر کیا ہے۔ نیز گوئٹے کی نظم (*Stub Werde*) بھی پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اسی حدیث کا ترجمہ ہے اور یہی حلاج (رحمہ اللہ) اور دیگر صوفیاء کے تصوف کا سنگ بنیاد ہے"۔

دیکھئے کس قدر پر مغز ریسرچ ہے۔ ان حقائق کو غور میں لایا جائے تو تمام اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ کتاب مذکور میں پروفیسر شیمل نے لکھا ہے کہ حلاجؒ کی موت کے بعد صوفیاء نے جو کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اس بات کی پرزور حمایت کی ہے کہ تصوف اور شریعت اسلامیہ کے مابین کوئی نزاع نہیں ہے مثلاً ابونصر سراجؒ کی کتاب اللمع، قلا آبادیؒ کی کتاب تعرف، ابوطالب مکیؒ کی کتاب قوت القلوب سلمیؒ کی کتاب طبقات الصوفیہ، نعیمؒ کی کتاب حلیتہ الاولیاء، امام ابو القاسمؒ کا رسالہ سید علی ہجویریؒ کی کتاب کشف المحجوب اور امام غزالیؒ کی کتاب احیاء العلوم ان تمام کتابوں میں تصوف اور شریعت کی ہم آہنگی ثابت کی گئی ہے۔

فاضل مصنفہ نے آگے چل کر لکھا ہے کہ تصوف کے تینوں اصول شریعت، طریقت اور حقیقت پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس حدیث میں موجود ہیں :

"الشریعتہ اقوالی والطریقتہ افعالی والحقیقتہ احوالی۔"

اس کے بعد وہ تصوف کے تمام حقائق و مسائل کو قرآنی آیات سے ثابت کرتی ہیں۔ انہوں نے توبہ، ورع، خلوص، زہد، توکل، فقر، فنا، صبر، شکر، خوف رجا، ادب، قبض، بسط، محبت، معرفت، انس، ہیبت، قرب، شوق، عشق وغیرہ کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا ہے۔

آگے چل کر وہ بعض لوگوں کے اس الزام کی بھی نفی کرتی ہیں کہ فنا سے حلول و اتحاد لازم آتا ہے۔ فنا کی جو تعریف فاضل مصنفہ کرتی ہیں وہ صوفیاء کی تعریف کے عین مطابق ہے :

"فنا کیا ہے سالک کا ذاتِ حق میں گم ہو جانا اور اپنی نفی کرنا ہے"۔

ظاہر ہے کہ اس سے نہ حلول لازم آتا ہے نہ اتحاد، حلول و اتحاد کا عقیدہ یہ ہے کہ ذاتِ حق رام اور کرشن میں اتر آئی اور وہ خدا بن گئے۔ لیکن اسلام کے عقیدہ فنا میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔

روڈلف اوٹو کی نکتہ چینی

ایک جرمن ماہر روحانیات روڈ لف اوٹو (Rudolf Otto) نے ایک کتاب میں ذاتِ حق کی دو صفات جمال اور جلال کا تقابل کیا ہے۔

اس کے متعلق ڈاکٹر شیمل لکھتی ہیں کہ :

" اس سے ایک ہزار سال سے زائد عرصہ پہلے مسلم صوفی

ذوالنون مصری (رحمہ اللہ) نے حق تعالیٰ کی صفتِ جمال'
صفتِ جلال کو بیان کر کے تیسری صفت کمال سے یکجا کر دیا
ہے۔ اس سے ظاہر ہے جو چیز روڈلف اوٹو نے بیان کی ہے
صوفیائے اسلام کو کئی صدیاں پہلے اس کا علم تھا"۔

روس پر تصوف کے اثرات

میری مندرجہ بالا کتابوں میں یہ انکشافات بھی کئے گئے ہیں کہ اسلامی تصوف کا روس پر بھی بہت اثر ہوا ہے اور اب وہاں کے سائنس دانوں' فلاسفروں اور ریسرچ سکالروں نے یہ بات بھی ثابت کر دی ہے کہ انسان کے اندر روح موجود ہے جو موت کے وقت مرتی نہیں بلکہ زندہ رہتی ہے اور کسی اور جہاں میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ اسلامی عقیدہ ہے جس کے مطابق مرنے کے بعد روح عالم برزخ میں منتقل ہو جاتی ہے نیز روسی ریسرچ سکالروں نے روح کی اعلیٰ خواص کا بھی کھوج لگا لیا ہے اور وہ بھی اس کے ذریعے چھوٹی موٹی نچلی قسم کی کرامات کے بھی قائل ہو چکے ہیں مثلاً اب وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے دور دراز مقامات پر پیغام رسانی کر سکتے ہیں۔ دور کی آواز روحانی طاقت سے سن سکتے ہیں اور دور کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں یعنی بغیر ٹی-وی۔اور وائرلیس وغیرہ۔ نیز وہ اب روحانی طاقت کے ذریعے وزنی چیزوں کو بھی ہلا سکتے ہیں اور زمین سے ایک انچ اوپر ہوا میں معلق ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ امور صوفیائے اسلام کے نزدیک بچوں کے کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو کتاب
(Psychic Discoveries Behind Iron Curtain) جو امریکہ میں چھپی ہے اور چند ایسے ریسرچ سکالروں کی تصنیف ہے جنہوں نے روس میں جا کر اپنی آنکھوں سے ان چیزوں کا مشاہدہ کیا۔

لہٰذا اسلامی تصوف کے چند مٹھی بھر مخالفین مخالفت کر کے اس کا کیا بگاڑ

سکتے ہیں جبکہ اب بھی یورپ اور امریکہ میں لوگ وہاں کی گلا گھونٹنے والی مادیت (Materialism) اور لادینیت (Secularism) سے تنگ آکر اولیائے اسلام مثل امام غزالیؒ، ابن عربیؒ جنید بغدادیؒ، مولانا رومیؒ کی کتابوں سے روحانیت کی تلاش میں سرگردان ہیں اور کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ ان نو مسلم حضرات کے حالات زندگی ہم باقاعدہ طور پر اپنے سہ ماہی سلسلہ کتب صوفی پاتھ (انگلش) میں دیتے رہتے ہیں۔ نیز خط و کتابت کے ذریعے بھی ان کی روحانی تعلیم و تربیت کا سلسلہ بفضلہٖ تعالیٰ جاری ہے۔ وباللہ التوفیق۔ والحمدللہ تعالیٰ عزوجل۔

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا
او نشیند در حضور اولیاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

از حضرتِ مصنّف رحمہ اللہ

حمد و نعت

ربنا اتنا من لدنک رحمتہ و ھیی لنا من امرنا رشدا الحمد للّٰہ الذی کشف لاولیائہ بواطن ملکوتہ و قشع لا صفیائہ سرائر جبروتہ و اراق دم المحبین بسیف جلالہ و اذاق سر العارفین روح وصالہ ھو المحی لموات القلوب بانوار ادراک صمدیتہ و کبریائہ و المنعش لھا براحتہ روح المعرفتہ بنشر اسمائہ والصلواۃ و السلام علی رسولہ محمد و علی الہ و اصحابہ و ازواجہ و اھل بیتہ اجمعین ○

ترجمہ اے ہمارے رب ہمیں اپنے حضور سے رحمت اور اپنی بارگاہ معلی سے سرخروئی مرحمت فرما۔ حمد و شکر ہے اس ذات پاک کا کہ جس نے اپنے اولیاء کرام کو اپنی باطنی سلطنت (یعنی ذات و صفات کے اسرار و رموز) سے آگاہ فرمایا،

اور اپنے دوستوں کو عالم جبروت کے اسرار و رموز سے مطلع فرمایا' اور اپنی تیغ جلال سے اپنے عاشقوں کا خون بہایا اور اپنے عارفوں کو نعمت وصال سے مالا مال فرمایا' اسی نے مردہ دلوں کو اپنے انوار صمدیت اور کبریائی سے زندہ فرمایا ہے اور اپنے اسماء و صفات کی خوشبو سے روحوں کو معطر فرمایا۔ اور درود و سلام ہو اس کے رسول پاک محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم پر اور آپ کے اصحاب' ازواج مطہرہ اور تمام اہل بیت پر۔

شرح سبحان اللہ ! کس قدر جامع دعا ہے اس دعا میں حضرت مخدوم علیہ رحمۃ نے سب سے پہلے حق تعالیٰ کی رحمت طلب کی ہے۔ کیونکہ جب تک اس کی رحمت شامل حال نہ ہو انسان کے جدوجہد اور اعمال سے کچھ نہیں بنتا۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنے اعمال سے کوئی شخص نجات حاصل نہیں کر سکتا' جو شخص نجات حاصل کرے گا فضل رب اور رحمت حق سے حاصل کرے گا۔ جب صحابہ کرام نے عرض کیا کہ حضور آپ بھی' تو آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی رحمت حق سے نجات حاصل کروں گا نہ کہ اپنے اعمال سے۔ اب آپ خود غور فرما سکتے ہیں کہ جب سرور کائنات' فخر موجودات بلکہ باعث تخلیق کائنات کا یہ حال ہے کہ فضل ربی کا سہارا لے رہے ہیں اور اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں کر رہے تو ہم کون ہیں جو اعمال پر اترائیں یا ان پر بھروسہ کریں۔ تمام انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو جو نعمت قرب و معرفت و وصل حق نصیب ہوئی ہے یہ سب ذات حق کی رحمت کا نتیجہ ہے نہ کہ اعمال اور جدوجہد کا۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جب رحمت حق موجزن ہوتی ہے تو انسان کے اندر جدوجہد کا جذبہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اصل محرک فضل رب ہے نہ کہ جدوجہد۔ کسی نے خوب کہا ہے ۔ عشق اول در دل معشوق پیدا مے شود۔ اس لئے اولیاء کرام اور مشائخ عظام نے سلوک الی اللہ طے کرنے کے سلسلے میں ذاتی

جدوجہد، عشق و محبت، ارشاد مرشد اور سب سے اول شرط فضل رب قرار دی ہے۔ "ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہو"۔

ترجمہ اے مخاطب! میں علی بن عثمان بن علی الجلابی، الغزنوی ثم ہجویری نے کتاب لکھنے کے متعلق تمہاری استدعا پر جناب باری تعالیٰ میں استخارہ کیا اور تمام نفسانی اغراض کو دل سے نکال کر تمہاری استدعا کے مطابق کتاب لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور اس کتاب کا نام "کشف المحجوب" رکھا جس کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے نیز اس کے مضامین کو مختلف ابواب میں منقسم کر دیا ہے۔ اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے میں ذات حق سے استعانت اور توفیق کا طلبگار ہوں۔ اس میں میری ذاتی کوشش اور قوت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ کیونکہ سب توفیق اللہ عزوجل کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔

شرح اس مختصر سی تمہید میں بھی حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی قابلیت اور جدوجہد کی نفی فرمائی ہے۔ اور اپنی قابلیت اور توفیق کا منبع و مصدر ذات حق کو قرار دیا ہے۔

فصل

کتاب کے اندر اپنا نام درج کرنے کی وجوہات

یہ جو کتاب کے اندر میں نے اپنا نام درج کیا ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک عام وجہ ہے دوسری خاص۔ عام وجہ یہ ہے کہ جب جاہل لوگ کتاب کو دیکھتے ہیں تو مصنف کا نام کتاب کے اندر نہ ہونے کی صورت میں اسے اپنے سے منسوب کرتے ہیں اور مصنف کا نام مٹا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے حقیقی مصنف کتاب پڑھنے والوں کی دعاؤں سے محروم رہ جاتا ہے۔ مجھے دو دفعہ یہ واقعہ پیش

آیا ہے۔ ایک یہ کہ کسی نے میرے اشعار کا دیوان مجھ سے عاریتہً طلب کیا اور واپس نہ دیا۔ چونکہ میرے پاس اس کی نقل نہ تھی۔ میری ساری محنت ضائع گئی۔ خداوند تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماوے۔ دوسرے میں نے تصوف کے مضمون پر ایک کتاب تالیف کی جس کا نام "منہاج الدین" تھا۔ لیکن ایک ذلیل آدمی نے اپنا نام روشن کرنے کی خاطر اس کتاب سے میرا نام خارج کر کے اپنا نام درج کر دیا۔ جس سے عام لوگوں نے سمجھا کہ یہ اس کی تصنیف ہے لیکن خواص جانتے تھے کہ یہ کس کی کتاب ہے چنانچہ خداوند عالم نے اسے بے برکتی سے روشناس کیا اور اس کا نام طالبان بارگاہ معلّی سے خارج کر دیا گیا۔

کتاب میں نام درج کرنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ مصنف کا نام دیکھ کر لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ واقعی وہ اس علم اور فن میں محقق کا درجہ رکھتا ہے اور کتاب پڑھنے اور سمجھنے میں پوری کوشش کرتے ہیں۔ جس سے کتاب لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔

اثبات و ضرورتِ استخارہ

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ میں نے کتاب کی تصنیف کیلئے استخارہ کیا اس سے میری مراد یہ تھی کہ حق تعالیٰ کے آداب کو بجا لایا جائے کیونکہ حق تعالیٰ عزوجل نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو استخارہ کا یہ حکم فرمایا ہے

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (اور جب آپ قرآن پاک کی تلاوت کریں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر لیا کریں کہ مجھے شر شیطان سے محفوظ رکھا جائے)۔

استعاذت، استخارت اور استعانت سب کا مطلب یہ ہے کہ معاملات کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے اور ہر قسم کی آفات سے نجات کی دعا مانگی جائے۔

چنانچہ صحابہ کرام سے روایت ہے کہ حضور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ہمیں دعائے استخارہ تعلیم فرمائی۔ جیسے کہ قرآن مجید میں حق تعالی نے امر فرمایا ہے۔ اب چونکہ انسان جانتا ہے کہ معاملات میں خیر اور صلاح اس کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ انسان کو جو بھلائی یا برائی پیش آتی ہے وہ تقدیر الٰہی میں مقدر ہو چکی ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ قضاء قدر کے سامنے آدمی سر جھکا لے اور خداوند تعالی سے مدد مانگے اور دعا کرے کہ نفس امارہ کے شر سے محفوظ فرما دے اور ہر عمل اور ہر کام میں خیر و عافیت فرماوے۔ اس چیز کو استخارہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو ہر کام کے شروع کرنے سے پہلے کیا جائے تاکہ حق تعالی اپنے بندہ کو تمام خطاؤں' آفتوں اور نقصانات اور ذلالت سے محفوظ رکھے۔ و باللہ التوفیق (تمام توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے)۔

شرح استعاذت کے لفظی معنی ہیں پناہ مانگنا' استخارت کے معنی ہیں حق تعالی سے خیر طلب کرنا اور استعانت کا مطلب ہے مدد طلب کرنا اور شیطان کے شر سے نجات کی دعا مانگنا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ خدا تعالی سے مشورہ کئے بغیر کام شروع کرتے ہیں معلوم نہیں وہ کیسے کامیاب ہوتے ہیں۔ اسلئے ہر کام میں استخارہ ضروری ہے احادیث میں دعائے استخارہ اکثر یہ مذکور ہے :

اللّٰھم انی استخیرک بالعلمک و استقدرک بقدرتک و اسالک بفضلک العظیم اللّٰھم انکنت تعلم ان ھذا امر خیر لی فی دینی و معاشی و عاقبت الامری یسرہ لہ ثم بارکہ لہ ط و انکنت تعلم ان ھذا امر شر لی فی دینی و معاشی و عاقبت الامری فاصرفہ عنی و اصرفنی عنہ یا رب یا کریم ط

(ترجمہ) نفسانیت کی آفت

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ میں نے تمام نفسانی اغراض کو دل سے باہر نکالا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام میں نفسانیت شامل ہو جاتی ہے اس کی برکت جاتی رہتی ہے۔ اور دل صراط مستقیم یعنی سیدھے راستے سے بھٹک کر کج روی میں مشغول ہو جاتا ہے۔ ہر کام کے دو نتائج نکلتے ہیں یا وہ کام ہو جاتا ہے یا نہیں ہوتا۔ جب نفسانی خواہش پوری ہو جاتی ہے تو اس سے اس کو تباہی کا سامنا ہوتا ہے اور دوزخ کا دروازہ اس کے لئے کھل جاتا ہے۔ اگر نفسانی خواہش پوری نہیں ہوتی تب بھی اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى (جو شخص نفسانی خواہش کے خلاف عمل کرتا ہے اس کی جگہ جنت میں ہے)۔

نفسانی خواہشات سے کیا مراد ہے

دنیا کے کاروبار میں نفسانی خواہشات کے شامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام میں حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے اور عذاب الٰہی سے نجات طلب نہ کی جائے۔ کیونکہ نفس کی سرکشیوں اور مکروفریب کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے متعلق کتاب ہٰذا میں انشاء اللہ تعالیٰ ایک مستقل باب اپنی جگہ پر آرہا ہے۔

نیک نیتی کی ضرورت

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ میں نے تمہاری استدعا کے مطابق اور تمہارا مقصد پورا کرنے کی خاطر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ

چونکہ تم نے مجھے اس کام کے کرنے کا اہل جانا اور مجھے کتاب کی فرمائش کی اس لئے کہ یہ ایک مفید کام تھا۔مجھ پر یہ واجب ہو گیا کہ تمہارے سوال کا حق ادا کروں۔ لیکن چونکہ فوری طور پر میں پورے سوال کا جواب نہیں لکھ سکتا تھا۔ میں نے کام پورا کرنے کی نیت کر لی ہے۔کیونکہ جس کام کے کرنے کی سچی نیت کر لی جائے تو خواہ کام میں کوئی کمی یا خلل واقع ہو جائے بندہ اس میں معذور سمجھا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے **نیت المومن خیر من عملہ** (مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نیتِ نیک کے ساتھ کام کی ابتدا کرنا اس سے بہتر ہے کہ نیت کے بغیر پورا کام مکمل کر لیا جائے۔ کیونکہ تمام امور میں نیت کا بڑا دخل اور اجرِ عظیم ہے خواہ کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر بغیر نیت کے آدمی کئی روز کھانا نہ کھائے تو اس کو کوئی ثواب حاصل نہ ہو گا۔ لیکن روزہ کی نیت سے کھانا نہ کھائے تو مقربین درگاہ کا مرتبہ پاتا ہے۔ حالانکہ نیت کرنے اور نہ کرنے میں ظاہراً کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص کسی نیت کے بغیر کسی مقدس مقام پر جائے تو اس کو کوئی ثواب نہیں ملے گا لیکن زیارت کی نیت سے جائے تو ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں بہت ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے اس کی نیت کر لی جائے۔ واللہ اعلم۔

کتاب کے نام کی وجہ تسمیہ

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اس کتاب کا نام میں نے "کشف المحجوب" رکھا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ ایسا نام رکھا جائے کہ جس سے ساری کتاب کا مقصد ظاہر ہو جائے اور سننے والے کو معلوم ہو جائے کہ اس کے اندر کیا ہو گا۔

جاننا چاہئے کہ سوائے اولیاء اللہ کے عام طور پر لوگ حقیقت سے محجوب

اور قرب حق سے محروم ہوتے ہیں اور چونکہ اس کتاب میں حقیقت کی برقعہ کشائی کی گئی ہے اور حجاباتِ بشریت کے کشف و شرح کی کوشش کی گئی ہے اس نام سے بہتر کوئی نام نظر نہیں آیا۔ درحقیقت کشف حقائق کا فائدہ صرف ازلی اہل کو ہوتا ہے۔ ازلی نااہل (محجوب) کشف برداشت نہیں کرسکتا اور کشف حقیقت ہوتے ہی ہلاک ہو جاتا ہے اور جو کشف حقائق کے لائق ہے اس کو محجوب کر دیا جائے تو اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ جیسے ایک شخص ہے جو قرب حق کی طاقت نہیں رکھتا اس کو اگر قریب لایا جائے تو ہلاک ہو جاتا ہے یا مثلاً وہ کیڑا جو سرکہ میں پیدا ہوتا ہے اگر اس کو کسی اور چیز میں ڈالا جائے تو مر جاتا ہے یا جو جانور کسی اور جگہ پیدا ہو اور اس کو سرکہ میں ڈالا جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ اس لیے حقیقت کا اظہار ان کے سامنے مشکل ہوتا ہے جو اس کے لئے پیدا ہی نہیں کئے گئے۔ چنانچہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے۔ **کل میسر لما خلق لہ** (خدا تعالٰی نے جس شخص کو کسی کام کے لئے پیدا فرمایا ہے وہی کام اس کے لئے آسان ہوتا ہے)۔

اقسام حجاب یاد رہے کہ حق تعالٰی اور بندہ کے درمیان جو حجابات حائل ہیں ان کی دو اقسام ہیں۔ اول "حجابات رینی" جو کبھی دور نہیں ہوتے۔ دوم "حجابات غینی" جو جلدی دور ہو سکتے ہیں۔ اس بیان کی تفصیل یہ ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو ذاتی طور پر (یعنی فطرتاً) محجوب ہوتے ہیں۔

شرح یعنی وہ پیدائشی طور پر ایسی طبیعت لے آتے ہیں کہ کشف اور دیدار حق کے قابل ہی نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کا پردہ کبھی نہیں ہٹتا۔

ترجمہ اور نہ ہی ان کے نزدیک حق و باطل میں کوئی تمیز ہوتی ہے۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو صفاتی طور پر محجوب ہوتے ہیں۔

شرح یعنی پیدائشی اندھے نہیں ہوتے بلکہ بعض وجوہات کی بناء پر کشف سے محروم ہوتے

ہیں۔ ان کے اندر صلاحیت ہوتی ہے۔لیکن پوشیدہ ہوتی ہے۔) ایسے لوگ ہمیشہ تلاش حق میں رہتے ہیں اور باطل سے گریز کرتے ہیں۔ چنانچہ پہلی قسم کا حجاب یعنی ذاتی حجاب' حجاب رینی کہلاتا ہے جو کبھی دور نہیں ہوتا۔ رین کے معنی ہیں مہر یا طباعت (یعنی پیدائشی طور پر ان کے قلوب پر مہر ثبت ہوتی ہے) جیسا کہ حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم (ہرگز نہیں ان کے قلوب پر مہر لگ چکی ہے) مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (ان کے اعمال کی وجہ سے) اس وقت ان کی حالت ان لوگوں کی سی ہوتی ہے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (تحقیق وہ جو کافر ہوئے ان کے لئے برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ایمان نہیں لائیں گے) آگے حق تعالیٰ نے اس کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ (اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر مہر لگا دی ہے) اور حجاب صفاتی جس کو حجاب غینی کہتے ہیں کبھی نہ کبھی دور ہو جاتا ہے اس وجہ سے کہ ذات یعنی فطرت میں تبدیلی ناممکن ہے۔ اور صفات میں ممکن ہے اور اس قسم کے حجابات دور ہو سکتے ہیں۔ مشائخ نے حجاب رینی اور غینی کے متعلق لطیف نکات بیان فرمائے ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **الرین من جملتہ الوطنات والغین من جملتہ الخطرات** (رین مستقل چیزوں میں سے ہے اور غین عارضی میں سے) چنانچہ وطن یعنی مستقل چیز پائیدار ہوتی ہے اور خطرات عارضی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پتھر سے شیشہ نہیں بنایا جاسکتا (کیونکہ پتھر کی ذات میں تاریکی یعنی حجاب ہے) خواہ جتنے شیشہ گر جمع ہو جائیں۔ لیکن جب ایک آئینہ پر زنگ لگ جاتا ہے تو اسے آسانی سے صاف کیا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پتھر کے اندر تاریکی اس کی ذاتی ہے اور آئینہ کے اندر صفائی اس کی ذاتی ہے۔

اصل پائیدار ہوتی ہے لیکن عارضی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ پس میں نے یہ کتاب اس لیے تالیف کی ہے کہ اس سے ان لوگوں کے قلوب سے زنگ دور ہو جائے جو حجاب غینی میں گرفتار ہیں کیونکہ ان کے قلوب میں نور حق کی کرن موجود ہوتی ہے۔کتاب کی برکت سے ان کے حجاب دور ہو سکتے ہیں اور حقیقت تک ان کی رسائی ہو سکتی ہے لیکن دوسری قسم کے لوگ جن کی سرشت میں انکار حق اور ارتکاب باطل موجود ہے وہ کبھی راہ راست پر نہیں آسکتے۔ خواہ ان کو حقیقت کا کس قدر ثبوت بہم پہنچایا جائے۔ ان کو میری کتاب سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ **والحمد للہ علی نعمتہ العرفان** (عرفان کی نعمت پر حق تعالیٰ کا شکر ہے) ۔

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ تمہارا مدعا معلوم ہوا اور جواب کتاب ہذا میں دے دیا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ جب تک سائل کا مقصد معلوم نہ ہو جواب نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ سوال مشکل امور کے متعلق کیا جاتا ہے اور جب تک سائل کا مدعا معلوم نہ ہو مشکلات حل نہیں ہو سکتیں اور صحیح جواب نہیں دیئے جاسکتے۔

توفیق و استعانت کا مطلب

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ میں حق تعالیٰ سے توفیق اور امداد کا خواہش مند ہوں اس سے میرا یہ مطلب تھا کہ حق تعالیٰ کی مدد کے بغیر کوئی کام انجام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ ہی کی مدد سے تمام امور انجام پاتے ہیں اور توفیق کا مطلب یہ ہے کہ کام میں تائید الٰہی شامل ہو جائے کیونکہ قرآن و سنت میں بھی خداوند تعالیٰ سے توفیق طلب کرنے کی تاکید وارد ہوئی ہے اور علمائے امت بھی اس بات پر متفق ہیں۔ سوائے معتزلہ فرقہ کے لوگوں کے جو قدر کے قائل ہیں اور لفظ توفیق کو بے معنی قرار دیتے ہیں لیکن مشائخ طریقت نے فرمایا ہے کہ

التوفیق هو القدرة علی الطاعۃ عند الاستعمال (یعنی توفیق سے مراد اطاعت کی طاقت ہے) جب بندہ حق تعالی کا مطیع اور فرمانبردار ہو جاتا ہے تو حق تعالی کی طرف سے اس کی قوت عمل میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوتا ہے اور چونکہ بندہ کی تمام حرکات و سکنات کا فاعل حق تعالی ہے جب وہ حرکات و سکنات بندہ سے صادر ہوتے ہیں تو اسی چیز کو توفیق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں اس موضوع کے لئے گنجائش نہیں ہے کیونکہ کتاب کا مقصد کچھ اور ہے۔ اب میں تمہارے سوال کی طرف متوجہ ہوتا ہوں لیکن جواب دینے سے پہلے تمہارے سوال کو دوہرانا چاہتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

شرح یہ جو حضرت مخدوم رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ بندہ کی تمام حرکات و سکنات کا فاعل اللہ ہے اور جب وہ حرکات و سکنات بندہ سے صادر ہوتے ہیں تو اسی چیز کو توفیق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس مسئلہ کو قضا و قدر یا قدر و جبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس کے متعلق امت میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ نہایت ہی ادق اور مشکل ہے اور عام دماغ اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام طور پر اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس مسئلہ کا جواب نہیں ہے۔جواب موجود ہے لیکن چونکہ عام سطح کے دماغ اس کے سمجھنے سے معذور ہیں اس لئے منع فرمایا ہے۔ چونکہ یہ کتاب عوام کے لئے نہیں ہے بلکہ خواص کے لئے ہے ہم اس مسئلہ پر مختصر الفاظ میں روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے سب حق تعالی کی تقدیر کے مطابق ہو رہا ہے اور انسان کے اختیار میں کوئی کام نہیں ہے۔ اس نظریہ کو قضا یا جبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ انسان فعل مختار ہے اور

جو چاہے کر سکتا ہے اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی جبر نہیں ہے اس نظریہ کا نام قدر ہے۔ نظریہ قدر کے حاملین فرقہ معتزلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ عباسی خلیفہ مامون الرشید کا یہی عقیدہ تھا اس نے علمائے اہلسنّت و الجماعت کو مجبور کیا کہ اس کی تائید کریں لیکن وہ ڈٹ گئے اور اس کی تردید میں کمربستہ ہو کر لوگوں کے ایمان کو بچا لیا۔ اس جنگ میں سب سے زیادہ مظالم حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ پر ڈھائے گئے بادشاہ کے پاس بلا کر ان کو زدوکوب کیا گیا لیکن آپ حق پر قائم رہے۔

اہلسنّت و الجماعت کا عقیدہ نہ قدر کی طرف مائل ہے نہ جبر کی طرف بلکہ ان کا مؤقف یہ ہے کہ اسلام میں صحیح راستہ جبر و قدر کے درمیان ہے۔ یعنی انسان نہ محض مجبور ہے اور نہ محض مختار ہے بلکہ مجبور بھی ہے اور مختار بھی۔ چنانچہ کشف المحجوب میں آگے آرہا ہے کہ جب اس مسئلہ کے متعلق حضرت خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ نے امیرالمومنین حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو آپ نے بھی یہی جواب دیا کہ حقیقت قدر اور جبر کے درمیان ہے۔ جب حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو آپ نے بھی فرمایا کہ **الامر بین الامرین** یعنی حقیقت دونوں کے درمیان ہے۔ اس واسطے بزرگان کا مسلک یہ رہا ہے کہ وہ **"مختار فی فعلہ و مجبور فی اختیارہ"** (یعنی انسان ہر کام کرنے میں مختار ہے لیکن اختیار کرنے میں وہ مجبور ہے) اس کا انگریزی ترجمہ جو اردو ترجمہ سے زیادہ صاف نظر آتا ہے۔ یہ ہے ۔

"Man is free to do what he wills but he can not will what he wills."

قرآن حکیم میں اس مسئلہ کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ انسان جو نیک کام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور جو برے کام کرتا ہے وہ اس کی اپنی طرف سے ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے

نیک کام اس کی روحانیت سے صادر ہوتے ہیں اور برے کام اس کی نفسانیت سے۔ اب چونکہ انسان کی روحانیت کا منبع و مصدر ذاتِ حق ہے اس لئے نیک کام بجا طور پر حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہوئے اور برے کام بجا طور پر انسان کی نفسانیت سے منسوب ہوئے۔ اس سلسلے میں حضرت خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "مقابیس المجالس" (جو احقر مترجم نے طبع کرائی ہے) میں اس ادق مسئلہ کو کس خوبی سے ایک سطر میں بیان فرما دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "عالم حقیقت میں جبر ہے اور عالم مجاز میں قدر ہے"۔ اب چونکہ انسان کی روح عالم حقیقت سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا جسم عالم مجاز سے متعلق ہے۔ انسان دونوں جہانوں یعنی عالم حقیقت اور عالم مجاز میں جکڑا ہوا ہے اور بیک وقت مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب انسان ایک کام اپنے ارادہ اور اپنی قوت بازو سے کرتا ہے وہ مختار کہلاتا ہے لیکن چونکہ انسان کے دل و دماغ، جسم، قوت اور طاقت کا خالق حق تعالیٰ ہے۔ اس کا فعل خالق حقیقی کی قدرت کے ساتھ منسوب ہو جاتا ہے۔ اس لئے صحیح عقیدہ یہی ہے کہ **الامر بین الامرین** (یعنی حقیقت قدر و جبر کے درمیان ہے) یعنی ایک لحاظ سے مختار ہے اور ایک لحاظ سے مجبور۔

وہ سوال کیا تھا جس کے جواب میں کتاب کشف المحجوب وجود میں آئی

ابو سعید ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے جو سوال کیا اس کے کئی حصے ہیں۔

پہلا حصہ — حقیقت طریقت و تصوف

دوسرا حصہ — مقامات تصوف

تیسرا حصہ — بیان مذاہب یعنی مختلف مشائخ کے مشارب و مسائل

چوتھا حصہ	مقامات اولیاء کرام
پانچواں حصہ	اشارات و رموز مقامات
چھٹا حصہ	قلوب پر محبت ذات حق کی کیفیت اور اس کے ظہور کے علامات
ساتواں حصہ	کنہ ذات باری تعالیٰ تک پہنچنے میں جو حجابات حائل ہیں ان کی کیفیت کیا ہے
آٹھواں حصہ	نفس انسانی کی حقیقت ذات سے نفرت اور روح انسانی کی اس کے ساتھ محبت کی کیفیات
نواں حصہ	تصوف و طریقت کے حصول کا عملی طریقہ

جواب علی بن عثمان الجلابی الہجویری خدا اس پر رحمت کرے کہتا ہے کہ ہمارے زمانے میں خاص طور پر ہمارے ملک میں علم حقیقت پرانا ہو چکا ہے۔ یعنی لوگ ہوا و ہوس میں مبتلا ہو کر طریق رضائے حق سے منحرف ہو گئے ہیں۔ علمائے زمانہ اور طریقت کے جھوٹے دعویداروں کا حال حقیقت کے برعکس ہو گیا ہے۔ تم ہمت سے کام لو کیونکہ سوائے خاصان خدا کے باقی ساری خلقت کی ہمتیں پست ہو چکی ہیں۔ حصول معرفت کی خواہش ختم ہو چکی ہے' اور اکثر اہل ارادت حال کو چھوڑ کر قال پر قانع ہیں اور دیدار کی بجائے حجاب پر مطمئن ہو گئے ہیں۔ تحقیق کو چھوڑ کر تقلید کے طلبگار ہیں اور حقیقت کو گم کر چکے ہیں۔ عوام اس بات پر خوش ہیں کہ ہم حق کو پہچانتے ہیں اور خواص اس پر خوش ہیں کہ ہم حق کے طلبگار ہیں۔ ان کے دلوں میں خواہشات نفسانی موجزن ہیں۔ کیونکہ دعوہ یہ کرتے ہیں کہ یہ ذات حق کی خواہش ہے اور ان کے قلوب میں آتش محبت حق موجزن ہے۔ اس لئے وہ مزید طلب سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ انہوں نے مجاہدۂ نفس اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ بزعم خود مشاہدۂ حق میں مشغول ہیں۔

شرح یاد رہے کہ حضرت سیدنا علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کا زمانہ پانچویں

صدی ہجری کا زمانہ ہے۔ جب اس وقت دنیا کی یہ حالت تھی تو آج کل کی حالت کا اندازہ ہم سب آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ بلکہ بچشم خود دیکھ رہے ہیں کہ ہماری کیا حالت ہے۔ اس کے باوجود بھی ہم تصوف و طریقت اور اولیاء کرام کی محبت و متابعت کے دعویداروں نے طریقت کا جو مذاق اڑایا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ ہماری یہ حالت ہے کہ تصوف پر چند کتابیں پڑھ کر ہم ولایت کے مدعی بن جاتے ہیں۔ بزرگوں کے گھروں میں پیدا ہو کر ہم اہل اللہ اور ہادیٔ خلق بن بیٹھے ہیں' اور قوالی اور میلاد کی چند محافل سجا کر ہم مشائخ زمانہ کا دعوہ کرتے ہیں۔ اول تو ہم سلوک الی اللہ پر چلنا تو بجائے خود اس کے نام سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ اگر نام سن بھی لیتے ہیں تو سلوک طے کرنے کا نہ مطلب سمجھتے ہیں نہ اس کا طریقہ جانتے ہیں اور نہ اس کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں مرید مل جاتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں چومنے والوں کی کثرت ہوتی ہے۔ کھانے پینے کی دعوتوں کی بھرمار ہوتی ہے' اور سلوک طے کرنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ خود محتاج ہدایت ہوتے ہیں اور دوسروں کو بیعت میں لے لے کر ان کو راہِ حق سے محروم کرتے جاتے ہیں۔ بس آج کل اسی کا نام تصوف اور طریقت ہے' اسی کا نام ہدایت ہے اور اسی کا نام ولایت' مشائیخیت اور پیری مریدی ہے۔ مریدوں کے غول کے غول درِ دولت پر خالی ہاتھ آتے ہیں اور خالی ہاتھ واپس چلے جاتے ہیں۔

ترجمہ اس سے پہلے میں نے اس مضمون پر ایک کتاب لکھی تھی۔ لیکن جھوٹے دعویداروں نے اس کے چند حصے نکال کر مریدوں کو دھوکا دینے کی خاطر اپنی طرف منسوب کر لیا اور کچھ حصوں کو ضائع کر دیا۔ کیونکہ اہل اللہ سے حسد اور انکار کی وجہ سے ان کو دنیاوی دولت میسر آتی ہے۔ بعض لوگوں نے کتاب مذکور کی کچھ عبارات نقل تو کر لیں لیکن ان پر عمل نہ کیا۔ بعض لوگوں نے اس

کو پڑھا لیکن سمجھ نہ سکے۔ البتہ عبارات اور الفاظ کو یاد کر لیا اور لوگوں کے سامنے شوخی بھگارنے لگے کہ یہ ہمارا علم اور ہمارا کلام ہے۔ حالانکہ بے حد محرومی کا شکار ہیں۔ اس وجہ سے آج کل حقیقت کو پہنچنا کبریتِ احمر (سرخ گندھک) کی طرح نایاب ہے۔ اگر مل جائے تو آدمی کیمیا گر بن جاتا ہے۔ اور اس کی ذرہ بھر مقدار تانبے اور سیسے کو سونا بنا دیتی ہے۔ غرضیکہ ہر شخص اپنے درد کی دوا کا طالب ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز کی تمنا نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ایک بزرگ نے فرمایا ہے "جس کو جو درد ہوتا ہے وہ اس کی دوا تلاش کرتا ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو معمولی سی بیماری لاحق ہے تو اس کے علاج کے لئے مروارید اور مرجان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

شرح یعنی جن جھوٹے دعویداروں کے غرض و غایت دنیا اور دولتِ دنیا ہے ان کا علاج روپے پیسے سے ہو جاتا ہے اور حقیقت و معرفت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔

ترجمہ اس کا مطلب یہ ہے چونکہ حقیقت و معرفت کو ہر کس و ناکس نہیں پہنچ سکتا جب حقائق و معارف سے لبریز کتب ان جاہلوں کے ہاتھ آئیں تو انہوں نے ان کو کلاہ سازوں اور جلد سازوں کے پاس سستے داموں فروخت کر دیا جس سے انہوں نے ٹوپیوں کے استر بنائے اور کتابوں کی جلد میں لگایا۔ ایسا کرنے سے انہوں نے ان اعلیٰ کتابوں کو "ابونواس" اور "جاحظ" کے بیہودہ کلام کا ہم پلہ بنا دیا۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ جب ایک شاہباز اڑتا ہوا کسی بڑھیا کی جھونپڑی پر جا بیٹھا تو جاہل لوگوں نے اس کے بال و پر نوچ کر اسے اپاہج بنا دیا۔ خداوند تعالیٰ نے ہمیں ایسے زمانے میں پیدا کیا ہے کہ جس میں لوگوں نے حرص و ہوا کو شریعت کا نام دے دیا ہے۔ طلب جاہ، عظمت اور غرور کو عزت و علم، ریاکاری کو نیکوکاری، کینہ پروری کو حلم، فتنہ و فساد کو مناظرہ، لڑائی جھگڑے کو بزرگی، نفاق کو

زہد' خواہش نفس کو ذوق' فضول گوئی کو معرفت' جذبات و خواہشاتِ نفس کو محبت الٰہی' الحاد (بے دینی) کو فقر اور نافرمانی کو دوستی' زندقہ (کافرانہ روش) کو فنا' ترکِ شریعت کو طریقت' اور آفت زمانہ کو مجاہدہ کا نام دے کر اہل حق کو پریشان کر دیا ہے اور ایسے لوگوں کے غلبہ سے اہل حق کی وہی کیفیت ہو گئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کی مروان کے زمانے میں ہوئی تھی۔ جیسا کہ اہل حق کے بادشاہ اور واقف حقائق و معارف حضرت شیخ ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے :

"ہم ایسے زمانے میں پیدا کئے گئے ہیں جس میں نہ آداب اسلام ہیں اور نہ اخلاق جاہلیت۔ اور نہ ہی اس میں کوئی اخلاق و مروت ہے۔"

حضرت شیخ ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"حق تعالیٰ نے دنیا کو ایک شتر سوار کے اونٹ کے بیٹھنے کی جگہ بنایا ہے۔ یعنی نہایت ہی عارضی اور مختصر مقام ہے۔ اس لئے جس نے اس کے ساتھ لمبی امیدیں باندھیں وہ تباہ و برباد ہوا۔"

فصل

اسرار و رموز الٰہی اور ان کے حجابات

یاد رہے کہ میں نے اس جہاں کو اسرار و رموزِ خداوندی کا جائے ظہور پایا ہے اور تمام موجودات یعنی اشیائے عالم ان اسرار و رموز کا خزانہ ہیں۔

شرح یعنی جس چیز کو دیکھو حقائق و معارف الٰہی سے لبریز ہے۔

ترجمہ اور یہ تمام جواہر و اعراض' عناصر' اجرام' اشباح' طبائع ان اسرار و

رموزِ الٰہی پر پردہ ڈالے ہوئے ہیں۔

شرح جواہر جمع ہے جوہر کی جس کا مطلب ہے اصل یا حقیقت اور اعراض جمع ہے عرض کی جس کا مطلب ہے اس اصل یا حقیقت کی جائے ظہور۔ مثلاً رنگ جوہر کہلاتا ہے اور جس کپڑے پر رنگ ظاہر ہوتا ہے اس کو عرض کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عناصر جمع ہے عنصر کی جس کے لفظی معنی جزو کے ہیں۔ کائنات میں چار عناصر پائے جاتے ہیں۔ آب ' باد' خاک' آتش۔ اور تمام موجوداتِ عالم ان اربعہ عناصر کا مجموعہ ہیں۔ اجرام جمع ہے جرم کی جس سے مراد زمین' سورج' چاند' ستارے ہیں۔ اشباح کا مطلب ہے اجسام یعنی اشیائے عالم۔ طبائع سے مراد ہے طبائع انسانی یا فطرت انسانی۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے اگرچہ سارا جہان حق تعالیٰ کی قدرت اور صفاتِ کمال کا مظہر (جائے ظہور) ہے لیکن چونکہ بظاہر جب کوئی شخص کائنات کو دیکھتا ہے تو اجسام اور اجرام نظر آتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی قدرت اور اس کی ذات و صفات نظر نہیں آتی اس لئے اشیائے عالم کو ذات و صفات حق پر حجاب کا نام دیا گیا ہے۔ جیسے جب تخم کو زمین میں رکھا جاتا ہے تو اس سے درخت ظاہر ہو جاتا ہے اور تخم چھپ جاتا ہے۔ بعد میں جب پھل لگتا ہے اور تخم ظاہر ہوتا ہے تو تخم کے اندر درخت چھپا ہوا ہوتا ہے۔ بعینہٖ جب حق تعالیٰ کی صفت قدرت سے جہان وجود میں آتا ہے تو جہان کی چیزیں ظاہر' اور حق تعالیٰ کی قدرت یا خود حق تعالیٰ اشیاء کے پردے کے پیچھے پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ یا جس طرح ایک محبوب کی زلفیں اس کے حسین چہرہ پر چھا جاتی ہیں تو زلفیں ظاہر ہوتی ہیں اور چہرہ چھپ جاتا ہے اور جب چہرہ ظاہر ہوتا ہے تو زلفیں پس پشت چلی جاتی ہیں۔ اس لئے صوفی شعراء نے اشیائے عالم جن کو تعینات بھی کہا جاتا ہے کا نام حجابات یا زلف رکھا ہے۔ جس طرح زلفوں سے محبوب کا رخ انور محجوب ہو جاتا ہے' اشیائے عالم یا تعینات بھی حق تعالیٰ کے

حسن و جمال کے لئے حجاب کا کام دیتے ہیں۔ جیسے مٹی کا برتن بنایا جائے تو برتن نظر آتا ہے لیکن مٹی چھپ جاتی ہے۔

ترجمہ اور توحید الٰہی کے مضمون کو لیا جائے تو اشیائے عالم کا وجود ثابت کرنا بھی شرک بن جاتا ہے۔

شرح یہاں حضرت اقدس نے موجودات عالم کے وجود تسلیم کرنے کو شرک کا نام اس لئے دیا ہے کہ وحدت الوجود حقیقت ہے۔ وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے اس جہان میں اگرچہ موجودات بہت ہیں لیکن درحقیقت یہ تمام موجودات وجود باری تعالیٰ میں شامل ہیں علیحدہ نہیں ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہ جہان حق تعالیٰ کی صفت تخلیق کا ظہور ہے۔ اب چونکہ صفت موصوف سے جدا نہیں ہے۔ اس لئے موجودات عالم جو صفات حق کا ظہور ہیں وہ بھی حق تعالیٰ کے وجود سے خارج کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ ان سب اشیاء کا وجود ظِلّی، اعتباری اور اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت میں وجود صرف ذات حق کا ہی ہے۔اس عقیدہ کو نظریہ وحدت الوجود کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو تمام اولیاء کرام اور علمائے اہلسنت والجماعت کا مسلک ہے۔ اس لئے حضرت مخدومؒ نے صحیح فرمایا ہے کہ اگر موجودات عالم کا علیحدہ وجود ثابت کیا جائے تو شرک لازم آتا ہے۔ کیونکہ اگر کائنات کا وجود حق تعالیٰ کے وجود سے خارج اور علیحدہ تسلیم کیا جائے تو وجود حق محدود ہو جاتا ہے اور وجود حق کو محدود سمجھنا کفر و شرک ہے۔ اور یہ بھی صحیح فرمایا ہے کہ ذات حق موجودات کے پردے میں چھپ گئی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم مٹی کے برتن یا کھلونے بناتے ہیں تو جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ برتن ہوتے ہیں۔ مٹی پر ہماری نظر نہیں جاتی۔ اسی طرح جب پانی جم کر برف بن جاتا ہے تو ہماری نظر برف کے ٹکڑوں پر پڑتی ہے پانی نظر نہیں آتا۔ اب جس طرح برتن اپنی اصل یعنی مٹی پر حجاب کا کام دیتے ہیں اور برف کے ٹکڑے اپنی اصل

آب پر پردہ کا کام دیتے ہیں بعینہٖ اسی طرح اشیائے عالم ذات باری تعالیٰ پر حجاب بن جاتے ہیں اور ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ یہی اشیاء ہوتی ہیں۔ لیکن انکی اصل یعنی ذات حق پر نظر نہیں پڑتی۔ اب بعض سطحی نظر کے لوگ سوال کرتے ہیں جب جہان میں ذات حق کے سوا کسی اور چیز کا وجود ہی نہیں ہے تو ساجد و مسجود اور عابد اور معبود کا سوال بھی ختم ہو جانا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عالم حقیقت میں وحدت الوجود ضرور ہے لیکن عالم مجاز میں کثرت الوجود ہے اور چونکہ انسان کا روح عالم حقیقت یعنی عالم قدس سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا جسم عالم شہادت یا عالم اجسام سے تعلق رکھتا ہے اس لئے وہ عالم حقیقت اور عالم مجاز یعنی دو جہانوں کا باشندہ ہے۔اس لئے اس کے ذمہ دونوں جہانوں کا حق ادا کرنا ہے۔ روحانی طور پر جب وہ تزکیۂ نفس کے ذریعہ مقام فنا فی اللہ یا عروج پر پہنچتا ہے تو وہاں وحدت ہی وحدت ہے کثرت کا نام و نشان نہیں ہوتا اور جب مقام بقاء باللہ یا نزول پر واپس آتا ہے تو ساجد و مسجود اور عابد و معبود کی تمیز اس پر لازم ہو جاتی ہے۔ اب چونکہ اسلام میں آخری منزل عروج اور فنا فی اللہ نہیں جیسا کہ آگے بیان ہو گا۔ بلکہ آخری منزل بقاء باللہ اور نزول ہے اس لئے اولیاء کرام نماز کے وقت عروج سے نزول کی طرف اور فنا سے بقاء کی طرف آتے ہیں اور حق بندگی ادا کرتے ہیں اور تابع شریعت ہوتے ہیں۔ البتہ جو کمزور طبع کے لوگ اوپر جا کر واپس نہیں آسکتے وہ مجذوب کہلاتے ہیں اور قیود شریعت کی پابندی سے معذور ہوتے ہیں۔ لیکن عرفان کا کمال عروج میں نہیں بلکہ نزول میں ہے جس کا دوسرا نام بقاء باللہ اور عبدیت ہے جو خاصہ ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام کا۔ کیونکہ آپ کو عروج میں بھی کمال حاصل تھا اور نزول یعنی بشریت میں بھی۔ آپ بدرجۂ کمال اور بدرجۂ اتم عابد، ساجد اور شاکر و صابر تھے۔ بالفاظ دیگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عروج یعنی الوہیت (فنا) میں بھی

کمال حاصل تھا اور نزول یعنی بشریت میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس بلند ترین مقام کو جامعیت بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ عرفاء کا قول ہے کہ جس عارف کا عروج بلند ترین ہوتا ہے اس کا نزول بھی قوی ترین اور مکمل ترین ہوتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عروج یعنی فنا فی اللہ میں سب انسانوں سے زیادہ بلند ترین مقام رکھتے ہیں اور نزول یعنی عبدیت یا بشریت میں بھی آپ کا مرتبہ تمام عابدوں اور ساجدوں' شاکروں اور صابروں سے زیادہ بلند ہے۔ اگر مسئلہ نور و بشر پر آپس میں لڑنے جھگڑنے والے علماء کرام ان حقائق کی روشنی میں دیکھیں تو جھگڑا فوراً ختم ہو جاتا ہے اور مقام عرفان اور فنا فی اللہ پر پہنچ کر ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو عروج یعنی فنا فی اللہ میں کمال حاصل تھا آپ کو نزول یعنی بقاء باللہ اور عبدیت یا بشریت میں بھی کمال حاصل تھا۔ یہ آپ کے عروج کا کمال تھا کہ فرمایا : **لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی ملک المقرب و نبی المرسل** (مجھے حق تعالیٰ کے قرب میں وہ بلند مقام حاصل ہے کہ جہاں نہ کسی مقرب فرشتہ کی رسائی ہو سکتی ہے نہ کسی نبی اور مرسل کی)۔ اور نزول یا بشریت میں آپؐ کے کمال کا یہ حال تھا کہ چاند گرہن یا سورج گرہن دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے تھے اور نوافل شروع کر دیتے تھے۔ آندھی آتی تھی یا شدید بارش تو آپؐ ہاتھ باندھ کر نوافل میں مشغول ہو جاتے تھے اور یہ بھی آپ کی عبدیت اور بشریت کا کمال ہے کہ باوجود یہ کہ آپ باعث تخلیق کائنات اور فخر موجودات ہیں پھر بھی ساری رات کھڑے عبادت میں گزار دیتے تھے حتیٰ کہ پاؤں مبارک پر ورم آجاتا تھا اور پاؤں کی انگلیاں پھٹ جاتی تھیں اور ان سے زرد پانی بہنا شروع ہو جاتا۔ نوافل میں روتے روتے آپ کی ریش مبارک اور سینہ مبارک تر ہو جاتا تھا۔ یہ آپ کے کمال عبدیت اور کمال بشریت کی علامت ہے۔ اس لئے آپ کے اتباع میں اولیاء امت کی زبردست اکثریت کا مسلک یہی بقاء

باللہ اور عبدیت کا مقام رہا ہے۔ ہاں گنتی کے چند حضرات ایسے بھی ہوئے ہیں جو مقام فنا میں پھنس کر رہ گئے اور مقام نزول اور عبدیت پر عود نہ کر سکے ان کو مجذوب کہا جاتا ہے۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود

یہاں ایک اور سوال کا جواب بھی دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ بعض سطح بین حضرات کا خیال ہے کہ چونکہ حضرت شیخ اکبر ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک وحدت الوجود غیر شرع تھا' حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کے مقابلے میں نظریۂ وحدت الشہود قائم کیا۔ چونکہ اس وقت اس طویل مسئلہ پر مکمل گفتگو کرنا بے محل ہے اس کے لئے احقر نے ایک اور کتاب تالیف کی ہے جس کا نام "وحدت الوجود اور وحدت الشہود" ہے۔ یہاں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ خود حضرت شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ نے مکتوبات شریف میں فرمایا ہے وحدت الوجود اور وحدت الشہود یا ہمہ اوست اور ہمہ ازوست کے درمیان صرف نزاع لفظی ہے یعنی لفظی اختلاف ہے حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۴۴ دفتر دوم بنام محمد صادق ولد حاجی مومن جس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے :

> "پس جو صوفیاء وحدت الوجود کے قائل ہیں حق پر ہیں اور علماء جو کثرت وجود کا حکم کرتے ہیں حق پر ہیں۔ وجود کا معاملہ حقیقت کی طرح ہے اور کثرت کا معاملہ اس کے مقابلہ میں مجاز کی طرح ہے۔"

نیز حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے مکتوب نمبر ۸۹ دفتر سوم بنام قاضی اسماعیل فرید آبادی میں ان اعتراضات کی تردید فرمائی ہے جو حضرت شیخ روز

بیان بقلی رحمتہ اللہ علیہ نے ہمہ اوست کہنے والوں پر کئے ہیں اور اثنائے تردید میں آپ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کی تائید میں فرماتے ہیں :

"انہوں نے کمال معرفت سے اس مسئلہ دقیقہ کو مشرح کیا اور بابوں اور فصلوں میں تقسیم کر کے صرف و نحو کی طرح جمع کیا۔ باوجود اس کے پھر بھی اس طائفہ میں سے بعض نے اس مراد کو نہ سمجھ کر ان کو خطا کی طرف منسوب کیا اور ان پر طعن و ملامت کی۔ اس مسئلہ کی اکثر تحقیقات میں شیخ اکبر رحمتہ اللہ علیہ حق پر ہیں اور ان پر طعن کرنے والے دور از ثواب ہیں۔ شیخ کی بزرگی اور ان کے علم کی زیادت اس مسئلہ کی تحقیق سے معلوم کرنی چاہئے اور ان پر رد اور طعن نہ کرنی چاہئے۔"

آگے چل کر اسی مکتوب میں حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"صوفیاء جو کلام ہمہ اوست کے قائل ہیں عالَم کو حق تعالیٰ کے ساتھ متحد نہیں جانتے اور حلول و سریان نہیں کرتے بلکہ ظہور اور ظلّیت کے اعتبار سے حمل کرتے ہیں نہ کہ وجود اور تحقیق کے اعتبار سے۔ اگرچہ ان کی ظاہری عبارت سے اتحاد وجودی کا وہم گزرتا ہے لیکن ہرگز ہرگز ان کی مراد یہ نہیں کیونکہ یہ کفر والحاد ہے۔ جب ایک کا دوسرے پر حمل کرنا باعتبار ظہور کے ہے نہ باعتبار وجود کے تو پھر ہمہ اوست کے معنی ہمہ ازوست کے ہیں۔"

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے

پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ دونوں حضرات سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن دونوں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں تطبیق ثابت کی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "مکتوب مدنی" اور شاہ اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "عبقات" میں ثابت کیا ہے کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں برحق ہیں اور دونوں کے درمیان صرف لفظی اختلاف ہے، حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

نوٹ (آگے آنے والی عبارت سخت ادق اور لطیف ہے اور اردو اور انگریزی ترجمہ کرنے والوں نے یہاں ٹھوکریں کھائیں ہیں۔ لہٰذا قارئین کرام ذرا غور و فکر، انہماک اور توجہ سے کام لیں اور صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں)۔

ترجمہ پس حق تعالیٰ نے اس جہان کو مقام حجاب بنایا ہے تاکہ ہر شخص اپنی طبیعت (استعداد و قابلیت) کے مطابق اس اندھیرے میں اپنا مقام تلاش کر کے خوش رہ سکے۔ اور انسان کا اپنا وجود اس کے اور حق تعالیٰ کے درمیان اس مصلحت سے حجاب بن گیا ہے کہ اپنے اندر روح کی آمیزش سے انسان میں احساس خودی پیدا ہو گیا ہے اور قرب حق کے باوجود اپنے آپ کو دور اور بعید محسوس کرتا ہے۔

شرح اس پردہ پوشی میں مصلحت یہ ہے کہ جس طرح بادل کی وجہ سے آدمی آفتاب کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہے اور اس کی چندھیا دینے والی کرنوں سے امان پاتا ہے اسی طرح اگر آفتاب ذات حق اور انسان کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ ہوتا تو کوئی شخص حسن و جمال حق کی تاب نہ لاسکتا اور مجنون اور دیوانہ ہو جاتا۔ جس طرح تھکے ماندے انسان کو رات کے وقت روشنی بند کر کے سونے میں آرام ملتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کے آفتاب حسن و جمال سے محجوب رہ کر انسان کو

ایک گونا سکون ملتا ہے اور اپنے کاروبار میں مشغول ہو سکتا ہے ورنہ زندگی ناممکن ہو جاتی۔

ترجمہ اب چونکہ قرب کے باوجود انسان حجابات کی وجہ سے اپنے آپ کو حق تعالیٰ سے دور محسوس کرتا ہے اور نہ ہی اس کی محدود عقل میں اسرار الٰہی آسکتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ غفلت کا بھی مرتکب ہو جاتا ہے اور غفلت کی وجہ سے گمراہی کی حد تک بھی جا سکتا ہے اس لئے حق تعالیٰ نے اس کی اس مجبوری یا معذوری کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۝ (قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے' یعنی کائنات کی تخلیق اور ساخت جس نہج پر ہوئی ہے اس سے انسان خسارے میں رہ گیا ہے یعنی مشاہدۂ حق سے محجوب ہو گیا ہے) آگے چل کر فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (سوائے ان لوگوں کے جو صحیح عقائد اور صحیح اعمال رکھتے ہیں)۔

شرح اس آیۂ مبارکہ میں انسان کی فطرت اور جبلت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ تقدیر اور تدبیر الٰہی سے اگرچہ انسان اپنے وجود کی وجہ سے محجوب ہے تاہم جب وہ ذات حق پر ایمان لاتا ہے یعنی اس کو ہر جگہ موجود تسلیم کرتا ہے اور نیک اعمال کے ذریعے اس کا تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے تو پھر اس کے تمام حجابات دور ہو جاتے ہیں اور مشاہدۂ حق کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسی آیت میں آگے چل کر فرمایا ہے وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ یعنی جب ایمان اور اعمال صالح کی بدولت قرب حق میں پہنچ جاؤ تو پھر یہ کام کرو کہ **تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ** اور ذات حق کے ساتھ قرب کے مقام کو مضبوطی سے تھام لو اور صبر یعنی ہمت و استقلال کے ساتھ اسی مقام پر مضبوطی سے جمے رہو۔ اس ساری تاکید کا مطلب یہ ہے کہ جیسا کہ مقربین بارگاہ کو معلوم ہے مقام قرب میں قیام کرنا بے حد مشکل اور کٹھن ہوتا ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ :

نزدیکاں رابیش بود حیرانی

"قرب حق میں مقربین کی حالت نہایت نازک ہوتی ہے"

ایک تو آداب قرب اور آدابِ بارگاہ معلیٰ میں حضوری کی وجہ سے نزاکت ہوتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ حسن و جمال محبوب حقیقی کی برق تجلی کے سامنے جو چیز آتی ہے جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ اس حالت کو ایک بزرگ نے یوں بیان کیا ہے ۔

من شمع سوزاں تو صبح دل ربائی
میرم اگر نہ بینم سوزم چوں رخ نمائی
در قرب آنچناں کہ گفتم در بعد آنچناں کہ آنم
نے تاب وصل دارم نہ طاقت جدائی

(یعنی اے محبوب میری حالت ایک جلتی ہوئی شمع کی طرح ہے اور تیرا رخ انور صبح متجلی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تیری عدم موجودگی میں شمع کی طرح جلتا رہتا ہوں اور جب تو رخ انور سے برقعہ اٹھاتا ہے تو شمع کی طرح میری موت واقع ہو جاتی ہے لہٰذا نہ میں جدائی برداشت کر سکتا ہوں نہ میرے اندر تاب دیدار ہے)۔

ترجمہ نیز حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنی امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے پیش کیا تو انہوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا لیکن انسان نے اسے قبول کر لیا کیونکہ وہ ظلومی اور جہولی تھا۔

شرح انگریز مترجم نے نہ صرف اس اہم آیت کو ترک کر دیا ہے بلکہ اس

کے ساتھ کافی عبارت کو حذف کر دیا ہے شاید اس وجہ سے کہ مضمون ما سبق و مابعد کے ساتھ اس کا ربط ان کے لئے مشکل بلکہ محال تھا۔ اردو ترجمہ کرنے والے حضرات نے بھی اس آیت کا نہ صرف لفظی بلکہ اوپری سطح کا ترجمہ کر دیا اور اس کے حقائق و معارف پر قلم نہیں اٹھائی اور نہ ہی شاید ان کو عبارت کے سیاق و سباق سے ربط مل سکا۔ جہاں تک سابق مضمون سے اس آیت شریفہ کے ربط کا تعلق ہے قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تقدیر و تدبیر الٰہی میں کائنات کی ساخت اس طرح واقع ہوئی ہے کہ نہ صرف موجودات کا وجود انسان اور ذات حق کے درمیان حجاب بن گیا ہے بلکہ انسان کا اپنا وجود بھی حجاب بن گیا ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں کہ کس طرح انسان کا وجود اس کے اور حق کے درمیان حجاب بن گیا ہے۔ عام سطح کے لوگ اس آیہ شریفہ کے یہ معنی کرتے ہیں کہ آسمان' زمین اور پہاڑوں نے امانت قبول نہ کی اور انسان نے قبول کر لی کیونکہ وہ ظالم اور جاہل تھا۔ ظالم اور جاہل مذمت کے الفاظ ہیں لیکن اس آیت میں حق تعالیٰ نے انسان کی مذمت نہیں بلکہ تعریف فرمائی ہے کیونکہ جس امانت کو آسمان یعنی آسمان والے فرشتے اور زمین' پہاڑ وغیرہ جیسے عظیم الجثہ موجودات برداشت نہ کیا سکے اور انسان جیسا چھوٹا سا خاکی پُتلا قبول کرے تو یقیناً وہ قابل تعریف ہو گا نہ کہ قابل مذمت۔ چنانچہ یہاں ظلوما" بھولا" کا مطلب ظالم اور جاہل نہیں ہے بلکہ انسان کی ساخت اور جبلت بیان کی گئی ہے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر یہ امانت قبول کرنے کی صلاحیت موجود تھی اس لئے اس نے اسے قبول کر لیا یاد رہے کہ حق تعالیٰ نے تخلیق کائنات کی جو وجہ بیان فرمائی ہے یہ ہے۔

کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق (میں حسن و جمال اور کمالات کا پوشیدہ خزانہ تھا مجھے یہ خواہش ہوئی کہ کسی آئینہ کے اندر اپنے

حسن و جمال کا مشاہدہ کروں اس لئے میں نے کائنات کو پیدا کیا) اب چونکہ فرشتے سراپا نور تھے ان کے اندر آئینہ بننے کی صلاحیت نہیں تھی اور چونکہ زمین اور پہاڑ وغیرہ سراپا ظلمت تھے یعنی سراپا مادہ تھے وہ بھی آئینہ نہیں بن سکتے تھے۔ لیکن چونکہ انسان مرکب ہے روح اور جسم کا' اس کی ایک طرف روح کی روشنی سے روشن تھی اور دوسری طرف جسم کی تاریکی سے تاریک تھی۔ اس لئے حسن و جمال الہی کا عکس قبول کرنے کی صلاحیت اس کے اندر موجود تھی اس لئے اس نے فوراً امانت کو قبول کر لیا۔ وہ امانت کیا تھی خلافت الہیہ تھی جس کے ذریعے اس کو منصب امامت عالم اور خلافت و نیابت الہیہ سپرد ہونا تھا اس سے ظاہر ہے کہ انسان کو ظلومی اور جہولی یعنی حجاب اور اندھیرے میں رکھنے کی مصلحت کیا تھی۔

ترجمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی فرمایا کہ :

خلق اللّٰہ الخلق فی ظلمتہ ثم القی علیہ نورا

(اللہ تعالیٰ نے کائنات کو اندھیرے میں پیدا فرمایا اور پھر اس پر نور کی تجلی فرمائی)۔

شرح اس حدیث پاک میں بھی کائنات اور انسان کی جبلی ظلمت کو بیان فرمایا ہے اور پھر اس نور کی پھینک سے منور کرنا سمجھایا ہے۔ نور کی پھینک کیا ہے وہی آیہ مبارکہ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (میں نے انسان میں اپنی روح پھونکی) کی تجلی ہے جو تزکیۂ نفس کے ذریعے نشوونما پاتی ہے جس سے حق تعالیٰ اور انسان کے مابین تمام حجابات پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

ترجمہ پس یہ حجابات انسان کی فطرت میں رکھے گئے ہیں اس وجہ سے کہ اس کی طبیعت اور اس کی عقل کا تقاضا یہی تھا کہ وہ جہالت کو پسند کرے۔

شرح یعنی ذات حق کے آفتاب عالم تاب یا عالم سوز اور اس کے درمیان ابر

کی طرح کوئی چیز حائل ہو جائے تاکہ وہ سکون سے زندگی بسر کر سکے۔ اور اس کی طبیعت بشری اور اس کی عقل بشری حجاب بن کر درمیان میں حائل ہو گئی۔

ترجمہ پس اس نے حجاب کو جان دے کر خرید کر لیا یعنی جان سے بھی زیادہ محبوب رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تجلی جمال الٰہی سے محروم اور اسرار و رموز ربانی سے بے خبر ہے اور حیوانات کی طرح اپنی جہالت پر خوش ہے' اپنی نجات سے دور بھاگ گیا ہے' توحید کے ذوق سے بے گانہ' جمال احدیت سے بے بہرہ' ذوق وصال سے معرا اور مشاہدۂ حق سے مبرا ہو کر حرص و ہوس کا شکار ہو گیا ہے اور خداوند عالم سے منہ موڑ لیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حیوانیت (نفسانی خواہشات) نے اس پر غلبہ پا لیا ہے اور کھانے' پینے' سونے اور شہوت رانی کے سوا اسے کوئی کام نہیں۔

لیکن خداوند تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو ان آفات سے بچا لیا اور فرمایا ہے

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

(ان کو چھوڑ دیجئے کہ کھائیں اور دنیا سے فائدہ اٹھائیں اور تمنائیں قائم کریں۔ ان کو جلدی معلوم ہو جائے گا)۔

اس وجہ سے کہ نفسانیت کے غلبہ نے ان کو مشاہدۂ حق سے محروم کر دیا ہے اور توفیق عمل کی بجائے حرمان اور بدنصیبی ان کے حصے میں آئی ہے۔ حتیٰ کہ نفس امارہ کی غلامی اختیار کر لی ہے اور یہی حجاب اعظم اور منبع شر اور بدکاری ہے جیسے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (بے شک نفس امارہ ان کو برائی پر آمادہ کرتا ہے)۔

شرح اس ساری عبارت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور خداوند عالم کے مابین حجابات حائل کرنے میں یہ حکمت تھی کہ اگر یہ حجابات نہ ہوتے تو انسان حسن

ازل کی برق تجلی سے دیوانہ اور مجنون ہو جاتا اور جس کام کے لئے کائنات اور انسان کو پیدا کیا گیا ہے وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچتا۔ لیکن چونکہ حق تعالیٰ نے انسان کے قلب کے اندر نور کی شمع روشن کر رکھی ہے اس کو اختیار دیا گیا کہ اس کو روشن کر کے حجابات ظلمت کو دور کر سکتا ہے اور مشاہدۂ جمال الٰہی سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

ترجمہ اب میں کتاب کا آغاز کرتا ہوں اور تمہاری خواہش کے مطابق (قرب حق) کے مقامات بیان کرتا ہوں اور جو حجابات درمیان میں حائل ہیں ان کی بھی تشریح کرتا ہوں اور اہل علم و ادب کے قواعد اور مشائخ عظام کے اقوال اور دلچسپ حکایات کے ذریعے شرح و بسط کے ساتھ بیان کروں گا تاکہ تمہارا مقصد پورا ہو جائے نیز علمائے ظواہر میں سے بھی جو شخص پڑھے اس کو معلوم ہو جائے کہ علم تصوف کی جڑیں مضبوط اور شاخیں بار آور ہیں اور تمام مشائخ تصوف صاحبِ علم تھے جنہوں نے اپنے مریدوں کو علم پڑھایا اور طلبِ علم میں ان کو ذوق و شوق دلایا۔ نہ کہ بے ہودہ کاموں میں مشغول رکھا۔ چنانچہ بیشتر مشائخ عظام نے حقائق تصوف پر کتابیں تصنیف کی ہیں اور نہایت ہی لطیف پیرائے میں حقائق و اسرار ربانی بیان فرمائے ہیں و باللہ التوفیق (سب توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے)۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
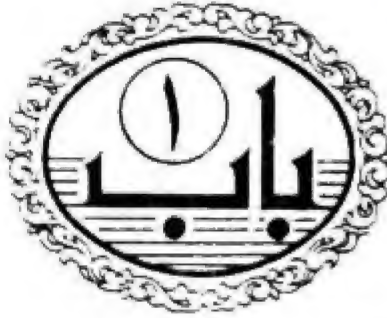
خداوند تعالیٰ نے علماء کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (بیشک اللہ کے بندوں میں سے علماء خدا سے ڈرتے ہیں) پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے **طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ** (علم کا طلب کرنا تمام مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں پر فرض ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے **اطلبوا العلم ولو کان بالصین** (علم طلب کرو خواہ چین میں کیوں نہ ہو)۔

شرح ان آیات و احادیث میں علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ بعض کم فہم لوگ اس آخری حدیث میں لفظ چین سے یہ مراد لیتے ہیں کہ چین چونکہ ایک اشتراکی (کمیونسٹ) ملک ہے اس حدیث میں اشتراکیت کی تعلیم حاصل کرنے کا اشارہ ہے۔ کس قدر جہالت ہے۔ اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے

زمانہ مبارک میں ملک چین میں اشتراکیت کا نام و نشان ہی نہیں تھا۔ چین سے آپ کی مراد دور و دراز ملک سے ہے کیونکہ ملک عرب سے چین بہت دور تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ اگر علم سیکھنے کی خاطر چین تک بھی جانا پڑے تو سیکھنا چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس حدیث میں علم سیکھنے کی تاکید فرمائی ہے نہ کہ جہالت کی۔ اشتراکیت چونکہ سراسر جہالت' الحاد اور بے دینی' دہریت اور کفر ہے یہ علم کی ضد تو کہلایا جا سکتا ہے علم نہیں ہے۔

ترجمہ یاد رہے کہ علم بہت ہے اور عمر کوتاہ۔ اس لئے تمام علوم کا حاصل کرنا انسان کیلئے فرض نہیں ہے، مثلاً علم نجوم' طب' حساب' صنعت و حرفت وغیرہ۔ ہاں ان علوم میں سے اسی قدر جاننا ضروری ہے جس کا تعلق شریعت سے ہو۔ مثلاً علم نجوم میں سے اس قدر جاننا فرض ہے کہ رات کے وقت اوقات کا تعین ہو سکے۔ اور طب کا اس قدر جاننا ہر مسلمان کیلئے فرض ہے کہ صحت بحال رہ سکے اور علم حساب کا اس قدر جاننا فرض ہے کہ وراثت اور عدت کا حساب لگا سکے۔ غرضیکہ ہر علم کا اس قدر سیکھنا فرض ہے کہ جو عمل کیلئے ضروری ہو کیونکہ حق تعالیٰ نے اس علم کے سیکھنے کی مذمت فرمائی ہے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ (لوگ وہ علم سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان دیتا ہے نفع نہیں پہنچاتا) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایسے علم سے پناہ مانگی۔ فرمایا **اعوذبک من علم لا ینفع** (اے اللہ میں تجھ سے اس علم سے پناہ مانگتا ہوں جس میں کوئی فائدہ نہیں)۔

شرح ان آیات و احادیث سے بھی واضح ہو گیا کہ جس علم سے کوئی فائدہ نہ ہو اس کا سیکھنا بے کار ہے۔ اور علم اشتراکیت تو نہ صرف بے کار ہے بلکہ سخت نقصان دہ اور کفر اور الحاد ہے اس کی حدیث میں کیسے تائید ہو سکتی ہے۔ دوسری

بات یہ ہے کہ ان احادیث و آیات میں صرف فرض کی بات ہو رہی ہے کہ مومن کیلئے شریعت پر عمل کرنے کیلئے کن کن علوم کو سیکھنا چاہئے اور کس قدر سیکھنا چاہئے۔ باقی رہا علم طب' نجوم' انجینئرنگ وغیرہ میں کمال' دنیاوی اغراض کے لئے ان علوم کو جس قدر حاصل کیا جائے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک اور حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "ہر اچھی بات مومن کا گم شدہ اونٹ ہے جہاں مل جائے اسے پکڑ لینا چاہئے۔"

اس سے سائنس کے تمام علوم کے حصول کی تائید ہوتی ہے لیکن کفر و شرک اور فتنہ و فساد کی باتیں سیکھنا گناہ ہے۔

ترجمہ اور علم کے ساتھ عمل کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے **المتعبد بلا فقه كالحمار في الطاحونة** (علم دین کے بغیر عابد کولہو کے بیل کی طرح ہے جو جس قدر چلے اسی جگہ پر ہوتا ہے جہاں شروع میں تھا)۔

شرح یاد رہے کہ اسلام میں انسانی زندگی کی غرض و غایت قرب و معرفت الٰہی ہے اور تمام عبادات یعنی نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ سب کا مقصد حصول قرب و معرفت الٰہی ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو اپنی حالت دیکھ کر غور کرنا چاہئے کہ آیا اس کی عبادت سے اس کو قرب حق میں اضافہ ہو رہا ہے یا دنیا سے محبت زیادہ ہو رہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی ایک اور حدیث میں فرمایا ہے کہ جس نماز سے انسان کے گناہ نہیں رک سکتے وہ نماز نہیں ہے۔ چنانچہ اولیاء کرام اور مشائخ عظام کا جو مسلک ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اولین فرض زہد و تقویٰ' اور رات دن قرب حق میں ترقی کے لئے جدوجہد کرنا

تھا۔ اولیاء کرام کا طریقہ وہی رہا ہے کہ اولیت حصول قرب و معرفت کو دیتے رہے ہیں اور رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابہ کرام کی طرح ان کو اور ان کے خلفاء و مریدین کو عملی طور پر حق تعالیٰ کا قرب و وصال نصیب بھی ہوا ہے جس کی بدولت وہ اس قدر مقبول حق' مقبول رسولؐ اور مقبول خلق ہوئے کہ سینکڑوں ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی آج تک ان کے مزارات اور تعلیمی مراکز آباد اور پر رونق ہیں اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت رکھنے والے جانباز عاشقوں کا وہاں ہر وقت تانتا بندھا رہتا ہے اور ان کے عرسوں پر اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ جس کی کسی اور عالم' فاضل اور قومی راہنما کی قبور یا تعلیمی مراکز پر مثال نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام محبت کا مذہب ہے اور خدا کی محبت ہر شخص اور ہر کس و ناکس کے دل میں موجزن ہے۔ چونکہ اولیاء اللہ کی تعلیمات میں حق تعالیٰ کی محبت کا عنصر غالب ہوتا ہے لوگ بے ساختہ اور والہانہ طریق پر ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں لیکن زاہدان خشک منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اسلام میں شدید حب اللہ کی شہادت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی کہ خود خالق کائنات نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (مومنین کو حق تعالیٰ کے ساتھ شدت سے محبت ہوتی ہے) نیز فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے) نیز ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا **الا لا ایمان من لا محبتہ لہ ○ الا لا ایمان من لا محبتہ لہ ○ الا لا ایمان من لا محبتہ لہ** (جس کے دل میں محبت نہیں اس کا ایمان بھی نہیں ہے) یہ کلمات آپ نے زور دے کر تین مرتبہ فرمائے۔ اس لئے ہر عابد' زاہد' عالم' فاضل' مومن اور مسلمان کا فرض ہے کہ ہر وقت یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ

اس حدیث پاک کے مطابق وہ کولہو کے بیل کی طرح نقطہ آغاز پر تو نہیں کھڑا۔ ترقی کی ظاہری علامت یہ ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ کا قرب محسوس ہو۔ ہر کام میں اس کو تائید ایزدی حاصل ہو جاتی ہے' خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زیارت اور ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو حق تعالیٰ کی جانب سے اس کو خواب میں تنبیہہ ہو جاتی ہے۔ بزرگان دین کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ کشف کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ گذشتہ اور آنے والے واقعات کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ اس کے مخالفین نقصان اٹھاتے ہیں اور قدم قدم پر اس کو حق تعالیٰ سے امداد ملتی ہے اور بالآخر فنا فی اللہ اور بقاء باللہ جیسے بلند مراتب نصیب ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر لوگوں کو قرب حق کی نوعیت کا علم نہیں ہے اور چند نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو مقرب بارگاہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

علم افضل ہے یا عمل

ترجمہ میں نے عوام کا ایک گروہ دیکھا جو علم کو عمل پر فضیلت دیتے تھے اور بعض ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو عمل کو علم پر فضیلت دیتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں گروہ باطل ہیں اس وجہ سے کہ عمل بے علم عمل نہیں کہلایا جا سکتا۔ عمل اس وقت تک عمل نہیں بنتا جب تک کہ اس کو علم کی تائید حاصل نہ ہو۔ علم کی وجہ سے عمل کا ثواب ملتا ہے۔ مثلاً نماز کو لیجئے جب تک پاکی اور پلیدی کا علم نہ ہو گا یا پانی کے پاک اور ناپاک ہونے کا علم نہ ہو' قبلہ کی سمت کا علم نہ ہو' نماز کی نیت کا علم نہ ہو' اور ارکان نماز کا علم نہ ہو نماز صحیح نہیں ہوگی۔ لہٰذا عمل بغیر علم کے عمل نہیں بلکہ بد عملی ہے اور عمل کو علم سے جدا کرنے والا جہالت کا شکار ہے۔

اور جو لوگ علم کو عمل پر فضیلت دیتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں کیونکہ علم بے عمل علم نہیں ہوتا جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (اہل کتاب میں سے بعض لوگوں نے کتاب اللہ کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا ہے جیسا کہ اسے جانتے ہی نہیں) اس آیت میں بھی عالم بے عمل کا نام عالموں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ علم سیکھنا اور یاد رکھنا بھی عمل میں شامل ہے اور اسی سے اس کو ثواب حاصل ہوتا ہے۔ اگر علم کے ساتھ عمل شامل نہ ہو تو اس علم کے حاصل کرنے کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔

علم کو عمل پر فضیلت دینے والوں کے بھی دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ علم کو اس لئے افضل سمجھتا ہے کہ اس سے ان کو خلق خدا کے درمیان جاہ و مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عمل کو ضروری نہیں سمجھتے۔ چونکہ وہ علم کی غرض و غایت نہیں جانتے اس لئے علم کو عمل سے جدا کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ عالم کہلا سکتے ہیں نہ عامل۔ یہ جاہل یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہمیں قال کی ضرورت نہیں حال کی ضرورت ہے۔

شرح قال سے ان کی مراد علمی قیل و قال ہے اور حال سے مراد روحانی کیفیت کا قلب پر غالب ہونا ہے۔ اس قسم کے جاہل صوفی آج بھی بہت ہیں جو علم شریعت اور شریعت کی پابندی سے پیچھا چھڑانے کی خاطر اپنے آپ کو حال مست ظاہر کرتے ہیں۔ ان کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ حال بغیر قال ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا جب تک شریعت کی پابندی نہ کی جائے روحانی ترقی ناممکن ہے اور یہ جو حضرت مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ۔

قال را بگزار و مرد حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

(یعنی زبانی جمع خرچ کو چھوڑ دو اور حال اختیار کرو جس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کسی مرد کامل کے پاؤں کی خاک بن جاؤ) اس شعر میں تو الٹا عمل کی تاکید آئی ہے کہ زبانی باتوں کو چھوڑ کر مرد کامل کے زیر ہدایت عبادات' ریاضات اور مجاہدہ کرو اور حال حاصل کرو یعنی عملی طور پر روحانی پرواز میں منہمک ہو جاؤ لیکن افسوس ہے کہ جہلا نے اپنی کاہلی کے پیش نظر اس عظیم الشان شعر کے معنی بھی الٹ دیئے ہیں مرد کامل کے پاؤں کی خاک بن جانا عمل نہیں تو اور کیا ہے ؟

ترجمہ حضرت خواجہ ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے راستہ میں ایک پتھر دیکھا جس پر لکھا ہوا تھا کہ "اسے الٹا کرو" جب میں نے اسے اٹھا کر الٹا کیا تو اس پر یہ لکھا ہوا دیکھا **انت لاتعمل بما تعلم فکیف تطلب مالا تعلم** (تم اپنے علم پر عمل نہیں کرتے لہذا جس کا تجھے علم نہیں اس کو کس طرح پاؤ گے) اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے علم کو عمل میں لاؤ تاکہ علم و عمل کی برکت سے تجھے خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو سکے۔

نیز حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ **ھمتہ العلماء الد رایہ و ھمتہ السفھلہ الروایتہ** (علماء اپنی تمام ہمت درایت یعنی غور و خوض پر صرف کرتے ہیں اور جہلا اپنی ہمت روایت پر یعنی اقوال نقل کرنے پر) اس کی وجہ یہ ہے کہ جہالت کی باتوں سے علماء مبرا ہوتے ہیں اور جو محض علم کے ذریعے جاہ و مرتبہ تلاش کرتا ہے عالم نہیں جاہل ہوتا ہے کیونکہ طلب جاہ و مرتبہ جہالت ہے۔ بات یہ ہے کہ علم سے بڑھ کر کوئی اور مرتبہ ہی نہیں ہے۔ کیونکہ جب علم نہ ہو تو انسان حق تعالیٰ کی ذات و صفات کو نہیں سمجھ سکتا یہ علم ہی ہے کہ جس

کی بدولت انسان تمام مقامات (قرب) شواہد (یعنی کشف) اور مراتب (منازل سلوک) پر فائز ہوتا ہے۔

شرح یاد رہے کہ قرب حق کے لاتعداد مدارج و مراتب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات حق بے نہایت' بے پایاں اور لامحدود ہے لہٰذا کسی ایک مقام قرب پر سالک اکتفا نہیں کر سکتا بلکہ جب قرب کی ایک منزل پر پہنچتا ہے تو اسے اوپر ایک اور منزل نظر آتی ہے۔ جب وہاں پہنچتا ہے تو اوپر اور منزل نظر آتی ہے غرضیکہ ساری عمر قرب حق میں پرواز کرتا ہے لیکن آخری منزل تک رسائی نہیں ہوتی کیونکہ یہاں آخری منزل ہی کوئی نہیں۔ یہ وہ سمندر ہے کہ جس کا دوسرا کنارہ ہی نہیں۔ سعدی رحمتہ اللہ علیہ اس حال کی یوں ترجمانی فرماتے ہیں ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ محبوب حقیقی کے حسن و جمال کی کوئی حد ہے نہ سعدی کے حمد و ثناء کی۔ اس کی مثال اس مریض استسقیٰ کی سی ہے جو دریا کے کنارے بیٹھا پانی پی پی کر مر جاتا ہے اور دریا اسی طرح چلتا رہتا ہے)۔

فصل

علم کی اقسام

جاننا چاہئے کہ علم کی دو اقسام ہیں اول علم خالق تعالیٰ' دوم علم مخلوق (یعنی انسان کا علم) اور انسان کا علم حق تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ علم الٰہی حق تعالیٰ کی صفات قدیم میں سے ایک صفت ہے اور

اس کی صفات کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ اور ہمارا علم ہماری صفت ہے اور ہماری صفات محدود ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (اور ہم نے آپ کو جو علم عطا کیا ہے وہ قلیل ہے) ۔

شرح اس آیت سے پہلے حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ یعنی جو لوگ آپ سے روح کی حقیقت کے متعلق دریافت کرتے ہیں ان کو بتا دیں کہ روح عالم امر کی چیز ہے جس کے متعلق آپ کو ہم نے قلیل علم عطا کیا ہے۔ لفظ قلیل کو دیکھ کر بعض حضرات کہتے ہیں کہ دیکھو خدا تعالیٰ نے خود فرما دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا علم قلیل ہے وہ کیسے غیب کا علم جان سکتے ہیں اور کیسے حاضر و ناظر ہو سکتے ہیں لیکن یاد رہے کہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں ماہرین علم نجوم کا کہنا ہے کہ ہمارے اس نظام شمسی کے علاوہ لاکھوں اور سورج اور لاکھوں اور نظام شمسی موجود ہیں اور ہمارے نظام شمسی کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اس نظام شمسی کا زمین سے سب سے دور ستارہ جس کا نام ملٹ ہے اس قدر فاصلے پر ہے کہ کروڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی روشنی زمین تک نہیں پہنچی اور روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ باقی لاکھوں آفتابوں اور ان کے نظام ہائے شمسی کی وسعت کا کیا حال ہو گا۔ یہ تو ظاہری ناسوتی کائنات کا حال ہے۔ اولیاء کرام کا مشاہدہ ہے کہ اس ناسوتی کائنات کے علاوہ اٹھارہ ہزار اور روحانی جہان ہیں جن کی سیر وہ کرتے رہتے ہیں جب کائنات اور اس کے علاوہ اٹھارہ ہزار جہانوں کی سیر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے غلامانِ غلامان کو حاصل ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیر اور علم کی وسعت کا اندازہ آپ خود لگا لیں۔ یہ جو لفظ قلیل استعمال کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ظاہری محدود کائنات اور باطنی اٹھارہ ہزار محدود

جہانوں کے علاوہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا جہان اس قدر وسیع' بے پایاں' بے نہایت اور لامحدود ہے کہ عقل کام نہیں کر سکتی۔ جب ذات حق لامحدود ہے تو اولیاء اور انبیاء کا علم اس کا کہاں احاطہ کر سکتا ہے۔ اس لئے اگرچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم بہت بہت اور بہت ہی زیادہ اور وسیع ہے لیکن حق تعالیٰ کی کل کائنات اور حق تعالیٰ کی ذات و صفات کو احاطہ میں نہیں لا سکتا اس لئے لفظ قلیل استعمال کیا گیا۔ یار لوگ یہ کہہ کر خوش نہ ہوں کہ جس طرح ہمارا علم قلیل ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم بھی قلیل ہے۔

ترجمہ علم صفات حمیدہ میں سے ایک صفت ہے۔ اور اس کا کام مطلوب چیز کی حقیقت معلوم کرنا اور بیان کرنا ہے۔ اور علم کی بہترین صفت یہ ہے کہ **العلم صفتہ یصیر الجاھل بھا عالما**" (علم ایک ایسی صفت ہے جس سے جاہل عالم ہو جاتا ہے) نیز خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاللّٰهُ مُحِيطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (اللہ کافروں پر محیط ہے) نیز فرمایا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (اللہ ہر چیز کو جانتا ہے) اس سے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کو کائنات کی ہر چیز کا علم ہے۔ اس لئے انسان کے علم اور علم الٰہی میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کا علم نہ قابل تجزیہ ہے نہ قابل تقسیم۔ اس کے علم کا کمال اس کے افعال (مخلوقات) سے ہو سکتا ہے کیونکہ فعل (خلق) کا ظہور علم کے مطابق ہوتا ہے چنانچہ اس کا علم تمام ظاہری و باطنی مخلوق پر حاوی ہے۔

شرح ظاہری چیزوں میں یہ کائنات شامل ہے اور باطنی چیزوں میں ارواح' ملائک' جنت' دوزخ اور دیگر تمام روحانی جہان شامل ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تمام ظاہری و باطنی اشیاء سے بخوبی آگاہ ہے۔

ترجمہ لہٰذا طالب کو چاہئے کہ جو کام کرے یہ سمجھے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔

حکایت روایت ہے کہ بصرہ میں ایک رئیس رہتا تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنے باغ میں گیا اور اس کی نظر باغ کے مالی کی بیوی کے حسن و جمال پر پڑی۔ اس نے کسی بہانے مالی کو باہر بھیج دیا اور اس کی بیوی سے کہا کہ سب دروازے بند کر دو۔ اس نے کہا جناب میں نے سب دروازے بند کر دیئے ہیں لیکن ایک دروازہ ایسا ہے جو مجھ سے بند نہیں ہوتا۔ رئیس نے پوچھا وہ کون سا دروازہ ہے اس نے جواب دیا کہ یہ وہ دروازہ ہے جو ہمارے اور خدا تعالیٰ کے درمیان ہے۔ یہ سن کر رئیس بہت شرمندہ ہوا اور توبہ کی۔

چار علم حاصل کرنے کے بعد تمام علوم سے چھٹکارا

حضرت شیخ حاتم اصم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے چار علوم اختیار کر لئے تو باقی تمام علوم سے مجھے چھٹکارا ملا۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ وہ چار علم کیا ہیں تو فرمایا کہ ایک یہ کہ رزق مقسوم ہے یعنی جو کچھ قسمت میں لکھا ہے ضرور مل کر رہے گا اور کوشش سے زیادہ یا کم نہیں ہو گا اس سے مجھے سکون نصیب ہوا۔ دوسرا علم یہ ہے کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کا مجھ پر حق ہے جو میرے سوا کوئی اور شخص ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہو گیا۔ تیسرا علم یہ ہے کہ موت میری تلاش میں ہے جس سے بھاگ نہیں جا سکتا۔ چوتھا علم یہ ہے کہ خدا میرے حال کا دانا بینا ہے اس لئے ہر کام میں میں نے اس سے شرم کیا اور نامناسب کاموں سے اجتناب کیا۔ کیونکہ جب بندہ کو معلوم ہو جائے کہ حق تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے تو پھر اسے برے کاموں سے شرم آنا چاہئے۔

علم بندہ جہاں تک انسان کے علم کا تعلق ہے اس میں دو امور کا علم لازمی ہے۔ اول علم شریعت، دوم علم معرفت۔ تاکہ ان علوم کے ذریعے وہ وقت کو پہچان

سکے۔

شرح علم روحانیت کی اصطلاح میں وقت سے مراد سالک کی اپنی روحانی کیفیت یا منزل ہے جس کا سمجھنا معرفت کہلاتا ہے۔

ترجمہ وقت یعنی روحانی کیفیت کی پہچان یہ ہے کہ تمام امور کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کو سمجھ سکے۔ علم وقت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اصل یعنی جڑ دوسری فرع یعنی شاخ۔ اصل کا ظاہری پہلو کلمہ شہادت ہے یعنی توحید و رسالت کا اقرار اور اس کا باطنی پہلو معرفت حق ہے۔ اور فرع کا ظاہری پہلو عمل بر شریعت ہے اور باطنی پہلو نیت کا صحیح کرنا ہے۔ ظاہر کے بغیر باطن اور باطن کے بغیر ظاہر ناممکن ہے۔ ظاہر کے پیچھے باطن (حقیقت) نہ ہو تو یہ نفاق یعنی (منافقت) ہے اور باطن کے ساتھ ظاہری عمل نہ ہو تو یہ زندقہ (بے دینی) ہے۔ اگر آدمی صرف ظاہری شریعت پر عمل پیرا ہے تو یہ ایک نقص ہے اور اگر شریعت پر عمل نہ ہو تو باطن ہوا و ہوس کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔

علم حقیقت کے ارکان علم حقیقت کے تین رکن ہیں۔

اول علم ذات حق (توحید ذاتی)

دوم علم صفات حق (توحید صفاتی)

سوم علم افعال حق (توحید افعالی)

علم شریعت علم شریعت کے بھی تین ارکان ہیں۔

اول علم کتاب (قرآن حکیم)

دوم علم سنت (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

سوم علم اجماع امت

علم حقیقت کے تینوں ارکان یعنی علم ذات الٰہی، علم صفات الٰہی اور علم

افعال الٰہی کا ثبوت مندرجہ ذیل آیات مبارکہ میں واضح ہے فرمایا فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) نیز فرمایا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ (جان لو کہ اللہ تمہارا آقا ہے) نیز فرمایا اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ (کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنا سایہ پھیلایا ہے یعنی موجودات عالم، ذات و صفات حق کے عکوس و ظلال ہیں) نیز فرمایا اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (کیا تم نہیں دیکھتے کہ اونٹ کیسے پیدا کیا گیا ہے)۔ غرضیکہ اس قسم کی آیات بہت ہیں جن میں افعال الٰہی پر غور کرنے کی تاکید آئی ہے تاکہ تو خالق کی صفات تخلیق کو پہچان سکے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ **من علم ان اللّٰہ تعالٰی ربہ و انی نبیہ حرم اللّٰہ تعالٰی لحمہ و دمہ علی النار** (جس نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ میرا رب ہے اور میں اس کا نبی ہوں اللہ تعالیٰ اس کے گوشت اور خون پر آتش دوزخ حرام قرار دیتا ہے)۔

لوازمات علم ذات الٰہی

علم ذات حق کے شرائط و لوازمات یہ ہیں کہ ہر عاقل و بالغ کو سمجھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ اپنی ذات قدیم کے ساتھ موجود ہے اور اس کی ذات کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ وہ نہ کسی مکان میں سما سکتا ہے نہ زمان میں۔ اور وہ سمت و طرف سے بالاتر ہے۔ اس کی ذات تغیر و تبدل سے بالاتر ہے اور جہان میں کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہے۔ اس کا نہ کوئی بیٹا ہے نہ بیوی۔ اور تمہارے دل میں جو خیالات اور ارادات پیدا ہوتے ہیں وہ ان کا بھی خالق ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (اس کی مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے اور دیکھنے والا ہے)

لوازمات علم صفات الٰہی

علم صفات الٰہی کے لوازمات یہ ہیں کہ تو یہ جان لے کہ وہ ایسی صفات کا مالک ہے جو اس کے ساتھ قائم ہیں لیکن وہ صفات نہ عین حق ہیں نہ غیر حق۔ لیکن اس کی ذات کے ساتھ موجود اور قائم ہیں اور یہ صفات ہمیشہ اس کے ساتھ ہیں مثلاً علم، قدرت، حیات، ارادت، سمع، بصر، کلام اور بقاء۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (اللہ تمہارے قلوب کا عالم ہے) نیز فرمایا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اللہ ہر چیز پر قادر ہے) نیز فرمایا وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (اور سننے اور دیکھنے والا ہے) نیز فرمایا فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے) نیز فرمایا هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (وہ زندہ ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں ہے) نیز فرمایا قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ (اس کا قول حق ہے اور ساری کائنات اس کی ملکیت ہے)۔

شرح اوپر یہ جو فرمایا گیا ہے کہ صفات نہ عین حق ہیں نہ غیر حق اس بات کا سمجھنا کچھ مشکل ہے حضرت مصنف کا مقصد یہ ہے کہ کائنات اگرچہ حق تعالیٰ کی صفت تخلیق کا مظہر (نتیجہ) ہے تاہم کائنات کو نہ عین حق کہا جا سکتا ہے نہ غیر حق۔ اور عین حق بھی ہے اور غیر حق بھی جس طرح ایک کتاب اپنے مصنف کا عین بھی ہے اور غیر بھی یعنی ظاہری طور پر کتاب کا وجود مصنف کے وجود سے علیحدہ ہے لیکن باطنی طور پر کتاب مصنف کا عین ہے اس طرح کائنات ظاہری طور پر حق تعالیٰ سے علیحدہ لیکن باطنی طور پر ذات حق میں شامل ہے کیونکہ صفت موصوف سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے صوفیاء کرام کا قول ہے کہ **صفات اللّٰہ لا عینہ و لا غیرہ** یعنی اللہ کی صفات نہ اس کی عین ہیں نہ غیر اور عین بھی ہیں اور غیر بھی ہیں۔ لہٰذا کائنات کا وجود مجاز میں غیر حق ہے اور حقیقت میں عین

حق۔ اس کا دوسرا نام وحدت الوجود ہے۔ جس کا ثبوت اس سے قبل اس کتاب میں حضرت مصنف نے دے دیا ہے۔

لوازمات علم افعال الٰہی

علم افعال الٰہی کے لوازمات یہ ہیں کہ تو یقین کرے کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر شخص کے افعال کا بھی خالق ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (وہ تمہارا اور تمہارے افعال کا خالق ہے) اور یہ جہان اسی کی قدرت سے عدم سے وجود میں آیا ہے۔ تمام خیر و شر (نیک و بد) کا خالق وہی ہے اور فائدہ اور نقصان بھی اسی کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ فرمایا ہے اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (اللہ ہر چیز کا خالق ہے)

شرح اس سے مسئلہ قضا و قدر بھی ثابت ہو گیا۔ اس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔

لوازمات علم شریعت

علم شریعت کے لوازمات یہ ہیں کہ تو جان لے کہ خداوند تعالیٰ نے ہمارے پاس رسول بھیجے ہیں معجزات کے ساتھ جو فوق العادات ہیں۔ اور ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق پر ہیں۔ اور ان سے بہت معجزات سرزد ہوئے ہیں۔ اور آپ نے ہمیں غیب اور حاضر سے جو کچھ خبر دی ہے وہ سب حق ہے۔

شرح جس طرح ایک نبی سے معجزات سرزد ہو سکتے ہیں نبی علیہ السلام کی سنت کے طور پر ایک ولی اللہ سے بھی کرامات کا ظہور ممکن ہے۔ قرآن و حدیث انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء کرام کی کرامات سے لبریز ہیں۔ اہل ظاہر نہ مانیں تو ان کی عقل کا قصور ہے۔

(ترجمہ) ارکان شریعت

شریعت کا پہلا رکن کتاب (قرآن) ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ (قرآن میں آیات محکمات ہیں اور وہ ام الکتاب ہے) شریعت کا دوسرا رکن سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (رسول خدا جو کچھ تم کو دیں قبول کرو اور جس چیز سے منع کریں اس سے پرہیز کرو) شریعت کا تیسرا رکن اجماع امت ہے اس کے متعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے **لا تجتمع امتی علی الضلالتہ علیکم بالسواد الاعظم** (میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی اس لئے تم پر فرض ہے کہ سواد اعظم یعنی مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت میں شامل ہو جاؤ)۔

شرح سواد اعظم سے مراد اہلسنت والجماعت ہے جو فقہ کے چار ائمہ کرام کے مکتب فکر کے ارباب پر مشتمل ہے اور جس کی تعداد ہر زمانے میں تمام اسلامی جماعتوں سے زیادہ رہی ہے اور اب بھی ہے۔ چار ائمہ فقہ یہ ہیں۔ حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ۔ اہلسنت والجماعت کے چار حصے اس لئے ہو گئے ہیں کہ جہاں ان کا آپس میں اصولی طور پر اتفاق ہے معمولی فروعی اور غیر ضروری امور پر ان کے مابین تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف ایک حدیث نبویؐ کے مطابق رحمت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے مستحسن ہے' دیگر اسلامی ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی اہلسنت والجماعت زبردست اکثریت میں ہیں اور اسلام کے تمام مشہور فرقے بریلوی ' دیوبندی' جمعیت العلمائے اسلام' جمیعت العلمائے پاکستان' جماعت اسلامی اور روحانی سلاسل

چشتیہ' قادریہ' نقشبندیہ' سہروردیہ وغیرہ سب اپنے آپ کو اہلسنت والجماعت کہتے ہیں اس لئے ان کے درمیان اختلاف کا پایا جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ جہاں تک فروعی مسائل کا تعلق ہے ان میں اختلاف ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ان کے درمیان بنیادی مسائل مثلاً نماز' روزہ' حج' زکوۃ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ اسلام کا زبردست معجزہ ہے کہ ساری دنیا میں قومی' نسلی' لسانی اور طبع کے اختلافات کے باوجود اختلاف سے اتفاق کا پہلو بہت زیادہ ہے۔ ساری دنیا میں وہی پانچ نمازیں' وہی رمضان کا روزہ' وہی حج' وہی زکوۃ' وہی شادی بیاہ کے قوانین وہی بیع و شرا کے قوانین اور وہی بود و باش کے طریقے یکساں پائے جاتے ہیں۔ اور یہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت کے ۷۳ فرقے ہونگے جن میں سے صرف ایک نجات پانے والا ہو گا اس میں بھی مندرجہ بالا تمام فرقے یعنی بریلوی' دیوبندی' اہل حدیث' جماعت اسلامی' جماعت تبلیغی' چشتی' قادری' نقشبندی' سہروردی اور تمام سلاسل طریقت شامل ہیں کیونکہ جب صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ کونسا فرقہ نجات پانے والا ہو گا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا عمل قرآن و سنت پر ہو گا۔ ظاہر ہے مندرجہ بالا تمام فرقوں کا عمل قرآن و سنت پر ہے لیکن ان کے مابین جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اسلام کے اصولوں پر نہیں بلکہ غیرضروری فروعات پر ہیں جن کو حضرت رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحمت کا نام دے کر سب کو بری کر دیا ہے وللہ الحمد۔

فصل

فرقہ سوفسطائیاں

یاد رہے کے ملحدوں کا ایک فرقہ ہے **لعنتہ اللہ علیہ** جسے سوفسطائی کہتے

ہیں۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ کسی چیز کا علم ممکن نہیں ہے بلکہ خود علم کا وجود بھی نہیں ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ آیا یہ جاننا کہ "علم کوئی چیز نہیں ہے" علم کہلاتا یا نہیں۔ اگر وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ علم ہے تو خود علم کو ثابت کرتے ہیں اور اگر کہتے ہیں کہ یہ علم نہیں ہے تو ناممکن پر بحث کرنا کونسی عقلمندی ہے۔

ملحدوں کا ایک اور فرقہ ہے جو اپنے آپ کو صوفی کہتے ہیں۔ وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا علم ممکن نہیں۔ اس لئے علم کا ترک کر دینا اس کے ثابت کرنے سے بہتر ہے۔ یہ ان کی حماقت اور جہالت کی دلیل ہے کیونکہ علم کا ترک کرنا دو وجوہات سے خالی نہیں یا علم کو علم کی بدولت ترک کیا جاتا ہے یا جہل کی بدولت۔ اگر علم کی بدولت ترک کیا جاتا ہے تو یہ محال ہے کیونکہ علم کی نفی علم سے نہیں ہو سکتی۔ اگر علم کو جہل کی بدولت ترک کیا جاتا ہے تو وہ لوگ جاہل ٹھہرے اور قابل مذمت ہوئے۔ کیونکہ جہل کفر کی طرف لے جاتا ہے اور حق کو جہل سے کوئی تعلق نہیں۔ تمام مشائخ کا ایسے لوگوں سے اختلاف ہے اگر مشائخ اختلاف نہ کرتے تو لوگ سمجھتے کہ شاید تمام اہل تصوف کا یہی عقیدہ ہے۔ جس سے ان کے اعتقادات خراب ہو جاتے۔ اور حق و باطل میں تمیز نہ کر سکتے۔ اس لئے ہم نے ایسے لوگوں کو خدا کے سپرد کر دیا ہے تاکہ اپنے حال پر رہیں۔ جب مشائخ ایسے لوگوں کا گریبان پکڑتے ہیں تو تمیز سے بات کرتے ہیں اور دوستان خدا کی مذمت سے باز آجاتے ہیں۔ اور احتیاط سے بات کرتے ہیں۔ کیونکہ مشائخ عظام کے ساتھ جو لوگ حسن ظن رکھتے ہیں تو ان کی برکت سے بے شمار آفات و بلیات سے نجات پاتے ہیں اور عزت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ایک دفعہ مجھے ایک ایسے علم کے دعویدار سے بحث کا اتفاق ہوا جس کو اپنی قابلیت پر بہت ناز تھا۔ وہ شخص نفسانی خواہشات کی پیروی کو سنت کی پیروی سمجھتا تھا اور اتباع شیطان کو اتباع ائمہ کرام سمجھتا تھا۔ دوران گفتگو میں اس نے کہا کہ

ملحدوں کے بارہ فرقے ہیں جن میں سے ایک فرقہ صوفیوں کا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اگر ایک فرقہ ہمارے صوفیاء کا ہے تو باقی گیارہ فرقے تم لوگوں کے ہوئے۔ اس لئے ہم ایک گروہ سے اپنی حفاظت بہتر طور پر کر سکتے ہیں لیکن تمہارے لئے گیارہ فرقوں کے شر سے محفوظ رہنا زیادہ مشکل ہے۔

یہ سب موجودہ زمانہ کے فساد کی وجہ سے ہے جس سے حق تعالٰی ہمیشہ اپنے دوستوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ اس پیر پیراں و آفتاب مریدان حضرت علی بن بندار صیرانی رحمتہ اللہ علیہ نے خوب کہا ہے **فساد القلوب علی حسب فساد الزمان و اھلہ** (قلوب کا فساد میں مبتلا ہونا زمانہ اور اہل زمانہ کے فساد کے مطابق ہوتا ہے)

شرح یعنی جس قدر خرابی زمانہ میں پیدا ہوتی ہے قلوب اسی قدر متاثر (ملوث) ہوتے ہیں۔

ترجمہ اب ہم مندرجہ بالا بیان کی تصدیق مشائخ عظام کے اقوال سے کرتے ہیں تاکہ جن لوگوں پر حق تعالٰی کی عنایت ہے وہ منکرین کے فتنوں سے محفوظ رہیں۔

حضرت محمد بن فضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت محمد بن فضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم تین ہیں۔ علم من اللہ، علم مع اللہ، علم باللہ۔

علم باللہ علم باللہ سے مراد معرفت الٰہی ہے جس سے تمام انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام نے حق تعالٰی کو پہچانا ہے اور جب تک تعریف و تعرف کا سلسلہ حق تعالٰی کی طرف سے نہ ہو تو اسے کوئی نہیں پہچان سکتا۔ کیونکہ حق تعالٰی کو انسانی کوشش سے جاننا ناممکن ہے۔ اس لئے معرفت حق انسان کے اپنے علم سے

حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ حق تعالیٰ کی ہدایت اور عنایت سے حاصل ہوتی ہے۔

علم من اللہ علم من اللہ سے مراد علم شریعت یعنی احکام الٰہی ہیں جو بنی نوع انسان کو ملے ہیں۔

علم مع اللہ علم مع اللہ سے مراد حق تعالیٰ تک رسائی کے طریق کا علم اور اولیاء اللہ کے مقامات اور درجات کا علم ہے۔ لہٰذا معرفت بغیر شریعت ممکن نہیں اور شریعت پر عمل بغیر معرفت یعنی مقامات قرب معلوم کئے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

ابو علی ثقفی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابو علی ثقفی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **العلم حیوٰۃ القلب من الجھل و نورالعین من الظلمتہ** (علم قلب کی حیات ہے جس سے جہل سے نجات ملتی ہے اور آنکھوں کا نور ہے جس سے تاریکی سے نجات ملتی ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ مرگ جہل سے علم نجات دلاتا ہے اور ظلمت کفر سے بچا کر آنکھوں کو نور مہیا کرتا ہے۔ اور جس کسی کو علم معرفت حاصل نہیں مرگ جہل سے مردہ کے برابر ہے اور جس کسی کو علم شریعت حاصل نہیں ہے اس کا قلب نادانی کی وجہ سے بیمار ہے چنانچہ کفار کے قلوب مردہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی معرفت نہیں رکھتے اور اہل غفلت یعنی غافل لوگوں کے دل بیمار کہلاتے ہیں کیونکہ وہ احکام الٰہی سے بے خبر ہیں۔

شرح یہاں ایک مغالطہ کا رفع کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اوپر آیا ہے قرآن حکیم میں کفار کو مردہ کہا گیا ہے اور جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کو تبلیغ دین کرتے تھے تو وہ پیٹھ پھیر کر چلے جاتے تھے لہٰذا قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دینے کی غرض سے

فرمایا کہ فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ (آپ مردوں کو پیغام حق نہیں سنا سکتے کیونکہ جب آپ ان کو مخاطب کرتے ہیں تو وہ پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں) اس سے بعض اہل ظواہر نے یہ مطلب نکالا ہے کہ اہل قبور کو قوت سماعت نہیں ہے حالانکہ متعدد احادیث صحیحہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم قبرستان میں جاکر مردوں کو سلام کرتے ہو تو وہ سلام کا جواب دیتے ہیں اور جب تم ان کے لئے دعا کرتے ہو وہ تمہارے لئے دعا کرتے ہیں اور جب تمہاری حالت اچھی ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ اور جب تمہاری حالت خراب ہوتی ہے تو ان کو غم ہوتا ہے۔ یہ تمام احادیث حافظ ابن قیم جوزی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "کتاب الروح" میں جمع کی ہیں۔ یاد رہے کہ حافظ ابن قیم جوزی رحمتہ اللہ علیہ فرقہ اہل حدیث کے امام ابن تیمیہ کے شاگرد ہیں اور تصوف اور سلوک الی اللہ کے مضمون پر انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے "الفوائد" اور "مدارج السالکین" مشہور ہیں۔ لہٰذا جو حضرات سماع موتیٰ کے قائل نہیں ہیں ان کو مندرجہ بالا آیت مبارکہ کے پہلے حصہ فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ سے مغالطہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کے دوسرے حصہ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ پر غور نہیں کرتے اگر اس آیت مبارکہ میں موتیٰ سے مراد قبروں کے مردے ہیں تو ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قبرستان میں جاکر اہل قبور کو اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ چنانچہ اس آیت مبارکہ کے غلط معنی کرکے اہل ظواہر سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہاں آیت قرآن اور حدیث میں اختلاف ہے اس لئے قرآن سچا ہے اور حدیث موضوع ہے حالانکہ اس کا دوسرا حصہ دیکھا جائے جو اکثر اہل ظاہر بحث و مباحثہ میں ترک کر دیتے ہیں تو معاملہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت اور احادیث نبویؐ میں کوئی اختلاف نہیں صرف آیت مذکور کے غلط معانی کرنے سے اس آیت اور احادیث کے درمیان تصادم نظر آتا ہے

آیت کے صحیح معنی کرنے سے کوئی تصادم واقع نہیں ہوتا۔

ترجمہ۔ حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابوبکر وراق ترمذی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **من اکتفی بالکلام من العلم دون الزھد تذندق ومن اکتفی بالفقہ دون الورع فقد تفسق** (جو شخص علم الٰہی کے محض الفاظ پر اکتفا کرتا ہے اور زہد اختیار نہیں کرتا زندیق یعنی بے دین ہوا اور جو شخص زہد و تقویٰ اختیار کئے بغیر علم فقہ پر قناعت کرتا ہے فسق و فجور میں مبتلا ہوا) اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت پر عمل کئے بغیر توحید" جبر" ہے لیکن ایک مؤحد کے لئے قولاً" جبری ہونا اور فعلاً" یا عملاً" قدری ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی روش نظریۂ قدر و جبر کے درمیان ہو۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ نے ایک اور موقع پر فرمایا ہے کہ **التوحید دون الجبرو فوق القدر** (توحید جبر اور قدر کے درمیان ہے)۔ لہٰذا جو شخص علم توحید کی صرف عبارت پر اکتفا کرتا ہے اور شریعت پر عمل اور مجاہدت نہیں کرتا اور زہد و تقویٰ اختیار نہیں کرتا زندیق یعنی بے دین ہو جاتا ہے کیونکہ علم فقہ ہو یا شریعت اس کے لئے تقویٰ شرط ہے نیز جو شخص علم فقہ و شریعت کی محض عبارت پر اکتفا کرتا ہے اور زہد و تقویٰ اختیار نہیں کرتا وہ تاویلات اور شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور ائمہ مجتہدین کے مذاہب سے نکل کر فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

شرح اس عبارت سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک اہلسنت والجماعت تھا۔ اور یہ جو اوپر جبر و قدر کا حوالہ دیا گیا اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ خلفائے بنی عباس کے دور میں مسلمانوں کے مابین ایک فرقہ پیدا ہوگیا تھا جس کا نام معتزلہ تھا معتزلہ خیال کے لوگوں نے فلسفہ یونان سے متأثر ہو کر مسلمانوں کے درمیان کئی قسم کے اختلافات پیدا کر

دیئے تھے۔ ان کا زیادہ اختلاف مسئلہ خلق قرآن پر تھا یعنی معتزلہ لوگ ذات حق کی باقی صفات کی طرح صفت کلام یعنی قرآن پاک کو ازلی اور قدیم نہیں مانتے تھے بلکہ کائنات کی دیگر اشیاء کی طرح اسے مخلوق اور محدث سمجھتے تھے۔ ان کا دوسرا مشہور عقیدہ یہ تھا کہ انسان ہر کام میں فعل مختار ہے تقدیر الٰہی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس اختلاف کو قدر اور جبر یا قضا و قدر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قدریہ فرقہ کے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان ہر کام میں فعل مختیار ہے جو چاہتا ہے کر سکتا ہے اور فقہ جبریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ آدمی مجبور محض ہے جو کچھ اس کی قسمت میں لکھا گیا ہے وہی کرتا ہے۔ اب قبل اس کے مسئلہ قدر و جبر پر روشنی ڈالی جائے ہم حضرت مصنف علیہ رحمہ کا مفہوم واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ شریعت پر عمل کئے بغیر توحید کا قائل ہونا عقیدہ جبر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ توحید الٰہی کو آدمی اس وقت سمجھنے کے قابل ہوتا ہے جب احکام الٰہی پر عمل کرنے سے اس کا تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے۔ اگر عمل کے بغیر اسرار توحید حاصل ہو جائے تو انسانی کوشش نہ ہوگی بلکہ فعل خدا یا تقدیر اور مشیت خداوندی ہوگی۔ اس لئے اسے جبر کہا گیا اور جب شریعت پر عمل اور مجاہدہ سے تزکیۂ نفس ہو گا اور اسرار توحید ظاہر ہوں گے تو یہ انسان کی اپنی کوشش کہلائے گی اور اس سے نظریۂ قدر ثابت ہو گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ نظریہ قدر صحیح ہے یا جبر۔ یاد رہے کہ اس کے متعلق بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں اور تا ہنوز یہ اختلاف جاری ہے۔ قرآن و حدیث میں جبر و قدر دونوں کو صحیح قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ محض جبر یعنی مجبوری ہے اور نہ محض قدر ہے یعنی نہ انسان بالکل آزاد ہے نہ بالکل مجبور ہے بلکہ معاملہ بین بین ہے۔ چنانچہ جب حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا **الامر بین الامرین** یعنی حقیقت قدر و جبر کے

درمیان ہے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے استفسار پر حضرت امیر المومنین امام حسن رضی اللہ عنہ نے بھی یہی جواب دیا کہ حقیقت قدر و جبر کے درمیان ہے۔ عربی زبان میں ایک مقولہ ہے جس سے یہ معاملہ واضح ہو جاتا ہے یعنی **مختیار فی فعلہ و مجبور فی اختیارہ** (انسان جو چاہے کر سکتا ہے لیکن جو چاہے چاہ نہیں سکتا) بات یہ ہے کہ انسان سے جو کام سرزد ہوتا ہے وہ محض انسان کی اپنی کوشش اور طاقت سے نہیں ہوتا بلکہ اس کام میں دیگر عناصر بھی شامل ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ مثلاً کھیتی باڑی کرنا انسان کا کام ہے لیکن بارش اور پانی دینا اور زمین میں روئیدگی اور پھل پکانے کی صلاحیت حق تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ نیز جب آدمی اپنے دست و بازو سے ایک کام کرتا ہے تو اس کے دست و بازو کی طاقت چونکہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی ہے اس لئے اپنے کام کا خالق صرف انسان نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں حق تعالیٰ کی قدرت اور طاقت اور عنایت کا بھی ہاتھ ہے اس لئے صحیح عقیدہ یہ ہے کہ انسان نہ مجبور محض ہے اور نہ قادر محض ہے بلکہ معاملہ قدر و جبر کے بین بین ہے۔

حضرت شیخ المشائخ معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ

شیخ المشائخ حضرت معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **اجتنب صحبتہ ثلاثتہ اصناف من الناس العلماء الغافلین والفقراء المداهنین والمتصوفتہ الجاهلین** (تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ اول غافل علماء' لالچی فقراء اور جاہل صوفیاء)۔

شرح بعض نسخوں میں فقراء کی بجائے لفظ قراء آیا ہے جو جمع ہے قاری کی جس کا مطلب یہ ہو گا کہ لالچی قاریوں سے پرہیز کرو لیکن مضمون کتاب کے مطابق لفظ فقراء زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔

ترجمہ علمائے غافل وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو قبلۂ دل بنایا ہوا ہے۔ شریعت کی پابندی میں سستی کرتے ہیں اور سلاطین اور جابر لوگوں کی پوجا میں مشغول رہتے ہیں اور ان کی کوٹھیوں کا طواف کرتے رہتے ہیں ان کی جاہ و حشمت سے مرعوب ہیں اور اپنی زیرکی' دانائی اور فصاحت و بلاغت پر خوش ہوتے ہیں' ائمہ سلف پر طعن و تشنیع کی زبان دراز کرتے ہیں' بزرگان دین کی توہین کرتے ہیں اور ان باتوں میں اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ اگر ساری کائنات کو ترازو کے دوسرے پلہ میں رکھا جائے تو ان کی مبالغہ آمیزی زیادہ بھاری ہو گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حرص اور حسد کو دین بنایا ہوا ہے۔ یہ علم نہیں ہے بلکہ جہل ہے۔ علم وہ ہوتا ہے جس سے جہل رفع ہو نہ کہ جہل کی پرورش ہو۔

اور لالچی فقراء وہ ہیں کہ جذبۂ لالچ میں آکر امراء کے ہر کام کی تعریف کرتے ہیں خواہ وہ کام برے اور باطل کیوں نہ ہوں اور جب کوئی شخص ان کی مخالفت کرتا ہے خواہ وہ حق بات کیوں نہ ہو وہ اس کے مخالف بن جاتے ہیں۔ وہ خلق خدا میں جاہ و حشمت کے طالب ہوتے ہیں اور امراء کے برے کاموں کی بھی تعریف کرتے ہیں۔

جاہل صوفی وہ ہیں جن کو مشائخ کی صحبت نصیب نہیں ہوتی نہ کسی بزرگ سے ادب سیکھا ہوا ہوتا ہے نہ انہوں نے زمانہ کے مصائب دیکھے ہیں۔ یہ لوگ جہالت کی وجہ سے نیلے کپڑے پہن لیتے ہیں حتیٰ کہ جب ان سے کوئی شخص مذاق کرتا ہے تو خوش ہوتے ہیں اور عام جاہلوں کی صحبت میں رہ کر سب کو آپ جیسا سمجھتے ہیں اور حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے۔

پس یہ وہ تین گروہ ہیں جن کی صحبت سے حضرت شیخ نے اپنے مریدوں کو منع فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے دعووں میں کاذب اور اپنی روش میں

خام ہوتے ہیں۔

حضرت ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **عملت فی المجاهدة ثلثين سنته فما وجدت شيئا" اشد علی من العلم و متابعته** (میں نے تیس سال مجاہدہ کیا لیکن میں نے علم اور اس پر عمل کرنے سے زیادہ سخت چیز کوئی نہیں پائی) اور مجھ پر آگ پر چلنا آسان تھا لیکن علم پر چلنا سخت مشکل۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پل صراط پر ہزار بار گزر جانا آسان ہے، لیکن علم کا ایک مسئلہ سیکھنا سخت مشکل ہے اور فاسق و فاجر کے لئے دوزخ میں خیمہ لگا کر بیٹھنا عالم کے لئے ایک مسئلہ سیکھنے سے زیادہ آسان ہے۔ پس تم علم حاصل کرو اور علم میں کمال پیدا کرو۔ لیکن ایک بات یاد رکھو کہ جس قدر علم میں کمال حاصل کرو گے علم حق کے مقابلہ میں وہ ہیچ ہے۔ پس اس قدر جان لو کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لئے علم بندگی کے سوا کچھ اور جاننا مشکل ہے۔

شرح یعنی انسان کے لئے علم حق یا حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی کنہہ تک پہنچنا محال ہے۔

ترجمہ اور بندگی حجاب اعظم (سب سے بڑا پردہ) ہے۔

شرح بندگی اس لئے حجاب اعظم ہوئی کہ جب بندہ مقام فنا سے نکل کر دوئی اور بندگی (عبدیت) کے مقام پر آتا ہے تو ذات حق سے محجوب ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی اپنی ہستی حق اور اس کے درمیان حجاب بن جاتی ہے۔ لیکن جب خود مٹ گیا تو حجاب اٹھ جاتا ہے اور وصل واقع ہوتا ہے۔

ترجمہ کسی نے خوب کہا ہے

العجز عن درک الا دراک ادراک
والوقف فی طریق الاخیار اشراک

(ذات و صفات حق کے ادراک میں عجز کا اقرار کرنا درحقیقت ادراک ہے اور اخیار یعنی نیک لوگوں کے راستے میں ٹھہرنا شرک ہے) ۔

شرح بعض نسخوں میں لفظ "اخیار" کی بجائے لفظ "جہل" ہے۔ لیکن اگلے فقرے میں حضرت اقدسؒ نے جو وضاحت فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل لفظ "جہل" ہے نہ کہ "اخیار" لہٰذا شعر کا مطلب یہ ہوا کہ عارف لوگ قرب حق تعالیٰ میں پہنچ کر اگرچہ ذات و صفات کا بہت علم رکھتے ہیں لیکن چونکہ علم ذات و صفات کی کنہہ تک پہنچنا بشر کے لئے ناممکن ہے وہ ادراک علم سے اپنے عجز (یعنی اپنے جہل) کا اقرار کرتے ہیں اور حقیقت میں یہی ادراک یعنی معرفت ہے کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔

ترجمہ جو شخص ذات و صفات کا علم حاصل نہیں کرتا اور اپنے جہل پر قانع رہتا ہے مشرک ہے۔

شرح یعنی ہوتا جاہل ہے اور جہالت کی وجہ اپنے آپ کو عالم کہتا ہے اس لئے مشرک ہے۔ مشرک اس لئے کہ علم حق کا جاننا بشر کی حد سے باہر ہے کیونکہ صرف حق تعالیٰ ہی کو اپنی ذات و صفات کا پورا علم ہے۔ جب ایک آدمی غلطی سے اپنے آپ کو عالم سمجھتا ہے تو گویا وہ صفات حق (علم حق) کو اپنے ساتھ منسوب کرتا ہے اس لئے مشرک ہے۔

ترجمہ لیکن جو شخص علم میں کمال حاصل کرتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ذات و صفات حق کا علم اس قدر وسیع ہے کہ بشر کی حد امکان سے باہر ہے اس لئے اس کا پندار یعنی غرور اور غلط فہمی مٹ جاتی ہے اور اپنے عجز کا اقرار

کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے اس قدر معلوم ہوا ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

شرح بزرگوں کے مقولہ "ایں قدر دانستم کہ ہیچ نہ دانستم" کا مطلب یہی ہے۔ اور علم کا کمال یہی ہے کہ اقرار عجز کرے۔

صوفی چہ فغانست مِن آین الیٰ آین
کیں نکتہ عیانست من العلم الیٰ العین

ما الحاصل فی البحرچہ پرسی سفرے کن
چوں خضر بجوے گوہر از مجمع بحرین

چوں از شیخ صدر الدین قونوی" معنی ایں رباعی پرسیدند فرمود
تجدد نسبۃ جامعۃ بین الطرفین ظاہرہ بالحکمین
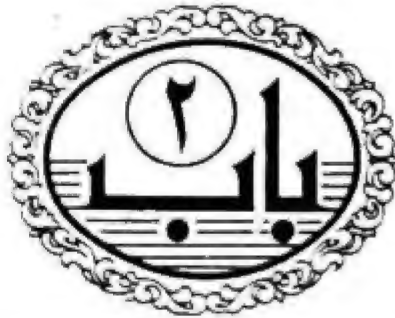
یاد رہے کہ راہ حق میں درویشی کو مرتبہ عظیم حاصل ہے۔ اور درویشوں کا بڑا درجہ ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (صدقات کا حق ان مساکین کا ہے جو راہ حق میں اس قدر محو ہیں کہ ادھر ادھر نہیں جا سکتے اور چونکہ وہ زبان سوال دراز نہیں کرتے ناواقف لوگ ان کو غنی سمجھتے ہیں)۔ نیز فرمایا ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (اللہ کے نزدیک ضربُ المثل ہیں وہ اللہ کے بندے جو اپنی عبدیت میں غرق ہیں اور کاروبار نہیں کر پاتے)۔

شرح ان دونوں آیات میں دو ایسے الفاظ ہیں جو حق تعالیٰ نے اپنے درویشوں کے حق میں فرمائے ہیں۔ پہلی آیت میں لفظ **احصروا** ہے جس کے لفظی معنی

ہیں "گھرا ہوا" یعنی وہ راہ حق میں اس قدر مغلوبُ الحال، منہمک اور مست و محو ہیں کہ دنیاوی کاموں کا ہوش نہیں ہے۔ اور دوسری آیت میں لفظ **عَبْدًا مَّمْلُوْكًا** یعنی وہ خدا کا عبد مومن جو حق تعالیٰ کا مملوک یعنی زر خرید یا بے زر خرید غلام بن چکا ہے اور اس کی رضا کے سوا کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ یہ دونوں مقامات یعنی "محویت فی الحق" اور "مملوکیت حق" عبد مومن کی شان ہے۔اور ان کا یہ مشغلہ حق تعالیٰ کو اس قدر محبوب ہے کہ جہاں ساری بنی نوع انسان کو حق تعالیٰ نے کسب اور روزی کمانے میں جدوجہد کا حکم دیا ہے، اپنے ان بندوں کے لئے حق تعالیٰ نے باقی لوگوں کو حکم دیا ہے کہ ان کی ضروریات زندگی کا خیال رکھیں۔ آجکل کے نام نہاد "مصلح" اور "روشن دماغ" لوگوں کی طرح حق تعالیٰ نے ان بندگان خدا کو "بے کاری" اور "مفت خوری" اور "خانقاہی نظام کی زیب و زینت" کے القاب نہیں مرحمت فرمائے بلکہ ان کی محبت، زہد و تقویٰ، گوشہ نشینی اور محویت فی ذات حق کی تعریف فرمائی ہے۔ کاش کہ ہمارے نام نہاد "مصلح" اور "روشن خیال" حضرات بھی حق تعالیٰ سے ہم خیال ہو سکتے۔ کیونکہ راہ حق میں بلکہ ذات و صفات حق کے اندر انہماک و محویت، جس کو علم تصوف کی اصطلاح میں فنا فی اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ایسا عظیم الشان مشغلہ ہے کہ اس پر دنیا کی تمام سلطنتیں، تمام بادشاہیاں، تمام امارتیں، تمام دولتیں، تمام قوتیں، تمام جاہ و جلال اور شان و شوکت، تمام علوم و فنون، تمام عقلی و علمی کمالات، ہنرمندیاں اور دانشوریاں قربان ہیں اور ہیچ در ہیچ ہیں۔ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء اور خلفاء در خلفاء یعنی تمام علماء و مشائخ روزی کمانے کو حصول قرب حق اور ہدایت خلق پر ترجیح دیتے اور اس میں مشغول ہو جاتے تو نبوت اور ولایت کے فرائض کون انجام دیتا۔ کیونکہ نبوت یا خلفاء نبی کا منصب ایسا ہمہ گیر اور ہمہ وقت مشغلہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور مشغلہ ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔

اس لئے ان برگزیدہ حضرات نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے' اپنے اہل و عیال کو بھوکوں مارا' چیتھڑوں میں زندگی بسر کی لیکن حصول قرب و معرفت حق اور ہدایت خلق کے اہم ترین مشاغل کو قربان نہ کیا۔ انہوں نے دنیا کو حق پر قربان کیا لیکن حق کو دنیا پر قربان نہ کیا اور اسی لئے ان "روشن خیال" لوگوں کے طعن و تشنیع کا ہدف بھی بنے ہوئے ہیں کہ انہوں نے ان کی اپنی طرح دنیا پر حق کو قربان کیوں نہ کر دیا۔ وائے حسرت' وائے نادانی! اگر ایثار اور بے غرضی اور بے نفسی کے یہ پیکر حق کو دنیا پر قربان کر دیتے تو دین حق کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا اور آج ہم لوگ اس سے محروم ہوتے۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ مقام شکر ہے نہ کہ شکایت کہ ایسے مردان خدا نے بے پناہ قربانیاں دے کر دین حق کو ہم تک پہنچایا۔

ترجمہ حق تعالیٰ نے درویشوں کے حق میں یہ بھی فرمایا ہے تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (مردان خدا رات کے وقت اپنے جسموں کو بستروں سے جدا رکھتے ہیں)۔

شرح اس آیت مبارکہ میں حق تعالیٰ نے اپنے ان پیارے بندوں کی تعریف فرمائی ہے جو ساری رات ذکر و فکر الٰہی میں یعنی عبادات اور مراقبات میں گزار دیتے ہیں اور بستروں پر جانے کا نام نہیں لیتے۔ ایک دفعہ شب معراج یا شب برات کو ہمارا ایک ہمسایہ جو پولیس میں انسپکٹر کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود ساری رات شب بیداری اور عبادات میں مشغول رہا۔ صبح کے وقت ایک اخبار ہاتھ میں لئے راقم الحروف کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ دیکھو جی قرآن و حدیث میں تو شب بیداری کی ترغیب آئی ہے لیکن ہمارے لاہور شہر کے اتنے بڑے عالم نے یہ مضمون اخبار میں چھاپ دیا ہے کہ "اسلام میں عبادت کا پروگرام نہایت مختصر ہے معلوم نہیں لوگوں نے اس کو کیوں طوالت دے دی ہے اور ساری ساری رات جاگ کر اپنے آپ کو سزا دیتے ہیں" راقم الحروف نے جواب دیا کہ چونکہ

وہ عالم صاحب خود رات کو نہیں جاگ سکتے اس لئے فتوے دے رہے ہیں کہ اسلام میں راتوں کا جاگنا ٹھیک نہیں۔ بس پانچ نمازیں پڑھ لیا کرو یہی کافی ہے۔ اس سے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی شب بیداری کی بھی نکتہ چینی کی ہے اور صحابہ کرام کی شب بیداری اور ساری رات عبادت گزاری کو بھی کالعدم کر دیا ہے۔ نیز قرآن عظیم کی اس آیت اور دیگر آیات مثل يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا (بندگان خدا ساری رات خداوند تعالٰی کی بارگاہ میں راتیں بسر کرتے ہیں اور قیام و سجود میں مشغول رہتے ہیں) پر بھی پانی پھیر دیا ہے۔ اس وجہ سے بے شمار کتابیں تو لکھ ڈالیں۔ جماعتیں بھی بنا لیں' چند نام لیوا اور مال و دولت بھی جمع کر لیا لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اور صحابہ کرام اور بندگان مومن کی طرح راتوں کو جاگ نہ سکے۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

تو نام و نسب کا حجازی ہے
پر دل کا حجازی بن نہ سکا

جن جماعتوں کے نزدیک اسلام کی غرض و غایت صرف دنیاوی عظمت اور جاہ و جلال ہے وہ جماعتیں دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ تاریخ عالم کہہ رہی ہے اور ہمارا اپنا مشاہدہ بھی یہی بتا رہا ہے۔

ترجمہ نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے بھی فقر اختیار فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں آپؐ یہ دعا کرتے تھے کہ **اللّٰھم احینی مسکینا و امتنی مسکینا واحشر نی فی زمرۃ المساکین** (یا اللہ مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ' مسکینی کی حالت میں موت دے اور مسکینوں کے زمرہ میں مجھے قیامت کے دن اٹھانا) اس قسم کی آیات و احادیث بے شمار ہیں جو اس قدر مشہور و معروف ہیں کہ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

شرح اس حدیث میں بھی خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے نہ

صرف اس دنیا میں مسکینی اور فقر کی دعا کی ہے بلکہ عالم برزخ اور قیامت کے دن بھی مساکین کے زمرہ میں شمولیت کی درخوست کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد' اسلام کی حیات و بقا اور کلمہ حق کا ہمیشہ قیام و دوام ہے جس کیلئے سادگی' قناعت اور مجاہدات و ریاضات کی بے حد ضرورت ہے۔ اقبال نے خوب کہا ہے ؎

من آں پروانہ را پروانہ دانم
کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

ترجمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ مبارک میں فقراء مہاجرین تھے جو عبودیت حق تعالیٰ اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اتباع کی خاطر مسجد نبویؐ میں رہتے تھے اور دنیوی مشاغل سے الگ تھلگ تھے اور نہ کوئی کسب کرتے تھے بلکہ روزی کے معاملہ میں خدا پر توکل کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا کہ ان کے پاس بیٹھا کریں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ (ان لوگوں کو اپنی صحبت کا موقعہ دیجئے جو صبح و شام ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں اور حق تعالیٰ کے قرب و وصال کے طالب ہیں) نیز فرمایا وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا (ان فقراء سے آنکھیں مت پھیرو کیا آپ دنیاوی زندگی کی زینت چاہتے ہیں) یہی وجہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب ان میں سے کسی کو دیکھتے تھے تو فرماتے تھے کہ میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں تم وہ لوگ ہو کہ حق تعالیٰ تمہاری خاطر مجھ سے ناراض ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک فقیر کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔

شرح یہاں فقیر سے عام گداگر مراد نہیں ہے بلکہ وہ طالب مولا مراد ہے جو

رات دن یاد حق میں مستغرق ہو۔ یاد رہے کہ بندگان خدا کی یہ گوشہ نشینی عارضی ہوتی ہے جیسے ایک طالب علم یا کسی ماہر فن کو اپنے فن میں مہارت حاصل کرنے کیلئے کچھ عرصہ دنیاوی مشاغل سے کنارہ کشی کر کے اپنے کام میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مشغول ہونا پڑتا ہے اور حصول مدعا کے بعد وہ بہتر طریق پر لوگوں کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ ماہرین فن روحانیت کا بھی یہی دستور ہے۔

ترجمہ جب ان لوگوں نے ظاہری اسباب کو ترک کر کے مسبب الاسباب (حق تعالیٰ) پر توکل کیا تو ان کیلئے فقر فخر بن گیا جس کے چلے جانے سے وہ مغموم ہوتے ہیں اور آنے سے خوش ہوتے ہیں اور اس سے اس قدر مطمئن ہوتے ہیں کہ اس کے بغیر ان کو کسی چیز سے چین نہیں آتا۔

شرح فقر کے ساتھ اطمینان قلب کی وجہ یہ ہے کہ فقر میں ان کو حق تعالیٰ کا قرب و وصال ملتا ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی دولت اور نعمت ہی نہیں ہے۔

ترجمہ لیکن فقر کی ایک ظاہری شکل ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ اس کی ظاہری شکل افلاس اور بے قراری ہے اور اس کا باطن اقبال مندی، کامرانی اور اطمینان قلب ہے اور جو شخص فقر کے ظاہر یعنی ظاہری محتاجی میں رہ گیا اور اس کی باطنی دولت تک نہ پہنچا وہ ناکام ہو کر بھاگ گیا اور جس نے فقر کی حقیقت یعنی باطنی دولت کو پا لیا وہ سارے جہاں سے منہ موڑ کر ذات حق میں فنا یعنی واصل ہو گیا اور بقا باللہ کے مرتبہ پر پہنچ گیا۔ بزرگوں نے کہا ہے **من لم یعرف سوے رسمہ لم یسمع سوے اسمہ** (جو شخص فقر کی صرف ظاہری صورت میں پھنس گیا وہ سوائے لفظ فقر کے اور کچھ نہیں جانتا) پس فقیر وہ ہے جس کی ملکیت کوئی چیز نہ ہو اور نہ اس کے پاس چیز کا ہونا اس کے حال و مقام میں خلل انداز ہو سکے۔

شرح اس کا مطلب یہ نہیں کہ طالب راہ حق کے پاس مادی اشیاء میں سے کچھ نہ ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی مادی چیز کا اس کے پاس ہونا یا نہ ہونا اس کے شغل حق میں خلل انداز نہیں ہونے پاتا۔ جیسے کہ آگے آرہا ہے۔

ترجمہ وہ نہ اسباب دنیا کے ہونے سے خود کو غنی محسوس کرتا ہے اور نہ اس کے نہ ہونے سے اپنے آپ کو محتاج سمجھتا ہے۔ مال و اسباب کا ہونا یا نہ ہونا اس کے فقر کیلئے برابر ہے اور اگر وہ نیستی میں زیادہ خوش ہوتا ہے تو یہ کوئی عجوبہ نہیں ہے کیونکہ مشائخ نے فرمایا کہ درویش جس قدر تنگ دست ہوتا ہے اس کا حال (یعنی روحانی کیفیت) زیادہ بلند ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسباب کا وجود درویش کیلئے مضرت رساں ہوتا ہے اور جس قدر اسباب زیادہ ہو گا اسی نسبت سے اس کا حال کم ہو گا۔ لہٰذا دوستان خدا کیلئے حق تعالیٰ اور اس کی ظاہری و باطنی عنایات کی فراوانی' دنیائے دون کے مال و متاع کی فراوانی سے زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے کہ متاع دنیا راہ رضا میں متاع (مانع) ہے۔

شرح حضرت خواجہ فضیل ابن عیاض قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جس قدر مال و دولت زیادہ ہو گا روحانی نعمت اسی نسبت سے کم ہو گی اور جس قدر متاع دنیا کم ہو گا روحانی مقامات زیادہ بلند ہوں گے لہٰذا جو لوگ امیر ہیں روحانی خسارے میں ہیں۔ بہتر ہے جس قدر زیادہ رزق ہو راہ خدا میں دے کر تنگ دست بن جائے۔

ترجمہ روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک درویش کی کسی بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے کہا کہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہوا کرے مجھ سے طلب کر لیا کریں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اپنے غلاموں کے غلام سے کچھ نہیں مانگ سکتا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کس طرح پر ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے دو غلام ہیں ایک حرص دوسرے امل یعنی لمبی امیدیں باندھنا اور تم ان دونوں کے غلام

ہو۔ اس لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے **الفقر عز لاھلہ** (درویشی اس کے اہل کے لئے عزت ہے) اب جو چیز اہل کے لئے عزت ہے وہ لازماً نااہل کے لئے ذلت ہوگی۔ اہل کے لئے فقر اس لئے عزت ہے کہ اس کی جان اور روح ذلت سے محفوظ ہوتی ہے۔ نہ اس کے جسم پر معصیت کا عذاب ہوتا ہے اور نہ اس کے روح پر کوئی تنگی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا جسم نعمت ظاہری میں اور اس کی روح نعمت باطنی میں مستغرق ہوتی ہے حتیٰ کہ اس کا جسم روحانی اور روح ربانی بن جاتا ہے اور خلق خدا کا اس کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ نہ کسی آدم زاد کو اس سے کوئی نسبت ہوتی ہے نہ وہ متاع دنیا کے نہ ہونے سے تنگ دست ہوتا ہے اور نہ اس کے ہونے سے وہ غنی ہو جاتا ہے حتیٰ کہ ساری کونین کو اگر ترازو میں رکھا جائے تو اس کا پلۂ فقر زیادہ وزنی ہوگا اور اس کے مقابلے میں کونین کی دولت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگی اور بلکہ اس کی روحانی دولت کونین میں بھی نہیں سما سکتی۔

فصل

فقر افضل ہے یا غنا

مشائخ عظام کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا انسان کے لئے فقر افضل ہے یا غنا (دولت)۔

غنا کی افضلیت کے دلائل

اس وجہ سے کہ درحقیقت غنی حق تعالیٰ ہے اور اس کی ہر صفت کو کمال ہے۔ حضرت یحییٰ معاذ رازی، حضرت احمد بن حواری، حضرت حارث **محاسبی**، حضرت ابو العباس بن عطا، حضرت ابو الحسن بن سمعون **رحمھم اللہ** اور

متاخرین میں سے شیخ المشائخ حضرت ابو سعید ابو الخیرؒ فضل اللہ بن محمد میہنیؒ فقر سے غنا کو افضل سمجھتے ہیں۔اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ غنا حق تعالیٰ کی صفت ہے اور فقر سے بالا تر ہے اس لئے جو صفت کہ بندہ اور خدا تعالیٰ میں مشترک ہو وہی افضل ہوگی نہ کہ وہ صفت جو خدا میں نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ شرکت ظاہری اسم میں ہے نہ کہ حقیقت میں۔

شرح یعنی بندہ کے اندر صفت غنا فقط لفظی مشارکت ہے۔ حقیقت میں کوئی مشارکت نہیں یعنی حقیقت میں بندہ غنی نہیں ہے۔

ترجمہ کیونکہ حق تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور انسان کی صفات محدث ہیں۔

شرح صفات الٰہی کے قدیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ذات حق ازلی اور ابدی ہے اسی طرح اس کی صفات بھی ازلی اور ابدی ہیں لیکن انسان چونکہ پہلے نابود تھا اور پھر نابود ہوجائے گا۔ اس کی صفات بھی نابود تھیں اور نابود ہوجائیں گی اس لئے حق تعالیٰ کی صفات اور بندہ کی صفات میں شرکت کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔

ترجمہ اس لئے یہ دلیل غلط ہے کہ انسان کی صفت غنا اس لئے افضل ہے کہ خدا کی صفت بھی غنا ہے۔ اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ صفت غنا حق تعالیٰ کو لائق ہے اور انسان اس نام کا مستحق نہیں ہے۔ اور فقر انسان کی صفت ہے اور حق تعالیٰ پر اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اور یہ جو مجاز میں کسی کو غنی کہا جاتا ہے وہ حقیقت میں غنی نہیں ہوتا۔ اس سے زیادہ قوی دلیل یہ ہے کہ ہمارا غنا مال و اسباب کی فراوانی پر منحصر ہے۔ یعنی جب ہمارے پاس متاع دنیا کی فراوانی ہوتی ہے تو ہم غنی کہلاتے ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ تو خود مسبب الاسباب ہے (یعنی مال و دولت عطا کرنے والا ہے) وہ مال و متاع ہونے کی وجہ سے کیسے

غنی کہلایا جاسکتا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کی صفت غنا میں بندہ کیسے شریک ہو سکتا ہے۔ نیز جب ذات حق میں کوئی شریک نہیں ہے تو صفات میں کیسے کوئی اس کا شریک ہو سکتا ہے۔ اور جب صفات میں شرکت ناممکن ہے تو اسماء میں بھی ناممکن ہونا چاہئے (یعنی غنی اسم ہے اس میں بھی بندہ شریک نہیں ہو سکتا) باقی رہا نام رکھنا (یعنی انسان کو غنی کہنا) تو صرف نشان وہی کے لئے یہ نام رکھا گیا ہے جو بہت ہی محدود یعنی ناتمام ہے۔ خدا کا غنا وہ ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں ہے نہ وہ کسی چیز کا محتاج ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے کوئی چیز اس کے حکم کو نہ ٹال سکتی ہے اور نہ روک سکتی ہے۔ نیز وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ مخلوق میں ضدیں (دو مخالف چیزوں) کو یکجا کر سکتا ہے۔ وہ ازل سے اس صفت سے متصف ہے اور ابد تک رہے گا۔ اس کے برعکس انسان کی صفت غنا اسباب و متاع دنیا پر یا حصول مراد یا مراد کے عدم حصول پر یا خوشی اور غمی پر منحصر ہے اور یہ سب تغیر و تبدل پذیر امور ہیں۔ جن پر انسان کی خوشی و غمی یا عزت و ذلت کا انحصار ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ لفظ غنا جب بندہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو وہ مجازاً" یعنی ظاہری طور پر اور جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو حقیقی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ یَاأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (اے لوگو! تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک فقیر ہو اور اللہ ہی حقیقی معنوں میں غنی ا . قابل ستائش ہے) نیز فرمایا وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (اللہ غنی ہے اور تم فقیر ہو)۔

عوام کا خیال یہ ہے کہ دولت مند اس لئے درویش سے افضل ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اسے دو جہانوں میں سعید پیدا فرمایا ہے۔ اور اس کو نعمت تونگری یعنی دولت سے نوازا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک غنا سے مراد فقط کثرت مال' کامرانی اور خواہشات نفسانی کا پورا ہونا ہے۔ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غنا پر

شکر لازم کیا ہے اور فقر پر صبر۔ چونکہ صبر بلا پر کیا جاتا ہے اور شکر نعمت پر اور چونکہ نعمت بلا سے افضل ہے اس لئے غنا فقر سے افضل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے نعمت پر شکر لازم فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ شکر سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے اور فقر پر صبر کا حکم فرمایا ہے اور صبر سے قرب حق میں زیادتی ہوتی ہے فرمایا لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (اگر شکر کرو گے تو نعمت میں زیادتی ہوگی) اور صبر کے متعلق فرمایا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) اب چونکہ متاع دنیا سے غفلت بڑھتی ہے اس لئے شکر کرنے سے غفلت پر غفلت بڑھے گی۔ اور فقر پر صبر کرنے سے وصل و قرب حق میں اضافہ ہوگا۔

لیکن مشائخ نے جس غنا کو فقر سے افضل قرار دیا ہے اس غنا سے ان کی وہ مراد نہیں ہے جس کو عوام غنا کہتے ہیں یعنی مال و دولت کا زیادہ ہونا۔ بلکہ مشائخ عظام اس شخص کو غنی کہتے ہیں جو روحانی نعمت کی وجہ سے غنی ہو یعنی جو غنی باللہ ہو۔ عوام کے نزدیک غفلت کا نام غنا ہے اور خواص کے نزدیک وصلت "قرب حق" کا نام غنا ہے۔ جیساکہ حضرت ابوسعید ابو الخیر علیہ رحمہ نے فرمایا ہے **الفقیر هو الغنی باللّٰہ** (فقیر وہ ہے جو اللہ کے ساتھ غنی ہو یعنی جس کی دولت اللہ کا قرب ہے) جس کا مطلب ہے مشاہدۂ حق میں دوام۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ مشاہدہ ایک عارضی چیز ہے جس کو مشاہدہ ہوتا ہے اس سے حجاب بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جب صاحب مشاہدہ محجوب ہوجاتا ہے تو وہ محتاج ہوا یا نہ ؟ اگر یہ جواب دیا جائے کہ وہ محتاج نہیں تو یہ ناممکن ہے۔اگر یہ جواب دیا جائے کہ محتاج ہوجاتا ہے تو جب احتیاج آتا ہے اسم غنا ساقط ہوجاتا ہے البتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غنی ہونا اس ہستی پر صادق آسکتا ہے جو قائم الصفتہ اور ثابت المراد ہو۔

شرح یعنی ہمیشہ اس صفت سے موصوف رہے۔ اور یہ صفت اس سے کبھی

ساقط نہ ہو۔

ترجمہ لیکن ان صفات سے دائمی طور پر متصف ہونا بشر کے لئے ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ بشر کی فطرت میں غنا نہیں رکھی گئی۔ بلکہ بشر سراسر احتیاج اور نیاز ہے۔ اور انسان کے حادث ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ محتاج ہے۔

شرح حادث وہ ہے جو ازلی نہ ہو اور بعد میں پیدا کیا جائے۔ اور ابدی نہ ہو بلکہ فنا ہو جائے۔ جب اس کے پیدا ہونے اور فنا ہونے میں کسی اور کا ہاتھ ہے تو وہ یقیناً محتاج ہے۔

ترجمہ اس لئے جو ہستی باقی الصفتہ ہے، یعنی ہمیشہ اپنی صفات کمال سے قائم ہے اور قائم رہے گی وہی دراصل غنی ہے۔ اور فانی الصفتہ ہرگز غنی کہلانے کا مستحق نہیں۔ جملہ **الغنی من اغناہ اللّٰہ** (غنی وہ ہے جسے خدا غنی کرے)۔ میں لفظ **من اغناہ اللّٰہ** مفعول ہے۔ اور جملہ **الفقیر ھو الغنی باللّٰہ** میں لفظ غنی باللہ فاعل ہے۔ چونکہ فاعل قائم بخود ہوتا ہے۔ اور مفعول قائم بافاعل ہوتا ہے لہٰذا جب وہ اپنی ذات سے قائم ہے تو وہ بشر کہلائے گا۔ اور جو حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے۔ وہ صفت بشری سے فانی ہو جاتا ہے۔ اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ جب (پہلی صورت میں) آدمی اپنی ذات سے الگ قائم ہے تو وہ محتاج بشر ہے۔ اور بشریت موجب آفت ہے۔ اور اگر (دوسری صورت میں) وہ اپنی ذات سے فانی ہے تو فانی پر بھی صفت غنا صادق نہیں آتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس شخص پر نہ فقیر کا نام صادق آتا ہے نہ غنی کا۔ لہٰذا صفت غنا صفت حق تعالیٰ ہے۔ اور صفت فقر صفت بندہ ہے۔

شرح اس عبارت میں حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ نے مذکورہ بالا دونوں مقولوں یعنی **الفقیر ھو الغنی باللّٰہ** اور **الغنی من اغناہ اللّٰہ** کا تجزیہ فرمایا ہے

اور یہ ثابت کیا ہے کہ خواہ سالک فانی فی اللہ ہو یا مقام بقاباللہ پر پہنچ جائے وہ ہر حال میں فقیر یعنی محتاج کہلائے گا اور ذات حق ہر حال میں حقیقی غنی کہلائے گی اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مخدومؒ کا مقام کتنا بلند ہے۔ (شرح ختم)

فقر کی غنا پر فضیلت کے دلائل

بعض مشائخ فقر کو غنا سے افضل سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب و سنت میں فقر کی فضیلت آئی ہے اس لئے امت کا اجماع اسی بات پر متفق ہے۔

حضرت جنیدؒ اور ابن عطاؒ میں فقر و غنا پر اختلاف

ایک دفعہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابن عطا رحمۃ اللہ علیہ کے مابین فقر و غنا پر بحث ہو رہی تھی۔ ابن عطا کا مؤقف یہ تھا کہ غنی لوگ افضل ہیں کیونکہ روایات میں آیا ہے کہ غنی سے حساب و کتاب طلب کیا جائے گا اور جب اس سے حساب طلب کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بلاواسطہ (براہ راست) حق تعالیٰ سے ہم کلام ہوں گے خواہ وہ عتاب ہی کی وجہ سے کیوں نہ ہو اور دوست کا عتاب بھی محبوب ہوتا ہے۔ اس پر حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا غنی لوگوں سے حساب و کتاب ہوگا لیکن فقیروں کو معاف کیا جائے گا اور معاف کرنا عتاب دینے سے افضل ہے۔ یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ جو میں بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ محبت میں معافی مانگنا یا معاف کرنا علامت بیگانگی ہے (یعنی خدا تعالیٰ سے بیگانہ ہونا) اور عتاب کرنا بھی یگانگی یعنی دوستی کے خلاف ہے۔ کیونکہ جب دوستی ہوتی ہے تو دونوں چیزیں یعنی عتاب اور معافی آفت سے خالی نہیں۔ کیونکہ معافی گناہ کے ارتکاب پر دی جاتی ہے اور عتاب بھی گناہ کے ارتکاب پر ہوتا ہے۔ اس لئے دوستی میں یہ دونوں صورتیں محال ہیں۔ کیونکہ دوست نہ دوست کے حکم کی عدولی کرتا ہے نہ مورد عتاب یا معافی ہوتا ہے پس

ظلم من سمی ابن ادم امیر وقد سماہ ربہ فقیرا (پس جس نے انسان کو امیر کہا اس نے ظلم کیا کیونکہ اللہ نے اس کو فقیر کہا ہے) چونکہ حق تعالیٰ نے انسان کو فقیر قرار دیا ہے خواہ وہ امیر کیوں نہ ہو وہ فقیر ہی ہے۔ ہلاک ہوا وہ شخص جس نے اس کو امیر کہا خواہ وہ صاحب تخت و تاج ہی کیوں نہ ہو اللہ کے نزدیک وہ فقیر ہے اس وجہ سے کہ امیر صاحب صدقہ (خیرات) ہوتا ہے اور فقیر صاحب صدق (دوستی) اور صاحب صدقہ یعنی امیر کبھی صاحب صدق کے برابر نہیں ہو سکتا۔

حضرت مخدومؒ کے نزدیک فقر و غنا دونوں افضل ہیں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ (اگر عنایت حق شامل حال ہو تو) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے فقر اور حضرت سلیمان پیغمبر علیہ السلام کے غنا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے جب شدت مصیبت میں صبر اختیار فرمایا تو حق تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا نِعْمَ الْعَبْدُ (اچھا بندہ ہے) اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے حسن سلطنت پر بھی فرمایا کہ نِعْمَ الْعَبْدُ (اچھا بندہ ہے) اس سے ثابت ہوا کہ اگر رضائے حق شامل حال ہے تو فقر سلمان (فارسی) اور غنائے حضرت سلیمان علیہ السلام برابر ہوئے۔

استاد ابو القاسم قشیری علیہ رحمہ سے میں نے سنا کہ فرمایا لوگوں نے فقر و غنا پر بحث کی ہے۔ بعض نے فقر اختیار کیا اور بعض نے غنا۔ لیکن میں اس بات کو اختیار کرتا ہوں جو حق تعالیٰ میرے لئے پسند کرے اور اس میں میری حفاظت کرے۔ اگر وہ مجھے غنی کرتا ہے تو میری دعا ہے کہ میں غافل نہ ہو جاؤں اور اگر وہ مجھے فقیر بناتا ہے تو میری دعا یہ ہے کہ حریص اور شکایت کرنے والا نہ بنوں۔ کیونکہ غنا وہ نعمت ہے جس سے غفلت لاحق ہوتی ہے اور فقر وہ نعمت ہے جس میں حرص کی آفت پیدا ہو سکتی ہے دراصل دونوں چیزیں اچھی ہیں لیکن انسان کی

روش ان کو برا بنا دیتی ہے۔ فقر سے مراد یہ ہے کہ ماسویٰ اللہ سے دل پاک ہو اور غنا سے مراد یہ ہے کہ ماسویٰ اللہ میں مشغول رہے۔ جب انسان غیر اللہ میں مشغول ہونے سے محفوظ رہتا ہے تو فقر غنا سے افضل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ غنا کثرت مال کا نام نہیں ہے اور نہ فقر قلت مال کا نام ہے۔ کیونکہ مال و دولت سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ جب سالک اس بات کا یقین کر لے کہ مال و دولت حق تعالیٰ کا ہے تو وہ دونوں ناموں سے آزاد ہوجاتا ہے یعنی نہ فقیر کہلاتا ہے نہ غنی۔

شرح یہ جو مندرجہ بالا عبارات میں فقر و غنا کی ایک دوسرے پر فضیلت کے اقوال پیش کیے گئے ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان حضرات کے مابین کوئی حقیقی اختلاف تھا بلکہ چونکہ ہر بزرگ اپنے علم و دانست اور معرفت میں یکتا تھا۔ اس معاملہ میں ان کی بحث محض طبع آزمائی اور باریک بینی کی حیثیت رکھتی ہے نہ کہ حقیقی اختلاف پر دلالت کرتی ہے۔ یہ ان حضرات کی معرفت کا کمال ہے اور ان کے بلند مقامات کا تقاضا کہ کبھی ظرافت طبع سے کام لیتے ہیں اور کبھی بال کی کھال اتار کر نہایت ہی ادق نکات نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی افتاد طبع اور طبیعت اور مزاج کے مطابق سخن آرائی فرماتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مشائخ عظام میں سے بعض نے تونگری اختیار فرمائی مثلاً غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی بڑی تجارت تھی' حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس دولت بھی تھی اور دولت کو خرچ کرکے قلاش بھی بن جاتے تھے۔ حضرت شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس مال و دولت کی اس قدر کثرت تھی کہ آپ کے گھوڑوں کے کیل بھی سنہری تھے لیکن آپ کے فرزند حضرت مخدوم صدرالدین رحمتہ اللہ علیہ نے سب کچھ راہ حق میں تقسیم کردیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے اور آپ کے والد بزرگوار کے مسلک کے

درمیان اس قدر عظیم فرق کیوں رونما ہوا تو فرمایا کہ میرے والدؒ سانپ کا منتر جانتے تھے۔ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ ایک دفعہ ایک بزرگ دوسرے بزرگ سے ملنے گئے جن کا گھر ایک باغ میں واقعہ تھا اور باغ کے درمیان ایک خوبصورت تالاب تھا۔ جب آنے والے بزرگ نے یہ شان و شوکت دیکھی تو ملاقات کئے بغیر واپس چلے گئے یہ سمجھ کر کہ دنیا داروں سے ملنے کا کیا فائدہ جب اس بات کا علم دوسرے بزرگ کو ہوا تو انھوں نے باغ کے تمام درخت کٹوا دیئے اور اس بزرگ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپ کے اور خدا تعالٰی کے درمیان درخت حائل ہوسکتے ہیں تو لیجئے میں نے آپ کی خاطر ان سب کو کٹوا دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مقیم بزرگ کے نزدیک نہ باغ کا ہونا خدا کے درمیان حجاب تھا نہ باغ کے کاٹنے سے ان کو کوئی قلق یا تکلیف ہوئی۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہی سب سے اونچا مقام ہے۔

فصل

فقر و غنا میں مشائخ کے اسرار و رموز

مشائخ عظام نے فقر و غنا کے بارے میں اسرار و رموز بیان فرمائے ہیں جن کی تفصیل بحد امکان اس کتاب میں بیان کی جائے گی انشاء اللہ عز و جل۔

مشائخ متاخرین میں سے ایک کا قول ہے کہ **لیس الفقیر من خلا من الزاد انما الفقیر من خلا من المراد** (فقیر وہ نہیں جو زاد (مال) سے فارغ ہے بلکہ فقیر وہ ہے جو مراد (اختیار یا تصرف سے فارغ ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ فقیر وہ نہیں جس کے پاس مال و دولت نہیں ہے بلکہ فقیر وہ ہے جو اپنے اختیار و تصرف سے بالاتر ہو۔ کیونکہ اگر اس کو خدا تعالٰی مال عطا کرتا ہے اور وہ اس کی

حفاظت کرتا ہے تو غنی کہلائے گا اگر مال کو ترک کرتا ہے تب بھی غنی ہے کیونکہ ان دونوں صورتوں میں اس نے اپنے اختیار اور تصرف کو بروئے کار لایا۔ لیکن فقر ترک حفظ اور ترک تصرف کا نام ہے۔

شرح اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہ حق تعالیٰ مال و دولت عطا فرمائے یا نہ فرمائے اسے اس میں قطعاً پس و پیش نہیں ہونا چاہئے اور توکل سے کام لینا چاہئے۔ مال آتا ہے تو حق تعالیٰ کی مہربانی سمجھے۔مال جاتا ہے تو بھی اس کی مہربانی سمجھے۔

ترجمہ حضرت معاذ بن رازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **علامتہ الفقر خوف الفقر** (فقر کی علامت یہ ہے کہ انسان فقر سے ڈرتا رہے) یعنی صحیح فقر یہ ہے کہ سالک ہر وقت فقر سے ڈرتا رہے یہاں فقر کے معنی ہیں حق تعالیٰ سے منقطع ہوجانا۔ یعنی اس کو یہ خوف ہمیشہ لاحق رہنا چاہئے کہ کہیں میرا تعلق اللہ تعالیٰ سے ختم نہ ہو جائے۔ اور کمال ولایت' دوام مشاہدت اور فنائے نفس ہمیشہ قائم رہے۔ اور منقطع نہ ہو۔

حضرت خواجہ محمد رویم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **من نعت الفقیرحفظ سره و صیانته نفسه و اداء فرائضه** (فقیر کی تعریف یہ ہے کہ اپنے اسرار کو اغراض سے محفوظ رکھے اور نفس کو آفات سے بچائے اور احکام الٰہی کی پابندی میں مشغول رہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اسرار کو کسی چیز یا طمع کی خاطر ظاہر نہ ہونے دے اور اگر خدا تعالیٰ اس کے اسرار و رموز کو ظاہر کرے تو چھپانے کی کوشش نہ کرے اور غلبۂ حال کی وجہ سے فرائض کی ادائگی میں کوتاہی نہ کرے۔ یعنی مغلوب الحال ہوکر فرائض ترک نہ کرے اور یہ مقام بشریت کے فنا ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے کہ جب بندہ سراپا موافق حق ہوجاتا ہے (یعنی

فنائے تامہ حاصل ہو جاتی ہے) اور یہ چیز بھی حق تعالیٰ کی مہربانی پر منحصر ہے۔

حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **افضل المقامات اعتقاد الصبر الی القبر** (سب سے افضل مقام یہ ہے کہ صبر پر قبر تک جما رہے) یعنی درویشی اور فقر و فاقہ پر قائم رہے حتیٰ کہ قبر تک پہنچ جائے اور چونکہ فقر تمام مقامات کی نفی کرتا ہے اس لئے صبر پر جم جانا یہ تقاضا کرتا ہے کہ اعمال و افعال کی نفی کی جائے اور اوصاف کے فنا کرنے میں کمربستہ ہو جانا چاہئے۔ اس قول سے فقر کی فنا پر فضیلت ثابت ہوتی ہے اور دوام فقر پر کاربند رہنے کی تاکید ہے۔

شرح اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح حضرت مصنفؒ نے فقر کو تمام مقامات کی نفی قرار دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر فقر سے مراد دائمی ترک دنیا ہے اور ہمیشہ کے لئے گوشہ نشینی ہے تو یہ کام مقام فنافی اللہ میں دائمی قیام کے بغیر ممکن نہیں جہاں سالک ہمیشہ کے لئے اپنی ہستی ختم کر کے ذات حق میں محو اور مستغرق ہو جاتا ہے اور مختلف مراتب' مقامات اور درجات کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔صرف ذات ہی ذات باقی رہتی ہے سب کچھ مٹ جاتا ہے حتیٰ کہ سالک کا وجود اور کائنات کا وجود بھی اس کے لئے باقی نہیں رہتا۔ اس کے متعلق حضرت مصنف علیہ رحمہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ ظاہری طور پر اس قول سے فقر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے لیکن درحقیقت فقر کا یہ مفہوم کہ ہمیشہ کے لئے انسان تارک دنیا ہو جائے افضل چیز نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے بلند ترین اور افضل مقام بقا باللہ اور عبدیت ہے کہ جب سالک فنا فی اللہ کی محویت اور استغراق سے نکل کر ہوش میں آتا ہے اور دنیاوی فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کے متعلق مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔

ترجمہ حضرت شیخ ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **الفقیر ان**

لایستغنی بشیٔی دون اللہ (فقیر وہ ہے جس کو حق تعالیٰ کے سوا کسی چیز میں چین نہ آئے) اور ماسویٰ کے ساتھ اس کو کوئی لگاؤ نہ ہو اس قول کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ فقیر حق تعالیٰ کے ساتھ غنی ہوتا ہے اور جب حق کو پالیتا ہے تو تونگر بن جاتا ہے لیکن جب تو نہ رہا (یعنی فنا فی اللہ ہوگیا) تو پھر تو تونگر کیسے رہا۔ دراصل اس قول کے بہت گہرے معنی ہیں اور اہل حقیقت کے نزدیک اس کا کچھ اور مطلب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ **الفقیر لایستغنی عنہ** (فقیر کا کبھی قرب و وصل حق میں دل نہیں بھرتا) یعنی فقیر وہ ہے جس کا ہرگز جی نہ بھر جائے ۔

شرح کسی مقام قرب پر کفایت اور قناعت نہ کرے بلکہ جس قدر قرب حق میں ترقی کرے اس کو ناکافی سمجھے اور پرواز جاری رکھے۔ اور **ھل من مزید** کے نعرے لگاتا رہے۔

ترجمہ اس مطلب کو حضرت خواجہ عبداللہ انصاری ہروی رحمتہ اللہ علیہ نے خوب واضح فرمایا ہے آپ فرماتے ہیں کہ ہمارا غم ابدی ہے نہ ہم اپنے مقصود کو مکمل طور پر پا سکتے ہیں اور نہ ہمیں مکمل فنا حاصل ہوتی ہے خواہ اس دنیاوی زندگی میں خواہ موت کے بعد آخرت میں۔ اس وجہ سے کہ کسی چیز کی دوسری چیز میں فنا اس وقت مکمل ہوسکتی ہے جبکہ دونوں کی جنس ایک ہو (جیسے پانی کے قطرے کا دریا میں ایک ہوجانا) لیکن حق تعالیٰ اور انسان ہم جنس نہیں ہیں۔ اگرچہ چین غفلت میں ملتا ہے لیکن درویش غافل نہیں ہوسکتا۔ پس ہمارا غم و اندوہ دائمی ہے اور ہماری مشکل لاعلاج ہے۔ ہمارا دوست وہ دوست ہے کہ جس کا دیدار کوشش سے حاصل نہیں ہوسکتا اور اس کا وصال نہ بشر کے مقدور میں ہے نہ حالت فنا میں کوئی تبدیل واقعہ ہوتا ہے۔ نہ حالت بقاء میں کوئی تغیر۔ نہ فانی فی اللہ باقی باللہ ہوسکتا ہے تاکہ اس کو وصل نصیب ہو اور نہ باقی باللہ فانی فی اللہ ہو سکتا ہے تاکہ اس کو قرب حق حاصل ہو۔ لہٰذا عاشقان الٰہی کا کام سراسر

مشکل بن گیا ہے۔ ہم لوگوں نے تسلئ دل کے لئے خوش کن عادتیں بنالی ہیں اور خود کو تسلی دینے کے لئے ہم نے مقامات و منازل اور طریقے پیدا کر لئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اور انسان کا تعلق ایسا ہے جیسا کہ ایک جنس کا دوسری ہم جنس کے ساتھ ہوتا ہے لیکن حق تعالیٰ تو ان چیزوں سے مبرا اور پاک ہے انسان کا کیسے ہم جنس ہو سکتا ہے۔

شرح مندرجہ بالا عبارت سمجھنے کے لئے تصوف کی اصطلاحات فنا فی اللہ اور بقاء باللہ کی نوعیت کا سمجھنا ضروری ہے یہ امر مسلمہ ہے اور ہر فرقہ کے لوگوں کا ایمان و یقین ہے کہ اسلام کی غرض و غایت حصول قرب ہے جس کو قرآن مجید میں معیت' قرب' لقاء' رویت جیسے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔اور احادیث میں قرب' وصل' معرفت و حقیقت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔اب جاننا چاہئے کہ قرب سے کیا مراد ہے۔ چونکہ انسان کے اذہان زمان و مکان کی قید میں مقید ہیں ہم قرب اور وصال حق کو محبوبان مجازی کے قرب و وصال کی طرح سمجھنے کے عادی ہیں۔ جیسے ایک شخص دوسرے شخص کے قریب بیٹھا ہو یا اس سے بغلگیر ہو۔ لیکن چونکہ ذات حق جسم' شکل و صورت سے منزہ اور پاک ہے قرب و وصال حق سے دو آدمیوں کا سا قرب و وصال مراد نہیں ہے بلکہ چونکہ حق تعالیٰ نور ہے اور انسان کا روح بھی نور ہے' انسان کے حق تعالیٰ سے قرب و وصال کا مطلب ہے نور روح انسان کا نور روح حق تعالیٰ کے ساتھ قریب ہونا اور اس کے ساتھ واصل ہونا۔ فنا فی اللہ سے بھی یہی مراد ہے کہ نور روح انسان کو نور روح حق کے ساتھ اس قدر قرب و وصال حاصل ہوجائے کہ اس کے اندر فنا ہوجائے اور خود باقی نہ رہے۔ نور حق یا ذات حق باقی رہ جائے۔ جیسے ایک شمع یا چراغ کی روشنی دوسرے چراغ کی روشنی میں یا آفتاب کی روشنی میں مدغم ہوجاتی ہے اور تمیز نہیں ہوسکتی کہ چراغ کی روشنی کہاں ہے۔ لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ

مثال غیر مکمل اور غیر شافی ہے کیونکہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (ذات حق سبحانہٗ و تعالیٰ پر کوئی مثال صادق نہیں آسکتی وہ بے مثل و بے مثال ہے) ہم نے سمجھنے کی خاطر یہ مثال پیش کی ہے لیکن حقیقت میں یہ مثال بالکل کمزور اور غیر تسلی بخش ہے کیونکہ نہ انسان کی حقیقت کو ایک چراغ سے کوئی نسبت ہے اور نہ حق تعالیٰ کو آفتاب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ انسان چراغ سے لاکھ گنا بلند و برتر ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ اور آفتاب میں کیا نسبت ہوسکتی ہے سوائے اس کے کہ حق تعالیٰ خالق اور آفتاب مخلوق ہے۔ نیز نہ چراغ میں آفتاب کے لئے وہ تڑپ موجود ہے جو حضرت انسان کو ذات حق کے لئے ہے اور نہ آفتاب کی چراغ پر وہ نظر رحمت و شفقت اور محبت ہے جو حق تعالیٰ کو انسان کے ساتھ ہے۔ اور یہی دونوں طرف سے محبت، کشش اور جاذبیت ہے جو عاشق و معشوق، محب اور محبوب کو ایک دوسرے کا قرب تلاش کرنے اور وصال کی اس حد تک پہنچنے پر آمادہ کرتی ہے جسے فنا فی اللہ کہا جاتا ہے۔

اس تڑپ کا آغاز اعلان **کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق** (میں حسن و جمال کا ایک مخفی خزانہ تھا مجھے یہ شوق ہوا کہ پہچانا جاؤں یعنی میرے حسن و جمال کا مشاہدہ ہو اس لئے میں نے کائنات کو پیدا کیا) سے ہوا اور اس کا انجام حدیث قدسی **بی یسمع بی یبصرو** میں ہوا جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میرا بندہ جب نوافل یعنی زائد عبادات و مجاہدات کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اس سے اس قدر قریب ہوجاتا ہوں کہ وہ مجھ سے دیکھتا ہے، مجھ سے سنتا ہے، اور میری قوت سے تمام کام کرتا ہے۔ یہ غایت قرب و وصال کا مقام ہے جہاں تک رسائی حاصل کرانے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر علیہم السلام کی تشریف آوری ہوئی اور پھر ان کے ہزاروں لاکھوں خلفاء یعنی اولیاء اللہ نے دنیا کے گوشے گوشے میں جاکر

بنی نوع انسان کو اس بلند ترین مقصد کے لئے دعوت دی اور خوش بخت لوگوں کو کامیابی سے حق تعالیٰ کے ساتھ واصل کرا دیا۔

اب ہم یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ عملاً مقام قرب کیسے حاصل ہوتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے "سلوک الیٰ اللہ" یعنی اس روحانی کورس کے سمجھنے کی ضرورت ہے جو مشائخ عظام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں طالبان راہ حقیقت کی سہولت کے لئے مرتب کیا ہے جیساکہ اسلامی عقائد کا خاکہ متکلمین حضرات نے اور اسلامی قوانین کا خاکہ فقہاء کرام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں مرتب کیا ہے تاکہ وہ لوگ جو قرآن و حدیث کو مکمل طور پر سمجھ نہیں سکتے ان کے لئے سہولت پیدا ہو سکے۔

سلوکِ اِلیٰ اللہ

سلوک الیٰ اللہ ویسے تو خاصہ طویل موضوع ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں اور جس کی میری انگریزی کتاب "اسلامی تصوف" اور اردو کتاب "روحانیت اسلام" میں مکمل وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس کا ایک خاکہ کتاب ھٰذا کے شروع میں دیا گیا ہے جو ایک دائرہ کی شکل میں ہے۔ دائرہ کے نچلے حصے سے یعنی نکتہ ب سے سلوک یا سیر الیٰ اللہ (اللہ کی طرف پرواز) کا آغاز ہوتا ہے۔ اور نکتہ الف پر پہنچ کر سالک راہ حقیقت کی پرواز ذات حق میں شروع ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر نور روح انسان، نور روح حق میں واصل ہو کر قریب سے قریب تر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بقول سعدی ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ ذات حق کی کوئی انتہا ہے نہ طالب مولا کے ذوق و شوق میں کوئی کمی

ہوتی ہے طالب سفر کرتے کرتے استسقیٰ کے مریض کی طرح پانی پی پی کر ختم ہوجاتا ہے اور ذات حق دریا کی طرح رواں دواں رہتی ہے) لیکن یہ مثال بھی ناکمل ہے کیونکہ طالب مستسقی کی طرح ختم نہیں ہوجاتا بلکہ موت کے بعد قیامت تک اور قیامت کے بعد ابدالآباد تک ذات حق میں قریب سے قریب تر مقام کی تلاش میں پرواز جاری رکھتا ہے لیکن نہ ذات حق کی کوئی انتہا ہے نہ اس کی پرواز ختم ہوتی ہے اس لئے حضرت پیر انصارؒ نے فرمایا ہے کہ ہمارا اندوہ ابدی ہے۔

اب چونکہ باقی مذاہب کے برعکس اسلام میں آخری مقام فنا میں محو و مست رہ جانا نہیں بلکہ اس دائرہ کے مقام ب پر یعنی نکتہ آغاز پر واپس آکر مقام دوئی اور کثرت پر فرائض زندگی ادا کرنا ہے اس لئے جس حد تک ایک سالک اپنی استعداد کے مطابق اونچی پرواز کرتا ہے اس کے بعد واپس آتا ہے اور فرائض زندگی ادا کرتا ہے اس لئے جس حد تک ایک سالک اپنی استعداد کے مطابق اونچی پرواز کر سکتا ہے، کرتا ہے اس کے بعد اسے واپس آنے اور فرائض زندگی انجام دینے کا حکم ملتا ہے۔ اس واپس آنے کے مقام کو بقاء باللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔کیونکہ مندرجہ بالا حدیث قدسی کی رو سے طالب جب مقام فنا میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات سے متصف ہوجاتا ہے تو اس کے اندر حق تعالیٰ کی بصیرت اور سماعت اور قدرت سے تمام امور سرانجام دینے کی طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور پھر وہ مقام آغاز پر واپس آکر ان صفات الٰہی کی روشنی اور قوت اور قدرت سے انسان کامل اور خلیفۃ اللہ فی الارض یا نائب حق کے فرائض انجام دیتا ہے۔ جس کی خبر ہمیں آیہ مبارکہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً میں دی گئی ہے۔ اس واپس آنے کے مقام کو بقاباللہ اور نزول اور عبدیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور ذات حق میں فنا کو فنا فی اللہ اور عروج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جہاں مقام عروج میں سراسر محویت اور استغراق وصل ہے، مقام بقاء یا نزول میں سراسر صحو اور ہوشیاری، عجز و نیاز اور عبادت کا ذوق و شوق ہے، اس لئے اس مقام کو مقام عبدیت کہا گیا ہے۔ جو خاصہ ہے ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ کیونکہ آپؐ کو عروج میں بھی کمال حاصل تھا اور نزول میں بھی کمال تھا۔ آپؐ سے زیادہ اونچا نہ کوئی مقام قرب و فنا میں پہنچا ہے اور نہ آپؐ جیسا قوی مقام نزول، بشریت اور عبودیت کسی کو حاصل ہوا ہے۔ اس لئے آپؐ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ **لی مع اللہ وقت لا یسعنی ملک المقرب و نبی المرسل** (مجھے ذات حق کے ساتھ قرب کا وہ مقام حاصل ہے کہ نہ کسی مقرب فرشتہ اور نہ نبی مرسل کی وہاں تک رسائی حاصل ہوسکتی ہے) اور یہ بات دونوں مقامات یعنی فنا فی اللہ اور بقاء باللہ پر صادق آتی ہے۔ یعنی فنا فی اللہ میں آپؐ کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے اور بقاء باللہ یعنی عبدیت میں بھی۔

اب چونکہ ذات حق اور انسان ہم جنس نہیں ہیں اس لئے طالب حق کو فنائے تامہ کبھی نصیب نہیں ہوسکتی اسی چراغ اور آفتاب کی مثال کو سامنے لایا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ جس طرح چراغ اور آفتاب ہم جنس نہیں ہیں۔ چراغ جس قدر کوشش کر کے نہ اپنی مٹی سے پیچھا چھڑا سکتا ہے نہ آفتاب میں پوری طرح مدغم ہوسکتا ہے۔ انسان بھی چراغ کی طرح ایک خاک کا پتلا ہے اور ذات حق نورٌ علیٰ نور ہے اس لئے انسان جس قدر کوشش کرتا ہے ذات حق میں مکمل طور پر فنا حاصل نہیں کر سکتا اور ہمیشہ جدوجہد میں مشغول رہتا ہے۔ اسی کا نام ہے عشق کی ناکامی اور نامرادی، جس کی عشاق الٰہی اور شعراء کرام نوحہ گری کرتے آئے ہیں اور کرتے چلے جائیں گے۔ اسی غم اور مصیبت کو حضرت شیخ عبداللہ انصاری رحمتہ اللہ علیہ نے "اندوہ ابدی" کا نام دیا ہے۔

ترجمہ حضرت خواجہ ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **نعت**

الفقیر السکوت عندالعدم و البذل عندالوجود و قال ایضا الاضطراب عند الوجود (فقیر کی تعریف یہ ہے کہ جب کچھ نہ ملے تو خاموش رہے یعنی صبر کرے اور کچھ مل جائے تو دوسروں پر خرچ کردے۔ یہ بھی فرمایا کہ جب فقیر کو کوئی چیز ملتی ہے تو اسے اضطرار لاحق ہوجاتا ہے)۔

شرح اضطراب اس لئے کہ ایک تو مال و دولت کے گھر میں آنے کو وہ علامت شامت سمجھتے ہیں دوسرے غرباء کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھتے ہیں۔

ترجمہ یہ ایک عظیم کام ہے۔ اس قول کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ مال و اسباب کی عدم موجودگی کے وقت سکون اور اس کے راضی برضائے حق کی علامت ہے اور مال و اسباب حاصل ہونے پر سخاوت اس کی خدا کے ساتھ محبت کی دلیل ہے۔ اب جو شخص حق تعالیٰ کی رضا کے ساتھ راضی ہوتا ہے اس کو انعام میں خلعت ملتی ہیں اور جو شخص خدا تعالیٰ کی محبت میں ہر چیز خرچ کردیتا ہے اسے خلعت کا طمع نہیں ہوتا کیونکہ محبّ سوائے ذات حق کے کسی چیز کا طالب نہیں ہوتا اگر غیر کو یعنی خلعت کو طلب کیا جائے تو فرقت لازم آتی ہے (یعنی جب طالب خلعت ہوا تو محبت سے گر گیا) اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس کو عدم میں سکون اس لئے میسر آتا ہے کہ اس کو لینے کی انتظار نہیں ہوتی۔ اور چیز کے ملنے سے اس کو اضطراب اس لئے ہوتا ہے کہ یہ غیر اللہ ہے اور غیر اللہ سے فقیر کو سکون نہیں آتا بلکہ اضطراب لاحق ہوجاتا ہے اس لئے بذل (سخاوت) اختیار کرتا ہے اور فوراً اس سے پیچھا چھڑا لیتا ہے۔

شرح سبحان اللہ! خاصان خدا کا کس قدر بلند مقام ہے کہ جس دنیا کے پیچھے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں اس کی آمد سے یہ حضرات اضطراب میں مبتلا

ہو جاتے ہیں اور خرچ کر کے آرام پاتے ہیں۔ اب جو لوگ دنیا پر فریفتہ ہیں خواہ وہ علماء ہوں یا عوام اس چیز کو ناممکنات میں شمار کرتے ہیں کہ کوئی بندۂ خدا ایسا بھی ہے جو ان کی محبوب دنیا سے نفرت کرتا ہے۔ خواجہ حافظ شیرازیؒ نے زاہد کو مخاطب کر کے سچ کہا۔

تو وطوبیٰ و ماو قامت یار
فکر ہرکس بقدر ہمت اوست

(یعنی زاہد جنت کے سرو کے پودے کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ اس سے بہشت کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ہم عشاق ازل طوبیٰ (سرو) کو قامت یار کے مشابہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ سچ ہے کہ ہر شخص اپنی ہمت کے مطابق سوچتا ہے) صوفیاء نے خوب کہا ہے۔ **من کان ہمتہ ما دخل فی بطنہ قیمتہ ما خرج منہ** (جس شخص کی تمام ہمت اس بات پر مرکوز ہے کہ پیٹ کے اندر کیا داخل ہوتا ہے اس کی قیمت وہ ہے جو پیٹ سے خارج ہوتا ہے)۔

ترجمہ اسی مضمون پر حضرت ابوالقاسم جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **الفقر خلو القلب عن الاشکال** (فقر نام ہے قلب کا خالی کرنا تصوّر غیر اللہ سے) اس لیے وہ غیر اللہ کو جلد تر اپنے سے جدا کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **الفقر بحر البلاء و بلاؤہٗ کلہٗ عز** (فقر بحر بلا ہے اور دوست کی فرستادہ بلا عزت ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بلا اس وقت باعث عزت ہے جب بلا میں مبتلا کرنے والے (حق تعالیٰ) پر نظر رکھتا ہے اور سب کچھ اسی سے سمجھتا ہے۔ ورنہ جو بلا میں مبتلا ہے وہ کیسے معزز بن سکتا ہے کیونکہ وہ تو بلا میں غرق ہے۔

شرح یعنی جب بلا میں بلا نازل کرنے والے کو پہچانتا ہے تو بلا سے خوش ہوتا

ہے اور اس کو دوست کا عطیہ سمجھ کر عزت محسوس کرتا ہے۔

ترجمہ اس وقت بلا اس کے لیے عزت بن جاتی ہے اور عزت میں قربت اور قربت میں محبت اور محبت میں مشاہدہ ہی مشاہدہ ہے۔ حتیٰ کہ طالب کا دماغ محلِ دیدار بن جاتا ہے لیکن اس کا دیدار بغیر جسمانی آنکھوں کے ہوتا ہے اسی طرح وہ بغیر جسمانی کانوں کے دوست کی آواز سنتا ہے پس خوش نصیب ہے وہ بندہ جو بلا و مصیبت میں دوست کو پاتا اور حقیقی معنوں میں عزیز یعنی معزز بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس نعمت ہائے دنیا درحقیقت ذلت ہیں کیونکہ عزت یہ ہے حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہو اور ذلت یہ ہے کہ حق سے مجور ہو جائے۔ اس لیے بلائے فقر علامت حضوری ہے اور راحت غنا (دولتمندی) علامت دوری ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ کی حضوری عزت ہے اور بُعد ذلت ہے۔ اور وہ بلا جس کا انجام مشاہدہ اور دیدار ہے ہر حال میں غنیمت (قابل قدر ہے)۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **یا معشر الفقراء انکم تعرفون باللّٰہ وتکرمون للّٰہ فانظروا کیف تکونوا مع اللّٰہ اذا خلوتم بہ** (اے فقراء کا گروہ تم کو خلقت خداوند تعالیٰ کی وجہ سے پہچانتی ہے اور خدا ہی کے لیے تمہاری عزت کرتی ہے اب دیکھنا کہ تم خلوت میں اس کے ساتھ کیسے برتاؤ کرتے ہو) یعنی جب لوگ تم کو فقر اور درویشی کی وجہ سے عزیز سمجھتے ہیں اور تمہاری عزت کرتے ہیں تمہیں بھی حق درویشی ادا کرنا چاہیے۔ اگر خلق خدا تم کو کسی اور نام سے پکارے (یعنی فقیر کے علاوہ) تو تم غمگین مت ہو کیونکہ تم انصاف سے دیکھو تو جیسا کہ تم ہو لوگ اسی نام سے تجھ کو پکارتے ہیں۔ بدترین وہ شخص ہے کہ لوگ اسے نیک سمجھیں اور وہ نیک نہ ہو اور بہترین شخص وہ ہے کہ وہ نیک ہو اور لوگ اس کو نیک نہ سمجھیں۔ یعنی ایک شخص بندۂ حق نہیں ہے اور لوگ اس کو بندۂ حق سمجھیں۔ وہ اس شخص جیسا ہے جو طبیب ہونے کا

دعویٰ کرتا ہے اور لوگوں کے علاج میں بھی مشغول ہے لیکن دراصل وہ اس ہنر سے ناواقف ہے اور بیماروں کو بیمار تر بناتا ہے۔ اور جب وہ خود بیمار ہوتا ہے تو اپنے علاج سے عاجز آجاتا ہے۔ کیونکہ وہ علم طب سے بیگانہ ہے اس کو اپنے علاج کے لیے دوسرے معالج کی ضرورت ہوتی ہے اور جو شخص بندۂ حق ہے اور لوگ اس کو بندۂ حق سمجھتے ہیں اس کی مثال اس طبیب کی ہے جو طب سے واقف ہے اور لوگ بھی اس کو طبیب سمجھتے ہیں۔ ایسا آدمی جب بیمار ہوتا ہے تو اپنا علاج آپ کر سکتا ہے اور ایسے شخص کی مثال کہ وہ مرد حق نہیں ہے اور لوگ اسے مرد حق سمجھیں یہ ہے کہ ایک شخص درحقیقت طبیب ہے لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے۔ ایسا شخص دوسروں کا علاج تو نہیں کرپاتا لیکن خود اچھی غذا اور فرحت بخش شربتوں سے مستفید ہوتا رہتا ہے اور بیمار نہیں ہوتا اور لوگ اس کے حال سے بے خبر ہوتے ہیں۔

بعض متأخرین کا قول ہے کہ **الفقر عدم بلا وجود** (فقر عدم ہے اور اس کا کوئی وجود نہیں ہے) اس لیے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی کیونکہ جب کسی چیز کا وجود ہی نہ ہو تو اس کی تعریف کیا کی جائے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ فقیر اپنی ہستی گم کر کے معدوم ہو جاتا ہے۔ لیکن مشائخ نے جو کچھ فقر اور فقیر کے متعلق لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ فقر بذات خود معدوم نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فقر کی حالت میں آفت معدوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جب تک انسان اپنی ذات و صفات سے قائم ہے آفت میں ہے اور جب اپنی ذات سے فانی اور حق کے ساتھ باقی ہوتا ہے تو پھر آفت سے نجات پاتا ہے۔ اس لیے فناء صفت حق تعالیٰ سے واصل ہونے کی علامت ہے۔

اور میں نے متکلمین کے ایک گروہ کو دیکھا جو اس چیز کو نہیں سمجھتے اور اس پر ہنستے تھے کہ یہ قول غیر معقول ہے۔ میں نے ایک اور گروہ دیکھا جو اس قول

کو صحیح سمجھتا تھا لیکن اس کی حقیقت سے آگاہ نہ تھا۔ یہ دونوں گروہ غلطی پر تھے۔ پہلا گروہ جہالت کی وجہ سے اس کا منکر تھا اور دوسرا گروہ جہالت کی وجہ سے اس پر قائم تھا۔ لیکن جب صوفیاء کرام "فقر عدم ہے جس کا کوئی وجود نہیں" جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو بُری صفات کی نفی کرتے ہیں نہ کہ بذات خود فقر کی نفی۔ کیونکہ فقر کی حالت میں تمام صفات مذمومہ ختم ہو جاتی ہیں اور صفات محمودہ پیدا ہو جاتی ہیں۔

غرضیکہ لفظ درویشی یہاں استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے جو بظاہر مفلسی ظاہر کرتا ہے لیکن درحقیقت وہ اسرار ربانی کی گزرگاہ ہے۔

شرح یعنی فقر کے لفظی معنی تو مفلسی کے ہیں لیکن ہے یہ بلند درجہ کی دولت اور عظیم نعمت جس کا مقابلہ کوئی دنیاوی سلطنت نہیں کر سکتی۔

ترجمہ جب تک وہ اپنے اعمال اور افعال کو اپنے آپ سے منسوب کرتا ہے فقیری کو اس کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے لیکن جب وہ اس خیال سے یعنی اپنے کاسب ہونے سے باز آتا ہے تو یہ نسبت منقطع ہو جاتی ہے۔ اس وقت جو کچھ اس پر گزرتا ہے وہ نہ "راہ" کہلایا جا سکتا ہے نہ "راہ رو" نہ وہ کسی چیز کو اختیار کرتا ہے نہ کسی چیز کو اپنے سے دفع کرتا ہے بلکہ ہر چیز کو عین حق تعالیٰ سمجھتا ہے۔

شرح ہر چیز کو عین سمجھنا بھی وحدت الوجود ہے جس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔

ترجمہ میں نے ایک اور گروہ دیکھا جو بہت تیز کلام تھا اور درویشی کے کمالات نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ان کی نفی کرتا تھا۔

شرح جیسے ایک شخص کی نظر کمزور ہے اور آسمان پر ستارے نہیں دیکھ سکتا

اور کہتا ہے کہ آسمان پر کوئی ستارہ موجود نہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ آسمان پر ستارے ہیں جھوٹ بولتے ہیں۔

ترجمہ یہ بہت بڑی دیدہ دلیری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقر کی حقیقت کے منکر نہیں تھے بلکہ صفات فقر کے منکر تھے۔ اور وہ لوگ فقر کے انکار کو بہت بڑا درجہ سمجھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے یہ ان کا تکبر اور غرور ہے۔ پس طالب کو چاہئے کہ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھے تاکہ ان کی باتوں سے گمراہ نہ ہو جائے۔

اب میں تصوف کے متعلق ارباب تصوف کے اصول' اسرار و رموز اور ارشادات کو اختصار سے بیان کرتا ہوں۔ اس کے بعد ان حضرات کے حالات بیان کروں گا۔ پھر صوفیاء کرام کے باہمی اختلافات اور اس کے بعد حقیقت' معرفت اور شریعت کے احکام بیان کروں گا اور آخر میں ان کے بلند مقامات اور اسرار و رموز پر حتی المقدور روشنی ڈالوں گا تاکہ تجھے اور قارئین کو حقیقت حال معلوم ہو جائے۔ وباللہ التوفیق۔

روزیکہ مقدسانِ خاکی مدفن
گردند باز سوار برمرکب تن
آغشتہ بخوں آلودہ کفن
از خاکِ سر کوئے تو خیزم من
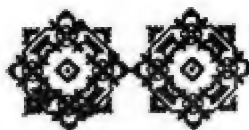
حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (خدائے رحمان کے ایسے بندے بھی ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اور جب ان کے ساتھ کوئی جہالت کی بات کرتے ہیں تو وہ ان کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں)۔

شرح اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی زمین پر اکڑ کر چلنا اور بے علم لوگوں سے خوامخواہ جھگڑ پڑنا مومن کا شیوہ نہیں ہے۔

ترجمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے **من سمع صوت اهل التصوف فلا یؤمن علی دعائهم کتب عند اللّٰہ من الغافلین** (جو اہل تصوف کی دعا کو سنے اور اس پر آمین نہ کہے تو عند اللہ وہ غافلین کی فہرست میں لکھا جاتا ہے)۔

شرح اس حدیث پاک میں تصوف اور اہل تصوف جیسے الفاظ موجود ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تصوف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک میں بھی رائج تھا۔

ترجمہ لوگوں نے تصوف کے مضمون پر بہت کچھ کہا ہے اور کافی کتابیں لکھیں ہیں۔

لفظ صوفی یا تصوف کی وجہ تسمیہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صوفی کو اس لئے صوفی کہا گیا ہے کہ وہ صف اول (یعنی اول درجہ) کے لوگ ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے احوال اصحاب صفہ کے مطابق ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ صفا سے مشتق ہے (صفا بمعنی پاکیزہ)۔ غرضیکہ ہر شخص نے اپنی تحقیق کے مطابق اس لفظ کے متعلق لطیف باتیں بیان کی ہیں۔ لغت کے اعتبار سے یہ تمام باتیں بعید از قیاس ہیں۔ لیکن ان میں سے لفظ صفا سے **اشتقاق** زیادہ صحیح ہے۔ صفا سے مراد صفائی قلب ہے جس کی ضد کدر ہے۔ جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ **ذھب صفو الدنیا وبقی کدرھا** (دنیا سے اچھائی اٹھ گئی ہے اور گندگی باقی رہ گئی ہے) کسی چیز کی اچھائی کو اس کی صفوت کہتے ہیں۔ چنانچہ جب ارباب تصوف نے اپنے اخلاق و اعمال کو پسندیدہ بنایا اور نفسانی خواہشات سے نجات پائی تو صوفی کے نام سے مشہور ہوئے۔ حالانکہ یہ نام محض ایک ظاہری نشانی ہے جس کی وجہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ جہاں تک اس کی حقیقت کا تعلق ہے ان کے مراتب اسقدر بلند ہیں کہ ان سے ہرگز روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال جن لوگوں کو **اشتقاق** کی ضرورت ہے تو ان کے لئے یہ **اشتقاق** (یعنی لفظ صفا) کافی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ نے ارباب تصوف کے مراتب

اور مدارج کو عوام سے پوشیدہ کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ بعض لوگ خیال کرنے لگ گئے ہیں کہ تصوف ایک ظاہری چیز کا نام ہے اس کا بطون نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک بے معنی رسم ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہاں تک کہ تمسخر یعنی مذاق میں آکر اس کی حقیقت سے انکار کر دیتے ہیں اور مذہب اصحاب سلف اور صحابہ کرام کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۔

ان الصفا صفت الصدیق
ان اروت صوفیا علی التحقیق

(تحقیق صفائے قلب صدیق اکبر یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صفت ہے۔ اگر تم صوفی بننا چاہتے ہو تو ان کو دیکھو)۔

یاد رہے کہ صفائے باطن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اس کا ظاہر دنیائے غدار کو دل سے نکالنا اور اس کا باطن اغیار یعنی غیراللہ سے **انقطاع** ہے اور یہ دونوں صفات حضرت ابوبکر صدیق بن قحافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں موجود تھیں۔ کیونکہ آپ امام اہل طریقت ہیں آپ کے **انقطاع** از دنیا کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جہان فانی سے عالم باقی کی طرف تشریف لے گئے تو تمام صحابہ کرام سخت پریشان حال تھے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تلوار نکال کر کہا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم وفات پا گئے ہیں میں اس کا سر تن سے جدا کر دوں گا۔

شرح اس کی وجہ بعض نے یہ بیان کی ہے کہ سیاسی طور پر کچھ عرصہ کے لیے آپ دشمنان اسلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کی خبر چھپانا چاہتے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قدر پیار تھا کہ لفظ موت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس بات کا علم اور

احساس ان لوگوں کو بخوبی ہو جاتا ہے جن کے عزیز فوت ہو جاتے ہیں۔ میرے عزیز بھائی کو فوت ہوئے دو سال ہو چکے ہیں لیکن میں اب تک نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مر گئے ہیں اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ان کی قبر پر گیا بلکہ یہ کہتا ہوں کہ میں قبرستان گیا۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حیاۃ النبی ہیں انہوں نے لوگوں کو مردہ کہنے سے منع کیا لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بقاباللہ اور عبدیت کے اس بلند مقام پر تھے کہ ہمت و استقلال کا پہاڑ بن کر سامنے آئے۔

ترجمہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باآواز بلند فرمایا کہ "اے لوگو ! جو شخص محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عبادت کرتا تھا اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس جہان سے چلے گئے ہیں اور جو رب محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عبادت کرتا ہے تو یاد رکھو کہ وہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرتا۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں آپ سے پہلے بہت رسول گزر چکے ہیں۔ پس اگر وہ مر جائیں یا قتل کئے جائیں تو کیا تم دین اسلام سے پھر جاؤ گے) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص فانی چیز کے ساتھ دل لگاتا ہے فنا ہو جاتا ہے اور دکھ اٹھاتا ہے اور جو شخص باقی کے ساتھ دل لگاتا ہے وہ زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔ خواہ اس کا جسم فنا کیوں نہ ہو جائے پس جس کسی نے محمد علیہ السلام کو ظاہری آنکھوں سے دیکھا آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس جہان سے پردہ پوش ہونے کے بعد آپ کی تعظیم اس کے دل سے نکل گئی اور جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو چشم حقیقت سے دیکھا اس کے لیے آپ کا اس جہان سے پردہ پوش ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ کیونکہ جس شخص کو مقام بقاء باللہ حاصل ہے۔ اس نے

آپ کو باقی بحق (باقی باللہ) دیکھا اور جو مقام فنا فی اللہ پر ہے اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فانی بحق (فنا فی اللہ) دیکھا۔ بہر صورت اس نے مُحَوَّل یعنی تبدیل شدہ کی بجائے محول یعنی تبدیل کرنے والے کو دیکھا۔ نہ اس نے کسی غیر سے دل لگایا نہ خلق پر نگاہ کی۔ کسی نے خوب کہا ؎

من نظر الی الخلق هلک
ومن نظر الی الحق ملک

(جس نے خلق پر نظر کی ہلاک ہوا اور جس نے حق پر نظر کی وہ فرشتہ بنا)
کیونکہ خلق پر امید باندھنا علامت ہلاکت ہے اور حق پر نظر امید رکھنا علامت ملائکہ ہے۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فقر کی علامت یہ تھی کہ آپ نے دنیائے غدار کو دل سے نکال دیا اور مال و متاع جو کچھ تھا راہ خدا میں دے دیا اور گلیم پہن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ اہل و عیال کے لئے کیا چھوڑ آئے ہو عرض کیا کہ دو بے بہا خزانے گھر میں چھوڑ آیا ہوں اول اللہ کی محبت دوم رسولؐ کی متابعت۔

شرح علامہ اقبال نے اس واقعہ کو زبان شعر و سخن میں یوں بیان کیا ہے ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے اللہ اور رسولؐ بس

ترجمہ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا دل دنیا کی محبت سے پاک ہو گیا آپ کا ہاتھ خود بخود اس کی آلائش سے صاف ہوا اور آپ نے سب کچھ اٹھا کر راہ حق میں دے دیا۔ یہ تمام صفات صوفی صادق کی ہیں اور ان کا انکار حق کا انکار ہے اور صاف مکابرہ یعنی تکبر اور غرور کی بات ہے۔

اور یہ جو میں نے کہا کہ صفا ضد ہے کدر کی۔ دراصل کدر یعنی آلائش یا گندگی بشریت کی صفت ہے۔ لہٰذا حقیقت میں صوفی وہ ہے جو دنیا کی آلائش سے پاک ہو جائے۔ چنانچہ شروع میں جب زنان مصر کے دل میں زلیخا سے رقابت پیدا ہوئی تو یہ بشریت کا تقاضا تھا لیکن جب ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کا مشاہدہ حاصل ہوا تو ان کی بشریت فنا ہوگئی اور پکار اٹھیں کہ "ما ھذا بشر" یہ کوئی بشر نہیں ہے۔ اب چونکہ وہ بشریت سے خالی تھیں ان کو یوسف علیہ السلام بھی بشر نظر نہ آئے بلکہ ملک یعنی فرشتہ دکھائی دیئے۔ اسی وجہ سے مشائخ طریقتؒ نے فرمایا ہے کہ **لیس الصفاء من صفات البشر لان البشر مدر والمدر لا یخلوا من الکدر** (صفا صفت بشر نہیں ہے کیونکہ بشر مٹی سے بنا ہے اور مٹی میں غلاظت ہے) اور بشر کو کدر (کدورت نفس) سے چھٹکارہ نہیں ہے (کیونکہ اس کی فطرت یا خمیر ہی مٹی سے ہے) اس لئے نہ اعمال سے صفائے قلب آسکتی ہے نہ مجاہدات سے کدورت بشریت جاسکتی ہے۔ صفائے قلب کو افعال و اعمال سے کوئی تعلق نہیں۔ اور نہ اس کا ظاہری اسماء و القاب سے کوئی واسطہ ہے **الصفا صفتہ الاحباب وھم شموس بلاسحاب** (دوستان خدا کے اندر صفائی یعنی نورانیت ان کی فطرت میں ہوتی ہے اور وہ آفتاب ہیں بغیر سحاب (بادل) کے)۔

شرح اس کا یہ مطلب نہیں کہ اعمال نیک کے بغیر آدمی خدا رسیدہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ولایت اور معرفت اور قرب کا حصول کسبی نہیں وہبی ہے۔ یعنی کوشش سے نہیں بلکہ عنایت الٰہی سے حاصل ہوتا ہے اور جس پر نظر عنایت ہوتی ہے وہ پیدائشی طور پر صلاحیت اور استعداد لے کر آتا ہے۔ لیکن چونکہ اپنی استعداد اور مقدر کا علم انسان کو نہیں ہوتا اس لئے کوشش ضرور کرنی چاہئے کیونکہ ممکن ہے کہ اس کے اندر استعداد ہو اور وہ بغیر استعمال رہ جائے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہر شخص کے دل میں اپنی محبت کسی نہ کسی مقدار میں ضرور رکھی ہے جس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ترجمہ جو شخص اپنی صفت سے فانی ہوتا ہے اور دوست کی صفت کے ساتھ باقی ہوتا ہے۔ اس کی مثال اہل اللہ کے نزدیک آفتاب کی طرح ہے جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کے متعلق کسی نے دریافت کیا تو فرمایا **عبد نور اللہ قلبہ بالایمان** (وہ ایسا بندۂ مومن ہے کہ جس کا قلب حق تعالیٰ نے نور ایمان سے منور فرمایا ہے۔) اور اس کا چہرہ اس کے اثر سے چاند کی طرح روشن ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا ہے ؎

ضیاء الشمس والقمر اذا اشترکا
انموذج من صفاء الحب والتوحید اذا اشتبکا

(جب چاند اور سورج کا نور باہم مل جائیں تو صفائے محبت اور توحید کا نمونہ بن جاتے ہیں) اور نور ماہ و آفتاب کی کیا حیثیت ہے، محبوب حقیقی کی محبت اور توحید کے نور کے سامنے۔ لیکن چونکہ دنیا میں آفتاب و ماہتاب دو بڑے نور ہیں ان کی مثال دی جاتی ہے۔ نور آفتاب و نور ماہ کے ذریعے ہم آسمان کو دیکھ سکتے ہیں لیکن نور معرفت، توحید اور محبت کے ذریعے عرش رحمٰن پر نظر جاتی ہے اور عقبیٰ کی حالت دنیا ہی میں منکشف ہو جاتی ہے اس لئے جملہ مشائخ عظامؒ اس بات پر متفق ہیں کہ جب بندہ مقامات کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ (یعنی مراتب و مدارج کی فکر میں نہیں رہتا) اور تمام کدورتوں سے پاک ہو جاتا ہے، تلون و تغیر سے پاک ہو جاتا ہے۔

شرح تلون یا تلوین سے مراد کیفیات سے مغلوب ہو جانا ہے۔ یعنی جب اس کی حالت اس قدر مضبوط ہو جاتی ہے کہ کیفیات سے مغلوب اور مستغرق

نہیں ہوتا بلکہ شربت توحید کے دریا اور سمندر نوش کر کے **ھل من مزید** کا نعرہ لگاتا ہے۔

ترجمہ جب صفات محمود سے موصوف ہوتا ہے اور پھر اس کے دل میں ان صفات کی وجہ سے تکبر پیدا نہیں ہوتا تو اس کی حالت عقل کی رسائی سے بالاتر اور شکوک و شبہات سے پاک ہو جاتی ہے اور حضوری (بحق) ہر وقت بحال رہتی ہے جیسا کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ **لان الصفا حضور بلا ذھاب و وجود بلا اسباب** (یعنی صفائے باطن ایسی حضوری ہے جو غیب نہیں ہوتی اور ایسی دولت ہے جو کسب سے نہیں بلکہ عنایت رب سے حاصل ہوتی ہے) چنانچہ اس کی حضوری میں غیابت نہیں ہوتی اور اس کا حصول بغیر کسب و کوشش کے ہوتا ہے۔ جب سالک راہ حقیقت اس مقام پر پہنچتا ہے تو دنیا اور عقبیٰ میں فانی ہو جاتا ہے یعنی فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ اور انسان کی صورت میں صفات ربانی سے متصف ہوتا ہے۔ سونا اور مٹی اس کے لئے برابر ہو جاتے ہیں۔ اور احکام خداوندی جو خلق پر مشکل ہوتے ہیں اس پر آسان ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ جب حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ **کیف اصبحت یا حارثہ** (اے حارثہ، صبح کے وقت تمہاری کیا کیفیت تھی) تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے اس حالت میں صبح کی کہ مجھے اللہ کے ساتھ پکا ایمان تھا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "اے حارثہ دیکھو تم کیا کہہ رہے ہو۔ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟" انہوں نے عرض کیا کہ "میں نے دنیا سے کنارہ کشی کر لی ہے اور اس سے اپنے دل کو الگ کر لیا ہے حتیٰ کہ میرے نزدیک پتھر، چاندی، سونا اور مٹی برابر ہو گئے ہیں۔ میں نے راتوں میں شب بیداری کی اور دنوں کو روزہ رکھا یہاں تک کہ مجھے عرش الٰہی نظر آنے لگا اور بہشت کے

لوگوں کو دیکھا کہ آپس میں میل ملاقات کر رہے ہیں اور دوزخ کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کو ملامت کر رہے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ وہ ایک دوسرے کو شرمندہ کر رہے ہیں" اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **عرفت فلزم** (تجھے معرفت الٰہی حاصل ہو گئی ہے اب اس کو لازم پکڑ لو) یعنی اس پر جم جاؤ اور یہ کلمات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین بار دہرائے۔ صوفی وہ نام ہے کہ جس سے کاملین اور محققین اولیاء اللہ کو موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ولی اللہ فرماتے ہیں کہ **من صفاہ الحب فھو صاف و من صفاہ الحبیب فھو صوفی** یعنی جو غرق محبت ہوا وہ صافی کہلاتا ہے اور جو غرق محبوب اور غیراللہ سے آزاد ہوا وہ صوفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

شرح غرق محبت سے مراد مجاہدات کے ذریعے حق تعالیٰ کی طرف بڑھنا اور غرق محبوب کا مطلب ہے ذات حق تک رسائی حاصل کر کے سیر فی اللہ یعنی فنا فی اللہ میں مشغول ہو جانا۔

ترجمہ لیکن لغت کے اعتبار سے لفظ صوفی کسی اسم سے مشتق نہیں ہے کیونکہ مشتق ہونے کے لئے ہم جنس ہونا ضروری ہے۔ لیکن صوفی وہ عظیم اسم ہے کہ اس کا کوئی ہم جنس نہیں ہے۔ کیونکہ جو کچھ ناسوتی دنیا میں ہے وہ کدر ہے۔ جو صفا کی ضد ہے اور ضد سے **اشتقاق** نہیں کیا جاتا۔ پس اہل تصوف کے نزدیک اسم صوفی کا مطلب اظہر من الشمس ہے اور تعریف کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے **لان الصوفی ممنوع من العبارۃ ولاشارۃ** (صوفی نہ عبارت میں آسکتا ہے نہ اشارت میں) سارا جہان صوفی کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے اگر وہ معلوم کر لیں یا نہ کریں صوفی کے مقام میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ اہل کمال صوفی کہلاتے ہیں اور جو لوگ صوفیاء کرام کے متعلقین اور شاگرد ہوتے ہیں وہ متصوف کہلاتے ہیں۔ لفظ

تصوف کا تعلق باب تفعل سے ہے اور تفعل کا تقاضا تکلف (یا کوشش ہے) اور یہ اصل مصدر کی شاخ ہے جس کا مطلب لغت اور ظاہر کے اعتبار سے صاف ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے **الصفاء ولایتہ ولھا ایتہ و روایتہ و التصوف حکایتہ للصفا بلاشکایتہ** (صفائے قلب ولایت ہے جس کی ایک آیت ہے اور ایک روایت پس تصوف وہ حکایت ہے کہ جس میں کوئی شکایت نہیں)

شرح اس زمانے کی قافیہ سنجی اور منظوم نثر کی وجہ سے مطالب کا سمجھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے اس کا مطلب سیدھے سادے الفاظ میں یہ ہے کہ صفائے قلب کی حقیقت بالکل ظاہر ہے اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے اور کسی کو اس میں شکایت یعنی اعتراض کا موقعہ نہیں ملتا۔

ترجمہ اہل تصوف کے تین اقسام ہیں۔ صوفی، متصوف اور **مستصوف**۔

صوفی وہ ہے جو اپنے آپ سے فانی اور حق تعالیٰ کے ساتھ باقی ہو چکا ہے اور بشریت سے نکل کر حقیقت میں واصل ہو چکا ہے۔

متصوف وہ ہے جو اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد میں مشغول ہے اور صوفیاء کرام کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مستصوف وہ ہے جس نے دنیا کے مال و دولت اور جاہ و حشمت کی خاطر صوفیاء کی شکل اختیار کر لی ہے اور نہ صوفی سے اس کا کوئی تعلق ہے اور نہ متصوف سے۔ چنانچہ اس کے حق میں کہا گیا ہے کہ **المستصوف عند الصوفیتہ کالذباب وعند غیرھم کالذئاب** (**مستصوف** صوفیاء کے نزدیک حریص مکھی کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسروں کے نزدیک وہ بھیڑیا کی مانند ہے)۔

شرح مکھی اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ حریص ہوتی ہے اور حلال و حرام دونوں پر گرتی ہے۔ اور بھیڑیا اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ بھی حلال و حرام کی تمیز کے بغیر

ہر حیلے اور بہانے اور بزور قوت بھیڑوں کے شکار میں مصروف رہتا ہے۔

ترجمہ اس لئے صوفی کو صاحب وصول، متصوف کو صاحب اصول اور مستصوف کو صاحب فضول کہا گیا ہے۔

شرح صاحب وصول کا مطلب ہے واصل باللہ اور صاحب اصول کا مطلب ہے قواعد و ضوابط کے مطابق تلاش حق میں مشغول رہنا اور صاحب فضول کا مطلب ظاہر ہے کہ وہ بے ہودہ باتوں میں مشغول رہتا ہے۔

ترجمہ جس کو وصل نصیب ہوا اس کے دل میں سوائے دوست کے اور کسی چیز کی تمنا نہیں رہتی۔ جو صاحب اصول ہے وہ احکام طریقت میں مستعد ہو کر آگے بڑھ رہا ہے اور مقامات پر مقامات حاصل کر رہا ہے۔ لیکن صاحب فضول ہر چیز سے محروم ہے اور صوفیاء کی ظاہری شکل و صورت پر اکتفا کئے ہوئے ہے۔ اس لئے دوست سے مہجور اور وصل سے دور ہے۔ اور تصوف کے معاملہ میں مشائخ کے بیشمار اقوال ہیں جن میں سے اختصار کی خاطر اس کتاب میں چند جمع کئے جاتے ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

فصل

اقوال صوفیاء

قول حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **الصوفی اذا نطق بان نطقہ من الحقائق و ان سکت نطقت عنہ الجوارح بقطع العلائق** (صوفی

وہ ہے کہ جس کا کلام بیان حقائق ہے اور جس کی خاموشی میں اسکے اعضاء زبان حال سے قطع علائق یعنی فقر کی بات کر رہے ہوتے ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب صوفی بات کرتا ہے تو حقائق و معارف بیان کرتا ہے اور اپنے حال کے مطابق اس کا قال ہوتا ہے اور جب خاموش ہوتا ہے تو اس کی خاموشی سے فقر ٹپکتا ہے اور ترک علائق یعنی ترک دنیا کا نمونہ ہوتا ہے۔ یعنی اس کی گفتار بیان حق ہے اور اس کا کردار تجرید محض یعنی مکمل ترک ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا قول ہمہ حق اور اس کا فعل ہمہ فقر ہوتا ہے۔

قول حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **التصوف نعت اقیم العبد فیہ قیل نعت للعبد ام للحق فقال نعت الحق حقیقتہ و نعت العبد رسمہ** (تصوف ایک وصف ہے کہ جس پر بندہ قائم ہے۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آیا وہ وصف خلق ہے یا وصف حق تو آپ نے فرمایا کہ حقیقت میں وہ خالق کی صفت ہے اور مجاز میں بندہ کی) اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ حق تعالیٰ تک رسائی صفات بشری کی نفی اور فنا سے حاصل ہوتی ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بندہ کی صفت کا فنا ہونا حق کی صفت کا پا لینا ہے۔ لہٰذا ایک لحاظ سے یہ نعت حق یعنی صفت حق اور ایک لحاظ سے صفت بندہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں بندہ کی صفات کا کوئی تعلق ہی نہیں کیونکہ صفات بندہ حادث ہیں اس لئے مجازی ہیں اور صفات حق قدیم اور باقی ہیں۔ مثلاً جب انسان کو حکم ہوا کہ روزہ رکھو تو روزہ دار ہونا بظاہر بندہ کی صفت یا بندہ کا کام ہے۔ لیکن درحقیقت یہ اللہ کا حکم ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ لوگوں کو بتا دیجئے کہ **الصوم لی وانا اجزی بہ** (روزہ میرا ہے اور میں اس کی جزا ہوں) اس لئے اگرچہ بظاہر روزہ فعل بندہ ہے لیکن درحقیقت یہ فعل حق ہے کیونکہ ہر کام کا

فاعل حقیقی اللہ ہے اور فاعل مجازی انسان ہے۔ (پس تقدیر کا مسئلہ حل ہو گیا)

قول حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **التصوف ترک کل حظ النفس** (تصوف لذات نفسانی کا ترک کرنا ہے) اس کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں' ایک حقیقی ایک مجازی۔ جب آدمی لذت نفسانی کو ترک کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے تو یہ بھی ایک حظ یعنی لذت ہے جسے ترک مجازی کہا جاتا ہے۔ ترک حقیقی یہ ہے کہ انسان کے لذت ترک کرنے کی بجائے لذت انسان کو ترک کر دے یعنی اس ترک میں وہ نہ لذت کا طالب رہے نہ لذت محسوس ہو اور یہ ہے ترک حقیقی۔ جس کا لازمی نتیجہ مشاہدت (مشاہدۂ حق) ہے۔ پس ظاہری ترک فعل بندہ ہے اور ترک حظ (یعنی حظ کا محسوس نہ ہونا) فعل حق ہے اور فعل بندہ مجاز ہے اور فعل حق حقیقت ہے۔ اس قول سے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول کی وضاحت ہوتی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ (اس سے بھی مسئلہ قضا و قدر کی حقیقت معلوم ہو گئی) ۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ **الصوفیتہ هم الذین صفت ارواحهم فصا روا فی الصف الاول بین یدی الحق** (صوفیاء وہ لوگ ہیں جن کے ارواح کی صفات صف اول میں پہنچ کر حق تعالی کے قرب میں پہنچ گئے ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ تزکیۂ نفس کے ذریعے وہ کدورت بشریت سے پاک' آفات نفس سے آزاد اور حرص و ہوا سے فارغ ہو کر صف اول اور عنداللہ درجہ اول پر فائز ہو چکے ہیں۔ اور غیراللہ سے نجات حاصل کر لی ہے۔ انہوں نے یہ بھی فرتایا ہے کہ۔ **الصوفی الذی لا یملک ولا یملک** (صوفی وہ ہے جو کسی چیز کا مالک ہو نہ مملوک) یعنی وہ دنیا کی کسی چیز کو اپنی ملکیت قرار نہ

دے (بلکہ حق کی ملکیت سمجھے) اور نہ وہ خود سوائے خدا کے کسی اور کا بندہ رہے۔) اور یہ عین مقام فنا فی اللہ ہے کیونکہ جو شخص خود فنا ہو جاتا ہے کسی کا مالک نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ کسی اور کا بندہ ہوتا ہے۔ اس کیوجہ یہ ہے کہ ملکیت کا اطلاق موجودات یا وجود پر ہوتا ہے جب صوفی از خود فنا ہو جاتا ہے تو وہ نہ متاع دنیا کا مالک باقی رہتا ہے نہ عقبیٰ کا۔ کیونکہ وہ خود گم ہے۔ نہ کسی کو ملکیت یا محکوم بنا سکتا ہے نہ کسی کی ملکیت یا حکم کے تحت آسکتا ہے۔ اور یہ قول بہت لطیف (باریک) ہے اور ان حضرات کا قول ہے جو فنائے کلی کے قائل ہیں اور ہم اس کتاب میں انکی غلط فہمی بیان کریں گے تاکہ تجھے حقیقت معلوم ہو جائے انشاء اللہ تعالیٰ۔

شرح اس سے حضرت مصنفؒ کا بلند مقام ظاہر ہے۔

قول ابن جلاء دمشقی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابن جلاء دمشقی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **التصوف حقیقتہ لا رسم لہ** (تصوف ایک حقیقت ہے نہ کہ رسم) اس کی وجہ یہ ہے کہ رسم کا تعلق خلق سے اور حقیقت کا تعلق حق تعالیٰ سے ہوتا ہے جب تصوف نام ہی خلق سے روگردانی کا ہے تو لامحالہ رسم سے بالاتر ہو گا۔

قول حضرت ابو عمر دمشقی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابو عمر دمشقی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **التصوف رویتہ الکون بعین النقص بل غض الطرف عن الکون** (تصوف نام ہے کائنات کو نقص کی نگاہ سے دیکھنے کا بلکہ اس سے آنکھیں بند کر لینے کا) کائنات کو نقص کی نگاہ سے دیکھنا مقام فنا فی اللہ کا خاصہ ہے اور کائنات سے آنکھیں بند کر لینا مقام بقاء باللہ ہے کیونکہ اس وقت سالک خود بینا نہیں ہوتا بلکہ بحق تعالیٰ بینا ہوتا ہے۔

شرح مقام فنا فی اللہ اور بقاء باللہ کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ منصور حلاج کا قول "اناالحق" بھی منصور کا قول نہیں تھا بلکہ حق کا قول تھا، اندر حق بول رہا تھا کہ "میں حق ہوں" لیکن عوام کالانعام نے یہ سمجھا کہ منصور بول رہا ہے اس لئے پھانسی دیدی۔ اس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

ترجمہ طالب کون یعنی (دنیا کا طالب) دنیا کو دیکھتا ہے اور اس سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اس سے بہتر وہ ہے جو دنیا کو نقص کی نگاہ سے دیکھے یعنی نفرت کی نگاہ سے دیکھے اور اس کا طالب نہ بنے (یہ مقام فنا ہے) اور اس سے بلند درجہ یہ ہے کہ دنیا کو نہ دیکھے۔ کیونکہ جو دنیا کو نفرت سے دیکھتا ہے وہ ابھی تک حجاب میں ہے کیونکہ غیر کا نظر آنا بھی حجاب ہے اور جس کی نظر دنیا پر پڑتی ہی نہیں ہے وہ بینائی کی وجہ سے محجوب نہیں ہوتا۔ اور خود نہیں دیکھتا بلکہ حق تعالیٰ دیکھتا ہے۔ یہ ارباب تصوف اور ارباب معانی کا قول ہے۔ یہاں اس کی شرح کی گنجائش نہیں ۔

قول حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **التصوف شرک لانہ صیانتہ القلب عن رویتہ الغیر ولاغیر** (تصوف شرک ہے کیونکہ تصوف نام ہے غیراللہ سے قلب کی حفاظت کا اور درحقیقت غیراللہ کا وجود ہی نہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب توحید (وحدت الوجود) حق بات ہے تو کسی چیز کو غیراللہ سمجھنا شرک ہوا اس لئے اگر تصوف کی تعریف یہ کی جائے کہ تصوف نام ہے قلب کو غیراللہ سے محفوظ رکھنے کا تو پھر ہم توحید یعنی وحدت الوجود کے قائل نہیں رہتے بلکہ کثرت الوجود کے قائل ہو جاتے ہیں (کیونکہ وجود غیر کو تسلیم کرنا شرک ہے۔ جب غیر کا وجود ہی نہیں ہے تو غیر سے قلب کو محفوظ رکھنا کیسا) ۔

شرح یہاں مسئلہ وحدت الوجود کی قدرے وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا کوئی الگ وجود نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ کے وجود میں شامل ہے اور جتنے موجودات یعنی اشیائے کائنات' زمین و آسمان' سورج' چاند' ستارے' درخت اور پہاڑ ہمیں نظر آرہے ہیں انکا وجود ظلّی ہے نہ کہ حقیقی۔ یعنی یہ ظل یا عکس ہیں اصل کا۔ جیسا کہ مٹی کے برتن اگرچہ ہمیں علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں لیکن ان کا وجود یا اصل مٹی ہے یا جس طرح برف اور جھاگ اور حباب اور لہروں کا وجود اگرچہ علیحدہ نظر آتا ہے لیکن دراصل یہ سب پانی ہی ہے جو مختلف شکلوں اور صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ یا جس طرح ایک عالم کتاب لکھتا ہے تو وہ کتاب اگرچہ ظاہری وجود کے اعتبار سے مصنف سے علیحدہ نظر آتی ہے لیکن دراصل وہ مصنف کا کلام ہے اور مصنف سے علیحدہ وجود نہیں رکھتا۔ اسلامی یا شرعی نقطہ نگاہ سے بھی وحدت الوجود کا ماننا ضروری ہے ورنہ جیسا کہ اوپر کے قول سے ظاہر ہے شرک لازم آتا ہے' کیونکہ قرآن و حدیث میں ذات باری تعالیٰ کا جو تصور ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے کہ ذات حق لامحدود ہے صفات کے لحاظ سے بھی لور ذات کے لحاظ سے بھی۔ اگر کائنات کو وجود حق سے علیحدہ تصور کیا جائے تو وجود حق محدود ہو جاتا ہے یعنی یہ کہنا پڑتا ہے کہ خدا تعالیٰ کائنات میں نہیں ہے باقی ہر جگہ موجود ہے لہٰذا محدود ہو گیا۔ اور حق تعالیٰ کو محدود سمجھنا کفر و شرک ہے۔ نیز جب حق تعالیٰ واحد لاشریک ہے تو لازماً وہ ذات اور صفات دونوں میں لاشریک ہوگا اور چونکہ وجود' حق تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور کائنات کا الگ وجود تسلیم کیا جائے اور حق تعالیٰ کا الگ' تو نہ صرف حق تعالیٰ کا وجود محدود ہو جاتا ہے بلکہ شرک بھی لازم آتا ہے کیونکہ جب اللہ ذات و صفات دونوں میں لاشریک ہے تو صفت وجود میں اس کا کوئی شریک کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ عقلاً" محال ہے۔ اس لئے وحدت الوجود حق ہے اور

مانا پڑتا ہے کہ حق تعالیٰ کے وجود کے سوا غیر کا وجود ہی نہیں ہے جو کچھ موجود ہے وہ وجود حق ہے۔ سطحی نظر کے لوگ اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ جب غیر کا وجود ہی نہیں ہے سب خدا کا وجود ہے تو پھر اسلام میں بت پرستی کیوں حرام ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بت کا وجود اگرچہ وجود خدا سے جدا نہیں ہے لیکن وہ خدا بھی نہیں ہے مثلاً زید کا ہاتھ اگرچہ زید سے جدا نہیں ہے لیکن زید نہیں ہو سکتا۔ جزو کو کل ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا لہٰذا اسلام میں بت پرستی اسی قدر مضحکہ خیز ہے جس طرح کہ ایک آدمی زید سے کچھ رقم طلب کرے اور زید دینے سے انکار کر دے اور وہ آدمی زید کے ہاتھ سے کہے کہ مجھے زید کی جیب سے رقم نکال کر دیدے۔ لہٰذا خلاصہ یہ ہوا کہ جیسا کہ زید کا ہاتھ زید نہیں لیکن زید سے جدا بھی نہیں ہے' اسی طرح بت خدا نہیں ہے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت اور وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر مکمل بحث اور ان دونوں میں تطبیق احقر کی کتاب "وحدت الوجود اور وحدت الشہود" میں مفصل درج ہے۔

قول حضرت شیخ حصری رحمتہ اللہ علیہ

حضرت شیخ حصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **التصوف صفاء السر من کدورة المخالفته** (تصوف صفائے قلب کا نام ہے مخالفت سے) اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کو مخالفت حق سے باز رکھے۔ کیونکہ دوستی موافقت کا نام ہے اور موافقت ضد ہے مخالفت کی۔ لیکن دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ سارے جہان میں دوست کے فرمان کی تابعداری کے بغیر کچھ نہ کرے۔ اور جب محب اور محبوب کی مراد ایک ہو جائے تو مخالفت کیسی۔

قول حضرت محمد بن علیؓ بن حسینؓ بن حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ

حضرت محمد بن علی (امام باقر) رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ **التصوف خلق فمن زاد علیک فی الخلق زاد علیک فی التصوف** (تصوف خوش خلقی کا نام ہے لہٰذا جو شخص سب سے زیادہ خلیق ہے سب سے بڑا صوفی ہے) نیک خوئی دو قسم کی ہوتی ہے ایک حق کے ساتھ دوسرے خلق کے ساتھ۔ حق تعالیٰ کے ساتھ نیک خوئی اس کی رضا پر راضی اور اس کی قضا پر خوش رہنے کا نام ہے اور خلق کے ساتھ نیک خوئی یہ ہے کہ لوگوں کی بدتمیزی کو للہ برداشت کرتا رہے۔ اور ان دونوں صورتوں میں طالب کا اپنا فائدہ ہے کیونکہ حق تعالیٰ طالب کی رضا اور نافرمانی دونوں سے مستغنی ہے۔ اور یہ دونوں صورتیں نظریہ وحدانیت کا نتیجہ ہیں۔

شرح جب توحید یعنی وحدت الوجود حق ہے تو پھر خلق خدا کی رضا جوئی بھی حق تعالیٰ کی رضا جوئی ہوگی کیونکہ یہ سب اسی ایک ہستی کا ظہور ہے۔ حضرت امام باقرؒ کے اس قول سے یہ بھی ثابت ہوا کہ لفظ تصوف ان کے زمانے میں بھی رائج تھا۔ یاد رہے کہ آپ تابعی ہیں۔

قول حضرت ابو محمد مرتعش رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابو محمد مرتعش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **الصوفی لا یسبق ھمتہ خطوتہ البتہ** (صوفی وہ ہے جس کی ہمت (یعنی قدم) اس کے خیال سے آگے نہ بڑھے) اس کا مطلب یہ ہے جو کام کرے حضور قلب کے ساتھ کرے۔ جہاں اس کا دل ہے وہاں اس کا جسم ہونا چاہئے اور جہاں اس کا جسم ہے دل بھی وہاں

ہونا چاہئے اور قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہونا چاہئے۔ جہاں قول ہے وہاں اس کا قدم ہونا چاہئے اور جہاں اس کا قدم ہے وہاں اس کا قول ہونا چاہئے۔ اور یہ علامت ہے حضوری بلاغیوب کے۔ یہ بات اس نظریئے کے خلاف ہے کہ یہ کہا جائے کہ جو خود سے غیب ہے حق کے ساتھ حاضر ہے۔لا بلکہ بحق حاضر بخود حاضر"(یہ بات نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے ساتھ بھی حاضر ہے اور خدا کے ساتھ بھی) اور یہ مقام جمع الجمع کی علامت ہے اس وجہ سے کہ جب سالک کی اپنی رویت بھی موجود ہے (یعنی اپنے آپ کو بھی دیکھ رہا ہے یہ خود سے غیب ہونا کیا ہوا۔ اور جب سالک اپنےآپکو نہیں دیکھ رہا تو پھر یہ خود سے غائب اور حق کے ساتھ حضوری یا حاضری ہے۔)

شرح یہ عبارت بہت ادق ہے اس لئے وضاحت کی ضرورت ہے اس کو سمجھنے کے لئے سلوک الی اللہ کے خاکے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے جس میں مقام فنا فی اللہ' مقام بقاء باللہ اور مقام جامعیت یا جمع الجمع کی وضاحت کی گئی ہے۔ جو چیز عروج بشری کا آخری مقام ہے۔ جہاں سالک بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ یعنی چونکہ ذات حق کی کوئی انتہا نہیں اس کی پرواز کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور اس کے اندر عشق الٰہی کا وہ طوفان ہوتا ہے کہ قرب کی کسی منزل پر بھی مطمئن نہیں ہوتا اور ہر آن اور ہر لحظہ ھل من مزید کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس مقام پر اس کا قرب بھی بُعد بن جاتا ہے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کو لکھا کہ اب میری یہ حالت ہے کہ میرے لئے قرب بھی بُعد بن گیا ہے۔ اس مقام کو حضرت خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ نے یوں بیان فرمایا ہے ؂

جتھاں خود قرب ہے دوری
اتھاں کیا وصل و مہجوری

انانیت تھئی پوری
ہے انسانوں تے رحمانوں

(جہاں قرب بھی بُعد بن جائے وہاں وصل و ہجر برابر ہیں۔ اس حالت میں بندہ اور حق' طالب و مطلوب دونوں کی طرف سے انانیت کا زور ہوتا ہے) یعنی طالب مقام فنا میں مست و محو اور مستغرق نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی طلب اس قدر تیز ہے کہ وصل کے ہر مقام پر مزید وصل کا طلبگار ہے یعنی اسے قریب سے قریب تر کی تلاش رہتی ہے۔ قلندر آنکہ فوق الوصل جوید (قلندر وہ ہے جو وصل سے بھی اونچے مقام کا طالب ہو) سے مراد وصل لاحاصل مراد ہے۔ سعدی علیہ رحمہ نے اس شعر میں اسی مقام کی نشاندہی فرمائی ہے ۔

عجب ایں نیست کہ سرگشتہ بود طالب دوست
عجب این است کہ من واصل و مہجورم

(حیرانگی کی یہ بات نہیں کہ میں محبوب پروالہ و شیدا ہوں بلکہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ بیک وقت میں واصل بھی ہوں اور مہجور بھی۔ مرزا بیدلؒ نے بھی اسی مقام کا پتہ دیا ہے ۔

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما
چہ قیامتے کہ نمے رسی زکنارِ ما بکنارِ ما

(اے دوست ہم نے ساری عمر تیری شراب وحدت کے جام نوش کئے لیکن اب تک ہماری پیاس ہے کہ بجھنے میں نہیں آتی یہ کیا ظلم و ستم ہے کہ آپ

میری آغوش سے میری آغوش میں نہیں آتے) یعنی وصل یار حاصل ہے لیکن چونکہ اس کے حسن و جمال اور قرب و وصال کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا' تڑپ ہے کہ کشاں کشاں لئے جاتی ہے اور سیری ہرگز نہیں ہوتی۔ حضرت مولانا روم علیہ رحمہ نے اس مقام کو یوں بیان فرمایا ہے ملاحظہ ہو مقدمہ مقابیس المجالس ۔

دل آرام در بر دل آرام جوئے
ہچو مستسقی تشنہ بر آب جوئے

(محبوب آغوش میں ہے اور محبوب کی تلاش ہے۔ میری حالت مرض استسقیٰ کے مریض کی سی ہے جو دریا کے کنارے پانی پی رہا ہے اور پھر بھی پیاسا ہے) حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ محبوب کے حسن وجمال کی کوئی حد ہے نہ سعدی کے کلام کی۔ بس ہوتا یہ ہے کہ مرض استسقیٰ کے مریض کی طرح عاشق دریا کے کنارے پانی پی پی کر مرجاتا ہے اور دریا چلتا رہتا ہے) یہ مقام جمع الجمع کہلاتا ہے اسے جامعیت بھی کہتے ہیں کیونکہ اس مقام پر سالک بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ حضرت مصنف علیہ رحمہ کا مقصد یہ ہے کہ جو صوفیاء مقام فنا کی مستی و استغراق یا محویت میں خوش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں ان کو اس مقام پر قانع نہیں ہونا چاہئے بلکہ بلند سے بلند تر مقام قرب و وصال کے لئے ہر آن' ہر لحظہ اور عمر کی آخری سانس تک جدوجہد جاری رکھنی چاہئے کیونکہ یہی انتہائے عروج بشری ہے اور یہی مدعاء حیات انسانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلند مقام صوفیاء کرام عبدیت کو زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ اس میں عجز و نیاز بھی ہے اور پھر اس سے مزید در مزید

مقامات قرب بھی حاصل ہوتے ہیں اور یہی مقام عبدیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے یعنی مقام فنا میں مستغرق اور محو نہ ہونا بلکہ عین سکر میں صحو اور مستی میں ہوشیاری قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش ناتمام اور وصل لاحاصل کا متلاشی بننا۔ خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ نے اس مقام کے متعلق یہ بھی فرمایا ہے ۔

شدہ عکس در عکس این بنا
کہ فنا' بقاء ہے بقاء' فنا

(یعنی میری یہ حالت ہے کہ میرے لئے فنا بقاء بن گئی ہے اور بقاء فنا)
اس کا مطلب وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ فنا یا وصل کے کسی مقام پر اکتفا نہ کرنا اور مزید در مزید مقامات وصل کی طرف پرواز جاری رکھنا۔ یعنی میری فنا میں وہ استغراق نہیں ہے جو مجھے آئندہ پرواز سے روکے اور میری بقاء میں وہ جمود نہیں ہے کہ ذات حق میں مزید پرواز سے مجھے باز رکھے۔ یہ بات صرف اس شہبازِ دشتِ حقیقت کو سمجھ آسکتی ہے جو عملاً ان مراتب و مقامات سے گزر چکا ہے۔(شرح ختم)

قول حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ

مندرجہ بالا قول کے مطابق حضرت ابوبکر شبلی نے فرمایا ہے **الصوفی لایری فی الدارین مع اللہ غیر اللہ** (صوفی دونوں جہانوں میں سوائے حق تعالی کے کچھ نہیں دیکھتا) اب چونکہ بندہ اپنی ہستی کے باوجود بھی غیراللہ میں شامل ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھتا اور اپنے آپ سے کلی طور پر فارغ ہو جاتا ہے۔ خواہ مقام فنا میں ہے یا بقاء میں۔

شرح اب بظاہر حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول مندرجہ بالا قول سے مختلف ہے۔ راقم الحروف کے دل میں تردد ہوا کہ حضرت مخدوم سید علی ہجویری

قدس سرہٗ نے یہ کس وجہ سے فرما دیا کہ حضرت شبلی کا یہ قول اوپر کے قول کے مطابق ہے کیونکہ اس کے مطابق تو نہیں ہے بلکہ مخالف ہے۔ یہ اشکال اس طرح حل ہوا کہ حضرت مصنف نے حضرت خواجہ محمد مرتعش علیہ رحمہ کے مندرجہ بالا قول میں جس سے مقام جمع الجمع ظاہر ہوتا ہے ایک جملہ یہ فرمایا کہ "ایں نشان حضوری بے غیبت است برخلاف آنکہ گویند از خود غائب و بحق حاضر" اب نکتہ کھلا کہ یہ حضرت شبلی علیہ رحمہ کا قول حضرت محمد مرتعش علیہ رحمہ کے قول کے مطابق نہیں بلکہ اس قول کے مطابق ہے جو اوپر فارسی میں نقل کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ حضرت محمد مرتعش علیہ رحمہ کے قول میں جہاں جامعیت یعنی مقام فنا و بقاء بیک وقت ہونا ثابت ہے شبلی علیہ رحمہ کے قول میں صرف فنائیت ہے جامعیت نہیں ہے۔ اس سے حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کی بلندئ مقام کا پتہ چلتا ہے حالانکہ حضرت اقدسؒ اور حضرت شیخ ابوبکر شبلی علیہ رحمہ کے درمیان دو واسطے ہیں۔ اور حضرت ابوبکر شبلی علیہ رحمہ گویا آپ کے مشائخ سابقین میں شامل ہیں۔ (شرح ختم)

قول حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ تصوف کی بنیاد آٹھ خصائل (جمع خصلت) پر ہے۔ (۱) سخا (۲) رضا (۳) صبر (۴) اشارہ (۵) غربت (۶) لبس صوف (۷) سیاحت (۸) فقر۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سی سخاوت (کہ بیٹے کو راہ حق میں قربان کر دیا) حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی سی رضا' حضرت ایوب علیہ السلام کا سا صبر' حضرت زکریا علیہ السلام کی سی اشارت' حضرت یحیٰی علیہ السلام کی غربت' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لباس صوف' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیاحت اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فقر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سخاوت یا قربانی کا یہ حال تھا کہ بیٹا راہ حق میں قربان

کر دیا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی رضا یہ ہے کہ چھری کے نیچے گردن رکھ دی اور جان عزیز قربان کر دی' حضرت ایوب علیہ السلام کا صبر یہ ہے کہ جسم میں کیڑے پڑ گئے لیکن راضی برضائے مولا رہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے اشارات کا کمال یہ ہے کہ حضرت حق تعالیٰ نے ان کے متعلق قرآن حکیم میں فرمایا ہے اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا (تین دن تمام لوگوں سے بات نہ کی سوائے اشارات و رموز کے) حق تعالیٰ نے ان کے حق میں یہ بھی فرمایا ہے اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا (حق تعالیٰ نے ان کو مخفی طور پر مخاطب فرمایا) حضرت یحییٰ علیہ السلام کی غربت کا یہ حال ہے کہ اپنے وطن میں بھی مسافر تھے اور اپنوں میں بیگانہ تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیاحت یہ ہے کہ سفر میں سوائے کاسہ چوبیں (لکڑی کا پیالہ) اور شانہ (کنگھی) ان کے پاس کچھ نہ تھا اور جب ایک آدمی کو دیکھا کہ چلو میں پانی پی رہا ہے تو پیالہ بھی پھینک دیا۔ اور جب یہ دیکھا کہ ایک آدمی اپنی انگلیوں سے بال سیدھے کر رہا ہے تو کنگھی بھی پھینک دی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لباس صوف کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ اسی لباس میں رہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے فقر کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ حق تعالیٰ نے روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں آپؐ کے ہاتھ میں دے دی تھیں لیکن آپؐ نے عرض کیا یا الٰہی مجھے ایک دن کھانا دے اور ایک دن بھوکا رکھ اور طریقت میں یہ بہت بڑا اصول ہے۔

قول حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ

حضرت حصری علیہ رحمہ فرماتے ہیں **الصوفی لا یوجد بعد عدمہ ولا بعدم بعد وجودہ** (صوفی وہ ہے کہ جس کی ہستی کو نیستی نہیں اور نیستی کو ہستی نہیں) یعنی جو کچھ وہ پالیتا ہے اس کو ہرگز گم نہیں کرتا اور جو کچھ گم کرتا ہے اس کو ہرگز نہیں پاتا۔

شرح اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ حق تعالیٰ کو پالیتا ہے تو پھر اس کو نہیں کھوتا اور جب وہ اپنی ہستی کو گم کر دیتا ہے تو پھر نہیں پاتا۔

ترجمہ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس کی یافت کو ہرگز نایافت نہیں اور نایافت کو ہرگز یافت نہیں۔

شرح سلوک الی اللہ میں یافت اور نایافت دو مقام ہیں۔ یافت سے مراد ہے بندہ کا اپنی طرف سے حق تعالیٰ کو دیکھنا اور نایافت یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو حق تعالیٰ کی طرف سے دیکھے۔ پہلا مقام عاشقی ہے اور دوسرا مقام محبوبیت ہے۔ پہلا مرید کا فعل ہے اور دوسرا مراد کا۔ سالک مرید عاشق ہوتا ہے اور مراد معشوق۔

ترجمہ حتیٰ کہ نفی بلا اثبات ہوتی ہے اور اثبات بلانفی۔

شرح یعنی مقام فنا فی اللہ پر فنائے تامّہ اس کو حاصل ہوتی ہے کہ بشریت کا ذرہ بھر شائبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ لوائح جامی میں فرماتے ہیں کہ جب تک فنا میں اپنی خودی کا ذرہ بھر احساس ہوتا ہے فنا کا دعویدار جھوٹا اور کذاب ہے۔ نیز عرفاء کا کہنا ہے کہ جب کسی شخص کو فنا کا ذرہ بھر بھی نصیب ہوجائے تو وہ کبھی مردود نہیں ہوتا یعنی وہ راندۂ درگاہ نہیں کیا جاتا۔ اور اثبات بلانفی کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کو مقام بقا باللہ نصیب ہوجاتا ہے تو پھر وہ اس سے ہرگز زائل نہیں ہوتا۔ اور مقام فنا و بقاء کی تفصیل پہلے کافی حد تک دی جاچکی ہے۔ امید ہے سا لکین راہ حقیقت سمجھ گئے ہوں گے لیکن یہ باتیں سا لکین کے سمجھنے کی ہیں۔ جن لوگوں کو عملی طور پر مقامات و منازل سلوک پر عبور نہیں ہے وہ ہرگز نہیں سمجھ سکیں گے۔ ان کو چاہئے کہ خواہ مخواہ کے اعتراضات سے پرہیز کریں روحانیت بھی باقی فنون کی طرح ایک فن ہے اور اس کے دقائق ماہر فن ہی سمجھ سکتا ہے۔ جیسے علم طب یا انجینئرنگ کی کتابوں کو

صرف ماہرین فن طب اور ماہرین انجینئرنگ ہی سمجھ سکے؛ ہیں دوسروں کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ ہاں سلوک الی اللہ میں کوشش کی جائے تو تزکیۂ نفس کے بعد یہ مقامات آسانی سے حاصل بھی ہوسکتے ہیں اور یہ دقائق سمجھ میں بھی آسکتے ہیں بلکہ دیگر علوم وفنون سے زیادہ فن روحانیت میں کمال حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ جہاں دیگر فنون میں دوسری جانب سے کشش نہیں ہوتی' طالب راہ حقیقت کو شروع ہی میں حق تعالیٰ کی طرف سے زبردست جذب و کشش شروع ہوجاتی ہے جیساکہ اس حدیث سے ظاہر ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "جب میرا بندہ میری طرف ایک بالشت آگے بڑھتا ہے تو میں دو بالشت اس کی طرف بڑھتا ہوں جب وہ میری طرف ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں اور جب وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔" دیکھیے کس قدر عنایت اور نوازش ہے یہ حوصلہ افزائی کسی اور فن کے حصول میں ممکن نہیں ہے۔

ترجمہ اور یہ دو صورتیں دو انبیاء علیہم السلام کے حال میں پائی جاتی ہیں۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کہ جن کے حق تعالیٰ کو پالینے میں نفی کبھی نہ آئی یعنی پاکر گم نہ کیا۔ اور بارگاہ رب العزت میں عرض کی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي (اے میرے رب مجھے شرح صدر عطا فرما اور میری مشکل آسان کردے) اور دوسرے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہ جن کے عجز و انکسار میں ہستی کا دعوہ باقی نہ رہا اور جن کے حق میں حق تعالیٰ نے فرمایا أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (کیا ہم نے تجھے شرح صدر نہیں عطا کی) اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک نے آرائش طلب کی اور دوسرے کو خود بخود آراستہ کردیا گیا۔ اور اس نے خود اس کا مطالبہ نہ کیا۔

قول حضرت علی بن بندار الصیرنی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت علی بن بندار الصیرنی علیہ رحمہ فرماتے ہیں **التصوف اسقاط رویتہ للحق ظاہراً و باطناً** "(تصوف یہ ہے کہ صاحب تصوف ظاہر اور باطن میں اپنے آپ کو نہ دیکھے بلکہ حق کو دیکھے) اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ظاہر کو دیکھے تو اس میں حق تعالیٰ کی توفیق یعنی قدرت ملاحظہ کرے اور اپنے اعمال و افعال میں اپنی توفیق کو حق تعالیٰ کی توفیق کے مقابلے میں مچھر کے پر کے برابر بھی نہ سمجھے اور جب اپنے باطن میں نظر کرے تو اپنے باطنی کمالات کو بھی تائید و توفیق حق تعالیٰ کا نتیجہ سمجھے اور اس بارے میں اپنی توفیق یا طاقت کو حق تعالیٰ کی طاقت کے مقابلے میں ذرہ بھر بھی خیال نہ کرے پس ظاہر و باطن میں سوائے حق کو نہ دیکھے اور اپنے کمال اور کوشش و جدوجہد کو ہیچ سمجھے۔

قول حضرت محمد بن احمد المقری رحمتہ اللہ علیہ

حضرت شیخ محمد بن احمد المقری علیہ رحمہ فرماتے ہیں **التصوف استقامتہ الاحوال مع الحق** (تصوف نام ہے استقامت احوال کا حق تعالیٰ کے ساتھ) اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی کے باطنی حال کو تبدیل نہیں کیا جاتا اور اس کو راہ حق سے بے راہ نہیں کیا جاتا اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کا دل حالات کے بدلنے والی ہستی (یعنی حق تعالیٰ) کا شیدا ہے اس کے حال کو نہیں بدلا جاتا بلکہ اس کو اس حال پر استقامت نصیب ہوتی ہے اور راندۂ درگاہ نہیں کیا جاتا۔

شرح جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے عرفاء کا کہنا ہے کہ جس سالک راہ حقیقت کو مقام فنا سے تھوڑا سا حصہ بھی نصیب ہوگیا اس کو حق تعالیٰ گمراہی سے محفوظ رکھتے ہیں او وہ کبھی حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے راندۂ درگارہ نہیں ہوتا۔

فصل

خلق کے ساتھ معاملات میں صوفیاء کا کردار

قول حضرت ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابو حفص نیشاپوری علیہ رحمہ فرماتے ہیں **التصوف کلہ اداب لکل وقت ادب ولکل مقام ادب' ولکل حال ادب فمن لزم اداب الاوقات بلغ مبلغ الرجال و من ضیع الاداب فھو بعید من حیث یظن القرب و مردود من حیث یظن القبول** (تصوف آداب کا نام ہے' ہر وقت کے آداب' ہر مقام کے آداب' اور ہر حال کے آداب۔ پس جس نے ان آداب کو لازم پکڑا بلند مقام پر پہنچا اور جس نے آداب کی پابندی نہ کی وہ دور پھینکا جاتا ہے اور مردود کیا جاتا ہے اس فخر و غرور کی وجہ سے کہ اپنے آپ کو مقرب و مقبول سمجھتا ہے) اور یہ بات حضرت ابوالحسنؒ کے اس قول کے مطابق ہے **لیس التصوف رسوما و لاعلوما ولکنہ اخلاق** (تصوف نہ کسی اسم کا نام ہے نہ علوم کا بلکہ یہ اخلاق ہے) اگر یہ علم ہوتا تو درس و تدریس سے حاصل ہو جاتا۔ یہ حسن خلق ہے کہ جب تک تو اس کا ارادہ نہ کرے' اس پر عمل نہ کرے اور جب تک اس کا حق ادا نہ کرے حاصل نہیں ہوتا۔ اور رسم اور اخلاق کے درمیان یہ فرق ہے کہ رسم ایک عمل ہے جس میں اخلاص یعنی خلوص دل نہیں ہوتا اور انسان کا ظاہر اس کے باطن سے مطابقت نہیں کھاتا۔ اور باطنی کیفیت سے خالی ہوتا ہے لیکن اخلاق ایک فعل محمود ہے جس میں تکلف نہیں ہوتا اور اس کا ظاہر باطن کے مطابق ہوتا ہے اور ریاکاری سے پاک ہوتا ہے۔

قول حضرت محمد مرتعش رحمتہ اللہ علیہ

حضرت محمد مرتعش علیہ رحمہ فرماتے ہیں کہ **التصوف حسن الخلق** (تصوف خوش خلقی کا نام ہے)

اقسام خلق حسنہ

حسن خلق کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ حق تعالیٰ کے احکام کی پابندی خلوص دل سے نہ کہ ریا سے۔

۲۔ بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت اور ہم عمروں کے ساتھ انصاف اور ان سے انصاف کا معاوضہ طلب نہ کرنا۔

۳۔ نفسانی خواہشات اور شیطانی وساوس پر عمل نہ کرنا۔ پس جو شخص ان تینوں قسم کے اخلاق پر کاربند رہتا ہے اور خوش خلق لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق کیسا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ قرآن پڑھ کر دیکھو کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (عفو اور درگزر اختیار کرو، نیک کاموں کی تاکید کرو اور جہلاء سے دور رہو)۔

حضرت خواجہ محمد مرتعش علیہ رحمہ فرماتے ہیں کہ **ھذا مذھب کلہ جد فلا تخلطوہ بشئی من الھذل** (یہ مذہب تصوف سراپا عظمت ہے اسے بے ہودہ باتوں سے پاک رکھو) اس کا مطلب یہ ہے کہ رسمی صوفیوں سے گریز کرو اور ان کی تقلید نہ کرو۔ جب لوگ اس قسم کے صوفیوں کو دیکھتے ہیں کہ سرود سنتے ہیں،

رقص کرتے ہیں' اور لقمہ چرب کے لئے سلاطین و امراء کے در کا طواف کرتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ سب اہل طریقت ایسے ہوتے ہیں اور سابقہ اہل طریقت بھی ایسے ہوں گے وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ فتنہ و فساد کا زمانہ ہے جس میں سلاطین ظلم و ستم میں' اور سارا زمانہ فسق و فجور میں مبتلا ہوگیا ہے اور ریاکاری نے زاہدوں کو نفاق میں ڈال دیا ہے صوفی لوگ سرود و رقص میں مشغول ہوگئے یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اگر اہل طریقت بدل بھی جائیں طریقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی

قول حضرت ابو علی قزوینیؒ

تصوف اخلاق حسنہ اور کردار پسندیدہ کا نام ہے اور بندہ ہمیشہ حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتا ہے۔

قول حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ

حضرت شیخ ابوالحسن نوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں **التصوف ھو الحریتہ و الفتوۃ و ترک التکلف و السخاء و بذل الدنیا** (تصوف نام ہے آزادی' فتوت' ترک تکلف اور سخاوت اور دولت خرچ کرنے کا)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہوا و ہوس سے آزاد ہو' فتوت سے یہ بھی مراد ہے کہ اپنی فتوت پر غرور نہ کرے اور ترک تکلف یہ ہے کہ دنیا کے امور میں خود غرضی نہ کرے' سخاوت اور بذل دنیا یہ ہے کہ دنیائے دون کو اہل دنیا کے حوالہ کردے۔

قول حضرت ابوالحسن ابوشنجہ رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابوالحسن ابو شنجہ علیہ رحمہ فرماتے ہیں کہ **التصوف الیوم اسم بلا حقیقت و قد کان حقیقتہ بلا اسم** (آجکل تصوف ایک نام ہے بلا حقیقت جبکہ پہلے یہ حقیقت تھی بغیر نام کے) یعنی صحابہ کرام کے زمانے میں یہ نام (تصوف) مروج نہ تھا لیکن اس کی حقیقت ہر شخص کے دل میں تھی۔ اب صرف نام رہ گیا ہے اور حقیقت مفقودبالفاظ دیگر پہلے حقیقت (روحانی مراتب) موجود تھی

اور اس کا دعوہ کوئی نہیں کرتا تھا اور اب دعویدار بہت ہیں لیکن حقیقت نہیں ہے۔

یہاں تصوف کی حقیقت کے متعلق صرف یہی اقوال پیش کیے گئے ہیں تاکہ تم پر (خدا تمہیں برکت دے) راہ حقیقت کشادہ ہوجائے اور تو منکرین تصوف کو پکڑ سکے کہ کیا بات کرتے ہو۔ کیونکہ نام کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ اگر کوئی تصوف کی حقیقت کا انکار کرتا ہے تو یہ ساری شریعت پیغمبر علیہ السلام کا انکار ہے اور آپ کے اخلاق پسندیدہ کا انکار ہے اور میں تجھے نصیحت کرتا ہوں (خدا تجھے نیک کرے) کہ تو اس کا پورا حق ادا کرے' انصاف سے کام لے اور اپنی کوتاہی کا دعوہ کرے اور اہلِ طریقت سے حسن اعتقاد رکھے۔ وباللہ التوفیق۔

ایمن مشو کہ مرکب مردانِ زہدرا
در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نامید ہم مشو کہ رندانِ بادہ نوش
ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند
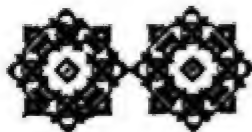
گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خُدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنُما

ترجمہ یاد رہے کہ صوفیاء کرام کا لباس اکثر مرقعہ (گدڑی) رہا ہے۔

شرح مرقعہ سے مراد گدڑی ہے یعنی ایسا جبہ یا چغہ جو مختلف رنگ کے ٹکڑوں کو باہم سی کر بنایا گیا ہو اس کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ عین افلاس کی حالت میں قسم و قسم کے پرانے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے چیتھڑوں کو دھو کر سی لیا جاتا تھا اور اہل اللہ اسے پہنتے تھے بعد میں جب کسی کو استطاعت ہوئی تو بزرگوں اور پیغمبروں کی سنت کے طور پر صوفی حضرات نئے اور پرانے ٹکڑے یا بالکل نئے ٹکڑے باہم سی کر جبہ بناتے تھے اور سنت مشائخ و انبیاء پر عمل کرتے تھے۔

ترجمہ اور یہ لباس سنت نبویؐ ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

علیکم بلبس الصوف تجدون حلاوۃ الایمان فی قلوبکم (اونی لباس اختیار

کرو تم اس سے حلاوت ایمان پاؤ گے اپنے قلوب میں) نیز ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ **کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یلبس الصوف و یرکب الحمار** (نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اون پہنتے تھے اور گدھے کی سواری فرماتے تھے) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا **لا تضعی الثوب حتی ترقعیہ** (کپڑا ضائع نہ کرو حتیٰ کہ تم اس کو پیوند نہ لگالو) تاکہ تجھے حلاوت ایمان نصیب ہو۔

شرح سبحان اللہ ! کس قدر حکمت سے بھرے ہوئے الفاظ ہیں کہ ایک تو کپڑا ضائع نہ ہو اور جس قدر کہنہ ہو جائے اس سے فائدہ اٹھایا جائے تاکہ فضول خرچی (یعنی اچھا خاصہ کپڑا اتار پھینکنے) سے قوم اور ملک کی دولت ضائع نہ ہو اور غرباء و مساکین محروم نہ رہیں۔ دوسرے یہ کہ پیوند لگے ہوئے اور کم قیمت اونی لباس سے غرور و تکبر کا قلع و قمع ہو اور حلاوت ایمان نصیب ہو۔ حلاوت ایمان اس لئے بھی زیادہ ہوتی ہے کہ غریبوں کا خیال رکھا جائے اور کم قیمت لباس سے دل میں عجز و نیاز پیدا ہو۔

ترجمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ مرقعہ پہنتے تھے کہ جس میں تیس ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔

یعنی تیس دفعہ آپ اس کی مرمت کر چکے تھے یہ مسلمانوں کے امیر یعنی فرمانروا کا حال تھا اور اسلام اسی سادگی اور روحانی قوت سے پھیلا نہ کہ عیش و عشرت کے سامان سے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بہترین کپڑا وہ ہے جو کم قیمت ہو۔ اور امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ کے پیراہن کی آستین انگلیوں تک ہوتی تھی اور بعض اوقات آپ لمبی آستین کاٹ دیتے تھے۔

شرح شاید یہ روایت اس لئے یہاں بیان کی گئی ہے کہ اس زمانے میں بازوؤں سے بھی لمبی آستین رکھنے کا رواج تھا۔

ترجمہ نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حق تعالیٰ کا فرمان ہوا کہ جامہ چھوٹا کرو وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ ای فقصر (اور اپنے کپڑوں کو پاک کرو یعنی کوتاہ کرو)

حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب بدر کی زیارت کی کہ وہ تمام اونی کپڑا پہنتے تھے۔

شرح اون سے مراد آج کل کے نفیس اور نرم اونی کپڑے نہیں ہیں جو سرد ملکوں کی بھیڑوں کی نہایت ہی باریک اور نرم اون سے بنائے جاتے ہیں بلکہ اس زمانے میں ایسے اونی کپڑے بنائے جاتے تھے جیسے آج کل دیہات میں کھردری لوئی یا کمبل ہوتے ہیں جو ننگے جسم پر لگیں تو تکلیف دیتے ہیں لیکن صحابہ کرام اور انبیاء علیہم السلام کا کمال ہے کہ اسی خام اون سے کُرتے، شلوار اور دستار بنا کر پہنتے تھے اور اس کی گرمی اور کھردراہٹ کو خوشی سے برداشت کرتے تھے۔ کس وجہ سے؟ صرف اس وجہ سے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اس سے ایمان میں زیادہ حلاوت محسوس ہوتی ہے اور اس سے غرباء و مساکین اور امراء میں فرق مٹ جاتا ہے اور قوم و ملک کی دولت بے جا خرچ نہیں ہوتی۔ آج کل کے زمانے میں لباس اور خوراک پر جس قدر دولت برباد ہو رہی ہے اس کو اگر ملک کے دفاعی اخراجات پر صرف کیا جائے تو ہمیں تحفظ ملک کے بارے میں ہرگز پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔ لیکن ہم سب پریشان بھی ہیں اور خرچ بھی زیادہ سے زیادہ کر رہے ہیں۔ اس کو عقلمندی کہا جائے یا کیا کہا جائے۔

ترجمہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ان کے پیراہن میں کئی پیوند تھے

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ' اور حضرت ہرم بن حیانؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ اونی کپڑا زیب تن تھا جس پر کئی پیوند تھے۔ نیز حضرت حسن بصری' مالک بن دینار اور سفیان ثوری علیہم الرحمہ ایسے اونی کپڑے پہنتے تھے جن پر پیوند لگے ہوئے ہوتے تھے اور امامِ اعظم حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے اور یہ بات کتاب تاریخ مشائخ مصنفہ محمد بن علی حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ میں درج ہے کہ آپ ابتدا میں اون پہنتے تھے اور جب آپ نے گوشہ نشینی اختیار کی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خواب میں ان کو حکم دیا کہ تجھے لوگوں کے درمیان رہنا چاہئے کیونکہ تجھ سے میری سنت زندہ ہوگی۔ اس کے بعد آپ نے عزلت یعنی گوشہ نشینی ترک کر دی اور آپ ہرگز قیمتی کپڑا زیب تن نہیں فرماتے تھے۔ نیز حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ کا لباس بھی اونی تھا۔ آپ کا شمار محققین صوفیاء کرام میں ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آئے تو دیکھا کہ آپ نے مرقعہ پیراہن پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اصحاب نے ان کو تحقیر اور تصغیر کی نگاہ سے دیکھا لیکن حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سیدنا ابراہیم تشریف لائے ہیں۔ جب آپ کے اصحاب نے پوچھا کہ ان کو یہ سیادت کیسے ملی تو انہوں نے جواب دیا کہ اس وجہ سے کہ وہ ہر دم ذکر خدا میں مشغول رہتے ہیں اور ہم تن پروری میں مشغول ہیں اس لئے وہ ہمارے سید (سردار) ہیں۔

اب اگر اس زمانے میں بعض لوگ خلق میں جاہ و حشمت پیدا کرنے کے لئے مرقعہ لباس اختیار کرتے ہیں اور اندر سے خالی ہیں تو یاد رکھو کہ فوج میں بہادر جرنیل ایک ہوتا ہے۔ بلکہ ہر فن میں محقق کم ہوتے ہیں لیکن سب لوگ

ان گنتی کے چند مخلص اصحاب سے منسوب کئے جاتے ہیں خواہ ان بندگان خدا کی صفات میں سے صرف ایک ہی صفت ان کے اندر کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ من تشبہ بقوم فھو منھم (جو شخص کسی قوم کی تشبیہ اختیار کرتا ہے تو اسی میں شمار ہوتا ہے) خواہ وہ اس قوم کی ظاہری صورت اختیار کرے یا اعتقادی۔ لیکن بعض کی نظر ان کی ظاہری صورت پر پڑتی ہے اور بعض کی ان کے باطنی کمالات، صفائے باطن، عظمت، بزرگی، لطافت طبع، اعتدال مزاج، اور صحت حال پر۔ اور ان کے بلند درجات اور اعلیٰ مقامات دیکھ کر ان کا دامن پکڑتے ہیں اور فیض حاصل کرتے ہیں اور اصلاح نفس، کشف حال، ترک ہوا اور ترک نفسانی خواہشات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

دوسرا گروہ ان کے ظاہری نیکی، سکون قلب، بزرگی سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے اتباع شریعت، حسن خلق، علم و ادب اور نیک معاملگی کو دیکھ کر ان کی صحبت اختیار کرتے ہیں اور اپنی اصلاح کی کوشش میں مشغول ہو جاتے ہیں اور حسن معاملات اور حسن خلق ان کا مدعا و مقصود ہوتا ہے۔

تیسرا گروہ ایسے لوگوں کا ہے جن کو اولیاء اللہ کی مروت اور حسن سیرت اور اعمال پسندیدہ اچھے لگتے ہیں۔ ان کی بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت اور کمزوروں پر مہربانی دیکھ کر ان کی صحبت اختیار کرتے ہیں اور دنیاوی معاملات میں حسن و خوبی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چوتھا گروہ ایسے لوگوں کا ہے جو سستی، رعونت، تکبر اور طلب جاہ میں مشغول تو ہوتے ہیں لیکن اولیاء اللہ کی صحبت بھی اختیار کر لیتے ہیں اس خیال سے کہ ان کے ظاہری صورت حال کے سوا ان کے اندر کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ حضرات بھی ان سے نرمی اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں اور مصلحت کی خاطر ان کو اپنی صحبت میں آنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن طلب حق وغیرہ کی کوئی چیز

ان کے اندر نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ لوگ ظاہری طور پر تزکیۂ نفس اور طہارت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بزرگوں کی وجہ سے لوگ ان کا احترام کریں اور ان سے خوف کھائیں جس طرح وہ بزرگوں کا احترام کرتے ہیں اور اُن سے خوف کھاتے ہیں وہ اپنے بدکردار اور برے افعال کو بزرگوں کی پاکیزگی کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بزرگوں جیسا لباس تو اختیار کر لیتے ہیں لیکن وہ لباس خود ان کے مکر و فریب پر زبان حال میں فریاد کرتا ہے کہ یہ جامۂ زور (مکر) ہے' لباس غرور ہے' اور حسرت روز نشور (روز قیامت) ہے۔ ان کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا ہے مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ

(ان لوگوں کی مثال جن پر تورات کا بوجھ ڈالا گیا اور برداشت نہ کر سکے اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لادی جائیں۔ وہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا)۔

یاد رکھو کہ اس زمانے میں اس (آخری) گروہ کے لوگوں کی کثرت ہے پس تم پر لازم ہے کہ جس قدر ہو سکے ایسے لوگوں سے اجتناب کرو۔ اگر تو ہزار بار حق قبول کرنے کی کوشش کرے تو اس چیز کی برابری نہیں ہو سکتی کہ حق تجھے ایک لحظہ کیلئے قبول کرے۔ یہ کام خرقہ (ظاہری لباس) سے نہیں حرفہ (اعمال) سے تعلق رکھتا ہے۔ جب انسان طریقت اختیار کرتا ہے تو اس کی قبا (شاہی لباس) بھی عبا (لباس درویشی) بن جاتا ہے اور اگر طریقت سے بے گانہ ہے تو مرقعہ (گدڑی) بھی اس کیلئے رقعۂ بربادی اور منشور یوم النشور (دوزخ کا پروانہ) بن جاتا ہے۔

جب ایک بزرگ سے پوچھا گیا کہ آپ مرقعہ کیوں نہیں پہنتے تو جواب دیا کہ نفاق (منافقت) کے خوف سے نہیں پہنتا کیونکہ جوانمردوں کا لباس پہننا اور

اندر جوانمردی کا نہ ہونا منافقت نہیں تو اور کیا ہے۔ لہٰذا اگر تو یہ لباس اس لئے اختیار کرتا ہے کہ خداوند تجھے اس سے پہچان لے کہ تو خاصان خدا میں سے ہے تو یاد رکھ کہ وہ تجھے اس لباس کے بغیر بھی پہچان سکتا ہے۔ اگر تو اسلئے اختیار کرتا ہے کہ میں خاصان خدا میں سے ہوں تو اگر تو خاصان خدا میں سے فی الواقع ہے تو یہ ریاکاری (دکھلاوہ) ہے اور اگر تو نہیں ہے تو یہ منافقت ہے۔ لہٰذا یہ راستہ بہت دشوار ہے۔ اور خاصان خدا کی تو یہ حالت ہے کہ لباس سے بے نیاز ہوتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے **الصفا من اللّٰہ تعالےٰ انعام و اکرام الصوف لبلس الانعام** (صفائی قلب حق تعالیٰ کا اِنعام ہے اور صوف (اون) اَنعام (جانوروں) کا لباس ہے یعنی بھیڑ بکری کا لباس بھی اون ہے)۔

پس بزرگوں کا سا حلیہ اختیار کرنا حیلہ جوئی یعنی بہانہ سازی ہے بعض لوگ بزرگوں کا لباس اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ بھی بزرگ ہیں اس لئے مشائخ عظام نے اپنے مریدوں کو گدڑی پہننے کا حکم دے دیا اور خود بھی اختیار کیا تاکہ لوگ یہ لباس اختیار نہ کر سکیں۔ (یعنی حقیر لباس سمجھ کر اختیار نہ کریں) اور اگر اختیار کریں تو لوگ ان کے پیچھے پڑ جائیں اور ان کی غلط کاریوں کو پکڑ لیں اور ان کو لعنت و ملامت کریں (کہ یہ لباس اور یہ اعمال)۔

الغرض مرقعہ اولیاء اللہ کی زینت کا لباس ہے۔ عوام اس لباس سے عزت پاتے ہیں اور خواص اس میں ذلت محسوس کرتے ہیں۔ عوام کیلئے یہ لباس باعث عزت اس لئے ہے کہ جب وہ یہ لباس پہنتے ہیں تو لوگ ان کی عزت کرتے ہیں اور خواص کیلئے ذلت اس لئے ہے کہ یہ حضرات زیب و زینت کو پسند نہیں کرتے۔ پس **المرقعہ النعم للعوام و جوشن البلاء للخواص** (اس لئے کہ مرقعہ عوام کیلئے نعمت کا لباس ہے اور خواص کیلئے مصیبت کی ڈھال ہے) لہٰذا عوام اس کو پہننے کیلئے بے چین ہوتے ہیں کیونکہ اور کام تو کر نہیں سکتے اسی طریقے جاہ و مرتبہ حاصل

کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن خواص کی یہ حالت ہے کہ وہ ریا اور ریاست (جاہ و مرتبہ) سے دور بھاگتے ہیں۔ اور عزت کی بجائے ذلت اختیار کرتے ہیں اور بلا کو نعمت پر ترجیح دیتے ہیں اس لئے جو چیز عوام کیلئے نعمت ہے وہ خواص کیلئے زحمت بن جاتی ہے۔ اس لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ **"المرقعتہ قمیص الوفاء لاھل الصفاو سربال السرور لاھل الغرور"** (مرقع اہل صفا کے لئے لباس وفا ہے اور اہل غرور کے لئے لباس سرور ہے) مطلب یہ ہے کہ اہل صفا اس کے پہننے سے کونین سے ہاتھ دھو لیتے ہیں اور اس کی نعمتوں سے علیحدہ ہوجاتے ہیں اور اہل غرور ان کی وجہ سے محجوب از حق اور خیر سے محروم ہوجاتے ہیں غرض یہ کہ اس سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔ لیکن جہاں اہل صفا کو صفائے قلبُ عطا ہوتا ہے' اہل دنیا کو غطا (گمراہی) ملتی ہے۔ایک کو وُطا (کجی) اور دوسرے کو رضا (الٰہی)۔ مجھے امید ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کی صحبت اور محبت کی وجہ سے نجات پائیں گے۔ جیساکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ **من احب قوماً فھو منہ** "جس گروہ سے کوئی شخص محبت کرتا ہے اسی کے ساتھ اس کا حشر ہوگا"۔ اور اسی زمرہ میں شمار ہوگا۔ اس لئے باطن کی طلب میں رہنا چاہیے۔ خالی نام سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ جو شخص خالی نام میں رہ گیا وہ حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا۔ نیز یہ جاننا چاہئے کہ وجود آدمیت حجاب ربوبیت ہے۔ اور یہ حجاب تزکیۂ نفس اور احوال و مقامات سلوک طے کئے بغیر دور نہیں ہوتا۔ اور تزکیۂ نفس (صفا) کا نام فنا ہے اور جو فنا ہوگیا اس کے لئے کسی لباس سے امتیاز یا زینت حاصل کرنا محال ہے پس جب فنائے صفت (فنائے صفتِ بشریت) میسر آگئی اور بشری طبیعت سے نجات مل گئی اس وقت اس کو صوفی کہو یا کسی اور نام سے یاد کرو یکساں ہے۔

فصل

شرائط مرقعات

مرقعات "گدڑی" پہننے کی دو شرطیں ہیں اول یہ کہ یہ ہلکا لباس ہونے کے لئے پہنا جائے دوم یہ کہ اس سے آسانی مطلوب ہو۔

شرح تاکہ قیمتی اور بھاری قسم کے لباس سے بچ کر سالک آسانی سے عبادت اور ریاضت میں مشغول ہو سکے۔

ترجمہ اور جس جگہ پھٹ جائے وہاں اور ٹکڑا لگا دے۔ اس میں مشائخ کے دو اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ٹکڑا لگانے میں ترتیب ضروری نہیں ہے۔ جہاں پھٹ جائے اسی جگہ نیا ٹکڑا لگادیا جائے۔ اور تکلف نہ کیا جائے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ٹکڑے ایک خاص ترتیب سے لگائے جائیں تاکہ اچھے لگیں۔ کیونکہ یہ بھی فقر کے لوازمات میں سے ہے کہ درستی اور صفائی سے ہر کام کیا جائے اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ میں نے استاذ ابو القاسم گورگانی رحمتہ اللہ علیہ سے طوس میں دریافت کیا کہ درویش کے لئے کم سے کم کیا چاہئے تاکہ فقر کے لئے بھی موزوں ہو۔ فرمایا کم سے کم یہ تین چیزیں اختیار کرے۔ اور اس میں کمی نہیں کرنا چاہئے اول گدڑی پر ٹھیک طرح سے ٹکڑا لگائے۔ دوم ہر بات ٹھیک طرح سے سنی چاہئے سوم ہر قدم ٹھیک طرح سے زمین پر پڑنا چاہئے۔ اس وقت میرے ساتھ اور درویش بھی موجود تھے۔ جب ہم باہر آئے تو ہر ایک اپنی رائے کے مطابق اس کلام میں تصرف کررہا تھا۔ اور اپنا اپنا مفہوم نکال رہا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آؤ بیٹھ کر اس قول پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کریں۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنا اپنا مفہوم بیان کیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ ٹکڑا ٹھیک طور پر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ فقر کی خاطر نہ کہ زیب و زینت کی خاطر لگایا جائے۔

کیونکہ جو نکڑا فقر کی خاطر لگایا جائے گا خواہ وہ غلط بھی لگایا جائے تو صحیح ہوتا ہے اور ہر بات ٹھیک طور پر سننے سے یہ مراد ہے کہ جو بات سنے حال سے سنے نہ کہ خواہش نفس کے ساتھ۔ اور اس سے وجد پیدا ہو نہ کہ فضولیت۔ اور اسے دل و جان سے سنے نہ کہ عقل سے۔

شرح چونکہ عقل کی رسائی بلند روحانی مقامات تک نہیں ہوسکتی اور عشق و وجدان کی ہوسکتی ہے اس لئے جو بات بزرگوں سے سنے اسے عشق اور وجدان کے ذوق میں سنے۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہ کرے۔

ترجمہ اور پاؤں ٹھیک طور پر زمین پر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ پاؤں وجد کے ساتھ رکھے نہ کے لہو و لعب کے ساتھ۔

شرح اس قول کے دو مطالب ہیں ایک یہ کہ سماع میں جب رقص کرے تو وجد اور محویت کی حالت میں کرے نہ کہ فن رقص کا فضول مظاہرہ کرے اور تال کے ساتھ زمین پر پاؤں مارے۔ دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں جب عام حالت میں زمین پر چلے تو جو قدم کہ زمین پر رکھے حال سے خالی نہ ہو اور قلب میں ہر وقت اور ہر قدم پر وجد محسوس کرے۔ جب دل میں عشق اور ذوق و شوق کا غلبہ ہوتا ہے تو منہ سے جو کلمہ نکلتا ہے عشق و حال میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور کلمہ کسی اور سے سنتا ہے تو اس پر بھی اس کو وجد آجاتا ہے۔ ایک بزرگ کے متعلق روایت ہے کہ جب ان کی بکری نے آواز نکالی تو وجد میں آگئے۔ حضرت حافظ شیر محمد صاحب شرق پوری رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق بھی روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ سڑک کے کنارے چارپائی پر بیٹھے تھے اور سڑک مرمت ہورہی تھی جب مزدوروں نے بجری چھاننے کے لئے لوہے کے بڑے چھلنے پر بجری ڈالی تو اس سے جو آواز پیدا ہوئی آپ سن کر وجد میں آگئے اور نیچے گر پڑے۔ اب یہ تو بکری اور

کنکر کی آواز ہے جس سے، عشاق الٰہی وجد میں آگئے۔ جب ان کے سامنے عاشقانہ کلام خوش الحانی سے اور نیز باجے کی چوٹ پر گایا جاتا ہے تو اس وقت ان پر جو حال و مستی اور بے خودی' وجد' ذوق و شوق' سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عاشق کے قلب پر کیا کیا بجلیاں گرتی ہوں گی اور کیا خنجر چلتے ہوں گے۔

ترجمہ جب میری یہ بات حضرت شیخ تک پہنچائی گئی تو آپ نے فرمایا کہ علی نے سچ کہا ہے خدا اسے برکت دے۔

پس مرقعہ پوشی کی غرض و غایت یہی ہے کہ لباس میں ہلکا پن اور آسانی ہو اور دل میں فقر' صدق اور وجدان کی کیفیت ہو۔ روایات میں آیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر لے جایا گیا تو اس وقت آپ نے مرقعہ پہنا ہوا تھا۔مشائخ عظام میں سے ایک بزرگ نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کی گدڑی کے ہر ٹکڑے سے نور کی شعاعیں چمک رہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا کہ پیغمبر خدا یہ انوار کیسے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ یہ انوار میرے اس اضطرار (فقر) کی وجہ سے چمک رہے ہیں جس کی وجہ سے میں نے وہ ٹکڑے مرقعہ پر لگائے تھے۔خداوند تعالیٰ نے مجھے ہر رنج اور ہر تکلیف کے صلہ میں انوار عطا فرمائے ہیں۔

میں نے ایک بزرگ کو دیکھا جو اہلِ ملامت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جو چیزیں عام طور پر لوگ کھاتے پیتے ہیں وہ نہیں کھاتے تھے نہ ان جیسے کپڑے پہنتے تھے بلکہ وہ چیزیں کھاتے تھے جو لوگ پھینک دیتے ہیں۔ مثلاً سڑی ہوئی سبزی' کڑوا کدو اور چھلکے وغیرہ۔ اور ان کا لباس یہ تھا کہ راستے میں جو چیتھڑے پڑے ہوئے ہوتے تھے وہ ان کو جمع کرکے گدڑی بناتے تھے۔ نیز شہر مرو میں متاخرین میں سے ایک اور بزرگ تھے جو بے حد قوی الحال اور نیک سیرت

تھے۔ اور ان کی ٹوپی اور جائے نماز میں اس کثرت سے ٹکڑے لگے ہوئے تھے کہ بچھو نے وہاں بچے دے دیئے تھے۔ نیز میرے مرشد رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ اکاون سال تک ایک ہی جبہ میں رہے۔ جس پر بے تکلف ٹکڑے چسپاں تھے۔

عراق کے بزرگوں میں سے دو درویش تھے۔ ایک صاحب مشاہدہ تھے دوسرے صاحب مجاہدہ۔

شرح ایک منزل مقصود پر پہنچ کر واصل باللہ ہو چکے تھے اور دوسرے منزل تک پہنچنے کی جدوجہد میں مشغول تھے۔

ترجمہ جو صاحب مشاہدہ تھے وہ ساری عمر صرف وہی کپڑا پہنتے تھے جو مشائخ عظام محافل سماع میں وجد کی حالت میں اتار کر قوالوں کے سامنے پھینک دیتے تھے۔ اور وہ جو صاحب مجاہدہ تھے وہ ہمیشہ وہ کپڑا زیب تن کرتے تھے جو درویش لوگ حالت استغفار اور توبہ و زاری میں پھاڑ دیتے تھے۔ (یعنی پھاڑ کر پھینک دیتے تھے) تاکہ لباس اندرونی حال کے مطابق ہو۔ یہ ہے حال کی پاسداری (تحفظ)۔

حضرت شیخ محمد بن خفیف رضی اللہ عنہ نے بیس سال تک پلاس (ٹاٹ) زیب تن کیا۔ آپ ہر سال چار چلے کرتے تھے اور ہر چلہ کے دوران آپ حقائق و معارف پر ایک کتاب تصنیف فرماتے تھے۔ ان کے ہم عصر ایک بزرگ تھے جن کا اسم گرامی محمد بن زکریا تھا۔ آپ علم طریقت و حقیقت میں محقق کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ فارس کے شہر "پرگ" میں رہتے تھے۔ اور کبھی مرقعہ نہیں پہنتے تھے بلکہ سفید لباس اختیار کرتے تھے۔ جب شیخ محمد بن خفیف سے کسی نے آداب مرقعہ کے متعلق دریافت کیا کہ اسے زیب تن کرنے کا لائق کون ہے تو آپ نے جواب دیا کہ مرقعہ پہننے کی شرط وہ ہے جو محمد بن زکریا اپنے سفید لباس میں بجا

لاتے ہیں اور وہی مرقعہ پہننے کے لائق ہیں۔

فصل

مرقعہ شرط فقر نہیں

لیکن مسلک تصوف میں صوفیاء کی ہر عادت پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ بعض مشائخ نے گدڑی کو ترک کیا ہے اس کی دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ اون کی تجارت میں فتنہ پیدا ہوگیا ہے کیونکہ مویشی کی جابجا چوری ہو رہی ہے (یعنی مال حلال کی تمیز مشکل ہو گئی ہے) دوسرے یہ کہ بعض جھوٹے دعویداروں نے گدڑی اختیار کر لی ہے اور دعویداروں سے اختلاف کرنا روا ہے خواہ وہ سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ گدڑی باتکلف اس لئے تیار کرتے ہیں کہ خلق خدا میں ان کو جاہ و مرتبہ حاصل ہو اور ان کا شمار درویشوں میں ہو سکے۔ لیکن ان کے اعمال درویشوں جیسے نہیں ہوتے اس سے تنگ آکر صوفیاء کرام نے مرقعہ دوزی کا ایک خاص طریقہ نکال لیا جس سے وہ ایک دوسرے کی پہچان کر سکتے تھے۔ اس حد تک کہ ایک دفعہ ایک درویش ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس حالت میں تھا کہ اس نے گدڑی پر ٹکڑے اس خاص طریق پر نہیں لگائے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اس کو باہر نکال دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات ان کی لطافت طبع کے اور مزاج کے مخالف تھی۔ کیونکہ صفائے قلب کی حالت میں کسی قسم کی کجی یعنی ٹیڑھا پن برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح کہ ایک غیر موزوں شعر طبیعت کو اچھا نہیں لگتا۔ اسی طرح ایک غیر موزوں فعل بھی ناپسندیدہ ہوتا ہے۔

لباس میں عادت کی نفی

بعض بزرگان ایسے بھی ہوئے ہیں جو لباس کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور جو کچھ خداوند تعالیٰ دیتا ہے پہن لیتے ہیں خواہ وہ قبا (شاہی لباس) ہو یا عبا (درویشی لباس) اور اگر حق تعالیٰ ان کو ننگے تن رکھتے ہیں۔ تو وہ ننگے تن رہتے ہیں اور میں علی بن عثمان الجلابی بھی اسی روش کو پسند کرتا ہوں۔ اور سفر کی حالت میں میں نے اسی پر عمل کیا ہے۔

حکایات میں آیا ہے کہ جب حضرت احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کو گئے تو قبا زیب تن تھی اور جب شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کو گئے تو انہوں نے بھی قبا پہنی ہوئی تھی۔ (حالانکہ قبا امراء کا لباس تھا۔) لیکن یہ ان کا ہمیشہ کا لباس نہیں تھا۔ وہ بعض اوقات مرقعہ بھی زیب تن کیا کرتے تھے۔ (اور کسی چیز کو عادت نہیں ہونے دیتے تھے) کیونکہ عادت طبیعت بن جاتی ہے اور طبیعت حجاب بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا ہے **خیرالصیام صوم اخی داود علیہ السلام** (بہترین روزہ میرے بھائی داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے۔) صحابہ نے پوچھا کہ حضور وہ کس طرح ؟ آپ نے فرمایا کہ آپ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن نہیں رکھتے تھے۔ تاکہ نفس روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا عادی نہ بن جائے جس کی وجہ سے حجاب ہو جاتا ہے۔

شرح عادت اس لئے حجاب بن جاتی ہے کہ جب روزانہ روزہ رکھا جاتا ہے تو نفس اس کا عادی ہو جاتا ہے اور تکلیف محسوس نہیں کرتا بلکہ بعض وقت اس سے فرحت ہوتی ہے اس لئے نفس کی مخالفت کے لئے ایک دن روزہ رکھا جاتا

ہے اور ایک دن ترک کیا جاتا ہے تاکہ بھوک اور پیاس محسوس ہو اور تزکیۂ نفس ہو۔ نیز جب گدڑی یا مخصوص درویشانہ لباس پہننے سے طبیعت میں عجب یا غرور پیدا ہو تو یہ بھی حجاب بن جاتا ہے۔

ترجمہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل حضرت ابو حامد مزوری رحمتہ اللہ علیہ کا تھا کہ جب آپ کو مرید کوئی پیراہن پہنا دیتے تھے تو آپ منع نہیں فرماتے تھے اور جب کسی کو پیراہن کی ضرورت ہوتی اور آپ کو اکیلا دیکھ کر وہ پیراہن اتار لیتا تو آپ اسے بھی منع نہیں فرماتے تھے کہ کیوں اتار رہے ہو۔ اور ہمارے اس زمانے میں بھی غزنی میں ایک درویش ہیں جس کا نام مؤید رحمتہ اللہ علیہ ہے وہ بھی لباس کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور یہ بات اس مقام پر درست بھی ہے۔

نیلا لباس پہننے میں حکمت

بعض مشائخ نے اکثر نیلا لباس اختیار کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اکثر اوقات سیر و سیاحت میں رہتے تھے اور سفید لباس سفر میں جلدی میلا ہو جاتا ہے جس کا دھونا دشوار ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نیلا لباس اکثر ماتم اور مصیبت کی علامت ہے اور غم زدوں کا لباس ہے۔ اب چونکہ یہ دنیا مصیبت کا گھر اور گہوارۂ بلا ہے اس لئے اہل اللہ ہمیشہ عشق محبوب میں سوگ مناتے ہیں اور نیلا لباس پہنتے ہیں۔ ایک اور گروہ ہے جو اپنے اعمال کی کوتاہی اور حال کی خرابی اور حصول مقصد میں اپنی ناکامی دیکھ کر اپنا سوگ آپ منانے کی خاطر نیلا لباس اختیار کرتے ہیں۔

وہ لباس جو خدا کے لئے پہنا جائے یا اولیاء اللہ کی موافقت میں اختیار کیا جائے مبارک ہے۔ اگر تم اولیاء اللہ کے لباس کا حق ادا کر سکتے ہو تو پہنو۔ ورنہ اپنے

دین کی حفاظت کرو اور یہ لباس اختیار مت کرو۔ کیونکہ عام مسلمان ایک مدعی (جھوٹے فقیر) سے بہتر ہوتا ہے۔

مرقعہ (گدڑی) دو قسم کے لوگوں کے لئے جائز ہے۔ ایک تارک دنیا۔ دوسرے عاشقان الٰہی۔ اور مشائخ عظامؒ کا دستور یہ رہا ہے کہ جو شخص مرید ہونے کی غرض سے ان کے پاس آتا تو اس کو تین سال کے لئے اپنے پاس رکھ کر یہ تین کام اس سے لیتے تھے۔

۱۔ ایک سال خدمت خلق۔

۲۔ ایک سال خدمت حق یعنی زہد و تقویٰ۔

۳۔ ایک سال اپنے قلب کی نگہبانی۔

خدمتِ خلق

خدمت خلق اس وقت انجام دی جاسکتی ہے جب انسان اپنے آپ کو خادم اور ساری خلقت کو مخدوم سمجھے یعنی بلا امتیاز ہر شخص کو اپنے آپ سے بہتر سمجھے۔ اور ہر شخص کی خدمت اپنے لئے لازم قرار دے دے۔ یہ خدمت نہیں ہے کہ کسی کو مخدوم بھی سمجھے اور اپنے آپ کو مخدوم سے افضل سمجھے۔ کیونکہ یہ واضح خسارہ اور صاف دھوکہ ہے اور آفات زمانہ میں سے ایک آفت ہے۔

خدمتِ حق

اور خدمت حق تعالیٰ اس وقت ممکن ہے کہ دنیا اور عقبیٰ کی تمام لذات کا خیال دل سے نکال دے اور حق تعالیٰ کی عبادت خالص حق تعالیٰ کے لئے کرے (نہ کہ خوف دوزخ یا طمع جنت)۔ کیونکہ جو شخص بہشت کی خاطر عبادت کرتا ہے تو اس کا معبود بہشت ہے نہ کہ خدا تعالیٰ۔

دل کی نگہبانی

اور دل کی نگہبانی یہ ہے کہ پوری ہمت کر کے دل کو تمام خیالات اور وساوس سے خالی کر کے حق تعالیٰ کے ساتھ لگا دے اور دل میں غفلت کو جگہ نہ دے۔

جب مرید کو یہ تین صفات حاصل ہو جائیں تو اس کو مرقعہ پہننے کا حق حاصل ہو جاتا ہے تب اس کے لئے مرقعہ حقیقی ہوتا ہے نہ کہ رسمی۔

اوصافِ شیخ

اور جو شخص مرید کو مرقعہ پہناتا ہے اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ مستقیم الحال ہو اور طریقت کے نشیب و فراز سے گزر چکا ہو۔ طریقت کے احوال و مقامات کا ذاتی تجربہ رکھتا ہو' حلاوت اعمال چکھ چکا ہو اور حق تعالیٰ کی صفات جلال و جمال کا مشاہدہ کر چکا ہو۔ نیز وہ کشف کے ذریعے یہ بھی معلوم کرنے کی طاقت رکھتا ہو کہ مرید کی رسائی کس مقام تک ہو سکتی ہے اور آیا وہ واپس لوٹنے والوں میں سے ہے یا ایک مقام پر رک جانے والوں میں سے ہے یا منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ وہ واپس لوٹنے والا ہے تو اس کو کہے کہ ابتداء ہی نہ کرے۔ اگر وہ درمیانی منزل پر رک جانے والا ہے تو اس کا علاج کرے۔ اور اگر منزل مقصود پر پہنچنے کی قابلیت رکھتا ہے تو اس کی تربیت کرے۔ یاد رہے کہ مشائخ طریقت طبیب قلب ہوتے ہیں۔ لیکن اگر طبیب علم طب سے ناواقف ہے تو وہ مریض کو ہلاک کر دے گا کیونکہ وہ علاج کر ہی نہیں سکتا۔ نہ وہ مرض کی تشخیص کر سکتا ہے اور نہ مرض کے لئے مناسب دوائی اور غذا تجویز کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ **الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ** (اپنی قوم میں شیخ اس طرح ہے جس طرح اپنی امت میں

نبی) ۔ پس انبیاء علیہم السلام نے خلق کو جو اسلام کی دعوت دی وہ باطنی بصیرت کے مطابق دی۔ اور ہر شخص کو وہ غذا دیتے ہیں جس سے دعوت کا مقصد حاصل ہو۔ پس جب شیخ کامل اپنی باطنی نگاہ سے مرید کی حالت دیکھ کر تین سال تک اسے اپنے پاس رکھتا ہے اور تربیت کرتا ہے تو اس کا مرقعہ پہنانا برحق ہوتا ہے اور مرقعہ پہنانا کفن پہنانے کی طرح ہے کہ لذات زندگی سے امید قطع کرلے اور راحت زندگی سے دل کو دور رکھے۔ ساری عمر حق تعالیٰ کی یاد کے لئے وقف کردے۔ اور حرص و ہوا سے کلی طور پر باز رہے۔ اس کے بعد شیخ اس مرید کو خلعت خلافت سے سرفراز کرتا ہے اور مرید اس خلعت کا پوری طرح حق ادا کرتا ہے۔ اور اس کے لئے مجاہدات و ریاضات کرتا ہے اور دیگر مقاصد کو اپنے لئے حرام قرار دیتا ہے۔

شرح دیگر مقاصد کو اپنے لئے حرام کا مطلب یہ ہے چونکہ اس نے فن روحانیت میں کمال حاصل کرلیا اب اسے اس فن کو اصلاح خلق کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ کیونکہ اصلاح خلق ہمہ وقت کام ہے۔ جس طرح ایک طب کے ڈاکٹر کو طب کا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ماہر فنِ روحانیت کو بھی اپنا پیشہ اختیار کرنا چاہئے نہ کہ دوسرے فن کا۔ اگر وہ دوسرے مشاغل اختیار کرے گا تو ہدایت خلق کا فریضہ کون ادا کرے گا۔

اشارات مرقعہ

مشائخ نے مرقعہ کے متعلق بہت اشارات بیان کئے ہیں۔ شیخ ابو معمر اصفہانی علیہ رحمہ نے اس موضوع پر ایک پوری کتاب لکھی ہے اور انہوں نے عام صوفیوں کی مبالغہ بازی کو اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد اس کتاب کا دہرانا نہیں ہے بلکہ طریقت کے ادق مسائل کو واضح کرنا ہے۔ مرقعہ کے

مختلف حصوں کے اشارات یہ ہیں :

مرقعہ کا گلا صبر ظاہر کرتا ہے۔ اس کے دو آستین خوف اور رجا ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی دو تریزین قبض و بسط کو' اس کی کمر مخالفت نفس کو' اس کی دو کربیاں یقین کی صحت کواوراس کی فراویز سے اخلاص مراد ہے۔

شرح قبض اور **بسط** طریقت میں دو کیفیات کا نام ہے۔ جب سالک پر کشف یا فیضان کی بندش ہوجاتی ہے تو اس حالت کو قبض کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب شرح صدر ہوتی ہے اور فیضان شروع ہوجاتا ہے تو اسے **بسط** کہتے ہیں۔

ترجمہ اور اس سے بہتر تشبیہہ یہ ہے کہ قبا یعنی گلا سے مراد خلق کے ساتھ میل جول کا بند کرنا ہے۔ دو آستینوں سے مراد فقر اور ولایت ہے' کمر گاہ سے مراد مشاہدۂ حق میں استقامت' کرسی سے مراد حضرت حق کی معیت میں کمال اطمینان قلب' اور فراویز سے مراد وصال حق میں قرار پکڑنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے جس طرح ظاہر میں تونے مرقعہ پہن لیا ہے باطن میں بھی مرقعہ پہن لے۔ میں نے اس مضمون پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام اسرار الخرق والمئونات ہے۔ یہ مرید کے لئے ضروری ہے۔ اگر مرید غلبۂ حال یا حکومت کے حکم سے مرقعہ پھاڑ دے تو وہ معذور ہے لیکن اگر جان بوجھ کر اسے پھاڑتا ہے تو اسے آئندہ مرقعہ پہننے کا حق نہیں ہے۔ اگر پہنتا ہے تو عام شہرت پسند لوگوں کی طرح ہوگا۔ جن کو بطون سے کچھ حصہ نہیں ملا۔

جہاں تک مرقعہ پھاڑنے اور تبدیل کرنے کا تعلق ہے ہر مقام کے لئے ایک مخصوص لباس ہوتا ہے۔ جب سالکین ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچتے ہیں تو حق تعالیٰ کے شکرانے کے لئے دوسرا مناسب حال لباس اختیار کرتے

ہیں۔ لیکن مرقعہ تمام مقامات طریقت اور ولایت کے لئے جامع لباس ہے اور اسے ترک کرنا ان تمام مقامات کو ترک کرنے کے مترادف ہے۔ اس مضمون پر مزید گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ باب خرقہ و کشف حجاب السماع میں اس کی وضاحت کی جائے گی۔ اس جگہ میں نے صرف اشارہ کردیا ہے تاکہ اس کے متعلق کچھ نہ کچھ علم ہوتا جائے۔

نیز بزرگوں نے کہا ہے کہ جو شیخ مرقعہ پہنائے اس کے اندر اتنی روحانی طاقت ہونی چاہئے کہ بیگانہ (ناآشنائے حقیقت) میں نظر کرے تو اسے آشنا کردے۔ اور جب ایک گناہ گار کو مرقعہ پہنائے تو اسے ولی اللہ بنا دے۔

حکایت ایک دفعہ میں اپنے شیخ کے ساتھ آذربائیجان میں سفر کررہا تھا۔ ہم نے دو تین مرقعہ پوشوں کو دیکھا کہ گندم کے ایک خرمن پر خیرات کے لئے مرقعہ کا دامن پھیلائے کھڑے تھے۔ حضرت شیخ نے ان کو مخاطب کرکے یہ آیت پڑھی اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ (یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی۔ ان کی یہ تجارت فائدہ مند نہیں اور وہ ہدایت پانے والے نہیں)

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک نہایت خوبصورت یہودی کو دیکھا اور حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اس کو میرے پاس بھیج دے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ یہودی میرے پاس آکر کہنے لگا یا شیخ مجھے کلمہ شہادت پڑھائیں۔ چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا۔

اور شیخ ابو علی سیاہ رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ گدڑی پہننا کس کے لئے جائز ہے انہوں نے فرمایا کہ اس شخص کے لئے جو مملکت الٰہی کے تمام اسرار سے مطلع ہو۔ چنانچہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم جاری نہیں ہوتا مگر فاعلان

قضا و قدر اس کو اس سے آگاہ کردیتے ہیں۔ پس گدڑی اولیاء اللہ کا نشان اور مشائخ کی علامت ہے اور فقراء اور اہل تصوف کا لباس ہے۔ اگر کوئی شخص اولیاء اللہ کے لباس کو دنیا جمع کرنے اور اپنی خرابی چھپانے کا ذریعہ بنا لے تو اس وجہ سے اہل تصوف کو مورد الزام نہ ٹھہرایا جائے۔ اہل بصیرت کے لئے اتنا کافی ہے۔ ورنہ کتاب کا مقصد جو اختصار ہے فوت ہوجائے گا۔ وباللہ التوفیق ۔

از دردِ فراق اگر نالم چہ کنم
روز و شب اگر نہ در خیالم چہ کنم
میگوئی باتوام نہ ام ہرگز دُور
در عینِ حضور بی وصالم چہ کنم

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خُدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنُما
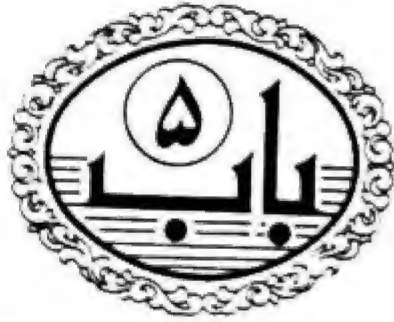
ترجمہ: فضیلتِ فقر و صفوت کے متعلق ارباب طریقت میں اختلاف ہے۔ بعض فقر کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض صفوت کو۔ جو لوگ فقر کو صفوت سے افضل سمجھتے ہیں ان کا کہنا کہ فقر فنائے تامہ ہے اور ماسوی اللہ سے انقطاع ہے۔ اور صفوت' فقر کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ کہ جب سالک مقام فنا فی اللہ میں پہنچ جاتا ہے تو تمام مقامات کا شعور مٹ جاتا ہے جیساکہ باب فقر و غنا میں بیان کیا گیا ہے۔ اور جو لوگ صفوت کو افضل قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ فقر ایک موجود چیز ہے اور اسم پذیر ہے اور صفوت ہے تمام مقامات کی صفائی یعنی عدم یا نہ ہونے کا نام جسے فنا کہا جاتا ہے۔ اس لئے وہ صفوت کو عین فنا اور فقر کو عین بقا قرار دیتے ہیں۔ پس فقر ایک مقام کا نام ہے اور صفوت ایک کمال کا نام ہے۔ غرض یہ کہ اس زمانے میں اس مضمون نے کافی طوالت پکڑی ہے۔ اور ہر شخص

دوسرے کو تعجب میں ڈالنے کی خاطر عجیب و غریب عبارات و الفاظ پیش کرتا ہے اور فقر و صفوت کے مابین اختلاف ظاہر کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ فقر کوئی علیحدہ مقام ہے نہ صفوت۔ لیکن لوگوں نے لفظی اختلاف (لفظی جنگ) پیدا کر رکھا ہے۔ اور حقیقت کو سمجھنے اور حقیقت تک پہنچنے سے روگردانی کر رکھی ہے۔ خواہشات نفسانی کی نفی کو حقیقی نفی اور خواہشات نفسانی کے اثبات کو حقیقی اثبات قرار دیتے ہیں۔

میں نے اپنے شیخؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ لوگ کس قدر بے حرمتی میں مبتلا ہو کر لوگوں کے سامنے مذاق بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ان پیروں کو مرید بڑھانے کا حرص اور ان مریدوں کو دولت کمانے کا حرص دامن گیر ہے۔ اور کوئی حرص دوسرے حرص سے اچھا نہیں ہوتا (یعنی حرص مذموم ہے) شیخ کامل کی اجازت (خلافت) کے بغیر مرید بنانے کا یہی حال ہوتا ہے کہ حرص و ہوا کی پرورش کی جاتی ہے۔

شرح آج کل یہ مرض بہت بڑھ گیا ہے اور **خلافتیں** ٹکے سیر بک رہی ہیں اور نام نہاد پیر جو داڑھی والا نمازی دیکھتے ہیں اسے فوراً خلافت پیش کرتے ہیں جس سے وہ خود بخود مرید بھی ہو جاتا ہے اور اسی وقت پیر بھی بن جاتا ہے۔ حالانکہ مشائخ عظام نے خلافت کے لئے جو شرائط مقرر کی ہیں یہ ہیں۔

سلوک الی اللہ تمام کرے اور فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مقامات طے کر کے صفات الٰہیہ سے متصف ہو چکا ہو تاکہ باطنی بصیرت سے مریدین کے قلوب کی امراض کا معائنہ کر کے علاج کر سکے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

ترجمہ لیکن موجود و مفقود (عدم موجود)، اور نفی و اثبات تمام قیام یا بقائے نفس کے ساتھ قائم ہیں اور جھوٹے دعویداروں کی اصطلاحات سے پاک اور مبرہ

ہیں۔ اور اولیاء اللہ کی پرواز اس قدر بلند ہے کہ وہاں مقامات اور درجات مٹ جاتے ہیں اور عبارت معانی کے اظہار سے عاجز آجاتی ہیں۔ وہاں نہ شرب باقی رہتا ہے نہ ذوق' نہ سکر و صحو وہاں جب یہ حضرات حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈتے ہیں تو الفاظ ہی نہیں ملتے۔ کیونکہ حقیقت اسماء و الفاظ سے بالاتر ہے۔ اس مقام پر افضلیت اور عدم افضلیت کا سوال اٹھ جاتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افضل ہے اور وہ غیر افضل۔

شرح اس مقام کو ذات لاتعین' ذات بحت اور ذات سازج کہتے ہیں جہاں نہ کوئی اسم ہے نہ اشارہ نہ رنگ' نہ بو' نہ سمت' نہ طرف' بس ذات ہی ذات ہے۔ سالکین کے اس مقام تک رسائی کو فناء الفناء یا فنائے فنا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یعنی فنا فی اللہ کا شعور بھی باقی نہیں رہتا کہ میں ذات حق میں فنا ہوں۔

ترجمہ پس بعض لوگوں کو نامِ فقر اچھا لگتا ہے اور اسے مقدم و افضل قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کا تعلق عجز و نیاز سے ہے اور بعض نامِ صفوت کو افضل قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ اس نام کو زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ اس کا تعلق کدورات اور آفاتِ نفس کی نفی سے ہے۔ ان دونوں الفاظوں کے ذریعے اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب چونکہ حقیقت کے اظہار کے لئے الفاظ ملنا محال ہیں یہ حضرات اشارات میں باتیں کرتے ہیں۔ لہٰذا جب نام ہی نہ ہو تو افضلیت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے لیکن جب لوگ کوشش کرکے نام اور الفاظ پیدا کرلیتے ہیں۔ جیسے فقر اور صفوت' تو پھر ان کی ایک دوسرے پر فضیلت بیان کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اور بعد میں آنے والے ارباب اللسان جو معنیٰ سے بے خبر ہوتے ہیں اس بحث کو جاری رکھتے ہیں اور ایک کو مقدم اور دوسرے کو مؤخر قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب الفاظ کی بحث ہے کیونکہ جہاں صوفیائے کرام کے

ہاں یہ معنوی بحث ہوتی ہے یہ لوگ الفاظ کی ظلمت میں ہوتے ہوئے بحث جاری رکھتے ہیں۔ لیکن جسے اس کی حقیقت معلوم ہوگئی وہ اسے اپنا قبلۂ دل بنا لیتا ہے اس وقت اس کو فقیر کہو یا صوفی اس کے لئے یکساں ہے۔ کیونکہ حقیقت الفاظ سے بالاتر ہے۔

اور یہ اختلاف شیخ ابو الحسن سمنون علیہ رحمہ کے وقت سے شروع ہوا کیونکہ وہ جب حالت بقاء میں ہوتے فقر کو صفوت پر ترجیح دیتے تھے۔ فقر کو ترجیح دینا الٹی بات تھی اس لئے لوگوں نے آپ سے اس کی وجہ دریافت کی لوگوں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ چونکہ مقام فنا اور فروماندگی میں بھی کمال ہے اور مقام بقاء اور الوہیت میں بھی کمال ہے جب میں مقام فنا میں ہوتا ہوں صفوت کو فقر پر ترجیح دیتا ہوں اور جب مقام بقاء میں ہوتا ہوں تو فقر کو صفوت پر ترجیح دیتا ہوں۔ جب میں حالت بقاء میں ہوتا ہوں تو مقام فنا کی خواہش ہوتی ہے ۔ اور جب مقام فنا میں ہوتا ہوں تو مقام بقاء کی خواہش ہوتی ہے تاکہ میری طبیعت سے فنا کی خواہش بھی نکل جائے اور بقاء کی بھی۔

شرح مقام فنا فی اللہ اور بقاء باللہ کی پہلے وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں مختصر طور پر اس قدر بتانے کی ضرورت ہے کہ جب کمالِ تزکیۂ نفس کے ذریعے انسانی روح میں قوت پرواز ہوتی ہے تو وہ روحِ حق یا ذاتِ حق میں واصل ہو جاتی ہے جو ہر چیز میں اور ہر جگہ طاری و ساری ہے۔ اب چونکہ ذاتِ حق کی کوئی انتہا نہیں، مراتبِ قرب اور وصل کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ عارف جس قدر پرواز کرتا ہے اوپر قرب کی اور منزل نظر آتی ہے۔ جب وہاں پہنچتا ہے تو اوپر اور منزل نظر آتی ہے۔ غرض یہ کہ پرواز ہمیشہ جاری رہتی ہے اور منازلِ قرب ختم نہیں ہوتیں۔ سعدیؒ نے اسی حالت کو یوں ظاہر کیا ہے۔ ۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

لہٰذا ہر عارف اپنی استعداد کے مطابق قرب کے اونچے سے اونچے مقام پر پہنچ کر نزول کرتا ہے اور اپنی انسانی ہستی میں واپس آتا ہے۔ اس واپسی کے مقام کو مقام بقاباللہ اور عبدیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس لئے شیخ سمنونؒ فرماتے ہیں کہ جب میں عروج یعنی مقام فنا میں ہوتا ہوں تو نزول یعنی مقام بقاء باللہ کی خواہش ہوتی ہے اور جب میں مقام نزول یعنی بقاء پر ہوتا ہوں تو عروج کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اب حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کا عرفان اور علومرتبت ملاحظہ ہو۔ آپ شیخ سمنون رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول کے متعلق کیا خوب صراحت فرماتے ہیں۔

ترجمہ لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کیونکہ نہ فنا کو بقاء ہے اور نہ بقاء کو فنا ہے کیونکہ جس شخص کو مقام فنا حاصل ہوتا ہے وہ اپنے آپ سے فانی ہوجاتا ہے (یعنی اپنی ہستی کو ذات حق میں گم کردیتا ہے) اس کے بعد جب وہ مقام فنا فی اللہ سے مقام بقا باللہ پر آتا ہے تو اپنی ہستی سے باقی ہوتا ہے یعنی اپنی انسانی ہستی میں واپس آتا ہے۔ فنا وہ اسم ہے کہ جس میں مبالغہ نہیں ہوسکتا۔

شرح فنا میں مبالغہ نہ ہوسکنے کا یہ مطلب ہے کہ کسی شخص کو پوری فنا حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ ذات حق کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لئے عارفین کا قول ہے کہ فنائے تامہ یا تکمیل ناممکن ہے جب فنا یا تکمیل کا نام لیا جاتا ہے تو اس سے مراد اضافی یا اعتباری تکمیل ہے نہ کہ حقیقی کیونکہ ذات حق میں مکمل فنا ناممکن ہے۔

ترجمہ جب کوئی کہتا ہے کہ مجھے فنا حاصل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے وجود کا اثر کم ہوگیا ہے نہ کہ وجود بالکل فنا ہوگیا ہے۔ کیونکہ جب تک

اپنے وجود یا اپنی ہستی کا احساس موجود ہے فنا مکمل نہیں ہوئی اور جب فنا میسر آگئی (یعنی بڑی حد تک فانی ہوگیا) تو پھر فنا کا فنا ہونا کیا ہے۔ یہ ارباب اللسان کی محض عبارت اور الفاظ ہیں (جن کی حقیقت کوئی نہیں) ہم نے بھی اوائل عمر میں فنا و بقاء کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن اس کتاب (کشف المحجوب) میں ہم باب فنا و بقاء میں احتیاط کے ساتھ اس پر بحث کریں گے۔ یہ ہے فقر و صفوت کا فرق لیکن تجرید دنیا (ترک دنیا) اور تجلی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس بحث کا نام فقر و مسکنت (مسکینی) ہو جاتا ہے۔

فقیر اور مسکین میں فرق

مشائخ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ فقیر افضل ہے مسکین سے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ (خیرات اور صدقات ان فقراء کا حق ہے جو اللہ میں مشغول ہیں اور روزی کمانے کے لئے دنیا میں نہیں پھر سکتے)۔ مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ ہو اور فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ فقر عزت ہے اور مسکینی ذلت ہے اس لئے مسکین طریقت میں ذلیل ہوتا ہے۔ جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ **تعس عبدالدنیا و تعس عبدالدرھم و تعس عبد الدینار و تعس عبدالخمیصۃ و القطیفۃ** (ہلاک ہو دنیا کا بندہ' ہلاک ہو دولت کا بندہ' ہلاک ہو دینار کا بندہ اور ہلاک ہو تھیلے تھیلی کا بندہ) لہٰذا تارک دنیا کا مرتبہ اس سے بلند ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ موجود ہو کیونکہ جس کے پاس کچھ ہے اس کا بھروسہ اپنی ملکیت پر ہوتا ہے اور جس کے پاس کچھ نہ ہو (فقیر) اس کا بھروسہ خداوند تعالیٰ پر ہوتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ مسکین افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا ہے کہ **اللّٰھم احینی مسکینا و امتنی مسکینا واحشر نی فی زمرۃ المساکین** (اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکینی کی حالت میں مجھے موت دے اور مساکین کے زمرہ میں مجھے اٹھا)

اور فقر کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **کاد الفقر ان یکون کفرا** (قریب ہے کہ فقر کفر ہوجائے) ان دونوں احادیث کے مطابق فقیر کی یہ تعریف ہوگی کہ کچھ ملکیت رکھتا ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور فقہاء کے نزدیک بھی فقیر وہ ہے جس کی کچھ ملکیت ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ لیکن اہل مقامات (صوفیائے کرام) مسکین کو صوفی کہتے ہیں۔ اس لئے وہ فقہاء سے متفق ہیں۔ جن کے نزدیک فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور صفوت افضل ہے فقر سے۔ یہ ہے فقر و صفوت کا مختصر بیان۔ واللہ اعلم بالصواب۔
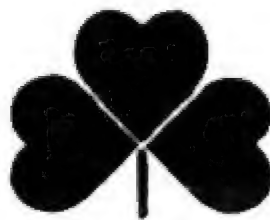
ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خُدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنُما
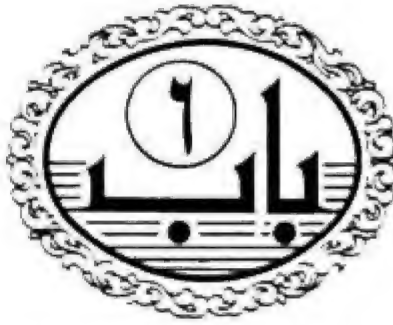
بعض مشائخ طریقت نے طریق ملامت کو اختیار کیا ہے۔ اور ملامت خلوص محبت میں بہت مؤثر اور محبوب چیز ہے اس لئے اہل حقیقت ہمیشہ ملامت خلق کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔ خصوصاً بزرگان دین۔ نیز خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو اہل حقیقت کے امام اور عاشقان الہی کے پیشوا ہیں' جب تک آپ پر وحی نازل نہیں ہوئی تھی سب کے نزدیک نیک نام اور بزرگ مانے جاتے تھے۔ لیکن خلعت دوستی (نبوت) کے ظاہر ہوتے ہی لوگوں نے زبان ملامت دراز کر دی۔ اور کسی نے آپ کو کاہن (جادوگر) کہا' کسی نے شاعر' کسی نے مجنون کہا اور کسی نے (نعوذ باللہ) کاذب کہا۔ نیز حق تعالی نے مؤمنین کی صفت اس آیت میں بیان فرمائی کہ وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے :

وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ○ (ملامت کرنے والوں کی ملامت سے خوف نہیں

کھاتے) حق تعالیٰ کی سنت (دستور) یوں جاری ہے کہ جو شخص حق تعالیٰ کا نام لیتا ہے لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں اور اس کو برا بھلا کہتے ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ ان کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھتا ہے اور یہ اس کی غیرت دوستی کا تقاضا ہے کہ اپنے دوستوں کو لوگوں کی نظروں سے غیب رکھتا ہے تاکہ ان کے جمال حال پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ نیز حق تعالیٰ اپنے دوستوں کو خود اپنا جمال حال بھی نہیں دیکھنے دیتا تاکہ مغرور نہ ہو جائیں۔ اور تکبر کی آفت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ خلقت کو ان کے خلاف لگا دیتے ہیں تاکہ ان پر لوگ ملامت کی زبان دراز کریں۔ نیز حق تعالیٰ اپنے دوستوں کے نفس لوامہ (ملامت کرنے والا ضمیر) کی بھی ڈیوٹی لگا دیتا ہے کہ وہ بھی ان کو ملامت کرے۔ چنانچہ جب خاصان خدا سے کوئی برا کام ہو جاتا ہے۔ تو ان کا نفس لوامہ ان کو ملامت کرتا ہے۔ اور اگر ان سے کوئی نیکی سرزد ہوتی ہے تو بھی نفس لوامہ ملامت کرتا ہے کہ جو کچھ کیا ہے بہت کم کیا ہے زیادہ کرنا چاہئے تھا۔

شرح قرآن مجید و فرقان حمید میں انسانی نفس کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں۔ اول نفسِ امّارہ یعنی سرکش نفس جو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ دوم نفس لوامہ جب کچھ تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے تو نفس میں سرکشی نہیں رہتی ہے بلکہ جب انسان برا کام کرتا ہے تو ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے۔ یہ نفس لوّامہ کہلاتا ہے۔ سوم نفسِ مطمئنہ۔ جب انسان کو کمال تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب نصیب ہوتا ہے تو اس کا نفس بالکل تابع فرمان ہوتا ہے اور راضی برضائے حق ہو جاتا ہے۔ نفس کی اس حالت کو نفس مطمئنہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

ترجمہ اور طریقت میں اس سے بڑا حجاب اور اس سے بڑی آفت اور کوئی نہیں کہ آدمی اپنی نیکی پر مغرور ہو جائے۔ غرور دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے ایک جاہ و مرتبہ اور لوگوں کی تعریف و آفرین کی وجہ سے۔ یعنی جب انسان کا کوئی کام

لوگوں کو اچھا لگتا ہے تو وہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ جس سے اس کے دل میں تکبر پیدا ہوتا ہے۔ دوسری چیز جس سے غرور پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کو خود پسند کرتا ہے اور اس وجہ سے مغرور ہو جاتا ہے۔ اور اس لئے حق تعالیٰ کمال شفقت سے اپنے دوستوں کو محفوظ رکھنے کی خاطر خلقت کو ان کے خلاف کر دیتا ہے تاکہ اگر ان کے اعمال برے ہوں تو لوگ ان کو نہیں چھوڑتے' اگر اچھے ہوں تب بھی لوگوں کی ملامت کی وجہ سے ان کے دل میں غرور پیدا نہیں ہوتا۔ پس جو شخص برگزیدۂ حق ہوتا ہے خلق اس کو پسند نہیں کرتی اور جو شخص اپنے تن کا غلام ہوتا ہے اس کو حق تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ جس طرح ابلیس کو جن و ملائک نے پسند کیا اور اس نے اپنے آپ کو بھی اچھا سمجھا۔ اس لئے حق تعالیٰ کے نزدیک راندۂ درگاہ ہوا۔ خلق کی تعریف اور ستائش نے اس کو لعنت کا سزاوار بنا دیا۔ ادھر آدم علیہ السلام کو ملائک نے پسند نہ کیا اور یہ اعتراض کیا کہ اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا (اے اللہ آپ ایسے آدمی کو پیدا کر رہے ہیں جو دنیا میں فساد مچائے گا) اب چونکہ آدم علیہ السلام کو نہ ملائک نے پسند کیا نہ انہوں نے اپنے آپ کو اچھا سمجھا اور اعتراف خطا کرتے ہوئے رب العزت کی بارگاہ میں عرض کی کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا (اے رب ہمارے ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا) اس لئے حق تعالیٰ کے برگزیدہ ہوئے۔ اور حق تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (اس سے نسیان ہو گیا اور ہم نے اس کے اندر ارادی طور پر ارتکاب خطا کو نہ پایا) پس خلق کا آدم علیہ السلام کو ناپسند کرنا اور ان کا اپنے آپ کو ملامت کرنا باعث رحمت ایزدی ہوا اور خلق کو معلوم ہو گیا کہ مقبول حق متروک خلق ہوتا ہے اور متروک حق مقبول خلق ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ملامت خلق دوستان خدا کی غذا ہے اور اس میں آثار قبولِ حق ہیں اس لئے طریق ملامت اولیاء کرام کا مشرب رہا ہے۔ لیکن عام لوگ قبولِ خلق

سے خوش ہوتے ہیں اور احادیث میں آیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا :

اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم غیری الا اولیائی (میرے اولیاء میری صدری کے نیچے پوشیدہ ہیں اور ان کو میرے سوا اور میرے دوستوں کے سوا کوئی نہیں پہچانتا)

شرح اس لئے بعض اولیاء کرام کمال صدق و خلوص کی بناء پر عمداً ایسے کام کرتے ہیں جس سے خلق میں بدنام ہو جائیں۔ اگرچہ بظاہر ان کے یہ کام خلاف شرع نظر آتے ہیں در حقیقت وہ خلافِ شرع نہیں ہوتے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

فصل

(ترجمہ) **اقسام ملامت** ملامت کی تین اقسام ہیں۔

(۱) راہ راست پر قائم رہنے کی وجہ سے ملامت کا نشانہ بننا۔

(۲) قصداً یعنی جان بوجھ کر ملامت کا نشانہ بننا۔

(۳) ترک شریعت کی وجہ سے بدنام ہو جانا۔

پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی شریعت کے مطابق کام کئے جاتا ہے اور لوگوں کی مدح و ذم کی پرواہ نہیں کرتا لیکن پھر بھی لوگ اسے ملامت کرتے ہیں۔ قصداً ملامت طلب کرنے کی صورت یہ ہے جب کسی بزرگ کی خلق خدا میں بہت قدر و منزلت ہوتی ہے جس سے اس کے دل میں خود پسندی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا علاج وہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ایسا کام کرتے ہیں جو شریعت کے خلاف نہ ہو لیکن لوگوں کو خلاف شرع نظر آئے۔ اس سے ان کو اطمینان قلب نصیب ہوتا

ہے اور حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ لیکن لوگ ان سے متنفر ہو جاتے ہیں اور ملامت کی زبان دراز کرتے ہیں۔ اور ملامت کی تیسری قسم یعنی ترک شریعت یہ ہے کہ کفر اور گمراہی میں ایک شخص مبتلا ہو جائے اور شریعت کے خلاف کام کرے لیکن لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ میں نے طریقِ ملامتیہ اختیار کیا ہے۔

لیکن وہ جو پہلی قسم کے لوگ ہیں راہ راست پر قائم رہتے ہیں ان کو نہ دوسری قسم کے اصحاب کی طرح نفاق اور ریا کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ خلق کی ملامت کی پرواہ کرتے ہیں اور ہر حال میں اپنے اصول پر قائم رہتے ہیں اور جس نام سے ان کو پکارا جائے ان کے لئے برابر ہوتا ہے۔ چنانچہ حکایات میں آیا ہے کہ ایک دن شیخ ابو طاہر عراقی گدھے پر سوار ہو کر بازار سے گزر رہے تھے اور ان کے ایک مرید نے باگ پکڑ رکھی تھی۔ کسی نے آواز دی کہ دیکھو پیرِ زندیق (بے دین) جا رہا ہے۔ اس سے ان کے مرید کو بہت غصہ لگا اور ڈنڈا لے کر اس آدمی کے پیچھے دوڑنے والا تھا۔ بازار کے لوگوں کو بھی اس شخص کی بات پسند نہ آئی اور جوش میں آگئے لیکن شیخ نے ان کو خاموش رہنے کی تلقین کی۔ جب گھر پر پہنچے تو انہوں نے مرید سے کہا کہ فلاں صندوق لے آؤ۔ انہوں نے صندوق میں سے کئی خطوط نکال کر مرید کو دکھائے کہ دیکھو کسی نے مجھے شیخ الاسلام کا لقب دیا ہے، کسی نے مجھے شیخ زکی اور شیخ زاہد کہا ہے اور کسی نے شیخ الحرمین لکھا ہے۔ لیکن میں ان تمام القاب و خطابات کا اہل اور مستحق نہیں ہوں اور ہر شخص نے اپنے اعتقاد کے مطابق مجھے یہ القاب دیئے ہیں اگر اس بیچارے نے اپنے اعتقاد کے مطابق مجھے زندیق کا لقب دیا ہے تو اس سے کیوں جھگڑتے ہو۔

اب رہے دوسری قسم کے لوگ جو قصداً اپنے آپ کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جاہ و مرتبہ اور ریا کو ترک کرتے ہیں ان کی مثال حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے کردار سے ملتی ہے کہ جب وہ باغ سے واپس

آئے تو سر پر ایندھن کا گٹھا اٹھائے ہوئے تھے حالانکہ ان کے چار سو غلام تھے۔ جب لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا صورت اختیار کر رکھی ہے تو فرمایا کہ **ارید ان اجرب نفسی** (میں اپنے نفس کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں) تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا مرتبہ مجھے اس کام سے باز رکھ سکتا ہے یا نہیں۔ اس حکایت سے طریق ملامتیہ کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی قسم کی ایک حکایت امام ابو حنیفہؒ کی ہے جو ان کے ذکر کے باب میں آرہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت ابو یزید علیہ رحمہ کے متعلق روایت ہے کہ جب حج سے واپس آئے تو شہر میں مشہور ہو گیا کہ آج پہنچنے والے ہیں اس لئے خلق خدا شہر سے باہر نکل آئی تاکہ ان کو عزت و احترام کے ساتھ لے آئیں۔ حضرت شیخ کو معلوم تھا کہ لوگ میرا استقبال کریں گے جس کی وجہ سے میرا دل ان کے ساتھ مشغول اور حق تعالیٰ سے غافل ہو جائے گا۔ اس لئے جب آپ بازار میں پہنچے تو اگرچہ یہ ماہ رمضان المبارک تھا انہوں نے جیب سے روٹی نکال کر کھانا شروع کر دی۔ چونکہ آپ مسافر تھے روزہ آپ پر فرض نہیں تھا لیکن ان کی یہ حالت دیکھ کر لوگ بھاگ گئے اور وہ اکیلے رہ گئے۔ یہ دیکھ کر آپ نے اپنے ایک مرید سے کہا جو باقی رہ گیا تھا کہ دیکھا میں نے شریعت کے ایک مسئلہ پر پابندی چھوڑ کر خلقت سے کیسے پیچھا چھڑایا۔ اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ اس زمانے میں ملامت کیلئے بظاہر برا کام کرنا پڑتا تھا لیکن آج کل کے زمانے میں اگر کوئی شخص ملامت چاہتا ہے تو اسے کہہ دو کہ دو رکعت نماز نفل لمبی کر دے یا شریعت کا پورا پابند ہو جائے ساری خلقت اسے فوراً منافق اور ریاکار کہنا شروع کر دے گی۔

اب رہا تیسرا گروہ جو ترک شریعت کرتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ میں نے یہ کام ملامت کیلئے کیا ہے یہ صاف گمراہی، کھلی آفت اور ہوا و ہوس ہے۔ چنانچہ بہت لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جن کی خلق سے کنارہ کشی دراصل اس لئے ہوتی

ہے کہ لوگوں میں زیادہ شہرت اور قبولیت ہو۔ کیونکہ مخلوقات سے کنارہ کشی کرنا اس کے لئے زیبا ہے جو پہلے مقبول خلائق ہو۔ لیکن جو شخص مقبول ہی نہیں ہے تو اس کے لئے کنارہ کشی کی کوشش کرنا دراصل مقبولیت حاصل کرنے کا ایک بہانہ ہے۔ مجھے اس قسم کے صوفی سے ایک دفعہ صحبت کا اتفاق ہوا۔ جب اس نے ایک غیر شرع کام کیا تو کہنے لگا کہ میں نے یہ کام ملامت کے لئے کیا ہے۔ اس پر ایک آدمی نے اس کو برا بھلا کہا جس کی وجہ سے وہ ناراض ہو گیا۔ میں نے اس صوفی سے کہا کہ آپ اس سے ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ اس نے اگر آپ کو برا کہا ہے تو یہ بھی آپ کے ملامتیہ مسلک کی تائید ہے اس کو اچھا سمجھو نہ کہ برا مناؤ۔ آپ کو غصہ ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہئے۔ نیز چونکہ آپ کا کام اسلام کی دعوت دینا ہے دعوت کیلئے دلیل درکار ہے اور دعوت کی واضح دلیل احترام شریعت ہے۔ جب آپ کا عمل خلاف شرع ہے تو یہ کہاں کی دعوت ہے یہ تو صریحی اسلام کی مخالفت ہے۔

فصل

ملامت کے متعلق مشائخ کے اقوال و لطائف

جاننا چاہئے کہ طریق ملامت کو پہلے پہل شیخ ابو حمدون قصار علیہ رحمہ نے رائج کیا اور اس بارے میں آپ کے اقوال لطیف ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ **الملامتہ ترک السلامتہ** (ملامت کا اختیار کرنا سلامتی کا ترک کرنا ہے)۔ اور جو شخص جان بوجھ کر سلامتی ترک کرتا ہے وہ آفات کو دعوت دیتا ہے اور اسے آرام و راحت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور طلب جاہ و مال اور خلق خدا سے نا امید ہونا پڑتا ہے اور دنیا سے بیزار ہونا پڑتا ہے اور جس قدر آدمی دنیا سے بیزار ہوتا

ہے حق تعالیٰ سے اسی قدر اس کا تعلق مضبوط ہوتا ہے۔

شرح اس کا یہ مطلب نہیں کہ گھربار' بال بچے چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دل میں دنیا کی محبت نہ ہو۔ دنیا میں رہے اور پھر دنیا کا نہ بنے۔ یہ ہے کمالِ درویشی۔ دریا کے اندر رہ کر دامن تر نہ کرنا بڑی بہادری ہے اور دریا کے نزدیک بھی نہ جائے اور کہتا پھرے کہ میرا دامن تر نہیں ہوا یہ کون سی بڑی بات ہے۔ صوفیاء کرام کے ترک دنیا سے یہی ترک محبت دنیا مراد ہے۔ یہ ترک روحانی ہوتا ہے نہ کہ جسمانی۔ کمال یہ ہے کہ جسمانی طور پر خلق میں رہے اور روحانی طور پر اس سے بیزار ہو۔

ترجمہ پس جس سلامتی کی طرف سارے جہان کا منہ ہوتا ہے اہل ملامت اس کی طرف پیٹھ موڑ لیتے ہیں۔ ان کی ہمت ساری خلقِ خدا کی ہمتوں سے علیحدہ ہوتی ہے بلکہ ان کی ہمت وَحدانی ہوتی ہے یعنی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ احمد فاتکؒ روایت کرتے ہیں کہ شیخ حسین بن منصورؒ (حلاج) سے لوگوں نے پوچھا کہ **من الصوفی** (صوفی کون ہوتا ہے) انہوں نے کہا **وَحدانی لی الذات** (صوفی اپنی ذات سے یکتا ہوتا ہے)۔خود شیخ حمدون رحمتہ اللہ علیہ سے جب پوچھا گیا کہ ملامت کیا ہے تو فرمایا کہ یہ بہت دشوار اور مغلق (مشکل) راستہ ہے لیکن میں اس کے متعلق کچھ بتاتا ہوں وہ یہ ہے کہ **رجاء المرجیہ و خوف القدریہ** (طریق ملامت فرقہ مرجیہ کی امید ہے اور فرقہ قدریہ کا خوف ہے۔)

شرح فرقہ مرجیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ عمل کی ضرورت نہیں ہے حق تعالیٰ اپنی بے پایاں رحمت سے سب کو بخش دیں گے۔ فرقہ قدریہ اس کے برعکس عمل کو نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور کوتاہیٔ عمل سے ہر وقت خائف رہتا ہے۔ فرقہ قدریہ کے لوگ تقدیرِ خداوندی کے بھی منکر ہیں اور انسان کو اپنے اعمال کا خالق

سمجھتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس فرقہ جبریہ ہے جو تقدیر الہٰی کے قائل ہیں اور عمل کو کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ لیکن حقیقت حال دونوں کے مابین ہے۔ انسان خودمختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ جس حد تک ایک کام کے کرنے میں اس کے جسم اور دل و دماغ میں طاقت اور قابلیت ہے اسی حد تک وہ فعل مختار ہے اور اس کام میں جس قدر قوت باری تعالیٰ اور قدرت الہٰی کا تعلق ہے وہ اس کے اختیار سے باہر ہے مثلاً جب ایک کسان کھیتی باڑی کرتا ہے اور رزق حاصل کرتا ہے تو جہاں تک ہل چلانے' پانی دینے اور بیج ڈالنے کا تعلق ہے یہ فعل بندہ ہے اس میں وہ خود مختار ہے اگر ہل چلائے گا' آب پاشی کرے گا اور بیج بوئے گا تو پھل پائے گا۔ لیکن پانی کا پیدا کرنا' زمین میں بیج اگانے کی طاقت پیدا کرنا اور بیج کے اندر پھل کا پوشیدہ رکھنا یہ فعل حق ہے اور بندہ کی طاقت سے باہر ہے۔ اس لئے ہر کام میں بندہ کی طاقت کا ہاتھ بھی ہے اور خداوند عالم کی طاقت کا بھی۔ لہٰذا انسان ایک حد تک خود مختار ہے لیکن جہاں معاملات اس کی طاقت سے باہر ہیں وہ مجبور مطلق ہے اس لئے شریعتِ حقہ کی رو سے ایمان قدر اور جبر کے درمیان ہے۔ نہ انسان کو پورا اختیار ہے نہ پوری مجبوری۔ عالم مجاز میں قدر ہے اور عالم حقیقت میں جبر۔ ہر کام کا فاعل حقیقی حق تعالیٰ اور فاعل مجازی انسان ہے۔

ترجمہ اور اس کے اندر ایک راز ہے یاد رہے کہ انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ جس قدر وہ مقبول خلق ہو گا خداوند تعالیٰ کی درگاہ سے اسی قدر بعید ہو گا۔ جب انسان کی کوئی شخص تعریف کرتا ہے تو اس بات کو وہ دل و جان سے پسند کرتا ہے اور حق تعالیٰ سے دور ہو جاتا ہے پس طالب کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ مقام خطا و خطر سے دور رہے۔ اس کوشش میں طالب کو دو خطرات کا سامنا ہوتا ہے ایک حجاب حق دوسرے ملامت خلق۔

شرح یعنی ملامت کی خاطر ایسا کام نہ کر بیٹھے جس سے حق تعالیٰ ناراض ہوں

اور لوگ اس کو گنہگار سمجھیں اور ملامت کریں اور لوگوں کے متعلق اس کا یہ خوف اس وجہ سے نہیں ہونا چاہئے کہ اس کی عزت اور مرتبہ میں کمی آئے گی بلکہ اس لئے کہ اس کی وجہ سے لوگ بھی وہی گناہ کا کام نہ کرنے لگ جائیں۔ اس لئے ملامتی کو چاہئے کہ اول تو لوگوں سے تمام دنیاوی اور اخروی امیدیں منقطع کرے اور جو کچھ وہ کہیں برداشت کرے۔ دوم یہ کہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو گناہ کبیرہ یا صغیرہ کی فہرست میں آتا ہو اور مردود خلائق بن جائے تاکہ اس کا خوف فرقۂ قدریہ کے خوف کے برابر مضبوط ہو اور اس کی امید فرقۂ مرجیہ کی امید کی طرح پکی ہو۔

ترجمہ درحقیقت ملامت کی محبت سے بہتر کوئی محبت نہیں۔ اس وجہ سے دوست کی ملامت کا دوست کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور دوست کو رضائے دوست کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اور اغیار کی باتوں کا اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کسی نے خوب کہا ہے :

اجد ملامته فی هواک لذ یذة لان الملامته روضته العاشقین و نزهته المحبین و راحته المشتاقین و سرور المرید ین (اے دوست تیری محبت میں میں نے ملامت جیسی لذیذ چیز کوئی نہیں دیکھی۔ کیونکہ ملامت عاشقوں کا باغ ہے' محبوں کی خوشبو' مشتاقوں کی راحت اور مریدوں کے دل کا سرور ہے) اور ساری کائنات میں صرف یہی ایک گروہِ عاشقان (ملامتیہ) ہے جو سلامتیٔ دل کیلئے ملامت کیلئے کوشاں ہے۔ نہ دوسرے مقربین' نہ جن نہ ملائک کو یہ درجہ حاصل ہے۔ اور گذشتہ امتوں میں جو عابد' زاہد' راغب اور طالب حق ہو گزرے ہیں ان کو یہ مرتبہ حاصل نہ تھا اور ہماری امت کے صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جو سالکان **انقطاع** دل ہیں (یعنی دنیا کی محبت سے پاک ہیں)۔

حضرت مخدوم ہجویریؒ کے نزدیک ملامت ریاکاری ہے

لیکن میرے نزدیک ملامت ریا (دکھلاوا) ہے اور ریا عین منافقت ہے۔ کیونکہ ریاکار اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ لوگ اسے قبول کریں اور ملامتی یہ کوشش کرتا ہے کہ لوگ اس کو رد کریں۔ اس سے ظاہر ہے کہ دونوں خلق میں جتلا ہیں۔

شرح ایک قبول خلق میں دوسرا رد خلق میں۔

ترجمہ اس سے باہر وہ نہیں جاسکے۔ کوئی اس بات میں گرفتار ہے کوئی اس میں۔

حضرت مخدومؒ کے نزدیک صفت درویش

لیکن درویش وہ ہے جس کے دل میں خلق خدا کا خیال ہی نہیں گزرتا۔ اور جب دل خلق سے سرد ہوجائے تو قبول خلق یا رد خلق اس کے لئے بے معنی ہیں۔ اور وہ کسی چیز کا پابند نہیں رہتا۔ ایک دفعہ مجھے ماورا النہر کے **ملامتوں** میں سے ایک شخص کے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ہنسی مذاق میں ان سے کہا کہ بھائی ان شوریدہ کاموں (ملامت کے کاموں) سے تمہارا مقصد کیا ہے۔ اس نے جواب دیا "تاکہ لوگوں کی نظروں سے گر جاؤں" میں نے کہا خلق خدا بیشمار ہے اور تمہاری عمر کم ہے کب تک ساری خلقت سے پیچھا چھڑاؤ گے۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم خلق کو اپنی نظروں میں گرا دو۔ تاکہ اس فکر سے آزاد ہو۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بعض لوگ خلقت کے ساتھ مشغول ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ خلقت ان کے ساتھ مشغول ہے۔ اس لئے جب تم اپنے آپ کو نہیں دیکھو گے تو کوئی بھی تم کو نہیں دیکھے گا۔ یہ ساری مصیبت تمہاری اپنی نظر کی پیدا کردہ

ہے۔ تجھے غیر سے کیا کام۔ جس شخص کا علاج پرہیز ہو اور وہ غذا سے علاج کرے تو اس سے زیادہ بے وقوف کون ہے۔

خواجہ ابراہیم بن ادھمؒ کی مراد کب پوری ہوئی

بعض حضرات تزکیۂ نفس کی خاطر ملامتی طریقہ اختیار کرتے ہیں تاکہ بدنامی کی وجہ ان کو روحانی ترقی حاصل ہو۔ اس لئے وہ اپنے نفس کو ذلیل کرکے خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ رحمہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی مراد کب پوری ہوئی۔

شرح یعنی آپ کا فتح باب کب ہوا۔ ہر بزرگ کا کسی نہ کسی کام سے فتح باب ہوتا ہے یعنی غیب کا دروازہ کھلتا ہے۔

ترجمہ آپ نے فرمایا کہ دو موقعوں پر میرے دل کی مراد پوری ہوئی۔ ایک اس وقت جب میں کشتی میں سوار تھا اور سب لوگ مجھے حقیر جان کر مجھ سے ٹھٹھا مخول کررہے تھے کیونکہ میرے کپڑے پھٹے پرانے اور سر کے بال پراگندہ تھے۔ کشتی میں ایک مسخرہ بھی تھا جو ہر وقت آکر میرے بال نوچتا تھا حتیٰ کہ جب اس کو پیشاب کی ضرورت ہوئی تو اس نے اٹھ کر مجھ پر پیشاب کردیا۔ اس وقت (ذلت نفس کی وجہ سے) مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ دوسرا موقع یہ تھا کہ سخت سردی کا موسم تھا' سخت بارش ہو رہی تھی اور میں رات کے وقت سفر کررہا تھا۔ میرا مرقعہ پانی سے تر ہوچکا تھا اور میرے جسم پر سردی کے مارے لرزہ طاری تھا۔ اس حالت میں میں ایک مسجد کے اندر پناہ لینے کی خاطر داخل ہوا لیکن لوگوں نے مجھے باہر نکال دیا۔ دوسری مسجد میں گیا تو وہاں بھی یہی سلوک ہوا۔ تیسری مسجد میں داخل ہونے کی کوشش کی تو وہاں بھی لوگوں نے اندر نہ آنے دیا۔ ناچار میں ایک حمام کی طرف دوڑا جہاں آگ جل رہی تھی اور سردی

کے مارے میں نے اپنے آپ کو آگ میں پھینک دیا جس سے میرے کپڑے اور منہ سیاہ ہو گئے۔ اس رات بھی میری مراد پوری ہوئی۔

حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کا اپنا واقعہ

اور میں کہ علی بن عثمان الجلابی ہوں میرے ساتھ بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ مجھے ایک مشکل پیش آئی۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن مشکل حل نہ ہوئی آخر میں نے حضرت بایزید بسطامیؒ کے مزار پر قیام کیا جس سے وہ نکتہ حل ہو گیا۔ اس کے بعد ایک اور مشکل پیش آئی جس کی عقدہ کشائی کے لئے میں تین ماہ تک حضرت بایزید علیہ رحمہ کے مزار پر مجاور رہا۔ اور ہر روز تین بار غسل کرتا تھا اور تیس بار وضو تازہ کرتا تھا لیکن مشکل حل نہ ہوئی۔ اس کے بعد میں نے خراسان کا سفر اختیار کیا اور رات کے وقت ایک گاؤں میں پہنچا جہاں ایک خانقاہ تھی اور اس کے اندر کچھ صوفی لوگ مقیم تھے۔ اگرچہ میں نے مرقعہ پہن رکھا تھا لیکن انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہ شخص ہم میں سے نہیں ہے۔ اور کسی حد تک وہ سچ بھی کہہ رہے تھے کیونکہ میں ان میں سے نہیں تھا۔ ناچار انہوں نے مجھے ایک مکان کی چھت پر رہنے کو کہا۔ اور خود اس سے اوپر والی منزل پر مقیم تھے۔ انہوں نے مجھے ایک سوکھی روٹی کھانے کو دی جو سبز ہو چکی تھی۔ اور خود اچھے کھانے کھا رہے تھے جن کی خوشبو مجھے آ رہی تھی۔ وہ لوگ اوپر بیٹھے مجھ پر مذاق کر رہے تھے اور خربوزہ کھا کر اس کے چھلکے مجھ پر پھینک رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا کہ بار خدایا اگر یہ لوگ فقراء کے لباس میں نہ ہوتے تو میں ان کی یہ حرکات ہرگز برداشت نہ کرسکتا۔ لیکن وہ جس قدر مجھے ستاتے تھے مجھے اسی طرح خوشی محسوس ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ اس ذلت کی وجہ سے میرا وہ اشکال (مسئلہ) حل ہو گیا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ کس وجہ سے مشائخ عظام جہلاء کو اپنی صحبت میں رہنے کی اجازت دیتے ہیں اور کیوں ان کی بے ہودہ حرکات برداشت کرتے

ہیں۔ یہ ہیں احکام طریق ملامت جو میں نے تحقیق سے بیان کردیئے ہیں۔ بتوفیق اللہ تبارک و تقدس۔

ہر لحظہ بشکل آں بتِ عیار بر آمد گہہ پیر و جوان شد
ہر دم بلباس دگر آں یار بر آمد دل برد و نہاں شد
ہر لحظہ بشکل آں بت عیار بر آمد
گہہ پیر و جواں شد
ہر دم بلباس دِگر آں یار بر آمد
دل برد و نہاں شد
خود کوزہ و خود کوزہ گرو خود گِل آں کوزہ
خود رند سبوکش
خود بر سرآں کوزہ خریدار بر آمد
بشکست و رواں شد
نے نے کہ ہمیں بود کہ مے آمد و مے رفت ہر قرن کہ دیدیم
تا عاقبت اشکل عرب وار بر آمد دارائے جہاں شد
رومی سخن کفر نگفتہ است و نگوید منکر مشودیدش
کافر شدہ آں کس کہ بہ انکار بر آمد مردودِ جہاں شد
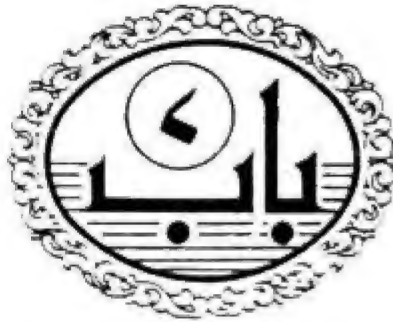
اب ہم صحابہ کرامؓ میں ان ائمہ (جمع امام) اصحاب کا ذکر کرتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے بعد مہاجرین و انصار میں سے معاملاتِ طریقت اور روحانی احوال و مقامات میں صوفیاء کرام کے پیشوا ہیں۔ تاکہ تصوف و طریقت کا صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے ثبوت بہم پہنچایا جائے۔

امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

شیخ الاسلام' خیرالانام بعد از انبیاء علیہم السلام' امام و سید اہلِ تجرید' و شہنشاہ ارباب تفرید' از آفات انسانی بعید' امیر المومنین حضرت ابوبکر عبداللہ بن عثمان الصدیق رضی اللہ عنہ۔حقائق و معارف میں آپ کی کرامات مشہور اور علامات و شواہد ظاہر ہیں۔ آپ کی صوفیانہ زندگی کے کچھ حالات یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔ آپ کی طرف سے روایات کے کم ہونے کی وجہ سے مشائخ عظام

آپ کو ارباب مشاہدہ کا سردار قرار دیتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ارباب مجاہدہ کا پیشوا سمجھتے ہیں۔

شرح مشاہدہ و مجاہدہ۔ مشاہدہ سے مراد ذات حق کا قرب و وصال ہے اور مجاہدہ سے مراد حصول قرب کی جدوجہد ہے۔ لیکن یہ مشاہدہ روحانی یا باطنی آنکھوں سے ہوتا ہے نہ کہ جسمانی بصارت سے۔ بعض علماء کے نزدیک قیامت سے پہلے رویت (دیدار) حق ناممکن ہے۔ لیکن مشائخ عظام نے مشاہدۂ حق کو اسی ناسوتی زندگی میں بھی ممکن کہا ہے اور مقام فنا فی اللہ جو اس زندگی میں حاصل ہوتا ہے سے مراد یہی مشاہدہ ہے جو باطنی بصیرت سے حاصل ہوتا ہے یعنی سِر کی آنکھوں سے نہ کہ سَر کی آنکھوں سے۔ عرفاء کا قول ہے مَن جَھدَ وَجدَ (جس نے جدوجہد کی اس نے پایا)۔ لہٰذا مجاہدہ ذریعہ ہے اور مشاہدہ مقصود بالذات ہے۔

ترجمہ احادیث میں آیا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ رات کے وقت نماز میں قرآن پڑھتے تو آہستہ (پست آواز) سے تلاوت کرتے تھے اور حضرت عمرؓ بلند آواز سے تلاوت کرتے تھے۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ کس وجہ سے قرآن آہستہ پڑھتے ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ **اسمع من اناجیہ** (جسے میں پکارتا ہوں وہ سنتا ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ بلند آواز سے کیوں تلاوت کرتے ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ **اوقظ الوسنان ای النائم و اطرد الشیطان** (سوتوں کو جگانے کے لئے اور شیطان کو بھگانے کے لئے)۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول مشاہدہ پر مبنی ہے اور حضرت عمرؓ کا قول مجاہدہ پر اور مقام مشاہدہ کے مقابلہ میں مقام مجاہدہ ایسے ہے جیسے سمندر میں قطرہ۔ یہی وجہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ **ھل انت الا حسنۃ من حسنات ابوبکر** (یعنی حضرت عمر رضی

اللہ عنہ کی نیکی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نیکیوں کا ایک حصہ ہے) حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بلندیٔ مقام کا یہ حال ہے کہ آپ کے دم سے عزت اسلام قائم ہے۔ اس سے باقی لوگوں کے مقامات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کیا تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا **دارنا فانیۃ و احوالنا عاریۃ و انفاسنا معدودۃ و کسلنا موجودۃ** (ہماری دنیا فانی ہے' ہماری زندگی **عاریۃ**" ہے' ہمارے سانس گنے ہوئے ہیں اور ہماری غفلت ظاہر ہے)۔ لہٰذا سرائے فانی میں مقام کرنا جہالت ہے' اور عاریتی زندگی کا بھروسہ بے سود' اور گنتی کے چند سانسوں پر اعتماد کرنا غفلت ہے۔ کیونکہ جو چیز **عاریۃ**" ملی ہے وہ جلدی واپس لے لی جائے گی اور جو چیز فانی ہے باقی نہیں رہتی۔ اور جو چیز گنتی میں آسکتی ہے ختم ہوجاتی ہے اور غفلت کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس لئے آپ نے ہمیں متنبہ فرمایا ہے کہ دنیا کی کوئی حقیقت نہیں کہ جس کے ساتھ آدمی دل لگا کر بیٹھ جائے کیونکہ جب تو فانی میں مشغول ہوتا ہے تو باقی (حق تعالیٰ) سے محجوب ہوجاتا ہے۔ لہٰذا نفس اور دنیا دونوں طالب کے لئے حجاب بن جاتے ہیں خدا اور اس کے درمیان۔ اس لئے عاشقان الٰہی ان دونوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ کیونکہ جو چیز **عاریۃ**" ملتی ہے وہ کسی اور کی ملکیت ہوتی ہے اور دوسروں کی ملکیت میں دست درازی کرنا عقلمندی نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ فرمایا **اللّٰھم ابسط لی الدنیا و زھدنی منھا** (اے اللہ میرے لئے دنیا فراخ کر اور پھر مجھے اس کی آفت سے محفوظ رکھ)۔ پہلے آپ نے دنیا کی فراخی کی دعا مانگی اور پھر اس سے پناہ مانگی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ مجھے دنیا عطا کر تاکہ اس کا شکر ادا کروں اور پھر اس کو صرف کرکے نیکی کماؤں۔ اور دنیا کے ہونے اور نہ ہونے میں شکر اور صبر دونوں نعمتوں سے سرفراز ہوسکوں۔ اور مفلسی کی حالت میں اضطرار سے بچ سکوں۔ اور فقر کو

مستحکم پکڑوں۔ اور یہ بات اس بزرگ کے قول کے خلاف ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ اضطراری فقر بہتر ہے اختیاری فقر سے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ اگر فقر میں اضطرار ہے تو وہ فقیر کی پیداوار ہے اگر اختیاری ہے تو فقیر اس کی پیداوار ہے۔

شرح فقر اختیاری یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر مال خرچ کردے اور نادار بن جائے اور فقر اضطراری یہ ہے کہ مجبوراً فقر اختیار کرنا پڑے۔ پہلی صورت میں فقیر اپنے فقر کا پیدا کرنے والا ہے اور دوسری صورت میں فقر غالب ہے اور فقیر مغلوب۔

ترجمہ اور جو شخص فقر کو بغیر ارادہ یعنی بلا اختیار قبول کرتا ہے بہتر ہے اس سے جو جان بوجھ کر اختیار کرتا ہے۔

حضرت مخدوم سید علی ہجویری ؒ کا فیصلہ

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فقر اس وقت افضل ہوگا جب دولت کی حالت میں فقیری کی خواہش دل پر غالب آجائے اور انسان محبوبہ دنیا سے دل کو ہٹا دے نہ کہ اس وقت جب آدمی مفلس ہے اور دولت کی تمنا اسے امراء اور سلاطین کے درباروں میں جانے پر مجبور کرے۔ لہٰذا بہتر فقر وہ ہے جو غنا کو ترک کرکے اختیار کیا جائے نہ کہ مفلسی میں غنا طلب کرے۔

شرح اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مخدوم ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک فقر اختیاری افضل ہے فقر اضطراری سے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا شیوہ تھا۔

ترجمہ چونکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ انبیاء علیہم السلام کے بعد بہترین

خلائق ہیں اس لئے کسی کا مشرب آپ کے مشرب سے زیادہ بلند نہیں ہو سکتا۔ لہذا فقر اضطراری سے فقر اختیاری افضل ہے اور تمام مشائخ طریقت کا یہی مسلک ہے۔ سوائے اس ایک بزرگ کے کہ جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔

امام زہری رحمتہ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ خلافت کے بعد پہلا خطبہ جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دیا یہ تھا۔ **"واللہ ما کنت حریصا علی الامارۃ یوما ولا لیلتہ قط ولا کنت فیھا راغبا ولا سالتھا اللہ قط فی سر و علانیہ و مالی فی الامارۃ من راحتہ"** (خدا کی قسم مجھے خلافت کا ہرگز حرص نہ تھا اور نہ کسی دن یا رات کو میرے دل میں اس کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور نہ مجھے اس کی کوئی رغبت تھی۔ اور نہ میں نے خداوند تعالیٰ سے ظاہر یا باطن میں اس کی تمنا کی اور نہ مجھے اس سے کوئی خوشی ہوئی ہے)۔

شرح جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے غلامانِ غلامانِ غلام یعنی عام اولیاء اللہ کی یہ حالت تھی کہ بادشاہی کو ٹھکرا کر فقیری اختیار کرتے رہے تو آغوش نبوت کے پروردہ اصحاب کرام کے دل میں کس طرح دنیائے دون کی خواہش داخل ہو سکتی تھی۔ اگر ان کو خلافت کی تمنا ہوتی تو خلیفہ بن کر اپنی دنیا سنوارتے' اور امراء و سلاطین کی طرح زندگیاں بسر کرتے۔ لیکن خلفاء راشدین کے فقر اور ناداری کا یہ حال تھا کہ جَو کی روٹی کے سوا نہ کھاتے تھے اور پھٹے پرانے کپڑے پہن کر بادشاہی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

ترجمہ جب خداوند تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو کمال صدق کے مقام پر فائز کرتا ہے اور اسے مقام تمکین پر متمکن کرتا ہے تو وہ فرمان الٰہی کا منتظر رہتا ہے کہ آیا اسے فقیری کا حکم کرتا ہے یا امیری کا۔ اگر فقیری کا حکم صادر ہوتا ہے تو فقر اختیار کرتا ہے۔ اگر امیری کا حکم ہوتا ہے تو وہ امارت اختیار کرتا ہے اور اس میں

اپنے تصرف یا اختیار کو دخل نہیں دینے دیتا۔ جیسا کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے ابتداء سے انتہا تک فقر اور تسلیم و رضا کو پسند کیا۔ اس لئے صوفیاء کرام کا جن کے امام اور مقتدا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں، بھی یہی فقر و تسلیم و رضا مسلک ہے اور امارت و ریاست کی تمنا نہیں کرتے۔

شرح "تلوین" و "تمکین" تصوف کی دو اصطلاحات ہیں۔ لفظ تلوین لون سے مشتق ہے جسکا مطلب ہے رنگ۔ سالکین راہ طریقت پر ابتداء میں کیف و مستی کا غلبہ ہوتا ہے اور ان کی حالت بدلتی رہتی ہے اس حالت کو تلوین کہا جاتا ہے۔ یہ حالت تلوین مقام فنا فی اللہ کا خاصہ ہے۔ لیکن جب سالک مقام بقا باللہ پر فائز ہوتا ہے تو اس کی حالت میں پختگی اور سکون آجاتا ہے جسے تکوین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہی منتہیوں کا مقام ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر سالک غلبۂ سکر و استغراق سے نکل کر صحو اور ہشیاری پر آتا ہے اور اپنے فرائض منصبی یعنی فرائضِ خلافتِ الٰہیہ انجام دیتا ہے۔ و دیگر زندگی کے امور کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ خواجہ حافظؒ کے مندرجہ ذیل شعر میں مقام تلوین ترک کر کے مقام تکوین کی خواہش کا اظہار ہے۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں رو
رندی و ہوسناکی در عہدِ شباب اولیٰ

اس غزل کا مطلع تو تلوین، سکر و استغراق و مستی و محویت میں ڈوبا ہوا ہے ۔

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولیٰ
وین دفترِ بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

لیکن مقطع میں تکوین غالب ہو رہی ہے۔

امیرالمؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

سپہ سالارِ اہل ایمان و سردارِ اہلِ احسان، امام اہل تحقیق، و اندر بحر محبت غریق، ابو حفص عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کرامات میں مشہور، فراست اور صلابت میں معروف ہیں۔

شرح کرامت سے مراد مافوق العادت کام ہیں۔ جو اگر نبی سے سرزد ہو تو معجزہ اور غیر نبی سے سرزد ہو تو کرامت کہلاتا ہے۔ فراست سے مراد ہے باطنی نظر جسے بصیرت بھی کہتے ہیں بصارت کا مطلب جسمانی بینائی ہے۔

ترجمہ تصوف و طریقت میں آپ کے اقوال بہت لطیف ہیں۔ چنانچہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ **الحق ینطق علیٰ لسان عمر** (عمر کی زبان پر حق تعالیٰ بولتا ہے۔) نیز فرمایا **قد کان فی الامم محدثون فان یک منھم فی امتی فعمر** (اگلی امتوں میں محدث ہوئے ہیں اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو عمرؓ ہے)۔

شرح محدث سے مراد وہ بزرگ ہے جو باطنی بصیرت کی بناء پر فیصلہ دے اور آنے والے واقعات کی بھی خبر دے۔

ترجمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقوال طریقت بہت لطیف ہیں جو پوری طرح اس کتاب میں نہیں آسکتے۔ آپ فرماتے ہیں **العزلتہ راحتہ من خلطاء السوء** "بری صحبت سے عزلت (گوشہ نشینی) بہتر ہے۔"

اقسام عزلت

عزلت کی دو اقسام ہیں اول خلقت سے اعراض دوم خلقت سے قطع تعلق۔

اعراض از خلق کا یہ مطلب ہے کہ خلق کی صحبت چھوڑ کر تنہائی میں بیٹھ جائے اور خلق خدا کے عیوب پر نظر کرنے کی بجائے اپنے عیوب کو دیکھے' لوگوں کے شر سے محفوظ رہے اور اپنے شر سے لوگوں کو بچائے۔ لیکن **انقطاع از خلق** کا مطلب یہ ہے کہ خلق کے درمیان رہے لیکن دل خلق خدا سے نہ لگائے اور دنیا کی کوئی چیز اسے نہ لبھا سکے۔ اور ہروقت حق تعالی کا خیال اس پر غالب رہے۔ اس وقت اگرچہ وہ خلق کے درمیان ہوتا ہے۔ خلق خدا سے بیگانہ ہوتا ہے اور دنیا کی کوئی چیز اسے فریفتہ نہیں کرسکتی۔ یہ مقام بہت بلند اور بعید ہے۔

شرح بعید کا مطلب یہ ہے کہ مجاہدات کے بعد آخر میں جا کر حاصل ہوتا ہے۔

ترجمہ اور یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقام ہے کہ بظاہر خلق کے درمیان رہ کر خلافت اور امارت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور بباطن خدا تعالی کے ساتھ پیوست تھے۔ اور اہل باطن کے مقام کا یہی خاصہ ہے کہ بظاہر خلق کے ساتھ رہتے ہیں اور بباطن خدا کے ساتھ رہتے ہیں اور ہر حال میں اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔

شرح اس دائمی توجہ کو قرآن عظیم میں صلوۃِ دوام کے نام سے موسوم کیا گیا ہے حق تعالی فرماتے ہیں اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ لیکن علمائے ظواہر اس آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ وہ پنجگانہ نماز پڑھتے ہیں حالانکہ ان کے اس مفہوم سے دوام کا مفہوم ختم ہوجاتا ہے جو آیۂ مذکور کی روحِ رواں ہے۔ دائمی کا مطلب ہے بلا تعطل۔ مشائخ عظام اس حال کو مراقبۂ ذات کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس کے بغیر وہ ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتے۔

ترجمہ خلق کے ساتھ جتنی دیر ان کو رہنا پڑتا ہے اسے یہ حضرات آفت و بلا

تصور کرتے ہیں اور اس سے حق تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ کیونکہ دنیا اہل اللہ کو راست نہیں آتی۔ جیساکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے **دار اسست علی البلای بلابلوی محال** (دنیا کی بنیاد بلا ہے اور بلا میں سکون محال ہے)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شمار خواص صحابہ کرام میں ہوتا ہے اور آپ کے تمام افعال بارگاہ حق تعالیٰ میں مقبول تھے۔ حتیٰ کہ ابتدائے اسلام میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ **یا محمد قد استبشر اهل السماء الیوم باسلام عمر** (یا محمدؐ آج تمام فرشتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے پر خوشیاں منا رہے ہیں)۔ اور صوفیاء کا مرقعہ کا لباس اختیار کرنا بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنت ہے کیونکہ آپ ہر حال میں خلق خدا کے امام ہیں۔

شرح حضرت مخدوم سید علی ہجویری سید ہیں اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدحت سرائی کر رہے ہیں **فا عتبروا یا اولی الابصار** شیعہ حضرات غور کریں۔

امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

گنجِ حیاء، و اعبدِ اہل صفا، و متعلق درگاہِ رضا، و متحلی بطریقِ مصطفیٰؐ ابو عمر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے فضائل ظاہر ہیں۔ اور مناقب بیشمار ہیں۔

شرح گنجِ حیا کا مطلب ہے شرم و حیاء کا خزانہ، اعبدِ اہلِ صفا کا معنی ہے کہ اہل اللہ میں سے سب سے زیادہ مقام عبدیت کا حامل، متعلق درگاہِ رضا کا مطلب ہے تسلیم و رضا آپ کا خاصہ ہے اور متحلی بطریق مصطفیٰؐ سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی وجہ سے آپ مورد تجلیات الٰہی تھے۔

ترجمہ حضرت عبداللہ بن رباح رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب آپ اپنے گھر میں محصور ہو چکے تھے تو ہم دونوں آپ کے ساتھ تھے۔ جب باغیوں نے آپ پر حملہ کیا تو آپ کے خادموں نے ہتھیار سنبھال لئے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کوئی ہتھیار نہ اٹھائے آج میں نے سب کو آزاد کیا۔ یہ سن کر ہم باہر آئے۔ راستے میں حضرت امام حسنؓ بن علی رضی اللہ عنہ ملے۔ ہم ان کے ساتھ حضرۃ عثمانؓ کی خدمت میں واپس آئے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ کس کام کے لئے آئے ہیں۔ امام حسن رضی اللہ عنہ نے اندر آکر سلام کیا اور ان کی اس مصیبت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا اے امیرالمومنین میں آپ کے حکم کے بغیر مسلمانوں پر تلوار نہیں اٹھاتا۔ آپ امام برحق ہیں آپ حکم کریں تاکہ میں باغیوں کی گردنیں اڑا دوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا : **یا ابن اخی ارجع و اجلس فی بیتک حتی یاتی اللہ بامرہ فلا حاجتہ لنالی اھراق الد ماء** (اے میرے برادر زادے واپس جایئے اور اپنے گھر میں بیٹھ جایئے یہاں تک کہ حق تعالیٰ کی تقدیر معلوم ہوجائے کیونکہ میں مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا) اور یہ علامت ہے تسلیم و رضا کی مصیبت و بلا کے وقت۔ اور یہ درجۂ خلّت ہے (یعنی مقام دوستی یا ولایت حق ہے)۔ اسی طرح جب نمرود لعین نے آگ جلائی اور منجنیق کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے اندر پھینکا تو راستے میں حضرت جرائیل علیہ السلام نے پہنچ کر کہا : **ھل لک من حاجتہ** (میرے لائق کوئی خدمت ہے)۔ آپ نے فرمایا ہے۔ **اما الیک فلا** (مجھے ضرورت ہے لیکن تمہارے سے نہیں)۔ جرائیل علیہ السلام نے کہا تو پھر حق تعالیٰ سے حاجت طلب کیجئے۔ آپ نے فرمایا **حسبی من سوالی علمہ بحالی** (مجھے وہ ذات پاک کافی ہے۔ مجھے سوال کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بہتر جانتا ہے

کہ میرے لئے بھلائی کس بات میں ہے)۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی وہ کام کیا جو خلیل اکبر علیہ السلام نے منجنیق میں کیا۔ باغیوں کا حملہ ان کے لئے آتشِ نمرود کا قائم مقام تھا اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرح امداد کی خاطر آن پہنچے تھے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نجات ملی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہلاکت کا سامنا ہوا۔ نجات کا تعلق مقام بقاء سے ہے اور ہلاکت کا مقام فنا سے۔ اور فنا و بقاء کے متعلق ہم نے اس سے پہلے کچھ اشارات بیان کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ عظام کا مسلک ہے مال و جان کا قربان کرنا اور حق تعالیٰ کی رضا کے ساتھ راضی رہنا۔ کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اہل طریقت و حقیقت اور شریعت کے امام ہیں۔

نوٹ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علیؓ اور امام حسنؓ کی محبت شیعہ حضرات کے لئے قابل غور ہے۔

امیرالمؤمنین حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ

برادر مصطفیٰؐ و غریق بحر بلا و حریقِ نار ولا و مقتدائے جملہ اولیاء و اصفیاء حضرت ابوالحسن علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا طریقت میں مقام بے حد بلند اور درجہ نہایت ارفع و اعلیٰ ہے۔ اور آپ کے اقوال حقائق و معارف کی جان ہیں یہاں تک حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ : **شیخنا فی الاصول و البلاء علی المرتضی کرم اللّٰہ وجہہ** (اصولِ طریقت اور بلا کی برداشت میں حضرت علی المرتضیٰ ہمارے امام ہیں)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم طریقت کو اہل طریقت علم اصول کہتے ہیں۔ اور طریقت کیا ہے۔ مجاہدات اور مصائب برداشت کرنے کا نام ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے آپ کی

خدمت میں آکر عرض کیا کہ مجھے وصیت کیجئے۔ آپ نے فرمایا "اپنے اہل و عیال کا زیادہ فکر نہ کرو کیونکہ اگر آپ کے اہل و عیال اہل اللہ ہیں تو حق تعالیٰ اپنے اولیاء کو برباد نہیں کرتا اور اگر وہ اہل اللہ نہیں ہیں بلکہ اعداء اللہ یعنی خدا کے مخالف ہیں تو خدا کے دشمنوں کا غم کھانے کی ضرورت نہیں۔" اس قول کا مطلب غیر اللہ سے دل کا قطع کرنا ہے کیونکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کو جس طرح چاہتا ہے رکھتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کو مشکل حالات میں خدا کے سپرد کر کے چلے گئے اور جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام' بی بی ہاجرہؓ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بیابان میں لے گئے اور خدا کے سپرد کردیا اور ان کے متعلق فکر کو روا نہ رکھا اور حق تعالیٰ کے سوا کسی کے ساتھ دل نہ لگایا۔ حتیٰ کہ ان حضرات کو عین نامرادی میں دوجہان کی مراد مل گئی یعنی حق تعالیٰ کی رضا کے ساتھ راضی رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی اسی حقیقت پر مبنی ہے۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ پاکیزہ ترین کسب کیا ہے۔ آپ نے فرمایا **غناء القلب باللّٰہ** (حق تعالیٰ کے ساتھ دل کا غنی ہونا) جو دل حق تعالیٰ کے ساتھ غنی ہے مال و دولت کا نہ ہونا اسے مفلس نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی مال و دولت کے ہونے سے اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس قول کی حقیقت مضمون فقر و صفوت سے تعلق رکھتی ہے جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے۔ پس اہل طریقت کے لئے لازم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقوال مبارک پر عمل کریں جو حقائق و معارف سے لبریز ہیں۔ آپ کے اقوال شمار سے باہر ہیں جن کی اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں۔
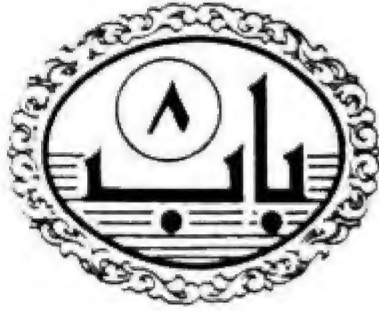
ویسے تو تمام اہل بیتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم طہارت ازلی سے مخصوص ہیں اور روحانیت کے میدان میں ان میں سے ہر ایک کا مقام بہت بلند ہے اور تمام کے تمام اربابِ طریقت کے راہنما اور پیشوا ہیں' یہاں اختصار کی خاطر صرف چند حضرات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

حضرت امیر المؤمنین امام حسنؓ بن علیؓ

جگر بندِ مصطفیٰؐ و ریحانِ دلِ مرتضیٰؓ' قرۃ العین زہراؓ' ابو محمد حسن بن علی رضی اللہ عنہم کا طریقت میں مقام بہت بلند تھا اور حقائق و معارف میں آپ کے کلمات بہت لطیف ہیں یہاں تک کہ آپ نے وصیت فرمائی کہ **علیکم بحفظ السرائر فان اللہ مطلع علی الضمائر** (تمہارے لئے اسرار قلب کی حفاظت لازمی ہے کیونکہ حق تعالی قلوب کا جاننے والا ہے)۔ اسرار قلب کی حفاظت سے

مراد غیر اللہ سے قلب کو خالی رکھنا ہے اور حفظِ ضمائر سے مراد احکام خداوندی کی مخالفت سے باز رہنا ہے۔

شرح حفظ السرائر کیا ہے۔ سِرّ کے معنی ہیں راز اور سرائر اس کی جمع ہے۔ مطلب یہ کہ اپنے روحانی حال اور مقام کو بحال رکھو اور دنیا کی کوئی چیز یا کوئی کام اس حال میں خلل انداز نہ ہونے پائے۔ حال سے مراد عارضی کیفیتِ قلب ہے اور جب وہ کیفیت دوام پکڑ لیتی ہے تو مقام کہلاتی ہے۔ بالفاظ دیگر جب سالک پر شروع میں فنا فی اللہ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں تو اسے "حال" کہتے ہیں اور جب فنا میں دوام اور پختگی حاصل ہو جاتی ہے تو اسے "مقام" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ حفظِ سرائر کا مطلب یہ ہے کہ خواہ تم پر حال طاری ہو یا مقام اس پر مضبوطی سے جمے رہو کیونکہ حق تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تمہارے احوال (جمع حال) اور مقامات پر دنیاوی امور کیا اثر ڈال رہے ہیں۔

مسئلہ قدر و جبر کے متعلق آپ کا ارشاد

جب فرقہ قدریہ کا غلبہ ہوا اور معتزلہ عقائد عام ہوئے تو حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے امیرالمؤمنین حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ عریضہ لکھا۔

ترجمہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم السلام علیکم ۔ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بیٹے اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔ آپ تمام اصحابِ بنو ہاشم بحرِ مواج میں امت کیلئے جہاز کی مانند ہیں اور اندھیروں میں مینارِ نور اور ہدایت کے جھنڈے ہیں اور ایسے ھادی اور راہنما ہیں جو آپ کی پیروی کرے منزلِ مقصود کو پہنچتا ہے آپ کا خاندان حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہے کہ جس کا سہارا لے کر امت کے لوگ نجات پاتے ہیں۔ اے ابن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ! مسئلۂ جبر و قدر کے متعلق آپ کا کیا فرمان ہے کیونکہ اس وقت ساری خلقت حیران و پریشان ہے۔ آپ انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہیں اور علم الٰہی سے بخوبی آگاہ ہیں اور وہی آپ کا محافظ اور نگہبان ہے اور آپ حضرات حق تعالیٰ کی طرف سے امت کے محافظ ہیں۔

جواب حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ جواب دیا۔

ترجمہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ السلام علیکم ۔ آپ کا خط ملا جس میں آپ نے اپنی اور ہماری امت کی حیرانی کے متعلق لکھا ہے۔ میری رائے اس مسئلہ کے متعلق یہ ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ ہر خیر و شر (نیک و بد) منجانب اللہ ہے وہ کافر ہے اور جس نے معاصی یعنی گناہ کے کاموں کا حق تعالیٰ کو ذمہ دار ٹھہرایا وہ فاسق و فاجر ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کسی کو جبراً نیکی کراتا ہے نہ جبراً گناہ کراتا ہے۔ اور نہ ہی اس کی حکومت سے کسی کو چون و چرا کی مجال ہے۔ جن چیزوں میں حق تعالیٰ نے بندوں کو مالک بنایا ہے ان کا اصلی مالک وہ خود ہے اور جن چیزوں پر اس نے بندوں کو قادر بنایا ہے ان کا اصلی قادر بھی وہ آپ ہے لہٰذا اگر کوئی حق تعالیٰ کی فرمانبرداری کا ارادہ کرے تو وہ اس کو منع نہیں کرتا اور نافرمانی کا قصد کرے تو اس کو روکتا نہیں۔ ہاں اگر وہ از راہ کرم و احسان انسان کو برائی سے روک دے تو روک سکتا ہے اور اگر وہ ان کو برائی سے نہ روکے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے اس کو برائی پر مجبور کیا اور ان پر جبر لازم آتا ہے حق تعالیٰ نے ان کو نیک یا بد کام کرنے کی قوت عطا فرما کر اپنی حجت قائم کر دی کہ نیک و بد کی ذمہ داری انسان پر ہے۔ خدا پر نہیں ہے اور حجت اللہ غالب ہے۔ والسلام۔

شرح اس زمانے میں فلسفۂ یونان سے متأثر ہو کر بعض اہلِ اسلام کے دلوں

میں اسلام کے چند ادق اور مشکل مسائل پر کچھ شکوک و شبہات پیدا ہو گئے اور قدریہ و جبریہ دو گروہ پیدا ہو گئے تھے اور دونوں فرقے قرآن و حدیث سے اپنے عقائد ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ فرقہ قدریہ کا موقف یہ تھا کہ فعل نیک و بد پر انسان قادر ہے جو چاہے کر سکتا ہے اور فرقۂ جبریہ کا یہ عقیدہ تھا کہ نیک و بد کام کرانے کی طاقت اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے چاہے نیکی کا حکم دے جسے چاہے بدی کا حکم دے۔ لیکن ان دونوں فرقوں کے عقائد اسلامی عقائد کے خلاف ہیں۔ کیونکہ انسان نہ مطلقاً خود مختار ہے اور نہ وہ مطلقاً مجبور ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ حقیقتِ حال قدر اور جبر کے مابین ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی یہ بات نہایت ہی معنی خیز اور حق پر مبنی ہے کہ جن چیزوں پر حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حاکم یعنی مختار بنایا ہے دراصل ان کا حاکم اور مختار بھی اللہ عز و جل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ہر کام کرنے کی جو طاقت' قدرت اور ذہانت ملی ہوئی ہے وہ بھی حق تعالیٰ کی دی ہوئی ہے اس لئے اگر انسان ہر نیک و بد کام کرنے کی طاقت اور عقل رکھتا ہے تو ایک حد تک وہ اپنی طاقت و عقل استعمال کر کے وہ فعل کرتا ہے اور اس کا فاعل خود کہلا سکتا ہے لیکن چونکہ اس کی طاقت کا اصلی منبع و مصدر حق تعالیٰ ہے اس لئے اس فعل میں ایک لحاظ سے حق تعالیٰ کا بھی ہاتھ ہے۔ لہٰذا اہل سنت و الجماعت کا عقیدہ یہ ہے جو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمرانی برحق ہے اور نیکی و بدی کی جو طاقت انسان کو ملی ہے وہ دراصل اللہ کی طاقت ہے لہٰذا ایک لحاظ سے انسان فعل مختار ہے اور ایک لحاظ سے مجبور ہے اس لئے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا **الامر بین الامرین** (حقیقت دونوں کے درمیان ہے) مثلاً جب ایک آدمی کھیتی باڑی کر کے روزی کماتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسے رزق دینے

والا میں ہوں۔ حالانکہ سب کام اس آدمی نے خود کئے ہیں۔ ہل بھی اسی نے چلائے ہیں' بیج بھی اسی نے ڈالا ہے اور آبپاشی بھی اسی نے کی ہے لیکن چونکہ ہل چلانے کی قوت کا دینے والا اللہ عزوجل ہے' نیز زمین میں روئیدگی کی طاقت اور بیج سے پھل پیدا کرنے کی قدرت اور پانی میں نشوونما کی طاقت حق تعالیٰ نے رکھی ہے اس لئے ایک لحاظ سے حصولِ رزق کسان کے ہاتھ میں ہے اور ایک حد تک (اور بڑی حد تک) حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس لئے بزرگوں کا قول ہے کہ **مختار فی فعلہ و مجبور فی اختیارہ** (یعنی انسان جو چاہے کر سکتا ہے لیکن جو چاہے چاہ نہیں سکتا) اور یہی ہے مطلب اس عقیدہ کا کہ ایمان قدر و جبر کے درمیان ہے اور حضرت مخدوم ہجویری قدس سرہٗ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ بندہ مختار است اندر کسب خود بمقدار استطاعش از خدائے عزوجل و دین مامیان قدر و جبراست "بندہ اپنے فعل میں اس قدر مختار ہے جس قدر اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے طاقت ملی ہے اور ہمارا مذہب قدر و جبر کے درمیان ہے"

ترجمہ اس خط کے نقل کرنے میں میری مراد یہ ہے کہ یہ خط فصاحت و بلاغت سے لبریز اور حقائق سے پُر ہے اور اس سے یہ ثابت کرنا بھی مقصود تھا کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا علوم حقائق و معارف میں کس قدر درجۂ بلند ہے۔

حکایات میں آیا ہے کہ کوفہ میں حضرت امام حسنؓ ابن علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر کے دروازہ پر تشریف فرما تھے کہ صحرا سے ایک دیہاتی آیا اور آتے ہی اس نے آپ کو اور آپ کے والدین کو گالیاں بکنا شروع کر دیں آپ نے فرمایا کہ اے اعرابی تجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔ اگر کھانا یا پانی کی ضرورت ہے تو میں لا دوں گا۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور گالیاں بکتا رہا کہ تم ایسے ہو اور تمہارے ماں باپ ایسے ہیں۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے نوکر سے کہا کہ ایک

تھیلہ چاندی سے بھرا ہوا لا کر اسے دے دو نیز فرمایا کہ اے اعرابی مجھے معاف رکھنا اس وقت میرے گھر میں اس کے سوا کچھ نہیں ہے ورنہ تجھ سے باز نہ رکھتا۔ یہ سن کر اعرابی نے کہا : **اشهد انک ابن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم** "مجھے اب یقین ہو گیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بیٹے ہیں" میں آپ کے حلم کو آزمانے کیلئے آیا تھا اور فی الواقع اولیاء اور مشائخ کی یہی صفت ہے کہ ان کے لئے خلق کی مدح و ذم (تعریف اور مذمت) برابر ہے اور لوگوں کے برے کلمات سے متاثر نہیں ہوتے۔

امیر المؤمنین حضرت امام حسینؓ ابن علیؓ

شمع آلِ محمدؐ از جملۂ علائقِ مجرد، سید زمانۂ خود حضرت امام ابو عبداللہ حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔ آپ قبلۂ اہل بلا اور شہید کربلا ہیں اور یہ بات آپ کی بلندیٔ حال پر دلالت کرتی ہے کہ جب تک حق کی متابعت ہوتی رہی آپ تابع حق رہے اور جب حق تعالیٰ کی نافرمانی شروع ہوئی تو آپ نے تلوار اٹھا لی اور جب تک حق پر جانِ عزیز قربان نہ کی سکون سے نہ بیٹھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بہت صفات حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اندر تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک دفعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت امام حسینؓ کو (حالتِ طفل میں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی پشت پر بٹھایا ہوا ہے۔ آپؐ نے ایک رسی منہ میں ڈالی ہوئی ہے جس کا ایک سرا امام حسین رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا ایک دوسرا سرا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے دوسرے ہاتھ میں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں یہ ماجرا دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ **نعم الجمل جملک یا ابو عبداللّٰہ** "اے ابو عبداللہ آپ

کا اونٹ کیسا اچھا ہے" یہ سن کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا **نعم الراکب ھو یا عمر** "اے عمر کیا ہی اچھا سوار ہے" حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اقوالِ طریقت اور حقائق و معارف بہت لطیف اور اسرار و رموز سے لبریز ہیں۔ آپ فرماتے ہیں **اشفق الا خوان علیک دینک** "تمہارا سب سے زیادہ مشفق دوست تمہارا دین ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نجات دین میں اور اس کی ہلاکت دین کی مخالفت میں ہے پس عقلمند انسان وہ ہے جو اپنے مشفق دوست کے فرمان پر چلتا ہے اور اس کی متابعت کے بغیر کوئی کام بھی نہیں کرتا اور بھائی وہ ہے جو نصیحت کرے اور شفقت کا دروازہ بند نہ کرے۔ حکایات میں آیا ہے کہ ایک دن ایک آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے میں ایک غریب عیالدار آدمی ہوں اور آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ رات کا کھانا عطا ہو۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا ذرا سی دیر بیٹھ جاؤ کیونکہ میرا رزق آ رہا ہے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک آدمی نے آ کر دینار کے پانچ تھیلے آپ کے سامنے رکھ دیئے اور ہر تھیلے میں ایک ہزار دینا تھے۔ قاصد نے کہا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ معذرت کر رہے تھے فی الحال یہ رقم خرچ کیجئے اس کے بعد اور ارسال کروں گا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ تھیلے اس آدمی کو دے دو نیز آپ نے اس سے کہا کہ معاف کرنا آپ کو اس ذرا سی رقم کے لئے بہت انتظار کرنا پڑا۔ اگر معلوم ہوتا کہ اتنی تھوڑی رقم آ رہی ہے تو آپ کو انتظار کی زحمت نہ دیتا۔ ہم لوگ اہل بلا ہیں ہم نے دنیا کی راحتوں سے کنارہ کشی کر رکھی ہے اور دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم سمجھتے ہیں۔

شرح سبحان اللہ ! کیا ہی بلند مقام ہے حضرت امام رضی اللہ عنہ کا کہ ایک

غریب آدمی رات کا کھانا طلب کرتا ہے اور اس کو پانچ ہزار دینار عطا فرما کر معذرت فرما رہے ہیں کہ انتظار زیادہ کرائی اور دیا کم ہے یہ سخاوت اور دنیا سے اس قدر بے اعتنائی ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ

وارثِ نبوت و چراغِ امت، سیدِ مظلوم و امامِ مرحوم، زینِ عباد، و شمعِ اوتاد، ابوالحسن علی زین العابدین بن حسین بن علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اپنے زمانے کے سب سے بڑے ولی اللہ تھے اور آپ کا رتبہ کشفِ حقائق و بیانِ دقائق میں بہت بلند ہے۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ سعید ترین انسان کون ہے۔ فرمایا : **من اذا رضی لم یحمله رضاه علی الباطل و اذا سخط لم یخرجه سخطه من الحق** (وہ شخص کہ جب راضی ہو تو باطل پر راضی نہ ہو اور جب غصہ کرے تو اس کا غصہ اس کو حق سے خارج نہ کرے)۔ اور یہ حق پرستوں کا کمال ہے کہ باطل کی پیروی بھی باطل ہے اور غصہ میں آکر حق سے دست بردار ہونا بھی باطل ہے اور مومن باطل کو پسند نہیں کرتا۔ روایت ہے کہ جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بچوں کو میدان کربلا میں شہید کر دیا گیا۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ تو ان کے سوا کوئی زندہ نہ بچ سکا کیونکہ اس وقت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ علیل تھے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو علی اصغر کہا کرتے تھے جب اہل بیت کو ننگے اونٹوں پر (بغیر کجاوہ و بالان) سوار کرکے یزید بن معاویہ (خدا اس کو رسوا کرے نہ کہ اس کے والد کو) کے پاس لے گئے تو کسی نے آپ سے پوچھا کہ یا اہل بیت آپ کا کیا حال ہے آپ نے جواب

دیا کہ **اصبحت من قومنا بمنزلت قوم موسیٰ من ال فرعون یذبحون ابناء هم و یستحیون نسله هم فلا ندری صباحنا من مساء نا من حقیقته بلاء نا** (ہمارے ساتھ وہی سلوک ہوا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے ساتھ فرعون نے کیا تھا یعنی ان کے بیٹوں کو ذبح کردیا اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھا اور ہم اس قدر بلا و مصیبت میں مبتلا ہیں کہ نہ دن کا پتہ ہے نہ رات کا)۔ اور ہم اس کی نعمت پر شکر ادا کرتے ہیں اور اس کی مصیبت پر صبر اختیار کرتے ہیں۔

حکایات میں آیا ہے کہ ایک دفعہ جب خلیفہ ہشام بن عبدالملک بن مروان حج کو گیا تو طواف کے دوران اس نے حجر اسود کو بوسہ دینے کی کوشش کی لیکن ہجوم اس قدر تھا کہ وہاں تک پہنچ نہ سکا۔ اس کے بعد اس نے منبر پر بیٹھ کر خطبہ شروع کیا۔ اس وقت حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی طواف کررہے تھے۔ جب انہوں نے حجر اسود کو بوسہ دینے کا قصد کیا تو ساری خلقت ایک طرف ہٹ گئی اور آپ نے اطمینان سے بوسہ دیا یہ دیکھ کر بادشاہ کے ایک مصاحب نے کہا کہ اے ہشام تجھے کسی نے حجر اسود تک پہنچنے نہیں دیا۔ بادشاہ تو ہے یا وہ خوبصورت نوجوان جس کے سامنے سے ساری خلقت ہٹ گئی ہے۔ ہشام نے کہا مجھے معلوم نہیں وہ کون ہے اس وقت فرزدق شاعر بھی موجود تھا۔ اس نے کھڑا ہوکر باآواز بلند کہا کہ میں جانتا ہوں کہ وہ جوان کون ہے۔ لوگوں نے کہا ہاں ابو فراش بتاؤ وہ کون ہے۔ اس نے کہا زرا کان کھول کر سنو میں بتاتا ہوں کہ وہ کون ہے۔ اس کے بعد اس نے یہ قصیدہ شروع کردیا۔ شاعر کے عربی کلام کو مترجم نے یوں بیان کیا ہے۔

یہ جوان وہ ہے کہ چومنے کو جس کے قدم
ہے ترستی سرزمین عرب و عجم

تو کیا جانے کہ یہ فاطمہؓ کا لال ہے
اور جس کے نانا پہ ہوئی نبوت ختم

بہترین و مہترین لوگوں کی یہ اولاد ہے
ہے تقی و نقی و طاہر و صاحب قلم

چہرہ اس کا چاند ہے اور چودھویں کا چاند ہے
یا آفتاب جہاں دور ہوں جس سے ظلم

شرم و حیاء جس کی صفت اور رعب بھی
خوب روئی، خوبصورتی ہو جس پر ختم

ہے قریشی ہاشمی اعلیٰ نسب
صاحب اخلاق بھی ہے اور اہل کرم

جن مراتب پر ہے رسائی شاہ کی
ان تلک پہنچا نہیں کوئی عرب نہ عجم

جن کے نانا ہیں فضیلت میں بلند
سب نبیوں سے اور امتش خیرالامم

کون ہے جو اس کے آگے آسکے
جب وہ چاہے چومنا بیت الحرم

اس کی زلفوں میں ہے خوشبوئیں کھیلتی
ماند ہیں جن سے جہاں کی سب شمم

وہ شاخ ہے ایسے شجر کی جس کا
نام ہے خیرالبشرؐ خیرالامم

وہ کون ہے تو جانے تضمینؓ
وہ بادشاہ ہے بادشاہِ عرب و عجم

ہاتھ میں خیر ہے اس کے اور لطف بھی
وہ لطف و کرم جو ہو کبھی نہ کم

اس کی آمد سے اجالا ہوگیا ہے جابجا
اور دور بھاگے ہیں سبھی جور و ستم

کوئی نہیں اس جیسا سخی اندر جہاں
نہ ہی دیکھا ہے کسی نے آپ جیسا محترم

قحط سالی میں ہے وہ باران کرم
اور جنگ میں بھی جما دیتا ہے قدم

خلق کا پتلا ہے وہ اور سیرت کا دھنی
حسن ہی سب حسن ہے از سر تا قدم

ہے محبت دین کی اس پر سوار
کس قدر اس پہ ہے اللہ کا کرم

اہل تقویٰ ' اہل علم و اہل ذوق
اہل حسن و اہل خوبی' اہل کرم

ہو کوئی گر مفلس و نادار و غنی
سب پہ ہوتا ہے شہا تیرا کرم

دی شرافت و نزاکت اس کو اللہ نے
ہیں ثناء خواں جس کے سب لوح و قلم

ہر شرافت ہر فضیلت ہر کرم
ہوتا ہے آخر آن کر اس پر ختم

حق پہ قائم، حق پہ دائم ہے وہی
اس کے گھرانے سے ملا ہے دینِ محترم

کون ہے دنیا میں یارو جہاں میں سچ کہو
اس کے سامنے گردن ہو جس کی نہ خم

پھر بھی تونے کہا میں نہ جانوں کون ہے
یہ سراسر جھوٹ ہے اے مبتلائے رنج و غم

جب اس شاعر نے اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت میں اس قسم کے اور شعر بھی پڑھے تو خلیفہ ہشام کو سخت غصہ لگا اور حکم دے دیا کہ اسے قلعہ عسفان میں قید کردیا جائے جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان واقعہ ہے۔ جب اس بات کا پتہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لگا تو آپ نے فرزوق کے پاس بارہ ہزار درھم ارسال فرمائے اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ ہمیں معذور رکھنا اس وقت ہمارے پاس اس رقم کے سوا کچھ نہیں تھا۔ فرزوق نے وہ رقم یہ کہہ کر واپس کردی کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے میں نے سلاطین کی مدحت کرکے بہت دروغ گوئی کی ہے اور بہت کمایا ہے اب

اپنے گناہوں کے کفارہ کے لئے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کی مدحت سرائی کی ہے اس لئے آپ یہ رقم واپس لے لیجئے تو نوازش ہوگی۔ جب حضرت امام رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام ملا تو آپ نے کہلا بھیجا کہ اگر تمہیں ہمارے ساتھ محبت ہے تو یہ رقم قبول کر لو کیونکہ ہم جو کچھ اپنی ملکیت سے خارج کرتے ہیں اس کو واپس نہیں لیتے۔ اس پر اس نے رقم قبول کر لی۔ حضرت امام رضی اللہ عنہ کے مناقب اس قدر ہیں کہ اس چھوٹی سی کتاب میں ان کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

حضرت امام ابو جعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ

حجتِ اصحابِ معاملت، و برہانِ اربابِ مشاہدت، امام اولادِ نبیؐ و برگزیدہ نسلِ علیؓ حضرت امام ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بن علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم کی کنیت ابو عبداللہ بھی تھی اور آپ کا لقب باقر تھا۔ قرآن حکیم کے حقائق و معارف کے بیان میں آپ بہت مشہور تھے اور آپ کی کرامات اور تصرفات ظاہر تھے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ بادشاہِ وقت نے آپ کے قتل کا ارادہ کرکے آپ کو اپنے پاس بلایا لیکن جب آپ آئے تو بادشاہ نے بہت معذرت کی اور تحائف دے کر رخصت کیا۔ جب لوگوں نے اس سے پوچھا کہ قتل کے ارادہ کے بعد یہ تحائف پیش کرکے واپس بھیجنا کیا معنی رکھتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ جب وہ میرے پاس آئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو شیر، ایک آپ کے دائیں طرف اور ایک آپ کے بائیں طرف کھڑے مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اگر تم نے ان کو قتل کیا تو ہم تجھے مار دیں گے۔

ایک آیت قرآن کی صوفیانہ تفسیر

آیت مبارکہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (جس نے شیطان کا

کہا نہ مانا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا) کی تفسیر میں آپ نے فرمایا ہے کہ جو چیز تجھے حق تعالیٰ کے مشاہدہ سے بعض رکھے وہ تیرے لئے طاغوت ہے۔ اب تجھے یہ دیکھنا ہے کہ کس چیز نے تجھے مشاہدہ حق سے محجوب کردیا ہے تاکہ اسے راستے سے ہٹا کر واصل باللہ ہو اور حجاب کی محرومی سے نجات پائے کیونکہ جو شخص محجوب ہے وہ دعوۂ قرب نہیں کر سکتا۔

شرح اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ ہماری زندگی میں کون سی چیزیں ایسی ہیں جو ہمیں قرب و وصال اور مشاہدہ حق سے مانع ہیں۔ یعنی کس وجہ سے ہم عبادت اور ریاضت اور مجاہدہ نہیں کرتے کیونکہ جو چیزیں ہمیں مشاہدہ اور قرب حق جیسی بلند ترین اور اعلیٰ و ارفع نعمتوں سے باز رکھ رہی ہیں ان سے پیچھا چھڑانا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو سب سے بڑی رکاوٹ جو ہمارے راستے میں حائل ہے ہماری نفسانی خواہشات ہیں یعنی دنیا کی محبت' دولت کمانے کا شوق' عزت و شہرت اور نام و ناموس کا عشق' تکبر اور خود پسندی' غرور اور حرص و ہوس وغیرہ اور یہ تمام چیزیں مشاہدۂ حق' قربِ حق' اور وصالِ حق اور معرفتِ حق کے مقابلہ میں نہایت ہی ہیچ' ادنیٰ' بے قیمت اور بے وقعت ہیں کیونکہ دولت' شہرت اور جاہ و جلال سب عارضی اور فانی چیزیں ہیں۔ عارضی اور فانی چیزوں سے دل لگا کر قرب و وصالِ حق تعالیٰ جیسی نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہ جانا عقل مندی کا کام نہیں ہے۔ بلکہ نہایت ہی حماقت اور بدنصیبی اور محرومی ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ ہم سب کو اس محرومی اور بدنصیبی سے بچائے۔ آمین۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شیطان لعین کو ہم کہاں تلاش کرتے رہے اور نکلا کہاں۔ ہم تو اسے باہر مندروں' گرجا گھروں اور بت خانوں میں مقیم سمجھتے تھے لیکن اس کو تو ہم نے اپنے اندر بیٹھا حکمرانی کرتا ہوا پایا جو ہمیں بہترین' بلند ترین اور عظیم ترین نعمت سے محروم کررہا ہے۔

ترجمہ روایت ہے کہ جب کچھ رات گزر جاتی اور آپ اوراد وغیرہ سے فارغ ہو جاتے تو آپ یہ مناجات باواز بلند کہتے :

"یا الٰہی و یا سیدی ! اب رات ہو گئی ہے' بادشاہوں کی بادشاہی ختم ہو چکی ہے' آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں' خلقِ خدا نیند میں مشغول ہے' اور گم سم ہو گئی ہے' لوگوں کی آوازیں ختم اور ان کی آنکھیں بند ہو گئی ہیں۔ امیروں کے دروازوں پر لوگوں کے مجمعے باقی نہیں رہے' سلاطینِ بنو امیہ آرام میں ہیں ان کے دروازے بند ہو گئے ہیں اور ان پر پہرہ دار کھڑے پہرہ دے رہے ہیں اور تمام حاجت مند لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں۔ لیکن بار خدایا تو زندہ و پائندہ اور دانندہ ہے۔ تو غنودگی اور نیند سے پاک ہے۔ جو شخص تیری ان صفات کو نہیں پہچانتا وہ تیری نعمتوں کا کیسے مستحق ہو سکتا ہے۔ یا الٰہی تو وہ ہستی ہے کہ کوئی چیز تیری ان صفات عالیہ کو نہیں روک سکتی اور نہ تیرے کاموں میں دن رات کو کوئی خلل واقع ہو سکتا ہے۔ تیری رحمت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ جو شخص تیری بارگاہ معلی میں سوالی آتا ہے خالی نہیں جاتا۔ تو وہ مالک الملک ہے کہ کسی سائل کو محروم کرنا تو روا نہیں رکھتا' بارے خدایا زمین و آسمان میں جو بھی تیرے در پر آتا ہے تو اسے خالی نہیں جانے دیتا۔ جب میں موت' قبر اور حساب و کتاب کو یاد کرتا ہوں تو دنیا کی ہر چیز بھول جاتا ہوں۔ بس میں تجھے چاہتا ہوں' تجھے ایک جانتا ہوں اور سب کچھ تجھ سے مانگتا ہوں۔ یا اللہ ! مجھے مرگ بے عذاب' حال بے حساب اور حیات بے عتاب عطا کر۔"

یہ مناجات کرتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ ایک دن میں نے آپ سے دریافت کیا کہ یا سیدی و یا سید آبائی ! آپ اس قدر کیوں روتے ہیں اور آہ و بکا کرتے ہیں ! فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک یوسف گم ہو گیا تھا اور اس قدر روئے کہ بینائی جاتی رہی اور آنکھیں سفید

ہو گئیں اور میں اپنے والد ماجد سمیت اٹھارہ عزیز کھو بیٹھا ہوں کیا میرے لئے گریہ کرنے اور آہ و فغاں میں مشغول ہونے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ عربی زبان میں یہ مناجات فصاحت و بلاغت کا بہترین سرمایہ ہیں لیکن طوالت کے خوف سے انہیں درج کتاب نہیں کیا جارہا ہے۔ انشاء اللہ موقعہ پاکر ان میں سے کچھ بعد میں بیان کروں گا۔

حضرت امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ‘

یوسفِ سنت‘ و جمالِ طریقت‘ و مُعَبّرِ معرفت‘ و مزیّنِ صفوت‘ ابو محمد جعفر بن محمد الصادق بن علی بن حسین بن علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا حال بہت اعلیٰ اور مقام نہایت بلند تھا۔

شرح یوسف سنت کا مطلب یہ ہے کہ آپ سنتِ نبوی کے بے حد حسین نمونہ تھے۔ جمالِ طریقت کا مطلب یہ ہے کہ آپ تصوف کا خوبصورت مجسمہ تھے‘ معبّر معرفت کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہترین معرفتِ حق بیان کرنے والے تھے مزیّن صفوت کا مطلب یہ ہے کہ آپ درویشی اور ولایت کی زینت تھے۔

ترجمہ آپ تمام ظاہری و باطنی کمالات کے جامع تھے۔ مشائخ عظام میں سے آپ کے اشارات یعنی باطنی نکات تمام علوم میں نہایت ہی لطیف و جمیل اور آپ کے حقائق و معارف بے حد بلند ہیں۔ طریقت میں آپ کی تصانیف معروف ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ **من عرف اللّٰہ اعرض عما سواہ** (جس نے حق تعالیٰ کو پہچان لیا اس نے غیر سے منہ موڑ لیا) یعنی عارف غیر کو اور ظاہری اسباب کو نہیں دیکھتا اس کی معرفت غیر کی عین نفی ہے کیونکہ غیر اللہ کی نفی عین معرفت ہے اور غیر کی معرفت اللہ تعالیٰ کی نفی ہے۔ پس عارف خلق کو دل سے نکال کر خالق کے ساتھ پیوست ہوجاتا ہے اس کے دل میں غیر اللہ کی اس قدر وقعت

نہیں ہوتی کہ اسے اللہ سے باز رکھ سکے اور نہ اتنی قدر و منزلت ہوتی ہے کہ اس کو اپنی طرف لبھا سکے۔

شرح قولہ "غیر اللہ کی نفی عین معرفت اور غیر کی معرفت اللہ کی نفی ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ جب عارف مقام فنا فی اللہ میں ہوتا ہے تو غیر اللہ گم ہوجاتا ہے سب ذات ہی ذات رہ جاتی ہے اور جب وہ دنیا میں مصروف ہوتا ہے تو اس وقت حالت فنا باقی نہیں رہتی اور وحدت سے کثرت کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اس قول کا مطلب یہ بھی ہے جو سالک دنیا میں مشغول ہوجاتا ہے معرفت حق سے محروم رہ جاتا ہے اور جو معرفت حق حاصل کرلیتا ہے دنیا کی مشغولی سے باز رہتا ہے۔

ترجمہ نیز آپ نے فرمایا ہے کہ **لا تصح العبادۃ الا بالتوبۃ لان اللّٰہ تعالیٰ قدم التوبۃ علی العبادۃ قال اللّٰہ تعالیٰ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ** ۔ (یعنی عبادت توبہ کے بغیر راست نہیں آتی کیونکہ خداوند تعالیٰ نے " اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ " میں توبہ کو عبادت پر مقدم رکھا ہے کیونکہ توبہ مقامات طریقت کی ابتداء اور عبادت ان کی انتہاء ہے اور حق تعالیٰ نے جہاں عاصیوں کا ذکر فرمایا ہے تو ان کے لئے توبہ کو لازم قرار دیا ہے مثلاً ایک آیت میں فرمایا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ (اے مسلمانو توبہ کرو سب اللہ تعالیٰ کے حضور میں) اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرمایا تو آپ کو عبودیت کے ساتھ مخصوص فرمایا مثلاً ایک آیت میں فرمایا فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (پس نے اپنے بندہ کی طرف نازل کیا جو کچھ نازل کیا) ۔

ایک دفعہ حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے ابن رسول صلی اللہ علیہ

وسلم مجھے کچھ نصیحت کیجئے کیونکہ میرا دل سیاہ ہوگیا ہے۔ آپ نے فرمایا اے ابو سلیمان! تو اپنے زمانے کا شیخ ہے تجھے میری نصیحت کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے فرزند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ خلقت میں سب سے زیادہ افضل ہیں اور آپ کی نصیحت ہمارے لئے واجب ہے آپ نے فرمایا :

"اے ابو سلیمان! میں اس بات سے بے حد خائف ہوں کہ کل قیامت کے دن میرے دادا مبارک مجھ سے سوال کریں گے کہ تو نے میری مطابعت کا حق کیوں نہیں ادا کیا کیونکہ حق تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر چیز حسب و نسب نہیں بلکہ حسن عمل ہے۔"

یہ سن کر حضرت شیخ داؤد طائیؒ پر گریہ طاری ہوگیا اور کہنے لگے کہ بارِ خدایا جس شخص کا خمیر خاندان نبوت ہے، جس کے دادا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور والدہ ماجدہ کا اسم مبارک حضرت فاطمہ بتولؓ ہے۔ جب وہ عاقبت کے معاملہ میں اس قدر حیران و پریشان ہے تو داؤد کون ہوتا ہے کہ وہ پریشان نہ ہو۔"

آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن آپ اپنے خادموں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور فرمایا کہ آؤ ہم عہد کریں کہ ہم میں سے جو بھی قیامت کے دن نجات پائے گا دوسروں کی شفاعت کرے گا۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ہماری شفاعت کی کیا ضرورت ہے کیونکہ آپ کے جد امجد ساری خلق خدا کے شافعی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اپنے ان اعمال سے شرم آتی ہے کہ اپنے جد امجد کے سامنے جاؤں۔ ان کے یہ تمام اقوال اپنے نفس کی نکتہ چینی کا نتیجہ ہیں اور یہ آپ کے صفاتِ کمال پر دلالت کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام تمام کا مسلک یہی تھا (یعنی اپنے نفس کے عیوب پر کڑی نگاہ رکھنا) جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ہے :

اذا اراد اللّٰہ بعبد خیرا بصرہ بعیوب نفسہ (جس کسی کو حق تعالیٰ خیر و برکت عطا فرماتا ہے اس کو اپنے نفس کے عیوب سے مطلع فرماتا ہے)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص عجز و نیاز کا شیوہ اختیار کرتا ہے حق تعالیٰ اسے دونوں جہانوں میں سرخ روئی عطا فرماتا ہے۔ اگر ہم تمام اصحابِ اہل بیت کا ذکر کریں اور ان کے مناقب و محاسن بیان کریں تو ایک علیحدہ ضخیم کتاب وجود میں آجائے گی اس لئے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ طریقت کے قائلین اور منکرین کی آنکھیں کھولنے کے لئے بس اسی قدر کافی ہے۔

اب ہم اصحاب صفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مختصر ذکر کرتے ہیں۔ اس موضوع پر پہلے ہم نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "منہاج الدین" ہے جس میں اصحاب صفہ میں سے ہر ایک کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہاں صرف ان کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں۔

آتش رخسارِ گل خرمنِ بلبل بسوخت
چہرہ خندانِ شمع آفت پروانہ شد
پنجہ زد عشقت لباسِ پارسائی پارہ شد
طاعتِ صد سالہ ام تاراج یک نظارہ شد

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

ذکر اصحابِ اہل الصفہ

اثبات گوشہ نشینی در زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یاد رہے کہ ساری امت کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک جماعتِ صحابہ مسجد نبوی میں گوشہ نشین تھی اور دنیا سے منہ موڑ کر اور کسبِ رزق چھوڑ کر یادِ خدا میں منہمک تھی اور ان کی خاطر حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اظہارِ خفگی بھی آیت ذیل میں فرمائی۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ○

"اے رسولؐ جو لوگ رات دن لقا اللہ (وصال و مشاہدۂ حق) کی خاطر اپنے رب کی یاد میں مشغول ہیں ان کو اپنی صحبت سے محروم نہ کریں۔" غرضیکہ قرآن مجید ان کے فضائل پر ناطق ہے نیز احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ان

حضرات کے بیشمار فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ان میں صرف چند فضائل بیان کئے جاتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

وقف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی اصحاب الصفتہ فرأی فقرھم وجھدھم و طیب قلوبھم فقال ابشروا یا اصحاب الصفتہ فمن لقی من امتی علی النعت الذی انتم علیہ راضیا" بمافیہ فانھم من رفقائی فی الجنتہ ○ "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصحاب صفہ پر گزر ہوا تو آپؐ وہاں ٹھہر گئے اور ان کے فقر' جدوجہد اور ان کے قلوب کے حال و مقام کو دیکھ کر فرمایا کہ اے اصحابِ صفہ تم کو بشارت ہو اور جو تمہارے بعد میری امت میں تمہاری روش اختیار کریں گے اور اپنے فقر پر راضی رہیں گے وہ بھی جنت میں میرے رفیق ہوں گے"۔

شرح یہ ہیں فضائل گوشہ نشینی' خلوت اور فقر کے۔ لیکن آج کل کے مٹھی بھر مسلمان جو اسلام میں ترمیم کے خواہش مند ہیں اقوام مغرب کے عارضی اقتدار اور فوجی قوت سے اس قدر مرعوب ہو گئے ہیں اور احساس کمتری میں اس قدر مبتلا ہیں کہ اولیاء کرام اور مشائخِ عظام کے مسلکِ گوشہ نشینی اور مشربِ خلوت گزینی پر نہ صرف اعتراض کرتے ہیں بلکہ اسلام کے انحطاط اور تنزل کی وجہ بھی اسی خانقاہی نظام کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اگرچہ اصحاب صفہ کی گوشہ نشینی شاید دائمی تھی۔ مشائخ عظام اپنے مریدین اور طالبان حق کو ایک محدود مدت کے لئے اپنے پاس رکھ کر عبادت و ریاضت کا ایک کورس کراتے تھے اور ان کی تکمیل کرا کر خلافت عطا کرتے تھے اور مختلف علاقوں میں ہدایت خلق کے لئے بھیج دیتے تھے۔ بعینہٖ جس طرح آج کل طالب علموں کو عارضی طور پر بورڈنگ ہاؤس میں چند سالوں کے لئے رکھ کر ان کو علوم سکھائے جاتے ہیں اور پھر اپنے کاموں

پر تعینات کر دیا جاتا ہے' جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہدایت خلق کے فرائض کی انجام دہی میں ہمہ وقت اور ہمہ تن منہمک رہتے تھے اور کسبِ رزق نہیں کر سکتے تھے اسی طرح آپ کے خلفاء یعنی اولیاء کرام اور مشائخ عظام بھی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا تھے اور ہمہ تن اور ہمہ وقت خلق خدا کی ہدایت میں مشغول رہتے تھے اور چونکہ ان کے پاس رزق کمانے کا وقت تک نہیں تھا۔ نہایت ہی عسرت' افلاس اور فقر و فاقہ میں زندگیاں بسر کرتے تھے اور اس پر صابر و شاکر رہتے تھے اور اگر وہ رزق کماتے اور دنیاوی کاموں میں ترقی حاصل کر کے دولت مند ہو جاتے تو امت کو وہ عروج اور ترقی حاصل نہ ہوتی جو ان فقراء اور بے نفس اور بے لوث اور مخلص جانبازوں کی مساعیٔ جلیلہ اور افعالِ جمیلہ سے حاصل ہوئی اور ایک دو صدی کے اندر ہی اسلام کا پرچم یورپ میں ہسپانیہ سے لے کر ایشیاء میں ہندوستان تک اور شمال میں ترکستان سے لیکر افریقہ کے صحراؤں تک لہلہانے لگا۔ گوشہ نشینی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امت کا ہر فرد و بشر گوشہ نشین ہو جاتا تھا بلکہ امت کے خواص اس کام میں لگ جاتے تھے اور قابلیت حاصل کر کے عوام کی اصلاح کے کاموں میں مشغول ہو جاتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان سطح بین' نام نہاد ترقی پسند لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اقوامِ مغرب نے اگرچہ جو کچھ سائنس اور مادی ترقی کے اصول سیکھے ہیں' مسلمانوں سے سیکھے ہیں۔ لیکن روحانیتِ اسلام کو قبول نہ کر کے انہوں نے صرف مادیت کے میدان میں جو ترقی کی ہے وہ روحانیت کی عدم موجودگی میں اس قدر غیر مکمل اور متزلزل ہے کہ ہر نصف صدی کے بعد ایک جنگِ عظیم پیدا کر دیتے ہیں جس سے ساری دنیا تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اقوام مغرب کی اس یکطرفہ غیر متوازن اور متزلزل ترقی کو ہرگز ہرگز ترقی کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ ایک بدترین قسم کا تنزل ہے جس میں یہ اقوام گرفتار

ہیں اور عنقریب ان کا تباہ کن تمدن ان کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا۔ جہاں جسم کے لئے مادی غذا اور مادی ترقی کی ضرورت ہے۔ روح کے لئے بھی روحانی غذا اور روحانی ترقی کی ضرورت ہے۔ جو اسلام کا خاصہ ہے۔ اور جو تہذیبِ مغرب میں مفقود ہے۔ تہذیبِ مغرب میں صرف جسم کی غذا اور مادی ترقی پر سارا زور لگایا جا رہا ہے اور روح کو غذا بہم پہنچانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا رہا جس کی وجہ سے وہ قومیں شدید روحانی اور ذہنی انتشار اور بے چینی اور بے قراری میں مبتلا ہیں اور اس صورتحال کا لازمی نتیجہ جنگ اور تباہی ہے لہٰذا ہمارے نام نہاد ترقی پسندوں کو ذرا ہوش سے بات کرنی چاہیئے۔

ترجمہ | حضرات اصحاب صفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

(۱) حق تعالیٰ کی بارگاہ کے منادی (مؤذن) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے برگزیدہ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ۔

(۲) خدائے واحدہٗ لاشریک کے دوست اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے محرم راز حضرت ابوعبداللہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ۔

(۳) مہاجرین و انصار کے سردار اور حق تعالیٰ کی رضا کے طالب حضرت ابوعبیدہ عامر بن عبداللہ الجراح رضی اللہ عنہ۔

(۴) برگزیدۂ اصحاب و زینتِ ارباب حضرت **ابویقظان** عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

(۵) گنجِ علوم و خزینۂ حلم حضرت ابومسعود عبداللہ بن مسعود الھزلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

(۶) مقیم درگاہِ حرمت و پاک از عیب آفت حضرت عتبہ بن مسعودؓ برادر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم۔

(۷) سالک طریق عزلت و معرا از عیوب و ذلت حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

(۸) دائیٔ مقامِ تقویٰ و راضی بہ بلا و بلویٰ حضرت خباب بن الارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

(۹) قاصد درگاہِ رضا و طالب بارگاہِ بقاء اندر فنا حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ۔

(۱۰) درج سعادت ' و بحرِ قناعت حضرت عتبہ بن عزوان رضی اللہ عنہ

(۱۱) برادر فاروقؓ و معرض از کونین و مخلوق حضرت زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

(۱۲) صاحبِ مجاہدت و طالبِ مشاہدت حضرت ابو کبیشہ رضی اللہ عنہ (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے غلام تھے)

(۱۳) تائبِ خلق و طالبِ حق حضرت ابو المرثد کنانہ بن الحصین العدوی رضی اللہ عنہ۔

(۱۴) عامر طریقِ تواضع حضرت حذیفہ الیمانی رضی اللہ عنہ

(۱۵) خائف از عقوبت وہارب از طریقِ مخالفت حضرت عکاشہ بن الحصین رضی اللہ عنہ۔

(۱۶) زینت مہاجرین و انصار حضرت مسعود بن ربیع القاری رضی اللہ عنہ

(۱۷) اندر زہد مانندِ عیسیٰؑ و اندر شوق مانندِ موسیٰؑ حضرت ابوذر جندب بن جنادہ الغفاری رضی اللہ عنہ۔

(۱۸) پہرہ دارِ درِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔

(۱۹) مقیمِ استقامت و متابعت حضرت صفوان بن بیضا رضی اللہ عنہ۔

(۲۰) صاحبِ ہمت و خالی از تہمت حضرت ابو دردا عویمر بن عامرؓ۔

(۲۱) طالب رضا الٰہی و مقبول رسولؐ حضرت ابو لبابہ بن المنذر رضی اللہ عنہ۔

(۲۲) غواصِ بحر حقیقت حضرت عبداللہ بن بدر الجہنی رضی اللہ عنہ وغیرہم۔

اگر تمام اصحاب صفہ کا ذکر کیا جائے تو پوری کتاب وجود میں آجائے گی۔
شیخ ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی رحمتہ اللہ علیہ نے جو سوانح نگارِ اہل طریقت ہیں ایک کتاب لکھی ہے جس کا موضوع اصحاب صفہ ہے۔ انہوں نے ان کے اسماء گرامی' مناقب و فضائل و مقامات مفصل لکھے ہیں انہوں نے حضرت مسطح بن ثابت بن عباد رضی اللہ عنہ کو بھی اصحاب صفہ میں شمار کیا ہے۔ لیکن میں ان سے دل سے محبت نہیں کرتا کیونکہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے افک کی ابتداء انہوں نے کی تھی۔ ان کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ' حضرت ثوبانؓ' حضرت معاذ بن الحارثؓ' حضرت سائب بن خلادؓ' حضرت ثابت بن ودیعتؓ' حضرت ابو عبیس عویم بن مساعدؓ' حضرت سالم بن عمیرؓ' حضرت ابوالیسر کعب بن عمروؓ' حضرت وہب بن مغفلؓ' حضرت عبداللہ بن انیسؓ' حضرت حجاج بن عمرو الاسمیؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین سب اصحاب صفہ تھے لیکن بعض اوقات دوسرے امور میں بھی شامل ہوجایا کرتے تھے۔ لیکن سب کا مقام وہی اصحاب صفہ کا ہے۔
درحقیقت صحابہ کرام کا زمانہ بہترین زمانہ ہے اور اصحابِ کرام میں سے جس مرتبہ پر بھی کوئی ہو باقی ہر زمانے کی خلقت سے بہترین اور افضل ترین ہے اس وجہ سے کہ ان کو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔ اور ان کے قلوب جملہ عیوب سے پاک ہوچکے تھے۔ جیساکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم** (بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے اس کے بعد وہ لوگ جو بعد میں آئے اور پھر وہ جو ان

کے بعد آئے)۔ اور خداوند تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ (سب سے زیادہ افضل مہاجرین اور انصار ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے خلوص دل سے ان کا اتباع کیا)۔ اب ہم تابعین کا ذکر کرتے ہیں۔ تاکہ تمام زمانے متصل ہو جائیں اور فائدہ حاصل ہو۔

من شمعِ دلگدازم تو صبح دل ربائی
سوزم اگر نہ بینم میرم چوں رخ نمائی
در وصل آنچناں کہ گفتم در ہجر آں چنانچہ ہستم
نے تاب وصل دارم نہ طاقتِ جدائی

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خُدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنُما
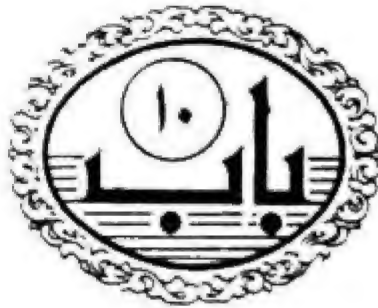
صوفیائے کے اُن اماموں کا ذِکر جو حضراتِ تابعین میں سے ہیں۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ،

آفتاب امت، شمع دین و ملت، حضرت اویس قرنیؓ کا شمار اکابر مشائخ تصوف میں ہوتا ہے۔ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں تھے۔ لیکن دو وجوہات کی بناء پر دیدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم رہے۔ اول غلبہ حال، دوم خدمت والدہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب کرام سے فرمادیا تھا کہ قرن میں اویس نامی ایک مرد ہے کہ جس کی شفاعت سے قبیلہ ربیعہ و مضر کی بکریوں کی تعداد میں میری امت کے لوگ بخشے جائیں گے۔ (قبیلہ ربیعہ اور مضر عرب میں بیشمار بکریوں کی وجہ سے مشہور تھے)۔

شرح بعض سطح بین لوگ کہتے ہیں کہ اولیاء کرام کے پاس جانے کا کیا فائدہ۔ نماز روزہ پر عمل کر دیہی کافی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ قرآن مجید میں خود حق تعالیٰ نے اولیاء کرام کی صحبت کا حکم فرمایا ہے۔ فرمایا کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (صادقین کی صحبت اختیار کرو) صادقین کی تعریف اس کتاب میں پہلے بیان ہو چکی ہے کہ ان سے مراد اولیاء کرام ہے۔ نیز فرمایا وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ (اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے وسیلہ یعنی ذریعہ شیخ و ہادی تلاش کرو)۔ اس آیت سے اللہ تعالیٰ تک رسائی یعنی قرب و وصال بھی ثابت ہو جاتا ہے جس کو اہل ظواہر کوئی اہمیت نہیں دیتے اور صوم و صلواۃ کو حصول جنت کا محض ذریعہ اور جنت کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ آیہ اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَهٰهَا میں منزل مقصود خود حق تعالیٰ ہیں۔ اور حدیث زیر بحث میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ کو حضرت اویس قرنی کی زیارت کا حکم دیا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ وہ جواں مرد ہے کہ جس کی شفاعت سے میری امت کے اتنے لوگ نجات پائیں گے جتنی کہ قبیلہ ربیعہ اور مضر کی بکریاں ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اولیاء کرام کی شفاعت سے مریدین نجات پائیں گے۔ اولیاء اللہ کی شفاعت کی تصدیق میں دیگر بیشمار احادیث کتب حدیث میں موجود ہیں اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ "جس نے اللہ تعالیٰ کے ولی کی اہانت کی اس سے اللہ تعالیٰ اعلان جنگ کرتا ہے"۔

ترجمہ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ حضرت اویس قرنی کو جا کر ملنا۔ ان کا قد درمیانہ ہے، لمبے بال ہیں اور اس کے بائیں پہلو پر ایک سفید نشان ہے جو کوڑھ کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس طرح اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر بھی سفید نشان ہے۔

جب ان کو ملو تو میرا سلام انکو پہنچا دینا اور یہ کہنا کہ میری امت کے لئے دعا کریں۔

شرح اس حدیث سے ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم غیب ثابت ہوتا ہے کہ اویس رضی اللہ عنہ کو دیکھا نہیں ہے اور فرما رہے ہیں کہ اس شکل و صورت کا آدمی ہے اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ملاقات کی' وہی علامات ان کے اندر موجود پائیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ولی اللہ سے امت کے لئے دعا کے لئے کہہ رہے ہیں۔ اگر ہم کسی ولی اللہ سے دعا کرائیں تو اہل ظواہر پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ خدا سب کی سنتا ہے تم خود کیوں نہیں دعا مانگتے۔ اب ان کو کون بتائے کہ مقبول درگاہ اور مقرب بارگاہ رب العزت اور عام انسان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اور مستجاب الدعوات وہ حضرات ہوتے ہیں جن کی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔

ترجمہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ گئے تو خطبہ کے دوران پوچھا کہ اگر یہاں کوئی اہل نجد ہے تو کھڑا ہو جائے۔ جب ایک آدمی کھڑا ہوگیا تو انہوں نے دریافت کیا کہ آیا قرن میں کوئی اویس نامی شخص رہتا ہے۔ اس آدمی نے بتایا کہ جی ہاں رہتا ہے لیکن وہ دیوانہ ہے جو آبادی میں نہیں آتا اور ویرانوں میں رہتا ہے۔ کسی کی صحبت میں نہیں بیٹھتا' جو کچھ لوگ کھاتے ہیں وہ نہیں کھاتا اور نہ شادی و خوشی کو جانتا ہے۔ جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے' جب لوگ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اس نے کہا کہ وہ ہمارے اونٹوں کے پاس ہے۔ چنانچہ جب وہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے پاس لے گئے تو

دیکھا کہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے اصحاب رسولؐ کو السلام علیکم کہا اور اپنے پہلو اور ہاتھ پر نشان دکھائے جس سے ان کو معلوم ہوگیا کہ وہی ہیں۔ اس کے بعد اصحاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پہنچایا اور امت کے لئے دعا کی درخواست کی۔ اور کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھے رہے۔ اس کے بعد حضرت اویس قرنیؒ نے فرمایا کہ آپ کو یہاں آنے میں بہت تکلیف ہوئی ہے۔ اب آپ واپس تشریف لے جائیں کیونکہ قیامت قریب ہے وہاں ہماری ملاقات ہوگی اور پھر وہاں سے واپس کوئی نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس وقت میں قیامت کے لئے تیاری میں مشغول ہوں۔ اصحاب رسولؐ کی واپسی کے بعد ان کی بڑی قدر و منزلت ہونے لگی جس سے بھاگ کر آپ کوفہ تشریف لے گئے۔ جہاں ہرم بن حیان نے ان کو ایک دفعہ دیکھا لیکن بعد میں کسی نے نہ دیکھا۔ حتی کہ جنگ صفین کے وقت پھر ظاہر ہوئے اور حضرت علیؓ کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے اور شہادت پائی۔ **علش حمید اومات شہیدا** (زندگی نیکی میں بسر کی اور شہادت کی موت نصیب ہوئی)۔

تنہائی اکیلے رہنے کا نام نہیں

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ **السلامتہ فی الوحدۃ** (سلامتی تنہائی میں ہے) کیونکہ جو شخص تنہائی اختیار کرتا ہے لوگوں کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔ وہ ہر حال میں خلق سے نامید ہوتا ہے اور سب سے منہ موڑ کر ایک کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ وحدت تنہائی اکیلے رہنے کا نام نہیں۔ کیونکہ جب تک شیطان کا دل پر غلبہ رہتا ہے نفس اس پر حکمرانی کرتا ہے۔ اور دنیا و عقبیٰ کے تفکرات دامن گیر رہتے ہیں اور خلق خدا کا خیال دل پر غالب رہتا ہے اس وقت تک حقیقی تنہائی (گوشہ نشینی) نصیب نہیں ہوتی۔ کیونکہ

خواہ خلق خدا کی صحبت ہو یا اس کا خیال دل میں جاگزین ہو دونوں برابر ہیں۔ وحدت یہ ہے کہ اگرچہ وہ صحبت خلق اختیار کرتا ہے اس سے اس کی حق کے ساتھ مشغولی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور جو شخص مشغول بخلق ہے۔ اگرچہ وہ تنہائی اختیار کرتا ہے۔ مشغولیٔ حق سے محروم رہتا ہے۔ اس لئے حقیقی وحدت اس وقت نصیب ہوتی ہے کہ جب حق تعالیٰ کی محبت میں پیوست ہو جاتا ہے اور خلقت کا خیال دل سے اٹھ جاتا ہے۔ **لان الوحدۃ صفتہ عبدصاف قال اللّٰہ تعالیٰ** اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ "وحدت صفت ہے عبد صاف کی جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کیا اللہ اپنے بندہ کو کافی نہیں ہے۔"

شرح سبحان اللہ ! حضرت مخدوم علی ہجویری قدس سرہ کا مقام کس قدر بلند ہے۔ خلوت اور تنہائی آپ کے نزدیک دنیا' گھر بار' بال بچے چھوڑ کر جنگل میں گوشہ نشینی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وحدت یعنی ایک ذات کے ساتھ ایک ہوجانے کا نام ہے خواہ جنگل ہو یا آبادی سالک کے لئے برابر ہے۔ مشائخ عظام اس کو خلوت در انجمن کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہی صحابہ کرام کا مسلک تھا اور یہی اسلام کا تقاضا ہے۔ البتہ جس طرح ہر فن اور پیشہ میں تکمیل کے لئے کچھ عرصہ ہمہ تن اس کام میں مشغول ہو کر خلق خدا سے کنارہ کش رہنا پڑتا ہے۔ طریقت میں بھی کچھ عرصہ ہمہ تن اور ہمہ وقت یاد حق میں مشغول رہ کر تکمیل کا حصول ضروری ہے۔ اس لئے مشائخ میں یہ قول مشہور ہے کہ **لا رھبانیتہ فی الاسلام** "اسلام میں ترک دنیا ضروری نہیں ہے" کیونکہ دنیا ایک میدان عمل اور جولا نگاہ ہے۔ ایک گھوڑے کا کمال جولانگاہ ہی میں کامیابی کا نام ہے نہ کہ اصطبل کی تنہائی میں رہ کر فربہ ہونا۔ اگر کوئی جنگل میں بیٹھ کر یہ کہے کہ آج تک میں نے نہ کسی پر غصہ کیا ہے نہ غرور و تکبر کیا ہے نہ کسی عورت پر بری نگاہ ڈالی ہے تو یہ کوئی کمال نہیں کیونکہ جنگل میں کون ہوتا ہے جس پر غصہ آئے یا نظر بد پڑے۔ کمال یہ

ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیا کا نہ بنے بلکہ مولا کا بن کر رہے۔ چنانچہ حضرت مخدوم علی ہجویری قدس سرہٗ کا یہ تجزیہ اور خلوت کی یہ تعریف اسلام اور رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابہ کرام کی زندگیوں کے عین مطابق ہے۔ اور یہی مشائخ طریقت کا مسلک ہے۔

حضرت ھرم بن حیان رضی اللہ عنہٗ

منبع صفا، معدن وفا، حضرت ھرم بن حیان رضی اللہ عنہ اکابر مشائخ طریقت میں سے تھے اور روحانیت میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ نے بیشتر صحابہ کرام کی صحبت پائی ہے اس لئے آپ کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ ان کے دل میں حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور قرن تشریف لے گئے لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ کوفہ چلے گئے ہیں۔ چنانچہ آپ کوفہ تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں بھی ملاقات نہ ہو سکی اس لئے واپس مکہ مکرمہ آگئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کوفہ میں آگئے ہیں۔ جب آپ دوبارہ کوفہ پہنچے تو پھر بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ اور کافی عرصہ کوفہ میں رہنے کے بعد جب آپ بصرہ تشریف لے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ دریائے فرات کے کنارے بیٹھے وضو کر رہے ہیں اور مرقعہ (گدڑی) زیب تن ہے۔ وضو سے فارغ ہو کر انہوں نے داڑھی میں کنگھی کی۔ اس کے بعد حضرت ھرم بن حیان رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو آپ نے جواب دیا کہ وعلیکم السلام یا ھرم بن حیان۔ حضرت ھرم رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ نے مجھے کیسے پہچانا تو آپ نے جواب دیا کہ **عرفت روحی روحک** "میری روح نے تیری روح کو پہچان لیا"۔

شرح اس سے معلوم ہوا کہ جب انسان کی روح غلبۂ نفس سے پاک ہو

جاتی ہے تو عالم غیب سے اس کو آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کا یہ علم کلی نہیں ہوتا جزوی ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا علم کلی ہوتا ہے۔ اس لئے جن حضرات کو علم غیب سے کچھ حصہ ملتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خدا بن جاتے ہیں یا علم غیب میں خدا کے شریک کہلا سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ویسے صفات سمع، بصر، قدرت، ارادہ، حیات وغیرہ کی وجہ سے ان کو کسی حد تک سمیع و بصیر، قادر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کہاں انسان کی صفات محدود اور کہاں حق تعالیٰ کی صفات لا محدود۔ اس لئے اولیاء اللہ کے ذرا سے علم غیب اور معمولی سی کشف و کرامات پر شور مچا دینا کہ یہ علم غیب ہے اور علم غیب صرف اللہ کی صفت ہے۔ بندہ کے ساتھ علم غیب کو منسوب کرنا شرک ہے۔ یہ خوامخواہ کا شور و غل ہے۔ اور اس سے بلاوجہ امت میں اختلاف پیدا کیا جا رہا ہے حالانکہ اختلاف کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ انسان کئی صفات میں حق تعالیٰ کا تھوڑا سا شریک ہے۔ ایک دفعہ جمعہ کی نماز سے پہلے لاہور میں ایک امام مسجد منبر پر کھڑے فرما رہے تھے کہ "نہ کوئی گنج بخش ہے نہ کوئی رنج بخش ہے۔ کم عقل لوگوں نے انسانوں کو داتا بنا کر شرک میں مبتلا کر دیا ہے۔ نماز کے بعد راقم الحروف نے ان سے پوچھا کہ آپ صرف امام ہیں یا مسجد میں کوئی مدرسہ وغیرہ بھی قائم کر رکھا ہے انہوں نے کہا نہیں جی اللہ کے فضل سے یہاں بڑا مدرسہ چل رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ مدرسے کا خرچ کہاں سے آتا ہے انہوں نے کہا اجی خدا بھلا کرے ہمسایوں کا جو امداد کر دیتے ہیں۔ مدرسہ چل رہا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو بھی ان چندوں میں سے کچھ تنخواہ ملتی ہے۔ انہوں نے کہا جی ہاں آخر گزارہ تو کرنا ہوتا ہے۔ میں نے کہا پھر تو سب چندہ دینے والے آپ کے داتا ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو زندوں سے مانگتے ہیں اور تم لوگ مردوں سے مانگتے ہو۔ میں نے کہا کیا زندہ لوگ غیر اللہ نہیں ہیں۔ زندہ لوگوں سے مدد مانگنا بھی غیر اللہ سے مدد مانگنا ہے۔ اس سے وہ لا

جواب ہو گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ کسی زندہ سے، مانگنا شرک ہے اور نہ کسی ولی اللہ سے دعا کرانا شرک ہے۔ کیونکہ دینے دلانے کا سلسلہ دنیا میں جاری ہے۔ غریب لوگ امیروں سے مدد مانگتے ہیں اور فقراء امراء سے خیرات حاصل کرتے ہیں اگر غیر اللہ سے مانگنا شرک ہوتا تو خیرات کا دینا اور لینا شرک ہوتا۔ لیکن خیرات اور صدقات کی تو حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احادیث میں تعریف فرمائی ہے۔ البتہ کسی کو خدا سمجھ کر اور رزاق مطلق سمجھ کر کوئی چیز طلب کرنا شرک ہے۔ جس طرح زمانہ جاہلیت میں کافر بتوں اور کاہنوں کو خدا سمجھ کر امداد طلب کیا کرتے تھے۔ لیکن نا سمجھی کی بات یہ ہے کہ جو احکام خدا کے دشمنوں یعنی بتوں اور کاہنوں کے خلاف آئے ہیں یار لوگوں نے وہی دلائل دوستان خدا کے متعلق پیش کرنا شروع کر دیئے ہیں حالانکہ کہاں دوست اور کہاں دشمن۔ اگر خدا کے سوا ہر شخص سے امداد طلب کرنا شرک ہے تو پھر امیر لوگوں سے خیرات لینا اور خیرات دینا بھی شرک ہے کیونکہ وہ بھی اللہ نہیں ہیں اللہ کے غیر ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اولیاء اللہ مردہ نہیں ہوتے زندہ ہیں۔ قرآن مجید میں شہداء کو مردہ کہنے کی ممانعت آئی ہے کیونکہ وہ زندہ ہیں۔ اب قرآن حکیم میں جب مختلف انسانوں کے مراتب بیان کئے گئے ہیں تو یہ ترتیب آئی ہے النَّبِيِّنَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِينَ یعنی سب سے بلند مرتبہ انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ اس کے بعد صدیقین یعنی اولیائے کرام ہیں۔ تیسرے نمبر پر شہداء اور چوتھے نمبر پر صالحین یعنی عام نیک لوگ ہیں اب جب قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے شہداء کو زندہ کہا ہے تو اس سے اوپر کی دو درجوں والے حضرات یعنی انبیاء اور صدیقین تو بدرجہ اتم زندہ ہوئے۔ اس لئے ان کو مردہ کہنا بھی قرآن مجید کے خلاف ہے۔ لہٰذا اولیاء کرام کو کیوں مردہ قرار دیا جاتا ہے۔ جب کہ قرآن ان کو

زندہ کہتا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ صدیقین کو اولیاء اللہ کیوں قرار دیا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے صدیق نہ نبی ہیں نہ شہید آخر وہ کون لوگ ہیں جن کو قرآن میں شہید سے بھی اونچا درجہ ملا ہے۔ یاد رہے کے ایمان کے ویسے تو بے شمار مراتب و مدارج ہیں لیکن عام طور پر ان کو تین اقسام پر منقسم کیا جاتا ہے۔ علم الیقین' عین الیقین اور حق الیقین' علم الیقین یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام سے سن کر کہ خدا موجود ہے اس پر ایمان لایا جائے۔ عین الیقین یہ ہے کہ اپنی آنکھوں سے یعنی قلب کی باطنی آنکھوں سے دیکھ کر پیغمبر علیہ السلام کی بات کی تصدیق کر سکے کہ واقع خدا تعالیٰ موجود ہے۔ اس مقام کے اصحاب کو قرآن مجید نے صدیقین کا نام دیا ہے۔ اور حق الیقین کا مرتبہ یہ ہے کہ ذات حق میں فنافی اللہ ہو کر ایمان کے بلند ترین اور قوی ترین مرتبہ تک پہنچ جائے۔ مثلاً آگ کے متعلق یہ علم کہ آگ جلاتی ہے علم الیقین ہے۔ اگر کوئی شخص لکڑی کو آگ میں جلتا ہوا دیکھ لے تو اس کا آگ میں ایمان عین الیقین کہلائے گا۔ اور اگر آگ میں ہاتھ ڈال کر اس کی جلانے کی صفت کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو اس کے ایمان کا درجہ حق الیقین کہلاتا ہے۔ لہٰذا صدیقین وہ ہیں جنہوں نے تزکیہ نفس کے ذریعے حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کر لی ہوتی ہے۔ اور عین الیقین اور حق الیقین کےمراتب پر فائز ہوتے ہیں اس لئے جب تیسرے درجہ کا شہید زندہ ہے تو دوسرے اور پہلے درجے کے انبیاء اور اولیاء ان سے زیادہ زندہ ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ شریعت حقہ کے نزدیک جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا جسم مرتا ہے لیکن روح نہیں مرتی اور عالم ارواح یا عالم برزخ میں چلی جاتی ہے اس پر ہر مسلمان اور ہر فرقے کا اتفاق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ہر شخص کی روح زندہ ہے تو پھر قرآن مجید میں صرف شہداء کو کیوں زندہ کہا گیا ہے۔ بعض لوگ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ شہداء اپنے کارناموں کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ اس لئے زندہ کہلاتے ہیں۔ لیکن

قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور مجھ سے رزق لیتے ہیں ان کو مردہ مت کہو۔ لہٰذا سوال کا جواب یہ ہے اور اس کے سوا یہ آیت اور کسی جواب کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ شہداء زندہ لوگوں کی طرح متصرف ہوتے ہیں لیکن باقی روحوں کو جسم فانی سے مفارقت کے بعد تصرف کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے بھی انبیاء اور اولیاء سے اگر امداد طلب کی جائے تو شریعت کی رو سے شرک نہیں ہے۔ کیونکہ وہ زندہ بھی ہیں اور متصرف بھی ہیں چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیاء اصحاب قبور سے ہزاروں تصرفات تاریخ اسلام میں مذکور ہیں۔ مثلاً جب یہودی لوگ روضہ اقدس پر سرنگ لگا کر حضور اقدسؐ کا جسم اطہر نکال کر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں نورالدین زنگی کو حکم دیا کہ اس کا انسداد کیا جائے۔ یہ تاریخی واقعہ ہے اور کسی کو اس سے انکار نہیں۔ حضور اقدسؐ کے تصرفات اور صحابہ کرام اور اولیاء امت کے اس قسم کے تاریخی واقعات بے شمار ہیں جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ معجزات انبیاء اور کرامات اولیاء سے کسی فرقہ کو انکار نہیں ہے۔ ایک حدیث صحیحہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ **اللہ یعطی وانا قاسم** اللہ تعالیٰ عطا کرنے والا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں" اب اگر تقسیم کنندہ سے طلب کیا جائے تو حق تعالیٰ کے **مشیئت** (مرضی) کے خلاف ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے خود آنحضرتؐ کو قاسم مقرر فرمایا ہے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے قاسم مقرر ہوئے ہیں عین اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء یعنی اولیاء کرام بھی قاسم ہیں۔ اور قاسم کا کام تقسیم کرنا ہے۔ لہٰذا اولیاء کرام کے داتا ہونے سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ اور تقسیم سے مراد تقسیم نعمائے ظاہری و باطنی کے بغیر اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی ولی اللہ خدا

نہیں کھلایا جا سکتا۔ خدا خدا ہے اور بندہ بندہ ہے۔ یہ تو مسئلہ کی بات ہے کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا شریعت میں منع نہیں ہے لیکن ہمارے اولیاء کرام کا مسلک اور تعلیمات تو یہ ہیں کہ غیر اللہ سے قطعاً کچھ نہیں طلب کیا۔ بلکہ فاقے کئے۔ بال بچوں کو بھوکوں مارا لیکن دست سوال کسی کے آگے دراز نہ کیا اور بادشاہوں کے نذرانوں اور اشرفیوں کے انبار کو لات مار کر پھینک دیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس اہل ظواہر ذرا سی مراعات کی خاطر امراء اور رؤسا کے گھروں کا طواف کرتے رہتے ہیں اور پھر ان اللہ والوں کو مشرک ٹھہراتے۔ این چہ بوالعجبی است۔

ترجمہ حضرت ھرم بن حیان کچھ دیر حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے اور پھر ان کو واپس جانے کے لئے کہا۔ حضرت ھرم بن حیان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ملاقات کے دوران انہوں نے میرے ساتھ زیادہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا۔ اس وقت حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ یہ حدیث بھی بیان کی کہ **انما الاعمال بالنیات .... الی اخرہ** "اعمال کی بنیاد نیات پر ہے" یعنی جو شخص جس نیت سے کام کرتا ہے وہی اس کو ملتا ہے جو شخص ہجرت کے وقت خدا اور اس کے رسول کے احکام پر پابندی کی خاطر نیت کرتا ہے تو وہ درحقیقت خدا اور رسول کی خاطر ہجرت ہے اور جو شخص دنیا کی خاطر ہجرت کرتا ہے۔ تو اس کو دنیا ملتی ہے اور اگر کوئی شخص عورت کے لئے ہجرت کرتا ہے۔ تو اس کی ہجرت عورت کے لئے ہوگی۔ اس کے بعد حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ **علیک بقلبک** "دل کی غیر اللہ سے حفاظت کر" اس قول کے دو معنی ہیں۔ اول یہ کہ دل کو تابع احکام الٰہی کر دے دوم یہ کہ خود تابع احکام دل ہو جائے۔ دل کو تابع احکام الٰہی کرنا مریدوں کا کام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات

سے باز رہے اور دنیا کو دل میں جگہ نہ دے۔ بلکہ جدوجہد کر کے دل کو حق تعالیٰ کے ساتھ لگائے تاکہ دوستیٔ حق سے مشرف ہو سکے۔ اور اپنے آپ کو دل کے تابع کرنا کاملین کا کام ہے۔ جن کے قلب کو حق تعالیٰ نور جمال سے منور کر دیتا ہے۔ اور تمام علائق و اسباب دنیا سے بچا کر اپنے قرب کے بلند مراتب عطا فرماتا ہے اور تجلیات و مشاہدات سے ان کو نوازتا ہے۔ یہ ہے مطلب خود کو تابع دل کرنے کا۔ چنانچہ اولیاء کرام صاحب قلب اور مالک قلب ہوتے جن کو باقی الصفۃ کہتے ہیں (یعنی باقی باللہ) اور جو لوگ مغلوب الحال ہوتے ہیں وہ فانی الصفتہ کہلاتے ہیں (یعنی فانی فی اللہ)۔

شرح مقام فنا فی اللہ اور بقاء باللہ کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔

ترجمہ اور اس مسئلہ کی حقیقت وہی ہے جو حق تعالیٰ نے آیہ **اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ** "سوائے تیرے مخلص بندوں کے" اور اس آیت کی دو قرأت ہیں ایک قرأت میں **مخلصین** کے لام کے نیچے زیر اور ایک میں لام پر زبر پڑھی جاتی ہے۔ زیر کے ساتھ مخلص فاعل کا صیغہ بنتا ہے جس سے مراد باقی الصفتہ (بقا باللہ) ہے۔ اور زبر کے ساتھ مخلص مفعول کا صیغہ ہے جس کا مطلب ہے فانی الصفتہ (فنافی اللہ)۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔ انشاء اللہ۔

اور حقیقت یہ ہے کہ فانی فی اللہ زیادہ افضل ہے کیونکہ تن کو دل کے تابع کر لیتے ہیں اور ان کا دل حق تعالیٰ میں غرق اور مشاہدہ حق میں قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو باقی الصفتہ ہوتے ہیں دل کو **بتکلف** تابع کرتے ہیں اور اس مسئلہ کی بنا صحو و سکر اور مشاہدت اور مجاہدت پر ہے۔ واللہ اعلم (اللہ بہتر جانتا ہے)۔

شرح صحو سے مراد مقام بقاباللہ ہے۔ اور سکر سے مراد فنافی اللہ ہے۔ اسی

طرح مشاہدت سے مراد بقا ہے اور مجاہدت سے مراد فنا ہے۔

حضرت خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ

امام عصر' وفرید دہر' ابوعلی الحسن بصری رضی اللہ عنہ۔بعض نے آپ کی کنیت ابو محمد بیان کی ہے۔ بعض نے ابوسعید کہا ہے۔ اہل طریقت کے نزدیک آپ بڑے جلیل القدر ولی اللہ ہوئے ہیں۔ اور آپ کے اقوال بہت بلند ہیں۔

حقیقت صبر

روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک اعرابی (دیہاتی) آپ کے پاس آیا اور صبر کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا ہے صبر دو طرح کا ہوتا ہے ایک صبر وہ ہے جو مصیبت اور بلا کے وقت کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا ان چیزوں سے اپنے آپ کو باز رکھنے کا نام ہے جن سے حق تعالیٰ نے ہمیں باز رہنے کا کم دیا ہے۔ اور انکو قبول کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اعرابی نے کہا کہ **انت زاہد ملرایت ازھد منک** (آپ ایسے زاہد ہیں کہ میں نے آپ سے بڑا زاہد نہیں دیکھا)۔حضرت امام حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اے اعرابی میرا زہد رغبت (حرص) ہے اور میرا صبر جزع (مجبوری) ہے۔ اعرابی نے کہا ذرا اس کی تشریح کیجئے ورنہ میرا اعتقاد خراب ہو چلا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مصیبت کے وقت یا عبادت میں میرا صبر اس وجہ سے ہے کہ مجھے دوزخ کا ڈر ہے اور یہ جزع ہے (مجبوراً اختیار کیا ہے) اور دنیا میں میرا زہد دراصل جنت کی خواہش کی وجہ سے ہے۔ اور یہ رغبت ہے۔ لہٰذا خوش نصیب ہے وہ شخص جو خود کو درمیان سے اٹھا دے یعنی نہ تمنائے جنت سے عبادت کرے نہ خوف دوزخ سے اور صدق یہی ہے۔

روایت ہے کہ آپ نے فرمایا :

ان صحبۃ الاشرار تورث سوء الظن فی الاخیار

" جو شخص بروں کی صحبت اختیار کرتا ہے وہ بزرگوں سے بدظن ہو جاتا ہے ۔ "

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو صوفی برے لوگوں کی صحبت اختیار کرتا ہے وہ اکابر صوفیاء سے بدظن ہو جاتا ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں لوگ اکابر اولیاء کے منکر ہو گئے ہیں۔

شرح مطلب یہ ہے کہ بناوٹی صوفیوں کو دیکھ کر لوگ حقیقی صوفیاء کرام سے بدظن ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے سب اسی طرح ہوتے ہیں۔

ترجمہ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ان نام نہاد صوفیوں کو دیکھ کر اندازہ قائم کر لیتے ہیں اور سچے صوفیاء کو بناوٹی سمجھتے ہیں لہٰذا ان کی بھی شکایت میں زبان دراز کرتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب صوفیاء کرام اسی طرح دنیا پرست، حریص اور لالچی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ بناوٹی صوفی ہیں۔ لیکن ان کو معلوم نہیں کہ ان حضرات کا ہر کام طاعت الٰہی ہے۔ ان کا ہر کلام حقیقت پر مبنی ہے۔ اور عشق الٰہی کا نتیجہ ہے۔ ان کے قلوب عشق الٰہی سے لبریز ہیں۔ ان کے کان سوائے حق کے نہیں سنتے اور ان کی آنکھیں سوائے تجلیات حق کے نہیں دیکھتیں۔ اور ان کی ہمت مشاہدۂ جمال الٰہی پر مرکوز ہے۔ لہٰذا اگر ان میں سے کوئی ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو خیانت سے کام لیں (یعنی بناوٹی صوفی ہوں) تو اس خیانت کے وہ خود ذمہ دار ہیں نہ کہ اکابرین۔ اب اگر کوئی شخص ان جھوٹے دعویداروں کی صحبت اختیار کرتا ہے تو اپنی خباثت نفس کی وجہ سے کرتا ہے۔ اور اگر اس کے اندر نیکی ہوتی تو نیکوں کی صحبت اختیار کرتا۔ پس ملامت کا مستحق انسان خود ہے جس نے غلط آدمی کی صحبت اختیار کی۔ اور صوفیاء کرام کے منکر وہی ہیں جنہوں نے

رذیلوں کی صحبت اختیار کی اور جب ان کے دل کی مراد پوری نہیں ہوتی تو منکر ہوجاتے ہیں۔ اور شریروں اور مکاروں کی اقتداء کرکے برباد ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہیں وہ نیک ہی لوگوں کی صحبت اختیار کرتے ہیں۔ اور دل و جان سے ان کی متابعت کرتے ہیں۔ اور ان کی صحبت کی برکت سے مقصود دو جہانی حاصل کرتے ہیں اور دنیائے دون سے نجات پاتے ہیں۔

حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہٗ

رئیس علماء و فقہاء حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے عظیم الشان، رفیع المقام عزیز قوم اور جمیل الصدر **تابعی** بزرگ ہیں جن کو مختلف علوم و فنون مثل فقہ، توحید، حقائق، تفسیر، شعر و نعت میں کمال حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ بظاہر امیر اور بباطن فقیر تھے۔ اور طریقت میں یہی بہترین روش ہے۔

شرح ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جو مفلسی میں امیر نظر آئے، بھوکا ہے تو مطمئن دکھائی دے۔ غمگین ہے تو خوش دکھائی دے۔ اس سے اس کے صدق، قناعت اور راضی برضائے حق کا ثبوت ملتا ہے۔

ترجمہ اور یہی جملہ مشائخ کی روش رہی ہے حضرت سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ :

اوض بالیسر من الدنیا مع سلامتہ دینک کمارضی قوم بکثیر ھا مع ذھاب دینھم (تو دنیا کے کم ہونے اور دین کی سلامتی پر راضی ہو جا۔ جیسے بعض لوگ کثرت دنیا اور دین کی تباہی پر راضی ہوئے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کی سلامتی کے ساتھ فقر بہتر ہے اس دولت سے جس میں غفلت کا شکار ہو جائے کیونکہ فقیر جب اپنی دل کی طرف نگاہ کرتا ہے تو تفکرات دنیا کو نہیں پاتا اور اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہے تو سکونِ قناعت پاتا ہے۔ اس کے برعکس امیر اپنے اندر جھانکتا

ہے تو تفکرات پاتا ہے اور اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہے تو دنیائے دون کو پاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے محبان خدا کے لئے خداوند تعالیٰ کی رضا کے ساتھ راضی رہنا زیادہ بہتر ہے۔ اس سے کہ انسان غافل ہو کر دنیائے دون سے راضی رہے۔ اور فقر و فاقہ و مصائب بہتر ہیں معصیت اور گنہگاری کی ذلت سے۔ اس لئے جب غافلین پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ دعا کرتے ہیں کہ میری دنیا سلامت رہے اور جب دوستان خدا پر مصیبت آتی ہے تو وہ دعا کرتے ہیں کہ یا الٰہی میرا دین سلامت رہے۔ کیونکہ جب دل میں بقاء ہے اور تن مصیبت میں مبتلا ہے تو بلائے تن خوشی سے برداشت کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر دل میں غفلت ہے اور تن نعمت میں غرق ہے تو وہ نقبت (معیبت) بن جاتی ہے۔ درحقیقت قلتِ دنیا پر راضی رہنا کثرتِ دنیا ہے اور کثرتِ دنیا پر راضی رہنا قلتِ دنیا ہے۔ کیونکہ اس وقت اس کی قلت بھی کثرت بن جاتی ہے۔

شرح یعنی اگر مال و دولت کی فراوانی ہے اور اس پر سکون و قناعت نہیں بلکہ ہر وقت زیادہ سے زیادہ کی طلب میں مبتلا ہے تو یہ مفلسی ہوئی نہ کہ امیری۔ اور اگر تھوڑے پر قناعت، صبر، اطمینان قلب ہے تو کم بھی بہت معلوم ہوتا ہے۔ اور انسان خوش رہتا ہے۔ اس لئے قلت کثرت بن جاتی ہے۔

ترجمہ یہ بھی آپ کے متعلق روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ کہ ایک شخص نے آکر پوچھا کہ مجھے بتائیے کہ وہ کونسا حلال ہے کہ جس میں حرام نہ ہو۔ اور وہ کونسا حرام ہے کہ جس کے اندر حلال نہ ہو۔ آپ نے فرمایا :

"ذکر اللہ حلال لیس فیہ حرام و ذکر غیرہ حرام لیس فیہ حلال"

(یاد خدا وہ حلال ہے کہ جس میں حرام نہیں اور غیر اللہ کی یاد وہ حرام ہے۔

کہ جس میں حلال نہیں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یاد خدا میں نجات اور یاد غیر میں ہلاکت ہے۔ وباللہ التوفیق۔

نگار من بہ مکتب نرفت و خط نہ نوشت
بہ غمزہ نکتہ آموز صد معلم شد
یتیمیکہ نا کردہ ابجد درست
کتب خانہ چند ملت بشست
اُمّی و دقیقہ دان عالم
بے سایہ و سائبان عالم

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خُدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنُما
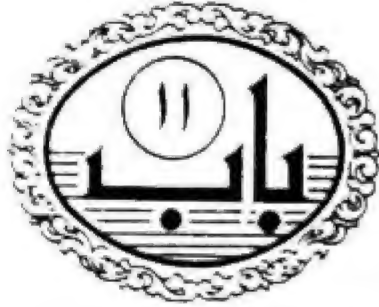
حضرت حبیب عجمی رضی اللہ عنہٗ

شجاع طریقت و متمکن اندر شریعت حضرت حبیب عجمی رضی اللہ عنہ بڑے بلند ہمت اور عظیم الشان ولی اللہ تھے اور آپ کا شمار اکابرین مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ نے توبہ حضرت امام حسن بصری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر کی۔ اوائل عمر میں آپ سود کا کاروبار کرتے تھے اور ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ خداوند تعالیٰ نے آپ کی توبہ قبول فرمائی اور آپ نے حق تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے علم و ہدایت حاصل کی۔ چونکہ آپ عجمی (غیر عرب) تھے عربی زبان نہیں بول سکتے تھے۔ اس کے باوجود حق تعالیٰ نے آپ کو ملک کا

راہبر بنایا۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے کہ امام حسن بصری رضی اللہ عنہ کا وہاں سے گزر ہوا لیکن چونکہ وہ صحیح طور پر قرات نہیں کر رہے تھے امام موصوف نے ان کے پیچھے نماز نہ پڑھی اور چلے گئے۔ رات کو خواب میں حق تعالیٰ کی زیارت ہوئی تو عرض کیا کہ بار خدایا تیری رضا کس چیز میں ہے ؟ حق تعالیٰ نے فرمایا اے حسن تو نے میری رضا پائی لیکن اس کی قدر نہ کی انہوں نے عرض کیا کہ حضور کس طرح ؟ فرمان ہوا کہ اگر تم حبیب کی عربی پر اعتراض نہ کرتے اور اس کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تو میری رضا پالیتے۔

حکایت روایت ہے کہ جب حضرت حسن بصریؒ رضی اللہ عنہ نے حجاج بن یوسف کے ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لئے حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ کے حجرہ میں پناہ لی تو حجاج کے آدمی نے حبیب رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آیا تم نے کہیں حسن بصریؒ کو دیکھا ہے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں دیکھا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہاں ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے حجرے میں ہیں۔ جب انہوں نے اندر جا کر دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا اور دل میں کہنے لگے کہ شاید حبیب نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے اس لئے انہوں نے ناراض ہو کر کہا کہ آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔ آپ نے کہا جھوٹ نہیں سچ کہتا ہوں وہ میرے اس حجرہ کے اندر ہیں۔ لیکن جب انہوں نے دوبارہ' سہ بارہ اندر جا کر دیکھا تو کچھ نہ پایا اور واپس چلے گئے۔ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے باہر آکر کہا اے حبیب یہ تو مجھے معلوم ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کی برکت سے مجھے ان ظالموں سے نجات دلائی ہے لیکن یہ بتائیں کہ آپ نے یہ کیوں کہا کہ وہ حجرے کے اندر ہیں ؟ انہوں نے جواب دیا اے استاد محترم یہ میری برکت نہیں ہے بلکہ سچ کہنے کی برکت ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ اگر میں جھوٹ بولتا تو وہ آپ کو اور مجھے بھی رسوا

کرتے اس قسم کی کرامات بہت ہیں جو ان سے رونما ہوئیں۔

رضائے خدا کس چیز میں ہے؟

ایک دفعہ کسی نے آپ سے پوچھا کہ رضائے خدا کس چیز میں ہے؟ فرمایا کہ **فی قلب لیس فیہ غبار النفاق** (اس قلب میں جو غبار نفاق یعنی منافقت سے پاک ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ نفاق خلاف وفاق (دوستی) ہے اور رضا عین وفاق ہے اور دوستی و محبت کا نفاق سے کوئی تعلق نہیں۔ دوستی کا خاصہ رضا ہے پس رضا صفتِ دوستان ہے اور نفاق صفتِ دشمنان اور یہ بات بہت اہم ہے جس کی تفصیل اپنی جگہ پر آرہی ہے۔ انشاء اللہ و بالتوفیق وعونہ۔

حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہٗ

نقیبِ اہل اُنس، زَین (زینت) ہمہ جنّ و انس حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ حضرت حسن بصری کے اصحاب (مریدین) اور اکابرینِ طریقت میں سے ہیں۔ آپ کی کرامات اور ریاضات بہت مشہور ہیں آپ کے والد کا نام دینار تھا جو ایک غلام تھے۔ اور حضرت مالک رحمتہ اللہ علیہ کی پیدائش بھی اسکے عہد غلامی میں ہوئی۔ آپ کی توبہ اس طرح ہوئی کہ ایک رات وہ اپنے ہم مذاق لوگوں کے ساتھ گانے بجانے میں مشغول تھے کہ جب سب لوگوں کو نیند آگئی تو باجے میں سے آواز آتی ہے "اے مالک' تو توبہ کیوں نہیں کرتا۔" یہ سنتے ہی وہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت امام حسن بصری رضی اللہ عنہ کے پاس جاکر ان کے ہاتھ پر توبہ کی۔اور آپ کا مرتبہ اس قدر بلند ہوا کہ ایک دن آپ کشتی میں سفر کر رہے تھے کہ کسی کا موتی گم ہوگیا۔ چونکہ کشتی میں آپ کو کوئی نہیں جانتا تھا سب نے ان ہی کو چور سمجھا آپ نے آسمان کی طرف منہ کیا تو فوراً دریا کی تمام **مچھلیاں** ایک ایک موتی منہ میں لئے سطحِ آب پر آگئیں۔ آپ نے ایک **مچھلی**

سے موتی لیا اور اس کے مالک کو دے کر پانی کی سطح پر قدم رکھا اور چلتے چلتے ساحل پر پہنچ گئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ **احب الاعمال علی الاخلاص فی الاعمال** (میرے نزدیک محبوب ترین عمل وہ ہے جو خلوصِ دل سے کیا گیا ہو)۔ اس وجہ سے کہ عمل اخلاص ہی سے عمل بنتا ہے۔ اخلاص عمل کے لئے ایسے ہے جیسے جسم کے لئے روح۔ جس طرح جسم بلا روح ایک پتھر سے زیادہ نہیں اسی طرح عمل بلا اخلاص بیکار ہے۔ اخلاص ایک باطنی چیز ہے اور عبادات و طاعات ظاہری اعمال کا نام ہے۔ اور عمل اس وقت تکمیل پاتا ہے جب باطن اس کے ساتھ شامل ہو اور باطن اس وقت وقعت پاتا ہے جب اس کا ظہور ظاہری اعمال سے ہو۔ اگر کوئی شخص ہزار سال تک دل میں مخلص رہے جب تک اخلاص کے ساتھ عمل کو شامل نہیں کرے گا مخلص نہیں ہو سکتا ہے اور اگر کوئی شخص ہزار سال تک عمل کرتا رہے جب تک اخلاص شامل نہیں کریگا اس کا عمل عبادت نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابو حلیم حبیب بن اسلم الراعی رضی اللہ عنہ

فقیرِ خطیر و برہمہ اولیاء امیر حضرت ابو حلیم حبیب بن اسلم الراعی رضی اللہ عنہ کو اولیاء اللہ کے درمیان بڑی قدر و منزلت حاصل ہے اور آپ کے تصرفات اور کرامات بیشمار ہیں۔ آپ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مرید ہیں اور اس حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے راوی ہیں **نیتہ المومن خیر من عملہ** ”مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے“۔ حضرت حبیب راعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بکریاں پالتے تھے۔ آپ دریائے فرات کے کنارے بیٹھ کر یاد الٰہی میں مشغول ہو جاتے تھے۔ آپ کا مشرب گوشہ نشینی تھا۔ ایک بزرگ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ میں ان کے پاس سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ نماز میں مشغول ہیں اور

ایک بھیڑیا بکریوں کی نگہبانی کر رہا ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اس پیر کی زیارت کروں بہت بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے سلام کیا انہوں نے دریافت کیا کہ بیٹے کس کام سے آئے ہو ؟ میں نے کہا کہ زیارت کے لئے آپ نے فرمایا **جزاک اللہ** میں نے عرض کیا کہ یا شیخ آپ کے یہاں تو بھیڑیا بکریوں کے ساتھ موافقت کر رہا ہے انہوں نے جواب دیا کہ ہاں یہ اس لئے ہے کہ بکریوں کا چرواہا خدا تعالیٰ کے ساتھ موافقت کرتا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ایک لکڑی کا پیالہ پہاڑ کے نیچے رکھ دیا اور پہاڑ میں سے دو چشمے پھوٹ نکلے ایک دودھ کا دوسرا شہد کا اور مجھ سے فرمایا کہ پیو میں نے عرض کیا کہ یا شیخ آپ نے یہ مرتبہ کیسے پایا ؟ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے۔ نیز فرمایا کہ اے بیٹے باوجودیکہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم ان کی مخالفت کر رہی تھی پہاڑ نے ان کو پانی دیا۔ لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ ہے جب میں آپ کی متابعت کرتا ہوں تو پہاڑ کیوں نہ مجھے دودھ اور شہد دیتا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ آپ کوئی نصیحت کریں۔ فرمایا **لا تجعل قلبک صندوق الحرص و بطنک وعاء الحرام** (دل کو حرص کی صندوق اور باطن کو حرام کا خزینہ نہ بنا) اس کی وجہ یہ ہے کہ خلقت کی ہلاکت ان ہی دو چیزوں سے ہوتی ہے اور نجات ان دو چیزوں سے پرہیز میں ہے۔ میرے شیخ علیہ رحمہ نے حضرت حبیب راعی رضی اللہ عنہ کی کئی روایات بیان فرمائیں جن کے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ میری کتابیں غزنی میں ہیں اور میں یہاں شہر لاہور میں جو ملتان کے مضافات میں واقع ہے غیر جنس کے لوگوں کی صحبت میں مبتلا ہوں **والحمد للہ علی السراء والضراء** (رنج و راحت پر حق تعالیٰ کا شکر ہے)۔

حضرت محمد بن واسع رضی اللہ عنہ

دائی اہل مجاہدت' و قائم اندر مشاہدت' حضرت محمد بن واسع رضی اللہ عنہ اپنے وقت میں بے نظیر تھے اور تابعین حضرات میں سے بہتوں کی صحبت کے پروردہ تھے۔ آپ نے بہت مشائخ عظام کی صحبت پائی اور ان سے فیض حاصل کیا۔ حقائق طریقت میں آپ کے اقوال و ارشادات بہت لطیف ہیں آپ فرماتے ہیں کہ **ما رایت شیأً الا و رایت اللّٰہ فیہ** "میں نے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی کہ جس میں اللہ کو نہ دیکھا"۔ اور یہ مقام مقام مشاہدہ ہے کہ جب بندہ فاعل حقیقی (حق تعالیٰ) کی دوستی میں اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کے فعل کو نہیں بلکہ فاعل کو دیکھتا ہے جیسا کہ جب کوئی شخص ایک تصویر کو دیکھتا ہے تو اس میں اس کو مصور نظر آتا ہے اور اس قول کی حقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کے مطابق ہے کہ سورج' چاند اور ستاروں کو دیکھ کر آپ نے فرمایا ہٰذا ربی (یہ میرا رب ہے) اور یہ کلمات غلبۂ و شوق میں آپ کی زبان مبارک سے سرزد ہوئے کہ جو کچھ نظر آیا اس میں جلوۂ محبوب دیکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اولیاء اللہ کائنات پر نظر کرتے ہیں تو سارے جہان کو قہر اور غلبہ حق میں مقہور اور مغلوب پاتے ہیں اور موجودات عالم کو حق تعالیٰ کی قدرت کے مقابلے میں بالکل لاشے اور معدوم اور ناچیز سمجھتے ہیں اور ہر چیز کو حق تعالیٰ کی قدرت میں مغلوب مقہور دیکھتے ہیں بلکہ خود قاہر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور مقہور کو نہیں دیکھتے۔ یعنی مفعول کو نہیں بلکہ فاعل کو دیکھتے ہیں اور مخلوق کو نہیں بلکہ خالق کو دیکھتے ہیں اور اس کی تفصیل انشاء اللہ عزوجل باب مشاہدہ میں آئے گی۔

یہاں صرف یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ بعض لوگوں کو شیخ محمد واسع رحمتہ اللہ علیہ کے قول **رایت اللّٰہ فیہ** "میں نے ہر چیز میں اللہ کو دیکھا" کے سمجھنے میں

غلطی ہوئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے مکان، تجزیہ (تقسیم) اور حلول لازم آتا ہے جو کفر ہے کیونکہ مکان اور مکین ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ مکان مخلوق ہے تو مکین (خدا) بھی مخلوق ہونا چاہئے اگر مکین کو قدیم مانا جائے تو مکان کا بھی قدیم ہونا لازم آتا ہے جو غلط ہے کیونکہ اس سے یا تو خلق کو قدیم کا درجہ ملتا ہے یا خالق کو محدث کا اور یہ دونوں نظریات کفر ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہر چیز میں خدا تعالیٰ کو دیکھنے کا وہی مطلب صحیح ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا۔ اس کے متعلق باقی رموز آگے آرہے ہیں۔

شرح حضرت محمد واسع رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول کہ "میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی کہ جس میں خدا کو نہ دیکھا" مسئلہ وحدت الوجود سے تعلق رکھتا ہے جو حضرت مخدوم ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں صرف اشارات کے ذریعے بیان کیا جاتا تھا لیکن بعد میں وہ وقت بھی آگیا کہ ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ نے کھلم کھلا یہ مسئلہ بیان کیا چونکہ مسئلہ بہت ادق ہے اور اس کا سمجھنا بے حد دشوار ہے ان کی بہت مخالفت ہوئی اور بعض نے ان پر کفر کے فتوے لگائے جیسا کہ یہاں بھی مکان، تجزیہ اور حلول کا سوال پیدا ہوا ہے۔ چونکہ وحدت الوجود کی پہلے ہم نے کافی شرح کر دی ہے یہاں صرف اتنا بتایا جاتا ہے کہ یہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حضرت مخدوم علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ آپ کے قول 'ہٰذا ربی (یہ میرا رب ہے) سے مراد یہ ہے کہ غلبہ حال میں ان کو تصویر کے اندر مصور نظر آیا۔ یعنی مخلوق کے اندر انہوں نے خالق کو دیکھا۔ یہ اس زمانے کے محتاط الفاظ ہیں۔ جو ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ سے پہلے کا زمانہ ہے اور زمانہ مابعد میں جو مباحث اور اصطلاحات وجود میں آئیں اور کھل کر اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو اب ہم اس حقیقت کو یعنی مصور کو تصویر کے اندر دیکھنے والی بات کو ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ وحدت الوجود سے یہ مراد نہیں کہ خدا تعالیٰ

ہر چیز کے اندر موجود ہے جیسے برتن میں پانی۔ بلکہ صورتحال تقریباً یہ ہے کہ جیسے مٹی کے برتنوں میں مٹی کو حاصل ہے۔ اگرچہ برتنوں کی صورت و شکل، طول و عرض مختلف ہیں لیکن ان کی اصل مٹی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے ذات حق نے ہر چیز کو اپنے نور سے پیدا فرمایا اور مختلف صورتیں عطا فرمائیں۔ لیکن نور تو وہ ایک ہے جیسے مٹی کے تمام برتنوں میں مٹی ایک ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص برتنوں کی شکل و صورت سے قطع نظر کر کے غلبۂ شوق کی وجہ سے ہر چیز کی اصل مٹی کہدے تو اس سے کونسا کفر لازم آتا ہے۔ ہاں جو چیز غلط اور کفر ہے یہ ہے کہ ہر چیز کو خدا کہا جائے کیونکہ خدا لامحدود ہے اور محدود چیز میں نہیں سما سکتا۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر چیز نہ خدا ہے، نہ خدا سے جدا ہے۔ یا یہ کہنا کفر ہے کہ ہر قطرہ سمندر ہے، لیکن یہ کہنا صحیح ہے کہ قطرہ سمندر سے جدا نہیں ہے۔ مکان اور مکین یا حلول کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مکان کا مکین سے علیحدہ وجود تسلیم کیا جائے۔ جب ہر برتن مٹی سے بنا ہوا ہے تو اس میں مکان اور مکین اور حلول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ سارا سمندر قطرہ کے اندر آگیا ہے جیسے ہندو اور عیسائی کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ان کے پیغمبروں میں اتر آیا ہے۔ ہم فقط یہ کہتے ہیں کہ قطرہ اگرچہ سمندر نہیں ہے لیکن سمندر سے جدا بھی نہیں ہے۔ یا ہر چیز مثلاً بت، سورج، پیغمبر خدا نہیں لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہیں۔ اسلام میں بت پرستی اسی طرح غلط اور مضحکہ خیز ہے جس طرح اگر کوئی شخص زید سے رقم مانگے اور وہ انکار کر دے تو وہ شخص زید کے ہاتھ سے کہے کہ اسے جیب سے رقم نکال کر دیدے۔ کیونکہ اس سے جز کو کل کا درجہ دیا جاتا ہے جو کفر ہے اور محدود کو لامحدود قرار دیا جاتا ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ جس طرح بظاہر موج، جھاگ، لہریں اور برف کے ٹکڑوں کا وجود دریا کے پانی سے علیحدہ نظر آتا ہے تاہم جھاگ، برف، حباب، لہریں ہیں تو دراصل سب ہی پانی۔

حضرت ابو حازم المدنی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ابوحازم المدنی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار مقتدائے مشائخ میں ہوتا ہے۔ طریقت میں آپ کا مقام نہایت بلند' فقر میں آپ کا قدم صادق تھا اور مجاہدات میں آپ کی روش کامل تھی۔ حضرت عمر بن عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ آپ کے بڑے جوشیلے تبع تھے۔ آپ کا کلام بے حد مقبول تھا اور اکثر کتبِ تصوف میں پایا جاتا ہے۔ حضرت عمر بن عثمان کی رحمتہ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوحازم مدنی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ **ماحالک** "آپ کا حال کیا ہے" انہوں نے جواب دیا کہ **الرضاء عن اللّٰہ و الغناء عن النلس** (حق تعالیٰ سے راضی ہونا اور خلق خدا سے استغنیٰ)۔ لامحالہ جو شخص خدا تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے وہ مخلوق سے مستغنی ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ سے راضی ہونا بہت بڑا خزانہ ہے۔ اور یہی مقام غنا ہے بخدا عزوجل۔ لہٰذا جو شخص حق کے ساتھ غنی ہے خلق سے مستغنی ہوتا ہے اور غیر اللہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتا اور خلوت اور جلوت میں اسی کو چاہتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوحازم مدنی رحمتہ اللہ علیہ کو ملنے گیا اور دیکھا کہ آپ سو رہے ہیں تھوڑی دیر بعد آپ نے اٹھ کر فرمایا کہ ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خواب میں فرمایا ہے کہ آپ کو یہ پیغام پہنچا دوں کہ ماں کی خدمت حج سے بہتر ہے۔ واپس جاؤ اور ماں کی خدمت کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حج کو نہ گیا اور واپس گھر چلا گیا۔ ان کے اقوال اس سے زیادہ میری نظروں سے نہیں گزرے۔

حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت الخراز رضی اللہ عنہٗ

امام امامان' و مقتدائے سنیاں' و شرف فقہا' و عز علماء حضرت امام ابوحنیفہ

نعمان بن ثابت الخراز رحمتہ اللہ علیہ مجاہدات اور عبادات میں بڑے ثابت قدم تھے اور طریقت میں آپ کا مقام بہت بلند تھا ابتدائے عمر میں آپ نے عزلت اختیار کی اور تارک الدنیا ہو کر بیٹھ گئے تاکہ خلقِ خدا سے علیحدہ رہ کر یادِ حق میں مشغول ہو سکیں۔

امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا ایک اہم خواب

ایک رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزار مبارک میں آپ کی ہڈیاں علیحدہ علیحدہ کر رہا ہوں اور بعض کو بعض سے زیادہ اختیار کر رہا ہوں۔ آپ خواب کی ہیبت سے بیدار ہو گئے اور حضرت محمد ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہؒ کے ایک مرید سے خواب کی تعبیر طلب کی۔ تو انہوں نے فرمایا کہ تم سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے تحفظ میں درجہ کمال کو پہنچو گے۔ چنانچہ آپ اس کام میں مشغول ہو گئے اور صحیح کو سقیم سے علیحدہ کر دیا۔

امام صاحب کا دوسرا خواب

دوسری بار آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یا ابو حنیفہ عزلت مت اختیار کرو کیونکہ تجھے میری سنت زندہ کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ امام موصوف کافی مشائخ کے استاد ہیں مثلاً حضرت ابراہیم بن

ؒ (حضرت محمد ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے ہم عصر تھے آپ کے والد سیرین جنگ تمرین میں فاتح اندلس موسیٰ کے والد کے ساتھ چالیس عیسائی لڑکوں کے ساتھ جنگی قیدی بن کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے۔ محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ خواب کی تعبیر میں ماہر فن تھے آپ کی کتاب "تعبیر الرؤیا" بہت ضخیم ہے۔)

ادھمؒ، حضرت فضیل ابن عیاضؒ، حضرت داؤد طائیؒ اور حضرت بشر حافیؒ وغیرھم۔

امام ابوحنیفہؒ کا عہدہ قاضی القضاہ سے انکار

علماء کرام کے تذکروں میں لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ ابو جعفر **المنصور** نے ارادہ کیا کہ چار علماء میں سے ایک کو قاضی کے عہدہ کے لئے منتخب کیا جائے وہ علماء یہ تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ مسعر بن کدام رحمتہ اللہ علیہ اور قاضی شریح رحمتہ اللہ علیہ۔ یہ چاروں اکابر علماء تھے۔ جب خلیفہ کی طرف سے بلاوہ آیا تو ان حضرات نے راستے میں مشورہ کیا کہ کسی نہ کسی بہانے اس بلا کو دفع کیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ نے کہا میری تجویز یہ ہے کہ میں کوئی بہانہ بنا کر بچ جاؤں گا' مسعر بن کدامؒ دیوانہ بن جائے' سفیانؒ بھاگ جائے اور شریحؒ قضا قبول کر لے۔ چنانچہ سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ تو راستے سے بھاگ گئے اور ایک کشتی میں بیٹھ کر کہا کہ مجھے پناہ دیدو بادشاہ کے لوگ میرا سر کاٹنے کو آرہے ہیں۔ انہوں نے یہ بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی بنا پر دیا کہ **من جعل قاضیا فقد ذبح بغیر سکین** (جو قاضی بنایا گیا وہ ذبح کیا گیا بغیر چھری کے) چنانچہ ملاحوں نے ان کو کشتی میں چھپا دیا۔ اور باقی تین حضرات خلیفہ منصور کے دربار میں پہنچ گئے۔ سب سے پہلے خلیفہ نے امام ابوحنیفہؒ سے کہا کہ آپ کو یہ عہدہ قبول کرنا چاہئے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ **یا ایھا الامیر** میں عرب نہیں ہوں بلکہ عربوں کے موالی (غلام) میں سے ہوں۔ عرب سادات میرے فیصلے کو کیسے قبول کریں گے۔ منصور نے جواب دیا کہ اس کام میں نسبت یعنی قومیت کا کوئی تعلق نہیں ہے اس کام کے لئے علم شرط ہے اور آپ بہترین عالم ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ میں قضا کے قابل نہیں ہوں۔ منصور نے کہا نہیں مجھے یقین ہے کہ آپ اس کے قابل ہیں اس پر آپ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں لہٰذا اگر سچ کہتا ہوں تب بھی میں قضا

کے قابل نہیں ہوں، اگر جھوٹ بولتا ہوں تب بھی میں قابل نہیں ہوں کیونکہ ایک جھوٹا شخص قاضی نہیں بن سکتا یہ کہہ کر انہوں نے جان چھڑالی۔

شرح بعض روایات میں ہے کہ امام موصوف کے اس جواب سے بادشاہ کو غصہ آگیا اور آپ کو قید کر دیا اور قید خانہ میں وصال پایا۔ اس پر مولانائے روم نے یہ شعر کہا ہے۔

بوحنیفہ قضا نکرد و بمرد
تو بمیری اگر قضا نکنی

(امام ابوحنیفہ نے موت قبول کی لیکن قضا قبول نہ کی۔ لیکن اے مخاطب تیرا یہ حال ہے کہ اگر تجھے قضا نہ ملے تو مرنے لگتا ہے اور خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے)

کتنا بڑا فرق ہے اکابرین علماء اور آجکل کے لوگوں میں۔ دراصل امام موصوف نے ایک بہت بڑے اصول کی بنا پر قضا سے انکار کیا۔ وہ یہ کہ آپ کا تعلق اسلامی مقننہ سے تھا لیکن آپ کو انتظامیہ کا سربراہ مقرر کیا جارہا تھا جو اصولاً غلط تھا کیونکہ اگر مقننہ اور انتظامیہ ایک ہی شخص میں جمع ہوں تو دھاندلی مچ جاتی ہے۔ جیسے آجکل بلکہ انگریزوں کے زمانے سے یہ دونوں منصب ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے پاس ہیں جو حکومت کا بہت بڑا نقص سمجھا جاتا ہے اور انگریزوں کے زمانے سے آج تک اس خامی کو دور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن تاحال اس کا کوئی حل نہیں ملا۔ لیکن امام موصوف نے اصول پر عمل کیا اور اتنے بڑے عہدے کو اصول کی خاطر ٹھکرا دیا۔ کاش کہ آپ کی مثال پر آج بھی عمل ہوتا۔)

ترجمہ اس کے بعد مسعر بن کدام ؒ کی باری آئی تو انہوں نے دیوانگی کا اظہار کرتے ہوئے خلیفہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہنے لگے کہ آپ کا کیا حال ہے۔ بال

بچے کیسے ہیں۔ اور اہل پردہ کس طرح ہیں۔ یہ دیکھ کر منصور نے کہا کہ یہ دیوانہ ہے' اسے باہر لے جاؤ۔ اس کے بعد شریح رحمتہ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ قضا قبول کریں تو انہوں نے کہا کہ میں ایک سودائی آدمی ہوں اور میرا دماغ بہت کمزور ہے۔ خلیفہ نے کہا کوئی بات نہیں ہے۔ مقوی غذا اور ادویات سے آپ کا علاج کیا جائے گا۔ اور آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ چنانچہ قاضی شریح رحمتہ اللہ علیہ کو عہدہ سپرد کر دیا گیا۔ اس کے بعد امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے قاضی شریح رحمتہ اللہ علیہ کا کبھی منہ نہ دیکھا اور تعلق قطع کر لیا۔ ان دونوں باتوں سے امام موصوف کی فراست کا کمال ثابت ہوتا ہے کہ ایک تو آپ نے اپنے تینوں دوستوں کے لئے راہ مقرر کر دی۔ دوسرے یہ کہ جاہ و جلال کو ٹھکرا کر یکسوئی اختیار کر لی اور سلامتی پائی۔ نیز اس حکایت سے صوفیاء کرام کے مسلکِ ملامت کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے آپ کو رسوا کر کے دنیاوی جاہ و مرتبہ سے جان چھڑائی۔ اور راہِ سلامت اختیار کیا۔ لیکن آج کل کے علماء اس اصول کے خلاف ہیں۔ کیونکہ وہ حرص و ہوا کے تابع ہیں۔ اور طریقِ حق کو چھوڑ کر انہوں نے امراء کے گھروں کو قبلہ بنا لیا ہے۔ اور حرص و ہوس کی پیروی میں ہر اصول کو ٹھکرا دیتے ہیں۔

ایک دفعہ غزنی میں (خدا اسے محفوظ رکھے) ایک علم اور امامت کے مدعی نے کہا کہ مرقعہ پہننا بدعت ہے۔ میں نے کہا کہ زر و کنار کا لباس جو سراسر ریشمی ہوتا ہے پہننا تو آپ کے لئے حلال ہے حالانکہ مردوں کے لئے ریشم کا استعمال شریعت میں حرام ہے اور پھر وہ حرام ملبوسات بھی آپ ظالموں سے التجا کر کے حاصل کرتے ہیں' حالانکہ التجا کر کے حاصل کرنا اور بھیک مانگنا بھی حرام ہے۔ ان تمام حرام امور کو تو آپ جائز سمجھتے ہیں اور بدعت قرار دیتے ہیں۔ اگر غرور و تکبر اور نفس آپ پر غالب نہ ہوتا تو ایسی باتیں نہ کرتے۔ ریشم عورتوں کے لئے

حلال ہے' مردوں کے لئے حرام اور دیوانوں کے لئے مباح ہے۔ لیکن اگر آپ ان اصولوں کے منکر ہیں تو اس عدم انصاف (ظلم) کی وجہ سے ہم آپ سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا تیسرا خواب

امام موصوف فرماتے ہیں کہ نوفل بن حیان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے۔ اور سب لوگوں کا حساب کتاب ہو رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حوض کوثر کے کنارے پر کھڑے ہیں اور آپ کے دائیں بائیں مشائخ کھڑے ہیں اور ایک بزرگ کو دیکھا کہ نہایت خوبصورت ہیں سفید بال آپ کے کندھوں پر پڑے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک پر رخسار رکھے ہوئے ہیں۔اس وقت میں نے نوفل بن حیان کو بھی دیکھا کہ ان کے پاس کھڑے ہیں۔ جب وہ میری طرف آئے تو میں نے ان سے پانی طلب کیا' انہوں نے جواب دیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری لے کر دوں گا۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی سے اشارہ فرمایا کہ دیدو۔ چنانچہ میں نے پانی پیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی پلایا لیکن برتن اسی طرح بھرا رہا اس کے بعد میں نے نوفل سے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں طرف وہ کون بزرگ ہیں انہوں نے جواب دیا کہ یہ حضرت ابراھیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ بائیں طرف کون ہیں انہوں نے جواب دیا کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اسی طرح میں پوچھتا رہا اور انگلیوں پر گنتا رہا کہ انہوں نے مجھے سترہ بزرگوں کے نام بتائے۔ جب میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ میری انگلی سترہ پر تھی۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا خواب امام ابوحنیفہؒ کے متعلق

حضرت شیخ یحییٰ بن معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایک رات خواب میں مجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی' میں نے عرض کیا حضور میں آپ کو کہاں طلب کروں ؟ فرمایا **عند علم ابوحنیفہ** (ابوحنیفہ کے علم میں)۔

امام موصوف کے زہد و اتقیٰ کے واقعات بیشمار ہیں جن کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے متعلق حضرت مخدوم علی ہجویریؒ کا خواب

اور میں علی بن عثمان الجلابی ایک رات ملک شام میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے روضہ اقدس پر سویا ہوا تھا کہ خواب میں دیکھا کہ مکہ مکرمہ میں ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے کعبتہ اللہ میں داخل ہو رہے ہیں اور ایک بوڑھے شخص کو گود میں اٹھایا ہوا ہے جس طرح بچے کو اٹھایا جاتا ہے میں فرط شوق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑ کر گیا اور آپ کے قدم مبارک کی پشت پر بوسہ دیا۔ میں حیران تھا کہ آخر وہ مرد پیر کون ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باطنی فراست سے میرے دل کی بات سمجھ لی اور فرمایا کہ یہ تمہارے اور تمہارے ملک کا امام یعنی ابوحنیفہ ہے اس سے مجھے اور میرے اہل دیار کو اس خواب سے بڑی امیدیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ نیز اس خواب سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امام ابوحنیفہ ان لوگوں میں سے ہیں کہ اپنی صفات بشریہ سے فانی اور احکام شریعت کے ساتھ باقی ہو چکے ہیں۔ اور ان کی صفات بشریہ کے مٹانے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ اگر وہ خواب میں اپنے قدموں پر چلتے تو باقی الصفتہ ہوتے اور جو اپنی صفات سے باقی ہوتا ہے تو یا تو وہ

خطاکار ہوتا یا واصل باللہ، اور جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت فانی الصفۃ ہوئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سے باقی تھے۔ اور چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خطا سے پاک ہیں اس شخص کا خطاوار ہونا بھی ممکن نہیں اور اس میں راز ہے۔

شرح فانی الصفتہ کا مطلب یہ ہے کہ امام موصوف کو فنا فی الرسول کا مقام حاصل تھا یعنی اپنی صفات سے فانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سے باقی تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اٹھایا ہوا تھا۔ اگر وہ اپنے قدموں پر چلتے ہوتے تو فنا فی الرسول نہ ہوتے۔ اس میں راز یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ سے فانی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میں باقی ہو چکا ہے تو اس کا کوئی کام یا فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم اور خطا سے پاک ہیں۔ اس لئے امام ابو حنیفہؒ کا مسلک صحیح ترین ہے۔

ترجمہ کہتے ہیں کہ جب داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ نے علم حاصل کر لیا اور مرکز اور مقتدائے خلائق ہوئے تو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس جا کر پوچھا کہ اب میں کیا کروں ؟ آپ نے فرمایا **علیک بالعمل فان العلم بلاعمل کالجسد بلاروح** (تم پر عمل واجب ہے کیونکہ عمل کے بغیر علم ایسے ہے جیسے روح کے بغیر جسم) جب تک علم کے ساتھ عمل شامل نہ ہو کام صحیح نہیں ہوتا ہے۔ جو شخص صرف علم پر اکتفا کرتا ہے وہ عالم نہیں ہوتا جیسے راہ ہدایت کے حصول کے لئے مجاہدت کی ضرورت ہوتی ہے ویسے علم کے لئے عمل ضروری ہے یا جس طرح مجاہدت کے بغیر مشاہدہ ممکن نہیں عمل کے بغیر علم بے معنی ہے اور عمل کے بغیر کشائش اور فوائد حاصل نہیں ہوتے۔ اس لئے علم کو عمل سے ہرگز جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے کہ نورِ آفتاب کو آفتاب سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور علم

کے متعلق اس کتاب میں مختصر بیان آچکا ہے۔ وباللہ التوفیق (سب توفیق اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے)۔

حضرت عبداللہ بن مبارک المروزی رحمتہ اللہ علیہ

سیدِ زہاد و قائدِ اوتاد حضرت عبداللہ بن مبارک المروزی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار اکابرینِ مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ تمام علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ تھے اپنے وقت کے امام تھے آپ نے کافی مشائخ کی صحبت پائی اور فیض حاصل کیا۔ تمام علوم پر آپ کی تصانیف بہت ہیں اور آپ کی کرامات مشہور ہیں۔ آپ کی توبہ کا واقعہ یہ ہے۔ آپ ایک عورت پر عاشق تھے۔ ایک رات اپنے مست ساتھیوں سے اٹھ کر آپ معشوقہ کے گھر پر گئے اور ساری رات اس کی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر باتیں کرتے رہے۔ جب صبح کی اذان ہوئی تو انہوں نے سمجھا کہ یہ عشاء کی اذان ہے لیکن جب تھوڑی دیر بعد صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو حیران ہوئے کہ ساری رات محبوبہ کے مشاہدۂ جمال میں گزار دی ہے۔ اس سے ان کے دل میں شرم محسوس ہوئی اور اپنے آپ سے کہا اے مبارک کے بیٹے آج تم نے ساری رات معشوقہ کے ساتھ گزار دی ہے لیکن اگر امام نماز میں لمبی سورۃ پڑھے تو تم غصے سے پاگل ہو جاتے ہو کہ وہ ہماری نیند خراب کرتا ہے۔ کیا یہ مسلمانی ہے کہ جس کے تم دعویدار ہو۔ اسی روز آپ نے توبہ کی اور طلب علم میں مشغول ہو گئے اور زہد و عبادت کر کے بلند درجات پر پہنچے۔ ایک دفعہ آپ کی والدہ باغ میں گئیں۔ وہاں جاکر کیا دیکھتی ہیں کہ وہ سو رہے ہیں اور ایک بہت بڑا سانپ گل ریحان کی شاخ منہ میں لئے ان کے چہرہ سے مکھیاں اڑا رہا ہے۔ اس کے بعد آپ شہر مرو سے رخصت ہوئے اور بغداد میں آکر مشائخ عظام کی صحبت میں رہے اس کے بعد جب اپنے شہر مرو میں واپس گئے تو ساری خلقت ان کے

گرد جمع ہو گئی اور درس و تدریس کی درخواست کی۔ اس وقت شہر کی نصف آبادی اہل حدیث پر مشتمل تھی اور نصف اہل الرائے (اہل فقہ) تھے۔ لیکن آپ دونوں فرقوں میں ہر دلعزیز تھے اور ہر فرقہ ان کو اپنا پیشوا سمجھتا تھا۔ اس لئے وہاں آپ نے دو مدارس قائم کئے ایک اہل حدیث کے لئے اور ایک اہل الرائے کے لئے اور آج تک دونوں مدارس بدستور چل رہے ہیں۔

اس کے بعد آپ حجاز تشریف لے گئے اور وہاں حرمین شریفین میں مجاور ہوئے۔ آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ کوئی عجوبہ بھی دیکھا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ ہاں میں نے ایک راہب کو دیکھا کہ مجاہدات کی وجہ سے نیم جان ہو چکا تھا اور خوف خدا کی وجہ سے دوتاہ ہو گیا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ **یا راہب کیف الطریق الی اللہ** "اے راہب اللہ تک جانے کا راستہ کیسا ہے" اس نے جواب دیا **لو عرفت اللہ لعرفت الطریق** (اگر خدا کی پہچان ہوئی تو راستہ بھی پہچان لو گے) اس کے بعد اس راہب نے کہا **اعبد من لا اعرفہ و تعصی من تعرفہ** (میں اس کو نہیں پہچانتا اور اس کی عبادت میں مشغول ہوں آپ اس کو پہچانتے ہیں اور عبادت نہیں کرتے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معرفت حق اسباب کا تقاضا کرتی ہے کہ تو خوف کھائے لیکن میں تجھے بے خوف دیکھ رہا ہوں اور کفر کا تقاضا جہل ہے لیکن میں کافر ہوں اور خوف بھی کھا رہا ہوں۔ حضرت عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مجھے نصیحت ہوئی اور بہت سے ناپسندیدہ امور سے باز رہا۔

شرح (عیسائی راہبوں کے اس قسم کے قصے پڑھ کر یورپ کے مصنف نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ بس صوفیائے اسلام نے عیسائی راہبوں سے تصوف سیکھا ہے۔ حالانکہ وہ راہب خود کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان لوگ حق پر ہو اور پھر بھی خوف خدا نہیں کرتے اور عبادت میں ہمہ تن مشغول نہیں ہوتے اور میں خدا کو نہیں

پہچانتا لیکن خوف خدا سے دہرا ہو گیا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ سخت مجاہدات کے باوجود عیسائی راہب اپنے آپ کو گمراہ اور مسلمانوں کو راہ راست پر سمجھتا تھا۔ اس طرح ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو خدا کا راستہ کس نے دکھایا اس نے جواب دیا کہ بلی نے کیونکہ جب میں نے دیکھا کہ ایک بلی چوہے کی تاک میں سارا دن بیٹھی رہی تو مجھے تعجب ہوا اور نصیحت بھی ہوئی کہ میں کیوں نہ مجاہدات میں مشغول ہو جاؤں۔ اب اگر جس طرح بلی صوفیاء کی استاد بن گئی اسی طرح عیسائی راہب بھی ان کے استاد کہلائیں تو ٹھیک ہے۔)

ترجمہ آپ فرماتے ہیں کہ **السکون حرام علی قلوب اولیائہ** (اللہ کے دوستوں کے قلوب پر سکون حرام ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قوم پر سکون حرام ہے دنیا میں وہ مجبوری از حق کیوجہ سے مضطرب رہتے ہیں اور آخرت میں حضوریٔ حق اور برقِ تجلیات سے بے قرار ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے دنیا اور عقبیٰ یکساں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سکونِ دل دو وجوہات سے ملتا ہے یا حصولِ مقصد کی وجہ سے یا مقصد سے غفلت کی وجہ سے لیکن یافت (وصال حق) نہ دنیا میں حاصل ہے نہ عقبیٰ میں۔ اس لئے عاشقانِ الٰہی کے قلوب ہر وقت مضطرب رہتے ہیں اور اس قول کا تعلق حقیقت سے ہے۔

شرح "عاشقوں کے لئے نہ دنیا میں وصال ہے نہ عقبیٰ میں" اس قول کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ ذات حق کی کوئی انتہا نہیں، مراتبِ قرب کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ عاشق الٰہی قرب کے جس مرتبہ یا منزل پر ہو وہ اپنے آپ کو مہجور سمجھتا ہے۔ مرزا بیدل نے خوب کہا ہے۔

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمار ما
چہ قیامتے کہ نمے رسی زکنارِ ما بکنارِ ما

اس سے پہلے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔

حضرت فضیل ابن عیاض رضی اللہ عنہ

شاہِ اہلِ معرفت اور بادشاہِ درگاہ وصلت حضرت ابو علی فضیل ابن عیاض رحمتہ اللہ علیہ کا شمار اکابرینِ مشائخ طریقت و عمائدِ اہل حقیقت میں ہوتا ہے۔ حقائق و معارف میں آپ کے اقوال بہت لطیف ہیں اور آپ کی کرامات مشہور ہیں۔ آپ بڑے متقی و پرہیزگار تھے اور آپ کا صدق و اخلاص ضرب المثل تھا۔ لیکن اوائل عمر میں آپ کا پیشہ راہزنی تھا اور آپ مرو اور ماورد کے درمیان قافلوں کو لوٹا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا میلانِ طبع نیکی کی طرف تھا اور راہزنی میں بھی آپ جوانمردی اور سخاوت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مثلاً آپ قافلے کی عورتوں کے قریب نہیں پھٹکتے تھے اور جس شخص کے پاس مال کم ہوتا تھا آپ اس سے درگزر کرتے تھے اور مال لوٹتے وقت بھی آپ اہل قافلہ کی ضروریات کے لئے مناسب مال چھوڑ دیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک تاجر کا قافلہ شہر بارزگان سے مرو جارہا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ خبردار فضیل راستے میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے وہ خدا ترس انسان ہے۔ اس لئے اس نے ایک قاری کو کچھ رقم دے کر اپنے ساتھ لے لیا اور اونٹ پر سوار کر کے اس سے کہا کہ شب و روز قرآن پڑھتے جاؤ۔ جب قافلہ فضیل کی کمین گاہ کے قریب پہنچا تو اتفاق سے قاری یہ آیت پڑھ رہا تھا اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ایمان والوں کے دل اللہ کے ذکر سے ڈر جائیں) یہ سن کر ان کے دل میں رقت پیدا ہوئی اور حق تعالیٰ کی نظر عنایت کے غلبے سے ان کا دل کانپ اٹھا اور فوراً توبہ کر لی۔ ان کے پاس ان تمام لوگوں کی فہرست تھی جن کو انہوں نے لوٹا تھا۔

ان کی حق رسی کر کے آپ مکہ مکرمہ چلے گئے اور کئی برس وہاں خانہ کعبہ کی مجاورت میں گزار دیئے جہاں ان کو بہت سے مشائخ عظام کی صحبت ملی۔ اس کے بعد آپ کوفہ تشریف لے گئے اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے۔ فن حدیث اور حقائق تصوف میں آپ کے اقوال بہت بلند ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ **من عرف اللّٰہ حق معرفتہ عبدہ بکل طاقتہ** (جس نے کماحقہٗ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کی وہ اپنی پوری طاقت سے اس کی عبادت میں منہمک ہوا)۔ کیونکہ جو شخص حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتا ہے اس کی نعمتوں' رحمتوں اور احسان کی بدولت معرفت حاصل کرتا ہے اور جب اس کی معرفت حاصل ہو گئی تو پھر اس سے محبت کرتا ہے اور محبت کی وجہ سے طاعت اس پر آسان ہو جاتی ہے۔ پس جس شخص کے دل میں خداوند تعالیٰ کی محبت زیادہ ہو گی عبادت پر وہ اتنا ہی حریص ہو گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ محبت کا دارومدار معرفت پر ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید وہ کسی دوسرے حجرہ میں تشریف لے گئے ہیں چنانچہ میں اٹھی اور آپ کی حس کے اثر کے پیچھے چلتی رہی حتیٰ کہ مسجد میں پہنچ گئی اور کیا دیکھتی ہوں کہ آپ نماز میں کھڑے ہیں اور آپ پر گریہ طاری ہے۔ حتیٰ کہ صبح ہو گئی اور بلال نے آکر اذان دی۔ نماز کے بعد آپ گھر تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے پاؤں سوجے ہوئے ہیں اور پاؤں کی دو انگلیاں پھٹ چکی ہیں اور ان میں سے زرد رنگ کا پانی بہہ رہا تھا۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر مجھے رونا آگیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے تمام اولین و آخرین گناہ معاف کر دیئے ہیں تو آپ اس قدر مشقت کیوں برداشت کر رہے ہیں۔ یہ سختی تو اس شخص کو جھیلنا مناسب ہے جو مامون العاقبت نہ ہو۔ یہ سن

کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ! یا عائشہ جب خداوند تعالیٰ کا مجھ پر اس قدر لطف و کرم ہے تو کیا میں اس کا شکرگزار بندہ نہ بنوں۔ جب مجھ پر اس کی اسقدر رحمت ہے کہ میرے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے ہیں تو میرا فرض ہے کہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کی بندگی کا حق ادا کروں۔ نیز جب شبِ معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پچاس نمازوں کا حکم ہوا تو آپ نے حق تعالیٰ کا فرمان قبول کر لیا اور اسے گراں (بوجھ) نہ سمجھا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر واپس جا کر پانچ نمازیں منظور کرائیں۔ کیونکہ آپ کی طبع مبارک میں فرمان الٰہی سے چون و چرا کا مادہ ہی نہیں تھا۔ **لان المحبتہ ھی الموافقتہ** (کیونکہ محبت سراسر موافقت ہے)۔

آپ فرماتے ہیں کہ **الد نیاء دارالمرضیٰ والناس فیھا کالمجانین وللمجانین فی دار المرضی الغل و القید** (دنیا ایک پاگل خانہ ہے جس کے اندر مجنون جمع ہیں اور مجنون بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں مقید ہیں) نفسانی خواہشات ہماری بیڑیاں ہیں اور گناہ ہماری ہتھکڑیاں ہیں۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ سے خلیفہ ہارون الرشید کی ملاقات

عباسی خلیفہ ہارون الرشید کا وزیر فضل (برمکی) بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ میں خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ حج کو گیا۔ حج کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ کسی مرد خدا کی زیارت کروں میں نے کہا جی ہاں عبدالرزاق صنعانی یہاں موجود ہیں آپ کو ان کے پاس لے چلتا ہوں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو کچھ دیر گفتگو کے بعد واپس آ گئے۔ اٹھنے سے پہلے ہارون الرشید نے مجھے اشارہ کیا کہ ان سے پوچھوں کہ آیا آپ نے کسی کا قرض ادا کرنا ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا تو جواب ملا ہاں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کا قرض ادا کر دیا جائے۔ واپس

آنے پر خلیفہ نے کہا کہ میرا جی ابھی نہیں بھرا۔ جی چاہتا ہے اس سے بھی بڑے ولی اللہ کو ملوں۔ میں نے کہا کہ سفیان بن عینیہ بھی یہاں ہیں۔ خلیفہ نے کہا ان کے پاس چلیں۔ ہم ان کے پاس گئے کچھ دیر بات چیت کی اور خلیفہ نے اشارہ کیا کہ ان سے پوچھوں کہ آپ کے ذمہ کسی کا قرض ہے۔ جب میں نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں ہے۔ خلیفہ نے کہا ان کا قرض ادا کر دیا جائے۔ اس کے بعد خلیفہ نے کہا میرا جی ابھی تک نہیں بھرا۔ مجھے یاد آیا کہ فضیل ابن عیاض رحمتہ اللہ علیہ بھی یہاں ہیں چنانچہ میں خلیفہ کو ان کے پاس لے گیا۔ آپ چوبارہ میں بیٹھے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب دروازہ کھٹکھٹایا تو آپ نے پوچھا کون ہے۔ میں نے کہا کہ امیرالمومنین آپ سے ملنے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا میرا امیرالمومنین سے کیا کام۔ میں نے کہا سبحان اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ "بندہ اپنے آپ کو خدا کی بندگی میں ذلیل نہیں کرتا" انہوں نے جواب دیا کہ ہاں لیکن میری عزت رضائے الٰہی ہے۔ یہ کہہ کر آپ نیچے آئے اور دروازہ کھولا۔ لیکن چراغ بجھا دیا اور ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ ہارون نے اندھیرے میں آپ سے مصافحہ کیا آپ نے فرمایا کہ کیسے نرم ہاتھ ہیں اگر دوزخ سے بچ جائیں تو۔ یہ سن کر ہارون پر گریہ طاری ہو گیا اور اس قدر رویا کہ بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو عرض کیا یا شیخ مجھے نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے امیرالمومنین تیرے باپ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کسی علاقے کا حاکم مقرر فرمایا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے چچا جان میں نے ایک لحظہ کے لئے آپ کو آپ کے نفس پر حاکم بنایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ طاعت حق تعالیٰ میں ایک لحظہ اس سے بہتر ہے کہ ہزار سال خلق پر حکومت کی جائے۔ ہارون نے کہا کچھ اور نصیحت فرمائی جائے۔ آپ نے فرمایا جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کو

خلافت کے لیے منتخب کیا گیا تو انہوں نے سالم بن عبداللہ' رجا بن حیات اور محمد بن کعب القرظی کو طلب کر کے کہا کہ میں اس مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اب میرے لیے کیا تدبیر ہے کہ اس بلا سے بچ جاؤں۔ اگرچہ لوگوں کے نزدیک یہ نعمت ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ کل قیامت کے دن خداوند تعالیٰ کے عذاب سے نجات ملے تو اپنے سے بڑے مسلمانوں کو باپ کی طرح سمجھو' ہم عمر لوگوں کو بھائی اور چھوٹوں کو اولاد کے برابر سمجھو اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کرو کہ جس طرح گھر میں باپ' بھائی اور بیٹے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسلام کا یہ تمام جہان تمہارا گھر ہے اور خلق خدا تمہارے اہل و عیال ہیں۔ اس کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ یا امیرالمومنین مجھے ترس آتا ہے کہ تمہارا یہ حسین چہرہ کہیں آتش دوزخ میں مبتلا نہ ہو جائے' خدا سے ڈرو اور اس کا حق پہلے سے زیادہ اچھی طرح ادا کرو۔ آخر میں ہارون نے پوچھا کیا آپ کے ذمہ کسی کا قرض ہے انہوں نے جواب دیا ہاں خداوندعالم کا قرض میری گردن کا بوجھ ہے۔ آخر میں ہارون نے کہا میرا مطلب یہ ہے کہ آیا آپ نے کسی شخص کا قرض ادا کرنا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بہت کچھ عطا فرمایا ہے اور مجھے اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے بندوں سے طلب کروں۔ پھر بھی ہارون نے ایک ہزار دینار کا تھیلہ نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیا۔ اور عرض کیا کہ آپ جس طرح چاہیں اسے خرچ فرما دیں۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ ہارون میری تمام نصیحتوں کا آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ابھی سے ظلم شروع کر دیا ہے۔ اس نے پوچھا میں نے کیا ظلم کیا ہے۔ فرمایا کہ میں تمہاری نجات چاہتا ہوں اور تو مجھے ہلاکت کی طرف کھینچ رہا ہے۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ سن کر ہارون اور اس کا وزیر روتے ہوئے باہر چلے گئے۔ باہر جا کر ہارون نے کہا کہ حقیقت میں تو بادشاہ فضیل بن عیاض ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ

کو دنیائے دون سے کس قدر نفرت تھی اور مال و دولت کو آپ کس حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دنیا داروں کے آگے دنیا کی وجہ سے سر تسلیم خم کرنا آپ کا شیوہ نہ تھا۔ آپ کے مناقب اس قدر زیادہ ہیں کہ اس کتاب میں ان کی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ

سفینۂ (کشتی) تحقیق در کرامت و صمصام (خزینہ) شرف اندر ولایت' ابوالفیض ذوالنون بن ابراہیم المصری رحمتہ اللہ علیہ ثوبی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کا اسم گرامی **ثعبان** تھا۔ آپ اکابر صوفیاء اور مشائخ طریقت میں سے تھے۔ آپ کا مسلک بلا اور مشرب ملامت تھا۔ اہلِ مصر آپ کے حال سے متحیر اور آپ کی شان سمجھنے سے عاجز تھے اس لئے آپ کی مخالفت کرتے تھے۔ اور ساری عمر آپ کے جمالِ حال سے بے خبر رہے۔ جس رات آپ کا وصال ہوا ستر آدمیوں کو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی کہ فرما رہے ہیں کہ آج خدا کے دوست ذوالنون نے وفات پائی ہے اور میں اس کے استقبال کے لئے آیا ہوں۔ لوگوں نے آپ کی پیشانی پر یہ لکھا ہوا دیکھا کہ **ھذا حبیب اللّٰہ مات فی حب اللّٰہ قتیل اللّٰہ** (یہ اللہ کا حبیب ہے جو اللہ کی محبت میں جان دے کر شہید ہوا ہے) جب آپ کا جنازہ اٹھا تو گرمی کا موسم تھا جنگل کے پرندوں نے جمع ہو کر آپ پر سایہ کر دیا۔ جب مصر کے لوگوں نے یہ تماشا دیکھا تو اپنے کئے پر بہت پچھتائے اور جو مظالم ان پر ڈھائے تھے ان سے تائب ہوئے۔ طریقت اور حقیقت میں آپ کے اقوال بہت لطیف ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ **العارف کل یوم اخشع لانّہ فی کل ساعتہ من الرب اقرب** (عارف ہر وقت خدا سے ڈرتا رہتا ہے کیونکہ وہ ہر ساعت اپنے رب سے قریب تر ہوتا جاتا ہے) اس کا

مطلب یہ ہے کہ جس قدر حق تعالیٰ کا قرب زیادہ ہوتا بندہ کا خوف اور تحیر بڑھتا جاتا ہے کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی عظمت سے زیادہ آگاہ ہو جاتا ہے اور حق کا جلال اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔ جتنا قریب جاتا ہے اتنا اپنے کو بعید سمجھتا ہے اور اس کی حیرت پر حیرت کا اضافہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک دفعہ دوران مکالمت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ: **یا رب این اطلبک قال عند المنکسرۃ قلوبھم** (یا رب میں تجھے کہاں تلاش کروں فرمایا کہ شکستہ دلوں کے اندر) اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا الٰہی مجھ سے زیادہ شکستہ کس کا دل ہے۔ فرمان ہوا کہ پس میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایسا مدعیٔ معرفت جس کے دل میں خوف خدا نہیں جاہل ہے نہ کہ عارف۔ اور معرفت کی علامت صدقِ ارادت ہے۔ اور صدقِ ارادت کی علامت ہے حسب و نسب و کسب سے قطعِ تعلق۔ اور حق تعالیٰ سے تعلق مضبوط کرنا۔ جیسا کہ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **الصدق سیف اللہ فی ارضہ ماوضع علی شیئی الا قطعہ** (صدق اللہ تعالیٰ کی تلوار ہے جس چیز پر پڑتی ہے کاٹ کر رکھ دیتی ہے) اور صدق یہ ہے کہ مسبب (خالق) کی طرف التفات کیا جائے نہ کہ اسباب یعنی مخلوق کی طرف۔ جونہی مخلوق پر نظر ڈالی جاتی ہے صدق ختم ہو جاتا ہے۔

شرح اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ تمام امیدیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ کرنی چاہئیں نہ کہ غیراللہ کے ساتھ اور جو کچھ طلب کرے خدا سے طلب کرے نہ کہ خلق خدا سے۔ اولیاء کرام کا کہنا ہے کہ خلق خدا سے حاجت روائی کرانا شرک خفی ہے اور بتوں سے مرادیں مانگنا شرک جلی۔ اور شرک خفی (پوشیدہ شرک)، شرک جلی (ظاہر شرک) سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ ظاہری شرک نظر آجاتا ہے لیکن پوشیدہ شرک نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اور

یہ جو ہم نے پہلے کہا ہے کہ اولیاء اللہ کو تصرف اور کرامات حاصل ہوتی ہیں اور وہ حاجت روائی کر سکتے ہیں یہ اور بات ہے کیونکہ اس میں ان کی طاقت ظاہر کرنا مطلوب تھا۔ لیکن حاجت روائی کے لئے در بدر مارے پھرنا اور بات ہے۔ دینے کی طاقت تو بہتوں کو حاصل ہے لیکن اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ مانگنا صرف خدا سے چاہئے۔ البتہ اولیاء کرام سے ہدایت اور روحانیت کا طالب ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ہدایت کا طلب کرنا نہ شرک ہے نہ گناہ۔

دعائے خیر کا نرالہ طریقہ

ترجمہ ایک دفعہ حضرت ذوالنونِ مصری اپنے احباب (مریدین) کے ساتھ کشتی میں سوار تھے اور دریائے نیل میں سیر و سیاحت کر رہے تھے جیسا کہ اہل مصر کی عادت ہے۔ ان کے نزدیک ایک اور کشتی آئی جس میں لوگ گانے بجانے اور ناروا حرکات میں مشغول تھے۔ یہ دیکھ کر آپ کے شاگردوں نے عرض کیا کہ دعا کیجئے کہ خدا ان سب کو غرق کرے۔ آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی یا الٰہی! جس طرح یہ لوگ اس دنیا میں عیش و خوشی میں ہیں آخرت میں بھی ان کو یہی عیش و خوشی نصیب کر۔ یہ سن کر مریدوں کو تعجب ہوا۔ لیکن جب وہ کشتی نزدیک آئی اور ان لوگوں کی نظر حضرت شیخ پر پڑی تو گریہ طاری ہو گیا' اپنے کئے پر نادم ہوئے' باجے توڑ دیئے اور راہ راست پر آگئے۔ اس کے بعد شیخ نے مریدوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آخرت کے عیش و خوشی سے مراد اس جہاں کی توبہ ہے۔ تم نے دیکھ لیا کہ دعا قبول ہوئی اور ان کو توبہ کی توفیق حاصل ہوئی۔ اس سے تمہاری خواہش بھی پوری ہو گئی اور نقصان کسی کو نہ پہنچا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت شیخ مسلمانوں پر کس قدر مہربان تھے اور یہ عین سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کافروں کے جور و ستم سے متنفر نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ دعا کرتے تھے **اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون** (یا اللہ

میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ وہ بے خبر ہیں)۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایک دفعہ میں بیت المقدس سے مصر کی طرف جا رہا تھا میں نے دیکھا کہ راستے میں ایک شخص آرہا ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اس سے کوئی بات کروں۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ ایک بوڑھی عورت تھی جس کے ہاتھ میں عصا تھا اور اونی جبہ پہنے ہوئے تھی۔ میں نے پوچھا کہ کہاں سے آرہی ہو ؟ اس نے جواب دیا کہ اللہ سے میں نے کہا' کہاں جا رہی ہو اس نہ کہا اللہ کی طرف۔ اس کے بعد میں جیب سے ایک دینار نکال کر اس کے ہاتھ میں دینے لگا تو اس نے زور سے میرا ہاتھ جھٹک کر کہا کہ اے ذوالنون میرے متعلق جو تو نے خیال کیا ہے یہ تیری کم عقلی کی دلیل ہے میں حق تعالٰی کے لئے کام کرتی ہوں اور اس کے سوا کسی سے کوئی چیز نہیں لیتی' نہ کسی دوسرے کی عبادت کرتی ہوں اور نہ اس سے کسی چیز کی امید رکھتی ہوں یہ کہا اور روانہ ہو گئی۔ اس حکایت میں یہ رمز ہے کہ یہ جو کہا کہ میں خدا کے لئے کام کرتی ہوں یہ اس کے صدق و محبت کی علامت ہے۔ معاملات میں لوگوں کی دو قسمیں ہیں بعض لوگ ایسے ہیں جو کام کرتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ ہم خدا کے لئے کر رہے ہیں لیکن کرتے وہ اپنے لئے ہیں یعنی اگرچہ وہ نفسانی خواہشات سے پاک ہوتے ہیں تاہم وہ ہر کام ثواب اور آخرت کی بھلائی کے لئے کرتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں ثواب اور آخرت کی بھلائی کا خیال نہیں ہوتا بلکہ ہر کام فرمانِ حق کی تعظیم اور تقاضائے محبت سے کرتے ہیں نہ کہ اپنے فائدے کے لئے۔ اور جو لوگ آخرت کے ثواب کے لئے نیکی کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ آخرت کی راحت دائمی ہے اور راحتِ گناہ عارضی ہے۔ اس لئے جو کچھ کرتے ہیں وہ اپنے لئے کرتے ہیں خدا کے لئے نہیں کرتے۔ لیکن خداوند تعالٰی کے لئے نہ ان کی نیکی سے کوئی فرق پڑتا ہے نہ بدی

ہے۔ اگر سارا جہان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صدق پر آجائے تو بھی خدا تعالیٰ کو فائدہ نہیں پہنچتا اور اگر سارا جہاں فرعون بن جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے لئے اور اگر برائی کرو گے تو اپنے لئے کرو گے) نیز فرمایا وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (اور جس شخص نے جہاد کیا بیشک اپنے نفس کے لئے کیا باتحقیق حق تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے) لوگ ملکِ ابدی اپنے لئے طلب کرتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ کام خدا کے لئے کر رہے ہیں۔ لیکن طریق دوستی اور ہے۔ دوستانِ خدا ہر کام دوست کی خوشنودی کے لئے کرتے ہیں نہ کہ اپنے لئے۔ اس مضمون پر مزید گفتگو اخلاص کے باب میں آرہی ہے۔ انشاء اللہ عزوجل۔

حضرت ابراهیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ

امیر الامراء' و سالکِ طریقِ لقا' ابواسحاق ابراهیم بن ادھم منصور رحمتہ اللہ علیہ یگانۂ طریق اور یگانۂ روزگار اور اپنے وقت کے سیدالاولیاء تھے۔ آپ کو حضرت خضر علیہ السلام سے بھی شرفِ ارادت تھا۔ آپ نے مشائخ متقدمین میں سے بہت سے مشائخ کی صحبت پائی اور آپ کی امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے خاص ملاقات تھی اور ان سے علم حاصل کیا۔ اوائل عمر میں آپ بلخ کے بادشاہ تھے۔ ایک دن اپنے لاؤ لشکر سمیت شکار کو گئے اور ایک ہرن کے تعاقب میں دور نکل گئے۔ خداوند تعالیٰ نے ہرن کو طاقت گویائی دی اور اس نے فصیح زبان میں کہا **الهذا خلقت ام بهذا امرت** (کیا تو اسی کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا تم کو اس کام کا حکم ملا ہے) ہرن کی یہ بات آپ کے دل میں گھر کر گئی اور آپ نے توبہ کر کے زہد و تقویٰ اختیار کیا۔ حضرت فضیل ابن عیاض رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اور سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ سے بھی فیض صحبت حاصل کیا اور توبہ کے بعد آپ ساری عمر اپنی روزی خود کماتے تھے۔ آپ کا مقام بہت بلند اور کرامات بہت مشہور ہیں اور حقائقِ تصوف میں آپ کے اقوال بہت لطیف ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **مفاتیح العلوم ابراھیم** (علوم کی چابی ابراھیمؒ ہیں)۔ آپ فرماتے ہیں کہ **اتخذ اللہ صاحبا و ذرالنلس جانبا** (اللہ سے دوستی لگاؤ اور خلقت کو ایک طرف پھینک دو) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ کا حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو جاتا ہے اور دوستیٔ حق میں اخلاص پیدا ہوتا ہے تو خلقت کی صحبت خود بخود چھوٹ جاتی ہے۔ کیونکہ صحبتِ حق کے مقابلہ میں صحبتِ خلق کوئی چیز نہیں ہے اور صحبتِ حق کا تقاضا عبادت میں خلوص ہے اور خلوص کا تقاضا محبت ہے۔ خلوص (خدا) کے ساتھ۔ اور حق تعالیٰ سے محبت و خلوص نتیجہ ہے نفسانی خواہشات کی مخالفت کا۔ کیونکہ جو شخص ہوائے نفس سے آشنا ہوتا ہے خدا سے جدا ہوتا ہے اور جو کوئی ہوائے نفس سے جدا ہوتا ہے واصلِ خدا ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے دراصل خلقت سے مراد تیرا اپنا نفس ہے۔ جب تو اپنے نفس سے علیحدہ ہو گیا تو گویا تو ساری خلق سے علیحدہ ہو گیا اور جو شخص خلق سے کنارہ کشی کرتا ہے لیکن اپنے نفس کا کہا مانتا ہے تو وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے کیونکہ خلقِ خدا جو کچھ کرتی ہے تقدیر کے مطابق کرتی ہے۔ یہاں تمہیں اپنے نفس سے واسطہ ہے۔ ظاہری و باطنی استقامت کے لئے طالب کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ان میں ایک کا تعلق جاننے سے ہے اور دوسری کا کرنے سے۔ جس چیز کا جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام خیر و شر من جانب اللہ ہے۔ دنیا میں تمام حرکات و سکنات اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہیں اور جس چیز کا کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ فرمان الٰہی کی اطاعت کی جائے اور سب کام شریعت کے مطابق کئے جائیں اور کسی صورت میں بھی تقدیر کو ترکِ شریعت کا بہانہ نہیں

بنانا چاہئے۔ چنانچہ خلقت سے کنارہ کشی اس وقت تک درست نہیں آتی جب تک کہ تو اپنے آپ سے یعنی ہوائے نفس سے کنارہ کشی نہ کرے۔ اور جب تو ہوائے نفس ترک کریگا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ ساری خلقت تقدیرِ حق کے مطابق چل رہی ہے اور جب تو نفس کی بجائے حق تعالیٰ کے تابع فرمان ہوا تو بھی تقدیرِ حق کے مطابق ہو جائے گا۔ لہٰذا اپنے نفس سے راضی یا مطمئن ہونا کسی صورت میں درست نہیں۔ اگر تو نے کسی سے ضرور راضی ہونا ہے تو اپنے نفس کی بجائے غیراللہ سے یعنی خلق خدا سے راضی رہنا بہتر ہے کیونکہ غیراللہ یعنی خلق سے راضی ہونا توحید کے زمرہ میں آجاتا ہے اور اپنے آپ سے راضی رہنا توحید کی نفی کرنا ہے۔

شرح یہ عبارت بہت ادق ہے جس کا ذہن نشین کرانا ضروری ہے۔ یاد رہے کہ پہلے تو حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے غیراللہ یعنی خلقت سے تعلق رکھنے کی مذمت فرمائی ہے اور یہاں یہ فرما رہے ہیں کہ غیراللہ سے تعلق توحید ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تین چیزوں کا ذکر ہو رہا ہے توجہ الی اللہ، توجہ الی خلق اور توجہ الی نفسِ خود۔ پہلے آپ نے تعلق باللہ کے مقابلہ میں تعلق با لخلق کو ہیچ قرار دیا ہے۔ اور پھر توجہ الی نفس یا ہوائے نفس کی مذمت فرمائی ہے۔ اب آپ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک نفسِ خود اور خلقِ خدا کا تعلق ہے اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو ضرور پسند کرنا ہے تو پھر خلق کو پسند کر۔ نفس کو ترجیح نہ دے کیونکہ خلق کو توجہ میں لانا ایک اور نقطہ نگاہ سے درست ہو سکتا ہے اور وہ ہے نظریہ توحید یعنی وحدت الوجود۔ مطلب یہ کہ اگر تو خلق کی طرف متوجہ ہوگا تب بھی تو تیرا تعلق اللہ سے وابستہ رہے گا کیونکہ مخلوق کا وجود ظنی اور اعتباری ہے، حقیقی وجود حق تعالیٰ کا ہے لہٰذا تیرا خلق کی طرف متوجہ ہونا بھی حق کی طرف متوجہ ہونا تصور ہوگا۔ لیکن نفس کی طرف متوجہ ہونا ہر صورت میں

مذموم ہے کیونکہ اس سے گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے آپ نے آگے مثال دی ہے کہ حضرت شیخ ابوالحسن رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر تو بلی کا اتباع کرتا ہے تو نفس کے اتباع سے بہتر ہے کیونکہ بلی چوہے کے شکار میں جس ہمت و استقلال' صبر اور مجاہدت کا مظاہرہ کرتی ہے تو اتنا ہی کر لے تو مراد حاصل ہو جائے گی لیکن نفس کی اتباع کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔

ترجمہ اس لئے حضرت شیخ ابوالحسن سالبہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مرید کے لئے گربہ (بلی) کی اتباع کرنا بہتر ہے اس سے کہ وہ اپنے نفس کی اتباع کرے۔ کیونکہ غیراللہ (خلقِ خدا) سے محبت رضائے خدا کے لئے ہوتی ہے اور اپنے نفس کے ساتھ محبت یعنی (اتباع نفس) نفس پروری ہے۔ اس مضمون پر آگے بحث آرہی ہے انشاء اللہ عزوجل۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایک دفعہ جب میں بیابان میں سفر کر رہا تھا تو ایک پیر مرد نے سامنے آکر کہا کہ اے ابراہیم تجھے معلوم ہے کہ یہ کیسی جگہ ہے اور تو زادِ راہ کے بغیر یہاں سفر کر رہا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ شیطان ہے۔ اس وقت میری جیب میں چار درہم تھے جو مجھے کوفہ میں ایک زنبیل فروخت کرنے سے ملے تھے میں نے انہیں نکال کر باہر پھینک دیا اور ارادہ کر لیا کہ ہر میل پر چار سو رکعت نفل ادا کرتا جاؤں گا۔

شرح یہ مخالفتِ نفس ہے تاکہ ہر میل پر چار سو رکعت نماز پڑھنے سے بیابان میں زیادہ وقت بسر ہو حالانکہ نفس چاہتا تھا کہ یہاں سے جلدی نکل جاؤں۔ مخلص بندگانِ خدا اپنے نفس کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔

اسم اعظم کی پہچان

ترجمہ غرضیکہ چار سال تک بیابان میں سفر کرتا رہا اور خداوند تعالیٰ مجھے

بلا تکلیف وقت پر کھانا دیتا تھا۔ اس سفر میں حضرت خضر علیہ السلام بھی میرے ساتھ تھے اور انہوں نے مجھے اسم اعظم بتایا جس کی وجہ سے میرا دل غیراللہ سے بالکل فارغ ہو گیا۔

شرح اسم اعظم کے متعلق معلوم کرنے کے لئے ساری دنیا کوشاں ہے لیکن اپنے پیارے بندوں کو حق تعالیٰ اپنے اسم اعظم سے آگاہ فرما دیتا ہے۔ اسم اعظم کے متعلق بزرگان میں اختلاف پایا جاتا ہے بعض اسم مبارک (اللہ) کو اسم اعظم قرار دیتے ہیں بعض اسم مبارک (رحمٰن) کو۔ یہ اختلاف شاید اس وجہ سے ہے کہ ہر شخص کی مناسبت سے اسم اعظم مختلف ہو سکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسم اعظم ایک نہیں بلکہ متعدد ہیں اور جملہ ہم معنی اسمائے الٰہی میں سے ایک اسم اعظم ہوتا ہے۔ مثلاً کریم' رحیم' رحمٰن ' رؤف میں سے ایک اسم اعظم ہو گا اس طرح جبار' قوی' قاہر' قہار میں سے ایک اور اسم اعظم ہو گا۔ ایک دفعہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے اسم اعظم دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب مرآۃ الاسرار۔ از شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ جس کا اردو ترجمہ راقم الحروف نے کیا ہے اور جس میں حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے اسم اعظم کی نشان دہی فرمائی ہے اور دیگر مشائخ کے ارشادات بھی درج ہیں۔)

ایک بزرگ سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اسم اعظم میں ہوں۔ بعض حضرات نے اشاروں میں اسم اعظم کی نشاندہی فرمائی ہے ہمارا اشارہ یہ ہے کہ مرتبہ احدیت یا لاتعین' جہاں نہ نام ہے نہ نشان' نہ رنگ ہے نہ بو' نہ شکل ہے نہ صورت' نہ سمت ہے نہ اشارہ' کے بعد جب اسماء اور صفات کا ظہور ہوا تو اس وقت جو اسم مبارک سب سے زیادہ ہر جگہ موجود' طاری و ساری تھا وہی اسم اعظم ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ نے جو یہ فرمایا ہے کہ

اسم اعظم ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ حق فرمایا ہے۔ اور جس بزرگ نے فرمایا ہے کہ میں اسم اعظم ہوں' انہوں نے بھی حق فرمایا ہے۔ حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کون ہیں تو فرمایا کہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا حرف با ہوں۔ اور حضرت بایزید **بسطامی** رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کون ہیں تو فرمایا کہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہوں۔ لہٰذا اسم عظم کے متعلق دوسرا اشارہ یہ ہے کہ جو شخص حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت بایزید **بسطامی** رحمتہ اللہ علیہ کے قول کے مطلب سمجھ لے گا وہ اسم اعظم بھی سمجھ لے گا اس سے زیادہ نہیں بتایا جا سکتا اور اسم عظم کی برکت یہ ہے کہ یہ نام لے کر جو کام کیا جائے ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (شرح ختم)

حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ

سرِیر معرفت' وتاجِ اہل معاملت حضرت بشر بن الحافی رحمتہ اللہ علیہ مجاہدات میں شانِ عظیم اور برہانِ کبیر رکھتے تھے اور طریقت میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ حضرت فضیل ابن عیاض رحمتہ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ ہیں اور اپنے ماموں حضرت بوعلی بن حشرم رحمتہ اللہ علیہ کے مرید ہیں۔ اور علومِ اصول و فروع میں ماہر فن کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کی توبہ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ شراب سے مست ہو کر جا رہے تھے کہ راستے میں ایک کاغذ کا ٹکڑا ملا جس پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تھا۔ آپ نے اسے عزت سے اٹھا لیا اور عطر لگا کر پاک جگہ پر رکھ دیا۔ اسی رات خواب میں حق تعالیٰ کی زیارت ہوئی اور فرمان ہوا کہ **یا بشر طیبت اسمی فبعزتی لطیبن اسمک فی الدنیا و الآخرۃ** (اے بشر تو نے میرے نام کو معطر کیا میری عزت کی قسم میں نے بھی تیرے نام کو دنیا اور آخرت میں معطر کیا) جو کوئی تیرا نام سنے گا اس کا دماغ معطر ہو جائے گا۔ جب

خواب سے بیدار ہوئے تو فوراً توبہ کی اور طریقت کا راستہ اختیار کیا۔ آپ پر مشاہدتِ حق کا اس قدر غلبہ تھا کہ ساری عمر جوتا نہ پہنا۔ جب کسی نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ زمین خداوند عالم کا فرش ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس پر جوتا پہن کر چلوں اور میرے اور فرش حق کے درمیان کوئی اور چیز حائل ہو۔ یہ ان کے راز و رموز کی بات ہے کہ ان کے لئے جوتا بھی حجاب بن گیا تھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو شخص دنیا میں ہر دلعزیز اور آخرت میں مشرف بارگاہ ہونا چاہتا ہے اسے تین چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اول یہ کہ کسی سے سوال نہ کرے، دوم کسی کو برا نہ کہے اور کسی کا مہمان نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے جس کو حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے وہ خلقت سے حاجت روائی نہیں چاہتا ہے۔ کیونکہ خلق کے آگے ہاتھ پھیلانا عدم معرفت کی علامت ہے۔ جو شخص قاضی الحاجات سے تعلق مضبوط کر لیتا ہے وہ اپنے جیسے انسان کا محتاج نہیں ہوتا۔ کسی نے خوب کہا ہے **لان استعانتہ المخلوق من المخلوق کلستعانتہ المسجون من المسجون** "کیونکہ مخلوق سے مدد طلب کرنا ایسا ہے جیسے ایک قیدی دوسرے قیدی سے کچھ طلب کرے" اور یہ جو فرمایا کہ کسی کو برا نہ کہو اس کا مطلب یہ ہے کسی کی برائی بیان کرنے والا حق تعالیٰ کے کاموں پر اعتراض کرتا ہے کیونکہ ہر شخص کے اعمال کا خالق حق تعالیٰ ہے جو کسی کے فعل پر اعتراض کرتا ہے وہ دراصل فاعل (خدا) پر اعتراض کرتا ہے۔ البتہ کفار کے کاموں کی مذمت حق تعالیٰ نے جائز فرمائی ہے۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ کسی کی مہمانی قبول نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کا رزاق اللہ ہے، ہاں البتہ یہ سمجھ کر قبول کر لے کہ روزی رساں حق تعالیٰ ہے اور اس شخص کے ذریعے مجھے رزق عطا کر رہا ہے تو یہ جائز ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص روزی دیکر اپنا احسان جتاتا ہے تو پھر قبول نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن اہلسنت و الجماعت اور فرقہ معتزلہ کے مابین اس

بات پر اختلاف ہے۔ اہلسنت رزق کو عطا سمجھتے ہیں اور معتزلہ ملکیت سمجھتے ہیں۔ اس لئے اہل سنت کے نزدیک رزق کسی کی ملکیت نہیں ہے اور کسی سے قبول کرنے میں کوئی ہرج ہیں ہے کیونکہ یہ خدا کی ملکیت ہے اور اس قول کے معنی ایک اور بھی ہیں۔ واللہ اعلم۔

شرح حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے یہ جو فرمایا کہ اس کے معنی ایک اور بھی ہیں۔ خیال ہے کہ اس سے آپ کی مراد وہی مسئلہ وحدت الوجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہ مہمان کو روزی دینے والا بظاہر ایک انسان ہو۔ درحقیقت وہ شخص ذاتِ حق اور وجودِ حق سے جدا نہیں ہے اس لئے اس سے غذا قبول کرنا روا ہے۔

حضرت ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ

فلکِ معرفت و فلکِ محبت (معرفت کے آسمان اور محبت کے جہاز) حضرت ابویزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار اکابرین مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ کا مقام بہت بلند اور حال بے حد قوی تھا۔ یہاں تک کہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ : **ابویزید منا بمنزلتہ جبرائیل من الملائکتہ** (ہمارے درمیان ابویزید اس طرح ہیں جس طرح حضرت جبرائیل علیہ السلام ملائک میں) آپ کے دادا مجوسی تھے جو **بسطام** کے امراء میں سے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث آپ نے بہت روایت کی ہیں۔ آپ تصوف کے دس اماموں میں سے ایک ہیں اور آپ نے جس قدر حقائق و معارف بیان فرمائے ہیں اس سے پہلے کسی نے نہیں بیان کئے تھے اور آپ ہر حال میں علم اور شریعت کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس کے برعکس ایک مردود گروہ نے اپنے الحاد (بے دینی) کا جواز قائم کرنے کے لئے اپنے آپ کو حضرت ابویزید رحمتہ

اللہ علیہ کا ہم مسلک قرار دیا ہے جو غلط ہے۔ آپ کا طریق ابتدائے حال سے مجاہدات اور طریقت پر عمل پیرائی تھا۔ آپ فرماتے ہیں کہ "میں نے تیس سال مجاہدہ کیا اور سب سے زیادہ شدید مشکل چیز میرے لئے سوائے شریعت اور پابندیٔ شریعت کے اور کوئی نہیں تھی۔ اور اگر اختلافِ امت نہ ہوتا تو میں محروم رہتا۔ اسی لئے اختلافِ علماء کو رحمت کہا گیا ہے سوائے تجرید و توحید کے"۔ اور یہ حقیقت ہے کہ انسان کی طبیعت جہل کی طرف مائل ہے کیونکہ جہالت کی حالت میں انسان بہت سے کام آسانی سے کر جاتا ہے لیکن علم ہو تو ایک قدم اٹھانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اور شریعت کا صراط (راستہ) پل صراط سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ پس اسبات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے کہ اگر بلند مقامات سے تو گرے تو شریعت پر جا پڑے۔ کیونکہ اگر باقی ہر چیز تجھ سے چھوٹ جائے تو شریعت ہاتھ میں رہ جائے۔ کیونکہ مرید کے لئے سب سے بڑی آفت ترکِ شریعت ہے۔ جھوٹے دعویدار کی کسوٹی شریعت ہے جس کی روشنی میں ان کے تمام عیوب و گناہ عریاں اور عیاں ہو جاتے ہیں۔

شرح اس سے ظاہر ہے کہ صوفیاء کرام بالعموم اور حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ بالخصوص شریعت کے سختی سے پابند تھے اور منکرین نے ان حضرات کے خلاف جو عدم پابندیٔ شریعت کے الزامات لگائے ہیں غلط ہیں۔ (اس سلسلہ میں راقم الحروف کی کتاب روحانیت اسلام ملاحظہ ہو۔ جس میں غیر مسلم مصنفین کی اپنی قلم سے نہ صرف ان الزامات کو غلط ثابت کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ صوفیاء کرام دیگر مذاہب سے متاثر ہونے کی بجائے الٹا ہندو اور عیسائی ارباب روحانیت پر اثرانداز ہوئے ہیں اور ان کو سب کچھ سکھایا ہے۔)

ترجمہ آپ فرماتے ہیں کہ **الجنتہ لا خطرلھا عند اھل المحبتہ و اھل**

المحبتہ محجوبون بمحبتھم (اہلِ محبت کے لئے بہشت کی کوئی وقعت نہیں ہے اور اہلِ محبت اپنی محبت کی وجہ سے حق تعالٰی سے محجوب ہیں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہشت مخلوق ہے اور محبت حق تعالٰی کی صفت ہونے کی وجہ سے غیر مخلوق ہے اور جو شخص مخلوق کی وجہ سے غیر مخلوق سے باز رہتا ہے بے قدر ہوتا ہے پس دوستان حق کے لئے مخلوق (بہشت) کی کوئی وقعت نہیں۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ دوستان خدا محبت کی وجہ سے محجوب ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے محبت یا دوستی کا تقاضا دوئی (یعنی محب اور محبوب دو علیحدہ وجود ہیں) اور توحید (وحدت الوجود) میں دوئی کا نام ہی نہیں ہے۔ اور دوستوں کا راستہ واحدیت سے وحدت ہے۔

شرح یہاں حضرت مصنف نے پھر وحدت الوجود کو حق کہا ہے لہٰذا ان لوگوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ تک صوفیاء کرام شریعت کے پابند تھے اور صحیح تصوف جاری تھا بعد میں لوگوں نے تصوف میں وحدت الوجود اور ہمہ اوست کے غیر اسلامی اور غیر شرعی نظریات شامل کر کے اس کی صورت بگاڑ دی۔ لیکن اس سے پہلے بھی اور اس عبارت سے بھی ثابت ہے کہ آپ وحدت الوجود کے قائل تھے جو اسلام اور شرع کے مطابق ہے اور یہ کہ وہ صوفیاء کرام جنہوں نے کھل کر وحدت الوجود کی پرچار کی ہے انہوں نے تصوف میں کوئی غیر شرع عنصر شامل نہیں کیا۔ اور حضرت مصنف کا یہ قول کہ دوستوں کا راستہ واحدیت سے وحدت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عشق میں عاشق اور معشوق دو ہستیوں کا وجود لازمی ہے۔ واحدیت سے مراد عاشق کا وجود اور وحدت سے مراد ذات حق کی وحدت۔ یعنی عاشق پہلے اپنی علیحدہ ہستی میں رہ کر عشق کماتا ہے اور جب واصل باللہ ہو جاتا ہے تو مقام وحدت میں پہنچ جاتا ہے اور دوئی مٹ جاتی ہے۔

ترجمہ دوستی میں علیت پائی جاتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مرید ہے' دوسرا مراد۔ مرید بندہ بھی ہو سکتا ہے اور حق بھی۔ اگر انسان مرید ہے تو حق تعالیٰ مراد ہے۔ اگر مرید حق تعالیٰ ہے تو انسان مراد ہے۔ ان دونوں صورتوں میں دوئی لازم آتی ہے۔ اور یہ محبت کی آفت ہے کہ جب تک محبت ہے دوئی نہیں مٹتی۔ پس محب (عاشق) کا محبوب میں فنا ہو جانا۔ اس سے افضل ہے کہ وہ محبت میں باقی رہے۔

شرح مراد اور مرید تصوف کی دو اصطلاحات ہیں۔ مرید وہ ہے جو طالب مولا ہے اور مراد وہ ہے جو مطلوب مولا ہے۔ جیسا کہ ولایت کے مضمون میں آگے آرہا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں (یہ عاشق یا مرید) کہلاتے ہیں اور بعض ایسے خوش نصیب ہیں جن کی طرف اللہ رجوع کرتا ہے یہ لوگ (مراد یا محبوب الٰہی) کہلاتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں بہت اولیاء اللہ ہیں جو محبوبیت کے مقام پر فائز ہیں۔ معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ولی اللہ اپنا مقام پہچان سکے کہ آیا وہ محب ہے یا محبوب۔ اگر محب ہے تو اسے معشوقانہ ناز نہیں کرنا چاہئے۔ اگر محبوب ہے تو سرد آہیں نہ بھرتا رہے۔ حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ محبوب سبحانی کے لقب سے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے لقب سے ملقب تھے۔

ترجمہ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مکہ مکرمہ گیا اور صرف خانہ کعبہ دیکھا تو میں نے کہا کہ یہ حج مقبول نہیں۔ اس قسم کے پتھر تو میں نے بہت دیکھے ہیں۔ دوسری بار گیا تو خانہ کعبہ کو بھی دیکھا اور صاحبِ خانہ (حق تعالیٰ) کو بھی دیکھا۔ میں نے دل میں کہا کہ ابھی حقیقت توحید حاصل نہیں ہوئی۔ تیسری مرتبہ گیا تو صاحبِ خانہ کو تو دیکھا لیکن خانہ کعبہ کو نہ

دیکھا اس کے بعد میں نے یہ آواز دل میں سنی کہ "اے بایزید اگر تو اپنے آپ کو نہ دیکھتا اور سارے جہاں کو دیکھتا تو مشرک ہوتا۔ جب تو سارے جہاں کو نہیں دیکھتا اور خود کو دیکھتا ہے تو تو مشرک ہے"۔ اس وقت میں نے خودی سے توبہ کی بلکہ اس توبہ سے بھی توبہ کی۔ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مقام کس قدر ارفع و اعلیٰ تھا۔

حضرت ابو عبداللہ الحارث الحاسبی رحمتہ اللہ علیہ

امامِ فنون (علوم و فنون کے امام) و جاسوسِ **ظنون** (صاحبِ کشفِ قلوب) حضرت ابو عبداللہ الحارث بن اسد **المحاسبی** رحمتہ اللہ علیہ تمام علومِ اسلامیہ کے عالم اور اصول و فروع کے ماہر تھے۔ آپ اپنے زمانے میں اہلِ علم کے مرجع تھے۔ آپ نے اصولِ تصوف پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "رغائب" ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی تصانیف اور بھی بہت ہیں۔ آپ کا حال بہت قوی اور ہمت بہت بلند تھی اور آپ اپنے زمانے میں بغداد کے شیخ المشائخ تھے۔

علمِ معرفت کی فضیلت عمل پر

آپ فرماتے ہیں کہ **العلم بحرکات القلوب فی مطالعتہ الغیوب اشرف من العمل بحرکات الجوارح** (وہ عالم جس کا قلب مطالعۂ غیب میں جاری ہو افضل ہے اس عامل سے جو صرف جوارح یعنی اعضاء سے عمل پیرا ہے) اس کا مطلب یہ ہے علم محلِ کمال ہے اور جہل محلِ طلب ہے۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ حضوری بہتر ہے حق تعالیٰ کے در پر حاضری سے، بحالتِ جہل۔ کیونکہ علم درجۂ کمال تک پہنچاتا ہے اور جہل دروازے کے اندر نہیں جانے دیتا۔ درحقیقت علم افضل ہے عمل سے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی معرفت علم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور عمل سے یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔ اگر صرف عمل سے حق

تعالیٰ تک رسائی ممکن ہوتی تو نصاریٰ اور راہب لوگ شدید مجاہدات کی بدولت مقامِ مشاہدہ پر پہنچ جاتے۔ اور گنہگار مسلمان عمل کے ذریعے علومِ غیبی سے بہرہ ور ہوتے۔ پس عمل صفتِ بندہ ہے اور علم صفتِ حق ہے۔ لیکن بعض روایات میں یہ لکھا ہے کہ **العمل بحرکلت القلوب اشرف من العمل بحرکلت الجوارح** (قلب کا ذکر' اعضا کی عبادت سے بہتر ہے) یہ غلط ہے کیونکہ عملِ بندہ کا تعلق دل کی حرکات سے نہیں ہے۔ ہاں اگر حرکاتِ القلوب سے مراد تفکر اور مراقبہ لیا جائے تو یہ بعید از قیاس نہ ہوگا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ **تفکر ساعتہ خیر من عبادۃ ستین سنتہ** (ایک ساعت کا تفکر (مراقبہ) ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے) لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ اعمالِ برتر (باطن یا قلب) بہتر ہیں اعمالِ جوارح سے۔ اور باطنی احوال (جمع حال) و افعال کی تاثیر ظاہری اعمال سے زیادہ ہوتی ہے۔ بزرگان کا کہنا ہے کہ **نوم العالم عبادۃ وسھر الجاھل معصیتہ** (عالم کی نیند عبادت ہے اور جاہل کی بیداری معصیت "گناہ" ہے)۔ کیونکہ نیند اور بیداری کی حالت میں عالم کا قلب مغلوبِ حال ہوتا ہے اور قلب میں حال کا غلبہ ہو تو بدن مغلوب الحال ہوتا ہے لہٰذا جب قلب غلبۂ حق میں مغلوب ہو تو اس سے بہتر ہے کہ ظاہریِ اعمال کے ہوتے ہوئے نفس غالب ہو۔

نیز آپ نے فرمایا کہ ایک درویش نے فرمایا کہ **کن للہ و الا فلا تکن** "خدا کا ہو کر رہ ورنہ خود نہ رہ" اس کا مطلب یہ ہے مقام بقاء باللہ حاصل کر اگر وہ حاصل نہ ہو سکے تو مقام فنا فی اللہ حاصل کر۔یعنی یا توصفوت (ولایت) کی بدولت فانی فی اللہ ہو جا یا فقر کی بدولت ہجر و فراق میں رہ۔ مطلب وہی ہے کہ یا مقام بقاء باللہ حاصل کرو اگر وہ حاصل نہیں ہو سکتا تو مقام فنا فی اللہ حاصل کرو یا تم یہ مقام (بقاء) حاصل کرو جو آیت اسْجُدُوا لِآدَمَ "آدم کو سجدہ کرو" کا تقاضا ہے یا

وہ مقام (فنا) حاصل کرو۔ جو آیتؐ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (انسان پر ایک وقت گزرا کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا)
کا خاصہ ہے اگر تو اپنے ارادہ اور اختیار سے حق کا ہو جائے تو یہ مقامِ فنا ہے اگر تو اپنے اختیار کے بغیر واصل حق ہو تو یہ مقامِ بقاء ہے۔

شرح یہاں مقام بقا باللہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے مقام فنا فی اللہ پر۔ جس کی تفصیل مقدمہ کتاب میں بھی آئی ہے اور دیگر مقامات پر بھی۔ مقام فنا فی اللہ میں انسان مغلوب الحال ہوتا ہے اور مقام بقا باللہ میں غالب الحال ہوتا ہے۔ مقام فنا پر سالک کوئی کام نہیں کر سکتا اور مقام بقاء پر واپس آکر وہ زندگی کے تمام فرائض ادا کرتا ہے۔ بلکہ سب سے بڑا فریضہ یعنی ہدایتِ خلق انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ جہاں مقام فنا کی خصوصیت سکر' استغراق اور محویت ہے' مقام بقا باللہ کی خصوصیت صحو' ہوشیاری اور فرض شناسی ہے۔ جہاں باقی امتوں میں آخری مقام فنا تھا اور وہ بھی ادنیٰ درجہ کا۔ اسلام انسان کو بلند ترین مقامِ فنا کے حصول کے بعد نزول یعنی بقا باللہ تک لے جاتا ہے۔ جس سے سابق امتیں نا آشنا تھیں کیونکہ یہ مقام سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور وساطت سے حاصل ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ مقامِ بقا باللہ میں مقام فنا فی اللہ سے محرومی یا عارضی تعطل نہیں بلکہ بیک وقت سالک فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ اس کا کمال یہ ہے کہ بیک وقت واصل بحق بھی ہوتا ہے اور مہجور بھی۔ اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ

امامِ معرض از خلق (امام گوشہ نشیناں) و از طلبِ ریاست بریدہ از خلق (تارک دنیا) حضرت ابو سلیمان داؤد ابن الطائی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار اکابر مشائخ

ؐ سورۃ الدھر آیت ۱

اور مقتدائے اہل تصوف میں ہوتا ہے۔ آپ اپنے زمانے میں بینظیر تھے۔ علم میں آپ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد' اور حضرت فضیل ابن عیاضؒ اور حضرت ابراھیم بن ادھمؒ کے صحبت یافتہ تھے۔ آپ طریقت میں حضرت حبیب راعی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ جمیع علوم اسلامیہ سے آراستہ اور علم فقہ میں فقہا کے استاذ مانے جاتے تھے۔ آپ تارک الدنیا تھے اور شہرت کو سخت ناپسند فرماتے تھے اور زہد و تقویٰ میں آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ آپ کے مناقب بیشمار اور فضائل لاتعداد ہیں اور علِم حقائق میں آپ کامل تھے۔

دنیا میں سلامتی کا راز

آپ فرماتے ہیں کہ **ان اردت السلامتہ سلم علی الدنیا و ان اردت الکرامتہ کبر علی الاخرۃ** " اگر تو سلامتی چاہتا ہے تو دنیا کو خیرباد کہدے اور کرامت چاہتا ہے تو آخرت کو تکبیرِ ذبح دیدے" یعنی یہ دونوں (دنیا و عقبیٰ) حجاب ہیں تیرے اور خدا کے درمیان۔ اور فراغت (آزادی) کا راز ان دونوں کے ترک میں ہے۔ جو شخص فراغتِ تن کا طلبگار ہے وہ دنیا سے کنارہ کشی کر لے' اور جو فراغت دل کا طلبگار ہے اسے چاہئے کہ آخرت کو ترک کر دے۔

شرح اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا آرام علائق دنیا کے ترک میں ہے اور روحانی فلاح طمعِ بہشت کے ترک میں ہے۔

ترجمہ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ ہمیشہ امام محمد بن حسن رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت اختیار کرتے تھے لیکن قاضی ابو یوسفؒ کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیتے تھے۔

شرح امام محمدؒ اور قاضی ابو یوسفؒ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ امام محمد علم میں ثابت قدم رہے لیکن قاضی ابو یوسف نے بادشاہ کے ہاں

ملازمت قبول کر لی تھی اور اسلامی دنیا کے قاضی القضاۃ تھے۔ چونکہ وہ دنیا دار تھے حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ ان کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیتے تھے۔

ترجمہ لوگوں نے پوچھا کہ جب یہ دونوں حضرات علم میں بلند پایہ ہیں تو آپ ایک کو کیوں عزیز رکھتے ہیں۔ اور دوسرے کو کیوں اپنے پاس آنے نہیں دیتے۔ تو فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ محمد بن حسن نے دنیا کو چھوڑ کر علم کو ترجیح دی ہے اور ابو یوسف نے علم چھوڑ کر دنیا کو ترجیح دی ہے۔ اور علم کو عز و جاہ کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لئے وہ محمد بن حسن کا کس طرح مقابلہ کر سکتا ہے۔

حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ دنیا کو حقیر سمجھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ آپ کے نزدیک تمام دنیا اور دنیا داروں کی ذرا بھر وقعت نہیں تھی۔ لیکن اس کے برعکس آپ فقراء بے نوا سے بہت محبت کرتے تھے۔ آپ کے مناقب بہت ہیں۔

حضرت خواجہ سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ

شیخ اہلِ حقائق (اہل حقائق کے مقتدا) اور آزاد از جملہ علائق حضرت ابوالحسن سری بن مغلس سقطی رحمتہ اللہ علیہ حضرت خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ کے ماموں تھے اور علوم تصوف و طریقت میں رفیع الشان تھے اور جس نے سب سے پہلے مقامات تصوف کو شرح و بسط سے بیان کیا وہ آپ ہی ہیں۔ عراق کے اکثر مشائخ آپ کے مرید ہیں اور آپ حبیب راعی رحمتہ اللہ علیہ کے فیض یافتہ ہیں۔ لیکن آپ مرید حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ کے تھے۔ آپ بغداد کے بازار میں پرانا مال فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب سارا بازار جل گیا تو لوگوں نے آپ سے کہا کہ آپ کی دوکان بھی جل گئی ہے تو آپ نے جواب دیا کہ اچھا ہوا کہ میں نے اس کی قید سے رہائی پائی۔ لیکن جب آپ کو خبر ملی کہ

دوکان صحیح سلامت ہے' جب کہ اردگرد کی تمام دوکانیں جل کر راکھ ہو چکی ہیں تو آپ نے سارا مال درویشوں میں تقسیم کر دیا اور گوشۂ فقر اختیار کیا۔ جب کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ نے اس کوچہ میں کیسے قدم رکھا تو فرمایا کہ ایک دن حبیب راعی رحمتہ اللہ علیہ کا میری دوکان پر گزر ہوا تو میں نے ان کو آدھی روٹی دیکر کہا کہ درویشوں کو دینا۔ روٹی لیکر آپ نے فرمایا کہ خدا تیرا بھلا کرے۔ جب سے میرے کان میں یہ دعا پہنچی ہے میرا دل دنیا سے بیزار ہو گیا ہے۔ اور میں نے اس سے چھٹکارا پایا ہے۔

حضرت سری سقطیؒ کی شاندار دعا

آپ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ **اللّٰھم بما عذبتنی بہ من شئی فلا تعذبنی بذل الحجاب** "یا الٰہی اگر تو مجھے کسی چیز سے عذاب دینا چاہے تو حجاب سے عذاب نہ دے"۔

سخت ترین آفت حجاب ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک میں تجھ سے محجوب نہیں ہونگا ہر قسم کا عذاب آسانی سے برداشت کرلوں گا لیکن اگر حجاب درمیان میں حائل ہو جائے تو ساری دنیا کی نعمتوں کے باوجود ذلیل و خوار ہوں گا۔ کیونکہ مشاہدہ حق کے ہوتے ہوئے کوئی آفت آفت نہیں رہتی لیکن حجاب کی حالت میں نعمت بھی آفت بن جاتی ہے۔ اور دوزخ کا کوئی عذاب حجاب سے زیادہ سخت نہیں ہے یہاں تک کہ اگر اہلِ دوزخ کو حق تعالٰی کا دیدار نصیب ہو جائے تو ان کو بہشت بھی بھول جائے گی۔ حق تعالٰی کے دیدار سے اس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے کہ جسم کو جس قدر عذاب' درد اور مصیبت پہنچتی ہے اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اور بہشت کی کوئی نعمت دیدار الٰہی سے بڑھکر نہیں ہے۔ اگر بہشت کی تمام نعمتوں کے باوجود

حق تعالیٰ کے دیدار سے اہل بہشت محروم ہوں تو اس سے زیادہ عذاب کوئی نہیں۔ پس سنت الٰہی اسی طرح جاری ہے کہ ہر حال میں خداوند تعالیٰ اپنے دوستوں کو اپنے دیدار سے خوش رکھتا ہے جس کی بدولت وہ دنیا کے تمام رنج و الم' آفات و مصائب کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں لہٰذا ان کے دل سے ہمیشہ یہی دعا نکلتی ہے کہ بار خدایا ہمیں ہر مصیبت اور درد و الم قبول ہے بشرطیکہ تو ہم سے محجوب نہ ہو۔ اگر تیرا دیدار ہمیں نصیب ہے تو ہمارے لئے کوئی مصیبت مصیبت نہیں راحت ہے۔

شرح کسی نے خوب کہا ہے۔

ہر جور و ہر جفا گوارا ہے - کاش کہہ دے کہ تو ہمارا ہے

حضرت شقیق بلخی رحمتہ اللہ علیہ

سرہنگِ اہلِ بلا' (اہل بلا کے سردار) و مایۂ زہد و تقویٰ' حضرت ابو علی شقیق بن ابراہیم الازدی رحمتہ اللہ علیہ عزیزِ قوم اور مقتدائے طائفہ صوفیاء تھے۔ آپ تمام علومِ شریعت' طریقت اور حقیقت سے آشنا تھے۔ حقائقِ تصوف پر آپ کی تصانیف بہت ہیں۔ آپ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے بلکہ دیگر مشائخ کبار کی بھی آپ کو صحبت ملی ہے۔

حقیقی زندگی اور حقیقی موت کیا ہے

آپ فرماتے ہیں کہ **جعل اللّٰہ اہل طاعتہ احیاءً فی مماتھم و اھل المعاصی امواتاً فی حیٰوتھم** "اللہ تعالیٰ اہل طاعت کو موت کی حالت میں زندہ رکھتا ہے اور اہل معاصی (گنہگاروں) کو زندگی کی حالت میں مردہ رکھتا ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ فرمانبردار اگرچہ مردہ ہے زندہ ہے اور ملائک اس کی فرمانبرداری

پر قیامت تک آفرین کہتے ہیں اور ثواب پہنچاتے ہیں پس وہ فنا کی حالت میں زندہ ہے یعنی باقی باللہ ہے۔

ایک دفعہ آپ کو ایک بوڑھے نے آکر کہا کہ یا شیخ میرے گناہ بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ میں توبہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ بہت دیر سے آئے ہو اس نے کہا بلکہ جلدی آیا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کس طرح اس نے عرض کیا کہ جو شخص موت سے پہلے توبہ کیلئے آیا تو سمجھیں کہ جلدی آیا۔

آپ کی توبہ کا واقعہ

آپ کی توبہ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ بلخ میں اس قدر قحط پڑا کہ لوگ مردہ جانوروں کا گوشت کھانے پر مجبور ہو گئے اور خلقِ خدا بے حد پریشان تھی۔ اس حالت میں آپ نے ایک غلام کو دیکھا کہ بازار میں نہایت ہی خوش و خرم پھر رہا ہے لوگوں نے اس سے کہا کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ لوگ مر رہے ہیں تو اس قدر خوش و خرم ہے اس نے کہا کہ مجھے کوئی غم نہیں ہے کیونکہ میں ایسے آقا کا غلام ہوں جو پورے گاؤں کا مالک ہے۔ یہ سن کر حضرت شقیق بلخی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا یا الٰہی جب ایک غلام اس بناء پر بے فکر ہے کہ اس کا آقا ایک گاؤں کا مالک ہے تو ہمیں کیا غم ہے کیونکہ ہمارا آقا تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کے بعد آپ نے دنیا سے قطع تعلق کر لیا اور حق تعالیٰ سے پیوستہ ہو گئے اور پھر کبھی روزی کا فکر نہ کیا۔ آپ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں تو فلاں غلام کا شاگرد ہوں اور جو کچھ میں نے پایا ہے اسی سے پایا ہے اور یہ انہوں نے ازراہ انکسار کہا۔ غرضیکہ آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔

حضرت ابو سلیمان عبدالرحمٰن دارانی رحمتہ اللہ علیہ

شیخ وقت خود، و طریقِ حق میں مجرد، حضرت ابو سلیمان عبدالرحمٰن علیہ

الدارانی رحمتہ اللہ علیہ عزیزِ قوم اور ریحانِ قلوب تھے آپ سخت ریاضات و مجاہدات کی وجہ سے مشہور تھے۔ آپ ظاہری علوم کے عالم اور آفاتِ نفس سے آشنا تھے۔ معاملاتِ طریقت اور حفظِ قلوب کے بارے میں آپ کے اقوال بہت لطیف ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ **اذا غلب الرجاء علی الخوف فسد الوقت** "جب خوف پر امید غالب آجائے تو فتنہ و فساد برپا ہو جاتا ہے"۔

شرح حدیث شریف میں آیا ہے کہ **الایمان بین الخوف و الرجا** "ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے" یعنی خداوند تعالیٰ سے انسان ڈرتا بھی رہے اور بخشش کی امید بھی رکھے لیکن جب امید کا غلبہ ہو جائے اور خوف خدا جاتا رہے تو پھر گناہوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور دنیا میں فتنہ و فساد بڑھ جاتا ہے۔ فرقہ مرجیہ سے یہی غلطی سرزد ہوئی ہے۔

ترجمہ کیونکہ جب تک بندہ خوفِ خدا دل میں رکھتا ہے اس کا حال درست رہتا ہے۔جونہی خوفِ خدا دل سے نکل جاتا ہے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کے برعکس اگر خوف کا دل پر غلبہ ہو اور انسان نا امید ہو جائے تو اس کا ایمان خطرہ میں پڑ جاتا ہے کیونکہ رحمت حق سے مایوسی شرک ہے۔ پس حفظ ایمان خوف اور رجا دونوں میں ہے اور رجا (امید) کا تعلق مشاہدہ سے' اور خوف کا تعلق مجاہدہ سے ہے۔ اور مشاہدہ میں سراسر اطمینان اور مجاہدہ میں سراسر اضطراب ہے۔ اب چونکہ مشاہدہ نتیجہ ہے مجاہدہ کا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر امید نا امیدی کا نتیجہ ہے یعنی جو شخص اپنے اعمال کی کمی کی وجہ سے نا امید ہو جاتا ہے وہ مجاہدات زیادہ کرتا ہے جس سے حق تعالیٰ کی رحمت و فضل و کرم بڑھ جاتا ہے اور مشاہدۂ حق سے سرفراز ہوتا ہے اور اس پر خوشیوں اور کامرانیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ دل کو سکون نصیب ہوتا ہے اور اسرارِ ربانی اس پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔

حضرت احمد ابن حواری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایک دفعہ میں خلوت میں نماز پڑھ رہا تھا جس سے میرے قلب کو بہت راحت نصیب ہوئی۔ جب میں نے دوسرے روز اس بات کا ذکر حضرت ابوسلیمان دارانی رحمتہ اللہ علیہ سے کیا تو فرمایا کہ تم بھی عجب کمزور آدمی ہو کہ خلوت (تنہائی) میں تمہارا حال اور ہوتا ہے اور جلوت یعنی لوگوں کے سامنے اور کیونکہ دونوں جہانوں میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو بندۂ حق کو حق تعالیٰ سے باز رکھ سکے۔ ایک دلہن کا چہرہ اس لئے دکھایا جاتا ہے کہ اس سے اس کی عزت بڑھتی ہے لیکن دلہن کو مناسب نہیں کہ وہ غیر کو دیکھے کیونکہ جب وہ غیر کو دیکھے گی تو ذلیل ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر بندہ مؤمن کو لوگ دیکھیں تو اس سے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ لیکن اگر وہ اپنے آپ کو دیکھے یعنی اپنے نیک اعمال پر نگاہ کرے تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس سے ہم سب کو پناہ دے۔

حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ

راضی برضائے حق اور تربیت یافتۂ حضرت علی بن موسیٰ الرضا رحمتہ اللہ علیہ، حضرت خواجہ معروف بن فیروز کرخی رحمتہ اللہ علیہ جیسے مشائخ طریقت کے مقتداء تھے اور نہایت ہی بلند ہمت اور متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ آپ کا ذکر پہلے آنا چاہئے تھا کیونکہ آپ حضرت خواجہ سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے پیر ہیں لیکن موجودہ ترتیب کی دو وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ شیخ ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ نے اپنی کتاب میں یہی ترتیب رکھی ہے دوسرے امام ابوالقاسم قشیریؒ نے اپنی کتاب میں مشائخ طریقت کا اسی ترتیب سے ذکر کیا ہے۔ آپ شروع میں مسلمان نہیں تھے۔ آپ نے حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور آپ کے فیضِ صحبت سے بلند مقامات حاصل کئے ۔ حضرت امام

موصوف آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ آپ کے مناقب اور فضائل بہت ہیں آپ علوم طریقت میں مقتدائے مشائخ ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ **للفتوۃ ثلث علامات' وفاء بلا خلاف و مدح بلا جود و عطاء بلا سوال** "جوانمردوں کی تین علامات ہیں اول وفا بلا خلاف' دوم کسی کا نیک سلوک دیکھے بغیر اس کی تعریف کرنا' سوم سوال سے پہلے عطا کرنا۔" وفا بلا خلاف کا مطلب یہ ہے کہ حق عبودیت ادا کرنے میں انسان مخالفتِ حق اور معصیت کو اپنے لئے حرام قرار دے دے۔ مدحت بلا جود کا یہ مطلب ہے کہ کسی سے نیک سلوک دیکھے بغیر اس کے ساتھ نیک سلوک کرے اور عطاء بلا سوال سے یہ مراد ہے کہ جب دینے کی طاقت ہو تو بلا تمیز عطا کرے یعنی جب کسی کا حال معلوم ہو جائے کہ دینے کا مستحق ہے تو اس کو سوال کی ذلت سے بچائے اور سوال کرنے سے پہلے عطا کر دے اور یہ تینوں صفات جو انسان کی طرف سے انسان کے ساتھ برتی جاتی ہیں دراصل یہ حق تعالٰی کی صفات ہیں جو انسان کو **علویتہ** مرحمت ہوئی ہیں حق تعالٰی کی یہ صفات حقیقی اور انسان کی مجازی ہیں کیونکہ حق تعالٰی اپنے دوستوں کے ساتھ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ وہ جس قدر اس کے خلاف مرضی عمل کریں حق تعالٰی ان کو زیادہ دیتا ہے۔حق تعالٰی کی وفا کا یہ حال ہے کہ ازل میں بندہ سے کوئی خوبی ظاہر ہوئے بغیر انسان کو نوازا اور آج اس کی بد عملی کے باوجود اسے راندۂ درگاہ نہیں کیا۔ جہاں تک مدح بے جود کا تعلق ہے وہ بھی حق تعالٰی کی صفت ہے کیونکہ اگرچہ وہ بندہ کا محتاج نہیں ہے لیکن بندہ کی ذرا سی نیکی دیکھ کر اس کی تعریف کرتا ہے اور عطا بلا سوال بھی اسی کی صفت ہے کہ مانگے بغیر ساری خلقت کو روزی عطا کر رہا ہے کیونکہ وہ کریم ہے ہر شخص کی ضروریات اس کو معلوم ہیں اور اس کو بلا سوال عطا کرتا ہے۔ لہٰذا جب حق تعالٰی بندہ پر مہربانی کرتا ہے اس کو بزرگی عطا کرتا ہے اور اپنا مقرب بارگاہ بناتا ہے تو ان

تینوں صفات سے اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ چنانچہ بندہ بھی ان تینوں صفاتِ حق سے متصف ہو کر خلقِ خدا کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے تب جا کر وہ فتوت کی صفت سے موصوف ہوتا ہے اور فتایان کی زمرہ میں اس کا نام لکھا جاتا ہے یہ تینوں صفات حضرت ابراہیم علیہ السلام میں موجود تھیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے انشاء اللہ عز و جل۔

حضرت حاتم اصم رحمتہ اللہ علیہ

زین العباد (عابدین کا زیور) و جمالِ اوتاد (اوتاد کا جمال) ' حضرت ابو عبدالرحمن حاتم بن عنوان الاصم رحمتہ اللہ علیہ بلخ کے سرداروں میں سے تھے۔ آپ خراسان کے اولیاء متقدمین میں سے تھے اور حضرت شقیق بلخی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کے پیر تھے۔ آپ نے ساری عمر یعنی ابتدائے سلوک سے انتہا تک صدق سے ایک دم تجاوز نہیں کیا۔ اس وجہ سے حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **صدیق زماننا حاتم الاصم** "ہمارے زمانے کا صدیق حاتم اصم ہے" آفاتِ نفس اور رعونتِ طبیعتِ انسانی کے متعلق آپ کے کلمات بہت لطیف ہیں۔ اور معاملاتِ طریقت میں آپ کی تصانیف بہت ہیں۔

شہوت کی اقسام

آپ فرماتے ہیں کہ شہوت کی تین اقسام ہیں شہوت فی الاکل' شہوت فی الکلام' شہوت فی النظر (کھانے کی شہوت' بات کرنے کی شہوت اور دیکھنے کی شہوت) ۔ لہٰذا کھانے کی شہوت سے اپنے آپ کو بچاؤ حق تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کے ساتھ' اور زبان کی شہوت سے سچ بول کر' اور آنکھ کی شہوت سے بچاؤ یہ ہے کہ ہر چیز کو عبرت کی نگاہ سے دیکھو۔ پس جو شخص توکل کرتا ہے کھانے کی

شہوت سے نجات پاتا ہے۔ جو سچ بولتا ہے وہ زبان کی شہوت سے چھٹکارا پاتا ہے اور جو شخص چشم راست سے دیکھتا ہے آنکھ کی شہوت سے نجات پاتا ہے۔

حقیقت توکل

حقیقتِ توکل یہ ہے کہ انسان کو معلوم ہو جائے کہ روزی دینے والا وہی ہے اور اس پر بھروسہ کرلے۔ اس وقت اس کی عبادت صحیح ہو گی کیونکہ وہ معرفت کی نظر سے دیکھ لے گا کہ روزی رساں وہی ہے اور یہ فعل دوستی ہے اس وقت اس کی عبادت وجد ہو گی اور اس کی نظر مشاہدۂ حق۔اور اس کا کھانا پینا دوستیٔ حق میں شمار ہو گا۔

اسی طرح جب کوئی بات کرے تو اس میں سوائے کلمۂ خیر کے کچھ نہ ہو اور جب یہ کرے گا تو اس کا کلام کرنا ذکر الٰہی تصور ہو گا۔ اسی طرح جب راست دیکھے گا تو حق تعالیٰ کو دیکھے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے رزق کو احکام شرع کے خلاف کھانا حلال نہیں ہے اور نہ اس کے ذکر کے بغیر زبان چلانا اور اس کے جمال و جلال کے بغیر کسی چیز کا مشاہدہ کرنا روا ہے۔ پس جب تو اس کے رزق کو اس کے حکم کے مطابق کھائے گا' وہ شہوت نہ ہو گی اور جب تو اس کے ذکر کے بغیر کوئی کلام نہیں کرے گا تو بھی یہ شہوت نہیں۔ اور جب تو اس کے حکم کے مطابق دیکھے گا تو وہ بھی شہوت نہیں۔ لیکن اگر تو ہوائے نفس کی خاطر کھاتا ہے تو یہ شہوت ہے خواہ وہ حلال کیوں نہ ہو۔ جب تو ہوائے نفس سے کلام کرے گا تو اگرچہ یہ ذکر خداوند ہے' شہوت اور جھوٹ ہو گا اور جب تو ہوائے نفس سے دیکھے گا تو یہ بھی شہوت ہے خواہ تو اسے اچھا کیوں نہ جانے۔ واللہ اعلم۔

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ

امام مطلبی (حضرت ابو مطلب کے خاندان والے امام) اور ابن عم نبیؐ

(رسولؐ کے چچا کے بیٹے) حضرت ابو عبداللہ محمد بن ادریس الشافعی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار اپنے زمانے کے اکابرین میں ہوتا ہے آپ تمام علوم میں امام تھے اور فتوت اور ورع (جوانمردی اور نیکی) میں ان کے مناقب بے شمار اور کلمات بہت بلند ہیں۔ جب تک آپ مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد رہے۔ جب عراق تشریف لے گئے تو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد ہوئے اور امام محمد بن حسن رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت اختیار کی۔ آپ کی طبع مبارک کو گوشہ نشینی محبوب تھی اور طریقت اختیار کرنا چاہتے تھے لیکن جب لوگوں نے آپ کے گرد جمع ہو کر آپ کی اقتداء شروع کی اور امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ جیسے شخص نے آپ کی شاگردی کا دم بھرا تو آپ درویشی کا خیال چھوڑ کر طلب جاہ و امامت کے امور میں مشغول ہو گئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس سے بھی باز آگئے۔ آپ ہر حالت میں نیک خصلت تھے۔ ابتدائے حال میں آپ کے دل میں صوفیاء کی طرف میلان نہیں تھا لیکن جب آپ کو حضرت سلیمان راعی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت ملی تو آپ کے دل میں حقیقت کی طلب پیدا ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں کہ **اذا رایت العالم یشتغل بالرخص فلیس یجبی منہ شیئی** "جب تو دیکھے کہ ایک عالم دین میں آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو جان لے کہ اس سے کچھ نہیں ہو سکے گا" یعنی ہر قسم کے لوگوں کے پیشوا علماء کو چاہئے کہ کسی کو شریعت سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ دیں اور نہایت احتیاط اور سعیٔ بلیغ کے ساتھ خلقِ خدا کو راہ راست پر قائم رکھیں کیونکہ ہر کام میں رخصت یعنی آسانی تلاش کرنا اس کا کام ہوتا ہے جو مجاہدات سے گریز کرتا ہے اور ہر کام میں تخفیف چاہتا ہے۔ تخفیف طلب کرنا عوام کا کام ہے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آسانی بھی ہو اور دائرہ شریعت سے بھی باہر نہ نکلیں اور مجاہدات پر ڈٹ جانا خواص کا درجہ ہے تاکہ عالمِ بطون سے بہرہ ور ہو سکیں۔ علماء کا شمار خواص میں

ہونا چاہئے۔ لیکن جب خواص بھی عوام کا سا کام کرنے لگ جاتے ہیں تو ان سے کسی چیز کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ نیز دین میں آسانی طلب کرنا فرمان حق کی ہلکی ہے۔ چونکہ علماء کرام دوستانِ حق ہیں۔ دوستوں کو دوست کے احکام کی ہلکی سے پرہیز لازم ہوتا ہے اور وہ عوام کی روش اختیار نہیں کرتے اور خوب احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک رات مجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم مجھے آپ کی ایک حدیث سے یہ معلوم ہوا ہے کہ خداوند تعالٰی نے دنیا میں اوتاد' اولیاء اور ابرار مقرر فرمائے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا کہ تجھے یہ صحیح خبر ملی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم میں چاہتا ہوں کہ ان میں سے کسی کی زیارت کروں۔ فرمایا محمد بن ادریس رحمتہ اللہ علیہ ان میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ امام موصوف کے مناقب بے شمار ہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ

شیخِ سنت و قاہرِ اہل بدعت حضرت امام ابو محمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے اور حافظِ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ آپ دونوں فریقین (اہل ظاہر و اہل باطن) میں مقبول تھے اور کئی مشائخ طریقت مثلاً حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ' حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ سے فیض صحبت حاصل کیا تھا۔ آپ ظاہر الکرامات اور صاحبِ فراست (بطون) بزرگ تھے۔ اور یہ جو آپ پر عقیدۂ تجسیم کی تہمت لگائی جاتی ہے بالکل افترا' بے بنیاد اور من گھڑت ہے۔

شرح عقیدۂ تجسیم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا جسم تسلیم کیا جائے مثلاً بعض اہل حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اوپر کی جانب عرش پر مقیم ہے۔ اس سے حق تعالیٰ کے لئے ایک جہت ثابت کی جاتی ہے حالانکہ اس کی نہ کوئی جہت ہے نہ سمت۔ دوسرے اس عقیدہ سے تجسیم یعنی حق تعالیٰ کا مجسم ہونا بھی لازم آتا ہے اور محدود ہونا بھی۔ کیونکہ جب عرش کو فضا کے کسی کونے میں تصور کیا جائے اور حق تعالیٰ کو اس عرش پر مقیم سمجھا جائے تو پھر وہ ایک محدود اور مجسم ہستی بن جاتا ہے جو عقائد اسلامیہ کے خلاف اور صریحی کفر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے یہ عقیدہ آیت اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (رحمٰن عرش پر مسلط ہے) سے قائم کیا ہے لیکن انہوں نے عرش کے معنی سمجھنے میں کوتاہی کی ہے۔ آیت الکرسی میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ "اس کے عرش و کرسی میں ساری کائنات شامل ہے۔" یعنی عرش کوئی ایک تخت نہیں ہے جو اوپر کی سمت میں فضا میں معلق ہے اور اس پر حق تعالیٰ تشریف رکھتے ہیں بلکہ عرش اور کرسی میں ساری کائنات شامل ہے اور جب آیت **اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى** کے مطابق حق تعالیٰ عرش پر مسلط ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات کا ذرہ بھر ذات حق اور وجود حق سے خالی نہیں ہے اور یہی عقیدہ وحدت الوجود ہے جس سے بچنے کی خاطر حق تعالیٰ کو اوپر کی جانب محدود عرش پر محدود جسم کے ساتھ بٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تفسیر کا بہترین طریقہ تفسیر بالقرآن ہے یعنی قرآن کی دوسری آیات سے کسی آیت کے معنی نکالنا۔ آیت الکرسی کے علاوہ قرآن حکیم میں اور بیشمار آیات ہیں جس سے حق تعالیٰ کا ہر جگہ اور کائنات کی ہر چیز میں پایا جانا ثابت ہے مثلاً حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو) نیز فرمایا فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (جس طرف منہ کرو اللہ ہی اللہ ہے) نیز فرمایا

هُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (اول بھی وہی ہے، آخر بھی وہی ہے، ظاہر بھی وہی ہے، باطن بھی وہی ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کریمہ کی یوں تفسیر فرمائی ہے **هو الاول ولا قبله شیئی هو الاخر ولا بعده شئی هو الظاهر ولا فوقه شئی هو الباطن ولا دونه شئی** (وہ اول ہے اور کوئی چیز اس سے پہلے نہ تھی، وہ آخر ہے اور کوئی چیز اس کے بعد نہیں، وہ ظاہر ہے اور کوئی چیز اس کے اوپر نہیں وہ باطن ہے اور کوئی چیز اس کے سوا نہیں) اور یہی عقیدہ وحدت الوجود ہے کہ ساری کائنات وجود باری تعالٰی میں شامل ہے اور اس عقیدہ کی کشف المحجوب میں حضرت مصنف نے کئی بار تصریح فرمائی ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ جو حضرات اہل حدیث کے شیخ ہیں، تجسیم کے قائل نہیں تھے بلکہ حق تعالٰی کی لامحدودیت کے قائل تھے۔ جس کا دوسرا نام وحدت الوجود ہے۔

ترجمہ امام موصوف عقیدۂ تشبیہ (تجسیم) سے بری تھے اور آپ کے عقائدِ دین تمام علمائے اسلام نے قبول کئے ہیں۔ جب بغداد میں فرقہ معتزلہ کا غلبہ ہوا تو انہوں نے امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کو زد و کوب کر کے قرآن کو مخلوق کہلانے کا عقیدہ منوانا چاہا۔ انہوں نے آپ کے بازو پیچھے باندھ کر ہزار کوڑے لگائے کہ قرآن کو مخلوق کہو۔ اس اثناء میں آپ کا زاربند کھل گیا۔ چونکہ آپ کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے، غیب سے دو ہاتھ ظاہر ہوئے اور زاربند باندھ دیا۔ جب ان لوگوں نے یہ کرامت دیکھی تو چھوڑ دیا۔ لیکن ہوا یہ کہ اسی زد و کوب کی وجہ سے آپ جاں بحق ہو گئے۔ انتقال سے پہلے کسی نے آپ سے پوچھا کہ جن لوگوں نے آپ کو اس قدر عذاب دیا ان کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں۔ فرمایا میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے رضائے حق کے لئے مجھ سے یہ سلوک روا رکھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ میں باطل پر ہوں اور وہ حق پر ہیں۔ اس لئے قیامت

میں میں ان کے خلاف کوئی داد رسی نہیں چاہتا۔ معاملاتِ طریقت میں آپ کے اقوال بہت لطیف ہیں۔ جب آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو اگر اس کا تعلق فقہ سے ہوتا تو خود جواب دیتے اور حقائق و معارف سے ہوتا تو آپ اس کو حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیتے تھے۔

امام موصوف کے نزدیک اخلاص کی تعریف

ایک دفعہ کسی نے آپ سے پوچھا کہ اخلاص کیا ہے؟ فرمایا **الاخلاص هو الخلاص من آفات الاعمال** (اخلاص یہ ہے کہ آفت اعمال سے خلاصی پائے) یعنی تمہارے اعمال ریا (دکھلاوے) اور نفاق (منافقت) سے پاک ہوں۔

توکل کیا ہے

کسی نے آپ سے پوچھا کہ توکل کیا ہے فرمایا **الثقة باللّٰہ** "حق تعالیٰ پر بھروسہ کرنا" یعنی روزی پہنچانے میں حق تعالیٰ پر پورا اعتماد رکھے۔

رضا کیا ہے

جب کسی نے پوچھا کہ رضا کیا ہے تو فرمایا **تسلیم الامور الی اللّٰہ** (ہر کام کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا)۔

لیکن جب کسی نے پوچھا کہ محبت کیا ہے تو فرمایا کہ حضرت شیخ بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ سے جاکر دریافت کرو جب تک وہ زندہ ہیں میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ غرضیکہ آپ کی ساری عمر معتزلہ کے طعن و تشنیع میں گزری اور وصال کے بعد آپ پر تشبیہ (تجسیم) کی تہمت لگائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اہلسنت و الجماعت نے بھی آپ کے متعلق زیادہ علم نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو ملامت کا نشانہ بنایا۔ حالانکہ آپ ملامت سے بری ہیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت احمد بن حواری رحمتہ اللہ علیہ

سراجِ وقت (اپنے زمانے کے آفتاب) اور مشرف آفات مقت (عقوبت الٰہی کی آفات سے آگاہ) حضرت ابوالحسن احمد بن الحواری رحمتہ اللہ علیہ کا شمار شام کے اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ اور آپ تمام مشائخ میں مقبول تھے۔چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ احمد حواری شام کے پھول ہیں۔ طریقت میں آپ کے اقوال بہت لطیف ہیں اور آپ نے کثرت سے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کی ہیں۔ آپ اپنے زمانے میں مرجع مشائخ تھے۔ آپ حضرت ابوسلیمان دارانی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ اور مروان بن معاویہ قاری رحمتہ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے۔ آپ نے سیاحت بہت کی اور کافی مشائخ سے فیض صحبت حاصل کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ دنیا گندگی کا ڈھیر ہے جس پر کتے جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن کتوں سے بدتر وہ ہے جو گندگی کے ڈھیر پر قیام کر لے کیونکہ کتے تو اپنا پیٹ بھر کر چلے جاتے ہیں لیکن طالب دنیا اسے نہیں چھوڑتا۔ آپ کے نزدیک جوانمرد وہ ہے جو دنیا کو گندگی کا ڈھیر سمجھ کر اس کی طرف رجوع نہ کرے اور کتوں سے بدتر نہ بنے کیونکہ کتے تو حاجت روائی کر کے چلے جاتے ہیں اور دنیا دار کو دنیا کی محبت اس قدر لاحق ہے کہ اس سے اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ یہ علامت ہے آپ کے ترک دنیا کی اور دنیا داروں سے اجتناب کی۔ اہل طریقت کے نزدیک دنیائے دون سے قطع تعلق کرنا بہت بڑی کامیابی اور خوشی ہے۔

آپ نے پہلے علم حاصل کیا اور کمال حاصل کر کے دریا پر گئے اور ساری کتابیں دریا میں پھینک کر فرمایا کہ تم میرے لئے اچھی دلیل تھیں لیکن وصال کے بعد دلیل کے ساتھ چمٹے رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ کیونکہ دلیل اس وقت کام

دیتی ہے جب تک سالک راستے میں ہے۔ (بعض نسخوں میں یہ آیا ہے کہ حضرت شیخ نے یہ کلمات حالت سکر اور استغراق میں کہے کیونکہ یہ بات اکابر مشائخ کے مسلک کے مطابق نہیں ہے۔)

جیسا کہ کسی نے کہا ہے **وصلت فقد ضل** (جس نے کہا کہ میں پہنچ گیا ہوں وہ گمراہ ہوا) کیونکہ منزل مقصود تک رسائی کا دعویٰ منزل مقصود سے محرومی کی علامت ہے۔

شرح چونکہ ذات حق کی کوئی انتہا نہیں اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے مکمل وصال حق نصیب ہو گیا ہے تو یہ دعویٰ باطل ہو گا۔ جس کی کوئی انتہا نہ ہو اس کا وصال کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔ اس لئے بزرگوں نے قرب کی لاانتہا منازل اور مراتب کہے ہیں اور آخری منزل تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکا۔ کیونکہ اس راستے کی کوئی آخری منزل ہی نہیں ہے۔ چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں کی تکمیل ہو گئی ہے تو لفظ تکمیل بھی اضافی یا اعتباری معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی ذاتی استعداد کے مطابق اسے قرب حاصل ہوا ہے جہاں تک کماحقہ' قرب کا تعلق ہے وہ کسی کو نصیب نہیں ہوتا کیونکہ ذات حق لامحدود اور لاانتہا ہے۔

ترجمہ چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص ذات حق میں مشغول ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں مشغول ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں واصل باللہ ہو کر فراغت پا چکا ہے تو اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ قرب اور وصال کی کسی منزل تک رسائی حاصل کر کے تھک کر بیٹھ گیا۔ غرضیکہ کوشش ہو یا فارغ ہو کر بیٹھنا یہ دونوں بندہ کے کام ہیں' اور وصل اور فصل (واصل ہونا یا جدا ہونا) یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے۔

"جسے چاہے واصل کر دے اور جسے چاہے مہجور رکھے" یہ چیز کوشش سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ فضل ربی سے حاصل ہوتی ہے۔ وصل میں بندہ کی کرامت (عظمت) ہے اور فصل میں اس کی محرومی ہے۔ اس اصول میں کوئی تبدل و تغیر نہیں ہوتا اور میں علی بن عثمان ہجویری یہ کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ حضرت احمد حواری رحمتہ اللہ علیہ کا لفظ "وصال" (پالینا) سے مطلب راہ حق کا پالینا ہو۔ کیونکہ اکثر مشائخ نے یہی کہا ہے کہ جب راہ حق واضح ہو جاتا ہے تو عبارات و تشریحات کی ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ راہ حق بیان کرنے سے راستہ سامنے نہیں آجاتا بلکہ ایک گونہ راہنمائی ہوتی ہے اور جب راہ حق پر بندہ چل پڑتا ہے پھر کتابوں سے اس کی راہنمائی کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب معرفت حق حاصل ہوتی ہے تو زبانیں اس کے بیان سے گونگی ہو جاتی ہیں لہٰذا ایک کاغذ کے ٹکڑے (کتاب) کی کیا ہستی ہے کہ وصال کے بعد اس کی ضرورت باقی رہے۔ بعض مشائخ کبار مثلاً حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ سے بھی روایت ہے کہ انہوں نے کتابیں دریا میں ڈال دیں۔ لیکن بعض رسمی صوفیوں نے جہل اور کاہلی کی وجہ سے ان کابرین کی تقلید کرتے ہوئے یہی کام کیا ہے لیکن اکابرین کا مقصد غیرِ حق سے **انقطاع** (قطع تعلق) کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ان کا یہ عمل علامت سکر (استغراق) ہے اور کودکی (ابتدائی مراحل) کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ اصحاب تکوین کی یہ حالت ہوتی ہے کہ کتاب تو درکنار دونوں جہان بھی ان کو حق تعالیٰ سے محجوب نہیں کر سکتے۔ جب دل غیر حق سے فارغ ہو جاتا ہے تو ایک کاغذ کے ٹکڑے کی کیا مجال کہ حجاب بن سکے لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کتابوں کو دریا میں پھینکنے سے ان کی مراد عبارت کی نفی ہے کیونکہ تحقیقِ حق (حقیقت) عبارت میں نہیں سما سکتی۔ لہٰذا خواہ زبانی بات چیت ہو خواہ کتابی عبارت، دونوں حقیقت کو بیان کرنے میں قاصر ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ

حضرت احمد حواری رحمتہ اللہ علیہ کو غلبۂ حال میں کوئی ان کی بات سننے والا نہیں ملا ہوگا اس لئے انہوں نے اپنی واردات قلبی کو کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔ جب کاغذ بہت جمع ہو گئے اور ان کا اہل نہ ملا تو انہوں نے ان کو دریا میں پھینک دیا۔ اور یہ فرمایا کہ میرے لئے بہترین دلیل حق تعالیٰ ہے۔ اور جب وصال حق حاصل ہو گیا تو کتابوں اور کاغذوں میں مشغول ہونا ختم ہو گیا۔ نیز یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ آپ کے ہاں اوراد اور معاملات کی قسم کے کاغذات اور کتابیں بہت جمع ہو گئیں اور راہ حق میں حائل ہوئیں تو انہوں نے ان کو دریا میں پھینک دیا تاکہ دل ان سب چیزوں سے فارغ ہو کر حق کے ساتھ مشغول ہو جائے۔ واللہ اعلم۔ ونعوذ باللہ من السفہ۔

حضرت شیخ احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ

سرہنگِ جوانمرداں (جوانمردوں کے سردار) اور آفتابِ خراسان (خراسان کے آفتاب) حضرت شیخ ابوحامد احمد بن خضرویہ بلخی رحمتہ اللہ علیہ بڑے بلند ہمت اور عالی مقام بزرگ تھے اور اپنے زمانہ کے مقتدائے قوم تھے۔ آپ ہر دلعزیز تھے آپ کا مسلک ملامتیہ تھا۔ آپ فوجی لباس زیب تن کرتے تھے۔ آپ کی اہلیہ فاطمہ جن کو طریقت میں بلند مقام حاصل تھا۔ بادشاہ بلخ کی بیٹی تھیں۔ جب بی بی فاطمہ کو توبہ کی توفیق ہوئی اور راہ حق اختیار کیا تو انہوں نے حضرت احمد خضرویہ کے پاس پیغام بھیجا کہ میرے باپ سے میرا رشتہ طلب کرو لیکن آپ نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ بی بی صاحبہ نے دوبارہ پیغام بھیج کر کہلا بھیجا کہ اے احمد میں نے تو آپ کو اس لئے شادی کا پیغام بھیجا کہ آپ ایک عورت کو راہ حق دکھلائیں گے نہ کہ راہزنی کریں گے۔ اس کے بعد حضرت شیخ نے بادشاہ کے پاس قاصد بھیج کر رشتہ طلب کیا تو اس نے تبرک کے طور پر اپنی بیٹی کا ان کے ساتھ بیاہ کر

دیا۔ شادی کے بعد بی بی فاطمہ دنیا سے قطع تعلق کر کے شیخ کے ساتھ یاد حق میں مشغول ہو گئیں۔ ایک دفعہ حضرت احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کو گئے تو فاطمہ بھی ساتھ تھیں۔ جب میاں بیوی حضرت شیخ کے پاس پہنچے تو بی بی فاطمہ نے منہ سے نقاب اٹھا لیا اور بے تکلفی سے کلام کرنے لگیں جس سے حضرت احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کو سخت تعجب ہوا اور ان سے کہا کہ فاطمہ یہ تم کیسے گستاخی سے باتیں کر رہی ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ میرے شوہر ہیں اور یہ میرے شیخ طریقت ہیں۔ آپ سے مجھے ہوا (نفسانی خواہش) اور ان سے خدا ملتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بایزید تو میری صحبت سے بے نیاز ہیں اور آپ میری صحبت کے محتاج ہیں۔ یہ کہہ کر وہ بدستور حضرت شیخ بایزید کے ساتھ اسی انداز میں باتیں کرتی رہیں۔ ایک دن حضرت شیخ بایزید رحمتہ اللہ علیہ کی نظر بی بی فاطمہ کے ہاتھ پر پڑی جس پر مہندی لگی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر انہوں نے پوچھا کہ آپ نے ہاتھ پر مہندی کیوں لگائی ہوئی ہے۔ بی بی فاطمہ نے جواب دیا اے بایزید جب تک آپ نے میرے ہاتھ کی طرف نظر نہ کی تھی تو مجھے آپ کے ساتھ بیٹھ کر خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اب جب کہ آپ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں ہمارا ایک دوسرے کے پاس بیٹھنا حرام ہو گیا ہے۔ اس کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو کر نیشاپور چلے گئے۔ اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اس سے وہاں کے لوگ اور مشائخ طریقت خوش ہوئے۔ جب شیخ یحییٰ بن معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ نیشاپور آئے اور بلخ جانے کا قصد کیا تو شیخ احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ نے ان کو دعوت دینے کا ارادہ کیا اور اس بارے میں بی بی فاطمہ سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ اتنی گائے بکریاں اور فلاں فلاں چیزوں کی اور فلاں قسم کے عطریات کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ بیس گدھوں کی ضرورت ہے ان کو بھی ذبح کیا جائے گا۔ شیخ نے پوچھا کہ گدھوں کو

ذبح کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے جواب دیا جب ایک کریم دوسرے کریم کے گھر مہمان ہوتا ہے تو شہر کے کتوں کا بھی حق ہے ان کو کھلایا پلایا جائے۔ حضرت ابو یزید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس کسی کو عورتوں کے لباس میں چھپا ہوا جوانمرد دیکھنے کی ضرورت ہو وہ فاطمہ کو دیکھے۔ حضرت ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر احمد خضرویہ نہ ہوتے تو دنیا میں جوانمردی ظاہر نہ ہوتی۔ آپ کے اقوال بہت بلند اور نکات بہت لطیف ہیں آپ کی تصانیف بھی ہر فن میں موجود ہیں جن کے اندر آپ نے بڑے اسرار و رموز بیان فرمائے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ **الطریق واضح والحق لائح' والداعی قداسمع فما التحیر بعدھا الا من العمی** "راستہ واضح ہے حق ظاہر ہے اور نگہبان سننے والا ہے۔ پس پھر بھی اگر کوئی غفلت کرے تو یہ نابینا ہونے کی علامت ہے"۔ کیونکہ راستہ سورج کی طرح روشن ہے۔ پس تو اپنے آپ کو دیکھ کہ کہاں پھر رہا ہے۔ حق تعالیٰ اس سے زیادہ ظاہر ہے کہ اس کو تلاش کرنے کی ضرورت پڑے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ **استرعز فقرک عن الخلق** "اپنے فقر کی عزت کو لوگوں سے چھپاؤ"۔ یعنی خلق پر یہ مت ظاہر کرو کہ تم درویش ہو تاکہ تمہارا راز ظاہر نہ ہو۔ کیونکہ یہ خداوند تعالیٰ کی عظیم کرامت (نعمت) ہے۔آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں کسی درویش نے ایک دولت مند کو دعوت دی اور آپ کے گھر میں سوائے ایک خشک روٹی کے کچھ نہیں تھا۔ جب مہمان دعوت کے بعد گھر واپس پہنچا تو اس نے درویش کے پاس سونے سے بھرا ہوا تھیلا ارسال کیا۔ درویش نے تھیلا واپس کر کے کہلا بھیجا کہ یہ سزا ہے اس شخص کی کہ جو اپنا راز تجھ پر ظاہر کرے یا غنی لوگوں کو عزت فقر کا اہل سمجھے۔ اور یہ علامت ہے آپ کے صدق اور فقر کی۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو تراب نخشبی رحمتہ اللہ علیہ

امام متوکلان و برگزیدۂ اہلِ زمان حضرت بو تراب عسکر بن حسین نخشبی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار خراسان کے اکابر مشائخ اور سادات میں ہوتا ہے۔ آپ بلندیٔ ہمت اور زہد و تقویٰ میں مشہور ہیں۔ آپ کی کرامات بیشمار ہیں جو سفر و حضر میں آپ سے ظاہر ہوئیں۔ آپ اکثر سیر و سیاحت میں رہتے تھے اور تن تنہا لق و دق بیابان میں بسر کرتے تھے۔ بلکہ آپ کی وفات بھی بصرہ کے صحرا میں ہوئی۔ آپ کے وصال کے کئی سال بعد جب لوگ وہاں پہنچے تو آپ کو اس حالت میں دیکھا کہ قبلہ کی طرف منہ کئے ہوئے عصا ہاتھ میں ہے اور سر پہاڑ پر رکھے ہوئے کھڑے ہیں۔ آپ کا جسم سوکھ کر لکڑی ہو چکا تھا لیکن کسی جنگلی جانور کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ ان کے پاس پھٹکتا۔

فقیر کا کھانا' کپڑا اور مکان

آپ فرماتے ہیں کہ **الفقیر قوتہ ما وجد و لبلسہ ملستر و مسکنہ حمث نزل** "فقیر کی خوراک وہ ہے جو مل جائے' اس کا لباس وہ ہونا چاہئے جس سے ننگا پن ڈھانپ سکے اور اس کا مسکن وہ ہے کہ جہاں رات بسر کرے"۔ یعنی خوراک میں اپنی پسند کو دخل نہ دے' لباس میں بے جا خرچ نہ کرے اور اپنے لئے مکان نہ بنائے بلکہ جہاں رات آجائے سو جائے۔ ان تینوں چیزوں میں تصرف کرنا (بے جا خرچ کرنا) غیراللہ میں مشغول ہونا ہے اور سارا جہان ان تین چیزوں کی آفت میں مبتلا ہے۔ یہ دنیاوی لحاظ ہے۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے درویش کی غذا وجد (حال) ہے اس کا لباس تقویٰ (پرہیزگاری) اور اس کا مسکن غیب ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا "اگر وہ لوگ طریقت یعنی (تصوف) پر جم جائیں تو ہم ان کو پوری

طرح سیراب کریں گے" نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **الفقر وطن الغیب** (فقر غیب کا وطن ہے)

شرح وطن غیب سے مراد مقام فنا فی اللہ ہے۔ یعنی غیب ھویت یا ذات بحت میں ایک ہو جانا۔

ترجمہ نیز حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (بہترین لباس' لباسِ تقویٰ ہے) پس طریق فقر یا مسلک فقیر یہ ہے کہ اس کا کھانا پینا شرابِ وصل ہوتا ہے۔ اس کا لباس تقویٰ اور مجاہدہ' اور اس کا مسکن ذاتِ حق ہوتا ہے (یعنی فنا فی اللہ)۔ یہ ہے فقر کا درجہ کمال۔

حضرت یحییٰ ابن معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ

لسانِ محبت و وفا' زینِ (زینت) طریقت و ولا (ولایت) حضرت ابو زکریا یحییٰ بن معاذ الرازی رحمتہ اللہ علیہ بڑے بلند مرتبہ اور نیک سیرت بزرگ تھے اور مقام خوف و رجائے حق میں بہت بلند تھے۔ حضرت شیخ حصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خداوند نے دو یحییٰ پیدا فرمائے ایک نبی تھے اور دوسرے ولی۔ آپ نے طریق خوف کو اس قدر اپنایا کہ تمام اہل اللہ خوف خدا میں ڈوب گئے اور طریق رجا (امید) کو اسقدر اختیار کیا کہ رجا کے تمام دعویداروں سے سبقت لے

(نوٹ: لیجئے حضرت مخدوم علی ہجویری قدس سرہٗ نے قرآن مجید سے "اصطلاح طریقت" تلاش کر دی۔ اسی طرح بعض احادیث میں لفظ تصوف بھی موجود ہے جن میں سے ایک حدیث حضرت مخدوم نے چوتھے باب کے شروع میں بیان فرمائی ہے۔ ایک اور حدیث میں شریعت' طریقت' حقیقت' معرفت یعنی تصوف کے چاروں ارکان مذکور ہیں یہ حدیث حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ نے شرح مثنوی میں نقل کی ہے۔)

گئے۔ کسی نے حضرت شیخ حصری رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ پیغمبر یحیٰی علیہ السلام کا حال تو ہمیں معلوم ہے، یحیٰی بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ کا حال کیسا ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ ان کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی جاہلیت میں نہیں رہے۔ اور ان سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد نہ ہوا۔ اور معاملات میں اسقدر پکے تھے جس کی مثال نہیں ملتی۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ یا شیخ آپ کا مقام تو مقام رجا ہے لیکن آپ کا معاملہ مقام خوف ظاہر کرتا ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں ؟ فرمایا بیٹے یاد رکھو کہ بندہ کے لئے عبودیت شرط ایمان ہے۔ اور خوف اور رجا ایمان کے ستون ہیں۔ اس لئے جب تک آدمی خوف و رجا پر عمل کرتا ہے اس کے لئے گمراہ ہونا محال ہے۔ خائف محرومی کے خوف سے عبادت کرتا ہے اور راجی امید وصل پر عبادت کرتا ہے۔ اس لئے خوف اور رجا دونوں کی غرض و غایت عبادت ہے۔ اور جب عبادت میسر آگئی خوف بھی عبادت بن جاتا ہے اور رجا بھی۔ اور عبادت کے مقابلہ میں عبارت (زبانی جمع خرچ) کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں اور نکات و اشارات بہت لطیف ہیں۔ خلفاء راشدین کے بعد پہلا شخص جس نے منبر پر چڑھ کر ہدایت دی آپ ہیں اور مجھے آپ کا کلام بہت پسند ہے کیونکہ اس سے طبیعت میں رقت اور دل میں لذت محسوس ہوتی ہے لیکن آپ کے کلمات ہیں بہت دقیق (مشکل) ۔ اور بے حد مفید۔

آپ فرماتے ہیں کہ **الدنیا دار الاشغال و الاخرۃ دار الاھوال ولا یزال العبد بین الاشغال والاھوال حتی یستقر بہ القرار اما الی الجنتہ و اما الی النار** "دنیا مشغولی کی جگہ ہے اور آخرت خوف و خطر کا مقام ہے لہذا دونوں جہانوں میں انسان کو اشتغال اور خطرات کے سوا چارہ نہیں حتیٰ کہ جنت میں پہنچ جائے یا دوزخ میں" خوش قسمت ہے وہ آدمی جو اشغالِ دنیا سے اور خطراتِ عقبیٰ سے پیچھا چھڑا کر حق تعالیٰ سے پیوست ہو جائے۔ آپ کا مسلک یہ تھا کہ آپ غنا

کو فقر پر ترجیح دیتے تھے۔ جب شہر رَے میں آپ پر قرض بڑھ گیا تو خراسان چلے گئے۔ جب بلخ پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے آپ کو اپنے پاس ٹھہرا لیا اور آپ مدت تک وہاں وعظ و نصیحت میں مشغول رہے۔ جب رَے واپس جانے لگے تو لوگوں نے ایک لاکھ درہم بطور نذر پیش کئے لیکن راستے میں سارا مال چوروں نے لوٹ لیا اور آپ بے سروسامانی کی حالت میں نیشاپور پہنچے۔ جہاں آپ کا وصال ہوا اور دفن کئے گئے۔ آپ جہاں بھی رہے ہردلعزیز رہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو حفص حدادی رحمتہ اللہ علیہ

شیخ المشائخ خراسان و نادرۂ زمین و زمان حضرت شیخ ابو حفص عمر بن سالم نیشاپوری حدادی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار اکابر مشائخ میں ہوتا ہے اور تمام مشائخ آپ کے مداح ہیں۔ آپ کو حضرت ابوعبداللہ بیوردی رحمتہ اللہ علیہ کا شرف صحبت حاصل ہے۔ نیز آپ حضرت احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کے بھی رفیق ہیں۔ شاہ شجاع کرمانی آپ کی زیارت کی خاطر کرمان سے بغداد تشریف لے گئے۔ آپ بغداد میں تھے لیکن عربی زبان نہیں جانتے تھے اس لئے آپ کے مریدین بہت پریشان تھے کہ کس قدر عظیم شیخ ہے لیکن بات کرنے کے لئے ترجمان کی ضرورت ہے۔ لیکن جب مسجد شونیزیہ میں پہنچے جہاں تمام مشائخ اور حضرت جنید بھی موجود تھے تو آپ نے ان کے ساتھ ایسی فصیح عربی میں بات کی کہ سب حیران رہ گئے۔ اس وقت مشائخِ بغداد نے آپ سے سوال کیا کہ **ما الفتوۃ** "فتوت کیا ہے ؟" آپ نے فرمایا ہم میں ہر شخص فتوت کی تعریف کرے۔ سب سے پہلے حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا **الفتوۃ عندی ترک الرویتہ و اسقاط النسبتہ** "میرے نزدیک فتوت یہ ہے کہ جوانمردی کا خیال ترک کرے اور جو کچھ کیا ہے اس کی نسبت اپنے سے نہ کرے کہ یہ میں نے کیا ہے"۔ اس کے بعد حضرت

ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا آپ نے خوب کہا ہے لیکن **الفتوۃ عندی اداء الانصاف و ترک مطالبتہ الانصاف** "میرے نزدیک فتوہ (جوانمردی) یہ ہے کہ انسان انصاف کرے لیکن انصاف طلب نہ کرے"۔ یہ سن کر حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دوستو اٹھو ابو حفص نے تو آدم زاد سے بڑھ کر بات کی ہے۔

آپ کی توبہ کا واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک کنیز پر عاشق ہو گئے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ نیشاپور میں ایک یہودی رہتا ہے جو تجھے محبوبہ سے ملا سکتا ہے ابو حفص اس کے پاس گئے اور حال بیان کیا۔ یہودی نے کہا کہ آپ کو چالیس روز نماز ترک کرنا پڑے گی اور ذکر حق اور عمل نیک سب کچھ چھوڑنا پڑے گا۔ اس کے بعد میں تمہارے لئے کچھ کروں گا اور تمہاری مراد پوری ہو گی۔ چنانچہ چالیس روز تک آپ نے یہودی کے کہنے کے مطابق عمل کیا اور یہودی نے بھی پورا زور لگا کر جادو کیا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ یہودی نے کہا تم نے ضرور کوئی نہ کوئی نیکی کا کام کیا ہے۔ اچھی طرح یاد کرو۔ ابو حفص نے کہا کہ میں نے اور تو کوئی نیکی کا کام نہیں کیا البتہ ایک دفعہ راستے میں ایک پتھر پڑا دیکھا تو اسے پاؤں سے ایک طرف کر دیا تاکہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے۔ یہودی نے کہا کہ جاؤ اور اس مہربان خدا کو رنجیدہ نہ کرو جس نے تمہاری ذرا سی نیکی بھی ضائع نہیں کی حالانکہ تم نے چالیس روز اس کی نافرمانی کی ہے۔ اس پر انہوں نے توبہ کی اور یہودی بھی مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد آپ بیورد تشریف لے گئے اور حضرت ابوعبداللہ بیوردی رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت کی۔ آپ لوہار کا کام کیا کرتے تھے۔ ایک دن دوکان پر بیٹھے تھے کہ بازار میں ایک نابینا قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ تلاوت قرآن کا آپ پر اس قدر غلبہ ہوا کہ محو ہو گئے اور جب آپ نے چمٹے کے بغیر آگ میں ہاتھ ڈال کر سرخ لوہے کا ٹکڑا نکال لیا تو آپ کا شاگرد یہ دیکھ کر بے

ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس واقعہ کے بعد آپ نے آہن گری کا پیشہ ترک کر دیا اور پھر کبھی دوکان پر نہ گئے۔

آپ فرماتے ہیں **ترکت العمل ثم رجعت الیہ ثم ترکنی العمل فلم ارجع الیہ** (میں نے عمل ترک کیا اور پھر اس کی طرف رجوع کیا۔ اس کے بعد عمل نے مجھے ترک کیا اور میں نے اس کی طرف رجوع نہ کیا)۔ کیونکہ جو کسب بندہ کے اختیار میں ہو اس کا ترک کرنا اس کے کرنے سے افضل نہیں ہوتا۔ (یعنی کرنا نہ کرنا برابر ہے) حقیقت یہ ہے کہ ہر قسم کا اکتساب (کسب کرنا) آفت ہے اور وقعت اس چیز کی ہے جو بغیر کسب یعنی خود بخود غیب سے حاصل ہو۔ لیکن جونہی بندہ خیال کرتا ہے کہ یہ کام میری کوشش سے ہوا تو وہ حقیقت کھو بیٹھتا ہے۔ کیونکہ کسی چیز کا ترک کرنا اور اختیار کرنا بندہ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بلکہ خداوند تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جب انسان کو کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو دراصل خدا دیتا ہے اور جب کوئی چیز اس سے ضائع ہوتی ہے تو دراصل خدا اس سے ضائع کراتا ہے۔ جب یہ بات ہے تو پھر دینا اور نہ دینا خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور اس کا حاصل کرنا یا ترک کرنا بندہ کے بس کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا ہزار سال بندہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہونے کی کوشش کرے تو اس سے افضل یہ ہے کہ ایک لمحہ کے لئے حق تعالیٰ بندہ کو قبول کر لے۔ کیونکہ قبولیت قسمت کی بات ہے اور سرورِ سرمدی (ابدی خوشی) سعادتِ ازلی یعنی تقدیرِ الٰہی پر منحصر ہے۔ اس لئے بندہ کی نجات عنایتِ ازلی میں ہے۔ پس خوش قسمت ہے وہ بندہ جو اپنے کسب یا اسباب پر نظر نہ کرے بلکہ مسبب الاسباب (ذاتِ حق) سے امید وابستہ رکھے۔

شرح یہ تقریر بھی مسئلہ قضا و قدر سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ درحقیقت آدمی نہ مجبور ہے نہ مختار۔

بلکہ مجبور بھی ہے اور مختار بھی۔ حقیقت جبر اور اختیار کے درمیان ہے کیونکہ انسان جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ اور اپنی قوت سے کرتا ہے لیکن قوت کا دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے اس لئے وہ مختار بھی ہے اور ایک لحاظ سے مجبور بھی ہے۔

حضرت حمدون قصار رحمتہ اللہ علیہ

قدوۂ اہلِ ملامت (ملامتیہ کے سردار) و بہ بلا سلامت (اور بلا میں سلامت رہنے والے) حضرت ابو صالح حمدون بن احمد بن عمارۃ القصار رحمتہ اللہ علیہ کا شمار مشائخِ متقدمین میں ہوتا ہے۔ آپ زہد و تقویٰ میں مشہور تھے اور علومِ ظاہری میں بدرجۂ اعلیٰ مہارت رکھتے تھے۔ آپ حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ کے ہم مسلک اور حضرت ابوتراب نخشبی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ اور ان کی بدولت حضرت علی نصر آبادی سے منسلک تھے۔ مجاہدات کے بارے میں آپ کے رموز لطیف اور کلمات دقیق ہیں۔ جب آپ کا علم میں درجہ بہت بلند ہوا تو نیشاپور کے اکابرین نے آکر آپ سے درخواست کی کہ منبر پر آکر ہدایتِ خلق کریں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے وعظ کرنا زیب نہیں دیتا۔ انہوں نے پوچھا کہ کس وجہ سے ؟ آپ نے فرمایا کہ ابھی تک میرے دل میں دنیا اور دنیاوی جاہ و حشمت کا خیال باقی ہے۔ میری بات لوگوں کے دلوں پر نہیں اترے گی اور جب تک لوگوں کے دل متاثر نہ ہوں وعظ کرنا خفت اور شریعت کا مذاق اڑانا ہے۔اور وعظ کرنا اس کو زیب دیتا ہے جس کی خاموشی سے دین کو نقصان ہو۔ اور جب بات کرے تو دین کو ترقی ہو۔ جب پوچھا گیا کہ اصحاب سلف کا کلام اس زمانے کے بزرگوں سے کیوں زیادہ فائدہ مند ہے تو آپ نے جواب دیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ عظمتِ اسلام، نجاتِ خلق اور رضائے رحمٰن کی خاطر کلام کرتے تھے اور ہم لوگ عزتِ نفس، طلبِ دنیا اور مقبولیتِ خلق کے لئے بات کرتے ہیں۔

پس جو شخص حق کی خاطر بات کرتا ہے اور حق بات کرتا ہے تو وہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور شریر لوگوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن جو شخص نفسانی خواہشات کی بنا پر کلام کرتا ہے تو اس میں خواری اور ذلت ہوتی ہے اور خلق خدا کو فائدہ نہیں ہوتا لہٰذا اس کا نہ کہنا کہنے سے بہتر ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بات کرنے والا اپنے قول کا عامل نہیں ہوتا (یعنی جو کہتا ہے اس کے مطابق عمل نہیں کرتا)۔

حضرت منصور بن عمار رحمتہ اللہ علیہ

شیخ باوقار' مشرفِ خواطر و اسرار (دلوں کی بات اور بھیدوں کا جاننے والا) حضرت ابو السری منصور بن عمار رحمتہ اللہ علیہ مشائخِ کبار میں سے تھے اور بڑے بلند مرتبہ بزرگ تھے۔ آپ مشائخِ عراق کے مسلک پر تھے اور خراسان میں مقبول تھے۔ پند و نصیحت کے موضوع پر آپ کا کلام بہترین کلام تھا اور آپ کا بیان لطیف ترین بیان تھا۔ آپ علم کی تمام اصناف یعنی روایت' درایت' احکام' اور معاملات وغیرہ میں ماہر فن کا درجہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض صوفیاء کرام نے آپ کے بارے میں بہت مبالغہ سے کام لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ **سبحان من جعل قلوب العارفین اوعیتہ الذکر و قلوب الزاھدین اوعیتہ التوکل و قلوب المتوکلین اوعیتہ الرضاء وقلوب الفقراء اوعیتہ القناعتہ و قلوب اھل الدنیا اوعیتہ الطمع** (پاک ہے وہ ذات جس نے عارفین کے قلوب کو ذکر الٰہی کا مقام بنایا' زاہدین کے قلوب کو توکل کا' توکل کرنے والوں کے قلوب کو رضا کا' فقراء کے قلوب کو قناعت کا اور اہل دنیا کے قلوب کو حرص کا مقام بنایا۔) عجیب بات یہ ہے کہ جہاں حق تعالیٰ نے انسان کے باقی اعضاء کے تمام افعال میں یکسانیت رکھی ہے یعنی سب لوگ ہاتھ سے پکڑنے کا کام لیتے ہیں پاؤں

سے چلنے کا' آنکھوں سے دیکھنے کا' کانوں سے سننے کا' زبان سے بولنے کا لیکن ہر انسان کے قلب میں اس نے مختلف خواص' مختلف ارادے اور مختلف خواہشات رکھی ہیں۔ جہاں ایک دل کو محل معرفت بنایا ہے دوسرے کے دل کو محل ضلالت (گمراہی) بنایا ہے۔ ایک دل میں قناعت رکھی ہے تو دوسرے دل میں حرص رکھا ہے' علیٰ ہذا القیاس۔ غرضیکہ قلبِ انسانی کے سوا کسی اور چیز میں قدرتِ خداوند تعالیٰ کے کرشمے زیادہ نظر نہیں آتے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ لوگوں کی دو اقسام ہیں اول وہ جو اپنے نفس کے عارف ہیں۔ دوم وہ جن کو معرفت حق حاصل ہے۔ اپنے نفوس کے عارفین کی خصوصیات ہیں مجاہدہ و ریاضت اور عارفانِ حق کی عبادت' ریاست (بادشاہی) ہے۔ پہلی قسم کے لوگ عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ بلند مقام حاصل کریں اور دوسری قسم کے لوگ اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ ان کو بلند مقام حاصل ہے۔ اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلا گروہ اہلِ مجاہدہ کہلاتا ہے اور دوسرا اہلِ مشاہدہ۔ واللہ اعلم۔

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو ہر حاجت حق تعالیٰ سے طلب کرتا ہے اور بلند مقام حاصل کرتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو طلب سے فارغ ہے یعنی توکل پر قائم ہے اور جانتا ہے کہ حق تعالیٰ نے روز ازل سے جو کچھ روزی' رزق' اجل' حیات' سعادت' شقاوت وغیرہ لکھ دی ہے وہ ہو کر رہے گی۔ پہلا گروہ فقر کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرا غنا(استغنا) کے ساتھ۔ پہلا گروہ فقر کی وجہ سے تقدیر الٰہی کے مشاہدہ سے محروم ہے اور دوسرا گروہ احتیاج کے ترک کی وجہ سے مشاہدۂ حق میں غرق ہے۔ ایک نعمت کی طلب میں مشغول ہے دوسرا منعم (نعمت دینے والے) میں مشغول ہے پہلا شخص اگرچہ نعمت پاتا ہے دراصل فقیر ہے اور دوسرا شخص جو منعم میں

مشغول ہے اگرچہ فقیر ہے دراصل غنی ہے۔

حضرت احمد بن عاصم انطاکی رحمتہ اللہ علیہ

ممدوحِ اولیاء و قدوۂ اہل رضا حضرت ابو عبداللہ احمد بن عاصم انطاکی رحمتہ اللہ علیہ' طائفۂ صوفیاء کے سردار اور سادات میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ تمام علوم ظاہری سے آراستہ اور علوم باطنی سے پیراستہ تھے۔ آپ کی عمر بہت دراز تھی جس کی وجہ سے آپ نے مشائخ متقدمین کی صحبت پائی اور تبع تابعین میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ اور سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے ہمعصر اور حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ آپ کو حضرت فضیل ابن عیاض رحمتہ اللہ علیہ کا فیضان صحبت بھی حاصل ہوا ہے۔ جملہ اولیاء کرام نے آپ کی تعریف کی ہے آپ کے اقوال بہت بلند اور نکات بہت لطیف ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ **انفع الفقر ماکنت بہ متجملا و بہ راضیا**" (سب سے زیادہ فائدہ مند فقر وہ ہے کہ جس سے تیرا حسن ظاہر ہو اور تو اس سے خوش رہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ساری خلقت کا جمال اور خوشی مال و دولت میں ہے۔ فقیر کا جمال' نعمت کی بجائے منعم حقیقی کے ساتھ رجوع اور اس کے احکام پر رضا میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے فقر مال و دولت کے عدم کا نام ہے اور غناء مال و دولت کے وجود کا نام ہے۔ فقر بلا مال حق تعالیٰ سے تعلق کا نام ہے اور غناء با مال و دولت تعلق بانفس خود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مال و دولت حجاب ہے۔ اور ترکِ مال (فقر) مشاہدہ ہے۔ اور دونوں جہانوں کا جمال (کامرانی) کشف (مشاہدہ) اور رضا میں ہے اور دونوں جہانوں کی بد نصیبی اور محرومی حق تعالیٰ سے محجوب ہونا ہے۔ اور اس کی وضاحت باب فقر و غناء میں کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت شیخ عبداللہ بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ

سالکِ طریقِ ورع و تقویٰ' و اندر امت بزہدِ یحییٰ علیہ السلام' حضرت شیخ ابو محمد عبداللہ بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ بڑے عابد و زاہد تھے اور آپ نے کثرت سے احادیث روایت کی ہیں۔ فقہ' طریقت اور حقیقت میں آپ حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ کے مسلک پر تھے اور ان کے اصحاب سے فیضِ صحبت حاصل کیا۔ طریقت کے اسرار و رموز پر آپ کے اقوال بہت لطیف ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ **من اراد ان یکون حیاً فی الحیٰوۃ فلا یسکن الطمع فی قلبہ** (جو شخص زندۂ جاوید ہونا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ حرص کو دل میں جگہ نہ دے) اس کی وجہ یہ ہے کہ حریص اپنے حرص میں مردہ ہوتا ہے۔ دل میں طمع' دل پر طبع (مہر) کا کام کرتا ہے اور لامحالہ جس دل پر مہر لگ جائے وہ مردہ ہی ہوتا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس کا دل غیر حق سے مردہ اور حق کے ساتھ زندہ ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دل کے لئے عزت اور ذلت دونوں کا سامان کیا ہے۔ ذکرِ حق دل کی عزت ہے اور طمع و لالچ دل کی ذلت ہے۔ جیسا کہ ایک مقام پر آپ نے خود فرمایا ہے: "حق تعالیٰ نے قلوب کو مسکنِ ذکر بنایا لیکن وہ شہوات کا مسکن بن گئے اور شہوات مٹ نہیں سکتیں سوائے بے قرار کرنے والے خوف اور تڑپا دینے والے شوق کے" پس خوف اور شوق ایمان کے دو ستون ہیں۔ جب دل میں ایمان پیدا ہوتا ہے تو اس سے ذکر اور قناعت پیدا ہوتے ہیں نہ کہ طمع و غفلت۔ اس لئے مومن کا دل حرص و ہوا کے تابع نہیں ہو سکتا کیونکہ حرص و ہوا وحشت کا نتیجہ ہے اور وحشت زدہ دل ایمان سے دور ہوتا ہے کیونکہ ایمان کا تقاضا حق تعالیٰ کے ساتھ انس اور غیر اللہ سے وحشت (نفرت) ہے۔ جیسا کہ بزرگوں نے فرمایا ہے **الطماع متوحش منہ**

کل واحد (لالچی سے ہر شخص دور بھاگتا ہے)۔

حضرت شیخ المشائخ جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

شیخ المشائخ اندر طریقت و امام الائمہ اندر شریعت حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید بغدادی قدس سرہٗ کا کمال یہ ہے کہ اہل ظاہر اور اہل باطن دونوں کے مقبول تھے۔ آپ تمام علوم و فنونِ اسلامیہ میں کمال کا درجہ رکھتے تھے اور اصول و فروع میں مفتی تھے۔ آپ حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ کے احباب میں سے تھے۔ آپ کے اقوال اس قدر بلند اور احوال اس قدر کامل تھے کہ آپ کی امامت پر تمام اہل طریقت متفق ہیں اور کسی مدعی اور متصرف کو آپ سے اعراض نہیں ہے۔ آپ حضرت شیخ سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے بھانجے اور مرید تھے۔ ایک دفعہ کسی نے حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ کیا کسی مرید کا اپنے پیر سے بھی درجہ زیادہ بلند ہو سکتا ہے تو آپ نے فرمایا ہاں۔ اس کا ثبوت جنیدؒ ہے جس کا مقام میرے مقام سے زیادہ بلند ہے۔ لیکن حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول تواضع کی بناء پر ہے اور اس میں بڑی حکمت پوشیدہ ہے وہ یہ کہ آپ اہل طریقت پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ اپنے مقام سے اوپر کوئی نہیں دیکھ سکتا کیونکہ نظر ہمیشہ نیچے کے مقام پر پڑتی ہے۔ اوپر جا ہی نہیں سکتی اس لئے جب انہوں نے حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا مرتبہ دیکھا تو لامحالہ نیچے دیکھا اگرچہ انکساری کی وجہ سے "اوپر" کا لفظ استعمال کیا۔

شرح کشف المحجوب کے تمام ترجمہ کرنے والوں نے اصل متن (ایں قول ازاں پیر ازروے تواضع بود) میں لفظ "تواضع" کی فوراً تصحیح کرتے ہوئے لفظ "تواضع" پڑھا ہے حالانکہ حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ کا لفظ "تواضح" زیادہ معنی خیز ہے لیکن چونکہ لفظ "تواضح" کا مطلب ذرا غور طلب اور مشکل نظر آیا۔

مترجم حضرات کا فوراً آسانی کی طرف رجوع ہوا۔ حالانکہ آگے جملہ "و آنچہ گفت بہ بصیرت گفت" سے صاف ظاہر ہے کہ اوپر کے جملہ میں لفظ تواضع نہیں "تواضح" ہے جو (بصیرت) کا ہم معنی ہے یعنی (وضاحت کرنا)۔ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے قول کی حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ چونکہ کسی شیخ کے لئے اپنے مرتبے سے اوپر کے مرتبہ کو معلوم کرنا ممکن نہیں اس لئے حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ نے جب حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا مرتبہ بتایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اوپر کی بجائے نیچے دیکھ کر یہ بات کہی۔ چنانچہ اس سے آگے جو مثال حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے دی ہے یعنی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کرنا اور وعظ کرنے کا حکم پانا۔ اس سے بھی حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کا مرتبہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے مرتبے سے زیادہ بلند تھا اور اگر لفظ "تواضح" کی بجائے "تواضع" پڑھا جائے تو بھی معنی درست آتے ہیں لیکن بہتر تواضح ہے کیونکہ سیاق وسباق سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

ترجمہ اور یہ بات مشہور ہے کہ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے مریدوں کی خواہش تھی کہ آپ پند ونصیحت دیا کریں تاکہ ان کے قلوب کو راحت نصیب ہو لیکن انہوں نے فرمایا کہ جب تک میرے شیخ موجود ہیں یہ کام نہیں کروں گا۔

ایک مرتبہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اے جنید وعظ کیا کرو کیونکہ تیرے کلام کو خداوند تعالیٰ نے خلق کی نجات کا ذریعہ بنایا ہے"۔ جب آپ بیدار ہوئے تو دل میں خیال پیدا ہوا کہ شاید میرا مرتبہ

میرے شیخ سے زیادہ بلند ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے براہ راست مجھے حکم دیا ہے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک مرید بھیج کر کہلا بھیجا کہ تم نے مریدوں کی بات نہ مانی' اور نہ مشائخ بغداد کی اور نہ میری بات مانی کہ پند و نصیحت کیا کرو۔ اب جب کہ تجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ملا ہے تو ان کے حکم کی تعمیل کر۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ پیغام سن کر میرے دل سے وہ وہم دور ہو گیا کہ (میرا مرتبہ میرے شیخ سے زیادہ بلند ہے) اور مجھے معلوم ہو گیا کہ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کو میرے تمام ظاہری و باطنی حالات کا علم ہے اور ان کا درجہ میرے درجہ سے اونچا ہے اس وجہ سے کہ ان کو میرے اسرار و رموز کا علم ہے اور مجھے ان کے اسرار و رموز کا علم نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس جا کر معافی مانگی اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے مجھے یہ حکم ملا ہے آپ نے جواب دیا کہ مجھے خداوند تعالیٰ کی خواب میں زیارت ہوئی اور ارشاد ہوا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جنید کے پاس جا کر وعظ کا حکم دیں تاکہ اہل بغداد کی مراد پوری ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ پیروں کو ہر حال میں مریدوں کے حالات کا علم ہوتا ہے۔

اولیاء پر انبیاءؑ کی فضیلت

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے اقوال بہت بلند اور رموز بہت لطیف ہیں آپ فرماتے ہیں کہ **کلام الانبیاء نباء عن الحضور و کلام الصدیقین اشارات عن المشاهده** "انبیاء علیہم السلام کا کلام حق تعالیٰ کے حضور کی خبر ہے اور اولیاء کا کلام ان کے مشاہدات کے متعلق اشارات ہوتے ہیں) صحیح خبر وہ ہے

جو نظر سے دیکھ کر دی جائے اور مشاہدات کا تعلق نظر سے نہیں بلکہ فکر (یعنی سوچ بچار اور تاویلات) سے ہوتا ہے۔ خبر کا تعلق عین (حاضری) سے ہے اور اشارہ کا تعلق غیر (حاضری) سے۔

شرح یعنی جو حکم حضوری یا حاضری کے وقت ملتا ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے اور قوی ہے جو غیر حاضری میں ملتا ہے۔

ترجمہ اس سے ظاہر ہے کہ صدیقین کے مراتب کی انتہا' انبیاء علیہم السلام کے مراتب کی ابتداء ہے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کے درمیان فرق اور انبیاء علیہم السلام کی اولیاء پر فضیلت اس سے واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ملحدوں کے دو گروہ ہیں جو اولیاء کو انبیاء علیہم السلام سے افضل سمجھتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے دل میں ابلیس کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی ایک دن میں مسجد کے دروازہ پر کھڑا تھا کہ دور سے ایک بوڑھے کو آتے دیکھا جب وہ قریب آیا تو میرے دل میں وحشت ہونے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو کہ میری آنکھ وحشت کی وجہ سے تجھے نہیں دیکھ سکتی اور میرا دل تیری ہیبت برداشت نہیں کر سکتا اس نے کہا میں وہی ہوں جسے دیکھنے کی آپ کو خواہش ہوئی۔ میں نے کہا اے ملعون تجھے کس چیز نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے باز رکھا اس نے جواب دیا کہ جنید کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں غیر خدا کو سجدہ کرتا۔ یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی لیکن اوپر سے آواز آئی اے جنید اس کو کہو کہ تم جھوٹ بولتے ہو اگر تو بندہ ہوتا تو حکم خداوندی سے انکار نہ کرتا اور حکم عدولی میں تقرب الٰہی نہ تلاش کرتا۔ جب اس نے میرے دل سے یہ آواز سنی تو کہنے لگا اے جنید تو نے مجھے جلا دیا۔ یہ کہہ کر وہ غیب ہو گیا۔ یہ دلیل ہے حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کی حفاظت و عصمت کی کیونکہ حق تعالیٰ اپنے اولیاء کی

ہر حال میں شیطان کے فریب سے حفاظت کرتا ہے۔

ایک دفعہ آپ کے ایک مرید کے دل میں حضرت شیخ کے متعلق شکایت پیدا ہوئی اور اس نے سمجھا کہ میں بلند مقام پر پہنچ گیا ہوں۔ ایک دن آپ کی آزمائش کی خاطر آیا اور ایک سوال کیا۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کو اس کے دل کا حال معلوم ہو گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تم اپنے سوال کا جواب زبانی چاہتے ہو یا معنوی۔ اس نے کہا مجھے دونوں جواب درکار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ زبانی جواب یہ ہے کہ پہلے تم اپنا امتحان کر لیتے تو میرے امتحان لینے کی تجھے ضرورت نہ ہوتی اور تم یہاں نہ آتے اور معنوی جواب یہ ہے کہ میں نے تجھے ولایت سے معزول کیا۔ یہ سنتے ہی فوراً اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا اور اس نے چلا کر کہا حضور میرا سکون دل برباد ہو گیا میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اس کے بعد حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تجھے معلوم نہیں کہ اولیاء اللہ کے قلوب خزینۂ اسرار ہوتے ہیں۔ تم ان کے زخم کی طاقت نہیں رکھتے۔ آپ نے اسے معاف کیا اور اس پر ایک پھونک ماری جس سے کھوئی نعمت واپس مل گئی اور آئندہ کے لئے مشائخ کی آزمائش سے تائب ہوا۔

حضرت ابوالحسن احمد بن محمد نوری رحمتہ اللہ علیہ

شیخ المشائخ اندر طریقت، و امام الائمہ اندر شریعت، شاہِ اہل تصوف، و بری از آفتِ تکلف، حضرت شیخ ابوالحسن احمد بن محمد الخراسانی رحمتہ اللہ علیہ ایسے ولی اللہ ہیں جو خلق کے ساتھ معاملات میں احسن (بہترین) تھے، جن کے اقوال بے حد واضح اور مجاہدات بہت مشہور تھے۔ آپ کا ایک مخصوص مسلک ہے جس کے متبعین کو نوری کہتے ہیں۔

صوفیاء کرام کے فرقے

صوفیاء کرام کے کل بارہ فرقے یا سلسلے ہیں جن میں سے دس مقبول اور دو مردود ہیں۔ مقبول سلاسل یہ ہیں :

۱- محاسبی ۲- قصاری ۳- طیفوری ۴- جنیدی
۵- ثوری ۶- سہلی ۷- حکیمی ۸- خرازی
۹- خفیفی ۱۰- ستاری۔

یہ تمام فرقے حق پر ہیں اور اہل سنت و الجماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور دو مردود فرقوں میں ایک کا نام حلولی ہے جو عقیدہ حلول و امتزاج رکھتے ہیں' نیز سالمی اور مشبہ بھی انہی میں سے ہیں۔ دوسرا فرقہ حلاجی ہے جو تارکِ شریعت ہے۔ یہ لوگ ملحد اور بے دین ہیں اس لئے مردود ہیں۔ فرقہ اباحتی اور فارسی بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ان تمام فرقوں کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ اس کتاب میں اپنی جگہ پر آرہی ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک اس لحاظ سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ ترک مداہنت (کاہلی چھوڑنے)' دفعِ مسامحت (چشم پوشی ترک کرنے) اور دوامِ مجاہدت (دائمی جدوجہد) کی تعلیم دیتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس گیا اور دیکھا کہ مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے ان سے کہا یا ابوالقاسم آپ نے لوگوں سے حق بات چھپائی تو انہوں نے آپ کو مسند پر بٹھا دیا ہے اور میں نے حق بات بتائی تو انہوں نے پتھروں سے میری تواضع کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو غفلت اور تن آسانی ترک کرنے کی نصیحت کی جائے تو مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ اور ان کی ہوا و حوص کی مخالفت کی جائے تو دشمن بن جاتے ہیں۔ اور جو شخص ان کی ہوا و ہوس

کی مخالفت نہ کرے ان سے پیار کرتے ہیں۔ حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے دوست تھے۔ آپ نے بہت مشائخ سے فیض صحبت حاصل کیا آپ نے حضرت احمد حواری رحمتہ اللہ علیہ کو بھی دیکھا ہے۔ تصوف و طریقت میں آپ کے اقوال بہت بلند اور ارشادات بے حد لطیف اور علوم میں آپ کے نکات بہت اعلیٰ و ارفع ہیں۔

حقیقتِ جمع و تفرقہ

آپ فرماتے ہیں کہ **الجمع بالحق تفرقتہ عن غیرہ و التفرقتہ من غیرہ جمع بہ** "حق کے ساتھ متصل ہونا غیر اللہ سے جدا ہونا اور غیر اللہ سے نجات پانا حق تعالیٰ سے متصل ہونا ہے۔" یعنی جو شخص ہمت کر کے حق تعالیٰ کے ساتھ واصل ہو جاتا ہے غیر اللہ سے اس کا تعلق چھوٹ جاتا ہے اور واصل باللہ ہو جاتا ہے۔ پس حق تعالیٰ سے وصال خلقت سے جدائی کا سبب بن جاتا ہے اور جب مخلوقات سے تعلق قطع ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ کا قرب و وصال حاصل ہوتا ہے کسی نے خوب کہا ہے کہ **الضدان لا یجتمعان** "دو ضدیں ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔"

شرح حق تعالیٰ کے ساتھ جمع یا متصل ہونے سے مراد مقام فنا فی اللہ کا حصول ہے۔ فنا فی اللہ کا مطلب یہ ہے کہ عبادات' ریاضات و مجاہدات' صوم و صلوٰۃ اور شب بیداری وغیرہ سے اس قدر تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے کہ آدمی کا نفس طابع فرمانِ شریعت بن جاتا ہے اور اس کی کدورت دور ہو جاتی ہیں۔ جب نفس کی کدورت دور ہوتی ہے تو انسان کی روح میں تہمت رواز پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ ذاتِ حق یا روحِ حق تعالیٰ میں واصل ہو ترتی ہے کچھ اس طرح جیسے

چراغ کی روشنی آفتاب کی روشنی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ چراغ اور آفتاب دونوں بے حس چیزیں ہیں۔ ان دونوں کی روشنی کا ایک ہو جانا اتنا لطف اندوز اور پرجوش نہیں جیسا کہ محب اور محبوب کا وصال۔ یعنی عاشق اور معشوق یا بندہ اور خداوند تعالیٰ کا ایک ہو جانا اور دوئی کا مٹ جانا۔ مثال کے طور پر جب کوئی شخص حسنِ مجازی پر عاشق ہوتا ہے تو ہر وقت اس کے قرب و وصال کی خواہش اور عشق میں جلتا رہتا ہے اور جب قرب نصیب ہوتا ہے تو اس وقت جو اس کی حالت ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے پہلو میں دل ہو ورنہ اگر وہ بے حس دیوار ہے تو نہ حسن اس کو مرعوب کر سکتا ہے اور نہ اس کے اندر عشق و جذب کا طوفان موجیں مارتا ہے۔ جب ایک ادنیٰ مجازی محبوب کا عشق اس قدر ولولہ انگیز ہوتا ہے کہ اس کا آرام و سکون برباد کر دیتا ہے اور جب اسے وصل یار حاصل ہوتا ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہوتا تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ محبوب حقیقی جو تمام محبوبان مجازی کا خالق ہے' کا حسن و جمال کس قدر جاذب اور پر کشش ہو گا اور اس کے وصال میں کیا کیفیت ہو گی۔ لذتِ قرب اور لذتِ وصال اس قدر پر کیف ہوتی ہے کہ انسان بالکل محو اور بے خود ہو جاتا ہے۔

ترجمہ حکایات میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ اپنے گھر کے اندر تین دن رات ایک ہی جگہ پر کھڑے نعرے لگا رہے تھے جب لوگوں نے اس کا ذکر حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے کیا تو آپ نے وہاں جا کر کہا کہ یا ابوالحسن اگر تمہیں یقین ہے کہ اس طرح آہ و فریاد کرنے سے کوئی فائدہ ہوتا ہے تو مجھے بتا تاکہ میں بھی یہی کام کروں۔ اگر تو جانتا ہے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو پھر شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کر تاکہ تجھے سکون حاصل ہو۔ یہ سن کر شیخ ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ خاموش ہو گئے اور کہنے لگے یا ابوالقاسم! آپ

ہمارے لئے بہت اچھے معلم ثابت ہوئے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں دو چیزیں غنیمت ہیں اول عالم باعمل' دوم عارف باللہ جو حقیقت بیان کرتا ہے۔ یعنی اپنے حال کے مطابق بات کرتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ علم اور معرفت دونوں عزیز اور محبوب چیزیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم بے عمل علم ہی نہیں ہوتا اور معرفت بغیر حقیقت کوئی چیز نہیں ہے۔اور یہ بات ان کے زمانے سے مخصوص نہیں بلکہ آج بھی صحیح ہے۔ جو شخص عالم اور عارف کی تلاش کرتا ہے پریشان ہوتا ہے۔ اسے چاہئے کہ اپنے آپ کو تلاش کرے تاکہ سارے جہاں کو عالم پائے۔ اور اپنے آپ سے خداوند تعالیٰ کی طرف رجوع کرے تاکہ سارے جہان کو عارف پائے۔ کیونکہ عالم و عارف بہت عزیز (نایاب) ہے اور ہر عزیز چیز مشکل سے ملتی ہے اور جس چیز کا ملنا مشکل ہو اس کا طلب کرنا بے سود ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ علم اور معرفت اپنے اندر تلاش کرے اور حقیقت بھی اپنے اندر تلاش کرنی چاہئے۔

شرح اس عبارت کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کامل یا ہادی و رہبر کی تلاش نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ علم و معرفت جو ہر شخص کے اندر موجود ہے اسے تلاش کرنا بہتر ہے۔ دوسروں کی دولت کے پیچھے بھاگنے سے اپنی دولت کا کھوج لگانا زیادہ بہتر ہے۔ یہ فرما کہ حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے ہمارے زمانے کی بھی ترجمانی فرمائی ہے۔ آج بھی لوگ مرد کامل یا ولی اللہ کی اس لئے تلاش میں رہتے ہیں کہ ان سے کوئی تسخیر کا وظیفہ طلب کریں تاکہ مال و دولت میں اضافہ ہو۔ بعض لوگ اولیاء کرام کی صحبت سے برکت حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ کی نصیحت یہ ہے کہ ان مقاصد کے لئے مرد کامل کو تلاش کرنے سے تو بہتر یہ ہے کہ اپنے اندر کی دولت کا کھوج لگائے کیونکہ یہ دولت حق تعالیٰ نے کم و بیش ہر انسان کے اندر رکھ دی ہے اور اس کا کھوج لگانا

ہر شخص کا فرض ہے اور یہی دین اور مذہب کی غرض ہے۔

ترجمہ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ **من علم الاشیاء باللّٰہ فوجوعہ فی کل شئی الی اللّٰہ** "جس نے اللہ کی بدولت اشیاء کا علم حاصل کیا وہ ہر چیز میں خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔" یعنی جو شخص اللہ کے ذریعے چیزوں کی پہچان کرتا ہے وہ ہر چیز میں خدا کو پاتا ہے نہ کہ چیز کو۔ اس کی وجہ یہ ہے مِلک اور مُلک کا وجود مالک سے قائم ہوتا ہے اس لئے فرحت مالک سے ہوتی ہے۔ نہ کہ مُلک سے۔ خالق سے نہ کہ مخلوق سے۔ اگر اشیاء عالم کو مقصود بالذات سمجھے گا تو دکھ اٹھائے گا کیونکہ غیراللہ کو مقصود بنانا شرک ہے لیکن اگر اشیاء کو مسبب یعنی حق تعالیٰ تک رسائی کا ذریعہ بنائے گا تو چونکہ سبب خودبخود قائم نہیں ہوتا بلکہ مسبب الاسباب (خالق) سے قائم ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کرلے گا اور رنج سے نجات پائے گا۔

حضرت ابو عثمان سعید بن اسمٰعیل حیری رحمتہ اللہ علیہ

مقدم سلف (اولیاء متقدمین کے سردار) و از سلفِ خود خلف (اور اصحاب سلف کے جانشین) حضرت ابو عثمان سعید بن اسمٰعیل الحیری رحمتہ اللہ علیہ کا شمار صوفیاء متقدمین میں ہوتا ہے آپ اپنے زمانہ کے بے نظیر بزرگ اور مقبولِ خلائق تھے۔ پہلے پہل آپ نے حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ سے فیضِ صحبت حاصل کیا۔ اس کے بعد ایک مدت تک آپ حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے اور آپ کے ہمراہ نیشاپور جاکر حضرت شیخ ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور مدت تک ان کی صحبت میں رہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں بچپن سے حقیقت طلبی کا شوق تھا اور

اہل ظاہر سے مجھے نفرت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ شریعت کی ظاہری صورت کے علاوہ ضرور کوئی باطنی اسرار و رموز بھی ہیں۔ جب سن بلوغ کو پہنچا تو ایک دن حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اسی روز مجھے شریعت کا باطنی راز معلوم ہو گیا اور مقصود حاصل ہوا۔ عرصہ تک ان کی صحبت میں رہ کر فیض حاصل کیا یہاں تک کہ ایک دفعہ حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں سے چند لوگ آئے اور ان کے حالات بیان کئے۔ میرے دل میں ان کی ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی اور میں نے شہر رَے سے کرمان کا سفر اختیار کیا۔ جب ان کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے پسند نہ کیا اور فرمایا کہ تمہاری طبیعت رجا پروردہ ہے۔تم نے حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت پائی ہے جن کا مقام رجا ہے (پر امید رہنا)۔اور جو شخص رجا کو اپنا شعار بناتا ہے وہ تصوف میں ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ رجا سے کاہلی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب میں نے بہت منت و سماجت کی اور بیس دن تک ان کی دربار میں التماس کرتا رہا تو آخر مجھے اپنی خدمت میں رہنے کی اجازت دے دی اور میں مدت تک ان کے یہاں رہا۔ آپ بڑے غیور مرد تھے۔جب آپ حضرت ابو حفصؒ کی زیارت کیلئے نیشاپور تشریف لے گئے تو میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ جس روز ہم ان کے پاس پہنچے تو شاہ شجاع کرمانیؒ نے قبا (شاہی لباس) زیب تن کر رکھی تھی۔ جب حضرت ابو حفصؒ نے ان کو دیکھا تو کھڑے ہو گئے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور فرمایا **وجدت فی القباء ما طلبت فی العباء** "جسے میں عبا یعنی جبہ درویشی میں طلب کرتا تھا اسے قباء یعنی (لباس شاہی) میں پایا"۔غرضیکہ ہم کافی عرصہ وہاں رہے اور میرے دل میں حضرت ابو حفصؒ کی محبت نے گھر کر لیا اور شاہ شجاعؒ کی شان و شوکت دل سے نکلنے لگی۔ میرے دل کی بات کا علم حضرت ابو حفصؒ کو بھی ہو گیا۔ میں خدا سے دعا کرتا تھا کہ الٰہی مجھے حضرت ابو حفصؒ کی صحبت میں باریابی عطا فرما اور شاہ شجاعؒ

بھی ناراض نہ ہوں۔ جب شاہ شجاعؒ نے واپسی کا قصد کیا تو میں نے بھی ادباً سفر کی تیاری کی اور کپڑے تیار کئے لیکن میرا دل حضرت ابو حفصؒ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو حفصؒ نے شاہ شجاعؒ سے ہنستے ہوئے فرمایا کہ اس لڑکے کو یہاں چھوڑ دیجئے کیونکہ یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔شاہ شجاعؒ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ لو حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے تم کو قبول کر لیا۔اسکے بعد وہ سفر پر روانہ ہو گئے اور میں وہاں رہ گیا اور آپ کی صحبت میں دیکھا جو کچھ دیکھا۔ ان کا مقام شفقت تھا۔

خداوند تعالیٰ نے حضرت ابو عثمان رحمتہ اللہ علیہ کو تین مشائخ کی صحبت میں تین مقامات سے گزارا اور یہ تین مقامات جن کا انہوں نے ذکر کیا خود ان کے اندر موجود تھے یعنی حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ کا مقام رجا' حضرت شیخ شجاع رحمتہ اللہ علیہ کا مقام غیرت اور حضرت ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ کا مقام شفقت۔ اور دستور چلا آرہا ہے کہ مرید پانچ' چھ یا اس سے بھی زیادہ مقام مشائخ کی صحبت میں حاصل کر کے منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ اور ہر شیخ کی صحبت سے ایک مقام اس پر کھلتا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ مشائخ کو اپنے مقام سے آلودہ نہ کرے۔

شرح یعنی جب ان کا مقام بیان کرے تو اپنا نکتہ نگاہ اور اپنی پہنچ کے مطابق بیان نہ کرے کیونکہ کہاں اس کی اپنی پہنچ اور کہاں مشائخ کی۔

ترجمہ اور ان کے بلند مقام کو اپنی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ یہ کہے کہ میرا حصہ ان کی صحبت سے یہی کچھ تھا لیکن ان کا مقام قیاس سے بلند تر ہے اور مجھے ان کی صحبت سے یہی کچھ حاصل ہوا ہے۔ یہ بات ادب سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کاملین راہ حقیقت کو حال و مقام سے سروکار

نہیں ہوتا۔

شرح "حال" و "مقام" کے درمیان یہ فرق ہے کہ حال عارضی کیفیت کا نام ہے جو آتی جاتی رہتی ہے اسے تلوین کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ تلوین لون سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے رنگ۔ تلوین سے مراد ہے حالت و کیفیت کا بدلتے رہنا۔ یہ چیز مقامِ فنا فی اللہ کا خاصہ ہے۔ اس کے مقابلے میں مقام ہے۔ جب حال جم کر پختہ ہو جاتا ہے اور دائمی ہو جاتا ہے تو اسے مقام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسے تمکین بھی کہا جاتا ہے اور یہ چیز بقا باللہ کا خاصہ ہے۔ اصحابِ فنا فی اللہ اکثر تلوین اور حال میں رہتے ہیں اور اصحاب بقا باللہ مقام تلوین پر متمکن ہو کر پہاڑ کی طرح جم جاتے ہیں اور کیفیات سے مست نہیں ہوتے۔ اہل تلوین کو ابن الوقت اور اصحابِ تلوین کو ابو الوقت یا ابن الحال اور ابو الحال کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جہاں مقام تلوین کا خاصہ محویت و سکر اور استغراق ہے۔ مقام تلوین میں ہوشیاری صحو اور حال پر قابو ہوتا ہے۔اب رہی یہ بات کہ کاملین کا حال و مقام سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اس کا مطلب یہ ہے کہ حال و مقام میں تمیز کرنا بھی شروع کی بات ہے۔ جب سالک ابتداء کی حالت میں ہوتا ہے تو اس پر حال یا بالفاظ دیگر تلوین کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس مقام سے گزر جاتا ہے تو اس کا حال مقام بن جاتا ہے اور دائمی طور پر اس حالت میں رہنے لگتا ہے لیکن اس حالت پر دوام کے بعد وہ حال و مقام دونوں سے بے خبر ہوتا ہے یعنی اس کو مقام بقاباللہ میں اس قدر پختگی حاصل ہوتی ہے کہ حال و مقام دونوں کو بھول جاتا ہے اور عبدیت یا عبودیت اس کا شیوہ بن جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ فنا و بقا سے محروم نہیں ہوتا بلکہ فنا و بقا کا جامع ہوتا ہے۔ اس مقام کو جامعیت کے نام سے موسوم کیاجاتا ہے جس پر وہ بیک وقت فنا فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ اس کے قلب میں آتشِ عشق کا طوفان اس قدر موجزن ہوتا ہے کہ

اس کو قرب و وصالِ حق کی کسی منزل پر قرار نہیں آتا بلکہ ہر وقت بلند سے بلند منازلِ قرب کی جستجو میں رہتا ہے اور شراب وصل کے پیالے نہیں، صراحی نہیں، خم نہیں، ندی نالے نہیں، بلکہ دریا اور سمندر نوش کر جاتا ہے اور پھر بھی ھل من مزید کے نعرے لگائے جاتا ہے۔ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے اس مقام کو یوں بیان فرمایا ہے ۔

عجبے نیست کہ سرگشتہ بود طالب دوست
عجب انیست کہ من واصل و مہجورم

نیز فرمایا ۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

مرزا بیدل نے اس مقام کو کس خوبی سے بیان کیا ہے ۔

ہمہ عمر باتو قدح زدیم و نرفت رنج خمارِ ما
چہ قیامتے کہ نمے رسی زکنارِ ما بکنارِ ما

مولانا رومؒ نے اس مقام کو یوں بیان فرمایا ۔

دل آرام در بر دل آرام جوے
ہمچو مستسقی تشنہ برآب جوے

ترجمہ خراسان اور نیشاپور میں تصوف کا ظہور حضرت ابو عثمان رحمتہ اللہ علیہ سے ہوا۔ آپ کو حضرت جنیدؒ حضرت رویمؒ، یوسف بن حسینؒ اور حضرت محمد بن فضل بلخیؒ کی صحبت بھی ملی ہے۔ آپ سے زیادہ کسی بزرگ نے اس قدر زیادہ اولیاء کرام سے فیضِ صحبت حاصل نہیں کیا۔ اہل نیشاپور نے آپ کو منبر پر چڑھ کر مسائل تصوف بیان کرنے پر مجبور کیا۔ وعظ و نصیحت کے علاوہ آپ کی تصوف پر

تصانیف بھی بہت ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ **حق لمن اعزہ اللّٰہ بالمعرفۃ ان لا یذ لہ بالمعصیۃ** ”جس کسی کو حق تعالیٰ نے اپنی معرفت کا شرف بخشا ہے اس کے لئے واجب ہے کہ اپنے آپ کو معصیت یعنی گناہوں میں ذلیل نہ کرے“ اور یہ بندہ کے اپنے بس کی بات ہے۔

شرح جیسا کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان نیکی اللہ کے حکم سے کرتا ہے اور بدی اپنی مرضی سے۔ کیونکہ نیکی کا خالق اللہ ہے اور بدی کا خالق انسان کا نفس ہے۔

ترجمہ یاد رکھو کہ حق تعالیٰ جس کو اپنی معرفت سے نوازتا ہے اسے گناہوں سے کبھی ذلیل نہیں کرتا۔ عطائے معرفت فعلِ حق ہے اور معصیت فعلِ بندہ اور جس کو معرفتِ حق عطا ہوئی ہے اس کی کیا مجال کہ معصیت سے ذلیل و خوار ہو۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ نے اپنی معرفت عطا فرمائی تو کبھی ذلیل نہ فرمایا۔

شرح اگرچہ حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہو گئی لیکن حق تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا اور ذلیل نہ فرمایا۔ یعنی مرتبۂ نبوت پر بحال رکھا اور معزول نہ کیا۔

حضرت احمد بن یحییٰ رحمتہ اللہ علیہ

سہیلِ بر اُوجِ معرفت (معرفت کے آسمان کا ستارہ) و قطبِ محبت حضرت ابو عبداللہ احمد بن یحییٰ بن جلالی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار اکابر مشائخ اور ساداتِ طائفہ صوفیاء میں ہوتا ہے آپ کا مسلک نیک اور طریق محبوب تھا۔ آپ نے حضرت

جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ابو الحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر اکابرین کی صحبت پائی تھی۔ حقائق تصوف میں آپ کے اقوال بہت بلند اور اشارات بہت لطیف ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ **همته العارف الی مولاه ولم یعطف علی شئی سواه** (عارف کی ہمت حق تعالیٰ پر جمی رہتی ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز کی طرف منعطف نہیں ہوتی اور کبھی نیچے نہیں آتی۔) اس کی وجہ یہ ہے کہ عارف کو سوائے معرفتِ حق کے اور کسی چیز سے سروکار نہیں ہوتا۔ اس کے دل کا سرمایہ معرفت اور اس کی ہمت کا مقصود رویت (دیدار حق) ہوتا ہے۔ جب ہمت پراگندہ ہو جائے تو نتیجہ محرومی ہے۔ اور محرومی کی وجہ سے بارہ گاہ رب العزت سے باز رہتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ ایک دن میں نے ایک نہایت ہی خوبصورت عیسائی بچہ دیکھا اور اسکے سامنے محو حیرت ہو کر ٹھہر گیا حتیٰ کہ جنید بغدادیؒ کا وہاں سے گذر ہوا۔ میں نے ان سے کہا اے استاد کیا حق تعالیٰ اس حسین چہرے کو دوزخ کی آگ میں جلائے گا۔ انہوں نے فرمایا بیٹے یہ نفس کا چھوٹا سا بازار ہے تو اس پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ اگر نظر حقیقت سے دیکھے تو کائنات کے ہر ذرہ میں یہی حسن موجود ہے۔ لیکن تو جلد ہی اس بے ادبی کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ جونہی جنیدؒ روانہ ہوئے مجھے قرآن بھول گیا اور کئی سال تک میں حق تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتا رہا اور اس کی استعانت طلب کرتا رہا حتیٰ کہ قرآن پھر سے یاد ہو گیا۔ اب میرے اندر ہمت نہیں ہوتی کہ کسی چیز کی طرف التفات کروں۔ اور اشیاء عالم پر نظر کرکے اپنا وقت ضائع کروں۔

شرح نظارہ حسن کرنے سے کیوں سزا ملی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت میں اسکی ممانعت آئی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک حسین چہرہ پر نظر ڈالنا شرع شریف میں کیوں منع ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حکم امتناعی میں کئی حکمتیں ہیں۔ ظاہری حکمت تو یہ ہے کہ نظربازی سے معاشرہ میں فساد برپا

ہوتا ہے اور ناجائز تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ باطنی وجہ یہ ہے کہ شریعت کا مقصد اصلاحِ نفس اور تہذیبِ نفس ہے اور اصلاحِ نفس اس لئے کی جاتی ہے کہ نفسانی خواہشات کا قلع قمع ہو۔ اور روحانی طاقت میں اضافہ ہو تاکہ قربِ الٰہی حاصل ہو۔ جب کسی حسین چہرے پر نظر پڑتی ہے تو اس کے اندر اس قدر جاذبیت ہے کہ دل اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کی طرف سے دل اسی قدر ہٹ جاتا ہے۔ اور دل کا حق تعالیٰ سے ہٹنا بہت بڑی محرومی ہے۔ جس طرح دنیا کی طرف ہر وقت متوجہ رہنے سے لالچ میں اضافہ اور حق تعالیٰ سے بُعد پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر مرغوب چیز میں یہی اثر موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

نیز عارفین کا کہنا ہے کہ جب سالک کسی حسین چہرے پر نظر کرتا ہے تو سالک کی روحانی دولت اس حسین کی طرف منتقل ہونے لگتی ہے۔ لیکن وہ نااہلی کی وجہ سے اسے قبول نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ دولت ضائع ہو جاتی ہے۔ نیز تعین کی طرف جس قدر توجہ ہو گی لاتعین سے اسی قدر حجاب وارد ہو گا۔ (شرح ختم)

حضرت خواجہ محمد رویم رحمتہ اللہ علیہ

وحیدِ عصر (یگانہ روزگار) و امامِ دہر (امامِ وقت) حضرت خواجہ محمد رویم بن احمدؒ کا شمار اکابرین مشائخ و ساداتِ صوفیاء میں ہوتا ہے۔ آپ حضرت خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ کے دوست اور محرم راز تھے۔ آپ حضرت خواجہ داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ کے مسلک پر تھے اور اپنے زمانے میں فقیہ الفقہا کا درجہ رکھتے تھے۔ علم تفسیر اور تجوید میں بھی آپ ماہر فن تھے۔ آپ اپنے زمانے میں علوم و فنون میں بے نظیر اور بلندئ حال میں بے مثال تھے۔ سیر و سیاحت اور زہد و عبادت کی کثرت سے آپ مقام تجرید و تفرید پر پہنچ گئے۔

شرح تجرید سے مراد خلق سے قطع تعلق اور فراغت ہے اور تفرید سے مراد

اپنے آپ سے فارغ ہونا ہے اور یہ مقام فنا فی اللہ کی غایت ہے۔ تفرید یعنی ذات حق کے ساتھ فرد ہو جانا بلند ترین مقام سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت سالک جو کچھ کرتا ہے قوت حق سے اور ارادہ حق سے کرتا ہے مقام تفرید کو کسی نے یوں بیان کیا ہے۔ ۔

تفرد باللہ فرید فرید
فظل وحید و المشوق وحید

(مقام تفرید پر پہنچ کر سالک فرد بن جاتا ہے اور محب و محبوب دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔)

یہ شعر حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے روضہ مبارک پر لکھا ہوا ہے اور شرح تعرف میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

ترجمہ آخر عمر میں آپ نے اپنے آپ کو دنیا داری اختیار کر کے چھپانے کی کوشش کی اور عہدۂ قضا قبول کر لیا لیکن آپ کا مقام اس قدر بلند تھا کہ وہاں بھی نہ چھپ سکے۔ اس وجہ سے خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ **"ما فارغان مشغولیم و رویمؒ مشغول فارغ است"** (ہم ترک دنیا ہونے کے باوجود دنیا میں غرق ہیں اور رویم رحمتہ اللہ علیہ دنیا میں مشغول رہ کر تارک دنیا ہے)۔

شرح دنیا میں مشغول رہ کر دنیا کا نہ بننا بڑا مقام ہے۔ یہ مقام رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اور صحابہ کرام کا خاصہ ہے اور اسلام کی غرض و غایت ہے کہ دنیا کو ترک نہ کیا جائے بلکہ دنیا میں رہ کر دنیا سے ملوث نہ ہو۔ حضرات نقشبندیہ اسے خلوت در انجمن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جو شخص پہاڑوں اور جنگلوں میں رہ کر یہ دعوہ کرے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا' نہ کسی کو نظر بد سے دیکھا' نہ کسی کو گالی دی ہے' نہ کسی کی غیبت کی ہے تو یہ کوئی کمال نہیں

ہے۔ کیونکہ وہاں کس کو نظرِ بد سے دیکھے گا اور کس کی غیبت کس کے سامنے کرے گا۔ کمال یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان رہ کر ان گناہوں سے بچتا رہے۔ گھوڑے کا کمال اصطبل میں نہیں جولانگاہ میں پرکھا جاتا ہے۔

ترجمہ طریقت میں آپ کی تصانیف بہت ہیں۔ خاص طور پر آپ کی کتاب **غلط الواجدین** جو سماع کے مضمون پر ہے جو مجھے بے حد پسند ہے۔

روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں آکر کہا کہ **کیف حالک** (آپ کا کیا حال ہے) آپ نے جواب دیا کہ **کیف حال من دینہ ہواہ و ہمتہ دنیاہ لیس ہو بصالح تقی ولا بعارف نقی** اس شخص کا کیا حال ہو سکتا ہے۔ جس کا دین حرص و ہوا ہو اور جس کی ہمت دنیا ہو، جو نہ نیک مرد صالح ہے نہ متقی عارف ہے۔) یعنی نہ دنیا ترک کرکے نیکی اختیار کر سکتا ہے اور نہ عارف نجی ہو سکتا ہے۔

شرح تقی سے مراد تارک دنیا اور نقی سے مراد واصل باللہ ہے اور یہ اشارات آپ نے انسانی نفس کے عیوب کی طرف کئے ہیں۔ کیونکہ نفس پرست لوگوں کے نزدیک دین حرص و ہوا کا نام ہے اور دین کے جھوٹے دعویداروں نے متابعتِ نفس کا نام دین رکھ لیا ہے اور نفسانی خواہشات کے اتباع کو انہوں اتباعِ شریعت کا نام دے رکھا ہے۔ جو شخص ان کے مسلک کے مطابق عمل کرتا ہے۔ وہ دیندار ہے خواہ وہ بدعتی کیوں نہ ہو۔ اور جو شخص ان کے مسلک کے خلاف چلتا ہے وہ ان کے نزدیک بے دین کہلاتا ہے خواہ وہ متقی کیوں نہ ہو۔ اور یہ فتنہ ہمارے زمانے میں بہت زیادہ ہے۔ خدا ہم سب کو ایسے لوگوں کی صحبت سے بچائے۔ نیز ممکن ہے کہ آپ نے اس سائل کے اپنے حال کے مطابق یہ کلمات کہے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے انہوں نے ان خصائل کو اپنے ساتھ منسوب کرکے

اس کی ہدایت کی کوشش کی ہو۔ واللہ اعلم۔ (شرح ختم)

حضرت یوسف بن حسین رازی رحمتہ اللہ علیہ

بدیع عصر (یگانۂ روزگار) اور رفیع قدر (بلند مرتبت) حضرت ابو یعقوب یوسف بن حسین رازی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار وقت کے اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ کی عمر طویل تھی اور آپ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ آپ نے اکثر مشائخ عظام سے فیض حاصل کیا۔ اور ان کی خدمت انجام دی ہے ۔آپ فرماتے ہیں کہ **اذل الناس الفقیر الطماع و اعزھم المحب لمحبوبہ الصدیق** (ذلیل ترین وہ فقیر ہے جو طماع یعنی لالچی ہے اور معزز ترین وہ عاشق ہے جس نے محبوبِ حقیقی کے لئے اپنی محبت مخصوص کر دی ہے)۔

طمع ایسی بلا ہے جو درویش کو دونوں جہانوں میں ذلیل کرتی ہے۔ ویسے بھی درویش دنیا میں بدنام ہیں لیکن طمع کی وجہ سے مزید بدنام ہوتے ہیں۔ لہٰذا عزت دارِ غنی' ذلیل فقیر سے بہتر ہے۔ اور طمع درویش کو خلاف شرع کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ اور طماع یعنی دنیا سے محبت کرنے والا دنیا کا غلام ہوتا ہے کیونکہ جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے۔ اس کا حقیر غلام بن جاتا ہے۔ اور اس کی پرستش کرتا ہے۔ یہ سب طمع کی وجہ سے ہے۔ جب طمع دل سے نکل جاتا ہے تو انسان معزز بن جاتا ہے۔ جیسا کہ بی بی زلیخا جب تک حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت کی طمع میں مبتلا رہی ذلیل رہی۔ جب طمع ترک کیا تو خداوند عالم نے اسے جمال اور جوانی واپس دے دی۔ اور یہ دستور جہان ہے کہ عاشق جس قدر محبوب کے پیچھے دوڑتا ہے محبوب اسی قدر بے پرواہی کرتا ہی اور جب عاشق اس کا پیچھا چھوڑ دیتا ہے تو محبوب عاشق کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر وصل کا طمع نہ ہو تو عاشق کی عزت ہوتی ہے۔ لیکن جب عاشق وصال کا طمع کرتا ہے تو اس کی عزت'

ذلت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا حقیقی محبت یہ ہے کہ عاشق وصال اور فراق سے بالاتر ہو کر محبت کرے۔

شرح حضرت مصنف شاید یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لذتِ وصل کی خاطر دوست سے محبت کرنا بھی نفسانیت میں شامل ہے اور للّٰہیت سے بعید ہے۔ کیونکہ عرفاء نے حجابات کی تین اقسام بیان کی ہیں اول حجابات ظلمانی جو معصیت یا گناہوں کی وجہ سے بندہ اور حق کے مابین حائل ہو جاتے ہیں۔ دوم حجابات نورانی جو کشف و کرامات کی وجہ سے حائل ہو جاتے ہیں۔ سوم حجابات کیفی جو لذتِ قرب کی وجہ محب اور محبوب کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ قربِ حق میں بے حد لذت ہے اس لئے جو سالک لذت کی خاطر حق تعالیٰ کا قرب تلاش کرتا ہے وہ بھی نادانستہ طور پر نفس پرست ہوتا ہے اور دراصل اپنے نفس کا طواف کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن جب لذت کی خاطر نہیں بلکہ محبوب کی خاطر اس کی طرف جدوجہد کی جاتی ہے تو یہ محبت خالص ہو جاتی ہے۔ اس لئے اولیاء کرام بہشت اور اس کی لذات کو بھی نظرانداز کر کے محض حق تعالیٰ کی خاطر عبادت کو شعار بناتے ہیں۔ جب حضرت ابن فارض رحمتہ اللہ علیہ کا وصال قریب آیا تو آپ کو حق تعالیٰ کی طرف سے سات بہشت دکھائے گئے کہ یہ تیرا مقام ہے لیکن آپ نے منہ پھیر لیا اور یہ شعر پڑھا ۔

ان کان منزلتی فی الحب عند کم

ماقد رایت فضعیت ، ایامی

(اگر میری محبت کی یہی قدر و منزلت ہے جو میرے سامنے ہے یعنی ہفت بہشت تو افسوس ہے کہ میں نے ساری عمر برباد کی) اس کے بعد آپ پر تجلیٔ ذاتی ہوئی اور اسی میں آپ کا وصال ہو گیا۔ یہ ہے خالص اخلص محبت جس میں نہ جنت کو دخل ہے۔ نہ دوزخ کو۔ نہ نفس کو نہ لذت کو۔ (شرح ختم)

حضرت سمنون بن عبداللہ خواص رحمتہ اللہ علیہ

آفتابِ اہل محبت، قدوۂ اہل مودت حضرت ابوالحسن سمنون بن عبداللہ خواص رحمتہ اللہ علیہ اپنے زمانے میں بے نظیر تھے اور محبت میں آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ اور تمام مشائخِ عصر آپ کی عزت کرتے تھے اور آپ کو سمنون المحب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ لیکن آپ اپنے آپ کو از راہ کسر نفی سمنون الکذاب کہتے تھے۔ (یعنی جھوٹا) آپ کو ایک شخص غلام خلیل کی طرف سے بہت تکلیف پہنچی۔ غلام خلیل نے آپ کے خلاف بادشاہ کی سامنے غلط شہادتیں دیں جس کی وجہ سے تمام مشائخ کو سخت افسوس ہوا۔ یہ غلام خلیل ایک ریاکار آدمی تھا جو پارسائی اور درویشی کا دعویدار تھا اور سلاطین و امراء کے ہاں شہرت حاصل کرلی تھی۔ اس نے دین کو دنیا کے عوض فروخت کر دیا تھا۔ جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔ اس کا دستور یہ تھا کہ مشائخ اور درویشوں کا بادشاہوں اور امیروں کی دربار میں شکوہ کرکے ان کو بدنام کرتا تھا۔ تاکہ ان سے بدظن ہو کر سب لوگ اس کی عزت کریں۔ دراصل شیخ سمنون اور دیگر مشائخ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ غلام خلیل جیسا صرف ایک آدمی ان کے خلاف تھا۔ حالانکہ آج کل تو ہر حق پرست کے لئے ہزاروں غلام خلیل پیدا ہو گئے ہیں۔ لیکن مشائخ عظام اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ کیونکہ مردار گدھوں کی غذا ہے۔ جب حضرت سمنون رحمتہ اللہ علیہ کی بغداد میں شہرت ہوئی اور ہر شخص ان کے پاس آنے جانے لگا تو غلام خلیل کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اس نے ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ چنانچہ اس نے ایک عورت کو حضرت شیخ سمنون رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بھیجا جب عورت نے آپ کو دیکھا تو شادی کے لئے آمادہ ہو گئی لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے پاس گئی۔ اور عرض کیا

کہ سمنون کو کہیں کہ میرے ساتھ شادی کر لیں۔ اس سے حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کو غصہ لگا اور عورت کو تنبیہہ کی کہ یہ کام مت کرو۔ اس کے بعد وہ عورت غلام خلیل کے پاس گئی اور شیخ سمنون کے خلاف تہمت لگائی۔ غلام خلیل تو ایسی باتوں کی تلاش میں تھا۔ اس نے فوراً بادشاہ کے پاس جا کر شکایت کی اور بادشاہ نے حکم دے دیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن جب جلاد کو لایا گیا اور اس نے بادشاہ سے قتل کا حکم صادر کرنے کی درخواست کی تو بادشاہ کی زبان بند ہو گئی اور کچھ نہ کہہ سکا۔ اس رات اس کو خواب میں دکھایا گیا کہ تمہاری بادشاہی کا زوال شیخ سمنون کے ساتھ وابستہ ہے۔ دوسرے روز بادشاہ نے آپ سے معافی مانگی اور اچھی طرح رخصت کیا۔

محبت کی حقیقت پر آپ کے اقوال بہت بلند اور اشارات بہت لطیف ہیں۔ آپ کا مقام یہ ہے کہ ایک دفعہ جب حجاز سے واپس آئے تو لوگوں نے وعظ کی درخواست۔ جب آپ نے منبر پر چڑھ کر وعظ شروع کیا تو لوگ اٹھ کر چلے گئے یہ دیکھ کر آپ نے قندیلوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ جونہی آپ کے منہ سے یہ بات نکلی قندیلیں آپس میں ٹکرا کر گر پڑیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ جب ایک ادق (مشکل) چیز کو بیان کیا جاتا ہے تو اس سے بھی زیادہ مشکل الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں اور چونکہ محبت سب چیزوں سے زیادہ مشکل ہے معلوم نہیں اسے کن الفاظ میں بیان کیا جائے۔ اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ محبت الفاظ میں نہیں آسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے الفاظ متکلم کی صفت ہیں (فانی ہیں) اور محبت حق تعالیٰ کی صفت ہے (جو باقی ہے) پس محبت الفاظ سے کیسے بیان ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ

شاہِ شیوخ و تغیّر از روزگارش منسوخ (جس کی حالت میں تغیر نہ آئے)

حضرت ابو الفوارس شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ شہزادہ تھے اور اپنے عصر میں بے نظیر تھے۔ آپ حضرت ابو تراب نخشبی کے صحبت یافتہ تھے اور کافی مشائخ کی صحبت کا شرف آپ کو حاصل تھا۔ حضرت ابوعثمان حیری رحمتہ اللہ علیہ کے باب میں آپ کا کچھ ذکر ہو چکا ہے۔ آپ کے مصنفہ رسالہ جاتِ تصوف مشہور ہیں۔ آپ نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام مراۃ الحکماء ہے۔ آپ کے اقوال بہت بلند ہیں۔ آپ فرماتے ہیں جس کو کوئی کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ اپنے کمال کو کمال نہیں سمجھتا اور جب کمال سمجھنے لگتا ہے تو کمال ختم ہو جاتا ہے اسی طرح اہلِ ولایت اپنی ولایت کو ولایت نہیں سمجھتے اور جب وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ولی ہیں تو ولایت نہیں رہتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی کے اندر حقیقی معنوں میں کمال اور ولایت ہے تو وہ اسے کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ لیکن جب وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگتے ہیں تو خالی ہو جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر جو شخص اپنے کمال یا اپنی ولایت پر ناز کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ صاحبِ کمال نہیں ہے یعنی جو شخص اپنے آپ کے متعلق یہ سمجھے کہ میں صاحبِ کمال ہوں یا ولی ہوں تو نہ وہ صاحب کمال ہوتا ہے نہ ولی۔

آپ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ چالیس سال تک نہ سوئے۔ ایک دفعہ جب نیند آگئی تو خواب میں حق تعالیٰ کی زیارت ہوئی۔ عرض کیا کہ بار خدایا میں تجھے بیداری میں طلب کرتا تھا۔ لیکن خواب میں تجھے پایا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے شاہ شجاع تم نے ان ہی بیداریوں کی بدولت مجھے خواب میں پایا ہے اگر تم بیدار نہ رہتے تو مجھے نہ پاتے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ

سرورِ دلہا' ونورِ سرہا' حضرت عمرو بن عثمان المکی رحمتہ اللہ علیہ اکابرین و سادات صوفیاء میں سے تھے۔ آپ نے حقائق تصوف پر بہت کتابیں لکھی ہیں۔ آپ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے اور حضرت ابوسعید خراز رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت شیخ نباجی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت پائی۔ آپ اصولِ طریقت میں امامِ وقت تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ **لا یقع علی کیفیتہ الوجد عبارۃ لانہ سر اللہ عند المومنین** (کیفیتِ وجد کو کوئی عبارت بیان نہیں کر سکتی کیونکہ یہ بندۂ مؤمن کے نزدیک سرِّ الٰہی ہے) اور جس چیز کو الفاظ یا عبارت بیان کر سکیں وہ سرِّ الٰہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسرارِ ربانی کا بیان کرنا بندہ کی حد امکان سے بالکل باہر ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عمرو بن عثمان اصفہان تشریف لے گئے تو ایک نوجوان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا حالانکہ اس کا باپ اسے منع کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ بیمار ہو گیا اور مدت تک اسی حالت میں رہا۔ یہ دیکھ کر حضرت شیخ اپنی جماعت کے ساتھ اس کی طبع پرسی کے لئے اس کے مکان پر تشریف لے گئے۔ لڑکے نے آپ سے درخواست کی کہ قوال کو حکم دیں کہ کوئی شعر سنائے۔ آپ کے اشارہ پر قوال نے ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ ہے : "جب میں بیمار ہوا تو کوئی بھی آپ کی طرف سے میری عیادت کو نہ آیا حالانکہ آپ کا غلام بھی بیمار ہو تو میں اس کی عیادت کو جاتا ہوں" یہ شعر سن کر اس کی بیماری میں افاقہ ہوا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور مزید قوالی کی درخواست کی۔ قوال نے یہ شعر پڑھا : "اے دوست تمہارا میرے پاس نہ آنا میری بیماری سے زیادہ میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ اپنے غلام کو بھی کوئی اس طرح تکلیف دیتا ہے" یہ سن کر لڑکا اٹھ بیٹھا

اور بالکل تندرست ہو گیا۔ اس پر اس کے والد نے اسے حضرت شیخ کی صحبت میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اور بدگمانی سے توبہ کی۔ حضرت شیخ کی صحبت میں رہ کر وہ نوجوان بڑا بزرگ ہوا۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ

مالک القلوب (دلوں کا مالک) اور ماحی العیوب (عیبوں سے پاک کرنے والا) حضرت ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ اپنے زمانے کے امام طریقت اور ہر دلعزیز تھے۔ آپ بڑے عبادت گذار اور مجاہد تھے۔ آپ کے حالات نیک تھے۔ اور اخلاص اور نفس کے نقائص بیان کرنے میں آپ کے کلمات بہت پسندیدہ ہیں۔

شریعت و طریقت میں کوئی فرق نہیں

علماء ظاہر کا قول ہے **ھو جمع بین الشریعتہ والطریقتہ** (آپ شریعت و طریقت کے جامع تھے)۔ لیکن ان کا یہ کہنا غلط ہے' کیونکہ شریعت اور طریقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور حقیقت شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ علمائے ظاہر نے یہ بات اس لئے کہی ہے کہ حضرت شیخ کا کلام بالکل واضح ہے اور اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔ جب حق تعالیٰ نے شریعت اور طریقت کو ایک بتایا ہے تو یہ ناممکن ہے کہ اولیاء ان کے درمیان فرق کریں۔ کیونکہ اگر ان کے درمیان فرق کیا جائے تو ایک کا قبول اور دوسرے کا رد لازم آتا ہے۔ اور ردِّ شریعت الحاد (بے دینی) اور ردِّ حقیقت کفر و شرک ہے۔ اور جب شریعت اور حقیقت دو الگ الفاظ کہے جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف ہیں بلکہ بتایا یہ جاتا ہے کہ ایک ہی چیز کے دو حصے ہیں۔ جیسے درخت کا ایک تنا ہوتا ہے اور کئی شاخیں۔ چنانچہ شریعت در اصل حقیقت کی ایک شاخ ہے۔

جیسا کہ کلمہ طیبہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** میں **لا الہ الا اللہ** حقیقت ہے اور **محمد رسول اللہ** شریعت ہے۔ جیسا کہ کلمہ طیبہ میں اقرار توحید حقیقت ہے اور فرمان الٰہی پر عمل کرنا شریعت ہے۔ لیکن ارباب ظاہر کی سمجھ میں جو چیز نہیں آتی اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور اصول دین کا انکار خطرناک ہے۔ وللہ الحمد علی الایمان (خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ایمان کی دولت سے سرفراز فرمایا ہے۔)

شرح شریعت ضابطہ حیات ہے۔ اس ضابطۂ حیات پر عمل کرنا طریقت کہلاتا ہے۔ بالفاظ دیگر شریعت ایک راستہ ہے اور راستے پر چلنے کا نام طریقت ہے اور جس منزل مقصود کی طرف یہ راستہ لے جاتا ہے اسے حقیقت کہتے ہیں اور منزل مقصود پر پہنچ کر جو علم سالک کو حاصل ہوتا ہے اسے معرفت کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت آپس میں کوئی علیحدہ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی سفر کی مختلف منازل کے نام ہیں۔ اور شریعت کے بغیر طریقت بے کار ہے اور طریقت کے بغیر شریعت بے سود ہے۔ کیونکہ جب تک راستے پر چلا نہ جائے راستہ طے نہیں ہوتا۔ اور منزل مقصود تک رسائی نہیں ہوتی۔

دوسرے الفاظ میں شریعت ایک ضابطہ حیات کا نام ہے۔ ضابطہ حیات پر عمل کرنے کا نام طریقت ہے اور اس عمل سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ حقیقت اور معرفت ہے۔ یا یوں کہو کہ شریعت ایک نسخہ ہے۔ نسخہ کے مطابق ادویات منتخب کرنا اور علاج کرنا طریقت ہے اور اس عمل سے یا علاج سے جو توانائی اور صحت حاصل ہوتی ہے وہ حقیقت اور معرفت ہے۔ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں : **من تصوف ولا تفقہ تزندق من تفقہ ولا تصوف تفسق من جمع بینھما تحقق** (جس نے تصوف سیکھا فقہ نہ سیکھا گمراہ ہوا۔ جس نے فقہ سیکھا تصوف نہ سیکھا گناہ میں جلا ہوا جس نے دونوں کو جمع کیا حقیقت کو پہنچا)۔

ترجمہ نیز آپ نے فرمایا ہے کہ : "روئے زمین پر جو لوگ بستے ہیں وہ خداوند تعالیٰ سے جاہل ہیں سوائے ان لوگوں کے جو حق تعالیٰ کو اپنی جان اور روح اور دنیا پر ترجیح دیتے ہیں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔ حق تعالیٰ کی معرفت سے محروم رہتا ہے۔ کیونکہ معرفت ترکِ خواہشات سے اور تسلیم رضا سے حاصل ہوتی ہے اور خواہشات نفس پورا کرنے سے جہل و غفلت لازم آتی ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عبداللہ محمد بن فضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ

اختیارِ اہلِ حَرَمین (اہل حرمین یعنی اصحاب مکہ مدینہ کے مقبول) و جملہ مشائخ را اقرۃ العین (تمام مشائخ کی آنکھوں کی ٹھنڈک) حضرت ابو محمد عبداللہ محمد بن الفضل البلخی کا شمار اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ عراق و خراسان کے پیشوا تھے اور حضرت احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے اور حضرت ابو عثمان حیری کو آپ سے بہت انس تھا۔ جب مذہبی جنون رکھنے والوں نے تصوف کی بنا پر آپ کو بلخ سے نکال دیا تو آپ نے سمرقند جاکر ساری عمر وہاں گذار دی۔

آپ فرماتے ہیں کہ **اعرف الناس باللّٰہ اشد ھم مجاھدۃ فی اوامرہ و اتبعھم بسنتہ نبیہ** (سب سے بڑا عارف وہ ہے جو شریعت کی پابندی میں سب سے بڑا مجاہد ہے اور نبی علیہ السلام کی سنت کا سب سے بڑا متبع ہے)۔ کیونکہ جو شخص حق تعالیٰ سے جتنا قریب تر ہوتا ہے اس کے احکام کی پابندی میں اتنا زیادہ حریص ہوتا ہے۔ اور جو شخص حق تعالیٰ سے جتنا دور ہوتا ہے اتنا احکام خداوندی کی تعمیل میں غافل ہوتا ہے۔

نیز آپ فرماتے ہیں کہ مجھے حیرت ہوتی ہے اس شخص پر جو صحرا جنگل اور سمندر پار کرکے خانہ کعبہ تک رسائی حاصل کرتا ہے جہاں انبیاء علیہم السلام کے

آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن اپنے نفس اور ہوا و ہوس کے صحرا اور جنگل کو طے کرکے اپنے قلب تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ جہاں اس کے آقا و مولا کے آثار موجود ہیں کیونکہ دل محل معرفت الہٰی ہے۔ اور کعبہ سے افضل ہے۔ جو عبادت کی سمت ہے۔ کعبہ وہ ہے جس پر عابد کی نظر ہوتی ے اور دل وہ ہے جہاں حق تعالیٰ کی نظر ہوتی ہے۔ لہٰذا میرے لئے بہترین جگہ وہ ہے جہاں محبوب حقیقی کی نظر ہے (یعنی دل) اور میرے دوستوں کا قبلہ وہ ہے جہاں لوگوں کی نظر ہوتی ہے یعنی خانہ کعبہ۔

شرح مطلب یہ کہ جہاں دوسرے لوگوں کا مقصود خانہ کعبہ ہے میرا مقصود میرا دل ہے جو خانہ خدا ہے۔ سعدیؒ نے خوب کہا ہے ؎

کعبہ بن گاہ خلیل اکبر است
دل گذرگاہ جلیل اکبر است

دل بدست آور کہ حج اکبر است
وز ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

حضرت محمد بن علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ

شیخ باخطر و فانی از صفاتِ بشر (شیخ باوقار اور صفات بشریت سے پاک)

حضرت ابوعبداللہ بن علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ (معروف بہ حکیم ترمذیؒ) جملہ علوم وفنون میں کامل بلکہ امام کا درجہ رکھتے تھے۔ اور اپنے زمانے کے شیخ المشائخ تھے۔ آپ صاحب تصنیف ہیں اور آپ کی کتابیں حقائق و معارف سے لبریز ہیں۔ ختم الولایت، کتاب النہج و نوادر الاصول اور دیگر کتب جو بہت قابل قدر ہیں اور میں آپ کا گرویدہ ہوں۔ میرے شیخ علیہ رحمہ فرماتے ہیں کہ حکیم محمد ترمذی رحمتہ

اللہ علیہ وہ در یتیم ہیں کہ جن کی مثال نہیں۔ علوم ظاہری میں بھی آپ کی بہت کتابیں ہیں۔ علم حدیث میں آپ صاحبِ اسناد ہیں۔ آپ نے ایک تفسیر شروع کی تھی لیکن عمر نے وفا نہ کی اور وہ نامکمل رہ گئی۔ اور جس قدر ہے' اہل علم میں بہت مقبول ہے۔ آپ نے علم فقہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ایک شاگردِ خاص سے حاصل کیا۔ ترمذ میں آپ حکیم محمدؒ کے نام سے معروف ہیں۔ اور علاقہ ترمذ کے صوفیاء کرام آپ کو اپنا مقتدا سمجھتے ہیں۔ آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔ ایک یہ کہ آپ حضرت خضر علیہ السلام کے صحبت یافتہ ہیں۔ حضرت ابوبکر وراقؒ جو آپ کے مرید ہیں روایت کرتے ہیں کہ ہر اتوار کے دن خضر علیہ السلام آپ کے پاس آتے اور گفتگو کرتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :

" من جهل باوصاف العبودية يكون اجهل باوصاف الربوبية ومن لم يعرف طريق معرفة النفس لم يعرف طريق معرفة الرب بان الظاهر متعلق بالباطن و تعلق بالظاهر بلا باطن محال و دعوى الباطن بلا ظاهر محال فمعرفة اوصاف الربوبية فى تصحيح اركان العبودية ولا يصح ذالك الا بالادب"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص شریعت کے مطابق اوصاف بندگی سے محروم ہے' وہ اوصافِ خداوندی سے محروم تر ہے۔ اور جس شخص کو اپنے نفس کی معرفت نہیں وہ معرفتِ حق سے محروم ہوتا ہے۔ یعنی جو شخص آفاتِ بشریت (نفس) سے غافل ہے وہ لطائفِ معرفتِ حق سے محروم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ ظاہر کا باطن کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا ظاہر بغیر باطن محال ہے اور باطن بغیر ظاہر ناممکن ہے۔ پس حق تعالیٰ کی معرفت نفس کی معرفت کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ اس قول میں بڑی حکمت پنہاں ہے۔ انشاء اللہ اپنے مقام پر اس کی وضاحت کی جائے گی۔

حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ

شرفِ زہاد امت (امت کے زاہدوں کا فخر) اور مزکیٔ اہل فقر و صفوت (اہل فقر و تصوف کا تزکیہ کرنے والا) حضرت ابوبکر محمد بن علی الوراق رحمتہ اللہ علیہ کا شمار اکابر مشائخ اور زہاد (جمع زاہد) میں ہوتا ہے۔ آپ کو حضرت احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت حکیم ترمذیؒ کی صحبت کا شرف حاصل ہے۔ آداب و معاملاتِ طریقت پر آپ کی بہت تصانیف ہیں۔ مشائخ نے آپ کو مؤدب الاولیاء کا لقب دیا ہے (یعنی اولیاء کو ادب کی تعلیم دینے والا)۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت حکیم ترمذیؒ نے مجھے ایک کتاب کے چند جزو دیکر حکم دیا کہ اسے دریا میں ڈال دو۔ لیکن میرے دل کو یہ بات گوارہ نہ ہوئی اور میں نے کتاب کا نسخہ لے کر اپنے گھر میں رکھ دیا۔ اور ان سے جا کر کہا کہ دریا میں پھینک دیا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ پھر کیا ہوا۔ میں نے جواب دیا کہ کچھ بھی نہ ہوا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ پھر تم نے دریا میں پھینکا ہی نہیں ہے۔ جاؤ اور ڈال کر آؤ۔ میں نے جذبات پر قابو پا کر اس کتاب کے نسخے کو دریا میں ڈال دیا۔ جونہی میں نے یہ کام کیا دریا کے پانی میں شگاف پیدا ہوا اور اندر سے ایک صندوق برآمد ہوا اور کاغذوں کو اپنے اندر لے کر پانی میں چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں اب تم نے کتاب پانی میں ڈالی ہے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ یا شیخ اس میں کیا راز ہے۔ آپ نے فرمایا میں نے یہ کتاب تصنیف کی لیکن اس کا سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ مجھے دے دو۔ اور پانی کو خداوند تعالیٰ نے حکم دیا کہ کتاب کو خضر تک پہنچا دے۔

حضرت ابوبکر وراقؒ فرماتے ہیں۔ کہ الناس ثلثۃ العلماء والامراء

والفقراء فاذا فسد العلماء فسد الطاعته والشريعته و اذا فسد الامراء فسد المعاش و اذا فسد الفقراء فسد الا خلاق (لوگ تین قسم کے ہیں' گروہ علماء' امراء اور فقراء۔ جب امراء میں خرابی آتی ہے تو معاش خلق یعنی لوگوں کے معاشرہ میں خرابی واقع ہو جاتی ہے۔ اور جب علماء کے اندر خرابی آتی ہے تو لوگوں کی عبادت اور شریعت کی پابندی میں خلل آجاتا ہے اور جب فقراء کے اندر خرابی پیدا ہوتی ہے تو لوگوں کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں) ۔ اور ان تینوں گروہوں میں خرابی کس وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے ؟ امراء اور سلاطین ظلم کی وجہ سے تباہ ہو جاتے ہیں' علماء طمع نفسانی کی وجہ سے اور فقراء ریا کی وجہ سے۔ جب تک سلاطین علماء کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں تباہ نہیں ہوتے۔ جب تک علماء سلاطین کے محلات کا طواف نہیں کرتے تباہ نہیں ہوتے۔ اور جب فقراء ریا کی وجہ سے جاہ و مرتبہ کے طالب نہیں بنتے تباہ نہیں ہوتے۔ اور سلاطین کا ظلم جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور علماء کی طمع بد دیانتی سے اور فقراء کی ریا خداوند تعالیٰ پر توکل نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ پس جاہل بادشاہ' بے عمل عالم' اور بے توکل فقیر آسانی سے شیطان کا شکار بن جاتا ہے۔ اور ساری خلقت کی تباہی ان تینوں گروہوں کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔

حضرت ابو سعید خراز رحمتہ اللہ علیہ

سفینۂ توکل و رضا (رضا و توکل کی کشتی) ' اور سالکِ طریق فنا حضرت ابو سعید بن عیسیٰ خراز رحمتہ اللہ علیہ مریدین کے احوال باطنی سے بخوبی آگاہ اور طالبین کی روحانی منازل کے شناسا تھے سب سے پہلے جس بزرگ نے فنا و بقا کے متعلق گفتگو کی آپ تھے۔ آپ کے مناقب مشہور' اور ریاضت و نکات معروف تھے۔ آپ کی تصانیف بہت بلند اور کلام بہت اعلیٰ تھا۔ آپ نے حضرت سفیان

ثوری رحمتہ اللہ علیہ کی بھی صحبت پائی ہے۔ نیز حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ اور سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ سے بھی فیض صحبت حاصل کیا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس قول کے متعلق کہ **جبلت القلوب علی حب من احسن الیھا** (لوگوں کی قلوب اس طرح بنائے گئے ہیں کہ جو شخص ان کی بھلائی کرتا ہے اس کی طرف راغب ہو جاتے ہیں) حضرت ابو سعید خراز رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **واعجبا لمن لم یری محسنا غیر اللہ کیف لا یمیل بکلیتہ الی اللہ** (تعجب ہے اس شخص پر جو جانتا ہے کہ حق تعالیٰ سے بڑا محسن کوئی نہیں ہے۔ اور پھر بھی اس کی طرف مکمل طور پر رجوع نہیں کرتا)۔ کیونکہ حقیقی معنوں میں احسان وہ ہے جو مطلق العنان بادشاہ کرے یعنی جو کسی احسان کا محتاج نہ ہو نہ کہ وہ جو دوسروں کے احسان کا محتاج ہو۔ جو شخص دوسرے کے احسان کا محتاج ہوتا ہے وہ کس طرح دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کر سکتا ہے۔ اب چونکہ حقیقی مالک خداوند تعالیٰ ہے اور وہ ہر شخص اور ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ جب اولیاء کرام اسباب کو سمجھ لیتے ہیں تو ہر انعام اور ہر نعمت پر منعم حقیقی کو دیکھتے ہیں اور ان کے قلوب کلی طور پر حق تعالیٰ کی محبت کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ اور غیر اللہ سے اجتناب کرتے ہیں۔

حضرت علی بن محمد اصفہانی رحمتہ اللہ علیہ

شاہِ محققان و دلیلِ مریدان حضرت ابوالحسن علی بن محمد اصفہانی رحمتہ اللہ علیہ جن کو علی بن سہیل بھی کہتے ہیں کا شمار اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ آپ کی خط و کتابت بہت محققانہ تھی۔ اور حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ آپ کی زیارت کے لئے اصفہان گئے تھے۔ آپ کو حضرت شیخ ابو تراب نخشبی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت بھی ملی ہے۔

اور جنید رحمتہ اللہ علیہ سے تو آپ کی دوستی تھی۔ آپ نیکوکاری میں بہت مشہور اور رضا و ریاضات میں بہت معروف تھے اور فتنہ ہائے زمانہ سے مامون تھے۔ حقائق و معارف میں آپ کا کلام بہت بلند ہے۔ اور ارشاوات و نکات آپ کے بہت لطیف ہیں۔

حضوری افضل ہے یقین سے

آپ فرماتے ہیں کہ **الحضور افضل من الیقین لان الحضور وطنات والیقین خطرات** (حضوریٔ بارگاہِ معلیٰ افضل ہے یقین سے ۔کیونکہ حضوری مستقل چیز ہے اور یقین آنے جانے والی چیز ہے)۔ حضوری جب آتی ہے جاتی نہیں ہے۔ اور یقین کبھی آتا ہے کبھی جاتا ہے۔ پس جن کو حضوری حاصل ہے وہ حق تعالیٰ کے سامنے ہوتے ہیں اور جن کو یقین ہوتا ہے وہ باہر دروازہ پر ہوتے ہیں۔ حضوری اور غیوب پر اس کتاب میں آگے ایک مستقل باب آرہا ہے۔ انشاء اللہ عزوجل۔

نیز آپ فرماتے ہیں **من وقت آدم الیٰ قیام الساعتہ الناس یقولون القلب القلب و انا احب ان اریٰ رجلاً یصف القلب و یقول ایش القلب او کیف القلب فلا اریٰ** (آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک لوگ قلب قلب کہتے رہیں گے۔ اور مجھے اس شخص کو دیکھنے کی خواہش ہے جو قلب کی تعریف کرے کہ قلب کیا ہے اور قلب کس طرح ہے لیکن آج تک وہ مجھے نظر نہیں آیا)۔اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام اس ٹکڑۂ گوشت کو دل (قلب) کہتے ہیں جو بچوں اور مجنون لوگوں کے اندر بھی موجود ہے لیکن درحقیقت وہ ہوتے بیدل ہیں۔ پس دل کیا چیز ہے۔ لفظ دل دل تو سن رہا ہوں۔ لیکن معلوم نہیں دل کیا ہے۔ اگر عقل کو دل کہوں تو وہ دل نہیں۔ اگر روح کو دل کہوں' وہ دل نہیں۔

اگر علم کو دل کہوں' وہ دل نہیں ہے۔ غرضیکہ تمام شواہد حق کا قیام دل سے ہے اور دل کی حقیقت نامعلوم۔

شرح علما' حکماء اور صوفیاء سب حقیقتِ قلب دریافت کرتے آئے ہیں اور اس پر کتابیں لکھتے آئے ہیں لیکن حقیقتِ حال پوری طرح کسی کو معلوم نہیں ہو سکی۔ قرآن مجید میں بھی کافروں کے اصرار پر صرف یہ بتایا گیا ہے قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (کہہ دیجئے کہ روح امرالٰہی سے ہے)۔ علماء ظاہر امر ربی سے حکم ربی معنی لیتے ہیں اور صوفیاء لفظ امر سے حکم نہیں بلکہ عالم امر مراد لیتے ہیں یعنی عالم قدس یا ذات و صفات باری تعالیٰ کا جہان۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر دو عوالم کا ذکر آیا ہے۔ عالم امر (عالم قدس) اور عالم خلق (ظاہری کائنات)۔

نیز قرآن مجید میں روح کے متعلق ایک اور جگہ پر حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (میں نے آدم میں اپنی روح پھونکی)۔ تو بات اس سے ذرا آگے بڑھی ہے اور معلوم ہوا ہے کہ انسانی روح حق تعالیٰ کی روح میں سے ہے۔ جب تزکیۂ نفس کی بدولت روح انسانی کو قوت پرواز حاصل ہوتی ہے تو مقاماتِ فنا فی اللہ اور بقا باللہ طے کرتے ہوئے قرب حق کے جہان میں اس کی رسائی ہو جاتی ہے اور یہی بشریت کا عروج ہے اور حصولِ مقصدِ حیات ہے۔

حضرت محمد بن اسماعیل خیر النسّاج رحمتہ اللہ علیہ

پیر اہل تسلیم (اصحابِ تسلیم و رضا کے امام) و اندر طریقِ محبت مستقیم (محبت کی راہ میں ثابت قدم) حضرت ابوالحسن محمد بن اسماعیل خیر النسّاج کا شمار اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ اپنے زمانے میں آپ بہترین واعظ تھے اور نکاتِ معرفت بیان کرتے تھے آپ کی عمر بہت دراز تھی۔ حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ اور ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ دونوں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی اور آپ

ہی نے حضرت ابوبکر شبلیؒ کو حضرت جنیدؒ کی خدمت میں بھیجا تھا تاکہ ان کا ادب بجا لائیں۔ آپ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت جنیدؒ اور ابوالحسن نوریؒ کے صحبت یافتہ تھے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ آپ کا بہت احترام کرتے تھے اور حضرت ابو حمزہ بغدادیؒ کے تو آپ منظور نظر تھے۔ آپ کے لقب خیر النساج کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ اپنے وطن سے حج کو براستہ سامرہ روانہ ہوئے تو کوفہ پہنچے۔ کوفہ کے دروازہ پر ایک پارچہ باف (جولاہا) نے آپ کو پکڑ لیا کہ تو میرا گمشدہ نوکر ہے۔ جس کا نام خیر تھا۔ آپ نے یہ حق تعالیٰ سے سمجھا اور اس کی غلامی قبول کر لی اور مدت تک اس کی خدمت کرتے رہے۔ جب بھی وہ خیر کہہ کر بلاتا تھا آپ فوراً جی حضور کہہ کر جواب دیتے۔ حتیٰ کہ وہ آدمی اپنے کئے پر پشیمان ہوا۔ اور اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ان کو رہا کر دیا۔ اس کے بعد آپ مکہ مکرمہ پہنچے اور بلند مقامات حاصل کئے۔ یہاں تک کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ جیسے بلند پایہ بزرگ بھی فرمایا کرتے تھے کہ خیرٌ خیرنا (وہ خیر میں سب سے اچھا ہے)۔ اور آپ بھی اس نام کو بہت پسند فرماتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ جب ایک مسلمان نے میرا نام خیر رکھا ہے تو میرے لئے روا نہیں کہ اسے ترک کروں۔ روایت ہے کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو شام کا وقت تھا۔ موت کی غشی کے بعد آنکھ کھولی تو ملک الموت کو سامنے کھڑا دیکھا اور اس سے کہا کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ خدا تیرا بھلا کرے۔ تو بھی ایک کام پر مامور ہے اور میں بھی ایک کام پر مامور ہوں۔ جو تجھے حکم ملا ہے اس کا وقت فوت نہیں ہوتا اور جو مجھے حکم ملا ہے اس کا وقت فوت ہو رہا ہے۔ یعنی مجھے شام کی نماز ادا کرنے دو۔ اس وقت آپ نے وضو کیا' نماز پڑھی۔ اور جان بحق ہو گئے۔ اس رات آپ کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھ سے یہ سوال نہ کرو لیکن میں نے تمہاری دنیا سے

نجات پائی ہے۔

آپ نے ایک دفعہ اپنی مجلس میں فرمایا کہ شرح اللہ صدور المتقین بنور الیقین و کشف بصائر المومنین بنور حقائق الایمان "حق تعالیٰ نے پرہیزگاروں کے قلوب کو نورِ یقین سے منور کیا ہے اور مؤمنین کی آنکھوں کو نورِ حقائق ایمان سے روشن فرمایا ہے"۔ پس جس جگہ ایمان ہے وہاں یقین بھی ہے اور جس جگہ یقین ہے وہاں تقویٰ بھی ہے کیونکہ ان دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابو حمزہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ

داعیٔ عصر (ہادیٔ زمانہ) و یگانۂ دہر (یگانۂ روزگار) حضرت ابو حمزہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ خراسان کے اکابرین مشائخ میں سے تھے۔ آپ کو حضرت ابو تراب اور حضرت خرازؒ کا فیضِ صحبت ملا ہے۔ آپ توکل میں نہایت ثابت قدم تھے۔ ایک دفعہ آپ کہیں جا رہے تھے کہ کنوئیں میں گر گئے۔ تین دن کے بعد ایک قافلہ کا وہاں پر گزر ہوا تو آپ کے دل میں خیال آیا کہ ان کو آواز دوں۔ لیکن بعد میں سوچا کہ غیر خدا سے امداد طلب کرنا اچھا نہیں ہے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی شکایت ہے کہ لوگوں کو کہوں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے کنوئیں میں پھینک دیا ہے اور اب مجھے نکالو۔ جب کچھ لوگ کنوئیں کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ نہ اس کا کوئی کنارہ ہے نہ حد ہے اور بہت ممکن ہے کہ کوئی بے خبری سے اس کے اندر جا پڑے۔ اس لئے انہوں نے اس کو بند کرنے کا ارادہ کیا تاکہ کوئی شخص اس کے اندر گر نہ سکے۔ یہ سن کر آپ کے نفس نے واویلا شروع کر دیا کہ اب میری موت یقینی ہے۔ جب وہ کنوئیں کا منہ بند کر کے چلے گئے تو آپ زندگی سے ناامید ہو گئے او[illegible]اری خلقت سے روگردانی کر کے حق تعالیٰ کے مناجات میں مشغول

ہو گئے۔ ایک دن رات گزر جانے کے بعد آپ نے آواز سنی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی کنوئیں کا منہ کھول رہا ہے۔ آپ نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف نگاہ کی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑا اژدہا ہے جس نے کنوئیں میں سوراخ کر کے اپنا دم نیچے کی طرف لٹکایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ میری نجات اسی میں ہے اور یہ حق تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے دم کو پکڑ لیا اور اس نے مجھے اوپر کھینچ لیا اس وقت غیب سے آواز آئی کہ اے ابو حمزہ تجھے کیسی اچھی نجات ملی کہ ہم نے تجھے ایک موت سے دوسری موت کے ذریعے بچا لیا ہے۔ (یعنی سانپ بھی موت ہے جس نے تجھے موت سے بچا لیا ہے)۔

کسی نے آپ سے پوچھا کہ غریب (مسافر یا اجنبی) کون ہوتا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ **المستوحش من الالف** (جو شخص الفت سے دور بھاگتا ہے)۔ یعنی جس کے دل میں دنیا کی محبت نہیں۔ یعنی جسے دنیا سے محبت نہیں وہ مسافر ہے کیونکہ درویش کا وطن نہ دنیا ہے نہ عقبیٰ۔ اور اس کے دل میں نہ دنیا کی محبت ہوتی ہے نہ آخرت کی۔ جب اس کی الفت کونین سے منقطع ہو جاتی ہے تو وہ ہر چیز سے دور بھاگتا ہے اور غریب (مسافر) بن جاتا ہے اور یہ مقام بہت بلند ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب۔**

حضرت ابو العباس بن مسروق رحمتہ اللہ علیہ

داعیِ مریدان بحکم فرمان (اللہ کے حکم سے مریدین کا ہادی) حضرت ابو العباس احمد بن مسروق رحمتہ اللہ علیہ کا شمار خراسان کے اکابرین مشائخ میں ہوتا ہے۔ تمام اولیاء اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ اوتادُ الارض تھے اور قطبِ مدار کے ہم صحبت تھے۔ جب آپ سے کسی نے پوچھا کہ آج کل قطبِ وقت کون ہے تو خاموش ہو گئے لیکن اشارہ یہ کیا کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ قطب

وقت ہیں۔ آپ نے چالیس مشائخ کی صحبت پائی اور فیض حاصل کیا۔

شرح ابدال، اوتاد، غوث، قطب یہ مردان غیب کے نام ہیں جو دنیا میں کسی نہ کسی خدمت پر کسی نہ کسی علاقے میں مامور من اللہ ہوتے ہیں۔ دنیا میں غوث ایک ہوتا ہے جس کے ہمراہ دو قطب ہوتے ہیں۔ غوثِ زمان کو قطب الاقطاب بھی کہتے ہیں۔ ایک قطب اس کی دائیں جانب ہوتا ہے ایک بائیں جانب۔ ان کے ماتحت ابدال اور اوتاد ہوتے ہیں جو مختلف علاقوں میں تکوینی امور پر مامور ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیل سردلبراں مصنفہ حضرت مولانا سید محمد ذوقی رحمتہ اللہ علیہ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو محفل ذوقیہ۔ کراچی نے شائع کی ہے۔

ترجمہ آپ تمام ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ تھے آپ فرماتے ہیں کہ **من کان سروره بغیر الحق فسروره یورث الهموم ومن لم یکن انسه فی خلمت ربه فانسه یورث الوحشته** "جو شخص خداوند تعالیٰ کے سوا کسی اور چیز میں خوش ہوتا ہے اس کی خوشی غموں کا گہوارہ ہے اور جو شخص حق تعالیٰ کے سوا غیر کے ساتھ انس رکھتا ہے اس کا انس وحشت بن جاتا ہے"۔ چنانچہ سارے جہان کا غم اور وحشت غیر اللہ کے انس میں ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو عبداللہ بن احمد اسماعیل مغربیؒ

استاد مُوکلاں، و شیخ محققان حضرت ابو عبداللہ بن احمد اسماعیل المغربی رحمتہ اللہ علیہ اپنے وقت کے پیشوا اور برگزیدہ بزرگ تھے اور مشائخ کے محبوب اور مریدوں کے راہبر مشہور تھے۔ حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابراہیم شیبانی رحمتہ اللہ علیہ دونوں آپ کے مرید تھے۔ آپ کا کلام بلند اور نکاتِ معرفت واضح ہیں۔ آپ تجرید یعنی ترک دنیا میں ثابت قدم تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے دنیا سے زیادہ منصف کسی کو نہیں دیکھا کیونکہ جو شخص

اس کا ہو جاتا ہے دنیا اس کی ہو جاتی ہے اور جو شخص دنیا ترک کر دیتا ہے تو دنیا بھی اسے ترک کر دیتی ہے۔ یعنی جب تو دنیا طلب کرتا ہے وہ تجھے طلب کرتی ہے اور جب تو اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ تجھے چھوڑ دیتی ہے۔ پس جو شخص صدق دل سے دنیا کو ترک کرتا ہے دنیا کے شر سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کی آفت سے بچ جاتا ہے۔ واللہ اعلم و باللہ التوفیق۔

حضرت ابو علی جرجانی رحمتہ اللہ علیہ

پیرِ زمانہ و اندر زمانۂ خود یگانہ حضرت ابو علی بن حسن بن علی جرجانیؒ اپنے وقت میں بے نظیر تھے معاملاتِ دین اور آفاتِ دنیا کے مضمون پر آپ نے کافی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ حضرت محمد بن علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے اور حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ اور ابراہیم سمرقندی رحمتہ اللہ علیہ ان کے مرید تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "قرار گاہ خلق میدان غفلت ہے۔ اور ان کا اعتماد ظنون و آفات پر ہے اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم ہی حق پر ہیں"۔ لیکن ان کا یہ کلام رعونت نفس اور غلبہ شہوات کی مذمت ہے۔کیونکہ اگر کوئی شخص جاہل بھی ہو تو وہ اپنی جہالت کا معتقد ہوتا ہے (یعنی اس کو اچھا سمجھتا ہے)۔ خاص طور پر جاہل صوفی تو اور بھی اپنے جاہلانہ خیالات پر نازاں ہوتا ہے۔ چنانچہ جاہل صوفی خلقت میں سے بدترین انسان اور عالم صوفی خلقت کے معزز ترین انسان ہوتے ہیں۔ کیونکہ عالم صوفیاء حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں اور غرور سے خالی ہوتے ہیں اور جاہل صوفی حقیقت سے خالی لیکن غرور سے پر ہوتے ہیں۔ وہ میدان غفلت میں چرتے پھرتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم یقین میں پختہ ہیں۔ خالی رسوماتِ تصوف کے پابند ہوتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ یہ حقیقت ہے۔ نفسانی خواہشات کی پوجا کرتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم اہل کشف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان

کی کھوپڑی سے پنداشت (خودپسندی) اس وقت تک نہیں نکلتی جب تک کہ اسے جلال و جمالِ حق کا مشاہدہ نہ ہو۔ خودپسندی ختم ہوتے ہی اس کی نظر اپنے آپ سے اٹھ کر مشاہدہ جلال میں غرق ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو محمد بن احمد الجریری رحمتہ اللہ علیہ

باسطِ علوم و واضحِ رسوم (علوم کو کھولنے والے اور رسوماتِ عبادت کی وضاحت کرنے والے) حضرت ابو محمد بن احمد بن حسین الجریری رحمتہ اللہ علیہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے محرم راز تھے اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے آپ تمام اقسام کے علوم سے آگاہ تھے۔ خاص کر علم فقہ میں آپ امام وقت تھے۔ اور صاحبِ اصول تھے۔ طریقت میں آپ کا مقام بہت بلند تھا اور حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ آپ سے کہا کرتے تھے کہ میرے مریدوں کو ادب سکھاؤ اور ریاضت کراؤ۔ خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ کے وصال کے بعد آپ ہی ان کے جانشین ہوئے اور فرائضِ رشد و ہدایت انجام دیئے۔

آپ فرماتے ہیں کہ دوامِ ایمان (ایمان کی سلامتی) و قوامِ الادیان (دین کی مضبوطی) وصلاح الابدان (جسمانی صحت) کا دارومدار تین چیزوں پر ہے۔ اول اکتفا (اللہ پر بھروسہ)، دوم اِتقیٰ (پرہیز گاری)، سوم احتماء (اجتناب)۔ اکتفا کا مطلب ہے اللہ کو ہر معاملہ میں کافی سمجھنا، اِتقیٰ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی منع کی ہوئی چیزوں کو ترک کرنا اور احتماء سے مراد ہے ناپسندیدہ غذا سے پرہیز کرنا۔ جس نے اللہ کو کافی سمجھا وہ نیک خصلت بن جاتا ہے۔ جس نے منع شدہ چیزوں سے پرہیز کیا اس کا دین سلامت رہتا ہے۔ اور جس نے غلط یا حرام کھانے کو ترک کیا اس کی جسمانی صحت درست ہوتی ہے۔ یعنی توکل علی اللہ سے ایمان بنتا ہے۔

منکرات ترک کرنے سے دین بنتا ہے اور ناپسندیدہ غذا سے صحت بنتی ہے۔ بالفاظ دیگر جو شخص خدا تعالیٰ کو کافی سمجھتا ہے اس کو معرفت حق حاصل ہوتی ہے۔ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اس کا دنیا و آخرت میں خلق اچھا ہوتا ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا ہے **من کثر صلواۃ باللیل حسن وجہہ بالنہار** (جس نے رات کو کثرت سے نماز پڑھی دن کو اس کا چہرہ روشن ہوا) ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ **وجو ھھم نور علی منابر من نور** (نور کے منبروں پر بیٹھے ہوئے ان کے چہرے منور ہوں گے) اور جو شخص بری چیزوں کے کھانے سے پرہیز کرتا ہے اس کا جسم بیماری سے اور نفس شہوت سے محفوظ رہتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل آملیؒ

شیخ ظرفا (ظریف یعنی دانا لوگوں کے شیخ) و قدوۂ اہل صفا (نیک لوگوں کے پیشوا) حضرت ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل آملیؒ کا شمار اکابر اور بلند مرتبہ مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ وقت کے تمام اولیاء کرام کے نزدیک ہردلعزیز تھے۔ آپ علم تفسیر اور تجوید میں عالم تھے اور نکات قرآن پاک کے بیان میں آپ کا کلام بہت لطیف ہے۔ آپ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے اکابر مریدین میں سے تھے۔ اور حضرت ابراہیم مارستانی کے صحبت یافتہ تھے۔ حضرت ابو سعید خراز رحمتہ اللہ علیہ آپ کا بہت احترام کرتے تھے اور آپ کے سوا کسی کے تصوف کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اپنی طبیعت کی پسندیدہ چیزوں سے محبت کرنا حقائق کے درجات سے گرا دیتا ہے۔ یعنی جو شخص اپنی پسندیدہ چیزوں میں مشغول ہو جاتا ہے حقیقت سے محروم رہتا ہے۔ کیونکہ انسانی طبیعت میں نفس پروری ہے' اور نفس

مقامِ حجاب ہے اور حقیقت (حق آگاہی) مقامِ کشف ہے جو مرغوباتِ طبع کے ترک سے حاصل ہوتا ہے۔ مرغوب طبع دو چیزیں ہوتی ہیں ایک دنیا اور اسکی لذات' دوسرے آخرت اور اس کے کوائف۔ دنیا کی محبت اس کی فطرت کے مطابق ہے (خود بھی خا[illegible] ہے اور خاک سے محبت ہے)۔ اور آخرت کی محبت پندار (غلط فہمی) کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ آخرت نہ اس کی ہم جنس ہے اور نہ اسکی حقیقت معلوم ہے۔ پس اس کی آخرت سے الفت غلط فہمی کی وجہ سے ہے نہ کہ صحیح فہمی سے۔ اگر آخرت (عقبیٰ) کو صحیح طور پر سمجھ لیتا تو دنیا جیسی فانی سرائے سے دل نہ لگاتا۔ اور جب اس سرائے فانی سے دل ہٹ جاتا تو نفسانیت کی اس پر حکمرانی ختم ہو جاتی۔ اور کشف حقائق ہو جاتا۔ کیونکہ عقبیٰ کی خوشی فنائے نفس کے بغیر ناممکن ہے **لان لہا مالا خطر علی قلب بشر** (کیونکہ آخرت میں وہ نعمتیں ملیں گی کہ جن کا انسان کو وہم گمان بھی نہیں ہو سکتا)۔ عقبیٰ کی عظمت (خطر) اس وجہ سے ہے کہ وہ پر خطر راہ کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

شرح یہاں حضرت مصنف نے لفظ خطر کے دونوں معانی لئے ہیں - کیونکہ خطر کے ایک معنی عظمت ہیں' دوسرے نقصان۔ یہ بلاغت کلام ہے۔ جو چیز انسان کے تصور میں آسکے اس کی کوئی عظمت (اہمیت) نہیں ہوتی۔ جب حقیقت عقبیٰ سمجھنے سے عقل عاجز ہے تو انسانی طبیعت کو اس کے ساتھ کیسے الفت ہو سکتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عقبیٰ کے ساتھ الفت غلط فہمی (پندار) کا نتیجہ ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ

مستغرقِ معنی (حقیقت میں غرق) و مستہلکِ دعویٰ (دعویداری کا شکار) حضرت ابوالمغیث حسین بن منصور الحلاج رحمتہ اللہ علیہ کا شمار مشتاقان اور

مستان طریقت میں ہوتا ہے۔ آپ کا حال بہت قوی اور ہمت بہت بلند تھی۔ آپ کے مقام کے متعلق مشائخ طریقت کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک آپ مردود سمجھے جاتے ہیں اور ایک گروہ کے نزدیک مقبول بارگاہ ہیں۔ جو لوگ آپ کو مردود سمجھتے ہیں ان میں حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ' ابو یعقوب نہرجوریؒ ابو یعقوب اقطعؒ اور علی بن سہل اصفہانیؒ وغیرہم ہیں۔ اور جن حضرات نے آپ کو مقبول قرار دیا ہے ان میں حضرت ابن عطاؒ' محمد بن خفیفؒ' ابوالقاسم نصر آبادیؒ اور جملہ مشائخ متاخرین ہیں۔ ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے آپ کے حق میں خاموشی اختیار کی ہے۔ مثلاً حضرت جنیدؒ' حضرت شبلیؒ اور حصریؒ وغیرہم۔ بعض لوگوں نے آپ کو سحر اور جادو سے منسوب کیا ہے۔ ہمارے زمانے کے مشائخ مثل شیخ المشائخ شیخ ابوسعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ ۔ شیخ ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ شیخ ابوالعباس شقانی رحمتہ اللہ علیہ اپنے آپ کو شیخ منصور حلاجؒ کا ہمراز سمجھتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن حضرت ابوالقاسم قشیری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اگر وہ اہل حقیقت تھے تو خلق کے طعن و تشنیع کی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کی درگاہ سے محروم نہیں ہوسکتے۔ اور اگر وہ مہجور و مردود طریقت تھے تو قبول خلق کی وجہ سے مقبول نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ہم ان کو ان کے حال پر چھوڑتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کے اندر جو نشان حق پایا ہے اس کی وجہ سے ان کا احترام کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے منکرین کی تعداد بہت کم ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے ان کے کمال و فضل' صفائے قلب' ریاضت و مجاہدات کے باوجود اس کتاب میں ان کا ذکر نہ کرنا بد دیانتی ہو گی۔ علمائے ظاہر میں سے بھی بعض لوگ ان کی تکفیر کرتے ہیں (کافر سمجھتے ہیں)۔ اور ان کے کمالات کے منکر ہیں۔ اور ان کے کشف و کرامات کو حیلہ بہانہ اور جادو سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حسین بن منصور حلاجؒ وہی بغدادی ملحد (بے دین) ہے جو محمد بن زکریا کا استاد تھا۔

اور ابو سعید قرامطی کا رفیق تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حسین بن منصور الحلاج جن کے متعلق مشائخ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور مخلص ہیں جو فارس کے شہر بیضا کے باشندہ تھے اور ان کو مشائخ نے اس وجہ سے رد نہیں کیا کہ ان کے عقائد میں کوئی خرابی تھی بلکہ ان کے عجیب حالات کی بنا پر ان کی نکتہ چینی کی گئی ہے۔

مثلاً سب سے پہلے وہ سہل بن عبداللہؒ کے مرید تھے لیکن اصول طریقت کو ترک کرتے ہوئے وہ ان کو چھوڑ کر حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں چلے گئے۔ اس کے بعد ان کو چھوڑ کر حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں جا پہنچے لیکن آپ نے ان کو قبول نہ کیا۔ اسی وجہ سے دیگر لوگوں نے ان کو قبول نہیں کیا۔ لیکن جو مہجور طریقت ہو وہ مہجور حقیقت نہیں ہوتا۔ تجھے معلوم نہیں کہ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے ان کے متعلق فرمایا ہے **انا والحلاج فی شیئی واحد فخلصنی جنونی و اھلکہ عقلہ** (میں اور حلاج ایک جیسے ہیں لیکن مجھے میرے جنون نے بچا لیا اور اس کو اس کے عقل نے ہلاک کر دیا)۔ اگر ان کے عقائد میں کوئی خرابی ہوتی تو شیخ شبلی رحمتہ اللہ علیہ یہ نہ فرماتے کہ میں اور حلاج ایک چیز ہیں۔ حضرت محمد بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **ھو عالم ربانی** (وہ عالم ربانی تھے) اس قسم کے اقوال ان کے حق میں بہت ہیں۔ پس مشائخ عظام کی ناراضگی اور ناخوشی کی وجہ سے وہ بدنام ہو گئے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں۔ اور اصول و فروع میں آپ کا کلام اسرار و رموز سے لبریز ہے۔

منصور حلاجؒ کی تعریف

اور میں علی بن عثمان الجلابیؒ نے ان کی پچاس کتب بغداد اور اس کے نواح میں اور بعض خوزستان، فارس اور خراسان میں دیکھی ہیں۔ ان کے اقوال سے

معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ابتدا میں سالکین کا حال ہوتا ہے کہ بعض قوی ہیں' بعض ضعیف' بعض آسان' بعض مشکل۔ غرضیکہ جب کسی بزرگ کو خداوند تعالیٰ کے فضل سے بلند مقامات حاصل ہوتے ہیں تو انکی عبارت ادق ہو جاتی ہے خاص کرجب مصنف خود جلدی کرے یا وضاحت سے نہ لکھے تو سننے والوں کے اذہان اسے قبول نہیں کرتے اور عقل ان کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ جب کلام بہت اعلیٰ وارفع ہوتا ہے تو بعض جہالت کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اور بعض جہالت کی وجہ اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اور ان کا انکار بھی اقرار بن جاتا ہے۔ لیکن محققین نہ عبارات میں الجھتے ہیں اور نہ تعجب کرتے ہیں۔ لہٰذا مدح و ذم (تعریف اور مذمت) دونوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور انکار و اقرار دونوں سے باز رہتے ہیں۔

اور جو لوگ اس جوانمرد کو جادو سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کیونکہ اگرچہ عقائد اہلسنت والجماعت کے مطابق کرامات کی طرح جادو کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن طریقت میں جادو کو روا رکھنا کمال کفر ہے۔ جیسا کہ کرامت کمال معرفت ہے اس وجہ سے کہ جادو خداوند تعالیٰ کے غضب اور کرامت اس کی رضا کا نتیجہ ہے۔ اس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

حلاجؒ کے خلاف الزامات کا جواب

اہل بصیرت (اولیاء کرام) کا اسبات پر اتفاق ہے کہ اہلسنت و جماعت سے تعلق رکھنے والا مسلمان خاسر (گمراہ) اور ساحر (جادوگر) نہیں ہو سکتا۔ اور کافر مکرم (صاحب کرامت) نہیں بن سکتا کیونکہ اس سے جمع اضداد لازم آتا ہے۔ لیکن حسین رحمتہ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ نماز کی پابندی ذکر و مناجات کی زیادتی اور مسلسل روزوں کی وجہ سے بہت نیک تھے۔ اور توحید کے مضمون پر بھی آپ کا کلام بہت لطیف ہے۔ اگر وہ جادوگر ہوتے تو یہ تمام چیزیں انکے لئے ناممکن

تھیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ان کے خوارق جادو نہیں کرامات تھے۔ اور کرامات کا صدور ولی اللہ کے سوا کسی میں نہیں ہوتا۔ اور یہ جو بعض اہل سنت ان پر اعتراض کرتے ہیں اور اتحاد و امتزاج کے الزام لگاتے ہیں یہ ان کے انتخاب الفاظ کیوجہ سے ہے۔ نہ کہ معنی (حقیقت) کی وجہ سے۔ کیونکہ ایک شخص جو مغلوب الحال ہے اس کے لئے صحیح الفاظ و عبارات کا انتخاب ناممکن ہو جاتا ہے یہ بھی ہوتا ہے کہ جب کلام مشکل ہوتا ہے اور لوگ اس کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں تو اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور ان کا یہ انکار انکی اپنی جہالت کا ثبوت ہے۔

شرح شیخ منصور حلاج" پر اتحاد اور امتزاج کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ امتزاج کو عام طور پر حلول بھی کہتے ہیں اور شریعت میں عقیدہ اتحاد اور عقیدہ حلول دونوں حرام ہیں۔ عقیدہ اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص یا چیز کے وجود کو حق تعالٰی کے وجود کے ساتھ متحد یعنی ساتھ ملا ہوا سمجھنا۔ یہ عقیدہ شریعت میں اس لئے حرام ہے کہ وجود صرف ایک ہے اور وہ ہے وجود باری تعالٰی۔ باقی اشیاء کا وجود ظلی' فرضی اور اضافی ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص کے وجود کو حق تعالٰی کے وجود کے ساتھ متحد قرار دیا جائے تو اس سے وجود کی دوئی یا کثرت لازم آتی ہے۔ حالانکہ وجود واحد ہے۔ امتزاج یا حلول کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزیں آپس میں اس قدر حل میں جائیں کہ ایک نظر آئیں۔ جیسے پانی میں شکر مکمل حل جاتی ہے۔ اس سے بھی کثرت وجود لازم آتا ہے۔ یعنی پانی اور شکر۔ حالانکہ وجود ایک ہے جو وجود باری تعالٰی ہے۔ لہٰذا حلاج نے جب "نعرہ اناالحق" لگایا تو جن لوگوں کو معرفت اور حقیقت کا علم نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ حلاج نے وہی کچھ کیا ہے جو نصرانی کہتے ہیں۔ یعنی خدا حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اندر اتر آیا۔ یا جس طرح ہنود کا عقیدہ ہے کہ رام اور کرشن کو خدا کا اوتار مانتے ہیں۔

یعنی جن کے اندر خدا اتر آیا۔ لیکن حلاج کے نعرہ "انالحق" کا مطلب یہ نہیں تھا کہ "میں خدا ہوں"۔ بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ "میں نہیں ہوں۔ خدا ہے"۔ اور خدا خود "انالحق" کہہ رہا ہے۔ ضمیر انا کا مرجع خدا ہے نہ کہ حلاج۔ اور یہ اور بات ہے کیونکہ سالک کو جب مقام فنافی اللہ حاصل ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سالک خود خدا بن جاتا ہے بلکہ وہ گم ہو جاتا ہے۔ اور خدا باقی رہتا ہے۔ جیسے جب قطرہ سمندر میں گم ہو جاتا ہے تو قطرہ نہیں رہتا بلکہ سمندر رہ جاتا ہے۔ یہ ایک لطیف اور باریک نکتہ ہے جس کو سمجھنے کے لئے لطافت اور تزکیہ نفس کی ضرورت ہے۔ حالتِ کثافت نفس میں اس کا سمجھنا محال ہے۔ کیونکہ جب تک انسان خود اس مقام سے نہ گزرے اس کا سمجھنا ناممکن ہوتا ہے۔

ترجمہ اور میں نے بغداد اور اس کے نواح میں ملحدوں (بے دینوں) کا ایک گروہ دیکھا جو حلاج کی اقتدا کا دعویٰ کرتے تھے۔ اور ان کے کلام سے اپنے ملحدانہ عقائد کا جواز نکالتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو حلاجی کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اور ان کے کلام میں اسی طرح غلو (مبالغہ آمیزی) کرتے تھے جس طرح کہ رافضی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کرتے ہیں۔ ان کے اقوال کی تردید میں ایک مستقل باب آ رہا ہے۔ انشاء اللہ عزوجل۔

لیکن کلام حلاج اقتدا کے قابل نہیں

البتہ حلاج کے کلام کی اقتدا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ مغلوب الحال تھے نہ کہ متمکن۔ اور صرف متمکن مشائخ کا کلام قابل اقتدا ہوتا ہے۔

شرح جیسا کہ پہلے تشریح ہو چکی ہے اربابِ طریقت کی مقامات کے اعتبار سے دو اقسام ہیں۔ ارباب تلوین و ارباب تکوین۔ ارباب تلوین پر سکر، محویت اور استغراق کا غلبہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا ظرف اس قدر قوی اور وسیع نہیں ہوتا

کہ شرابِ معرفت کے پیالے پیتے جائیں۔ اور مست نہ ہوں۔ان کا کلام چونکہ درمیانی منازل کا نتیجہ ہوتا ہے اور عشق و مستی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی اقتدا نہیں کرنا چاہئے۔ ارباب تمکین وہ ہیں جو جس قدر شراب وحدت کے پیالے پیتے ہیں مست نہیں ہوتے بلکہ پیالے تو کیا وہ حضرات صراحی' خم' ندی نالے بلکہ دریا بھی نوش جاتے ہیں۔ لیکن مدہوش نہیں ہوتے۔ اور شریعت کے خلاف نہ کوئی کلمہ منہ سے نکالتے ہیں اور نہ صوم و صلواۃ ترک کرتے ہیں۔ لیکن ارباب تکوین سے بعض اوقات غیر شرع کلمات بھی سرزد ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ان سے مستی کی حالت میں صوم وصلواۃ بھی ترک ہو جاتا ہے اس لئے ارباب تکوین کا کلام اور روش قابل تقلید نہیں ہوتی۔ بلکہ تقلید ان کی کرنا چاہئے جو ارباب تمکین ہیں جو دریا اور سمندر نوش کر جاتے ہیں۔ اور پھر بھی ھل من مزید کے نعرے لگاتے ہیں۔ اور شرع و شریعت پر عامل رہتے ہیں ۔لیکن یاد رہے کہ ارباب تکوین کی مذمت کرنا روا نہیں۔ کیونکہ وہ بھی اللہ کے دوست ہوتے ہیں لیکن معذور اور مجبور ہوتے ہیں۔

ترجمہ لیکن میرے دل میں انکا بہت احترام ہے ۔ اگرچہ ان کا طریق کسی طور پر مستقیم نہیں ہے اور ان کا حال کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اور ان کے حال میں فتنے بہت ہیں (یعنی عوام گمراہ ہو سکتے ہیں)۔ لیکن مجھے اپنے ابتدائی مکاشفات میں ان سے بہت تقویت پہنچی ہے اور کافی دلائل و براہین ملے۔ اس سے قبل میں نے ان کے کلمات کی تشریح میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں ان کے مقامات کی بلندی اور حال کی صحت ثابت کی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنی کتاب منہاج الدین میں بھی جسکا ذکر پہلے ہو چکا ہے ان کے حال کی ابتدا اور انتہا بیان کی ہے اور یہاں بھی قدرے بیان کر دیا ہے پس جس طریق کے متعلق اس قدر اعتراضات وارد ہو چکے ہوں اس کی اقتدا کس طرح روا رکھی جا سکتی ہے۔ نفسانی

خواہشات (ہوا) اور حقیقت یکجا نہیں ہو سکتی۔ نفسانی خواہش ہمیشہ اس تلاش میں ہوتی ہے۔ کہ نافرمانی کا کوئی جواز نکل آئے اور وہ اس کا سہارا لے سکے۔ (مثلاً) وہ کہتے ہیں کہ **الا السنتہ مستنطقات تحت نطقھا مستھلکات صامتات** (بولتی ہوئی زبانوں میں تباہ کن عبارات ہوتی ہیں خاموش دلوں کے لئے) یعنی عبارات تمام آفت ہوتی ہیں اور حقیقت بیانی میں الفاظ بیکار ہیں۔ کیونکہ جب حقیقت حاصل ہے تو عبارت سے ضائع نہیں ہوتی اور جب حقیقت مفقود (غیب) ہوتی ہے تو عبارت (الفاظ) سے حاصل نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے کہ درمیان میں وہم آجائے اور طالب کو ہلاک کر دے اور وہ خالی عبارت کو سمجھے کہ یہ حقیقت ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابراھیم بن احمد خواص رحمتہ اللہ علیہ

سرہنگِ متوکلان (متوکلین کے سردار) و سالارِ **مستسلمان** (ارباب تسلیم و رضا کے سردار) حضرت ابواسحاق ابراہیم بن احمد خواص رحمتہ اللہ علیہ توکل میں بلند مقام اور عظیم شان رکھتے تھے۔ آپ نے بہت سے اکابرین مشائخ کی صحبت پائی ہے۔ آپ بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے اور طریقت پر آپ نے بہت کتابیں لکھی ہیں۔

اقوال آپ فرماتے ہیں **العلم کلہ فی کلمتین لا تتکلف فیما کفیت ولا تضیع ما استکفیت** "سارا علم دو لفظوں میں ہے اول یہ کہ جو کچھ حق تعالیٰ نے تیرے لئے مقدر کیا ہے اس میں فکر مت کر دوم یہ کہ جس کام کا تجھے حکم ملا ہے اس میں کوتاہی مت کر"۔ تاکہ دنیا و عقبیٰ میں خوش رہے۔ اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ اپنی تقدیر میں فکر نہ کر۔ کیونکہ جو کچھ تیری قسمت میں ازل سے لکھا جا چکا ہے تیرے فکر سے تبدیل نہ ہو گا اور حق تعالیٰ کے حکم بجا لانے میں کوتاہی نہ

کر کیونکہ نافرمانی کی سزا ملتی ہے۔

کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے عجائب میں سے کیا دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ویسے تو میں نے بہت عجائب دیکھے ہیں لیکن سب سے زیادہ عجیب یہ بات ہے کہ ایک دفعہ پیغمبر خضر علیہ السلام نے مجھ سے درخواست کی کہ مجھے اپنی صحبت میں رہنے دو۔ لیکن میں نے یہ بات قبول نہ کی۔ لوگوں نے جب اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے اُن سے بہتر رفیق کی ضرورت تھی بلکہ وجہ یہ ہے کہ مجھے ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو کہ حق تعالیٰ کی بجائے مجھے اُن پر اعتماد ہو جائے اور میرے توکل کو نقصان پہنچے اور نوافل میں مشغول ہو کر فرائض سے محروم رہ جاؤں۔ یہ ان کے کمال کی علامت ہے۔

حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

محرمِ سراپردۂ تمکین، (مقامِ تمکین کے محرم راز) و اساسِ اہل یقین (اہل یقین کے سہارا) حضرت ابو حمزہ بغدادی البزاز رحمتہ اللہ علیہ اکابرین و متکلمین مشائخ میں سے تھے۔ (متکلمین بمعنی ماہرین علم الکلام) ۔ آپ حضرت حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے اور حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ اور خیر النساجؒ کے ہم عصر تھے۔ آپ نے بڑے بڑے مشائخ سے فیض صحبت حاصل کیا اور مسجد رصافہ میں وعظ کیا کرتے تھے۔ آپ علمِ تفسیرِ قرآن میں ماہر فن اور احادیث نبویؐ کے راوی تھے۔ آپ وہی ہیں کہ جنہوں نے حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کی معیبت کے وقت آپ کا ساتھ دیا اور خداوند تعالیٰ نے سب کو نجات دلائی اس حکایت کی تفصیل حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کے بیان میں آئی ہے۔

اقوال آپ فرماتے ہیں کہ **اذا سلمت منک نفسک فقد ادیت حقها واذا سلم منک الخلق فقضیت حقوقهم** "جب تیرا نفس تجھ سے سلامت رہا تو تو نے اس کا حق ادا کر دیا۔جب خلقِ خدا تجھ سے سلامت رہی تو تو نے اس کا حق ادا کر دیا"۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ حقوق دو ہیں ایک تیرے نفس کا تجھ پر حق' دوسرے خلق کا حق تجھ پر۔ جب تو نے اپنے نفس کو گناہ سے بچایا اور آخرت میں اس کو نجات دلائی تو اس کا حق ادا ہو گیا اور جب تو نے خلق خدا کو اپنی برائی سے بچایا اور ان کی بدخواہی نہ کی تو تو نے خلق کا حق ادا کر دیا۔ اپنے نفس اور خلق کے حقوق ادا کرنے کے بعد اب تو حق تعالیٰ کا حق ادا کرنے کی کوشش کر۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو بکر محمد بن موسیٰ واسطی رحمتہ اللہ علیہ

اندر فنِ خود امام ' و عالی حال و لطیف کلام حضرت ابو بکر محمد بن موسیٰ واسطی رحمتہ اللہ علیہ مشائخ محققین میں سے تھے اور آپ کا مقام بہت بلند اور شان بہت عظیم تھی۔ آپ جملہ مشائخ کے پسندیدہ تھے۔ اور حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے قدیم اصحاب میں سے تھے۔ آپ کے اقوال ایسے دقیق ہیں کہ علمائے ظواہر کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ آپ کسی مقام پر زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے تھے۔ جب آپ شہر مرو تشریف لے گئے تو اہل مرو نے آپ کو کمالات کی وجہ سے سر آنکھوں پر رکھا اور آپ کا کلام سنا اور آپ مدت تک وہاں مقیم رہے۔

اقوال آپ فرماتے ہیں کہ **الذاکرون فی ذکره اکثر غفلته من الناسین لذکره** "ذاکر اپنے ذکر کے وقت زیادہ غافل ہوتے ہیں بہ نسبت ذکر نہ کرنے والوں کے"۔ اس کا مطلب یہ ہے اگر خدا کو یاد رکھے لیکن بیٹھ کر ذکر میں مشغول نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن جب ذکر کرے اور دل میں خدا کا خیال نہ

ہو تو یہ نقصان کی بات ہے۔

شرح اس قول کے دو معنی ہیں ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ ظاہری مطلب یہ ہے کہ ذکر کرتے وقت اگر دل میں وساوس آئیں اور دوسری باتوں کا خیال دل میں غالب رہے تو اس سے بہتر وہ شخص ہے جو بیٹھ کر ذکر تو نہ کرے لیکن دل میں یاد خدا موجود رہے۔ باطنی معنی یہ ہیں کہ جس شخص کو مقام فنا فی اللہ حاصل ہے اور دائمی طور پر اس میں مستغرق رہتا ہے تو خواہ وہ زبان سے ذکر نہ کرے، اس شخص سے بہتر ہے جس کو مقام فنا حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس کی زبان پر ذکر جاری ہے۔ بات یہ ہے کہ جب دل میں خدا بس جاتا ہے (یعنی مقام فنا حاصل ہو جاتا ہے) تو زبان بند ہو جاتی ہے کیونکہ مستی میں غرق ہے تو اسم کیسے زبان پر آسکتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مجنوں لیلیٰ لیلیٰ اس وقت پکارتا تھا جب لیلیٰ کے فراق میں جلتا تھا لیکن لیلیٰ کے سامنے بیٹھ کر وہ کیوں لیلیٰ لیلیٰ پکارے۔ یہ ہے لیلیٰ کے سامنے مقام حضوری۔ لیکن حق تعالیٰ کے ساتھ مقام فنا فی اللہ حضوری سے بھی زیادہ انہماک اور استغراق کا باعث ہوتا ہے اور بات کرنا محال ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ذکر لسانی سے کئی درجہ اعلیٰ و ارفع مقام ہے۔ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات جب کوئی شخص میرے سامنے اللہ کہتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس کے سر پر ڈنڈا ماروں۔ اور بعض اوقات یہ حالت ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے اس کے منہ میں شکر دے دوں۔ اول حالت، حالتِ فنا ہے دوم حالتِ بقا ہے۔

ترجمہ نقصان کی بات یہ ہے کہ اللہ کے ذکر میں زبان تو جاری ہو لیکن قرب و وصال حق نصیب نہ ہو۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اللہ کا قرب و حضوری حاصل ہو خواہ زبان پر ذکر جاری نہ ہو۔ حالت وصال (فنا) میں زبان کا ذاکر نہ ہونا اس سے بہتر ہے کہ زبان پر ذکر جاری ہو اور وصال حاصل نہ ہو۔ جو سالک ذات حق

میں فانی ہوتا ہے اسے اپنی خبر نہیں ہوتی لیکن جس ذاکر کو اپنی ہستی کا احساس ہوتا ہے، وہ خدا سے مجور ہوتا ہے۔ اس لئے اس ذاکر سے وہ خاموش بہتر ہے جو ذات حق میں فنا ہے کیونکہ طالب حق کے لئے اپنی ہستی کا احساس بہت مضر ہے۔ جس قدر اپنی ہستی کا احساس زیادہ ہو گا حق تعالیٰ اسی قدر دور ہو گا اور اپنی ہستی کا احساس جس قدر کم ہو گا حق سے زیادہ قریب ہو گا اور یہ اپنی ہستی کا احساس عقل و شعور کی وجہ سے ہوتا ہے اور عقل و شعور کی بنیاد نفس ہے۔ لہٰذا تزکیۂ نفس کے بعد احساس و شعور خودی کم ہو جاتا ہے۔ جس سے قرب حق میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرب حق میں پہنچ کر ذکر لسانی ختم ہو جاتا ہے اور ذکر کی بجائے جو حالت یا مقام حاصل ہوتا ہے وہ مشاہدہ کہلاتا ہے لیکن جو ذاکر حق سے غیب ہو گا وہ خود سے حاضر ہوتا ہے۔ جس کا دوسرا نام احساس خودی ہے کیونکہ قرب حق میں (یعنی مقام فنا فی اللہ میں) احساسِ خودی مٹ جاتا ہے یا بہت تھوڑا ہوتا ہے۔

شرح یہ عبارت بہت ادق ہے کیونکہ اس کا تعلق فنا فی اللہ اور قرب و وصال حق سے ہے۔ جب تک انسان کو یہ مقام حاصل نہ ہو یا کسی حد تک اس میں ذاتی طور پر رسائی نہ ہو اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ اس لئے بعض اردو ترجموں اور ڈاکٹر نکلسن کے انگریزی ترجمہ میں اس قسم کی ادق عبارتوں کا لفظی ترجمہ کر کے مبہم کر دیا گیا ہے اور مطلب بالکل فوت ہو جاتا ہے۔ موجودہ ترجمہ اور شرح میں ہم نے لفظی ترجمہ کی بجائے تصوف کی مروجہ اصطلاحات سے کام لیا ہے جن کا سمجھنا قدرے آسان ہو گیا ہے۔

حضرت ابو بکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ

سکینہ احوال و سفینہ مقال (قال اور حال کے دھنی) حضرت ابو بکر بن دلف

بن جدار شبلیؒ کا شمار اکابرین مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ بڑے متقی و پرہیزگار تھے اور آپ کے اقوال میں اشارات لطیف اور اقوال قابل تعریف ہیں۔ چنانچہ متاخرین میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ تین چیزیں عجائبات دنیا میں سے ہیں اول اشارات شبلی رحمتہ اللہ علیہ دوم نکات مرتعش رحمتہ اللہ علیہ ' سوم حکایات جعفر رحمتہ اللہ علیہ ۔ آپ سالارِ طائفۂ صوفیاء اور سردارِ اہلِ طریقت ہیں۔ ابتداء میں آپ خلیفہ وقت کے حاجب تھے آپ نے حضرت خیرالنساج رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر توبہ کی اور حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ کو بہت مشائخ کا فیض صحبت حاصل ہوا ہے۔

اقوال آپ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے کلام قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ "مومنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں" کا مطلب یہ ہے کہ سر کی آنکھوں کو نظر شہوت سے اور دل کی آنکھوں کو غیر اللہ سے باز رکھیں۔ نظر شہوت یعنی غیر محرم کو دیکھنا غفلت کا نتیجہ ہے اور اہل غفلت کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اپنے عیبوں سے جاہل ہوتے ہیں اور جو شخص اس دنیا میں جاہل ہے آخرت میں بھی جاہل ہو گا جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى "جو شخص اس جہان میں نابینا ہے آخرت میں بھی نابینا ہو گا" ۔ اور اصل بات یہ ہے کہ جب تک حق تعالیٰ کسی کے دل کو شہوات نفسانی سے پاک نہ کرے ' جسمانی آنکھیں شہوت کی نگاہ سے باز نہیں آسکتیں اور جب تک حق تعالیٰ کسی کے دل کی آنکھوں کو غیر اللہ کے نظارہ سے محفوظ نہ رکھے وہ محفوظ نہیں ہو سکتیں۔

نیز آپ فرماتے ہیں کہ میں تمہارے نزدیک مجنون ہوں اور تم میرے نزدیک ہوشیار ہو۔ خدا میرے جنوں اور تمہاری ہوشیاری کو زیادہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ میرا جنوں محبت کی شدت کی وجہ سے ہے اور تمہاری

محبت تمہاری غفلت کی وجہ سے ہے۔ خدا تعالٰی سے دعا ہے کہ میرے جنوں میں برکت دے تاکہ مجھے زیادہ سے زیادہ قرب حاصل ہو اور تمہاری ہوشیاری میں برکت دے تاکہ تمہارے بُعد (دوری و مجبوری) میں اضافہ ہو اور یہ بات آپ نے غصے کی وجہ سے کہی۔ کیونکہ ایسے لوگ بھی ہیں جو دوستی اور دیوانگی میں فرق بھی نہیں کر سکتے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر خالدیؒ

حاکی احوال اولیاء بالطف اقوال (اقوال اولیاء کو خوبی سے بیان کرنے والے) حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر خالدیؒ، حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے اصحاب کبار میں سے تھے۔ آپ علم طریقت میں تبحر تھے اور کلام مشائخ کے بہترین پاسدار اور ان کے آداب کے بہترین محافظ تھے۔ آپ کے اقوال طریقت بہت بلندپایہ ہیں۔ آپ نے ہر مضمون میں رعونت نفس ظاہر کرنے کیلئے حکایات بیان کی ہیں اور باقاعدہ کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔

فضیلتِ توکل

آپ فرماتے ہیں کہ **التوکل استواء القلب عند الوجود والعدم** "توکل یہ ہے کہ رزق ملے یا نہ ملے قلب کو فکر لاحق نہ ہو" یعنی رزق حاصل کر کے خوش نہ ہو اور اس کے نہ ہونے سے مغموم نہ ہو۔ کیونکہ ہمارا یہ جسم مالک حقیقی کی ملکیت ہے اور اس کی پرورش یا ہلاکی کے متعلق حق تعالٰی تجھ سے بہتر سوچ سکتا ہے وہ جس طرح تجھے رکھے راضی رہ اور اس میں کوئی دخل نہ دے ملک مالک کے حوالہ کر دے اور اس کے اندر تو کوئی تصرف نہ کر۔

حضرت جنیدؒ کی صحت کیلئے دعا اور حق تعالیٰ کا جواب

آپ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس گیا اور دیکھا کہ بخار میں مبتلا ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اے استاد خدا تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ آپ کو صحت دے۔ آپ نے فرمایا گذشتہ رات میں نے یہی دعا مانگی تو آواز آئی کہ تمہارا جسم ہماری ملکیت ہے ہماری مرضی ہم اسے تندرستی دیں یا بیمار کریں تو کون ہے ہمارے اور ہمارے ملک کے درمیان دخل دینے والا۔ اپنا تصرف (دخل اندازی) بند کر اور بندہ بن کر رہ۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو علی رودباری رحمتہ اللہ علیہ

شیخِ محمود و معدنِ جود (ہر دلعزیز بزرگ اور جود و سخا کی کان) حضرت ابو علی محمد بن قاسم رودباری رحمتہ اللہ علیہ بڑے جوانمرد صوفی اور شیخ المشائخ وقت تھے آپ اپنے علاقے کے امراء میں سے تھے اور علوم و فنون میں آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ آپ کی کرامات اور مناقب بہت ہیں۔ اور حقائق و معارفِ طریقت میں آپ کا کلام بہت لطیف ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ **المرید لا یرید لنفسہ الا ما اراد اللہ لہ والمراد لا یرید من الکونین شیئا غیرہ** "مرید وہ ہے جو اپنے لئے کچھ نہ چاہے سوائے اس کے کہ جو کچھ اللہ اس کے لئے چاہتا ہے اور مراد وہ ہے جو کائنات میں سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی چیز نہیں چاہتا ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ مرید وہ ہے جو حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہے۔ کیونکہ محب وہ ہے جو اپنا ارادہ نہ رکھے بلکہ اپنے ارادہ کو ارادۂ حق تعالیٰ میں فنا کر دے۔اور جو شخص حق تعالیٰ کو چاہتا ہے' وہی پسند کرتا ہے جو اللہ اس کے لئے چاہتا ہے۔ اور مراد وہ ہے جسے حق تعالیٰ چاہتا ہے۔ اس لئے مراد سوائے حق کے اور کسی کو نہیں چاہتا۔ پس حق تعالیٰ کی رضا پر

راضی ہونا طالب کے ابتدائی مقامات میں سے ہے اور حق تعالیٰ کے ساتھ محبت طالب کے انتہائی احوال میں سے ہے۔ مقامات کا تعلق عبودیت سے ہے اور احوال کا تعلق ربوبیت سے ہے۔ جبکہ معاملہ یہ ہے کہ مرید (یعنی صاحب مقامات) اپنے آپ سے قائم ہوتا ہے (یعنی اپنی عبودیت میں مستحکم ہوتا ہے اور باقی باللہ کہلاتا ہے) اور مراد حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے (یعنی فانی فی اللہ ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے)۔

شرح اصطلاحات مرید اور اور مراد کی پہلے بھی تشریح ہو چکی ہے یعنی مرید وہ ہے جو اللہ کا طالب ہو اور مراد اس کو کہتے ہیں جس کا خود اللہ طالب (عاشق) ہو یہ بہت بڑا درجہ ہے اور یہ مقامات مرید و مراد قرآن کی آیات سے ثابت ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

باقی رہا احوال و مقامات میں فرق۔ احوال جمع ہے حال کی جو اصحاب فنا فی اللہ پر طاری ہوتا ہے اور وہ محویت تامہ اور سکر و استغراق کا نام ہے۔ مقامات جمع ہے مقام کی۔ حال عارضی ہوتا ہے جو آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ لیکن جب حال میں پختگی آجاتی ہے تو اسے مقام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مقام کا تعلق بقا باللہ سے ہے جس کا دوسرا نام عبودیت ہے۔ لہٰذا حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے صحیح فرمایا ہے کہ مرید مقام عبودیت میں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی خودی سے قائم ہوتا ہے۔ اور مراد چونکہ محبوب ہے وہ ہر وقت مقام فنا (محویت) میں رہتا ہے اور خود نہیں رہتا بلکہ ذات حق کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر مرید باقی باللہ ہوتا ہے اور اپنی انفرادیت پر قائم ہوتا ہے اور مراد فانی فی اللہ ہوتا ہے اور ذات حق میں غرق اور ذات حق سے قائم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی یساریؒ

خزینہ دارِ توحید و سمسارِ تفرید (تفرید کے قطب) حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی الیساری رحمتہ اللہ علیہ کا شمار ائمہ وقت میں ہوتا ہے۔ آپ تمام علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ تھے آپ حضرت ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے اور دیگر مشائخ عظام سے بھی تربیت حاصل کی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے آپ وقت کے اظہر (ظاہر ترین) اور اشرف (بزرگ ترین) اور ازہد (زاہد ترین) شیخ تھے۔ آپ کا کلام بہت بلند اور تصانیف بہت پسندیدہ ہیں۔

توحید کیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ **التوحیدان لا یخطر بقلبک ماذونہ** "توحید یہ ہے کہ سوائے حق تعالیٰ کے تیرے دل پر کوئی خیال نہ گزرے"۔ یعنی مخلوق کا خیال تیرے دل میں نہ آئے اور نہ تیرے اپنے معاملات کا خیال تجھے پریشان کرے۔ کیونکہ غیر کا خیال آنا غیر کی ہستی کو ثابت کرتا ہے اور جب غیر کی ہستی ثابت ہو گئی تو توحید ساقط (ختم) ہو گئی۔

شرح یہ قول بھی وحدت الوجود پر مبنی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہے سب وجود باری تعالیٰ ہے اس سے الگ یا علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی مقامات پر حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ وحدت الوجود ثابت کر چکے ہیں۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ کھل کر اس مضمون کی تشریح نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں جب شیخ اکبر ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی کھلم کھلا وضاحت کی تو دیگر مشائخ عظام نے بھی زبان بندی ترک کی اور کھل کر اس حقیقت کا اعتراف کیا۔

ترجمہ آپ خاندانی امیر تھے اور مرو کے علاقے میں آپ کے خاندان سے

بڑھ کر جاہ و منزلت میں کوئی خاندان نہیں تھا۔ آپ کو اپنے والد سے بے شمار دولت ورثہ میں آئی لیکن آپ نے سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو موئے مبارک کے عوض دے دیا۔اس وجہ سے حق تعالیٰ نے آپ کو روحانی دولت سے مالا مال فرمایا اور حضرت ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت نصیب فرمائی۔ ان کے فیض صحبت سے آپ کو وہ درجہ ملا کہ اولیاء کرام کے امام بن گئے۔ اور آپ نے وصیت کی کہ جب میرا انتقال ہو تو یہ دونوں بال میرے منہ کے اندر رکھ دینا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک آپ کے مزار مبارک میں وہ اثر موجود ہے کہ جو شخص حاجت لے کر جاتا ہے پوری ہوتی ہے۔ بہت مجرب ہے۔

شرح اس سے بھی حضرت مخدوم سید علی ہجویری قدس سرہٗ کا یہ عقیدہ ثابت ہوا کہ اصحاب قبور سے بھی کرامات ممکن ہیں اور مرادیں پوری ہوتی ہیں۔

حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ

تصوف میں اپنے وقت کے امام ' حضرت ابو عبداللہ محمد بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ تمام علوم اسلامیہ میں بھی اپنے وقت کے امام تھے۔ آپ کا مجاہدات میں بلند مرتبہ تھا اور حقائق بیانی میں آپ بہت مشہور تھے۔ تصانیف آپ کی بہت پسندیدہ تھیں۔ آپ حضرت ابن عطاؒ' ابوبکر شبلیؒ اور حسین بن منصورؒ کے صحبت یافتہ تھے۔ نیز مکہ مکرمہ میں آپ کو حضرت یعقوب نہرجوری رحمتہ اللہ علیہ کا فیض صحبت بھی حاصل ہوا۔ آپ ایک دولت مند خاندان کے فرد تھے لیکن دنیاوی زندگی سے تائب ہو کر آپ نے درویشی اختیار کی اور کافی عرصہ سفر کی تنہائی میں زندگی بسر فرمائی۔ اہل معرفت کے ہاں آپ کا بہت احترام پایا جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ **التوحید الاعراض عن الطبعتہ** "توحید نام ہے نفسانی خواہشات سے اجتناب کا" کیونکہ جہاں نفس کا غلبہ آیا حق تعالیٰ سے دور

ہوا اور دنیا کی نعمتوں نے اسے اندھا کیا۔ لہٰذا جب تک نفس کی نافرمانی نہیں کی جاتی حق کی فرمانبرداری نہیں ہوتی۔ اہل نفس حق تعالیٰ سے محجوب ہوتے ہیں۔ جس نے نفس سے نجات پائی حق سے واصل ہوا۔ آپ کے کلمات بہت بلند اور کرامات مشہور ہیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو عثمان مغربی رحمتہ اللہ علیہ

سیفِ سیادت، و آفتابِ نجابت حضرت ابو عثمان سعید بن سلام مغربیؒ کا شمار اولیائے تمکین میں ہوتا ہے۔ علوم و فنون میں آپ مہارت کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ ریاضت میں مشہور اور آفات نفس سے آگاہ تھے۔ آپ کے کلمات بہت بلند اور کرامات مشہور ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو شخص درویشوں کی مجالست ترک کرکے امراء کی صحبت اختیار کرتا ہے حق تعالیٰ اسے موت القلب (دل کی موت) میں مبتلا کرتا ہے۔ مجالست اور صحبت میں فرق ہے۔ مجالست کا مطلب ہے کبھی کبھار درویشوں کے پاس بیٹھنا۔ اور صحبت کا مطلب یہ ہے کہ درویشوں کی خدمت اختیار کرلینا۔ اور اسے اپنا شعار بنالینا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درویشوں سے وہی شخص اجتناب کرسکتا ہے جو ان کی مجلس میں نہ بیٹھا ہو۔ لیکن جس شخص کو ان کی صحبت مل جاتی ہے وہ کبھی نہیں چھوڑتا اس لئے جب درویشوں کو چھوڑ کر امراء کی صحبت اختیار کرتا ہے تو اس کا دل مردہ ہوجاتا ہے حرص کی وجہ سے۔ اور اس کا دماغ غرور سے بھر جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب درویشوں کی مجالست کے ترک کرنے سے دل مردہ ہوجاتا ہے تو ان کی صحبت ترک کرنے میں کیا آفت ہوگی۔ بہرحال اس سے مجالست (عارضی آمد و رفت) اور صحبت (دائمی ہمراہی) میں فرق ظاہر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابراہیم بن محمد نصر آبادی رحمتہ اللہ علیہ

مبارزِ صفِ صوفیاں (صوفیوں کے سپہ سالار) معبرِ احوالِ عارفان (عارفوں کے حال جاننے والے) حضرت ابوالقاسم ابراہیم بن محمدؒ بن محمود نصر آبادیؒ نیشاپور میں ایسے معزز تھے جیسے بادشاہ۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ بادشاہ دنیا میں معزز تھے اور آپ آخرت میں۔ آپ کا کلام بہت لطیف اور تصرفات بہت ظاہر تھے۔ آپ حضرت ابوبکر شبلیؒ کے مرید اور خراسان کے اولیاء متأخرین کے استاد تھے۔ اور اپنے وقت میں آپ یگانۂ روزگار تھے۔ آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے زاہد تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :

"تم دو نسبتوں کے درمیان ہو۔ ایک نسبت (تعلق) تمہارے اپنے جسم (بشریت) کے ساتھ ہے دوسری نسبت حق تعالیٰ کے ساتھ۔ نسبت بشریت تجھے آفات اور ذلت میں مبتلا کرتی ہے کیونکہ یہ بشریت کا تقاضا ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (انسان ظلومی اور جہولی واقع ہوا ہے) اور جب تو حق تعالیٰ کے ساتھ نسبت (تعلق) مضبوط کرے گا تو مقامات کشف و کرامات، عصمت اور ولایت پر پہنچ جائے گا۔ کیونکہ یہ تیری عبودیت کا تقاضا ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (اللہ کے ایسے بندے ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں)۔ جسم کا تعلق موت پر ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اور اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ نسبت بشریت کا کمال یہ ہے کہ انسان کہتا ہے کہ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ (اے میرے رب میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا) اور نسبت حق کا کمال یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندہ سے فرماتا ہے يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (اے میرے بندے آج تجھے کوئی خوف نہیں ہے)۔ واللہ اعلم

بالصواب۔

حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم حصریؒ

سرورِ سرِ سالکانِ طریقِ حق (طالبان حق کے سرکاروسرور) و جمال جانہائے اہل تحقیق حق (اہل تحقیق کی جان و جمال) حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم الحصریؒ کا شمار مقربین بارگاہ حق تعالیٰ اور مشائخ کبار میں ہوتا ہے۔ آپ یگانۂ روزگار تھے۔ آپ کا کلام حقائق و معارف سے لبریز ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ کیا تم آدم زاد نہیں ہو۔ وہ آدم جس کو حق تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے بنایا' اس میں اپنی روح پھونکی اور پھر مسجود ملائک بنایا۔ لیکن جب حق تعالیٰ نے اس کو ایک کام کرنے کا حکم دیا تو اس نے اس کا خلاف کیا۔ پس جس کی ابتداء یہ ہو اس کی انتہا کیسی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو نافرمانی کرتا ہے اور جب حق تعالیٰ کی عنایت شامل حال ہوتی ہے تو ہمہ تن محبت بن جاتا ہے۔ اب اپنی حالت کا مقابلہ کرو حق تعالیٰ کی عنایت کے ساتھ۔ اور اسی حال میں ساری زندگی گزار دو۔ یہ ہے مختصر ذکر تبع تابعین صوفیاء کرام کا۔ اب متأخرین کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بادہ از ماست شد نے ما ازو

قالب از ماہست شد نے ما ازو

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خُدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنُما
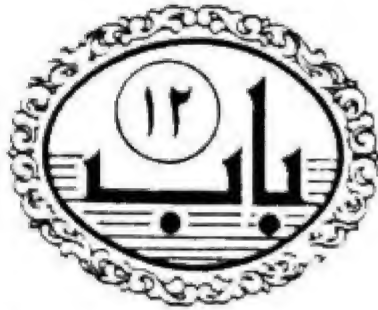
ائمہ متاخرین رحمۃ اللہ علیہم کے بیان میں

جاننا چاہئے خدا تجھے خیر و برکت دے کہ ہمارے زمانے میں لوگوں کا ایک گروہ ہے جو ریاضت اور مجاہدات کی طاقت نہیں رکھتے اور بغیر محنت جاہ و مرتبہ کے خواہشمند ہیں اور تمام اہل اللہ کو اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب ان کے حالات سنتے ہیں اور ان کی بزرگی اور عظمت کے واقعات دیکھتے ہیں اور اپنے آپ کو ان کے مطابق نہیں پاتے تو ان کا ذکر ترک کر دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان کا زمانہ اور تھا' ہمارا زمانہ اور ہے' آج کل ان جیسی ہستیاں کیسے پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ حق تعالیٰ ہرگز کرۂ زمین کو بغیر حجت نہیں چھوڑتا اور اس امت کو اولیاء اللہ سے خالی نہیں کرتا۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ **لا یزال طائفتہ من امتی علی الخیر و الحق حتی تقوم الساعتہ** (میری امت ہرگز ایسے لوگوں سے خالی نہ ہوگی جو قیامت تک خیر اور حق پر ہوں گے)۔ نیز فرمایا **لا یزال فی امتی اربعون علی خلق ابراہیم** (میری

امت میں ہمیشہ چالیس مردان خدا حضرت ابراہیم کی خصلت پر ہوں گے)۔ جن حضرات کا اب ہم ذکر کرنے والے ہیں ان میں سے بعض اس جہان فانی سے کوچ کر گئے ہیں اور بعض موجود ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و علیٰ جمیع مسلمین و المسلمات برحمتہٖ (حق تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے ان سے اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں سے راضی رہے)۔

حضرت ابو العباس قصاب رحمتہ اللہ علیہ

طرازِ طریق ولایت' و جمال جمیع اہل ہدایت حضرت ابوالعباس احمد بن محمدؒ قصابؒ کو ماوراء النہر کے مشائخ عظام کا فیضِ صحبت حاصل ہوا ہے۔ آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ اور میدانِ فراست' کرامت اور زہد و تقویٰ میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ ابو عبداللہ خیاطؒ جو امام طبرستان تھے فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے برگزیدہ لوگوں میں سے ایک حضرت ابوالعباس قصابؒ ہیں کہ جن کو حق تعالیٰ نے ظاہری علم کے حصول کے بغیر اصولِ دین اور حقائقِ توحید میں وہ مقام عطا فرمایا ہے کہ ہمیں جو مشکل مسئلہ پیش آتا ہے ان سے پوچھتے ہیں۔ آپ اُمّی محض (بالکل ان پڑھ) تھے۔ لیکن رموزِ طریقت میں آپ کا کلام اس قدر بلند ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آپ ابتداء سے انتہائے عمر تک نیکو کار اور نیکو سیرت رہے۔ آپ کی حکایات بیشمار ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارا مقصد اختصار ہے' یہاں کچھ نہ کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شہر آمل کے بازار میں ایک لڑکا اونٹ کی باگ پکڑے جارہا تھا۔ چونکہ اونٹ پر بوجھ بہت زیادہ تھا۔ اس کا پاؤں کیچڑ پر پھسل گیا جس سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے چاہا کہ اس (اونٹ) کا بوجھ اتار لیں لیکن لڑکا بہت بے تابی سے رو رہا تھا۔ اتفاقاً حضرت ابوالعباسؒ کا وہاں سے گزر ہوا آپ نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ لوگوں نے بتایا کہ اونٹ کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔

آپ نے اونٹ کی باگ پکڑ کر آسمان کی طرف منہ کیا اور عرض کیا بار خدایا اس اونٹ کی ٹانگ ٹھیک کردے کیونکہ قصاب کا دل بچے کے رونے سے جلا جارہا ہے۔ یہ کہنا تھا کہ اونٹ کی ٹانگ ٹھیک ہوگئی اور وہ کھڑا ہوگیا اور لڑکا اسے لے کر چلا گیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ خلق خدا کو چاہئے کہ برضا و رغبت یا بالجبر حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے کی خو پیدا کرے۔ ورنہ ہمیشہ رنج و غم میں مبتلا رہے گا۔ کیونکہ جب تو اس کی رضا پر راضی ہوگا تو اس کی دی ہوئی مصیبت بھی تجھے رحمت محسوس ہوگی۔ لیکن اگر تو راضی برضا نہیں ہوگا تو مصیبت میں تجھے بے حد تکلیف ہوگی۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے جو ہمارے مقدر میں لکھ دیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اس لئے جو شخص رضائے حق پر راضی رہتا ہے خوش رہتا ہے اور جو راضی نہیں رہتا بے قرار رہتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو علی دقاق رحمتہ اللہ علیہ

لسانِ مریدان و برہانِ محققان حضرت ابو علی بن حسین بن محمدؒ دقاقؒ اپنے فن کے امام اور یگانۂ روزگار تھے۔ حقائق طریقت میں آپ کا بیان بہت واضح اور آپ کی زبان بہت فصیح تھی۔ آپ نے بیشمار مشائخ کی صحبت پائی اور فیض حاصل کیا۔ آپ حضرت نصر آبادیؒ کے مرید تھے اور وعظ کیا کرتے تھے۔

آپ فرماتے ہیں کہ **من انس بغیرہ ضعف فی حالہ و من نطق من غیرہ کذب فی مقالہ** (جس نے بغیر حق کے کسی سے دل لگایا اس کا حال ضعیف ہوا اور جس نے حق تعالیٰ کے بغیر کسی چیز کا تذکرہ کیا اس نے جھوٹ بولا)۔ کیونکہ غیر سے دل لگانا قلتِ معرفت کی دلیل ہے اور حق تعالیٰ سے محبت کرنا غیر سے وحشت پیدا کرتا ہے اور غیر سے وحشت زدہ غیر کا ذکر نہیں کرتا۔ ایک

بزرگ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں ان کی مجلس میں یہ سوال لے کر پہنچا کہ توکل کیا چیز ہے۔ اس وقت ایک نہایت قیمتی دستار ان کے سر پر تھی۔ اور میرے دل میں اس کی خواہش پیدا ہوئی۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ یا شیخ توکل کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ توکل یہ ہے کہ کسی کی دستار کا طمع نہ کرے۔ یہ کہ کر انہوں نے اپنی دستار میرے سامنے پھینک دی۔

حضرت ابوالحسن خرقانی رحمتہ اللہ علیہ

شرفِ اہلِ زمانہ' و اندر زمانہ خود یگانہ حضرت ابوالحسن علی بن احمد خرقانیؒ کا شمار اکابر اور متقدمین مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ اپنے زمانے کے اولیاء کرام میں ہردلعزیز تھے۔ حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے آپ کی زیارت کا قصد کیا۔ اور ہر فن پر بہت لطیف گفتگو ہوئی۔ جب رخصت ہونے لگے تو حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا کہ میں نے تجھے اپنے زمانہ کی ولایت پر تعینات کیا ہے اور حسن مؤدبؒ سے جو حضرت ابوسعیدؒ کے خادم تھے میں نے سنا ہے کہ جب آپ حضرت ابوالحسن خرقانی کی خدمت میں پہنچے تو کوئی بات نہ کی اور خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ فراغت کے بعد میں نے عرض کیا کہ یا شیخ آپ نے کیوں بات نہ کی۔ فرمایا کہ سلسلہ کلام شروع کرنے کے لئے ایک بولنے والا کافی ہوتا ہے۔

شرح بعض اوقات مشائخ کی باہمی گفتگو خاموشی میں ہوتی ہے جیسے حضرت شیخ اکبر ابن عربیؒ اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے درمیان زبان سے کوئی گفتگو نہ ہوئی لیکن باطنی طور پر باتیں ہوتی رہیں۔ یہاں بھی آپ کا خاموشی سے باتوں کا جواب دینا معلوم ہوتا ہے۔

ترجمہ استاذ ابوالقاسم قشیری رحمتہ اللہ علیہ سے میں نے سنا ہے کہ جب میں ملک خراسان میں پہنچا تو اس پیر کی ہیبت سے میری فصاحت و بلاغت نے جواب

شرح اس قول کا مطلب یہ ہے جب سالک اپنے وجود کی نفی کر لیتا ہے تو وہ گم ہوجاتا ہے اور حق موجود ہوتا ہے۔ اس لئے توحید (وجود کا ایک ہونا' جسے وحدت الوجود کہتے ہیں) قائم ہوگئی۔ لیکن جب سالک اپنا وجود ثابت کرتا ہے تو توحید مفقود ہوجاتی ہے یعنی دوئی اور کثرت قائم ہوجاتی ہے۔ اپنے وجود کے گم کرنے کو فنا فی اللہ اور اپنے وجود میں واپس آنے کو تصوف کی اصطلاح میں بقا باللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ دونوں حالتیں سالک راہ حقیقت پر آتی رہتی ہیں۔ کبھی مقام فنا میں ہوتا ہے کبھی مقام بقا میں۔ لیکن اس سے بھی بلند وہ مقام ہے کہ جب بیک وقت سالک فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ اس مقام کو جامعیت کہتے ہیں۔ یعنی بیک وقت واصل بھی ہوتا ہے اور مہجور بھی۔ جیساکہ سعدیؒ نے فرمایا ہے۔

عجب ایں نیست کہ سرگشتہ بود طالب دوست
عجب این است کہ من واصل و مہجورم

ترجمہ شیخ سلگیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ بسطام میں ٹڈی کا حملہ ہوا جس سے تمام فصل اور درخت سیاہ ہوگئے۔ اور لوگوں کو سخت صدمہ ہوا۔ شیخ اٹھ کر مکان کی چھت پر گئے اور آسمان کی طرف منہ کیا۔ اس سے فوراً تمام ٹڈیاں اڑ گئیں اور عصر کی نماز تک ایک بھی باقی نہ رہی۔

حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ

شہنشاہِ محباں (عاشقوں کے بادشاہ) و ملک الملوک صوفیاء (صوفیوں کے سردار) حضرت شیخ ابوسعید فضل اللہ بن محمد مہینی رحمتہ اللہ علیہ سلطانِ وقت اور جمالِ طریقت تھے اور سارا جہاں آپ کا فرمانبردار تھا۔ بعض لوگ آپ کے دیدار

سے خوش تھے اور بعض آپ سے خوش اعتقاد تھے اور بعض آپ کی بدولت صاحب حال بن چکے تھے۔ آپ تمام علوم و فنون میں کمال رکھتے تھے اور حقائق و معارف میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی کرامات و تصرفات کا شمار نہیں تھا۔ چنانچہ آجکل تک ان کی عظمت ظاہر ہے۔ ابتداء میں آپ طلب علم کے لئے اپنے گاؤں مِنہ سے سرخس گئے اور ابو علی زاہدؒ کے ہاں تعلیم شروع کی۔ اور ہر روز تین دن کا سبق پڑھ لیتے اور وہ تین دن عبادت میں صرف کرتے تھے۔ جب امام ابو علی زاہدؒ نے آپ کی یہ حالت دیکھی تو ان کا بہت احترام کرنے لگے۔ اس زمانے میں سرخس کے ولی اللہ شیخ ابوالفضل حسنؒ تھے۔ ایک دفعہ آپ سرخس کی نہر کے کنارے جارہے تھے کہ شیخ ابوالفضلؒ سامنے آگئے اور ابو سعید سے کہا کہ لڑکے تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ اپنے راستہ پر چلا کرو۔ یہ بات ان کے دل میں گھر کرگئی اور اپنی جگہ پر آکر ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہوگئے۔ حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے اُن کو راہ ہدایت بخشی اور بلند درجات عطا فرمائے۔

اللہ کا فقیر بڑا غنی ہوتا ہے

شیخ ابو مسلم فارسیؒ نے مجھے کہا کہ میری ابو سعیدؒ کے ساتھ ہمیشہ خصومت رہتی تھی۔ ایک دفعہ جب میں ان کے پاس گیا میں نے گدڑی پہن رکھی تھی۔ لیکن ان کو دیکھا کہ پلنگ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور شاندار مصری ریشم کی پوشاک زیب تن ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ شخص فقر کا دعوہ کرتا ہے اور امیر ہے اور میں فقیری کا دعویدار ہوں اور مفلس ہوں۔ مجھے ایسے شخص سے کیسے موافقت ہو سکتی ہے۔ ان کو میرے دل کی بات کا علم ہوگیا اور سر اٹھا کر کہا کہ اے ابا مسلم تم نے کس کتاب میں پڑھا ہے کہ جس شخص کا قلب مشاہدۂ حق سے مالا مال ہے اس کو فقیر کہا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصحاب مشاہدہ غنی ہوتے ہیں نہ کہ فقیر۔ اور فقیر وہ ہیں جو ارباب مجاہدہ ہوں۔ یہ سن کر میں اپنے دل میں پشیمان

ہوا۔ اور اس ناپسندیدہ خیال سے توبہ کی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ **التصوف قیام القلب مع اللہ بلا واسطہ** (تصوف نام ہے اللہ کے ساتھ بلا واسطہ دل کے قیام کا)۔ یہ بھی مشاہدۂ حق کی طرف اشارہ ہے۔ اور مشاہدہ غلبۂ محبت' ذوق دیدار اور فنائے نفس و بقائے حق کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ حج کے باب میں اس مضمون پر مکمل بحث آئے گی۔

شرح مشاہدہ سے مشائخ عظام کی مراد حصول فنا فی اللہ ہوتی ہے۔ اردو ادب کی اصطلاح میں لفظ مشاہدہ سے مراد ہے آنکھوں سے دیکھنا۔ لیکن اربابِ حقیقت کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے روح انسانی کا روحِ ذات باری تعالیٰ میں غرق ہونا۔ اہل اللہ کے نزدیک آنکھوں سے دیکھنا بھی بُعد تصور کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ذاتِ حق کے ساتھ ایک ہوجانا حقیقی قرب ہے نہ کہ ایک دیکھنا۔ کیونکہ حقیقی قرب میں دیکھنا نہیں ہوتا۔ ایک ہوجانا ہوتا ہے۔ اور یہ مقام فنا ہے (شرح ختم)

الہام اور وسواس میں فرق

روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوسعیدؒ نیشاپور سے طوس کی طرف تشریف لے جارہے تھے۔ جب ایک وادی سے آپ کا گزر ہوا تو آپ کے پاؤں سردی سے ٹھٹھر گئے۔ ایک درویش بھی ان کے ساتھ تھا۔ درویش کے دل میں خیال آیا کہ اپنی صدری پھاڑ کر حضرت شیخ کے پاؤں پر لپیٹ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ صدری بہت قیمتی ہے اس کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ جب طوس پہنچے تو اس درویش نے حضرت شیخ کی مجلس میں سوال کیا کہ شیطانی وسواس اور الہام حق میں کیا فرق ہے۔ آپ نے فرمایا کہ الہام حق وہ تھا کہ تجھے کہا گیا کہ صدری پھاڑ کر ابوسعید کے پاؤں کو سردی سے بچاؤ۔ اور شیطانی وسواس وہ تھا جس نے تجھے اس

کام سے باز رکھا۔ اس قسم کے واقعات بہت ہیں اور یہ مردان خدا کا کام ہے۔

حضرت ابوالفضل محمد بن حسن ختلی قدس سرہٗ

زینِ اوتاد (اہل اللہ کی زینت) و شیخِ عباد (عابدوں کے راہبر) حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی رحمتہ اللہ علیہ جو میرے مرشد طریقت ہیں علم تفسیر و حدیث میں عالم تبحر تھے اور حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے مسلک پر تھے۔ آپ حضرت شیخ حصری رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ حضرت شیخ سروانی رحمتہ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے اور حضرت ابو عمر قزوینی رحمتہ اللہ علیہ اور ابوالحسن بن سالبہ رحمتہ اللہ علیہ کے ہم عصر تھے۔ آپ ساٹھ سال کامل پہاڑوں میں خلوت گزیں رہے اور اپنا نام و نشان مٹادیا۔ آپ اکثر کوہ لکام میں رہا کرتے تھے۔ آپ کی عمر طویل تھی اور کشف و کرامات کثرت سے سرزد ہوئے لیکن آپ لباس درویشانہ نہیں پہنتے تھے اور رسمی صوفیوں سے سختی سے پیش آتے تھے۔ میں نے ساری زندگی میں آپ سے زیادہ بارعب درویش نہیں دیکھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ **الدنیا یوم ولنا فیھا صوم** (دنیا ایک دن کی بہار ہے اور ہم اس ایک دن میں بھی روزہ دار ہیں) یعنی اس ایک دن میں بھی اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ اس کی قید میں قیدی ہوئے ہیں کیونکہ ہم دنیا کی آفت سے آگاہ ہوگئے ہیں اور اس کے حجابات سے بخوبی واقف ہیں اس لئے اسے ترک کردیا ہے۔

ایک دفعہ میں آپ کو وضو کرا رہا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ جب ہر چیز کا انحصار تقدیر پر ہے تو آزاد لوگ کیوں خواہ مخواہ کرامت کے طمع پر اپنے آپ کو پیروں کا غلام بنالیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا بیٹے جو کچھ تم نے سوچا ہے مجھے معلوم ہوگیا ہے یاد رکھو کہ ہر چیز کے لئے ایک سبب ہوتا ہے۔ جب حق تعالیٰ

چاہتا ہے کہ ایک عام بچے کو تخت و تاج عطا کرے (یعنی روحانی نعمت سے نوازے) تو اس کو پہلے توبہ کی توفیق عطا کرتا ہے اور اپنے ولی کی خدمت میں بھیج دیتا ہے اور یہی چیز اس کے کمال کا سبب بن جاتی ہے۔

شرح اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہر کام تقدیر الٰہی کے مطابق ہوتا ہے لیکن اس کے لئے بھی حق تعالیٰ ایک سبب بنا دیتا ہے اور وہ سبب بھی تقدیر الٰہی میں شامل ہوتا ہے۔ نیز اس واقعہ سے اولیائے کرام کے کشف قلوب اور علم غیب کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ترجمہ اس قسم کے بہت سے لطائف ہیں جو ہر روز مجھ پر ظاہر ہوتے تھے۔ جس روز آپ کا وصال ہوا آپ مقام بیت الجن میں تھے۔ یہ ایک گاؤں ہے جو دمشق اور دریائے بانیاں کے درمیان ایک وادی میں واقع ہے۔ وصال کے وقت آپ کا سر میری گود میں تھا۔ اس وقت میں اپنے ایک دوست کی بیوفائی کی وجہ سے رنجیدہ خاطر تھا جیساکہ عام طور پر ہوتا ہے۔ آپ نے میرے دل کی بات پر مطلع ہوکر فرمایا کہ :۔

"بیٹا! میں تجھے ایک بات بتاتا ہوں اگر تم نے اس پر عمل کیا تو تمام غموں اور مصیبتوں سے نجات پاؤ گے۔ اس بات کا پختہ یقین کر لو کہ دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے اور جس جگہ ہورہا ہے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہورہا ہے۔ تجھے چاہئے کہ اللہ کے کسی فعل کی نکتہ چینی نہ کرے اور نہ ہی اُس سے رنجیدہ خاطر ہو"۔ یہ کہہ کر آپ جاں بحق ہوگئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازن قشیریؒ

استاد و امام و زینِ اسلام حضرت ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازن القشیریؒ

اپنے وقت میں یگانہ روزگار تھے' آپ کا مقام بہت بلند اور شان بہت عالی تھی۔ آپ کے کمالات کی سارے جہان میں بہت شہرت تھی اور علم کے ہر فن میں آپ کا کلام بہت لطیف اور تصانیف نفیس ہیں۔ غرضیکہ تمام علوم و فنون میں آپ محقق کا درجہ رکھتے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے آپ کو حشویہ عقائد سے محفوظ فرمایا تھا۔ میں نے آپ کو کہتے ہوئے سنا کہ :۔

مثل الصوفی کعلتہ البرسلم اولہ' ھذیان و اخرہ' سکوت فاذا تمکن خرس (صوفی مرض برسام کے مریض کی طرح ہے۔ جس کی ابتداء گفتار اور انتہا خاموشی ہے اور جب مضبوط ہو تو گنگا پن ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی کے دو حال ہیں اول نمود۔ دوم وجد۔ (یعنی کشف)۔نمود مبتدیوں کا کام ہے اور اس میں شورش کلام کی زیادتی ہوتی ہے۔اور وجد منتہیوں کی علامت ہے (یعنی آخری درجہ کے مشائخ کا کام ہے)۔ اور وجد کی حالت میں وجد کے متعلق کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔جب تک سالک مقام طلب میں ہوتا ہے ہمت سے کام لیتا ہے اور شورشِ عشق میں خوب باتیں بناتا ہے جو اہل تمکین کو فضول معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جب حقیقت تک رسائی ہوجاتی ہے خاموشی چھاجاتی ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام ابتدائے حال میں جوش میں آئے اور دیدار کی درخواست کرکے عرض کیا کہ رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ (اے رب مجھے اپنا دیدار عطا فرما اور میری طرف دیکھ) لیکن (اہل تمکین کے نزدیک) یہ آرزو ناقابل قبول (از نایافت بود) تھی اس لئے ہذیان نظر آئی۔ اور چونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم منتہی تھے اور مقام تمکین پر متمکن تھے۔ آپ نے بارگاہ رب العزت میں مناجات کی کہ **لا احصی ثناء علیک** (میں تیری ثنا بیان کرنے میں قاصر ہوں) اور یہ بلند ترین مقام ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شرح مبتدی وہ ہے جو ابتدائے سلوک میں ہوتا ہے اس کی حالت کو تلوین

کہتے ہیں۔ اور وہ حالت سکر و فنا میں مستغرق رہتا ہے۔ اس کے برعکس منتہی وہ ہے جو سلوک تمام کرچکا ہے اور حالت تلوین (رنگ بدلنا) سے نکل کر مقام تمکین تک پہنچ چکا ہے۔ اس مقام پر سالک مقام فنا فی اللہ کے سکر و استغراق سے نکل کر صحو اور ہوشیاری میں آجاتا ہے اور فرائض زندگی ادا کرتا ہے۔ یہ مقام بقا باللہ ہے۔ اس سے اوپر مقام جامعیت ہے جہاں سالک بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد اشقانی رحمتہ اللہ علیہ

شیخ و امام اوحد (شیخ بے نظیر) و اندر طریقِ خود منفرد (طریقت میں بے مثال) حضرت ابوالعباس احمد بن محمد الاشقانی رحمتہ اللہ علیہ تمام اصول و فروعاتِ علوم اسلامیہ میں امامِ وقت اور مقربِ بارگاہ تھے۔ آپ نے اکثر مشائخ وقت کی صحبت پائی اور تصوف میں بلند مقام حاصل کیا۔ آپ کے طریق کی خصوصیت فنا تھی۔ لیکن آپ کا کلام بہت مغلق (دقیق) ہے۔ میں نے دیکھا کہ بعض جاہل صوفی جو آپ کے کلام کو سمجھنے سے قاصر تھے اور سطع نظری کی وجہ سے آپ کے کلام کے ناپسندیدہ مطالب نکالتے تھے۔ اس لئے عبارت میں احتیاط لازم ہے۔ مجھے آپ سے بہت انس تھا اور آپ کو مجھ پر عظیم شفقت تھی۔ ظاہری علوم میں آپ میرے استاذ تھے اور شریعت کا آپ کو اس قدر احترام تھا کہ اس سے زیادہ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ آپ نے تمام علائق دنیا ختم کردیئے تھے۔ آپ کا کلام اس قدر ادق ہوتا تھا کہ محققین کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ آپ دنیا و عقبیٰ دونوں سے بیزار تھے۔ آپ ہمیشہ یہ نعرہ لگایا کرتے تھے **اشتھی عدما لاوجود لہ**

(میں وہ عدم چاہتا ہوں کہ جس کے بعد وجود نہ ہو)۔

شرح یعنی ذات حق میں اس قدر فنا ہوجاؤں کہ اس سے باہر نہ نکل سکوں۔

شاید یہ کلمات آپ کی ابتدائی یا متوسط حالت کے تھے۔ کیونکہ اسلام میں منتہی وہ ہے جو فنا سے نکل کر بقا اور دوئی کے مقام پر عود کرتا ہے اور فرائض زندگی ادا کرنے کے قابل بنتا ہے۔ شاید یہ مقام افراد یا فردیت کی تمنا بھی ہو سکتی ہے جو موت سے تھوڑا عرصہ پہلے ممکن ہوتی ہے یعنی دائمی طور پر ایک کے ساتھ ایک ہو جانا اور پھر وصال پانا۔

ترجمہ نیز آپ فارسی زبان میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر آدمی ایک مشکل دعا مانگتا ہے اور میں بھی مشکل دعا مانگتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ پوری نہیں ہوگی۔ میری دعا یہ ہے کہ حق تعالیٰ مجھے ایسا عدم عطا کرے (یعنی ایسا نیست و نابود کردے) کہ جس کے بعد وجود حاصل نہ ہو۔ (یعنی فنائے تامہ اور فنائے دوام)۔ کیونکہ یہ جو مقامات اور کرامات ہیں سب محلِ حجاب ہیں (یعنی حجاب آور ہیں)۔ اور مقامات کا طلب گار حجابات کا طلبگار بن جاتا ہے۔ دیدار کے شوق میں نیست و نابود ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ حجاب سے مطمئن ہو جائے۔ اور چونکہ حق تعالیٰ وہ ہستی ہے کہ جس کے لئے نیستی محال ہے پھر اس میں کیا ہرج ہے کہ بندہ حق تعالیٰ میں گم ہو جائے۔ اور یہ گم ہونا وہ ہے کہ جس کے بعد ہستی ناممکن ہے۔ اور آپ کا یہ قول صحت فنا کی دلیل ہے (یعنی اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا نظریہ فنا بالکل صحیح ہے)۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمنائے مقام فردیت ہے جس کی تفصیل کئی مقامات پر آچکی ہے۔

حضرت ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ

قطبِ زمانہ' اور اپنے زمانہ میں یگانہ حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی رحمتہ اللہ علیہ خدا آپ کے وجود کو مسلمانوں کے لئے باعث فلاح بنائے۔

اپنے وقت میں یگانۂ روزگار' بے نظیر و بے مثال تھے۔ ابتدائے حال سے آپ کی حالت بہت اچھی اور قوی تھی اور آپ نے بڑے سخت سفر اختیار کئے۔ اس زمانے میں تمام اہل اللہ کے قلوب کے لئے آپ مقناطیس تھے۔ مریدین کے احوال و مقامات کے کشف میں آپ بے نظیر تھے۔ آپ خود بھی عالم تبحر تھے اور آپ کا ہر مرید علم میں دنیا کی زینت تھا۔ امید ہے کہ آپ کے بعد بھی ان کی یہ بزرگی برقرار رہے گی اور مقتدائے قوم رہے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ لسان الوقت ہیں (یعنی حقائق و معارف بیان کرنے میں یکتائے زمانہ) آپ کے مریدین میں سے ایک حضرت ابوعلی ابو الفضل بن محمد فارمدی رحمتہ اللہ علیہ نے تمام دنیا سے اجتناب کر کے حضرت شیخ کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرلیا تھا اور حق تعالیٰ نے ان کو حضرت شیخ (ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ) کی زبان بنادیا تھا۔ ایک دن میں حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں بیٹھا اپنے مکاشفات بیان کررہا تھا۔ اس امید میں کہ آپ ان کی وضاحت کریں۔ کیونکہ آپ بڑے نقاد تھے۔ اور آپ نہایت شفقت سے میری سرگذشت سن رہے تھے۔ بچپن کے غرور اور جوانی کے جوش نے میرے دل میں خیال پیدا کیا کہ شاید آپ اس قسم کے کشف و کرامات سے نہیں گزرے اس لئے میری بات شوق سے سن رہے ہیں اور اس قدر عجز و نیاز سے پیش آرہے ہیں۔ جونہی میرے دل میں یہ وسوسہ آیا آپ کو اس کا علم ہو گیا اور فرمایا بیٹا ! میرا یہ عجز تمہارے مکشوفات کی وجہ سے نہیں بلکہ عطا کرنے والے کی عطا کی وجہ سے ہے اور یہ معاملہ ہر شخص کو پیش آتا ہے۔ تمہارے ساتھ مخصوص نہیں۔ جب میں نے یہ بات سنی تو بہت پشیمان ہوا۔ آپ نے میری پشیمانی کو دیکھ کر فرمایا کہ بیٹے شروع میں انسان پر طریقت کا اتنا زیادہ اثر نہیں ہوتا کہ اسے ان باتوں سے روک دے۔ اس لئے وہ غرور (خود پسندی) کا

شکار ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اسے طریقت سے معزول بھی کردیا جائے تو بھی طریقت کے الفاظ و عبارات میں پھنسا رہتا ہے۔ غرضیکہ خواہ طریقت ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں خود پسندی باقی رہ جاتی ہے اور آدمی اس کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی عجز و نیاز کو اپنا شیوہ بنالے۔ باقی تمام نسبتوں سے خالی ہو کر بندگی اور فرمانبرداری اختیار کرلے۔ اس کے علاوہ حضرت شیخ کے ساتھ بہت راز و نیاز کی باتیں ہوئیں اگر ان کو بیان کروں تو مقصودِ اصل سے باز رہ جاؤں گا۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو احمد حمدان رحمتہ اللہ علیہ

رئیس اولیاء و ناصحِ اہل صفا' ابو احمدؒ المظفر بن احمدؒ بن حمدانؒ وہ ولی اللہ ہیں جن کو تخت شاہی سے اٹھا کر حق تعالیٰ نے تاجِ فقر و ولایت عطا فرمایا۔ مسائل فنا و بقا پر آپ کا کلام بہت بلند اور بیان بہت لطیف ہے۔ حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ہمیں ازراہ بندگی اپنی بارگاہ تک پہنچایا اور ان کو ازراہ خداوندی یعنی بذریعہ کشف و کرامات۔ یعنی ہم نے مجاہدہ سے مقام مشاہدہ پایا ہے لیکن ان کو براہ راست مشاہدہ حاصل ہوا ہے۔ میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو کچھ کوہ و دشت پیمائی سے حاصل ہوتا ہے' وہ مجھے تخت شاہی پر ہی مل گیا۔ آپ کے اس قول کو کم فہم لوگ رعونت سے تشبیہ دیتے ہیں یہ ان کی غلط فہمی ہے کیونکہ اپنی حقیقت حال بیان کرنا بری بات نہیں ہے۔ خاص کر اہل حقیقت کے لئے۔ چنانچہ اب تک آپ کی بزرگی کا چرچا ہو رہا ہے۔

شرح جس بزرگ کو مجاہدہ کے ذریعے مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اس کو سالک مجذوب کہا جاتا ہے اور جس کو پہلے مشاہدہ حاصل ہوتا ہے وہ مجذوب سالک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نیز آپ نے جو اپنی بزرگی بیان کی ہے یہ تحدیث

نعمت ہے جس کا قرآن مجید میں حکم آیا کہ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۔

ترجمہ خواجہ احمدؒ ایک اور بزرگ ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں شیخ حمدان رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ وہاں نیشاپور کا ایک مدعی (جھوٹا دعویدار) بھی موجود تھا جو فنا اور بقا کی باتیں کررہا تھا۔ اس نے کہا کہ جب انسان فانی ہوتا ہے تو باقی ہوجاتا ہے۔ خواجہ مظفر حمدان رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ فنا پر بقا کیسے متصور ہوسکتی ہے۔ کیونکہ فنا سے مراد ہے نیستی اور بقا نام ہے ہستی کا۔ لہٰذا دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ (یعنی ایک دوسرے کی ضد ہیں) سب کو معلوم ہے کہ فنا نیستی کا نام ہے اب اگر فنا ہست ہو جائے تو وہ فنا نہیں ہو گی۔ بلکہ کوئی اور چیز بن جائے گی اور یہ امر واقعہ ہے کہ ذات فنا نہیں ہوتی۔ البتہ صفات فنا ہوجاتی ہیں اور سبب کا فنا ہونا بھی روا ہے۔ پس اگرچہ صفت فنا ہوجاتی ہے تو موصوف باقی رہتا ہے۔ اس کی ذات کے لئے فنا کا حکم لگانا صحیح نہیں ہوگا اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ مجھے اس خواجہ کے الفاظ اچھی طرح یاد نہیں ہیں لیکن مطلب وہی ہے جس کا خلاصہ میں نے اوپر بیان کردیا ہے۔ اب اس کی مزید وضاحت کرتا ہوں تاکہ ہر شخص کو معلوم ہوجائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کا اختیار (ارادہ) اس کی اپنی صفت ہے لیکن بندہ کا ارادہ حق تعالیٰ کے ارادہ سے محجوب ہو جاتا ہے۔ یعنی نظر نہیں آتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ بندہ کی صفت حق تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے۔ اب چونکہ صفت حق تعالیٰ ازلی اور بندہ کی صفت فانی ہے۔ صفت ازلی کے لئے فنا نہیں ہے۔ جب حق تعالیٰ کے ارادہ میں بندہ کا ارادہ گم ہوجاتا ہے تو لا محالہ اختیار بندہ (بندہ کا ارادہ) فانی ہوجاتا ہے اور اس کا تصرف بھی منقطع (ختم) ہوجاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

شرح اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک بندہ کی صفات یعنی اس کی ہستی موجود ہے وہ فانی فی اللہ نہیں ہوسکتا۔ جب اپنی ذات و صفات کو ذات و صفات

حق تعالیٰ میں گم کردیتا ہے تو پھر اسے مقام فنا فی اللہ حاصل ہوتا ہے۔ یعنی وہ خود گم ہوتا ہے اور اللہ باقی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت مصنف نے پہلے فرمایا کہ حلاج نے اپنی ہستی کو ذات حق تعالیٰ میں گم کردیا۔ تو جو نعرۂ انا الحق بلند ہوا وہ کلام حلاج نہیں تھا۔ بلکہ کلام حق تھا۔ اور حق تعالیٰ بطور متکلم خود کہہ رہا تھا کہ میں حق ہوں (انا الحق)۔

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ اور سماع

ایک دفعہ نہایت پریشان حالی میں میں حضرت شیخ حمران رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا چاہتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ سماع کی خواہش ہے۔ انہوں نے قوال طلب کئے اور اصحابِ ذوق کو بھی بلایا۔ جب سماع شروع ہوا تو مجھ پر ابتدائی زمانے کا ذوق و شوق غالب آگیا اور خوب جوش رہا۔ جب سماع ختم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ سناؤ سماع کیسا رہا۔ میں نے عرض کیا کہ یا شیخ بہت اچھا رہا۔ آپ نے فرمایا ایک وقت آئے گا جب سماع اور کوّے کی آواز تمہارے لئے برابر ہو جائے گی۔ قوت سماع اس وقت تک رہتی ہے جب تک مشاہدہ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن جب مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے تو ذوق سماع مٹ جاتا ہے۔ یاد رکھو سماع کو عادت نہ بناؤ ورنہ یہ عادت طبیعت بن جائے گی اور مقصود اصلی سے محروم رہ جاؤ گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شرح حضرت داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے شیخ کے کلام کے بعد بجا طور پر "واللہ اعلم بالصواب" کہا ہے۔ کیونکہ حضرت شیخ حمران رحمتہ اللہ علیہ کی یہ عبارت آخری بات معلوم نہیں ہوتی بلکہ اس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ جو کچھ حضرت شیخ حمران رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے اپنے نقطہ نگاہ سے درست فرمایا ہے کیونکہ آپ کے نزدیک آخری مقام مشاہدہ حق ہے اور مشاہدہ حق کے وقت

مشاہدۂ غیر ناممکن ہے لیکن ایک بات تو یہ ہے کہ سماع بھی مشاہدۂ غیر نہیں ہے بلکہ مشاہدۂ حق ہے یا مشاہدۂ حق میں اضافہ کرنے والی چیز ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض اکابر مشائخ کے نزدیک مشاہدہ حق (جو مقام فنا فی اللہ کا دوسرا نام ہے) آخری منزل نہیں بلکہ بقاباللہ یعنی نزول اور عبدیت آخری مقام ہے اور جن حضرات کو مقام بقا باللہ حاصل ہے وہ بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتے ہیں اور باقی باللہ بھی۔ اور اس چیز کو تصوف کی اصطلاح میں جامعیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جامعیت وہ مقام ہے کہ جس میں سالک واصل بھی ہوتا ہے اور مجور بھی۔ بقول حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ ۔

عجب ایں نیست کہ سرگشتہ بود طالب دوست
عجب این است کہ من واصل و مجورم

اب وصل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان محویت اور استغراق کے مزے اڑائے اور ہجرو فراق کا تقاضا یہ ہے کہ آتش عشق میں جلتا رہے اور مزید در مزید مقامات قرب و وصل کی طرف پرواز جاری رکھے۔ لہٰذا منتہی حضرات کے نقطۂ نظر سے ذوق سماع مشاہدۂ حق پر ختم نہیں ہو گا بلکہ اس میں اور اضافہ ہو گا۔ بقول مرزا بیدلؒ ۔

ہمہ عمر باتو قدح زدیم و نرفت رنج خمارما
چہ قیامتے کہ نمے رسی زکنارِ ما بکنارِ ما

(ساری عمر شراب وصل کے پیمانے نوش کئے لیکن پیاس ہے کہ بجھنے میں نہیں آتی۔ اے محبوب یہ کیا قیامت ہے کہ تو میرے آغوش سے میرے آغوش میں نہیں آتا)۔نیز عارف رومیؒ فرماتے ہیں ۔

دل آرام در بر و دل آرام جوے
ہمچو مستسقی تشنہ بر آب جوے

(محبوب بغل میں ہے اور محبوب کی تلاش ہے۔ میری حالت وہی ہے جو مرض استسقیٰ کے مریض کی ہوتی ہے کہ ساحل دریا پر بیٹھا پیاس سے مر رہا ہے اور دریا جاری ہے) حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کا مقام بھی یہی ہے۔ اس لئے آپ نے حضرت شیخ حمدان رحمتہ اللہ علیہ کے کلام پر واللہ اعلم بالصواب کہا ہے۔

نیز یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ یہ جو بعض مشائخ کے درمیان مقام فنا اور بقا کے متعلق اختلاف نظر آتا ہے جس کی رو سے بعض مقام فنا کو ترجیح دیتے ہیں اور آخری مقام سمجھتے ہیں اور بعض مقام بقا کو ترجیح دیتے ہوئے اس کو آخری مقام سمجھتے ہیں' یہ اختلاف کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ نزاع لفظی ہے۔ مثلاً حضرت ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک فنا فی اللہ تھا اور آپ فنا کو بقا پر ترجیح دیتے تھے اور حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک بقا باللہ تھا اس لئے آپ بقا کو فنا پر ترجیح دیتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مقام فنا کا سالک بقاباللہ سے محروم ہوتا ہے اور مقام بقا کا سالک مقام فنا سے محروم ہوتا ہے۔ بلکہ اولیائے امت مسلمہ کی یہ عظیم الشان خصوصیت ہے کہ ان کی زبردست اکثریت کو بیک وقت دونوں مقام حاصل تھے جس کا دوسرا نام جامعیت ہے لیکن یہ جو بعض حضرات نے فنا کو بقا پر ترجیح دی ہے اس کا مطلب یہ ہے وہ حضرات طبعاً" فنا کو زیادہ پسند فرماتے تھے اور جن حضرات نے بقا کو فنا پر ترجیح دی ہے ان کی طبیعت میں عبدیت اور بندگی زیادہ غالب تھی اس لئے فنا سے نکل کر بقا پر زیادہ عرصہ قیام فرماتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ صرف ترجیحات کا فرق ہے حقیقی فرق نہیں ہے۔ جن حضرات کی طبائع میں ذوق و شوق' محویت و مستی

غالب تھی وہ مقام فنا کو زیاہ پسند کرتے تھے اور جن حضرات کی طبیعت عجز و نیاز اور بندگی و عبودیت کی طرف زیادہ مائل تھی وہ بقا باللہ کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ لہٰذا یہاں معاملہ زیادہ پسند یا کم پسند کا ہے اختلاف کا نہیں ہے۔

آنکس کہ خاک مارا گل کرد و خانہ ساخت
خود درمیاں بیامد و مارا بہانہ ساخت
مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت
خود سوئے ما ندید و حیا را بہانہ ساخت
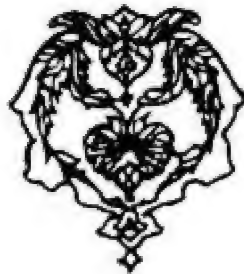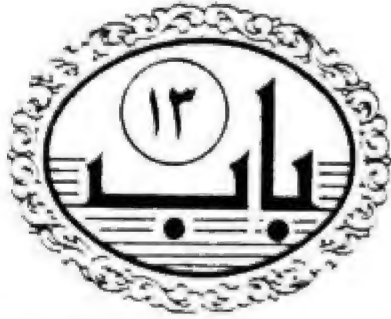
صوفیائے معاصرین کے مختصر احوال مع علاقہ جات

اب اگر میں تمام صوفیائے کرام کے حالات بیان کروں تو یہ کتاب بہت طویل ہو جائے گی اور اگر ترک کروں تو کتاب کا مقصد فوت ہوتا ہے اس لئے اس وقت میں اپنے عہد کے صرف ان صوفیائے کرام کے حالات بیان کرتا ہوں جو اصحاب حقائق و معارف اور مقتدائے خلق ہیں اور اہل رسوم کا بیان ترک کرتا ہوں امید ہے کہ اس طرح میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔

مشائخ شام و عراق

حضرت شیخ زکی بن العلاؒ آپ کا شمار اکابر مشائخ اور ساداتِ عصر میں ہوتا ہے میں نے ان کی صحبت پائی ہے۔ آپ عشقِ الٰہی میں مجسم پرکالۂ آتش اور صاحب کشف و کرامات تھے۔

حضرت شیخ ابو جعفر محمد بن المصباح صیدلانیؒ آپ اکابر صوفیاء میں سے تھے اور حقائق بیانی میں زبان فصیح رکھتے تھے۔ آپ حضرت شیخ حسین ابن منصور رحمتہ اللہ علیہ کے مسلک کی طرف بہت مائل تھے۔ میں نے آپ کی بعض تصانیف کا آپ سے درس بھی لیا ہے۔

حضرت شیخ ابوالقاسم سدیؒ آپ بڑے صاحب مجاہدہ و صاحب حال بزرگ تھے اور اولیاء و مشائخ کے دلدادہ تھے۔

مشائخ فارس

حضرت شیخ الشیوخ ابوالحسن ابن سالبہؒ آپ حقائق تصوف میں نہایت فصیح البیان اور توحید کے بیان میں نہایت واضح اللسان تھے۔ آپ کے کلمات مشہور ہیں۔

حضرت ابو اسحاق ابن شہریارؒ آپ کا شمار مقتدائے خلق اور محتشم صوفیاء میں ہوتا ہے اور آپ کی عظمت کا ہر شخص قائل تھا۔

حضرت ابوالحسن علی بن بکرانؒ آپ اجلی شیخ طریقت اور بلند مقام بزرگ تھے۔

حضرت شیخ ابو مسلم ہرویؒ آپ بڑے ہردل عزیز اور مشہور زمانہ بزرگ تھے۔

حضرت شیخ ابوالفتح سالبہؒ آپ اپنے والد بزرگوار کے کمالات کے حقیقی وارث تھے۔

حضرت شیخ ابوطالبؒ آپ حقائق و معارف کے گرویدہ تھے۔

ان حضرات میں سے حضرت شیخ الشیوخ ابو سحاق کی صحبت مجھے نہیں ملی ہے۔

مشائخ قہستان، آذربائیجان و طبرستان

حضرت شیخ شفیق فرح المعروف بہ اخی زنجانیؒ آپ بڑے نیک سیرت اور شیخ طریقت ہیں اور اپنے وقت کے شیخ مانے جاتے ہیں۔ آپ کے کلمات بہت نادر ہیں۔

حضرت بادشاہ تائبؒ آپ راہ طریقت کے شہسوار تھے۔

حضرت شیخ عبداللہ جنیدیؒ آپ بڑے رفیق اور بڑے محترم بزرگ ہیں۔

حضرت شیخ ابوطاہر مکشوفؒ آپ اپنے زمانہ کے بلند پایہ بزرگ ہیں۔

حضرت خواجہ حسن سمنانیؒ آپ گرفتار محبت اور صاحب حال بزرگ ہیں۔

حضرت شیخ سہلگیؒ آپ کا شمار نادار درویشوں میں ہوتا ہے۔

حضرت شیخ احمد بن شیخ ابوالحسن خرقانیؒ آپ اپنے والد محترم کے کمالات کے وارث ہیں۔

حضرت ادیب کمندیؒ آپ کا شمار ساداتِ زمانہ میں ہوتا ہے۔

صوفیائے اہل کرمان

حضرت خواجہ علی بن حسین سیرکانیؒ آپ بڑے سیاح تھے اور ہر وقت

سفر پر کمربستہ تھے۔ آپ کے بیٹے شیخ حکیم بھی مرد کامل تھے۔

حضرت شیخ محمد بن سلمہؒ آپ کا شمار اکابر مشائخ وقت میں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے پوشیدہ مشائخ اور نوخیز صوفیاء ہو چکے ہیں۔

خراسان (جہاں اب مقبولیتِ حق سایہ فگن ہے)

حضرت شیخ مجتہد ابوالعباس دامغانیؒ آپ بڑے کامران و کامیاب بزرگ تھے۔

حضرت خواجہ ابو جعفر ترشیزیؒ آپ اپنے وقت کے بلند پایہ شیخ تھے۔

حضرت شیخ ابو جعفر محمد بن علی جوینیؒ آپ بڑے محقق بزرگ تھے۔

حضرت خواجہ محمود نیشاری پوریؒ آپ مقتدائے وقت تھے اور حقائق میں آپ کو کمال حاصل تھا۔

حضرت شیخ محمد معشوقؒ آپ بڑے خوش وقت بزرگ اور عشق الٰہی میں مجسم آتش تھے۔ آپ ہر وقت خوش و خرم اور حال میں ڈوبے رہتے تھے۔

خواجہ رشید مظفر ابن شیخ ابوسعیدؒ آپ نوخیز صوفی ہیں جو امید ہے کہ اپنے والد کے کمالات کے وارث ہوں گے۔

حضرت خواجہ احمد جمادی سرخسیؒ آپ بڑے مجاہد زمانہ ہیں اور ہم کافی عرصہ اکٹھے رہے ہیں۔ آپ بڑے صاحب کشف و کرامات ہیں اور بڑے مرد میدان ہیں۔

حضرت شیخ احمد نجار سمرقندیؒ آپ شہر مرو میں مقیم تھے اور سلطان

وقت تھے۔

حضرت ابوالحسن علی بن ابی علی الاسودؒ آپ اپنے والد ماجد کے کمالات کے وارث تھے اور عالی ہمت اور صدق و فراست میں یگانۂ روزگار تھے۔

اگر میں خراسان کے تمام مشائخ کا ذکر کروں تو یہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ میں نے صرف اسی ملک میں تین سو ایسے بزرگ دیکھے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک صاحب مشرب تھا اور کمال کے اعتبار سے ان میں ساری دنیا کے لئے صرف ایک کافی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت اور طریقت میں خراسان کا ستارہ عروج پر ہے۔

اہلِ ماوراء النہر

حضرت شیخ ابو جعفر محمد بن حسین الحرمیؒ آپ امام خلق اور مقبول خاص و عام تھے آپ اہل سماع اور اہل محبت تھے آپ بڑے بلند ہمت شیخ تھے۔ زہد و تقویٰ میں مشہور اور مریدین کے ساتھ بہت شفیق تھے۔

خواجہ ابو محمد بالغریؒ آپ فقیہ خلق اور اپنے اصحاب کے درمیان وجیہ (باعزت) تھے۔آپ فراخی کی زندگی بسر کرتے تھے اور معاملات خلق میں بہت محتاط تھے۔

حضرت شیخ احمد ایلاقیؒ آپ شیخ وقت اور تارک رسوم و عادات تھے۔

حضرت شیخ علی بن ابی اسحاقؒ آپ یگانۂ روزگار اور محتشم اور فصیح اللسان تھے۔

مشائخ غزنی

حضرت شیخ ابوالفضل بن الاسدیؒ آپ بہت بڑے عارف باللہ، صاحب کشف و کرامات تھے۔ اور عشق الٰہی میں آپ مجسم آتش تھے۔ آپ اپنے آپ کو چھپانے میں صاحبِ کمال تھے۔

حضرت شیخ اسماعیل شاشیؒ آپ تجرد و تفرید میں یکتائے زمانہ تھے۔ آپ کا طریقہ ملامتیہ تھا۔

شرح تجرید و تفرید صوفیائے کرام کے اعلیٰ مقامات میں سے ہیں۔ تجرید کا مطلب ہے ترکِ دنیا اور تفرید سے مراد ترکِ خود۔ ترک خود کا تعلق اگرچہ مقام فنا سے ہے جس کے بعد مقام بقاباللہ ہے لیکن مقام تفرید بقا باللہ کے بعد کی فنا کا نام ہے جب کہ مشائخ عظام اپنی عمر کے آخر چند سال یا چند ماہ میں خلفاء مقرر کر کے فریضہ ہدایت خلق سے فارغ ہو جاتے ہیں اور ذات حق میں گم ہو کر ایک کے ساتھ ایک ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دوئی کا نام و نشان تک نہیں رہتا اور اکثر کھانا پینا بھی ترک ہو جاتا ہے۔

حضرت شیخ سالار طبریؒ آپ ایک عالم و عارف باللہ تھے۔ آپ خوش باش اور خوش لباس تھے اور بڑے محقق اور نکتہ دان تھے۔

حضرت شیخ ابوعبداللہ محمد بن حکیم معروف بہ مریدؒ آپ پر عشق و مستی کا غلبہ تھا۔ آپ یگانہ روزگار تھے۔ اور خلق خدا سے پوشیدہ رہتے تھے۔ آپ صاحب کرامات تھے۔ آپ کے دیدار سے آپ کی صحبت زیادہ مؤثر تھی۔

شرح یعنی ظاہر میں آپ کچھ نظر نہیں آتے تھے لیکن آپ کی صحبت میں

رہنے سے آپ کی عظمت کا پتہ چلتا تھا۔

حضرت شیخ سعید بن ابوسعید العیارؒ آپ حافظ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے۔ آپ نے عمر طویل پائی تھی جس کی وجہ سے آپ کا مسلک اخفا (پوشیدگی) تھا اور خلق پر اپنے کمالات ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔

حضرت شیخ ابو العلا عبدالرحیم بن احمد السعدیؒ آپ ہر دلعزیز اور ساداتِ وقت میں سے تھے آپ بڑے باعظمت و باوقار بزرگ تھے۔ آپ خوش حال زندگی بسر کرتے تھے اور آپ کا حال نہایت قوی تھا۔ آپ تمام علوم و فنون اسلامیہ سے آگاہ تھے۔

حضرت شیخ اوحد قسورت بن محمد جرویزیؒ آپ کو اہل طریقت کے ساتھ بے حد انس ہے اور سب کی عزت کرتے ہیں آپ نے بہت مشائخ کی صحبت پائی ہے۔

اب مجھے امید قوی ہے کہ ایک دن اس شہر (غزنی) کے خواص و عوام میں سے کوئی مرد میدان پیدا ہو گا جو اس کی گندگی کو دور کرے گا اور اسے ہر قسم کی آلودگی سے پاک کرے گا اور بد اعمالوں کی بجائے اولیاء کرام کا آماجگاہ بنے گا۔اب میں اپنے اصلی مضمون یعنی مختلف فرقوں کے مابین فرق کی طرف آتا ہوں۔

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما
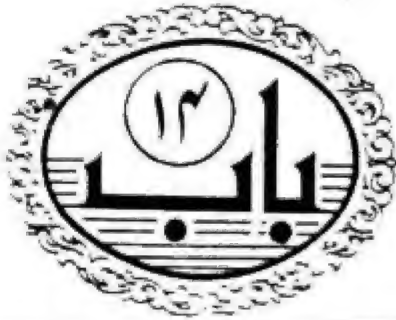
شرح یہاں یہ بتاتے جانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نہ صوفیاء اسلام کے مابین کوئی حقیقی اختلاف پایا جاتا ہے اور نہ ہی وہ مختلف فرقوں میں منقسم ہیں۔ البتہ صوفیاء کرام مختلف سلاسل طریقت سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنے مشائخ سلف کے اسمائے گرامی سے موسوم کئے جاتے ہیں نہ کہ کسی اختلاف کی بناء پر۔ نیز ان کے ملفوظات اور اقوال میں جو بظاہر فرق نظر آتا ہے وہ بھی الفاظ کا فرق ہے معانی کا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کے مابین نزاع لفظی ہے نہ کہ نزاع حقیقی۔ حقائق و معارف پر وہ سب متفق ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات اصحاب معنی اور اصحاب مشاہدہ ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں عین الیقین اور حق الیقین سے کہتے ہیں نہ کہ علم الیقین اور منطقی اور ظنی قیاسات سے۔ بخلاف علمائے ظواہر کے کہ جن کے اقوال عین الیقین اور حق الیقین کی نعمت سے مبرا اور معرا ہوتے ہیں۔

ہفتاد و دوملت راعذر بنہ۔ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ (حافظؒ)

ترجمہ جیسا کہ حضرت شیخ ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کے ذکر میں بتایا جا چکا ہے۔ صوفیاء کے بارہ گروہ ہیں جن میں سے دو مردود اور دس مقبول ہیں۔ ان دس گروہوں میں سے ہر ایک گروہ کے مجاہدات اور طور طریقے محمود' اور مشاہدات مستحسن ہیں۔ اگرچہ ان کے معاملات' مجاہدات اور ریاضات کے طریقے قدرے مختلف ہیں تاہم شریعت اور توحید کے اصول اور فروعات میں وہ سب متفق ہیں۔

شرح لفظ "معاملات" کے دو مطالب ہیں۔ ایک ظاہری' دوسرا باطنی۔ ظاہر میں معاملہ کسی خاص کام یا قضیہ کا نام ہے' باطن میں معاملہ سے مراد حالت کشف ہے۔

"مجاہدات و ریاضات" سے مراد عبادت میں وہ جدوجہد اور کوشش ہے جو حصول قرب کی خاطر از قسم فرائض' سنن و نوافل بجا لائے جاتے ہیں۔

" اصول " سے مراد بنیادی عقائد ہیں اور فروعات سے مراد تفصیلات ہیں۔ جیسے درخت کا تنہ اصل ہے اور اس کی شاخیں فروعات۔

شرع و توحید شرع سے مراد ظاہری عقائد ہیں اور عالم مجاز کے قوانین ہیں اور توحید سے مراد عالم حقیقت میں بوجود مطلق کو ایک جاننا اور ایک دیکھنا ہے۔

ترجمہ حضرت خواجہ ابویزید بسطامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ **اختلاف العلماء رحمتہ الا فی تجرید التوحید** (یعنی یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ علمائے امت کے درمیان اختلاف رحمت ہے یہ اختلاف تجرید التوحید کے سوا باقی تمام عقائد و معاملات میں رحمت ہے)۔

شرح اب ہم نے دیکھنا ہے کہ اول اختلاف علماء کیسے رحمت ہے' دوم تجرید التوحید سے کیا مراد ہے اور اس کے اندر اختلاف کی نوعیت کیا ہے اور کیوں مختلف ہے۔ یاد رہے کہ اختلاف اور چیز ہے اور مخالفت بالکل دوسری چیز ہے۔ اختلاف سے مراد ہے تعمیری اختلاف رائے ہے جس کی وجہ سے ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اور نشوونما کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

فخرِ موجودات' سرورِ کائنات علیہ الصلواۃ والسلام کے قول مبارک **"اختلاف العلماء رحمتہ"** سے مراد یہی تعمیری اختلاف رائے ہے۔ جس طرح سیاست کے میدان میں حزب اختلاف کا وجود ضروری اور مفید ثابت ہوتا ہے عقائد اور معاملات دین خاص طور پر روحانی ترقی کے میدان میں بھی اختلاف کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے ترقی اور نشوونما کے علاوہ مختلف گروہوں میں ایک تو رشک کی وجہ سے ذوق عمل میں اضافہ ہوتا ہے دوسرے ایک دوسرے کے خوف کی وجہ سے امت افراط و تفریط سے محفوظ ہو کر صراط مستقیم پر گامزن رہ سکتی ہے۔ موسموں کے اختلاف یعنی سردی و گرمی' خشکی و تری' بادِ بہاری و بادِ خزاں' پودوں کی کانٹ چھانٹ' پہلوانوں کی باہمی مکابازی' کھیلوں کے میدان میں ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد' جنگوں میں فتح و شکست' قوموں کے ترقی و تنزل وغیرہ وغیرہ امور میں قدرت کاملہ کا یہی زریں اصول کارفرما ہے۔

تجرید التوحید اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ تجرید التوحید کے مضمون کو حضرت خواجہ بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے اصول اختلاف سے کیوں مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ پہلے ہم تجرید التوحید کا مطلب بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے تجرید اور تفرید سلوک الی اللہ کے دو اہم مقامات ہیں۔ اس سے مراد دنیا و مافیہا بلکہ اپنے وجود کو بھی ذات حق میں فنا اور نیست و نابود کرنا اور ذات حق کا

باقی رہنا ہے۔ اس منزل کے حصول کا دوسرا نام وحدت الوجود ہے۔ اگرچہ مسئلہ وحدت الوجود کی وضاحت کے لئے ضخیم کتب درکار ہیں یہاں صرف مختصر طور پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ یہ کائنات حق تعالیٰ کی صفت تخلیق کا مظہر ہے اور چونکہ صفت، موصوف سے علیحدہ نہیں ہوتی اس لئے خالق اور مخلوق میں مغائرت مفقود ہے۔ جیسے ایک مصنف کتاب کی ذات سے اس کی کتاب جو اس کی صفتِ علم کا ظہور یا نتیجہ ہے جدا نہیں متصور ہو سکتی۔ اسی طرح کائنات کا وجود بھی حق تعالیٰ کے وجود سے غیر متصور نہیں ہو سکتا۔ مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ نے مختصر الفاظ میں اس نکتہ کی یوں وضاحت فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ اور کائنات کے مابین کل و جزو یا ظرف و مظروف کا سا تعلق نہیں ہے بلکہ خالق و مخلوق اور لازم و ملزوم کا سا تعلق ہے۔ چنانچہ اولیائے کرام نے خالق و مخلوق میں تعلق کی جو مثالیں دی ہیں ان میں سے دو مثالیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔ مٹی کے مختلف برتنوں کا جو تعلق مٹی سے ہے یا سمندر کے اندر جھاگ، حباب، لہروں اور برف کے ٹکڑوں کا جو تعلق سمندر کے پانی سے ہے وہی تعلق اشیائے کائنات کا حق تعالیٰ سے ہے۔ فرق یہ ہے کہ باقی اشیاء محدود اور مادی ہیں حق تعالیٰ لا محدود اور غیر مادی ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ اُس کی مثال حقیقی معنوں میں کائنات کی کسی چیز سے نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح ایک اور نامکمل مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ جس طرح زید کا ہاتھ زید سے جدا نہیں اسی طرح کائنات کی کوئی چیز ذاتِ حق سے جدا نہیں ہے اور جس طرح زید کا ہاتھ زید نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی زید سے جدا کہا جا سکتا ہے اسی طرح اشیائے کائنات کو خدا سے نہ جدا کہا جا سکتا ہے اور نہ خدا کہا جا سکتا ہے۔ اور جس طرح زید کو چھوڑ کر زید کے ہاتھ سے کوئی چیز طلب کرنا مضحکہ خیز ہے اسی طرح بت پرستی مضحکہ خیز ہے۔ لیکن اس مثال میں کمی یہ ہے کہ جہاں ذات حق لا محدود اور غیر منقسم ہے۔ زید محدود اور منقسم

ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ حضرت خواجہ بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے تجرید التوحید کو اختلاف سے ماوراء کیوں کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تجرید التوحید یعنی مقام فنا فی اللہ پر جب سالک اپنی ہستی کو ذات حق میں گم کر دیتا ہے تو لامحدودیت اور اطلاق ذات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب سالک کا اپنا وجود ہی باقی نہیں رہتا ہے تو اختلاف کا سوال ہی مٹ جاتا ہے۔ کیونکہ اختلاف دو یا دو سے زائد اشیاء کے وجود سے وجود میں آتا ہے۔ جب اشیاء کا وجود ہی مٹ جاتا ہے اور وحدت ہی وحدت (جسے ذات بحت یا ذات لاتعین' و احدیت کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے) رہ جاتی ہے تو اختلاف کہاں رہا۔

ترجمہ لہٰذا مشائخ عظام کے مابین تصوف کے مضمون پر جو فرق نظر آتا ہے وہ حقیقی نہیں ہے بلکہ مجازی ہے۔

شرح "حقیقت و مجاز" عالم حقیقت سے مراد عالم قدس یعنی حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا جہان ہے اور عالم مجاز سے مراد ہماری یہی ظاہری کائنات ہے جسے عالم ناسوت کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ کا مطلب یہ ہے کہ مشائخ کے درمیان جو بظاہر فرق (اختلاف) نظر آتا ہے وہ حقیقی نہیں مجازی ہے۔ یعنی اصولی نہیں اضافی ہے' باطنی نہیں ظاہری ہے' حقیقی نہیں لفظی ہے جسے نزاع لفظی کہا جاتا ہے۔

ترجمہ لہٰذا اب ہم مجازی نقطہ نظر سے مشائخ کے اس اختلاف کی وضاحت کرتے ہیں تاکہ طالب کو علم حاصل ہو۔ علماء کو سلاح (بحث و مباحثہ کیلئے گولہ بارود یعنی استدلال)' مریدوں (یعنی سچے عقیدت مندوں) کیلئے صلاح (بہتری)' عاشقوں کیلئے فلاح (ترقی)' عقلاء (فلسفیوں) کے لئے تنبیہ اور میرے

لئے ثواب کا باعث ہو۔ **و باللہ التوفیق** (توفیق کا دینے والا اللہ عزوجل ہے)

سلسلہ محاسبیہ

محاسبیہ مکتب فکر کے ارباب کا تعلق حضرت شیخ ابی عبداللہ بن اسد حارث **المحاسبی** رحمتہ اللہ علیہ سے ہے۔

شرح آپ کو محاسبی اس لئے کہتے ہیں کہ آپ دن رات سختی سے اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے تھے۔ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ میں اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے کے علاوہ اپنی نیات اور خیالات قلبی کا بھی محاسبہ کرتا ہوں کیونکہ خاصان خدا کو برے خیالات کی بھی سزا ملتی ہے۔ ایک دفعہ حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی موٹے اور ہٹے کٹے فقیر نے سوال کیا تو آپ کے دل میں خیال آیا کہ یہ آدمی تو جھوٹا ہے۔ یہ خیال آنا تھا کہ کسی شخص نے آپ کو ایک کھانے کا خوانچہ پیش کیا۔ کپڑا اٹھا کر دیکھا تو وہی فقیر چھوٹی شکل میں اس کے اندر پڑا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تم نے دل میں فقیر کی غیبت کی۔ اور غیبت کی سزا قرآن میں یہ ہے کہ جیسے کوئی اس کا گوشت کھا رہا ہے۔

ترجمہ حضرت شیخ حارث **محاسبی** سارے زمانے میں مقبول النفس اور مقتول النفس مانے جاتے ہیں۔

شرح مقبول النفس سے مراد وہ بزرگ ہیں جو مستجاب الدعوات ہوتے ہیں۔ یعنی جن کی ہر دعا قبول ہو۔ نیز اس سے مراد قبولیت عامہ (ہر دلعزیزی) بھی ہے۔ مقتول النفس کے بھی دو مطالب ہیں ایک قتیل محبت ہونا' دوم نفس امارہ پر غالب ہونا۔

ترجمہ آپ علوم اسلامیہ کے اصول و تفصیلات میں ماہر فن تھے اور حقائق و

معارف میں صاحب سخن۔ آپ کا مقام اگرچہ تجرید توحید (یعنی فناء مطلق) تھا لیکن اس کے باوجود شریعت کے ظاہری مسائل میں بھی بے حد محتاط اور سخن ور تھے۔ آپ کے حقائق و معارف میں سب سے زیادہ نمایاں یہ امر ہے کہ آپ "رضا" کو "مقام" نہیں "حال" کہتے ہیں۔

شرح "حال و مقام" حال عارضی کیفیت کا نام ہے جو آتی ہے اور چلی جاتی ہے لیکن اس کیفیت کے دوام کو "مقام" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو آتا ہے اور پھر کبھی نہیں جاتا۔

ترجمہ یہ فرق شروع میں آپ ہی نے بیان فرمایا ہے۔ اس کے بعد اصحاب خراسان میں مروج ہوا لیکن مشائخ عراق "رضا" کو مقام میں شمار کرتے ہیں اور یہ غایت توکل کا دوسرا نام ہے۔

شرح توکل سے مراد ہر حال میں قانع اور راضی برضا الٰہی رہنا۔ اس سے رضا کا دوام ثابت ہوتا ہے لہٰذا یہ مقام کہلائے گا نہ کہ حال۔

ترجمہ اور آج تک صوفیاء کے درمیان یہ اختلاف باقی ہے۔ اب ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

حقیقت رضا

پہلے ہم حقیقت رضا بیان کرتے ہیں اور پھر اسکی اقسام بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد حال و مقام کا فرق بیان کریں گے۔ انشاء اللہ عز و جل۔ یاد رہے کہ کتاب و سنت (قرآن و حدیث) سے "رضا" ثابت ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے۔ جیسا کہ حق تعالٰی نے فرمایا ہے وَرَضُوا عَنْهُ (اور وہ یعنی صحابہ کرام خدا سے راضی ہیں) نیز فرمایا لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ...... (یعنی حق تعالٰی

مومنین سے راضی ہے) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ **ذاق طعم الایمان من رضی باللّٰہ** (جو اللہ سے راضی ہوا اس نے حلاوت ایمان کا مزہ چکھا)۔

اقسام رضا

رضا کی دو قسمیں ہیں اول حق تعالیٰ کا بندہ کے کاموں سے راضی ہونا دوم بندہ کا حق تعالیٰ کے کاموں سے راضی ہونا۔ رضائے الٰہی کا ظہور یہ ہے کہ بندہ پر اللہ تعالیٰ کا فیض و کرم ہوتا ہے اور بندہ کی رضا کا ثبوت یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے فرمان کی مطابعت میں سرگرم رہتا ہے۔ اور اس کے احکام سے گردن نہیں موڑتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رضائے الٰہی مقدم ہے رضائے بندہ پر۔ یعنی پہلے حق تعالیٰ راضی ہوتا ہے پھر بندہ راضی ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک حق تعالیٰ کی بارگاہ سے فضل و کرم نہ ہو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کوئی نہیں کرتا۔ رضائے بندہ رضائے حق کا نتیجہ ہے۔ اور رضائے حق سے قائم ہے۔ اور رضا کیا ہے بندہ کے دل کا حق تعالیٰ کی قضا کو تسلیم کرلینا ہے۔ خواہ عطا ہو یا محرومی۔ اور ہر حال میں خوش رہنا ہے۔ خواہ وہ حال مشاہدہ جلال ہو یا جمال۔

شرح مشاہدۂ جلال و جمال

سالک کے حال میں انشراح و بسط کو مشاہدہ جمال کہتے ہیں اور سختی و قبض ہو تو اس کو مشاہدہ جلال کہا جاتا ہے۔

ترجمہ چنانچہ جب سالک کو عطا سے واسطہ پڑے یا جفا سے وہ ہر حال میں راضی برضا و قضا الٰہی رہتا ہے۔ خواہ وہ آتش ہیبت (جلال) میں جلایا جائے خواہ نور لطف و جمال سے نوازا جائے اس کے لئے دونوں مساوی ہیں۔ سوختن (جلنا) اور افروختن (منور ہونا) اسی کے لئے یکساں ہے۔ اس وجہ سے کہ ان دونوں

حالتوں میں مشاہدہ حق حاصل ہے۔ و ہر چہ از دوست نیکو است ۔(یعنی محبوب کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے۔)

کسی نے امیر المومنین حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے اس قول کا کیا مطلب ہے۔

" الفقر احب الی من الغناء والسقم احب الی من الصحتہ "

(مجھے فقر دولت سے زیادہ محبوب ہے اور مرض صحت سے زیادہ عزیز ہے)

حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ :-

" رحم اللّٰہ اباذر اما انا فاقول من اشرف علی حسن اختیار اللّٰہ لہ لم یتمن غیرما اختار اللّٰہ لہ " (خدا رحم کرے ابوذر پر جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ کہتا ہوں کہ جس نے اختیار الٰہی کا مزہ چکھ لیا وہ اختیار الٰہی کے سوا کسی چیز کو نہیں چاہتا۔)

شرح اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک اپنی پسند اور ناپسند کو ترک کرے اور اس کے لئے جو کچھ حق تعالیٰ پسند کرے اسی کو بجان و دل قبول کرے۔

ترجمہ کیونکہ جب بندہ اپنی تمنا کو چھوڑ کر رضائے حق کا طالب ہو جاتا ہے تو تمام مصائب و آلام سے نجات پاتا ہے۔ لیکن یہ چیز حالت غیب میں میسر نہیں آتی بلکہ حالتِ حضور میں نصیب ہوتی ہے۔

شرح یہاں حضور سے مراد حق تعالیٰ کے ساتھ حاضر ہونا ہے۔ اور غیب سے مراد حضوری حق سے محروم ہونا ہے۔ حضور کیا ہے وہی مقام قرب ہے جس کی تاکید حدیث **بی یسمع و بی یبصر** میں آئی ہے۔ اور غایت قرب کو فنا فی اللہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جس کے بے شمار مراتب ہیں۔

ترجمہ کسی نے خوب کہا ہے : **لان الرضا للاحزان نافیتہ و للغفلتہ معالجتہ شافیتہ** (اس لئے کہ رضا مصائب کے لئے نافع اور غفلت کے لئے دافع ہے) رضا غیر اللہ کے خیال سے دل کو محفوظ رکھتی ہے اور تمام مشکلات سے نجات دلاتی ہے کیونکہ اس کے اندر مشکلات آسان کرنے کی برکت و قوت موجود ہے اور حقیقت رضا یہ ہے کہ بندہ یقین محکم کرلے کہ ہر چیز کا دینا اور نہ دینا اللہ عزوجل کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ اعتقاد رکھے کہ وہ بندہ کے ہر حال سے آگاہ ہے (یعنی وہ جانتا ہے کہ بندہ مجھ سے خوش ہے یا ناخوش) اس قسم کے ارباب کی چار اقسام ہیں :۔

اول : راضی بہ عطا (یعنی روحانی نعمتوں پر خوش) یہ اہل معرفت ہیں۔

دوم : راضی بہ نعما (دنیا کی نعمت پر خوش) یہ اہل دنیا ہیں۔

سوم : راضی بہ بلا (یعنی آلام و مصائب پر خوش) جو اصحابِ امتحان ہیں۔

چہارم : راضی بہ اصطفا (یعنی وہ جن کو حق تعالیٰ اپنی دوستی کے لئے چن لے) یہ اہل محبت ہیں۔

پس گروہ اول کے لوگ جو عطا کرنے والے کی وجہ سے عطا سے خوش ہیں یعنی نعمت سے اس لئے خوش ہیں کہ وہ محبوب حقیقی کی عطا کردہ ہے اسے دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور ہر قسم کے رنج و ملال و مشقت ان کے قلب سے دور ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے گروہ کے لوگ جو نعمتوں کی وجہ سے نعمت دینے والے سے خوش ہوتے ہیں۔ دنیاوی نعمتوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ اور صرف تکلف سے (نہ کہ دل سے) رضا اختیار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ رنج و الم میں مبتلا رہتے ہیں۔ کیونکہ تکلف میں تکلیف ہے معرفت اس وقت حاصل

ہوتی ہے کہ جب بندہ کو مشاہدہ حق حاصل ہو۔ لیکن جو علم معرفت سے بے بہرہ ہو وہ الٹا حجاب بن جاتا ہے۔ اس قسم کا علم نا آشنائی اور اس قسم کی نعمت زحمت بن جاتی ہے۔ لہذا وہ عطا الٹا غطا (پردہ) بن جاتی ہے۔ کیونکہ جو لوگ دنیاوی نعمتوں کی وجہ سے حق تعالی سے راضی رہتے ہیں وہ ہلاکت اور بربادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی (کھوٹی) رضا ان کے لئے جہنم بن جاتی ہے۔ اس وجہ سے کہ ساری دنیا کی نعمتیں بھی اس قابل نہیں کہ ان سے دل لگایا جائے یا اس کا ذرہ بھر غم کھایا جائے۔ نعمت اس وقت نعمت ہے جو منعم حقیقی کی یاد دلائے۔لیکن جب نعمت منعم (نعمت دینے والے) کے درمیان حجاب بن جائے تو وہ عطا نہیں زحمت ہے۔

تیسرے گروہ کے لوگ جو بلا و مصائب پر راضی ہوتے ہیں ان کو مصیبت میں محبت اور مشقت میں مشاہدہ میسر آتا ہے اور مشاہدہ کی مسرت کیوجہ سے ان کی زحمت رحمت میں بدل جاتی ہے۔ چوتھے گروہ کے لوگ جو اصطفا یعنی دوستیٔ حق کی وجہ سے راضی برضا ہوتے ہیں وہ حق تعالی کے عاشق ہیں۔ ان کی زندگی حق تعالی کے لئے وقف رہتی ہے خواہ سختی ہو یا نرمی۔ اور ان کی منزل خالص ذات (ذات بحت' ذات لا تعین) ہوتی ہے۔ وہ ہر دم انس و محبت کے باغ میں خیمہ زن ہوتے ہیں۔ اور اس دنیا میں موجود ہونے کے باوجود عالم غیب کے باسی ہوتے ہیں۔فرشی ہونے کے باوجود عرشی ہوتے ہیں جسموں کے باوجود روحانی ہوتے ہیں' موجِدان روحانی ہونے کی وجہ دل خلق خدا سے ہٹا لیتے ہیں۔ ہمیشہ احوال و مقاماتِ روحانی میں مستغرق رہ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے ہیں اور حق تعالی کی محبت میں سرشار ہو کر اس کے لطف و کرم کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان ہی حضرات کی شان میں حق تعالی نے فرمایا ہے لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيٰوةً وَلَا نُشُورًا (وہ اپنے لئے نہ نفع و نقصان کا خیال

رکھتے ہیں نہ مرنے یا زندہ رہنے کی فکر کرتے ہیں اور نہ آخرت کی) ان کی رضا دوزخ کے خوف اور بہشت کی طمع سے آزاد ہوتی ہے۔ کیونکہ غیر اللہ کے ساتھ راضی ہونا بڑی ہلاکت اور اللہ سے راضی ہونا بڑی سعادت ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :۔

من لم یرض باللّٰہ و بقضائہ شغل قلبہ و تعب بدنہ (جو شخص اللہ اور اس کی تقدیر پر راضی نہیں ہوتا اس کا قلب پریشان اور جسم عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔) واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

رضا کے متعلق اقوالِ مشائخ

روایات میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ :۔

"الٰہی مجھے ایسا عمل بتایئے کہ جس کے کرنے سے آپ کی رضا حاصل ہو۔ حق تعالیٰ نے جواب دیا کہ اے موسیٰ تیرے اندر یہ طاقت نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی وہ عجز و نیاز سے سجدہ میں گر گئے تو حق تعالیٰ کی جناب سے وحی نازل ہوئی کہ اے ابن عمران میری رضا اس میں ہے کہ تو میری قضا پر راضی رہے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ حق تعالیٰ کی قضا پر راضی ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ بشر حافی رضی اللہ عنہ نے حضرت خواجہ فضیل ابن عیاض رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ زہد افضل ہے یا رضا۔ آپ نے جواب دیا کہ زہد سے رضا افضل ہے۔ کیونکہ رضا سے اوپر کوئی منزل نہیں ہے جس کی راضی

کے دل میں تمنا باقی رہ جائے۔ جیسا کہ دروازہ پر حاضری سے بارگاہ معلی میں حاضری افضل ہے۔ اور اس حکایت سے محاسبی رحمتہ اللہ علیہ کے قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ رضا کا تعلق احوال سے ہے نہ کہ مقامات سے۔ رضا مواہب سے ہے نہ کہ مکاسب سے (یعنی عطیہ الٰہی ہے جو کوشش سے حاصل نہیں ہوتا) نیز یہ بھی ممکن ہے کہ راضی کے دل میں کوئی تمنا ہو۔ کیونکہ حضور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دعا کے دوران فرمایا :-

اسئلک الرضاء بعد القضاء (یعنی اے خدا مجھے اس طرح رکھ کہ تیری قضا آنے پر تو مجھے راضی پائے۔)

اس بات سے ثابت ہوا کہ قضا کے وارد ہونے سے پہلے رضا نہیں بلکہ بعد میں واقع ہوتی ہے۔ کیونکہ قضا سے پہلے راضی رہنے کا ارادہ ہوتا ہے نہ کہ خود رضا۔ رضا اور ہے اور رضا کا ارادہ اور چیز ہے۔ ارادہ رضا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حضرت ابوالعباس بن عطاؒ نے فرمایا ہے کہ :-

" الرضاء نظر القلب الی قدیم اختیار اللّٰہ للعبد "

(رضا یہ ہے کہ آدمی یقین رکھے کہ جو کچھ حق تعالیٰ کی قدیم تقدیر میں آچکا ہے وہی اس کے لئے بہتر ہے۔)

اس لئے تقدیر الٰہی کے وارد ہونے پر مضطرب نہ ہو اور دل کو مضبوط رکھے۔

حضرت حارث محاسبی جو صاحب مذہب ہیں کا قول ہے کہ :-

" الرضاء سکون القلب تحت مجاری الاحکام " (رضا سکون دل کا نام ہے احکام الٰہی کے اجرا میں) کیونکہ اِس مضمون پر آپ کا ایک اور قول یہ ہے کہ سکون قلب مکاسب سے نہیں مواہب سے ہے یعنی کوشش سے نہیں بلکہ حق تعالیٰ کے

فضل وکرم سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رضا کا تعلق احوال سے ہے نہ کہ مقامات سے۔

روایت ہے کہ حضرت عتبۃ الغلام رحمتہ اللہ علیہ ساری رات نہ سوئے اور صبح تک یہ مناجات کرتے رہے کہ :-

"ان تعذبنی فلنا لک محب و ان ترحمنی فلنا لک محب"

(خواہ تو مجھے عذاب دے تو بھی میں آپ کا عاشق ہوں خواہ مجھ پر رحم کرے تب بھی میں آپ کا عاشق ہوں) ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دوزخ کا عذاب اور بہشت کی نعمت تن پر ہوتی ہے اور دوستی کا تعلق دل سے ہے۔ اور تن کی تکلیف سے محبت میں فرق نہیں آتا۔ اس سے بھی حضرت محاسبیؒ کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ رضا محبت کا نتیجہ ہے اور جو کچھ اللہ کا حکم ہو محب اس پر راضی ہوتا ہے۔ بندہ اور مولا کے درمیان نہ عذاب حائل (پردہ) ہو سکتا ہے نہ نعمت۔ غرضیکہ وہ حق تعالیٰ کی پسند کو اپنی پسند سے زیادہ افضل سمجھتا ہے۔

حضرت ابو عثمان حیری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ :-

"چالیس سال سے میری یہ حالت ہے کہ جس حال میں مجھے حق تعالیٰ نے رکھا ہے اس سے خوش ہوں اور دوسرے حال میں تبدیل کیا ہے تو اس سے بھی خوش ہوں"۔

اس سے بھی رضا کے دوام اور کمالِ محبت کا ثبوت ملتا ہے۔

حکایت ایک دفعہ ایک درویش دریائے دجلہ میں گر گیا۔ کسی نے باہر سے آواز دی کہ کیا کسی کو بلاؤں تاکہ تجھے باہر نکال لے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ اس آدمی نے کہا کیا تم مرنا چاہتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس نے کہا کہ

پھر تم کیا چاہتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ جو کچھ حق تعالیٰ چاہتا ہے میں وہی چاہتا ہوں۔ بندہ کو چاہت سے کیا کام ؟

غرضیکہ رضا کے متعلق مشائخ کے اقوال بہت ہیں۔ اگرچہ ان کے الفاظ میں فرق ہے تاہم ان کا مطلب وہی ہے جو میں نے بیان کیا ہے۔ اور اختصار کی خاطر تفصیل کو ترک کرتا ہوں اور حال و مقام کا فرق بیان کرتا ہوں تاکہ قارئین کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

"حال" و "مقام" میں فرق

یاد رہے کہ یہ دو لفظ چونکہ طائفہ صوفیاء کے اقوال اور عبادات میں مستعمل ہیں۔ اور علم تصوف میں مستقل حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ان کا علم رکھنا طالبوں کے لئے ضروری ہے۔

جاننا چاہئے کہ عام طور پر لفظ مقام کا مطلب میم کے پیش کے ساتھ بندہ کا قائم ہونا اور زبر کے ساتھ جائے قیام سمجھا جاتا ہے۔ عربی زبان میں میم کے پیش کے ساتھ مقام کا مطلب ہے کسی بات پر قائم رہنا اور میم کی زبر کے ساتھ مقام کا مطلب ہے رہنے کی جگہ۔ لیکن تصوف کی اصطلاح میں مقام کا مطلب ہے راہ حق میں جم جانا اور اس کا حق ادا کرنا ہے۔ تاکہ اس میں کمال حاصل ہو۔ چنانچہ مقامات راہ حق میں سے پہلا مقام توبہ ہے دوسرا انابت یعنی توبہ کا قبول ہونا۔ تیسرا مقام زہد اور چوتھا توکل وغیرہ۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (کوئی ایسا شخص نہیں جس کے لئے کوئی مقام نہ ہو) ۔

حال حال ایک کیفیت کا نام ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ کہ جب آتی ہے تو کوشش سے دفع نہیں کی جا سکتی ہے

اور جب جاتی ہے تو کوشش سے روکی نہیں جاسکتی۔

مقام مقام سے مراد طلب حق میں وہ چیز ہے جو انسان کی کوشش اور جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر "مقام" اکتسابی ہے (کوشش سے حاصل ہو سکتا ہے) اور "حال" وہبی ہے جو حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوتا ہے۔ نہ کہ جدوجہد سے۔ اس وجہ سے "مقام" اعمال کا نتیجہ ہے اور "حال" افضال کا (یعنی فضل رب کا)۔ مقام کسبی ہوتا ہے اور حال وہبی۔ پس "صاحبِ مقام" اپنے مجاہدات کی وجہ سے قائم ہوتا ہے اور "صاحبِ حال" اپنے آپ سے فانی اور فیضان حق سے باقی ہوتا ہے جو اس کے قلب پر حق تعالیٰ کی طرف سے وارد ہوتا ہے۔

حال عارضی ہوتا ہے اور مقام مستقل

اس مضمون پر مشائخ کا اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ حال دائمی ہوتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دائمی نہیں ہوتا۔ لیکن حضرت حارث محاسبی رضی اللہ عنہ حال کو دائمی قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ محبت و شوق، قبض و بسط، تمام احوال ہیں۔ اگر حال دائمی نہ ہو تو محب محب نہیں رہتا۔ نہ مشتاق مشتاق رہتا ہے۔ جب تک محبت دائمی نہیں ہوتی انسان محب نہیں کہلایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ "رضا" کو "حال" قرار دیتے ہیں۔ حضرت ابوعثمان کے مندرجہ بالا قول (**منذ اربعین سنته**) کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے۔ اور ایک گروہ حال کے دوام و بقا کو روا نہیں رکھتا (عارضی قرار دیتا ہے) جیسا کہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ **الاحوال کالبروق فان بقیت فحدیث النفس** (احوال بجلی کی طرح ہوتے ہیں یعنی جھلک دکھا کر چلے جاتے ہیں۔ اگر باقی رہ جائیں تو یہ حدیث نفس ہوتی ہے۔ یعنی انسان کا اپنا

تخیل)۔کیونکہ جو باقی رہ جاتا ہے وہ اپنے دل کی تمنا اور خواہش ہے (نہ کہ غیبی وارد) بعض نے حال کے عارضی ہونے کو یوں بیان کیا ہے کہ **الاحوال کاسمها یعنی انها کما تحل بالقلب تزول** (حال حلول کرنے والی چیز کی طرح ایک لمحہ کے لئے آتا ہے اور زائل ہو جاتا ہے۔) اگر دیر تک برقرار رہے تو صفت کہلاتا ہے (مقام بن جاتا ہے) اور چونکہ صفت کا قیام موصوف کے ساتھ ہوتا ہے اور چونکہ موصوف اپنی صفت سے کامل تر ہوتا ہے اس لحاظ سے بھی حال کا عارضی ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ اور یہ فرق میں نے اس لئے بیان کیا کہ صوفیاء کرام کی کتابوں میں ہر جگہ حال و مقام کا ذکر آیا ہے اور تم کو اس کی حقیقت معلوم رہے۔

غرضیکہ رضا کا شمار سلوک الی اللہ کے آخری مقامات میں ہوتا ہے۔ اور احوال سلوک کی ابتدا ہے۔ یہاں پر پہنچ کر اکتساب اور وہب جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف جدوجہد ہے دوسری طرف محبت اور اس کا غلبہ۔

شرح اس کا مطلب یہ ہے کہ حصول مقام رضا کے لئے جدوجہد کی ضرورت بھی ہے اور فضل رب کی بھی۔ اس وجہ سے کہ پہلے مقام ہے جو جدوجہد سے حاصل ہوتا ہے اور پھر حال جو حق تعالی کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے اور جب مقام کے بعد آدمی حال تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی کوشش کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور حق تعالی کا فضل و کرم شروع ہو جاتا ہے۔

ترجمہ رضا سے اوپر کوئی مقام نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر مجاہدات ختم ہو جاتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ رضا کی ابتدا کسب سے ہوئی اور انتہا حق تعالی کے فضل وکرم پر۔ اس وجہ سے سالک کبھی احتمال کرتا ہے کہ چونکہ شروع میں کوشش کو اس میں دخل تھا رضا کو "مقام" کہدیا اور جب حق تعالی کے فضل

وکرم کا مشاہدہ کیا تو اس کا نام "حال" رکھ دیا۔ یہ ہے حضرت حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک تصوف میں۔ طریقت کے باقی معاملات میں انہوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ آپ اپنے مریدین کو ایسے کاموں سے منع کرتے تھے کہ جن میں اندیشہ خطا ہو۔خواہ اصولی طور پر اس میں کوئی برائی نہ ہو۔ مثلاً ایک دن ابو حمزہؒ بغدادی جو ان کے مرید تھے آپ کے پاس آئے ہوئے تھے۔ ابو حمزہ رضی اللہ عنہ سماع سنتے تھے اور صاحب حال تھے۔ حضرت شیخ حارثؒ کے پاس ایک بڑا مرغ تھا۔ جب اس نے بانگ دی تو ابو حمزہؒ نے نعرہ مارا (حال میں آگئے) یہ دیکھ کر حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے چھری اٹھالی اور مرغ کو ذبح کرنے لگے۔ اور ابو حمزہؒ سے کہا کہ تو نے کفر کا کام کیا ہے۔ اب پھر سے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ۔ لیکن مریدوں نے حضرت شیخ کے پاؤں پکڑ لئے اور مرغ کو بچا لیا۔ مریدوں نے حضرت شیخ سے عرض کیا کہ حضور ہم تو ابو حمزہ کو خاصان اولیاء اور موحدین میں شمار کرتے ہیں آپ اُن کو کس وجہ سے برا سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں اسے برا نہیں کہتا وہ تمام خوبیوں کا مالک ہے اور اس کا باطن توحید میں غرق ہے۔ لیکن اس نے جو یہ کام کیا یہ حلولیوں کی مانند تھا اس سے حلول کا عقیدہ رکھنے والوں کے اقوال کی تائید ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مرغ عقل نہیں رکھتا اور بانگ دینا اس کی فطرت میں ہے۔ اس کی آواز کو حق کی آواز کیوں سمجھ لیا گیا۔ حق تعالیٰ تو غیر منقسم ذات ہے جو حلول و اتحاد سے پاک ہے۔ دوستان حق تعالیٰ کو صرف حق تعالیٰ کے کلام پر وجد آنا چاہئے اور اسلام کی باتوں پر حال طاری ہونا چاہئے۔ حق تعالیٰ حلول و اتحاد سے برتر اور مبرا ہے کیونکہ وہ قدیم ہے حادث قدیم نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے مرغ کی آواز پر حال طاری ہو جائے تو دیکھنے والے کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس آدمی نے مرغ کے اندر حق تعالیٰ کی آواز سنی اس لئے وجد طاری ہوا۔ جب ابو حمزہ نے حضرت شیخ کی دقت نظر (دقیق

نظری اور نکتہ سنجی) کو دیکھا تو عرض کیا کہ یا شیخ اگرچہ میرا یہ فعل احوالاً درست تھا لیکن چونکہ یہ فعل گمراہ لوگوں کے فعل کی مانند تھا اس لئے میں اس سے توبہ کرتا ہوں۔ اور پھر نہیں کروں گا۔ غرضیکہ اس قسم کی تنبیہات حضرت شیخ حارث محاسبیؒ کے کلام میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ جو اختصار کی خاطر ترک کی جاتی ہیں۔

شرح "حلول و اتحاد" حلول اور اتحاد کافرانہ عقائد ہیں جو غیر مسلم ارباب روحانیت میں پائے جاتے ہیں جیسے عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ خداوند تعالیٰ حضرت عیسیٰ کے اندر اتر آیا (یعنی حلول کیا) یا جیسے ہندو لوگ کہتے ہیں کہ رام اور کرشن خدا کے اوتار ہیں۔ اس لئے ان کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کرتے ہیں۔ حلول و اتحاد تقریباً ہم معنی ہیں۔ فرق یہ ہے اتحاد میں دو علیحدہ ہستیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متحد مانا جائے جیسے قرب حق سے کوئی شخص یہ سمجھے کہ بندہ بحیثیت ایک انسان پرواز کرکے حق تعالیٰ کے سامنے جا بیٹھے اور حلول یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے وجود میں اس کا وجود گھس کر یکجا ہو جائے۔ دراصل یہ عقائد مقام فنا فی اللہ کی حقیقت اور ماہیت نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب انبیاء علیہم السلام یا اولیاء کرام اپنی قرب حق اور فنا فی اللہ کی حالت کو بیان کرتے ہیں تو جن لوگوں کو یہ مقام حاصل نہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ شاید حق تعالیٰ کے ساتھ قرب اور اس کی ذات میں فنا کا مطلب یہ ہے کہ انسان ذات حق میں اس طرح گھل مل جاتا ہے جیسے شکر پانی میں۔ لیکن عارفین کے نزدیک یہ بات غلط ہے ان کے نزدیک یہ خیال کفر ہے۔ فنا فی اللہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سالک یا عارف اور واصل باللہ ذات حق میں اس طرح فنا ہو جاتا ہے۔ جس طرح کہ شکر کا وجود پانی میں۔ بلکہ فنا کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ عقیدہ وحدت الوجود جو عین اسلامی عقیدہ ہے کی بنا پر ذات حق کے سوا غیر کا وجود نہیں ہے اور یہ جو اشیائے کائنات

کا وجود پایا جاتا ہے یہ سراب کی طرح محض خیالی اور وہمی ہے اس لئے جب سالک تزکیۂ نفس کے ذریعے عروج کے بلند مقامات پر پہنچتا ہے تو اسے وحدت الوجود کا مشاہدہ ہوتا ہے اور وہ ہر چیز کو فانی' خیالی اور وہمی دیکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے وجود کو بھی وہم و گمان سمجھتا ہے۔ اور جب اس کی روح ذات حق یا روح حق میں واصل ہو کر گم ہو جاتی ہے تو وہ اسے اپنی فنا اور ذات حق کی بقا کا نام دیتا ہے۔ اس وقت انسان مٹ جاتا ہے۔ اور ذاتِ حق باقی ہوتی ہے۔ حسین ابن منصور حلاج کے نعرۂ اناالحق کی حقیقت یہی تھی اناالحق کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں حلاج حق ہوں بلکہ حلاج کی ہستی موہوم مٹ چکی تھی اور حق بول رہا تھا کہ اناالحق (میں حق ہوں)۔اگر کائنات اور اشیائے کائنات کا وجود حق تعالیٰ کے کے وجود سے علیحدہ مانا جائے اور وہمی اور خیالی نہیں بلکہ حقیقی مانا جائے تو ذات حق محدود ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ ماننا پڑتا ہے کہ حق تعالیٰ کائنات یا اشیائے کائنات میں نہیں ہے باقی ہر جگہ موجود ہے۔ اس سے حق تعالیٰ کا وجود محدود ہو جاتا ہے جو کفر ہے اس لئے عقائد اہلسنّت والجماعت کی رو سے اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ کائنات کا وجود خیالی اور وہمی مانا جائے۔ اور حق تعالیٰ کا وجود حقیقی مانا جائے۔ جیسے سمندر میں لہروں' حبابوں' جھاگ اور برف کے ٹکڑوں کے وجود کی کوئی اصل نہیں سب کی اصل پانی ہے جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہے۔ کائنات مخلوق ہے اور خداوند تعالیٰ خالق ہے۔ یہ کائنات حق تعالیٰ کی صفت تخلیق کا مظہر ہے۔ چونکہ صفت موصوف سے جدا نہیں ہو سکتی اس لئے مخلوق خالق سے جدا نہیں ہو سکتی۔دونوں کا وجود ایک ہے۔ یہ ہے وحدت الوجود کا عقیدہ جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ لیکن حلول واتحاد اس لئے غیر اسلامی عقائد ہیں کہ اس سے دو وجود لازم آتے ہیں۔ جیسے شکر اور پانی۔اگر شکر اور پانی دونوں کا وجود خیالی اور حق تعالیٰ کا وجود حقیقی مانا جائے تو حلول اور اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ

دونوں ایک ہی وجود کے مختلف مظاہر ہیں۔ عقیدۂ وحدت الوجود کے بغیر فنا فی اللہ حلول بن جاتا ہے۔ لیکن جب غیر کا وجود ہی نہیں ہے حلول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ترجمہ اور یہ طریقہ (یعنی حلول و اتحاد سے پرہیز) بہت پسندیدہ ہے اور راہ سلامتی ہے اور یہ صحو اور ہوشیاری کا راستہ ہے۔

شرح مقام صحو سے مراد سالک کا مقام فنا کے استغراق سے نکل کر مقام دوئی اور کثرت پر واپس آنا اور استغراق کو ترک کرکے ہوشیاری میں آنا۔ صحو کے معنی ہوشیاری کے ہیں۔ اس کے مقابل محویت اور بے خودی ہے۔ مشائخ اسلام کی زبردست اکثریت کا مقام صحو ہی رہا ہے۔ صرف گنتی کے چند حضرات ہمیشہ استغراق میں رہے ہیں۔ جیسے مجاذیب اور قلندر باقی تمام اہل صحو تھے۔ جو عبدیت کے مقام پر سرفراز تھے اور شریعت پر سختی سے قائم تھے۔

ترجمہ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے "جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ تہمت میں نہیں پڑتا"۔ یعنی غیر اسلامی عقائد ترک کرتا ہے۔ اور میں علی بن عثمان جلابی ہمیشہ خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو لیکن رسمی درویشوں کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ اگر ان کی موافقت نہ کی جائے تو دشمن بن جاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سلسلہ قصاریہ

یہ سلسلہ حضرت ابی صالح بن حمدون بن احمد بن عمارۃ القصار رضی اللہ عنہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جو بڑے عالم دین اور شیخ طریقت تھے۔ آپ کا مسلک ملامتیہ تھا۔ مسائل تصوف میں آپ کا کلام بہت بلند ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :

"خلوت میں حق تعالیٰ کے ساتھ تیرا معاملہ جلوت (ظاہر میں) میں اس معاملہ سے بہتر ہونا چاہئے جو خلق کے ساتھ تیرا معاملہ ہو۔ کیونکہ تیرا خلق کے ساتھ مشغول ہونا حق تعالیٰ سے حجاب کا باعث ہے۔

شرح یعنی تو خلق کو خوش کرنے کی خاطر جو کام کرتا ہے۔ حق تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے اس سے زیادہ محنت کرنی چاہئے۔ کیونکہ تیرے متعلق حق تعالیٰ کی خوشنودی، خلق کی خوشنودی سے بہتر ہے اور خلق کی خوشنودی حجاب اکبر ہے تیرے اور حق کے درمیان۔

ترجمہ فرقہ ملامتیہ کے متعلق اس کتاب میں پہلے کافی بیان ہو چکا ہے۔

جوانمردی کیا ہے

آپ فرماتے ہیں کہ نیشارہ کی نہرچرہ کے کنارے پر جا رہا تھا کہ میں نے نوح کو دیکھا جو اس علاقے کا ایک بڑا عیار (بدمعاش) آدمی تھا لیکن سخاوت میں مشہور تھا۔ اور تمام بدمعاشوں کا سردار تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اے نوح یہ بتاؤ کہ جوانمردی کسے کہتے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ میری جوانمردی یا آپ کی۔ میں نے کہا دونوں بتاؤ۔ اس نے کہا کہ میری جوانمردی یہ ہے کہ میں قبا (لباس دولتمندی) اتار کر مرقعہ (لباس درویشی) پہنوں اور اس کے مطابق عمل کروں تاکہ صوفی بن جاؤں اور خدا سے شرم کرتے ہوئے اس لباس کی برکت سے گناہ سے پرہیز کروں۔ اور آپ کی جوانمردی یہ ہے آپ اپنا مرقعہ (گدڑی) اتار دیں تاکہ نہ آپ خلق سے دھوکہ کھائیں اور نہ خلق آپ سے۔ پس میری جوانمردی عالم ظاہری میں شریعت کی پابندی ہے اور آپ کی جوانمردی اسرارِ توحید کی حفاظت ہے۔ عالم بطون میں۔ اور یہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سلسلہ طیفوریہ

یہ سلسلہ حضرت خواجہ ابویزید رضی اللہ عنہ طیفور بن عیسیٰ بن سروشان بسطامی رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے۔ جن کا شمار اکابر مشائخ طریقت میں ہوتا ہے۔ آپ کا مسلک غلبۂ سکر و استغراق اور غلبۂ عشق الٰہی تھا۔ اور سکر و مستی کسبی نہیں (کوشش سے حاصل نہیں ہوتی) اور جو چیز کوشش سے باہر ہے اس کو اپنی طرف منسوب کرنا غلط ہے اور اس کی تقلید محال ہے۔ لیکن اہل صحو حالت سکر سے آزاد ہوتے ہیں اور نہ ہی سکر (استغراق) کو اپنی مرضی سے اپنے آپ پر وارد کیا جا سکتا ہے۔ مغلوب الحال خلق خدا کی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ استغراق سے باہر ہو کر مقام صحو پر نہیں آتا۔ اور مشائخ طریقت کے نزدیک اصحاب صحو کے سوا کسی کی تقلید واجب نہیں۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ تکلف سے راہ سکر اختیار کرنی چاہئے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :-

ابکوا فان لم تبکوا فتباکوا "تم روؤ یا رونے کی صورت اختیار کرو"

اس کی دو صورتیں ہیں اول یہ کہ ریاکاری سے اس گروہ کی شکل و صورت بنائی جائے یہ صریحی شرک ہے۔ دوم یہ کہ نیک لوگوں کی شکل و صورت اس نیت سے اختیار کی جائے کہ خدا تعالیٰ اسے ان حضرات کے مقام تک پہنچا دے جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :-

من تشبہ بقوم فھو منھم (جس نے کسی قوم کی شکل و صورت اختیار کی وہ اسی میں سے ہو جاتا ہے)۔

پس انسان جس قدر مجاہدات کر سکتا ہے۔ عمل میں لائے۔ اور حق تعالیٰ کی بارگاہِ معلی میں امید وار رہے کہ حقیقت حال سے آگاہی فرماوے کیونکہ مشائخ

عظام نے فرمایا ہے کہ **المشاهدات مواریث المجاهدات** (مجاہدات سے مشاہدات حاصل ہوتے ہیں۔) لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ مجاہدات ہر حال میں بہتر ہیں۔ سوائے سکر و استغراق کے جو کسب یعنی کوشش سے حاصل نہیں ہوتے البتہ سکر کی بجائے صحو کے مقامات مجاہدات سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن صاحب صحو مقام سکر پر قیام نہیں کر سکتا کیونکہ یہ محال ہے۔ اب میں سکر و صحو کی حقیقت اور مشائخ کے اس بارے میں اختلاف کو بیان کرتا ہوں۔ تاکہ اشکال رفع ہو۔ انشاء اللہ عز وجل۔

سکر اور صحو کے بیان میں

تجھے خدا عزت دے تجھے جاننا چاہئے کہ ارباب حقیقت کے نزدیک سکر اور غلبہ سے مراد محبتِ الٰہی کا غلبہ ہے اور صحو کا مطلب مقامِ ہوشیاری میں آنا ہے۔

شرح سکر سے مراد وہ بے خودی اور محویت ہے جو سالک پر قربِ حق میں طاری ہو جاتی ہے۔ یہ استغراق مقام فنا فی اللہ کا ثمرہ ہے۔ صحو کا مطلب ہے ہوشیاری۔ جب سالک مقام فنا کو ترک کرکے مقام دوئی پر واپس آتا ہے تو غلبہ استغراق سے نکل جاتا ہے۔ مشائخ کے نزدیک سکر سے صحو زیادہ افضل ہے کیونکہ اس میں کثرت سے عبادت کا موقعہ ملتا ہے۔ لیکن غلبۂ سکر و استغراق میں سالک عام طور پر فرائض اور واجبات پر عمل کر سکتے ہیں نوافل نہیں ادا کر سکتے۔ البتہ وہ حضرات جن کو مقام جامعیت حاصل ہے جیسا کہ کتاب ہٰذا کے مقدمہ میں بیان کیا گیا وہ بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتے ہیں اور باقی باللہ بھی۔ اس مقام کو عبدیت اور بقاباللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جو نزول کا خاصہ ہے اور مقام فنا فی اللہ میں عروج ہی عروج ہے۔

سکر کو افضل سمجھنے والے حضرات کا نظریہ

ترجمہ بعض حضرات سکر کو افضل سمجھتے ہیں بعض صحو کو۔ جو حضرات سکر کو افضل سمجھتے ہیں وہ حضرت خواجہ بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے متبعین ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صحو اس وقت قائم ہوتا ہے جب آدمی اپنے صفات اور ہستی کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور یہ حجاب اکبر ہے۔ اور سکر اس وقت قائم ہوتا ہے جب بشریت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا اختیار' تدبیر اور ارادہ مٹ جاتا ہے اور اس کا تصرف حق تعالیٰ کے تصرف میں فنا ہو جاتا ہے۔ اور انسان کے اندر بہیمانہ صفات (جانوروں جیسی صفات) کی بجائے صفات رحمانی رہ جاتی ہے۔ اور یہ اکمل' افضل اور بہترین حالت ہے۔ چنانچہ آیہ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ (داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا) سے ظاہر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام مقام صحو میں تھے اس لئے جو فعل (یعنی قتل) ان سے سرزد ہوا اس کو حق تعالیٰ نے ان کا فعل کہا ہے۔ لیکن جب ہمارے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام مقام سکر میں تھے تو حق تعالیٰ نے آیہ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (جب آپ نے کفار پر مٹی پھینکی تو آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل کو اپنا فعل قرار دیا۔ ان دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ چونکہ حضرت داؤد علیہ اسلام حالت صحو میں تھے اور اپنی ذات سے قائم تھے حق تعالیٰ نے وہ فعل ان کے ساتھ منسوب فرمایا۔ لیکن چونکہ ہمارے پیغمبر علیہ الصلواۃ والسلام اپنی ذات سے فانی اور حق تعالیٰ کے ساتھ باقی تھے۔ ان کے فعل کو حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ منسوب فرمایا۔ اور بندہ کے فعل کا حق تعالیٰ کے ساتھ منسوب ہونا اس سے بہتر ہے کہ حق کا فعل بندہ سے منسوب کیا جائے۔ کیونکہ جب فعل حق بندہ کے ساتھ منسوب ہوتا ہے تو بندہ کی خودی قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن جب فعل بندہ حق کے ساتھ منسوب ہوتا ہے تو بندہ حق کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ یہ بندہ کا اپنی خودی

سے قائم ہونے کا نتیجہ تھا حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر جب "اوریہ" کی بیوی پر پڑی تو ناجائز کہلائی اور یہ بندہ کے حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہونے کا نتیجہ ہے چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر زید کی بیوی پر پڑی تو زید پر حرام ہو گئی۔ کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر حالت صحو میں تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر حالت سکر میں تھی۔

صحو کو سکر سے افضل سمجھنے والے حضرات کا نظریہ

جو حضرات صحو کو سکر سے افضل سمجھتے ہیں وہ حضرت شیخ جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے سلسلہ کے لوگ ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ سکر جائے آفت ہے کیونکہ اس سے پریشان حالی، صحت کی خرابی اور اپنی خودی کا گم ہونا لازم آتا ہے۔ جب ہر چیز کا دارو مدار طالب پر ہے یعنی اس کی فنا اور بقا یا اس کے گم ہو جانے اور باقی رہنے پر ہے تو جب خود طالب صحیح الحال نہیں ہو گا تو حقیقت حال پوشیدہ رہے گی۔ کیونکہ اہل حق کو تمام عوارضات (نقائص) سے بالاتر ہونا چاہئے۔ فرض کرو ایک نابینا ہے ایسا شخص کبھی اشیائے عالم سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اور نہ وہ آفات سے بچ سکتا ہے۔ جو لوگ حق تعالیٰ کے بغیر اشیائے عالم میں مستغرق رہتے ہیں وہ حقیقت اشیاء کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور نہ ان کے شر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اشیائے عالم کو دو طرح پر دیکھا جاتا ہے نظر بقا سے دیکھنا یا نظر فنا سے۔ اگر وہ اشیاء کو حالت بقا میں دیکھتا ہے تو اپنی بقا کی وجہ سے ہر چیز کو ناقص پائے گا۔ اگر فنا کی حالت میں دیکھتا ہے تو ہر چیز کو ذات حق میں گم پائے گا۔ غرضیکہ دونوں صورتوں میں وہ موجودات (اشیائے عالم) کو نابود سمجھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ **اللّٰھم ارنا الاشیاء کما ھی** (اے اللہ ہمیں حقیقت اشیاء سے آگاہ فرما) کیونکہ جو حقیقت اشیاء سے واقف ہوا آفت سے بچ گیا۔ نیز خداوند تعالیٰ کے

فرمان : فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ (اے عقل مندوں عبرت حاصل کرو) سے یہی بات مراد ہے۔ کیونکہ جب تک حقیقت اشیاء کو نہیں جانے گا عبرت کیسے حاصل کرے گا۔ اور یہ تمام امور حالت صحو کے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔ اور اہل سکر کو ان حقائق سے آگاہی حاصل نہیں ہوتی۔ دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ حالت سکر میں تھے تجلی الٰہی کو برداشت نہ کر سکے اور ہوش گم کر بیٹھے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (موسیٰ محو و بے خود ہو کر گر گئے) اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ حالت صحو میں تھے اور ایسے مقام قرب پر فائز تھے کہ جسے قرآن کی زبان میں قاب قوسین کہا گیا ہے۔ بے پناہ تجلیات کے طوفان کے وقت بھی آپ ہوشیار تر اور بیدار تر رہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

شربت الراح كاْساً بعد كاسٍ
فما نفذ الشراب و ما رويت

(میں نے شراب معرفت کے پیمانے درپیمانے نوش کئے لیکن نہ شراب ختم ہوئی نہ میری پیاس)

شرح کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

موسیٰ ز ہوش رفت زیک نظارۂ صفات
تو عین ذات بنگری و در تبسمی

(حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف صفات الٰہی کی ایک تجلی دیکھ کر مدہوش ہو گئے اے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام تو عین ذات کا مشاہدہ کر رہا ہے اور تبسم میں ہے)۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے۔ ؎

بہ ادا و خوبی سر طور گر خرامی
ارنی بگوید آنکس کہ گفت لن ترانی

(اے پیغمبرؐ اگر تو نازو ادا سے کوہ طور پر خراماں ہو کر جائے تو جس نے لن ترانی کہا تھا وہ ارنی کہہ دے۔

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو یہ جواب ملا کہ لن ترانی (تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا) لیکن تجھے دیکھ کر حق تعالیٰ یہ کہے گا کہ "میری طرف دیکھو" یاد رہے کہ سلوک الیٰ اللہ کا خاکہ جو مقدمہ کتاب میں پیش کیا گیا ہے اگر قارئین اس کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ سکر سے مراد مقام فنافی اللہ ہے جہاں ذات حق میں فنا کی وجہ سے طالب پر بے خودی کا دور دورہ رہتا ہے اور صحو سے مراد مقام بقا باللہ ہے۔ جہاں فنا کی مستی و استغراق سے نکل کر طالب اپنی خودی میں واپس لوٹ آتا ہے۔ اور چونکہ مقام فنا میں صفات باری تعالیٰ کے ساتھ بمصداق حدیث **تخلقوا باخلاق اللہ** (حق تعالیٰ کی صفات کے متصف ہو جاؤ) طالب حق تعالیٰ کی صفات سے متصف ہو کر خلیفۃ اللہ علی الارض کا لقب پاتا ہے اس لئے جمہور مشائخ کے نزدیک یہی مقام بقا باللہ و صحو زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے کیونکہ ایک تو اس میں اِنسان فرائض زندگی ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے دوسرے اسے بندۂ حق بننے اور ہر وقت عبدیت اور عبادت میں مشغول رہنے کا موقعہ ملتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہئے کہ اب وہ فنا کو ترک کر چکا ہے بلکہ اس کے اندر اس قدر روحانی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے۔ اور باقی باللہ بھی۔ لیکن فرق یہ ہوتا ہے۔ وہ روحانی قوت کی وجہ سے استغراق سے بالا تر ہو جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ وارفع مقام ہے اور مشائخِ اسلام کی زبردست اکثریت اسی مقام صحو یا بقا باللہ پر رہی ہے۔ سوائے اِکا دُکا مجاذیب کے

جن پر استغراق کا غلبہ ہوا تو مغلوب الحال ہو کر رہ گئے یا قلندر ہوئے۔ لیکن ایسے حضرات امت محمدیہ میں بہت کم ہیں اور انگلیوں پر گنے جاتے ہیں۔

(ترجمہ) حضرت داتا علیہ رحمہ کا مسلک

لیکن میرے شیخ علیہ رحمہ کا مسلک خواجہ جنیدؒ کی طرح صحو تھا۔ نہ کہ سکر۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ سکر بچوں کا کھیل ہے اور صحو مردان خدا کی جنازہ گاہ (فنا گاہ) ہے اور میں علی بن عثمان جلابیؒ اپنے شیخ کے مسلک پر ہوں۔ کیونکہ اصحاب سکر کا کمال صحو ہے۔ اور مقام صحو کا کمترین درجہ بشریت کا مٹ جانا ہے۔

شرح یہاں بشریت کے مٹ جانے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے مراد مقام فنا ہے جو سکر کا دوسرا نام ہے۔ بلکہ یہاں بشریت سے مراد نفسانیت کا مٹ جانا ہے۔

ترجمہ پس اگرچہ صحو آفت نظر آتا ہے سکر سے بہتر ہے کیونکہ سکر خود آفت ہے (اور صحو صرف آفت نظر آتا ہے۔)

شرح اب دیکھنا یہ ہے کہ صحو کیسے آفت نظر آتا ہے۔ وہ اس لئے کہ مقام صحو اور ہوشیاری میں تمام آداب و قواعد اور تکالیفِ بندگی و عبودیت لازم آتے ہیں اور سکر میں یہ قیود مٹ جاتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو سکر اس سے بھی بڑی آفت ہے کیونکہ سکر میں سراسر بحرِ محیطِ ذات کا طلاطم ہے۔ اور تنوعات عالم یعنی جہاں کی رنگینیوں اور دلفریبیوں سے محرومی ہے۔ نیز سکر مغلوب الحالی ہے اور صحو غالب الحالی۔ سکر میں عبودیت سے محرومی ہے اور صحو میں عبدیت تن عبدیت ہے۔ سکر میں صوم و صلوٰۃ مفقود اور صحو میں موجود ہوتے ہیں۔ سکر نیم انسانیت اور صحو مکمل انسانیت ہے۔

ترجمہ جیسا کہ حضرت ابو عثمان مغربی رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح حیات میں درج

ہے کہ آپ نے ابتدائے سلوک میں بیس سال صحراؤں میں عزلت (گوشہ نشینی) اختیار کی۔ اور اس عرصہ میں آدم زاد کی بو تک نہ سونگھی۔ مجاہدات کی وجہ سے آپ کا چہرہ دگرگوں ہو گیا۔ آنکھیں دھنس گئیں۔ انسانی شکل و صورت جاتی رہی۔ جب بیس سال کے بعد آپ کو آبادی میں جانے اور خلق کے درمیان رہنے کا حکم ہوا۔ تو آپ کے دل میں خیال آیا کہ پہلے بیت اللہ جا کر اہل اللہ کی صحبت اختیار کر لوں تاکہ باعث برکت ہو۔ ادھر مشائخ مکہ کو آپ کے آنے کی حق تعالیٰ کی طرف سے اطلاع ہو گئی۔ جب استقبال کے لئے باہر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی وہ شکل و صورت ہی نہ تھی اور نیم مردہ ہو چکے تھے۔ مشائخ نے یہ حالت دیکھ کر کہا کہ اے ابو عثمان آپ نے بیس سال اس طرح گزارے دیئے کہ اولاد آدم کی شکل تک نہیں دیکھی۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کیوں گئے تھے۔ وہاں کیا دیکھا، کیا حاصل کیا اور اب کیوں واپس آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں سکر کی حالت میں نکل گیا تھا۔ آفت سکر میں مبتلا رہا۔ اور ناکامی حاصل کی۔ اب عاجز آکر واپس آیا ہوں۔ مشائخ نے کہا کہ سچ ہے اسکے بعد کسی کی کیا مجال کہ سکر و صحو کی حقیقت بیان کرے۔

سکر و صحو کے متعلق لفظ آخر

خلاصہ یہ کہ "سکر" نام ہے احساسِ فنا کا عین بقائے صفت کے ساتھ۔ جو حجاب ہے۔ لیکن "صحو" نام ہے احساسِ بقا کا فنائے صفت کے ساتھ۔ اور یہ عین کشف ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صحو کی نسبت سکر فنا سے زیادہ قریب ہے تو محال ہے۔ اس وجہ سے کہ سکر ایک صفت ہے جو صحو پر زائد ہے۔ یعنی سکر کی زیادتی کی وجہ سے انسان کے صفات موقوف ہو جاتے ہیں اور وہ بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور جب سکر کی حالت میں نقصان آتا ہے۔ (یعنی کمی آجاتی ہے) تو سالکین پر ہوشیاری طاری ہو جاتی ہے۔ اور یہ ہے سکر و صحو میں طالبان کا غلو

(غایت)۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول سکر و صحو میں

حضرت ابو یزید رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق جو مغلوب الحال تھے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت شیخ یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ نے ان کو خط لکھا کہ :

"آپ کا اس شخص کے متعلق کیا خیال ہے کہ اسے بحر محبت سے ایک قطرہ ملا ہو اور وہ اس میں مست ہو"۔

آپ نے جواب دیا کہ :۔

" آپ کا اس شخص کے متعلق کیا خیال ہے کہ شراب محبت کے تمام سمندر نوش کر گیا ہے اور پھر بھی "هل من مزید" (اور لاؤ) کے نعرے لگا رہا ہے۔

شرح اس کا مطلب یہ ہے کہ شراب محبت پی کر مست و بے خود ہو جانا کمال نہیں ہے۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ دریا اور سمندر نوش کر جائے لیکن مست نہ ہو بلکہ مزید طلب کرے۔ یہ کمال اصحاب سکر کو نہیں بلکہ اصحاب صحو کو حاصل ہے۔ لیکن حضرت خواجہ بایزیدؒ کی سوانح حیات سے ظاہر ہے کہ آپ سکر کو صحو پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اگلی سطر میں اسباب کا تجزیہ فرمایا ہے۔

ترجمہ لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ نے سکر کی فضیلت بتائی ہے۔ اور حضرت خواجہ بایزید رحمتہ اللہ علیہ نے صحو کی۔ اس سے تو الٹا یہ ثابت ہوا کہ صاحب صحو وہ ہے جو ایک قطرۂ شراب کی طاقت نہیں رکھتا (جیسے حضرت یحییٰ بن معاذؒ) اور صاحب سکر وہ ہے جو شراب محبت کے سمندر نوش کر جائے اور مست نہ ہو (جیسے حضرت بایزید بسطامیؒ) جن کا مسلک سکر

تھا۔) بلکہ مزید طلب کرے۔ کیونکہ شراب کا تقاضا مستی ہے۔ اور صحو اس کی ضد ہے اور شراب پینے والے سے اس کی حالت مختلف ہوتی ہے۔

اقسام سکر

ترجمہ یاد رہے کہ سکر کی دو اقسام ہیں۔ ایک شراب مؤدت (یعنی مال مست) دوم شراب محبت (یعنی حال مست) شراب مؤدت نتیجہ ہے نعمت کا۔ یعنی نعمت ملنے پر حاصل ہوتا ہے۔ اور شراب محبت بلاعلت ہوتا ہے جو منعم (نعمت دینے والے) کے مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے ۔ پس جو نعمت سے خوش ہوا وہ نفسانیت میں رہ گیا اور خودبین (خود غرض) رہا۔ اور جس نے منعم (خالق) کو دیکھا وہ خود بینی سے باز رہا۔ ایسا شخص اگرچہ سکر میں ہوتا ہے تاہم اس کا سکر بھی صحو ہوتا ہے۔

شرح حضرت مصنف نے اوپر فرمایا ہے کہ :۔

"سکر نام ہے احساس فنا کا بقائے صفت کے ساتھ جو حجاب ہے" یہاں سکر کو فنا کے ساتھ مخلوط نہیں کرنا چاہئے۔ سکر کا مطلب ہے بے خودی' محویت اور غلبۂ استغراق جو مقام فنا فی اللہ سے بہت پہلے یعنی سلوک کے ابتدائی مراحل میں بھی ہو سکتا ہے بلکہ بعض اوقات سلوک شروع کرنے سے پہلے بھی ایک عام آدمی پر طاری ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوئی اچھی بات سن کر کانپنے لگتا اور بے ہوش یا بے خود ہو جاتا۔ لیکن فنا سے مراد وہ اعلیٰ و رافع مقام ہے جب سالک سلوک الی اللہ کے آخری منازل پر پہنچ کر اپنی نفسانیت اور اپنی خودی کھو دیتا ہے اور اس قدر پاک منزہ بن جاتا ہے کہ ذات حق میں واصل اور یک جان ہو جاتا ہے۔ لیکن سکر اس وقت بھی غالب ہو سکتا ہے کہ جب سالک کا غلبہ نفس اور بشری صفات فنا نہیں ہوئے اس لئے حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ سکر

نام ہے احساس یا گمان فنا کا صفات بشریہ کی موجودگی میں اس لئے ایسا سکر حجاب ہے۔ حجاب اس لئے ہے کہ اس سکر کی وجہ سے اوپر نہیں جا سکتا۔ اب رہا حضرت مصنف کا یہ جملہ کہ "صحو نام ہے احساس بقا کا فنائے صفت کے ساتھ" اس کا مطلب یہ ہے کہ جب سالک حقیقی طور پر مقام صحو پر پہنچ جاتا ہے جیسا کہ کتاب ہٰذا کے شروع میں تعارف کے اندر بتایا گیا ہے کہ فنا فی اللہ سے نکل کر جب سالک مقام کثرت اور دوئی پر واپس آتا ہے تو وہ صفات بشریت سے آزاد ہو چکا ہوتا ہے۔ اور اپنی صفات کی بجائے وہ صفات الٰہیہ سے متصف ہوتا ہے۔ اس مقام کو فرق بعد جمع یا جامعیت کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر اگرچہ سالک کو اپنی بقا یعنی خودی کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ صفات بشریہ اور نفسانیت سے بالکل آزاد مبرا، معرا اور منزہ ہوتا ہے۔ اور مصداق حدیث قدسی **بی یسمع و بی یبصر** وہ اپنی قوت سماعت اور بصارت سے نہیں سنتا اور دیکھتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سماعت و بصارت سے سنتا اور دیکھتا ہے۔ یہ ہے احساس بقا فنائے صفات کے ساتھ جیسا کہ حضرت مصنف نے فرمایا ہے۔

آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ "اور یہ عین کشف ہے" ظاہر ہے کہ جب انسان کی اپنی نظر نہیں رہی اور نظر حق سے دیکھتا ہے تو اس سے بہتر اور زیادہ کیا کشف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جب "احساس فنا بقائے صفات کے ساتھ ہو" تو یہ کشف نہیں بلکہ حجاب بن جاتا ہے۔ کیونکہ بے ہوشی کی وجہ سے اس پر اسرار و رموز الٰہیہ نہیں کھلتے۔

اس کے بعد حضرت مصنف فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صحو کی نسبت سکر، فنا سے زیادہ قریب ہے تو یہ محال ہے"۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ سالک ابتدائی منازل سے جب مغلوب الحال ہو جاتا ہے تو یہ اس کی بے خودی کہلائے گی نہ کہ فنا فی اللہ کیونکہ ابھی تک اس کی صفات بشریہ باقی ہیں۔ اس لئے

مقام فنا فی اللہ کا حصول محال ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی وجہ آپ خود بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایسے سالک کے لئے حصول بقا اس لئے محال ہے کہ "سکر ایک صفت ہے جو صحو پر زائد ہے" یعنی سکر کی مغلوبیت میں پھنس کر وہ مقام صحو (فرق بعد الجمع۔ بقا باللہ) سے اب تک محروم ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "حالت سکر میں صفات بشریت کی وجہ سے آدمی بیہوش ہو جاتا ہے" یعنی غلبۂ حال میں اس کے جسمانی حواس گم ہو جاتے ہیں لیکن صفات بشریہ میں کمی آتی ہے تو اس کی فنا بھی مکمل ہوتی ہے اور صحو (یعنی بقا باللہ اور عبدیت) بھی مکمل ہوتی ہے۔

اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ اس شخص کا سکر کیسے صحو ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ حضرت مخدوم سید علی ہجویری قدس سرہٗ چونکہ منتہی کا درجہ رکھتے ہیں۔ صحو اور سکر کو بھی آپ منتہیانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ کتاب ہٰذا کے مقدمہ میں بتایا گیا ہے۔ انتہائے سلوک میں سالک کو مقام جامعیت حاصل ہوتا ہے۔ جامعیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتے ہیں اور باقی باللہ بھی۔ چونکہ فنا میں سکر ہی سکر ہے اور بقا میں صحو ہی صحو ہے۔ اس لئے جس خوش قسمت کو مقام جامعیت حاصل ہوتا ہے وہ بیک وقت سکر میں بھی ہوتا ہے اور صحو میں بھی۔ بلکہ ان کے اندر اس قدر طاقت ہوتی ہے یا غلبہ عشق اس قدر شدید ہوتا ہے کہ قرب کی کسی منزل پر مطمئن نہیں ہوتے۔ اور شراب وصل کے پیمانے نہیں؛ دریا اور سمندر نوش کرتے جاتے ہیں اور مست نہیں ہوتے بلکہ "ھل من مزید" کے نعرے لگاتے جاتے ہیں۔ اس قسم کے سکر کو حضرت مصنف علیہ رحمہ نے سکر محبت کا نتیجہ کہا ہے اس کے برعکس شراب مؤدت ہے جو منعم کی نعمت دیکھ کر حاصل ہوتا ہے۔ اس قسم کا سکر مقام فنا کی ایک اور قسم سے ہوتا ہے جسے فنا فی صفات اللہ کہا جاتا ہے۔ اسے قرب نوافل بھی کہتے ہیں کیونکہ

حدیث قدسی **بی یسمع وبی یبصر** و سے حق تعالیٰ کی صفات یعنی سماعت اور بصر میں فنا ہے جو نوافل سے حاصل ہوتی ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں "**من یتقرب بالنوافل**"۔ قربِ نوافل یا فنا فی صفات الٰہیہ سے اوپر فنا کا ایک اور درجہ ہے جو قربِ فرائض یا فنا فی الذات اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے جس سکر کو سکر محبت کہا ہے اس سے مراد وہی فنا فی الذات ہے اور جن عشاقِ الٰہی کے قلوب میں عشقِ الٰہی کے اس قدر بے پناہ شعلے اٹھ رہے ہوتے ہیں کہ قرب حق کی لاتعداد منازل میں سے ان کو کسی منزل پر تسکین نہیں ہوتی۔ اس وقت سکر صحو میں مبدل ہو جاتا ہے۔ حضرت خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ نے اس حالت کو ایک کافی میں یوں بیان فرمایا ہے۔ ؎

شدہ عکس در عکس ایں بنا
کہ فنا بقا ہے بقا فنا

(یعنی میری حالت دو دفعہ برعکس ہوئی ہے اول میری فنا بقا بن گئی ہے دوم میری بقا فنا بن گئی ہے۔ اس حالت کو آپ نے ایک اور کافی میں یوں بیان فرمایا ہے۔ ؎

جتھاں (جہاں) خود قرب ہے دوری
اتھاں (وہاں) کیا وصل و مہجوری

انانیت ہوئی پوری
ہے انسانوں و رحمانوں

(یعنی اب میری وہ حالت ہے کہ میرے لیے قرب بھی بُعد بن گیا ہے اور اب ہجر و وصل کا فرق اٹھ گیا ہے۔ اب عاشق و معشوق دونوں کی انانیت قائم ہے حالانکہ مقام فنا میں عاشق کی انانیت ختم ہو جاتی ہے اور حق کی انانیت باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن آپ یہاں فنا سے بھی زیادہ بلند مقام کی طرف اشارہ فرما رہے

ہیں۔ جو مقام جامعیت ہے جہاں پر سالک منتہی بیک وقت فنا فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ اس لئے حضرت سیدنا علی ہجویری قدس سرہٗ نے بجا فرمایا ہے کہ یہاں سکر صحو بن جاتا ہے اور صحو سکر۔ اس طرح حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ نے بھی اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ کو لکھتے ہیں کہ "اب میری حالت یہ ہے کہ میرے لیے قرب بھی بُعد بن گیا ہے یہ مقام جامعیتِ جاوید ہے۔

حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ نے اس مقام جامعیت کو یوں بیان فرمایا ہے۔ ۔

عجب ایں نیست سرگشتہ بود طالب دوست
عجب این است کہ من واصل و مہجورم

(تعجب کی بات یہ نہیں ہے کہ میں عشق میں سرگرداں ہوں بلکہ تعجب یہ ہے کہ بیک وقت واصل بھی ہوں اور مہجور بھی۔ یعنی فانی فی اللہ بھی اور باقی باللہ بھی، صاحب سکر بھی اور صاحب صحو بھی۔

اقسام صحو

آگے چل کر حضرت مصنف قدس سرہٗ صحو کی بھی دو اقسام بیان فرماتے ہیں۔

ترجمہ اور صحو کی بھی دو اقسام ہیں۔ ایک صحو (ہوشیاری) غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دوسرا محبت کی بنا پر اور وہ صحو جو غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے حجاب اکبر ہے۔

شرح جو صحو غفلت کی بنا پر ہوتا ہے وہ یہ عوام کا صحو ہے جو اپنے کاروبار میں

ہوشیار پھرتے ہیں۔ اور اسلام کے بلند روحانی مقامات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس قسم کی ہوشیاری یا بیداری کو حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے بجا طور پر حجاب اکبر کہا ہے۔

صحو کی دوسری قسم جو محبت یا عرفان پر مبنی ہے وہ نہایت اعلیٰ و ارفع ہے کیونکہ یہ مقام وصل اور قرب کے بعد کی چیز ہے۔

ترجمہ اور وہ صحو جو محبت کی بنا پر ہوتا ہے وہ بہترین قسم کا کشف ہے۔ پس وہ صحو جو غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے اگرچہ (برائے نام) صحو یعنی ہوشیاری ہے در اصل سکر ہے (یعنی نادانی اور غفلت) ہے اور وہ سکر جو محبت کی وجہ سے ہوتا ہے (یعنی عارفین کا استغراق) وہ صحو ہے (یعنی ہوشیاری) ہے اگرچہ بظاہر سکر (یعنی بے خودی) ہے۔ غرضیکہ جب اصل مستحکم ہے (یعنی تعلق باللہ قائم ہے) تو صحو بھی سکر ہے اور سکر بھی صحو ہے۔ لیکن اصل مستحکم نہیں (تعلق باللہ قائم نہیں ہوا) تو صحو و سکر دونوں بے کار ہیں۔

غرض یہ کہ مردان خدا کی نزدیک صحو و سکر میں جو فرق ہے وہ نقطہ نگاہ کا فرق ہے۔ لیکن جب حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے صحو و سکر طفیلی بن جاتے ہیں (یعنی ان کی حقیقت کچھ نہیں رہتی) اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کے اطراف ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ایک کی انتہا دوسرے کی ابتدا ہے اور ابتدا و انتہا کا تصور حالت تفرقہ میں ہو سکتا ہے۔ اور جن چیزوں کا تصور تفرقہ پر مبنی ہوتا ہے وہ حقیقت میں مساوی (یکساں) ہوتی ہیں۔ کیونکہ جمع (وصل) تفرقہ (ہجر) کی نفی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ۔

اذا طلع الصباح بنجم راح
تساوی به سکران و صاح

(جب جمال دوست کا آفتاب طلوع کرتا ہے تو سکر و صحو یکساں ہو جاتے ہیں۔

حکایت سرخس میں دو بزرگ رہتے تھے۔ حضرت لقمان رحمتہ اللہ علیہ دوسرے ابوالفضل حسن رحمتہ اللہ علیہ - ایک دن جب شیخ لقمان حضرت ابوالفضل کے ہاں گئے تو دیکھا کہ وہ ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ اے ابوالفضل آپ اس کتاب میں کیا تلاش کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہی جو تم اس کے ترک کرنے میں تلاش کرتے ہو۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ اختلاف کس وجہ سے ہے۔ شیخ ابوالفضل نے جواب دیا کہ اختلاف آپ کو نظر آرہا ہے اور مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ لہٰذا مستی کو (سکر کو) ترک کرو اور ہوشیاری (صحو) اختیار کرو تاکہ اختلاف رفع ہو جائے۔ اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں اور آپ کیا طلب کر رہے ہیں پس طیفوریوں اور جنیدیوں کے مابین صرف اس قدر اختلاف ہے جو بیان ہوا حضرت ابو یزید کا مسلک عزلت اور خلق سے کنارہ کشی تھا۔ آپ کے سلسلہ کے لوگوں کا بھی یہی مسلک ہے اور یہ اچھا طریقہ ہے خدا نصیب کرے۔

شرح صحو و سکر کے متعلق اتنا بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ حضرت مصنفؒ نے فرمایا ہے۔ سلسلہ جنیدیہ اور طیفوریہ کے درمیان یہ کوئی مستقل اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ دونوں ایسے مقامات ہیں کہ جن میں سے ان دونوں سلسلوں سمیت ہر ولی اللہ کا گزر ہوتا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے مقدمہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسلام میں سلوک الی اللہ کے دو مراحل ہیں۔ فنا فی اللہ اور بقا باللہ۔ پہلے مقام فنا آتا ہے اس کے بعد مقام بقا۔ مقام فنا میں سکر یعنی سراسر محویت و استغراق ہے اور مقام بقا باللہ پر ہوشیاری (صحو) ہے اور ہر ولی اللہ کو ان

دونوں مقامات سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہاں صحو اور سکر کے مضمون پر ان دونوں سلسلوں میں جو فرق یا اختلاف بتایا گیا ہے وہ محض نزاع لفظی ہے حقیقی نہیں ہے۔ حقیقت میں دونوں یکساں ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ اختلاف دونوں بزرگوں یعنی حضرت بایزید بسطامیؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ کی افتاد طبع، مزاج اور پسند کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کو مقام فنا فی اللہ کی سرمستیاں زیادہ محبوب ہیں اور حضرت جنید بغدادیؒ کو مقام بقا باللہ کے ہجر و فراق میں زیادہ لطف آتا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کا مسلک اس شعر سے ظاہر ہے۔

من لذتِ دردِ تو بدرماں نفروشم
کفرِ سرِزلفِ تو بہ ایماں نفروشم

(اے محبوب مجھے تیری فرقت کا درد محبوب ہے اور اس کے درماں یعنی مرہم کی مجھے کوئی ضرورت نہیں)اور حضرت بایزید بسطامی کا مسلک اس شعر سے ظاہر ہے۔

مست گشتم از دو چشم ساقیٔ پیمانہ نوش
الوداع اے ننگ و ہستی الفراق اے عقل و ہوش

(میرے ساقی کی چشم مست نے مجھے ایسا مست کیا کہ اب مجھے نہ نام و ناموس سے غرض ہے نہ عقل و ہوش سے)۔ طریقت سے ناواقف حضرات کے لئے ایک اور بات کا یاد رکھنا بھی ضروری ہے وہ یہ کہ اولیاء اللہ کے لئے نہ مقام وصل (فنا) دائمی ہوتا ہے نہ مقام ہجر و فراق (بقا)۔ وہ جب چاہتے ہیں وصل میں چلے جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں وصل سے نکل کر ہجر و فراق کے مزے اڑانے لگتے ہیں۔ بلکہ جیسا کہ مقدمہ کتاب میں بیان ہوچکا ہے عارفانِ بلند مقام کی یہ حالت ہوتی ہے کہ بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتے ہیں اور باقی باللہ بھی۔ وہ

بیک وقت وصل محبوب کے مزے بھی لیتے ہیں اور ہجرو فراق کے تیر بھی کھاتے ہیں بلکہ ان کو وصل سے ہجر زیادہ محبوب ہوتا ہے کیونکہ اس میں ان کو عبدیت اور بندگی کے اظہار کا زیادہ موقعہ ملتا ہے۔ حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ کے وصال کے بعد کسی نے آپ کو خواب میں دیکھا تو دریافت کیا کہ آپ کے ساتھ حق تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ۔

"بیکار گئے میرے مقامات و منازل' بے کار گئے میرے نکاتِ معرفت' بے کار گئی میری تصانیف مجھے تو حق تعالیٰ نے ان چند رکعات نماز کی وجہ سے نواز لیا جو میں بوقت تہجد ادا کرتا تھا۔" یہی وجہ ہے کہ جمہور مشائخ اسلام کا مسلک صحو رہا ہے نہ کہ سکر۔ یعنی عبدیت' عجز و نیاز۔ اور یہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسلک ہے"۔

سلسلہ جنیدیہ

سلسلہ جنیدیہ حضرت خواجہ ابوالقاسم بن محمد سے موسوم و منسوب ہے۔ آپ اپنے زمانے میں طاؤس العلماء کے لقب سے ملقب تھے اور سید الطائفہ و امام الطائفہ کہلاتے ہیں۔ آپ کا مسلک سلسلئہ طیفوریہ کے برعکس صحو ہے جو مشہور ترین اور معروف ترین مسلک ہے۔ کیونکہ اکثر مشائخ عظام کا یہی مسلک رہا ہے۔ اس موضوع (صحو و سکر) کے علاوہ ان کے مابین اور بھی فرق ہے جو میں طوالت کے خوف سے بیان نہیں کرتا۔ تفصیلات کے خواہاں دیگر کتب میں معلوم کرسکتے ہیں کیونکہ اس کتاب میں میرا مقصد اختصار ہے۔ وباللہ التوفیق۔

حلاجؒ کی حضرت جنیدؒ سے ملاقات

حکایات میں آیا ہے کہ جب حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ غلبۂ

حال کی وجہ سے اپنے شیخ عمرو بن عثمان رحمتہ اللہ علیہ کو چھوڑ کر حضرت خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آئے تو انہوں نے پوچھا کہ کیسے آئے ہو۔ حلاج رحمتہ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ آپ کی صحبت کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے مجانین (جمع مجنون) کی صحبت پسند نہیں ہے کیونکہ صحبت کے لئے صحت (حال) ضروری ہے۔ جب تک تم اس آفت (غلبہ سکر) میں مبتلا ہو تو نتیجہ وہی نکلے گا جو سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ (پہلے شیخ) اور عمرو بن عثمان رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ تمہاری صحبت کا نکلا ہے۔ (یعنی جیسے ان کو آپ نے چھوڑ دیا ہے مجھے بھی چھوڑ دو گے۔) شیخ منصور رحمتہ اللہ علیہ نے کہا "یا شیخ! صحو اور سکر دونوں بندہ کی صفات ہیں جب تک اس کی صفات فنا نہیں ہوتیں انسان حق تعالیٰ سے محجوب رہتا ہے۔" آپ نے فرمایا کہ "یا ابن منصور! تم نے صحو و سکر کے سمجھنے میں خطا کی ہے۔ صحو بندہ کی صفت نہیں بلکہ بندہ کے حق تعالیٰ کے ساتھ صحیح تعلق کا نام ہے جو محض حق تعالیٰ کا فضل ہے اور اے ابن منصور تمہاری باتیں بے معنی اور بے کار نظر آتی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شرح ساری دنیا جانتی ہے کہ شیخ منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ مغلوب الحال بزرگ تھے اور اکثر مشائخ عظام کے نزدیک مغلوبیت کمزوری کی علامت ہے کیونکہ اس سے ترقی رک جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص مے وحدت کا ایک پیالہ پی کر مست ہوجائے تو اسے مزید کیا مل سکتا ہے لہٰذا بلند پایہ مشائخ کا مسلک یہ ہے کہ پیالے نہیں، صراحی نہیں، خم نہیں مے توحید کے دریا نوش کرجائے اور پھر بھی پیاس نہ بجھے اور ھل من مزید (اور لاؤ) کے نعرے لگاتا رہے اب چونکہ حضرت خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک سکر (مغلوبیت) نہیں بلکہ صحو(غالب الحال)تھا آپ نے شیخ منصور کو تنبیہہ فرمائی۔ لیکن جب باز نہ آئے تو آپ نے ان کی سزائے موت کے پروانہ پر دستخط بھی کردیئے تاکہ آئندہ کوئی نوجوان صوفی

مغلوب الحال ہو کر درمیانی منزل پر نہ رک جائے بلکہ غالب الحال ہو کر قرب حق کی طرف منزل پر منزل طے کرتا رہے کیونکہ نہ ذات حق کی کوئی انتہا ہے نہ منازل قرب کی۔ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

"نہ محبوب حقیقی کے حسن و جمال کی کوئی حد ہے نہ سعدی کے عشق لازوال کی پس استسقیٰ کی مرض کے مریض کی طرح وہ مئے توحید کے دریا پر بیٹھا ساری عمر پیالے پی پی کر مرجائے گا لیکن دریا بدستور چلتا رہے گا۔"

سلسلہ نوریہ

سلسلہ نوریہ کا تعلق حضرت شیخ ابوالحسن احمد بن نوری رحمتہ اللہ علیہ سے ہے جن کا شمار اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ آپ اپنے بلند کلمات اور واضح بیانات کی وجہ سے مشہور زمانہ تھے اور آپ کا مسلک ہردلعزیز تھا۔ آپ کے مسلک کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ دوستی (صفوت) کو درویشی پر فوقیت دیتے ہیں۔

اس اصول میں آپ خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ کے ہم مسلک تھے۔ آپ کے نوادرات طریقت میں سے ایک نادر بات یہ ہے کہ درویشوں کے ساتھ صحبت کے آداب میں سے آپ کا ایک اصول ایثار ہے یعنی آپ ہمیشہ دوسروں کو اپنے سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے اور جس مسلک میں ایثار نہ ہو آپ اسے حرام سمجھتے تھے ۔

شرح یہ اصولِ ایثار اسلام و ایمان کی جان ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کن واضح الفاظ میں ایثار کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ **"لا یومن**

احد کم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ"۔ (تم میں سے کوئی مومن ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے کرتا ہے۔) یہ وہ زریں اصول اسلام ہے کہ جس پر تمام اولیاء کرام سختی سے پابند رہے ہیں۔ بخلاف علمائے ظواہر کے جن میں سے اکثر کا شیوہ حب جاہ اور حب مال اور طواف امراء رہا ہے۔ علمائے ظواہر خواہ کتنے بڑے دیندار اور متقی و پرہیزگار ہوں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید میں غرباء کی خاطر فاقہ کشیوں تک نہیں پہنچ سکے۔

ترجمہ حضرت ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں کہ عزلت (گوشہ نشینی) سے بزرگان دین کی صحبت بہتر ہے اور پھر اپنے ہم صحبت لوگوں کی خاطر ایثار (اپنے حقوق کی قربانی دینا) فرض ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "عزلت اختیار مت کرو کیونکہ عزلت قرب شیطانی ہے اور بزرگوں کی صحبت اختیار کرو کیونکہ ان کی صحبت ہی رضائے رحمٰن ہے۔"

شرح اولیاء کرام کی صحبت کے متعلق حق تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتے ہیں : كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ (صادقین یعنی صادق الحال ارباب) کی صحبت اختیار کرو۔) صادق الحال سے مراد اولیاء اللہ ہیں جن کا قول و فعل یکساں ہوتا ہے مثلاً مذکورہ بالا حدیث (**لایومن احد کم .....**) کی تعمیل میں اولیاء کرام اپنا سب کچھ غرباء و فقراء کی خاطر ترک کرکے فاقے کرتے ہیں اور علماء ظواہر اپنی دولت کا صرف چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکال کر باقی انتالیس حصے اپنے آپ پر خرچ کرتے ہیں خواہ دوسرے بھوکوں مریں یا بچیں۔ "بہ بیں تفاوت رہ است از کجا بکجا۔" فرق آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے اولیاء کرام کو قرآن حکیم میں صادقین کہا گیا ہے نیز صادق کا مطلب یہ بھی ہے کہ اسے ایمان کے تین مراتب یعنی علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین میں سے صرف علم الیقین حاصل نہیں ہوتا جو

علمائے ظواہر کا مقام ہے بلکہ عین الیقین اور حق الیقین (یعنی مشاہدہ حق اور فنا فی اللہ) بھی ان کو حاصل ہوتا ہے۔

ترجمہ اب میں حقیقت ایثار بیان کرتا ہوں اور جب باب عزلت و صحبت پر پہنچوں گا تو ان کے اسرار و رموز بھی بیان کروں گا تاکہ سب کو علم ہوجائے۔ انشاء اللہ عزوجل۔

ایثار کا بیان

خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (بندگان خدا وہ ہیں جو اگرچہ خود حاجت مند ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے لئے ایثار کرتے ہیں)۔ اس آیت کا شان نزول ان صحابہ کرام کی حالت کے متعلق ہے جو فقر و درویشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ایثار یہ ہے کہ اپنے ہم صحبت لوگوں کو اپنے آپ پر ترجیح دے۔ حتیٰ کہ اپنی ضرورت کی بجائے دوسروں کی ضرورت پورا کرے اور اپنے آپ کو تکلیف میں رکھ کر دوسروں کو راحت پہنچائے کیونکہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ "ایثار نام ہے معاونتِ اغیار کا (یعنی دوسروں کی مدد کرنا)۔" جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے : خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (لوگوں کی خطا معاف کردیا کرو۔ نیکی کا حکم کرو اور جاہلوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔)

شرح اب دیکھنا یہ ہے کہ جاہل کون ہے جس کی صحبت سے اجتناب کا حکم وارد ہوا ہے۔ سب سے بڑا جاہل وہ ہے جو احکام الٰہی نہ جانتا ہو' ذات و صفاتِ الٰہی سے آگاہ نہ ہو کیونکہ احکام کے علم سے زیادہ افضل ذات و صفات الٰہیہ کا علم ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے پاس کوئی معرفتِ الٰہی کے متعلق دریافت کرنے آتا

تو آپ اسے شیخ بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیتے تھے۔ آپ کے اس عمل سے آپ کے شاگردوں کو کوفت ہوتی تھی اور عرض کرتے تھے کہ آپ امامِ وقت ہیں آپ سائلوں کو ایک مست صوفی کے پاس کیوں بھیجتے ہیں آپ یہ جواب دیتے تھے "وہ مجھ سے افضل ہیں کیونکہ مجھے اللہ کے احکام کا علم ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔" اس طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب انفاس العارفین میں لکھتے ہیں کہ : "ساری دنیا کے تمام علوم بھوسہ کی مانند ہیں اور علم الٰہی دانہ ہے اور پھر حق تعالیٰ کی ذات و صفات میں استغشال (فنا فی اللہ) اس دانہ کا مغز ہے۔" اس سے ظاہر ہے کہ عالم وہ ہے جو ذات و صفات حق تعالیٰ کا عارف بھی ہے اور ذات و صفات حق کے ساتھ وصل کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ اس سے کم عالم وہ ہے جو علم ذات و صفات رکھتا ہو لیکن مقام فنا سے بے بہرہ ہو۔ لیکن جاہل وہ ہے جو ساری دنیا کا علم تو رکھے لیکن حق تعالیٰ کے علم سے ناواقف ہو اور جاہل ترین شخص وہ ہے جو ظاہری علم سے بھی بے بہرہ ہو۔ اب آپ خود قیاس فرما سکتے ہیں کہ جب قرآن حکیم نے جہلاء سے پرہیز کا حکم دیا ہے تو اس سے کن کن لوگوں کی صحبت سے پرہیز لازم ہے۔ دانارا اشارہ کافی است۔ لیکن عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس کے پاس دنیا ہے لوگ مکھیوں کی طرح اس پر گرتے ہیں یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ گندگی پر گرنا مکھیوں کی فطرت ہوتی ہے۔ اور دنیا کی گندگی کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ **الدنیا جیفتہ و طالبھا کلاب** (دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا ہے) لیکن طالبِ دنیا اور ہوتا ہے اور کاسبِ دنیا اور ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنے تمام کاموں میں حق تعالیٰ کی رضا کو ملحوظ رکھے اگر یہ کام کرے گا تو طالبِ مولیٰ کہلائے گا طالب دنیا نہیں ہوگا۔ دنیا کو مقصود بالذات نہ بنائے بلکہ مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے۔ ایسا شخص طالبِ دنیا نہیں کہلائے گا

جیسا کہ عارف رومیؒ نے فرمایا ہے ۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن
آب اندر کشتی ہلاکِ کشتی است
آب زیرِ کشتی پشتی است

(یہ دنیا جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جیفہ یعنی مردار قرار دیا ہے کیا ہے خدا سے غفلت کا نام ہے نہ مال و دولت اور اہل و عیال۔ دنیا پانی کی مانند ہے اور انسان کا دل کشتی کی طرح ہے اگر پانی کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو کشتی کی تباہی ہے اگر کشتی کے نیچے رہے تو کشتی کی سلامتی ہے۔)

(ترجمہ) اقسامِ ایثار

ایثار کی دو قسمیں ہیں۔ اول ایثارِ صحبت جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے' دوم ایثارِ محبت جس میں رنج و تکلف ہے ایثار محبت میں راحت ہی راحت ہے۔ ایثار صحبت کی مثال مندرجہ ذیل حکایت سے ملتی ہے۔

حکایت چونکہ غلام الخلیل (بادشاہ کے وزیر کا نام) کو صوفیاء کرام سے عداوت تھی۔ اس نے حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ ' رقام رحمتہ اللہ علیہ اور ابوحمزہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے صوفیاء کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور یہ الزام لگایا کہ یہ لوگ زندیق (بے دین) ہیں۔ اگر ان کو قتل کردیا جائے تو زندقہ (بے دینی) کی بیخ نکل جائے گی کیونکہ اس گروہ کے سرغنے یہی آدمی ہیں اور جس شخص سے یہ کارخیر سرانجام ہو جائے میں آخرت میں اس کے لئے اجر عظیم کا ضامن ہوں۔ یہ سنتے ہی خلیفہ وقت نے اسی وقت حکم دے دیا کہ ان کی گردنیں

اڑا دی جائیں۔ چنانچہ جب جلاد نے آکر ان کے ہاتھ باندھ دیئے۔ پہلے شیخ رقام رحمتہ اللہ علیہ کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھا تو شیخ ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فوراً اٹھے اور ان کی جگہ لے لی اور کہنے لگے کہ ان کی بجائے پہلے مجھے قتل کرو۔ یہ دیکھ کر جلاد کہنے لگا اے جوان تلوار ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کی طرف تمہاری رغبت ہو سکے تو صبر کر تیری نوبت بھی آنے والی ہے۔ انہوں نے کہا مجھے معلوم ہے لیکن میرا اصول ایثار ہے۔ دنیا میں عزیز ترین چیز زندگی ہے لہذا میری خواہش ہے کہ عزیز ترین چیز کو دوستوں پر نثار کردوں۔ میرے لئے دنیا کی زندگی کا ایک لمحہ آخرت کے ہزار سال سے بھی بہتر ہے کیونکہ یہ دنیا جائے خدمت ہے اور آخرت جائے قربت اور قرب خدمت کے عوض نصیب ہوتا ہے یہ خبر خلیفہ کو پہنچی تو اس پر رقت طاری ہوگئی اور کہلا بھیجا کہ ٹھہر جاؤ۔ ان کو فی الحال قتل نہ کرو۔ یہ کہہ کر اس نے معاملہ قاضی القضاۃ ابوالعباس بن علی کے سپرد کردیا۔ قاضی القضاۃ ان تینوں بزرگوں کو اپنے گھر لے گئے اور شریعت و حقیقت کے متعلق ان سے جتنے سوال پوچھے ان کو کامل و مکمل پایا۔ بلکہ اب تک ان حضرات سے عدم واقفیت کی وجہ سے قاضی صاحب کو افسوس بھی ہوا۔ اس کے بعد حضرت ابوالحسن نوریؒ نے قاضی سے فرمایا :۔ "اے قاضی یہ جو کچھ تم نے دریافت کیا ہے یہ تو کچھ نہیں دریافت کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کے جو مخلص بندے ہوتے ہیں وہ اللہ کے ساتھ کھاتے ہیں' اللہ کے ساتھ پیتے ہیں' اللہ کے ساتھ اٹھتے' بیٹھے ہیں اور اللہ کے ساتھ کلام کرتے ہیں۔" یعنی وہ اسی کے ساتھ زندہ ہیں اور اسی کے مشاہدہ کے ساتھ پائندہ ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی حق تعالیٰ سے جدا ہوں تو حواس باختہ ہوجاتے ہیں۔ ان کی حقیقت و معرفت کی یہ باتیں سن کر قاضی سخت حیران ہوئے اور خلیفہ وقت کو خط لکھا کہ اگر ایسے لوگ بے دین ہیں تو دنیا میں دیندار کوئی بھی نہیں ہے۔ خلیفہ نے ان کو

اپنے پاس بلا کر کہا کہ کیا آپ حضرات کو کسی چیز کی ضرورت ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ ہم کو بھول جائیں۔ نہ کبھی آپ ہمیں پھر اپنے پاس بلائیں اور نہ ہماری جدائی آپ کو ستائے کیونکہ آپ کا ہمیں ترک کرنا بھی ایسا ہے جیساکہ آپ کا قبول کرنا۔ یہ سن کر خلیفہ پر گریہ طاری ہوگیا اور عزت کے ساتھ واپس بھیج دیا۔

شرح ایک اور کتاب میں اس واقعہ کی تفصیل یہ آئی ہے کہ ان تین حضرات میں سے ایک نہایت خوبصورت جوان تھے جن پر ایک نہایت ہی خوبصورت عورت عاشق ہوگئی اور ان کے حلقہ ہائے ذکر میں شریک ہونے لگی۔ ایک دن اس عورت نے اپنے محبوب سے کہا کہ میرے ساتھ شادی کرلو لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ خیانت ہے کہ ہمارے حلقہ میں کوئی تلاش حق کے لئے آئے اور ہم اس کے ساتھ عشق لگانا شروع کردیں۔ اس عورت نے کہا کہ میں صرف تمہارے دیدار کے لئے آیا کرتی تھی مجھے اور کوئی غرض نہیں تھی لیکن وہ پھر بھی نہ مانے۔ جب اس نے وہاں کے سب سے بڑے ولی اللہ کے پاس جاکر سفارش کی التجا کی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ صوفیاء کے لئے یہ خیانت ہے کہ حلقہ ذکر میں آنے والی کسی خاتون سے شادی کریں۔ اس سے وہ عورت بہت برہم ہوئی اور غصہ میں آکر وزیر غلام خلیل کے پاس شکایت کی اس نے اس عورت سے کہا کہ تم بادشاہ کے سامنے چل کر یہ بیان دے دو کہ ان آدمیوں نے تیرے ساتھ بدفعلی کی ہے۔ اس کے بعد وہ اس عورت کو بادشاہ کے پاس لے گیا اور سارا ماجرا بادشاہ کے سامنے بیان کیا بادشاہ نے غصہ میں آکر ان کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن بعد میں جب قاضی القضاۃ نے ان کو بری کردیا تو اس عورت نے اعتراف کیا کہ وہ تینوں بے قصور تھے۔ بادشاہ نے ان حضرات کو عزت و اکرام کے ساتھ واپس بھیج دیا اور غلام خلیل کو سزا دی۔

ترجمہ اسی طرح حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ ابن عمر رحمتہ اللہ علیہ کو مچھلی کھانے کی خواہش ہوئی لیکن سارے شہر میں مچھلی کہیں سے نہ ملی۔ چند روز کے بعد مجھے مچھلی مل گئی اور میں نے شیخ کی خدمت میں جاکر پیش کی۔ یہ دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اسے پکا کر لے آؤ۔ جب مچھلی تیار ہوکر آپ کے سامنے لائی گئی تو ایک سائل نے آکر صدا دی کہ کچھ عطا کیا جائے۔ آپ نے فرمایا یہ مچھلی اسے دے دو۔ خادم نے عرض کیا کہ یا سیدی! آپ کئی روز سے مچھلی کی خواہش کررہے تھے اب جب وہ پک کر آپ کے سامنے آئی ہے تو سائل کو دے رہے ہیں۔ اس کو مچھلی کی بجائے کوئی اور چیز دے دیں۔ آپ نے فرمایا کہ اے جوان اب مچھلی کا کھانا میرے لئے حرام ہے اب میں نے اس کی خواہش دل سے نکال دی ہے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث سنی ہے کہ : "جس کے دل میں کسی چیز کی خواہش پیدا ہو اور پھر اپنی خواہش پر قابو پالے اور وہ چیز ایثار کرکے کسی دوسرے کے حوالہ کردے تو اس کی مغفرت ہوجاتی ہے۔"

حکایت میں نے روایات میں دیکھا ہے کہ ایک دفعہ دس درویش ایک صحرا میں سفر پر روانہ ہوئے۔ آگے چل کر راستہ بھول گئے اور پیاس کا سخت غلبہ ہوا۔ ان کے پاس صرف ایک پیالہ بھر پانی تھا لیکن انہوں نے ایثار سے کام لیا اور ایک دوسرے کی خاطر کسی نے پانی نہ پیا اور سوائے ایک درویش کے باقی سب جاں بحق ہوگئے۔ وہ کہتے ہیں جب سب مرگئے تو پھر وہ پانی پی لیا اور صحیح و سلامت واپس آگیا۔ کسی نے اس سے کہا کہ اگر آپ وہ پانی نہ پیتے تو کیا آپ کے لئے بہتر نہ تھا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اے فلاں شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر میں وہ پانی نہ پیتا اور مرجاتا تو یہ خودکشی ہوتی یہ سن کر اس آدمی نے کہا کہ پھر تو ان لوگوں نے بھی پانی نہ پی کر خودکشی کی ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ

یہ خودکشی نہیں ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی خاطر پانی نہ پیا حتیٰ کہ سب فوت ہوگئے اور میں بچ گیا۔ اس لئے پانی کا پینا مجھ پر شرعاً واجب ہوگیا۔ اسی طرح امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ ہجرت کے وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بستر پر سوگئے اور آپؐ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مکہ مکرمہ سے باہر نکل کر غار کے اندر چلے گئے کیونکہ اس رات کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے حضرت جرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام سے فرمایا کہ ہم نے تم دونوں کو بھائی بنایا ہے تم میں سے ایک کی عمر دوسرے سے لمبی بنائی ہے۔ اب تم میں سے کون اپنی زندگی کو دوسرے پر قربان کرنے اور خود پہلے مرنے کو تیار ہے لیکن دونوں میں سے ہر ایک فرشتے نے زندگی کو پسند اور موت کو ناپسند کیا۔ اس پر حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے جرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام سے فرمایا کہ تم میں سے تو کسی نے دوسرے کی خاطر مرنا قبول نہیں کیا۔ علیؓ کا شرف دیکھو کہ ہم نے بھی ان دونوں میں برادری قائم کی لیکن علی نے اپنے بھائی کی خاطر موت قبول کرلی اور پیغمبر کے بستر پر سوگئے اور اپنی جان بھائی پر قربان کرنے کو تیار ہوگئے۔ اب تم دونوں زمین پر جاؤ اور علیؓ کو دشمنوں سے محفوظ رکھو۔ یہ حکم ملتے ہی جرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔ ایک آپ کے سرہانے کی طرف اور دوسرا پاؤں کی طرف بیٹھ گیا اور جرائیل علیہ السلام نے کہا۔

"اے علی ابن ابی طالب تیری برابری کون کرسکتا ہے کیونکہ آج حق تعالیٰ آپ کو ملائک سے افضل قرار دے رہا ہے اور آپ مزے سے سو رہے ہیں حتیٰ کہ یہ آیت آپ کی فضیلت میں نازل ہوئی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ

(جن لوگوں نے اپنے آپ کو حق تعالیٰ کی رضا کے لئے قربان کر دیا اللہ اپنے ان بندوں پر بے حد مہربان ہے) ۔

شرح اس آیت مبارکہ کی مولانا اشرف علی چشتی رحمتہ اللہ علیہ نے کتاب علم و عمل میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ تفسیر بیان فرمائی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ ہم نے کئی مرتبہ اس آیت کو پڑھا لیکن اس کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔ لیکن جب سے ہم نے اپنے پیر و مرشد کی جوتیاں سیدھی کی ہیں اس کے معانی سمجھ میں آگئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ کے اندر تصوف کے پانچوں بلند ترین مقامات پوشیدہ ہیں۔ یعنی مقام فنا فی اللہ' بقا باللہ' عبدیت' محبوبیت اور رضا الٰہی۔ لفظ "**من یشری**" میں فنا کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اپنے آپ کو راہ حق میں قربان کر دینا اصل فنا ہے۔ لفظ "مرضات اللہ" میں رضائے الٰہی ہے یعنی جو بندگان خدا کی رضا جوئی کے لئے اپنے آپ کو فنا کر دیتے ہیں تو ان کے حق میں اللہ تعالیٰ "رؤف" ہوجاتا ہے یعنی بے حد مہربان۔ اب حق تعالیٰ کی بے حد مہربانی یہ ہے کہ وہ اپنے بندہ کو اپنا محبوب بنا لے اور لفظ عباد میں مقام عبدیت پنہاں ہے۔ لیجئے تصوف کے پانچوں بلند مقامات قرآن حکیم سے ثابت ہوگئے۔ (بحوالہ علم و عمل)

(ترجمہ) ایک انصار خاتون کی حکایت

انصار میں سے ایک خاتون کہتی ہیں کہ جنگ احد کے دن میں پانی لے کر میدان جنگ میں گئی تاکہ پیاسوں کو پانی پلاؤں۔ میں نے دیکھا کہ ایک شدید زخمی صحابیؓ پڑے پیاس پیاس پکار رہے ہیں اور قریب المرگ ہیں۔ انہوں نے اشارہ سے مجھ سے پانی طلب کیا۔ جب میں آگے بڑھی تو ایک اور زخمی نے آواز دی کہ پانی دو۔ اس پہلے صحابیؓ نے کہا کہ پانی اسے دے دو۔ جب اس کے پاس گئی تو

تیسرے آدمی نے آواز دی کہ پانی دو۔ دوسرے نے کہا اس کو دے دو۔ جب تیسرے کے پاس گئی تو چوتھے نے یہی آواز دی حتیٰ کہ چھ آدمیوں نے پانی مانگا اور جب ان کے پاس گئی تو ہر ایک نے ایثار سے کام لیا اور اپنے سے زیادہ حاجت مند کو ترجیح دی۔ لیکن جب میں چھٹے آدمی کے پاس پہنچی تو وہ مرچکا تھا اس لئے میں نے چاہا کہ پانچویں کو پانی دوں تو دیکھا کہ وہ بھی مرچکا تھا۔ جب چوتھے کے پاس پہنچی تو وہ بھی مرچکا تھا غرضیکہ سب مرچکے تھے اور پانی باقی تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (ایثار سے کام لے کر اپنے نفس کو دوسروں کی خاطر روکتے ہیں حالانکہ خود حاجت مند ہوتے ہیں)۔

حکایت دیگر بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا جو چار سو سال سے عبادت الٰہی میں مشغول تھا۔ ایک دن اس نے مناجات میں کہا کہ بار خدایا اگر تو پہاڑوں کو پیدا نہ کرتا تو تیرے بندگان کے لئے زمین کا سفر آسان ہوجاتا۔ اس زمانے کے پیغمبر اسلام کو فرمان الٰہی موصول ہوا کہ اسے کہہ دو کہ تمہیں ہماری خلق میں دخل دینے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ اب جبکہ تم نے دخل اندازی کی ہے ہم نے تمہارا نام نیک بختوں کے دفتر سے خارج کرکے بدبختوں کے دفتر میں درج کردیا ہے۔ یہ پیغام سن کر وہ عابد بہت خوش ہوا اور سجدۂ شکر بجالایا۔ پیغمبر علیہ السلام نے کہا کہ اے نادان بدبختی پر سجدہ شکر ادا کرنے کے کیا معنی۔ اس نے کہا کہ میں نے بدبختی پر شکر ادا نہیں کیا بلکہ اس بات پر شکر کیا ہے کہ میرا نام حق تعالیٰ عزوجل کے کسی دفتر میں تو موجود ہے۔ اے پیغمبر خدا اب میری ایک گزارش ہے۔ انہوں نے کہا وہ کیا ہے اس نے کہا کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں میری طرف سے یہ عرض کریں کہ جب آپ مجھے دوزخ میں ڈالیں تو میرا جسم اس قدر بڑا کردیں کہ ساری

دوزخ کو گھیر لے تاکہ تیرے سب بندے دوزخ سے بچ کر جنت میں جاسکیں۔ فرمان ہوا کہ میرے بندے کو کہہ دو کہ تیرے اس امتحان کا مقصد یہ نہ تھا کہ تیری ذلت کی جائے گی بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ خلق خدا پر تیرا شرف ظاہر ہوجائے۔ اب اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت میں تم جن کی شفاعت کروگے وہ بہشت میں جائیں گے۔

حکایت دیگر میں نے شیخ احمد حماد سرخسی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ کی توبہ کی ابتداء کس طرح ہوئی تو انہوں نے جواب دیا کہ ایک دفعہ میں اونٹوں سمیت صحرا نشین ہوگیا اور کافی مدت تک وہاں مقیم رہا۔ میں اکثر اوقات فاقوں میں بسر کرتا تھا اور اپنا کھانا دوسروں کو دے دیتا تھا۔ یہ بات مجھے بہت پسند تھی کیونکہ حق تعالی نے فرمایا ہے کہ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (ایسے مردان خدا بھی ہیں جو نفس کشی کرکے اپنا حصہ دوسروں کو دے دیتے ہیں حالانکہ خود حاجت مند ہوتے ہیں)۔ غرضیکہ مجھے صوفیاء کرام کے مجاہدات سے محبت تھی۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بھوکا شیر آیا اور میرے اونٹ کو مار کر ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور دھاڑنے لگا۔ اس کی آواز سن کر جنگلی جانور جمع ہوگئے۔ یہ دیکھ کر شیر نیچے اتر آیا اور اونٹ کے ٹکڑے کرکے پھر ٹیلے پر جا کر بیٹھ گیا اور تمام جنگلی جانوروں مثل گیدڑ' لومڑی' بھیڑیا وغیرہ نے پیٹ بھر کر گوشت کھایا۔ جب سب جانور سیر ہوگئے تو شیر ٹیلے سے اتر کر نیچے آیا اور گوشت کھانے ہی والا تھا کہ ایک لنگڑی لومڑی نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر شیر پیچھے ہٹ گیا اور ٹیلے پر جا بیٹھا۔ جب لومڑی نے پیٹ بھر کر گوشت کھالیا تو شیر نے نیچے اتر کر گوشت کھانا شروع کردیا۔ میں دور کھڑا یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ جب شیر پیٹ بھر کر کھا چکا تو میری طرف دیکھ کر زبان حال سے کہنے لگا کہ اے احمد لقمہ خیرات کرنا تو کتوں کا کام ہے۔ مردان خدا وہ ہیں جو دوسروں کے لئے اپنی زندگی نثار کردیتے

ہیں۔ اس کے بعد میرے دل میں دنیا کی محبت سرد پڑ گئی اور توبہ کرکے راہ حق میں مشغول ہو گیا۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کے مناجات

شیخ جعفر خلدی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت شیخ ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ خلوت میں مناجات کررہے تھے چونکہ آپ بہت فصیح اللسان تھے میں چھپ کر آپ کے مناجات سنتا رہا۔ آپ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ کہہ رہے تھے کہ بار خدایا تونے دوزخ کو پر کرنے کا وعدہ کیا ہے حالانکہ ساری خلقت تیرے علم، قدرت اور ارادہ کی پیداوار ہے۔ اگر تونے بالضرور دوزخ کو پر کرنا ہے تو تو قادر ہے جو چاہے کرسکتا ہے۔ لیکن میری خواہش یہ ہے کہ ان سب کی بجائے آپ مجھے دوزخ میں ڈال دیں اور میرا جسم اس قدر موٹا کردیں کہ دوزخ میں کسی اور کے لئے جگہ باقی نہ رہے اور سب خلق خدا بہشت میں داخل ہوسکے۔ شیخ جعفر کہتے ہیں کہ شیخ کی یہ مناجات سن کر میں بے حد حیران ہوا۔ اسی رات خواب میں دیکھا کہ ایک شخص نے آکر کہا ہے کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ تم ابوالحسنؒ کے پاس جاکر اس سے کہو کہ جو کچھ تمہارے دل میں خلق خدا کے لئے شفقت اور میرے لئے عظمت ہے اس کی بدولت ہم نے تم کو بخش دیا ہے۔ آپ کو نوری اس لئے کہتے ہیں کہ جب آپ اندھیرے میں بات کرتے تھے تو نور باطن کی وجہ سے آپ کے منہ سے روشنی نکلتی تھی۔ نیز آپ اسی نور باطن کی وجہ سے مریدوں کے دل کی بات معلوم کرلیتے تھے۔ اس لئے حضرت شیخ جنید بغدادیؒ ان کو جاسوس القلوب (دلوں کا جاسوس) کہتے تھے۔ غرضیکہ ایثار ان کا اصل اصول تھا اور تمام اہل بصیرت کا مسلک بھی یہی ہے کیونکہ انسان کے لئے اپنے دل کی پسندیدہ (محبوب) چیز کا چھوڑ کر دوسرے کے حوالہ کرنا بہت دشوار امر ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی دل پسند چیز کو راہ حق میں صرف کرنے کو جنت کی کنجی قرار دیا ہے

جیساکہ آیہ ذیل میں فرمایا گیا ہے کہ :-

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (جب تک تم اپنی محبوب چیز کو راہ حق میں صرف نہیں کروگے نجات نہیں پاؤ گے۔) اب جب دل کی محبوب ترین چیز راہ خدا میں صرف کردی جائے تو مال و دولت، کپڑا اور طعام کس تعداد میں ہیں۔ طریقت اسی کا نام ہے۔

حضرت شیخ رویمؒ کی وصیت

کسی نے شیخ رویم رحمتہ اللہ علیہ سے وصیت (نصیحت) طلب کی تو فرمایا : "اے میرے بیٹے ! اگر ہو سکے تو دل کی محبوب چیز کی قربانی دے۔ اگر یہ کام نہیں کر سکتا تو تصوف کے معاملات میں دخل نہ دے۔"

ایثار کی تعریف میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے :- "ان لوگوں کو مردہ مت سمجھو جنہوں نے راہ خدا میں جانیں قربان کردی ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور حق تعالیٰ سے رزق حاصل کرتے ہیں۔" (سورۃ آل عمران آیہ ۱۶۹)۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا .... "ان لوگوں کو مردہ مت کہو جنہوں نے راہ خدا میں جانیں دیں بلکہ وہ زندہ ہیں" یعنی وہ لوگ جو راہ خدا میں جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اور مقربان حق کی طرح اپنا حق ترک کرتے ہیں یعنی (ایثار کرتے ہیں) تو وہ قرب حق میں حیات جاویدانی حاصل کرتے ہیں اگرچہ بظاہر ایثار اور اختیار میں تفرقہ نظر آتا ہے۔ حقیقت میں جمع (یکساں) ہے کیونکہ اپنا نصیب (حق) چھوڑنا اصل نصیب وہی ہے۔ جب تک طالب (سالک) کی نیت روزی کمانے پر لگی رہتی ہے تو ہلاک ہوتا جاتا ہے۔ لیکن جب جذبۂ حق کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کی حالت دگرگوں کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

"میں اپنے آپ سے غیب ہو گیا ہوں اور مجھے اپنی ہستی کا شعور نہیں رہا میری تمام صفات گم ہو گئی ہیں۔ تمام اشیاء میرے لیے کالعدم ہیں اور میں خالی نام رہ گیا ہوں۔"

شرح یہ مقام فنا فی اللہ ہے جہاں سوائے ذات حق کے کچھ نہیں رہتا۔

فرقہ سہلیہ

سلسلہ سہلیہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ سے منسوب ہے جن کا بہت بڑے اہلِ تصوف اور اکابر اولیاء میں شمار ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے آپ اپنے وقت کے بادشاہِ (ولایت) تھے۔ آپ طریقت میں اہل حل و عقد میں سے تھے۔ آپ کا مسلک مجاہدہ و ریاضت ہے، جس کے ذریعے مریدین کو بلند مقامات پر پہنچا دیتے تھے۔ روایت ہے کہ آپ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا کہ تین دن متواتر ذکر اللہ اللہ اللہ کرتا رہ۔ اس کے بعد حکم دیا اب رات کو بھی یہی کام کر جب اس نے اس پر عمل کیا تو اس کی حالت ایسی ہو گئی کہ خواب میں بھی اللہ اللہ کہہ رہا تھا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ "اب اسم کا ذکر چھوڑ دو اور موسوم (ذات حق) میں غرق ہو جاؤ۔ اس سے ان پر حالت استغراق طاری ہو گئی۔ چنانچہ ایک دفعہ جب چھت سے لکڑی گر کر ان کے سر پر لگی تو خون بہنے لگا۔ اور خون کا جو قطرہ زمین پر گرتا تھا نقش "اللہ" بن جاتا تھا۔ چنانچہ ریاضت و مجاہدات کے ذریعے سلوک طے کرانا سہلیوں کا طریقہ ہے۔

" حمدونیوں " کا طریقہ خدمتِ درویشاں اور حرمتِ طریقت ہے۔ لیکن جنیدیوں کا طریقہ مراقبۂ باطن ہے۔ ریاضت اور مجاہدت کا مقصد نفس کے زور کو کم کرنا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب تک نفس کی حقیقت معلوم نہ ہو مجاہدت سودمند ثابت نہیں ہوتی۔ اب میں معرفت و حقیقتِ نفس بیان کرتا ہوں۔ اس

کے بعد مجاہدات و احکام بیان کروں گا تاکہ طالبان حق کو دونوں چیزوں سے آگاہی حاصل ہو۔ وباللہ التوفیق (توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے)۔

حقیقت نفس اور معنیٔ ھوای

یاد رہے کہ لغت کے اعتبار سے نفس سے مراد کسی چیز کا وجود یا حقیقت یا ذات ہے۔ لیکن اصطلاح عام میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ایک گروہ کے مطابق نفس کا مطلب ہے "روح" دوسرا گروہ اس کو "مروّت" کا نام دیتا ہے۔ ایک اور گروہ اس سے جسم اور ایک گروہ اس سے خون مراد لیتا ہے۔ لیکن محققین ان تمام معنوں کی نفی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نفس سے مراد "منبع شر" اور "برائی کا مادہ" ہے۔ لیکن اس میں بھی دو خیال ہیں ایک گروہ کہتا ہے کہ نفس عین جسم ہے دوسرا کہتا ہے کہ یہ نفس کی صفت ہے۔ جیسے جان۔ لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ نفس تمام ادنیٰ اور خسیس افعال کا منبع ہے۔ ان افعال کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اول گناہ' دوم گرے ہوئے اخلاق مثلاً تکبر' حسد' بخل' غصہ اور کینہ وغیرہ۔ غرضیکہ تمام وہ کام جو شرع اور عقل کی رو سے ممنوع و مذموم ہیں۔ چنانچہ ریاضت کے ذریعے ان برے اخلاق کو دور کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً گناہ کا علاج توبہ کے ذریعے' لیکن برے اخلاق (مثل تکبر و حسد) جو باطن سے تعلق رکھتے ہیں ان کا علاج ظاہری ریاضت سے ہوتا ہے اور گناہ کے کام جو ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں ان کا علاج توبہ سے ہوتا ہے جو باطنی چیز ہے (یعنی توبہ دل سے کی جاتی ہے)۔ نیز نفس اور روح دونوں جسم کے اندر لطیف چیزیں ہیں جیسے ملائک' شیطان' جنت' دوزخ وغیرہ لیکن نفس محلِ شر ہے اور روح محلِ خیر ہے جیسے آنکھ محلِ بصارت ہے اور کان محلِ سماعت۔ پس تمام عبادات و مجاہدات کا مقصد و مدعا مخالفتِ نفس ہے اور مخالفتِ نفس کے بغیر انسان کی حق

تعالیٰ تک رسائی ممکن نہیں۔ اس لئے کہ نفس کی موافقت میں انسان کی ہلاکت ہے اور مخالفت میں نجات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے نفس کی مخالفت کا حکم دیا ہے اور ان لوگوں کی تعریف فرمائی ہے جو نفس کی مخالفت کرتے ہیں اور ان لوگوں کی مذمت فرمائی جو نفس کے تابع ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

"جس نے نفس کی مخالفت کی اس کا ٹھکانہ جنت ہے"[1] نیز فرمایا "پس جب کبھی کوئی رسول اللہ کی طرف سے احکام لایا تو تم نے ان کی مخالفت کی"[2] نیز حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان پر فرمایا "میں اپنے نفس امارہ کو گناہ سے بری نہیں سمجھتا بلاشبہ نفس برائی کا حکم دیتا ہے"[3] رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے "جب اللہ تعالیٰ کسی کو بچاتا ہے تو اس کو اپنے نفس کی برائی سے آگاہ کر دیتا ہے" روایات میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا :

"اے داؤد نفس کی مخالفت کرو کیونکہ میری محبت نفس کی مخالفت میں ہے"۔

حقیقتِ نفس انسان

پس یہ تمام نفس کے اوصاف ہیں۔ چونکہ ہر صفت کیلئے موصوف ہوتا ہے، صفت بغیر موصوف محال ہے۔ ان صفات کا موصوف انسان ہے۔ حقیقت انسان بیان کرنے میں بزرگوں نے شرح و بسط سے کام لیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ انسان کیا چیز ہے۔ لہذا انسان کی حقیقت سے آگاہ ہونا ہر طالب کا فرض ہے۔ کیونکہ جو شخص اپنی حقیقت سے جاہل ہے۔ دوسروں کی حقیقت سے جاہل تر ہوتا ہے۔ نیز معرفتِ حق تعالیٰ سمجھنے سے پہلے بھی اپنی حقیقت سمجھنا ضروری

---

[1] سورۃ النزعت آیت ۴۰، ۴۱ [2] سورۃ البقرہ آیت ۸۷ [3] سورۃ یوسف آیت ۵۳

ہے۔ تاکہ اپنے حدوث (فانی ہونے) کی بدولت خداوند تعالیٰ کا قِدم (قدیم ہونا) سمجھ میں آ سکے۔ اور اپنی فنائے نفس کی بدولت بقائے حق تک رسائی ہو۔ اور قرآن حکیم ہمیں بتا رہا ہے کہ حق تعالیٰ نے کفار کو جہل سے موصوف فرمایا ہے۔ فرمان ہوتا ہے:۔

"جس[1] نے ملت ابراہیمی سے انحراف کیا وہ جاہل کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ **من جهل نفسه فهو بالغير اجهل** "جو شخص اپنے نفس سے جاہل ہے وہ دوسروں سے جاہل تر ہے"۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے۔ **من عرف نفسه فقد عرف ربه** "جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا" ۔ یعنی جس نے اپنے نفس کو فنائیت سے پہچانا اس نے اپنے رب کو بقائیت سے پہچانا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کی ذلت کو پہچانا اس نے اپنے رب کی عزت کو پہچانا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو عبودیت سے پہچانا اس نے اپنے رب کو ربوبیت سے پہچانا۔ پس جس نے اپنے آپ کو نہ جانا معرفت حق سے محجوب (محروم) رہا۔ اس بارے میں جو اختلاف ہے وہ حقیقت انسان کے متعلق ہے۔

حقیقتِ انسان

بعض کہتے ہیں کہ انسان روح کے سوا کچھ نہیں اور یہ جسم اس کی ڈھال (جوشن) اور ظاہری صورت (ہیکل) ہے یا اس کی جائے رہائش ہے۔ تاکہ طبائع کے خلل سے محفوظ رہے اور حس و عقل اس روح کی صفات ہیں لیکن یہ بات غلط ہے کیونکہ روح جب جسم سے جدا ہوتا ہے تب بھی انسان کہلاتا ۔ بے فرق صرف یہ ہے کہ جان تو جانوروں کے اندر بھی موجود ہے لیکن ان کو انسان نہیں کہا جاتا۔ اس لئے کہ اگر انسان کا نام انسان روح کی وجہ سے ہوتا تو جس چیز میں

[1] سورۃ البقرہ آیت ۱۳۰

روح (جان) ہے وہ بھی انسان کہلاتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ قول غلط ہے۔ چنانچہ جب ایک سے دوسرا جدا ہوتا ہے تو یہ نام ساقط ہو جاتا ہے۔ مثلاً جس گھوڑے میں دو رنگ ہوتے ہیں ایک سیاہ اور ایک سفید اسے ابلق کہتے ہیں۔ لیکن جب دونوں رنگ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو ایک کو سیاہ اور دوسرے کو سفید کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی غلط ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے "انسان پر ایک وقت تھا کہ وہ کوئی چیز نہیں تھا"[1] ۔ یہاں خاکِ آدم کو جو بے جان تھی حق تعالیٰ نے انسان کے نام سے یاد فرمایا ہے کیونکہ اس وقت اسکے اندر جان نہ تھی۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انسان ایک جزو ہے لا یتجزیٰ (غیر منقسم) اور اس کا مقام دل ہے جو انسان کے وجود کی بنیاد ہے یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ اگر کسی شخص کو قتل کر کے اس کا دل اندر سے نکال لیا جائے تو پھر بھی انسان کہلاتا ہے نیز تخلیق سے پہلے انسان کے اندر دل نہیں تھا لیکن اس کو انسان کہا گیا۔

مدعی صوفیاء کے ایک گروہ کو اس بارے میں غلطی ہوئی اور کہدیا کہ چونکہ انسان آکل (کھانے والا) و شارب (پینے والا) ہے اور تغیر پذیر نہیں اس لئے وہ سر الٰہی (خدائی راز) ہے یہ جسم اس کا لباس ہے اور وہ طبائع اور روح جسم کا مرکب ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ تمام عاقل، مجنون، کفار، فاسق، فاجر اور جہلاء پر بھی انسان کا لفظ صادق آتا ہے اور ان کے اندر اسرار الٰہی میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔ تمام کھانے والے اور پینے والے ہیں اور تمام کی فطرت متغیر نہیں ہوتی ہے۔ انسان کے جسم اور وجود میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو انسان کہا جائے اور نہ اس کے مرنے کے بعد کوئی چیز ہوتی ہے تاہم حق تعالیٰ نے تمام عناصر کو جو ہمارے اندر جمع ہیں انسان کا نام دیا ہے جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے "ہم[2] نے انسان کو مٹی کے مجموعے سے پیدا کیا، پھر ہم نے

---

[1] سورۃ الدھر آیت ۱ [2] سورۃ المؤمنون آیت ۱۲، ۱۳، ۱۴

اس کو نطفہ کی صورت دے کر رحم مادر میں جگہ دی' پھر ہم نے نطفہ کو منجمد خون کی صورت دی' پھر اس کو گوشت کا ٹکڑا بنایا پھر گوشت کے ٹکڑے کو ہڈیاں بنا دیا اور پھر ہڈیوں پر گوشت کا لباس چڑھایا اور پھر اس کو آخر شکل میں ظاہر کیا۔ پاک ہے اللہ تعالیٰ جو بہترین خالق ہے"۔

لہٰذا حق تعالیٰ کے قول کے مطابق جو اصدق یعنی سب سے زیادہ صحیح ہے انسان اس ہستی کا نام ہے جو ان تمام عناصر و اجزاء کا مرکب ہے۔ لہٰذا اہلسنت والجماعت کا گروہ کہتا ہے کہ انسان ایک جاندار ہے جس کو موت بھی اس نام سے (انسان سے) محروم نہیں کر سکتی۔ اس ظاہری صورت میں خواہ وہ تندرست ہے یا بیمار ہے یا باطن میں عاقل یا مجنون ہے انسان ہی کہلائے گا اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جس قدر صحیح ہو گا اسی قدر کامل تر ہو گا۔

جاننا چاہئے کہ محققین کے نزدیک کامل تر انسان کی ترکیب تین عناصر سے ہوتی ہے اول روح' دوم نفس' سوم جسد (جسم) ان تینوں عناصر کی ایک ایک صفت ہے جس سے وہ قائم ہیں۔ روح کی صفت عقل ہے' نفس کی صفت خواہش ہے اور جسم کی صفت حس ہے نیز انسان کو کائنات اصغر کہا گیا ہے کیونکہ کائنات مجموعہ ہے دو جہانوں کا (یہ دنیا اور آخرت) اور ان دونوں جہانوں میں جو کچھ موجود ہے انسان کے اندر بھی موجود ہے۔ مثلاً کائنات میں چار عناصر پائے جاتے ہیں آب' آتش' خاک اور باد (ہوا)۔ اس کے مقابلے میں انسان کے اندر چار مزاج یا طبائع ہیں۔ بلغمی' خونی' صفراوی اور سودائی اسی طرح جہان آخرت میں دوزخ' بہشت اور عرصات (میدان قیامت) ہیں تو انسان کے اندر بھی بہشت کے بالمقابل جان ہے اور دوزخ کے بالمقابل نفس کی خرابی ہے اور عرصات کے بالمقابل جسم ہے جس طرح بہشت حق تعالیٰ کی رضا کا نام ہے اور دوزخ اس کے قہر کا اسی طرح مومن کی روح کو معرفت الٰہی سے راحت حاصل ہے اور نفس کی

خرابی کی وجہ سے جمال حق سے محروم ہے۔ نیز جس طرح انسان قیامت کے دن جب تک دوزخ سے نجات نہیں پائے گا بہشت میں نہیں پہنچے گا اور رویت باری تعالیٰ سے بہرہ ور نہیں ہو گا اسی طرح جب تک بندہ دنیا میں نفس کی شرارت سے نجات نہیں پاتا تب تک وہ قرب حق تک نہیں پہنچ سکتا اور جب وہ قرب حق کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے اور غیر اللہ سے روگردانی کرتا ہے اور شریعت پر چلتا ہے۔ قیامت میں وہ پل صراط اور دوزخ سے مامون رہے گا۔ غرضیکہ اگر دنیا میں انسان پر نفس کا غلبہ ہو گا تو وہ اس کو دوزخ میں لے جائے گا اگر روحانیت کا غلبہ ہو گا تو وہ اس کو بہشت میں لے جائے گا۔ روح کی راہنما عقل ہے اور نفس کی راہنما نفسانی خواہشات۔ عقل اس کو نیکی کی طرف اور نفس اس کو گناہ کی طرف بلاتا ہے۔ لہٰذا طالب حق کو چاہیے کہ نفس کی مخالفت کرے تاکہ روحانی قوت میں اضافہ ہو اور قرب حق میں پہنچ سکے۔

فصل

نفس کے متعلق اقوال مشائخ

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اشد الحجاب رویت نفس (سب سے سخت حجاب اپنے نفس کی پیروی کرنا ہے) کیونکہ نفس کی اطاعت حق تعالیٰ کی مخالفت ہے اور حق تعالیٰ کی مخالفت تمام حجابات کی جڑ ہے۔

حضرت ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں **النفس صفتہ لا تسکن الا بالباطل** "نفس وہ چیز ہے جو باطل سے سکون حاصل کرتی ہے اور بندۂ نفس ہرگز حق تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتا"۔

حضرت محمد بن علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

"تو چاہتا ہے کہ خدا کو پہچان لے حالانکہ تیرا نفس غالب ہے۔ کیونکہ جب تیرا نفس اپنی شرارت کو نہیں پہچان سکتا تو اپنے غیر کو کیسے پہچان سکتا ہے۔"

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ **اسلس الکفر قیامک علی مراد نفسک** (کفر کی بنیاد نفس کی اطاعت ہے) کیونکہ نفس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ہروقت اسلام کی مخالفت کرتا ہے اور اسلام کی مخالفت کفر ہے۔

حضرت ابوسلمان دارانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"**النفس خائنتہ مانعتہ والفضل الا عمال خلافھا** (نفس امانت میں خیانت کرنے والا اور قرب حق سے منع کرنے والا ہے اس لئے بہترین عمل مخالفت نفس ہے۔ غرضیکہ نفس کے متعلق مشائخ کے بیانات اس قدر زیادہ ہیں کہ تمام کا ذکر اس کتاب میں مشکل ہے۔ لہذا حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک مجاہدہ نفس ہے۔ جس کا بیان آگے آرہا ہے۔

مجاہدہ نفس کا بیان

حق تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں :-

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (جو لوگ ہمارے قرب کے لئے جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب کی طرف لے جاتے ہیں)۔

شرح اس سے ظاہر کہ جو انسان حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے حضرت حق کمال مہربانی سے اس کی راہیں کشادہ اور سفر آسان فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ :-

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میرا بندہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دو بالشت جاتا ہوں اور جو ایک ہاتھ میری طرف آتا ہے میں اس کی طرف دو ہاتھ جاتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔"

ترجمہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :-

المجاهد من جاهد نفسه فی الله (مجاہد وہ ہے جس نے قرب حق کی خاطر نفس کی مخالفت کی) ۔

نیز فرمایا :-

رجعنا من جهاد الاصغر الا جهاد الاكبر ۔

(ہم جہاد اصغر (چھوٹے جہاد) سے جہاد اکبر (بڑے جہاد) کی طرف آئے ہیں۔) جب آپ سے پوچھا گیا کہ جہاد اکبر سے کیا مراد ہے تو فرمایا کہ جہاد بالنفس (یعنی نفس کے ساتھ جنگ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جہاد بالنفس کو اس لئے افضل قرار دیا کہ نفس کی مخالفت بہت ہی مشکل کام ہے۔ یاد رہے کہ نفس کی مخالفت اور اس کی تربیت (تزکیہ) تمام مذاہب اور اقوام کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔ لیکن مشائخ عظام نے بطور خاص اس کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس بارے میں بہت کچھ فرمایا ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ نے اس بارے میں بہت غلو سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں آپ کے کشف و کرامات مشہور ہیں۔ آپ نے یہ عادت بنا رکھی تھی کہ پندرہ دن کے بعد ایک دفعہ کھانا کھاتے تھے اور ساری عمر اس طرح گزار دی۔ اس طرح تمام مشائخ عظام نے سخت مجاہدات کئے ہیں اور مجاہدہ کو ذریعۂ مشاہدہ قرار دیا ہے۔ بلکہ حضرت عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ مجاہدہ کو مشاہدہ کی

علت قرار دیتے ہیں (یعنی ان کے نزدیک مجاہدہ کے بغیر مشاہدہ نا ممکن ہے) یعنی انہوں نے طلب کو یافت کی علت قرار دیا ہے اس لئے وہ اس دنیا کی زندگی کو جو مجاہدہ سے مزین ہو آخرت کی زندگی سے افضل قرار دیتے ہیں کیونکہ آخرت کی مراد اسی دنیاوی زندگی کی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ جو شخص اس دنیا میں مجاہدہ کرتا ہے آخرت میں مشاہدہ پاتا ہے۔ بغیر مجاہدت قربت ممکن نہیں۔ انسان کو چاہئے کہ قرب حق کی خاطر مجاہدہ کرے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ المشاہدات مواریث المجاہدات (مشاہدات ورثہ ہیں مجاہدات کا) لیکن بعض مشائخ کہتے ہیں کہ قرب حق کسی علت (سبب) کا محتاج نہیں بلکہ محض حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوتا ہے۔ فضل ربی کے سامنے مجاہدات کی کیا حیثیت ہے۔ ان کے نزدیک مجاہدہ کا مقصد تزکیہ نفس ہے نہ کہ قرب حق۔ اس وجہ سے کہ مجاہدہ بندہ کا فعل اور مشاہدہ حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ چنانچہ بندہ کا فعل حق تعالیٰ کے فعل کا کیسے سبب بن سکتا ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ اپنے موقف کی تائید حق تعالیٰ کے اس قول سے کرتے ہیں کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (جو لوگ ہمارے قرب کے لئے کوشش کرتے ہیں ہم ان کی اپنے قرب کی طرف راہنمائی کرتے ہیں) جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مجاہدہ کرتا ہے۔ مشاہدہ پاتا ہے۔ نیز تمام انبیاء علیہم السلام' شریعت اور تمام آسمانی کتابوں کا مقصد بھی مجاہدت کی تلقین ہے۔ اگر مشاہدہ کی علت مجاہدہ نہیں تو یہ تمام احکام باطل ہو جاتے۔ نیز دنیا اور عقبیٰ کے تمام احوال کا دار و مدار بھی اسباب پر ہے اور جو شخص اسباب کو ضروری نہیں سمجھتا وہ شریعت کے اصول اور فروعات دونوں کی نفی کرتا ہے۔ جس طرح کھانا کھانے سے سیری ہوتی ہے یا کپڑا پہنے سے سردی رفع ہوتی ہے۔ اگر علت و اسباب کی نفی کر دی جائے تو کل کام بے معنی ہو جاتے ہیں۔ پس افعال میں علت

کا دخل تسلیم کرنا عقیدہ توحید کے منافی نہیں بلکہ قانون علت و معلول کی نفی کرنا کارخانہ قدرت کی نفی ہے۔ پس مجاہدہ کا انکار خود مشاہدہ کا انکار ہے اور یہ بڑا گناہ ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ گھوڑے کو تربیت دے کر جانوروں کی صفات سے انسان کی صفت پر لایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر چابک زمین پر گر جائے تو اٹھا کر مالک کو دیتا ہے۔ اور گیند کو پاؤں مار کر ہٹاتا ہے اس طرح ایک عجمی لڑکے کو تربیت دیکر عربی زبان سکھائی جاتی ہے اور طبعی عادت کو تبدیل کیا جاتا ہے۔ نیز باز ایک جنگلی جانور ہے لیکن تربیت کے بعد اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ جب اسے دور کرو تو دور چلا جاتا ہے۔ اور پاس بلاؤ تو واپس آجاتا ہے۔ اور قید و بند کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے۔ اس طرح پلید کتے کی جب تربیت ہو جاتی ہے تو اس کا مارا ہوا جانور حلال ہو جاتا ہے۔ لیکن جاہل انسان شرع کے مطابق جانور کو ذبح نہ کرے تو حرام ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے شرع کی دار مدار مجاہدہ یعنی کوشش پر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حصول قرب حق اور عافیت دارین کی خاطر اس قدر مجاہدات کرتے تھے کہ کئی کئی روز کھانا نہیں کھاتے تھے۔ طے کے روزے رکھتے تھے اور اس قدر شب بیداری کرتے تھے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے فرمان صادر ہوا طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (اے محمدؐ آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا گیا کہ اپنے آپ کو اس قدر تکلیف میں ڈالیں)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعمیر مسجد کے لئے اینٹیں اٹھا رہے تھے اور سخت تکلیف برداشت کر رہے تھے تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ چھوڑ دیں یہ کام میں کر دوں گا۔ تو فرمایا اے ابو ہریرہ کسی اور کی مدد کرو۔ میرے نزدیک آخرت کے آرام سے زیادہ بہتر کوئی آرام نہیں۔ حیان بن حارث رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے غزہ (جہاد) کے

بارے میں دریافت کیا تو فرمایا :

" اگر تو خوشی سے جہاد کرتا ہوا قتل ہو گا تو اللہ تعالیٰ تجھے خوش و خرم قیامت میں اٹھائے گا۔ اگر تو ریا کاری سے جہاد کرتا ہوا مارا جائے گا تو اللہ تعالیٰ تجھے ریاکار اٹھائے گا۔ اگر ثواب کی نیت سے مارا جائے گا تو اللہ تعالیٰ تجھے ثواب کی نیت والا اٹھائے گا"۔

پس جس طرح مطالب کے بیان کرنے میں الفاظ و عبارات کی ترکیب سے اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ عبادات و مجاہدات کی خوبی سے حقائق و معارف حاصل ہوتے ہیں اور جس طرح عبارت کے غیر موزوں الفاظ کی وجہ سے مطالب سمجھ میں نہیں آتے۔ غیر موزوں مجاہدات سے بھی حقائق اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتے اور جو شخص اس حقیقت سے انکار کرتا ہے اس کے دماغ میں خلل ہے۔ کیونکہ جس طرح کائنات کی حقیقت جاننے کے بعد خالق کائنات کی معرفت حاصل ہوتی ہے' اپنے نفس کی حقیقت جاننے کے بعد حقیقت قرب الٰہی سے آگاہی ہوتی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آیہ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" میں تقدیم و تاخر ہے یعنی اس کے معنی یہ لیتے ہیں جن کو خدا ہدایت کرتا ہے وہ مجاہدات میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :-

" تم میں سے کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے نجات نہیں پائے گا"۔

جب آپ ؐ سے پوچھا گیا کہ آپ بھی' تو فرمایا ہاں میں بھی حق تعالیٰ کی رحمت سے نجات پاؤں گا۔ اس سے ظاہر ہے اگرچہ مجاہدہ بندہ کا فعل ہے۔ لیکن اس کی نجات کا سبب نہیں بن سکتا۔ کیونکہ سب کی نجات اور خلاص حق تعالیٰ کی

مشیت پر منحصر ہے نہ کہ مجاہدہ پر اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا "جس کو اللہ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے نور سے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ میں تنگی اور سختی پیدا کر دیتا ہے۔"

نیز فرمایا :- **تُؤْتِي الْمُلْكَ...**

"اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے۔" (سورۃ آل عمران آیہ ۲۶)

اس سے ظاہر ہے کہ لوگوں کی اپنی مرضی سے کام نہیں چلتا۔ اگر مجاہدہ وصول الی اللہ کا سبب ہوتا تو شیطان مردود نہ ہوتا۔ اور اگر مجاہدہ کا ترک کرنا مردود ہونے کا سبب ہوتا تو آدمؑ ہرگز مقبول نہ ہوتے۔ پس اصل بات عنایت حق تعالیٰ ہے نہ کثرت مجاہدہ اور نہ ہی جو شخص محنت زیادہ کرتا ہے۔ زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس پر عنایت زیادہ ہے وہی حق تعالیٰ سے قریب تر ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص عبادت خانہ میں مصروف ہے لیکن حق سے دور ہے۔ دوسرا شراب خانہ میں غرق ہوتے ہوئے آخر حق تعالیٰ کا مقرب ہو جاتا ہے۔ اصل چیز ایمان ہے۔ ایک بچے کو دیکھو اگرچہ وہ احکام خداوندی کے ابھی تک تابع نہیں ہوا تاہم وہ مسلمان کہلاتا ہے۔ یہی حال دیوانوں کا ہے۔ پس عطیات خداوندی کے لئے محنت شرط نہیں۔ لہٰذا جب اعلیٰ عطیات کے لئے محنت شرط نہیں تو ادنیٰ عنایات کے لئے کیسے شرط ہو سکتی ہے۔

اور میں علی بن عثمان جلابیؒ کہتا ہوں کہ یہ اختلاف صرف لفظی ہے حقیقی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک کہتا ہے کہ **من طلب وجد** (جس نے کوشش کی پایا) دوسرا کہتا ہے **من وجد طلب** (جس نے پایا اس نے طلب کیا) ایک کے نزدیک

حاصل کرنے کا سبب کوشش ہے۔ دوسرے کے نزدیک کوشش کرنے کا سبب حاصل کرنا ہے۔ ایک کوشش کرتا ہے تاکہ مشاہدہ حاصل ہو اور دوسرے کی قسمت میں مشاہدہ ہے اس لئے وہ مجاہدہ کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشاہدہ کے لئے مجاہدہ اتنا ضروری ہے جتنا توفیق الٰہی کے لئے عبادت۔ اور توفیق ایک عطیہ ہے حق تعالٰی کی طرف سے پس جس طرح توفیق الٰہی کے بغیر عبادت محال ہے اسی طرح عبادت کے بغیر توفیق بھی محال ہے۔ پس جمال الٰہی کے نور کی ایک کرن درکار ہے جو بندہ کو مجاہدہ پر آمادہ کرتی ہے اب جب کہ مجاہدہ کا سبب وہی نور کی کرن ہے تو ہدایت مقدم ہوئی مجاہدہ پر (یعنی مجاہدہ کا اصل سبب ہدایت خداوندی ہے) اور یہ جو حضرت سہل تستری رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ مشاہدہ کے لئے مجاہدہ ضروری ہے کیونکہ اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو تمام انبیاء علیہم السلام ان کی کتب اور شریعت کا انکار لازم آتا ہے۔ اسباب سے بہتر یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے۔ کہ بندہ کی طرف سے کوشش کرنا صرف اتمام حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ کہ مشاہدہ کا سبب ہے۔ کیونکہ حق تعالٰی نے فرمایا ہے: **وَلَوْ اَنَّنَا...**

"اگر ہم کفار پر ملائک بھی نازل کرتے اور مردے ان سے کلام کرتے اور ان پر تمام غیب کی چیزیں ظاہر ہو جاتیں پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے سوائے ان کے جن کو اللہ ہدایت دیتا اور اس بات کو اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ ہدایت (مشاہدہ) کی اصل وجہ عنایت (بخشش) خداوندی ہے نہ کہ کوشش یا محنت۔ نیز حق تعالٰی نے فرمایا ہے: **اِنَّ الَّذِیْنَ...**

" جو لوگ کافر ہوئے ان کے لئے برابر ہے ڈرانا اور نہ ڈرانا' وہ ایمان نہیں لائیں گے۔"

یعنی ان کے لئے دلائل و براہین قیامت بے کار ہیں کیونکہ ان کے حق میں شقاوت لکھی جا چکی ہے اس سے ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مبعوث

ہونا' نزول کتب و شریعت ہدایت کا ذریعہ ہیں۔ نہ کہ علت ہدایت۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ابوجہل ایک ہی حالت میں رہتے تھے لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر فضل خداوندی تھا وہ بازی جیت گئے۔ لیکن ابوجہل فضل رب سے محروم تھا۔ ناکام رہا۔ پس واصل ہونے کی علت خود وصال ہے اور فضل خداوندی سے ان کا حاصل ہونا' نہ کہ کوششِ وصال سے۔ کیونکہ اگر طالب و مطلوب دونوں ایک ہوتے' طالب واجد ہوتا اور جب واجد ہوتا طالب نہ ہوتا۔ کیونکہ جو واجد (پہنچا ہوا) ہوتا ہے وہ آرام میں ہوتا ہے اور طلب سے بالاتر ہوتا ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

من استوی یوماً فھو مغبون (جس نے دو دن برابر کئے یعنی روزانہ ترقی نہ کی وہ نقصان میں ہے)۔

نیز فرمایا :

استقموا و لن تحصوا (آرام پکڑو گے تو ترقی نہیں کرو گے)۔ یہاں بھی مجاہدہ کو مشاہدہ کا سبب (ذریعہ) قرار دیا گیا ہے لیکن یہ اتمام حجت کے لئے ہے وصول الی اللہ اور حصول قرب کے لئے سبب ضروری نہیں ہے کیونکہ مجاہدات و ریاضات بندہ کی صفت ہے اور حصول قرب و مشاہدہ عطیہ حق ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ گھوڑے کو کوشش کے ذریعے تبدیل کیا جاسکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ گھوڑے کے اندر ایک صفت پنہاں ہوتی ہے جس کے لئے کوشش ضروری ہوتی ہے۔ جب تک گھوڑے کو مجاہدت میں نہیں ڈالا جاتا وہ صفت ظاہر نہیں ہوتی اور چونکہ گدھے کے اندر وہ صفت نہیں ہوتی۔ جس قدر کوشش کی جائے گدھا کبھی گھوڑا نہیں بن سکتا۔ محنت اور کوشش سے نہ گدھے کو گھوڑا بنایا جاسکتا ہے اور نہ گھوڑے کو گدھا کیونکہ کسی کی اصل (فطرت) تبدیل نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ یہ بات محال (ناممکن) ہے کہ مجاہدہ کے ذریعے قرب حق حاصل

ہو۔

جہاں تک سہل تستریؒ کے اقوال کا تعلق ہے ان پر مجاہدت کا ایک حال طاری تھا جس کی وجہ سے وہ الفاظ میں فرق نہیں سمجھتے تھے۔ بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے عمل کی بجائے الفاظ کو مذہب بنا رکھا ہے اور جو کچھ عمل میں آتا ہے وہ عبارت میں نہیں آسکتا۔

الغرض اہل طریقت کے نزدیک یہ امر محقق ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت ضروری ہے۔ لیکن مجاہدات کو قرب حق کا ذریعہ قرار دینا غلط ہے لہٰذا جو لوگ مجاہدات کو ضروری نہیں سمجھتے ان کا مطلب یہ نہیں کہ مجاہدات کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ حصول قرب میں غرور نفس کی نفی کی جائے کیونکہ مجاہدہ بندہ کا فعل ہے اور حصول قرب حق تعالیٰ کا عطیہ ہے اور جب تک حق تعالیٰ کی رحمت شامل حال نہ ہو مجاہدات سے کچھ نہیں بنتا۔ اے عزیز کیا تو اس بات کو برا نہیں سمجھتا کہ اپنے مجاہدات کو دیکھے اور رحمت حق کو نظرانداز کرے اور اپنی محنت کی داستانیں بناتا رہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اولیاء کرام کا مجاہدہ بھی فعل حق ہوتا ہے جس کا ان کو علم اور اختیار نہیں ہوتا وہ قرب حق میں غرق ہوجاتے ہیں اور یہ غرق ہونا حق تعالیٰ کی رحمت ہے۔

لیکن جاہلوں کا مجاہدہ ان کا اپنا فعل ہوتا ہے اور ان کے اپنے اختیار سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ پریشان حال ہوتے ہیں۔ پس جہاں تک ہو سکے کسی چیز کو اپنے ساتھ منسوب نہ کرو اور نفس کی مطابقت سے باز رہو کیونکہ خودی ایک بہت بڑا حجاب ہے۔ ممکن ہے کہ ایک فعل سے تجھ پر پردہ حائل ہوجائے اور دوسرے فعل سے اٹھ جائے۔ اب چونکہ تیرا پورا وجود حجاب ہے جب تک تو پوری طرح فنا فی اللہ کے مقام پر فائز نہیں ہوگا مقام بقا باللہ کے قابل نہیں بنے گا۔

شرح اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ (۱) ہمارا وجود کس طرح بندہ اور خدا کے درمیان حجاب ہے۔ (۲) یہ حجاب کیسے اٹھتا ہے۔ (۳) مقام فنا کیا ہے۔ (۴) مقام بقا کیا ہے۔ یہ تو ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا۔ روح عالم بالا کی چیز ہے اور بمصداق **کل شئی یرجع الی اصلہ** روح انسان کو حق تعالیٰ کی جانب کشش کرتی ہے جبکہ جسم جس کا تعلق اس خاکی دنیا سے ہے انسان کو نیچے کی طرف کشش کرتا ہے یعنی چونکہ جسم کی یعنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرکے انسان ذلت کے گڑھے میں گر کر تباہ و برباد ہوجاتا ہے حق تعالیٰ تک ہرگز رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔ لہٰذا تمام عبادات' مجاہدات اور ریاضات کی غرض یہ ہے کہ نفسانیت کا زور کم کیا جائے تاکہ روحانی قوت نفسانی قوت پر غالب آجائے اور انسان قرب حق کی جانب پرواز کرسکے۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ چونکہ تیری نفسانیت سب سے بڑا حجاب ہے تیرے اور تیرے رب کے درمیان جب تک تو مجاہدات کے ذریعے نفسانیت کا پوری طرح قلع قمع نہیں کرے گا حجاب رفع نہیں ہوگا اور جب حجاب رفع ہوجائے گا اور نفسانیت پر روحانی قوت غالب آجائے گی۔ تو واصل باللہ ہوجائے گا۔ اس واصل باللہ ہونے کا دوسرا نام فنا فی اللہ ہے یعنی اپنے آپ کو جسمانیت کی ظلمت سے نکال کر تزکیۂ نفس کے ذریعے خالص نور بنانا اور پھر نور حق (روح حق) سے واصل ہوجانا۔ اسی کا نام قرب و وصال ہے اور فنا فی اللہ۔ حضرت شیخ نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ جب تک تو مکمل طور پر فنا فی اللہ نہیں ہو گا بقا باللہ کے قابل نہیں ہو گا۔ اب سوال یہ ہے کہ بقا باللہ کیا چیز ہے۔

بقا باللہ یاد رہے کہ مقام فنا فی اللہ میں چونکہ سراسر بے خودی' محویت اور استغراق طاری ہوجاتا ہے اس مقام پر انسان فرائض زندگی ادا نہیں کرسکتا۔ لیکن مقام فنا پر یہ چیز ضرور حاصل ہو جاتی ہے کہ سالک ذات و صفات باری تعالیٰ میں

فنا ہو کر صفات الٰہیہ سے متصف ہو جاتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی (بخاری)۔ بی یسمع وبی یبصر سے ظاہر ہے کہ بندہ اللہ کی بصارت سے دیکھتا ہے اور اللہ کے سماعت سے سنتا ہے اور ہر کام اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کرتا ہے۔اس لئے اسلامی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کامل ہمیشہ کے لئے مقام فنا میں مستغرق رہ کر فرائض زندگی سے محروم نہ رہ جائے بلکہ مقام فنا سے نزول کر کے اپنی عبدیت پر واپس آجائے اور فرائض زندگی ادا کرے۔ کیونکہ جہاں مقام فنا میں محویت و استغراق ہے مقام بقا باللہ میں ہوشیاری اور شعور ہے۔ اب چونکہ مقام فنا پر سالک صفات باری تعالیٰ سے متصف ہو جاتا ہے مقام بقا پر واپس آکر وہ انہی صفات الٰہیہ کے ذریعے منصب خلافت الٰہیہ کے قابل بنتا ہے جس کا اشارہ آیہ مبارکہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً میں فرمایا گیا ہے۔ اس مقام کو نزول عبدیت، بقا باللہ اور فرق بعد الجمع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جہاں دیگر مذاہب یعنی بدھ مت، ہندو دھرم اور عیسائیت میں آخری مقام فنا تھا اسلام میں آخری مقام بقا باللہ ہے جہاں پہنچ کر انسان قرب حق کی محویت اور استغراق سے نکل کر ہوشیاری حاصل کرتا ہے اور چونکہ اب وہ مقام فنا کی وجہ سے صفات حق تعالیٰ سے متصف ہوتا ہے فرائض زندگی بوجوہِ احسن ادا کرتا ہے۔ علمائے سوء کی طرح نہ اس پر نفسانیت کا غلبہ ہوتا ہے نہ تکبر غالب ہوتا ہے، نہ حرص، نہ طمع اور نہ کوئی لالچ اس کو راہ حق سے جدا کر سکتی ہے۔

ترجمہ **لان النفس کلب باغ و جلد الکلب لایطہر الا بالدباغ** "نفس ایک باغی کتا ہے جس کا چمڑا صرف دباغ ہی پاک کر سکتا ہے"

شرح دباغ کا مطلب ہے چمڑا رنگنے والا۔ یہاں اس سے مراد مجاہدۂ نفس ہے۔ یا شیخ کامل۔

ترجمہ روایات میں ہے کہ جب حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ

کوفہ میں حضرت محمد بن حسین رحمتہ اللہ علیہ کے گھر قیام پذیر تھے تو حضرت ابراھیم خواص رحمتہ اللہ علیہ ان کو ملنے آئے۔ شیخ منصورؒ نے ان سے کہا کہ اے ابراھیم طریقت کی چالیس سالہ زندگی سے تجھے کیا حاصل ہوا ؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے توکل میں خوب استقامت حاصل ہوئی ہے۔ شیخ منصور رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا **ضیعت عمرک فی عمران باطنک فاین الفناء فی التوحید** "تم نے عمر باطن سنوارنے میں صرف کر دی فنا فی اللہ کب حاصل کرو گے" توکل نام ہے خداوند تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کا اور اس کی ذات پر پورا اعتماد کرنے کا۔ جب آپ نے ساری عمر باطن کو درست کرنے میں صرف کر دی تو ظاہری زندگی کو درست کرنے کے لئے ایک اور عمر درکار ہے۔ دونوں عمریں اس طرح ضائع ہوئیں حق تعالیٰ تک رسائی کب حاصل ہو گی۔

حضرت شیخ ابو علی سیاح مروزیؒ فرماتے ہیں کہ :

"میں نے دیکھا کہ کسی نے میری صورت کو بالوں سے پکڑ کر میرے حوالے کر دیا ہے اور میں نے اسے درخت سے باندھ کر قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا اے ابو علی تجھے معلوم ہونا چاہئے میں لشکر خداوندی ہوں تو مجھے ختم نہیں کر سکتا۔"

شرح چونکہ لشکر یعنی فوج سے دشمن کو شکست دیکر اپنا مقصد حاصل کیا جاتا ہے حق تعالیٰ نے انسان کے نفس کو بھی ایک مقصد کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ مشائخ عظامؒ فرماتے ہیں کہ نفس یعنی جسم بمنزلہ اسپ ہے اور روح سوار کی مانند ہے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے گھوڑے اور سوار دونوں کو متوازن غذا بہم پہنچانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر گھوڑے کو بھوکوں مار کر ختم کر دیا جائے تو سوار منزل مقصود تک کیسے پہنچے گا۔ اس لئے قرآن حکیم میں آیا ہے کہ انسان پر اپنے نفس کا بھی حق ہے۔ نیز ایک اور مقام پر حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی ہے

جو لوگوں کی غلطی معاف کرتے ہیں اور اپنے غصے کو دبا دیتے ہیں۔ یہاں نفس کو دبانے کا حکم آیا ہے۔ نہ کہ بالکل ختم کرنے کا۔ اس لئے نفس بجا طور پر لشکر خداوندی ہے جس کے ذریعے بہت سے اچھے کام بھی انجام پاتے ہیں۔ مثلاً غصہ باقی نہ رہے تو جہاد کیسے کرے گا یا برائی کو کیسے روکے گا۔

ترجمہ حضرت محمد بن علیان نسوی رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت شیخ جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے اکابر اصحاب میں سے تھے فرماتے ہیں :

"ابتدائے حال میں اپنے نفس کی شرارت پر کڑی نظر رکھتا تھا اور اس کی چالوں سے بخوبی واقف تھا۔ ایک دن ایک لومڑی کا بچہ میرے حلق سے نکل کر باہر آیا حق تعالٰی نے مجھے آگاہ فرمایا کہ یہ تمہارا نفس ہے میں نے اسے پاؤں کے نیچے دبایا اور اس پر لاتیں مارنا شروع کیں۔ لیکن وہ ہر لات پر اور زیادہ بڑا ہو جاتا تھا میں نے کہا ہر چیز مارنے سے ہلاک ہوتی ہے تو کیا بلا ہے کہ الٹا بڑی ہو رہی ہے اس نے جواب دیا میری فطرت ہی الٹی رکھی گئی ہے جو چیز دوسروں کے لئے باعث رنج ہوتی ہے میرے لئے باعث راحت ہوتی ہے اور جو چیز دوسروں کے لئے باعث راحت ہوتی ہے میرے لئے باعث رنج ہوتی ہے"۔

شرح قرآن حکیم میں سورۂ مزمل میں حق تعالٰی نے نفس کشی کا علاج راتوں کو جاگنا فرمایا ہے فرمان ہوتا ہے اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَّأَقْوَمُ قِيْلًا "راتوں کے جاگنے سے نفس کچلا جاتا ہے اور آدمی مستجاب الدعوات بنتا ہے" نیز مشائخ عظامؒ نے نفس کشی کا ایک علاج بھوک بھی بتایا ہے۔

ترجمہ حضرت شیخ ابوالعباس شقانی رحمتہ اللہ علیہ جو امام وقت تھے فرماتے ہیں کہ ایک دن جب میں گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک زرد رنگ کا کتا میرے بستر پر سویا ہوا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید محلے کا کتا اندر گھس آیا ہے۔ جب میں

نے اس کو بھگانے کا ارادہ کیا تو میرے دامن کے اندر گھس کر غیب ہو گیا۔

شرح یہ بھی ان کا نفس تھا جس کو حق تعالیٰ نے کتے کی صورت میں دکھایا۔

ترجمہ حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ جو آج قطب مدار کے منصب پر فائز ہیں اپنے ابتدائے حال کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے نفس کو سانپ کی شکل میں دیکھا۔ ایک اور درویش فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے نفس کو چوہے کی شکل میں دیکھا۔ میں نے کہا تو کون ہے اس نے کہا کہ میں غافل لوگوں کو ہلاک کرنے والا ہوں اور ان کو شر و فساد کی طرف بلاتا ہوں اور دوستانِ حق کی نجات ہوں کیونکہ میرا وجود آفت ہے اگر ان کے ساتھ نہ رہوں تو وہ اپنی پاکی کی وجہ سے مغرور اور اپنے اعمال کی وجہ سے متکبر ہو جائیں۔ جب وہ اپنے اندر طہارت اور صفائی' ترقی اور نور ولایت اور طاعت پر استقامت دیکھتے ہیں تو ان کے اندر غرور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ مجھے اپنے پاس دیکھتے ہیں تو اپنے تمام عیبوں سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔

ان تمام حکایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس بذات خود ایک حقیقت ہے نہ کہ انسان کی ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کے اوصاف (عادات) ہم دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک "تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان ہے" پس جب تجھے اس کی معرفت حاصل ہو جائے تو ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعے اس کی اصلاح کرنی چاہئے لیکن اس کے وجود کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں جب اس کے شر سے طالب آگاہ ہو جائے تو پھر کوئی ڈر نہیں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ :-

لان النفس کلب نباح و امساک الکلب بعد الریاضتہ مباح "نفس

ایک بھونکنے والا کتا ہے اور تربیت یافتہ کتا رکھنا مباح یعنی جائز ہے"۔ لیکن مجاہدات کے ذریعے اسے سدھایا جا سکتا ہے۔ مٹایا نہیں جا سکتا۔ اس کے متعلق مشائخ عظامؒ کے کلمات تو بہت ہیں طوالت کے خوف سے یہاں صرف یہی کچھ بیان ہو سکا ہے۔ اب حقیقت ہوا و ہوس اور ترک خواہشات نفسانی کے متعلق بیان کروں گا۔

حقیقت حرص و ہوا کے بیان میں

خدا تجھے عزت دے تجھے جاننا چاہئے کہ بعض صوفیائے کرام کے نزدیک ہوا (ہوس) نفس کی ایک صفت ہے جب کہ بعض کے نزدیک ہوا سے مراد ارادہ طبیعت ہے جس کا فرمانروا اور حاکم نفس ہے بعینہ اسی طرح جس طرح روح کا حاکم عقل ہے۔ جس طرح وہ روح جس کو عقل سے تقویت (رہنمائی) نہ ملے ناقص ہوتا ہے اسی طرح ہر ہوا جس کو نفس سے تقویت نہ ملے ناقص ہے۔ روح کا خسارہ قرب حق نہ ہونے کی وجہ سے ہے لیکن نفس کا خسارہ عین قرب ہے۔

شرح روح کا تقاضا قرب حق ہے اگر قرب حق نصیب نہ ہو تو روح پریشان ہوتی ہے اس کے برعکس نفس کا تقاضا حق تعالیٰ سے بُعد (دوری) اور گمراہی ہے۔ گمراہی اور حق تعالیٰ سے دوری کی وجہ سے نفس خوش ہوتا ہے۔ اور قرب حق حاصل ہو تو نفس کی مراد پوری نہیں ہوتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ نفس کا خسارہ یعنی اس کی مراد کا پورا نہ ہونا قرب حق ہے اور اس کی مراد کا پورا ہونا حق تعالیٰ سے دوری اور حجاب ہے۔

ترجمہ انسان ہمیشہ دو تقاضوں میں جتلا رہتا ہے ایک عقل کا تقاضا دوسرا ہوا کا تقاضا۔ جو شخص عقل کا تقاضا پورا کرتا ہے ایمان حاصل کرتا ہے اور جو شخص ہوا (نفسانی خواہش) کا تقاضا پورا کرتا ہے کفر اور گمراہی میں جتلا ہوتا ہے اس سے

ظاہر ہے کہ ہوا و ہوس کی پیروی باعث حجاب اور گمراہی ثابت ہوتی ہے اور اس کی مخالفت سے انسان کامیابی اور سرخروئی حاصل کرتا ہے۔ **من رکبھا ھلک و من خالفھا ملک** "جس نے خواہشات کی پیروی کی ہلاک ہوا جس نے مخالفت کی کامیاب ہوا"۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى "جس نے حق تعالیٰ سے خوف کھایا اور نفس کی مخالفت کی اس کا ٹھکانہ جنت ہے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے **اخوف ما اخاف علی امتی اتباع الھوی و طول الامل** "سب سے زیادہ خوف جو مجھے اپنی امت کے متعلق ہے خواہشات نفسانی کی پیروی اور طویل آرزوئیں باندھنا ہے"۔ نیز حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ "تم نے دیکھا اس کو جس نے اپنی خواہشات کو معبود سمجھا"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر یوں فرمائی ہے "جس نے اپنی خواہشات کی پرستش کی"۔ ہوا کی دو اقسام ہیں اول جسمانی لذت اور شہوت' دوم عزت و مرتبت کی خواہش۔ جو شخص جسمانی لذت میں مبتلا ہے اس کے شر سے خلق خدا محفوظ ہوتی ہے لیکن جو شخص جاہ و حشمت کا طالب ہے وہ خلق خدا کیلئے فتنہ بن جاتا ہے۔ وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور خلق کو بھی گمراہ کرتا ہے **نعوذ باللہ من ذالک** پس جو شخص اپنی خواہشات نفسانی کے تابع فرمان ہے وہ حق تعالیٰ سے دور ہوتا ہے خواہ وہ تمہارے ساتھ مساجد میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص ہوا و ہوس سے آزاد ہوتا ہے حق تعالیٰ سے قریب ہوتا ہے خواہ وہ بظاہر دنیاوی کاموں میں مشغول ہے۔

ایک عیسائی راہب کی گوشہ نشینی

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا کہ ولایت

روم میں ایک عیسائی راہب ستر سال سے گوشہ نشین ہے۔ یہ سن کر مجھے تعجب ہوا کیونکہ رہبانیت کی مدت چالیس سال ہوتی ہے یہ شخص کیوں ستر سال سے گوشہ نشین ہے چنانچہ میں نے اس کو ملنے کا ارادہ کیا۔ جب اس کے پاس پہنچا تو اس نے کھڑکی کھول کر کہا کہ ابراہیم مجھے معلوم ہو گیا ہے تم کس غرض سے میرے پاس آئے ہو۔ میں یہاں رہبانیت کی نیت سے نہیں بیٹھا بلکہ میرے نفس کا کتا بہت شریر ہے میں اس لئے یہاں بیٹھا ہوں کہ اس کتے سے لوگ محفوظ رہیں۔ ورنہ میں کون اور کہاں گوشہ نشینی۔ یہ سن کر میں نے کہا یا خدا تو کس قدر قادر ہے کہ تو نے اس شخص کو گمراہی کے باوجود صحیح کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا اے ابراہیم تم کب تک دوسروں کی تلاش میں رہو گے۔ جاؤ اور خود کو طلب کرو۔ جب اپنے آپ کو پا لو تو اس کی نگہبانی کرو۔ کیونکہ ہر روز یہ ہوا تین سو ساٹھ مقدس لباس پہن کر انسان کو گمراہ کرتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ شیطان کو بندے کے دل میں گھسنے کی اس وقت تک طاقت نہیں جب تک کہ اس کے دل میں گناہ کی خواہش نہ ہو۔ جب انسان ہوا و ہوس کا شکار ہو جاتا ہے تو شیطان کو موقعہ ملتا ہے اور اس معصیت کو بنا سنوار کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ شیطان کی اس کارروائی کو وسواس کہا گیا ہے اس کی ابتداء ہوا سے ہوتی ہے اور حدیث **والبادی اظلم** "ابتداء کرنے والا زیادہ ظالم ہوتا ہے" کے یہی معنی ہیں اور جب شیطان نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں کہا کہ میں تمام خلق کو گمراہ کروں گا تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ "میرے بندوں پر تو غالب نہیں آ سکتا"۔ اس سے حق تعالیٰ کا یہی مقصد تھا کہ بندگان خدا ہوا و ہوس سے پاک ہوتے ہیں شیطان کے دھوکے میں نہیں آ سکتے۔ پس شیطان درحقیقت انسان کا اپنا نفس اور ہوا و ہوس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا **ما من احد الا وقد غلبه**

الشیطان الا عمر فانہ غلب شیطانہ "کوئی آدمی نہیں کہ اس کے شیطان نے اس پر غلبہ نہ کیا ہو سوائے عمر کے جس نے اپنے شیطان پر غلبہ پالیا ہے"۔

پس ہوا انسان کی فطرت میں مرکب ہے اور اس کی راحت جان ہے جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے **الھوی و الشھوۃ معجونتہ بطینتہ ابن ادم** "ہوا اور شہوت آدمی کی فطرت میں خمیر کی گئی ہے"۔ ترک ہوا بندہ کو امیر کرتی ہے اور ارتکاب ہوا اس امیر کو اسیر (قیدی) بناتی ہے۔ چنانچہ جب حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ **ما الوصل قال ترک ارتکاب الھوی** "وصال کیا ہے فرمایا ہوا کا ترک"۔ چنانچہ زلیخا ہوائے نفس کی غلام ہوئی تو امیری سے اسیری میں جا پڑی اور حضرت یوسف علیہ السلام اسیر تھے ترک ہوا سے امیر بن گئے۔

لہٰذا جو شخص وصل حق تعالیٰ سے مشرف ہونا چاہتا ہے اسے کہو کہ ہوا ترک کرے۔کسی عبادت سے بندہ کو اس قدر قرب حق حاصل نہیں ہوتا جس قدر ترک ہوا سے ہوتا ہے لیکن یہ کام مشکل بہت ہے ناخن سے پہاڑ کو کھودنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ ہوا کو ترک کرنا ہے۔ حضرت شیخ ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "میں نے ایک شخص کو ہوا میں اڑتے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ مرتبہ تم نے کیسے حاصل کیا اس نے جواب دیا کہ ہوا کو چھوڑا اور ہوا میں اڑا"۔ حضرت شیخ محمد فضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو خانہ کعبہ کی زیارت کی خواہش کرتا ہے اور پہنچ جاتا ہے لیکن اپنی خواہشات نفسانی ترک کرے تو خانہ کی بجائے صاحب خانہ کا دیدار کر سکے"۔

لیکن نفس کی سب سے زیادہ ظاہر صفت شہوت ہے جو انسان کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ لہٰذا انسان کو اپنے ہر فعل کی نگرانی کرنی چاہئے ورنہ جوابدہ ہو گا۔ آنکھ کی شہوت دیکھنا ہے کان کی شہوت سننا ہے ناک کی خواہش

سونگھنا ہے زبان کی خواہش بولنا اور ذائقہ لینا ہے جسم کی خواہش چھونا اور آرام کرنا ہے اور دماغ کی صفت سوچنا ہے پس انسان کو اپنا حاکم آپ ہونا چاہئے۔ رات دن اس بت کا خیال رکھے کہ نفسانی خواہشات کے تابع نہ رہے بلکہ ان کو ترک کرے اور خداوند تعالٰی سے دعا کرے کہ بری خواہشات اس کے دل سے دور ہوں کیونکہ جو شخص شہوات میں مبتلا ہو جاتا ہے حق تعالٰی سے محجوب ہو جاتا ہے۔ اگر بندہ اپنی کوشش سے ترک ہوا کرے گا تو یہ سلسلہ طویل ہو جاتا ہے لہٰذا اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ حق تعالٰی سے توفیق طلب کرے۔ حضرت ابو علی سیاح مروی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں سنت کے مطابق زیر ناف بال صاف کر رہا تھا کہ دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ آلہ تناسل کو قطع کر دیا جائے کیونکہ تمام آفت اسی میں ہے غیب سے آواز آئی کہ اے ابو علی میری سلطنت میں مداخلت کرتے ہو۔ ہمارے نزدیک ہر عضو دوسرے عضو سے زیادہ اہم ہے۔ اگر تم اس عضو کو اپنے سے جدا کرو گے تو ہم تیرے ہر بال کے اندر ہزار گنا شہوت پیدا کر دیں گے۔

انسان اپنی فطرت نہیں بدل سکتا ہاں تائید ایزدی اور تسلیم کے ذریعے بد صفات سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ جب مقام تسلیم و رضا حاصل ہو گیا تو بندہ تمام آفات سے نجات پا سکتا ہے نہ کہ کوشش سے۔ کیونکہ جب تک رحمت حق شامل نہ ہو کوشش سے کام نہیں بنتا کسی نے خوب کہا ہے "پنکھے کے ذریعے مکھیوں کو دور کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اپنی چیز کو ڈھانک کر رکھ دو"۔ لہٰذا حق تعالٰی سے رحمت طلب کرنا تمام آفتوں کا علاج ہے۔ بندہ حق تعالٰی کے کسی کام میں کوشش سے مداخلت نہیں کر سکتا ہے جیسا کہ فرمان ہوتا ہے کہ میری سلطنت میں دخل مت دو جب تک تائید حق شامل حال نہ ہو انسان کوشش کے ذریعے کوئی مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ بندہ کی کوشش اس وقت تک کامیاب

نہیں ہوتی جب تک تائید ایزدی شامل حال نہ ہو۔ بندہ کی تمام کوشش دو طرح کی ہو سکتی ہے یا کوشش سے تقدیر بدل دے یا کوشش سے تقدیر کے خلاف مراد حاصل کر لے۔ یہ دونوں باتیں محال ہیں کیونکہ نہ انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے اور نہ اس کے خلاف کر سکتا ہے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت شیخ شبلیؒ بیمار ہوئے تو طبیب طلب کیا گیا طبیب نے کہا کہ پرہیز کرو انہوں نے کہا کس چیز سے پرہیز کروں کیا میں اس چیز سے پرہیز کر سکتا ہوں جو میرے لئے مقدر ہو چکی ہے یا اس چیز سے جو میرے مقدر میں نہیں ہے کیونکہ جو چیز میرے مقدر میں ہے اس سے پرہیز ناممکن ہے اور جو چیز میرے مقدر میں نہیں ہے اس سے خود بخود پرہیز ہے۔ مشائخ نے خوب کہا ہے کہ **لان المشاھد لایجاھد** "مشاہدہ کوشش سے حاصل ہونے کا نہیں" اس مسئلہ (تقدیر) پر احتیاط سے دوسری جگہ پر بات کروں گا۔ انشاء اللہ عزو جل۔

فصل

سلسلہ حکیمیہ

سلسلہ حکیمیہ حضرت ابی عبداللہ محمد بن علی الحکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ سے منسوب ہے جو امامِ وقت تھے۔جملہ ظاہری و باطنی علوم میں آپ کی تصانیف بہت ہیں۔ آپ کا مخصوص مسلک اور مقصد اثباتِ ولایت ہے جس کی حقیقت سمجھانے کی آپ نے کوشش کی ہے۔ نیز آپ نے اولیاء کرامؒ کے مدارج اور ان مدارج کے حصول کے طریقوں پر بھی بحث فرمائی ہے۔یہ علیحدہ بحرِ بے پایاں ہے جو عجائب و غرائب سے لبریز ہے۔ آپ کی تعلیمات کی ابتداء یہ ہے کہ انسان کو جاننا چاہئے کہ حق تعالیٰ کے ایسے برگزیدہ اولیاء ہیں جو دیگر خلق سے ممتاز ہیں۔ جنہوں

نے دنیا کی دلچسپیوں سے بالاتر ہو کر نفسانی خواہشات سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا علیحدہ مقام ہے اگرچہ یہ مضمون بہت طویل ہے سطور ذیل میں ان مقامات کی شرح بیان کی جائے گی۔

ولایت کا ثبوت

جاننا چاہئے کہ تصوف اور طریقت اور معرفت کی بنیاد اثبات ولایت ہے جس پر تمام مشائخ متفق ہیں اگرچہ ہر ایک کی عبارات مختلف ہیں حضرت محمد بن حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ بالخصوص ولایت کو طریقت و حقیقت سمجھتے ہیں۔ لیکن وِلایت (باکسر واؤ) اور وَلایت (بافتح واؤ) میں فرق ہے ۔ وَلایت بافتح کا مطلب ہے تصرف کرنا اور وِلایت باکسر کا معنی ہے امارت (امیر ہونا) یہ دونوں الفاظ فعل ولیت کے مصدر ہیں۔ چنانچہ دونوں معانی جائز ہیں۔ نیز ولایت ربوبیت کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و الوہیت بچ ثابت ہو جائے گی"۔ اور کفار بھی اسے تسلیم کریں گے اور اس کے گرویدہ ہوں گے اور اپنے معبودوں سے بیزاری اختیار کریں گے۔ نیز ولایت کے معنی محبت کے بھی ہیں۔ نیز ولی فعیل کے معنوں میں آتا ہے جو مفعول ہے۔ جیسا کہ آیت مبارکہ : وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ "اللہ تعالیٰ صالحین سے محبت کرتا ہے۔" یعنی ان کو اللہ تعالیٰ انکے حال پر نہیں چھوڑتا بلکہ اپنی حفاظت کے چھاتے میں ڈھانپ لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں ولی بر وزن فعیل مبالغہ کا صیغہ ہو اور فاعل کے معنوں میں آئے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو دوست رکھتا ہے اور اس کے حقوق کی پابندگی کرتا ہے اور غیر اللہ سے اجتناب کرتا ہے۔ چنانچہ مفعول ہونے کی صورت میں بندہ مراد کہلاتا ہے اور فاعل ہونے کی صورت میں بندہ مرید ہوتا ہے۔

شرح یہ ایک نہایت ہی اہم مضمون ہے۔ کشف المحجوب کے ترجمہ کرنے والے حضرات نے مرید اور مراد کی وضاحت نہیں فرمائی۔ اور شاید ترجموں میں وضاحت ہو بھی نہیں سکتی۔ یاد رہے کہ اولیاء کرامؒ کے عام طور پر دو اقسام ہوتے ہیں بعض پیدائشی طور پر عاشق ہوتے ہیں اور بعض جو بہت قلیل تعداد میں ہوتے ہیں معشوق کا درجہ رکھتے ہیں عاشق کو علم تصوف کی اصطلاح میں مرید اور معشوق کو مراد کہا جاتا ہے مرید وہ ہے جو اللہ کا طالب ہے اور مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا مطلوب و محبوب ہے۔ یہ بات محض مفروضہ نہیں بلکہ آیاتِ قرآن پر مبنی ہے۔ حق تعالیٰ نے سورہ الشوریٰ میں فرمایا ہے اَللّٰهُ يَجْتَبِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ "اللہ برگزیدہ بناتا ہے اس کو جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف راہ دکھاتا ہے اس کو جو طالب ہے"۔ اول الذکر کو علم روحانیت کی اصطلاح میں مراد (مطلوب) اور ثانی الذکر کو مرید (طالب) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں بعض ایسے اولیاء کرام ہوئے ہیں جن کو محبوبیت کا مقام حاصل تھا۔ مثلاً حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ محبوب سبحانی کے لقب سے ملقب تھے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بدایونی رحمتہ اللہ علیہ کا لقب محبوب الٰہی تھا۔ چنانچہ آیہ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ کی شرح کرتے ہوئے حضرت مصنف علیہ رحمہ نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ اگر لفظ صٰلِحِيْنَ کو فعل يَتَوَلّٰى کا فاعل قرار دیا جائے تو صالحین کا درجہ مرید یعنی طالب کا ہوگا اور اگر اسے فعل يَتَوَلّٰى کا مفعول قرار دیا جائے تو مفعول یعنی مطلوب اللہ ہو گا اور صالحین کا مقام مقامِ مراد متصور ہو گا ۔

ترجمہ اس آیت کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں یعنی اللہ بندہ کو چاہے یا بندہ اللہ کو چاہے دونوں صورتیں صحیح ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کا مددگار ہو۔ جیسا کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے آیہ ذیل

میں نصرت کا وعدہ فرمایا ہے ﴿اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾ "یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی طرف فتح و نصرت قریب ہے"۔ نیز فرمایا ﴿وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ "کافروں کا کوئی مددگار نہیں"۔ اب جبکہ وہ کافروں کا مددگار نہیں تو لامحالہ مسلمانوں کا مددگار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس معاونت کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ ان کے اذہان اور قلوب پر آیات کا صحیح مفہوم القا کر دے۔ دوم یہ کہ ان کو کشف و کرامات عطا فرما دے۔ سوم یہ کہ نفس امارہ کی مخالفت میں مدد کرے۔ چہارم یہ کہ شیطان کی مخالفت میں بندہ کی مدد کرے۔ پنجم یہ کہ اپنے احکام کی پابندی میں مدد فرما دے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنا محبوب بنا لے اور مخالفت سے باز رکھے۔ جیسا کہ فرمان ہوتا ہے : ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ "اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں"۔ تاکہ لوگ اس کو حق تعالیٰ کی وجہ سے دوست رکھیں اور وہ غیر سے منہ موڑ لے۔ حتیٰ کہ وہ بھی اللہ کا دوست ہو جائے اور باقی مسلمان بھی اس کے دوست ہو جائیں۔ حق تعالیٰ کی یہ ولایت بھی دو قسم کی ہو سکتی ہے ایک یہ کہ اطاعت پر قائم ہو جانا اور نافرمانی سے باز رہنا تاکہ شیطان اس کے حسن عبادت کو دیکھ کر بھاگ جائے۔ دوم یہ کہ ایسی ولایت جس میں حل و عقد اس کے ہاتھ میں آجائے اور وہ مستجاب الدعوات بن جائے۔

شرح یعنی تصرفات اور کشف و کرامات سرزد ہوں اور جو دعا کرے قبول ہو۔

ترجمہ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے :

"کبھی ایسے پراگندہ دل اور غبار آلودہ پھٹے پرانے کپڑوں والے لوگ ہوتے ہیں کہ اگر وہ کسی بات کی قسم کھائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری کرتا ہے"۔

چنانچہ یہ بات عام مشہور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دریائے نیل کا پانی بند ہو گیا کیونکہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق جب تک ایک دوشیزہ

لڑکی کو بنا سنوار کر اس کے اندر نہیں پھینکا جاتا تھا دریا نہیں چلتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کاغذ پر یہ لکھ کر دریا میں پھینک دیا کہ :

"اے نیل اگر تو خود بخود چلتا تھا تو مت چل اگر اللہ کے حکم سے چلتا تھا تو عمر کہتا ہے کہ چل"۔

جونہی یہ خط دریا میں ڈالا گیا تو دریا بہنے لگ گیا۔

یہ حقیقی بادشاہی ہے پس ولایت سے مراد یہ ہے کہ اس کے اندر یہ خصوصیت پائی جائے یعنی قال کے طور پر نہیں بلکہ حال اور واقعہ کے طور پر حاصل ہو۔ اس سے پہلے مشائخ نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں لیکن اب ناپید ہو چکی ہیں۔ اب میں حضرت شیخ حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ کے نظریات پیش کرتا ہوں جن سے مجھے عقیدت ہے تاکہ تجھے اس سے فائدہ ہو اور عام **طالبین** کو بھی فائدہ ہو۔

لفظ ولایت کی تشریح

یاد رہے کہ لفظ (ولی) خلق کے درمیان مشہور ہے اور قرآن و حدیث میں بھی وارد ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ "سنو بے شک اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جن کو نہ کوئی ڈر ہے نہ غم"۔

نیز فرمایا نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ "ہم تمہارے دوست ہیں دنیا میں اور آخرت میں بھی۔"

ایک اور مقام پر فرمایا ہے اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا "اللہ دوست ہے مومنین کا۔"

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

"تحقیق اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں جن پر انبیاء اور شہداء رشک کرتے ہیں۔

جب صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ ہمیں ان کا حال بتایا جائے تا کہ ہم ان کو دوست رکھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ ایسے لوگ ہیں کہ محض رضائے حق کیلئے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں نہ کہ مال و دولت کی وجہ سے ان کے چہرے نورانی ہوتے ہیں۔ اور وہ نور کے منبروں پر مقیم ہوتے ہیں ان کو کوئی خوف نہیں ہوتا۔ جب کہ لوگ خوف زدہ ہوتے ہیں۔ اور ان کو کوئی غم نہیں ہوتا ہے۔ جب کہ لوگ غم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالی فرماتا ہے کہ **من اذی لی ولیاً فقد استحل محاربتی** "جس نے میرے ولی کو تکلیف دی اس نے میرے ساتھ جنگ کی۔"

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشند

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالی کے ایسے دوست ہیں جن کو اللہ تعالی نے اپنی محبت اور ولایت کا شرف بخشا ہے اور ان کو اپنے ملک میں تصرف کا اختیار عطا فرمایا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالی کی قدرت کا اظہار ان کے ہاتھوں سے ہوتا ہے (یعنی ان سے کرامات سرزد ہوتی ہیں) ان کو کشف و کرامات کی قوت عطا فرمائی ہے۔ طبیعت کی کمزوری سے ان کو پاک کیا ہے اور نفس کی متابعت اور ہوا و ہوس سے ان کو نجات دی ہے حتیٰ کہ ان کی پوری زندگی کا مدعا و مقصد حق تعالی ہوتا ہے اور حق تعالی کے سوا کسی کی طرف رغبت نہیں رکھتے۔ ایسے حضرات زمانہ ماضی میں بھی ہو گزرے ہیں اور زمانہ حال میں بھی موجود ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ کیونکہ حق تعالی نے امت محمدیہؐ کو دیگر امتوں پر یہ شرف بخشا ہے اور اس بات کی ضمانت دی ہے کہ شریعت محمدیؐ کی حفاظت کروں گا۔

چونکہ علماء کے درمیان علمی اور عقلی دلائل و براہین موجود ہیں اب ہم براہین عینی (چشم دید شہادت) پیش کرتے ہیں تاکہ کسی کو انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ہمارا اختلاف دو فرقوں سے ہے ایک فرقہ معتزلہ دوسرا حشویہ۔

شرح فرقہ معتزلہ مامون الرشید کے زمانے میں وجود میں آیا اور علماء حقانی اور مشائخ ربانی کی جدوجہد سے بفضلہ تعالیٰ ختم بھی ہو گیا ہے۔ اس فرقہ کے عقائد آزادانہ تھے اور اہل سنت و الجماعت کے عقائد کے خلاف تھے۔ وہ مسئلہ قدر و جبر میں قدر کے قائل تھے اور قرآن کو مخلوق سمجھتے تھے۔ علمائے کرام بالخصوص حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا حالانکہ بادشاہ وقت فرقہ معتزلہ سے تعلق رکھتا تھا اور ان کو سخت سے سخت اذیتیں پہنچائیں۔

فرقہ حشویہ کا عقیدہ یہ تھا کہ خداوند تعالیٰ کا انسان کی طرح کا جسم ہے اور وہ اوپر عرش پر بیٹھا کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے۔ اس عقیدۂ تجسیم کے حامیوں کے خلاف علمائے وقت نے کفر کے فتوے لگائے اور حکومت وقت نے ان کو قید کر دیا اور ان میں سے بعض قید میں فوت ہوئے۔ فرقہ حشویہ کے عقائد عیسائی عقیدۂ تجسیم کے مترادف ہیں جس کو اصطلاح عام میں Anthropomorphism کہتے ہیں۔

ترجمہ فرقہ معتزلہ کے لوگ اولیاء اللہ کے قائل ہیں لیکن مختلف اولیاء کرامؒ کے مختلف مراتب اور ایک دوسرے پر فضیلت کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک سب ولی برابر ہیں۔ حالانکہ اولیاء کرامؒ کے مراتب کی نفی سے انبیاء علیہم السلام کے مراتب میں فرق کی نفی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو بھی ایک دوسرے پر فضیلت حاصل تھی۔ اس طرح اولیاء کرامؒ کے مراتب میں بھی فرق ہے۔ انبیاء کے مراتب کے فرق کی نفی کرنا کفر ہے۔ حشویہ فرقہ کے لوگ اولیاء

کرامؒ کے مراتب میں فرق کو مانتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ فضیلت والے لوگ پہلے زمانے میں ہو گزرے ہیں اب نہیں ہیں۔ حالانکہ ماضی اور حال کا انکار برابر ہے۔ ماضی کے اقرار اور حال کے انکار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حقانیتِ نبویؐ کو آج بھی دائم و قائم رکھا ہے اور اولیاء اللہ کو اس کے ظہور کا ذریعہ بنایا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت آج تک اولیاء کرمؒ کے وجود سے جاری ہے اور ان کو حق تعالیٰ نے ہر قسم کے تصرفات عطا فرمائے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ہمہ تن راہ حق میں بک چکے ہیں اور متابعت نفس سے بالاتر ہو گئے ہیں۔

اولیائے مستورین یا رجال الغیب

آسمان سے بارش ان کی برکت سے ہوتی ہے اور زمین سے سبزہ ان کی برکت سے نکلتا ہے۔ نیز مسلمانوں کو کافروں پر فتح بھی ان کی برکت سے ہوتی ہے ان کی تعداد چار ہزار ہوتی ہے وہ خلق کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن وہ نہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور نہ اپنے حال سے آگاہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ہر حال میں مخلوق سے اور اپنے آپ سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں روایات موجود ہیں اور اولیاء کرامؒ نے بھی اپنی تصانیف میں ان کا ذکر کیا ہے اور مجھ پر بھی خداوند تعالیٰ کے فضل سے یہ بات عیاں ہے۔ جن حضرات کو دنیا میں حل و عقد کا تصرف حاصل ہے۔ ان کی تعداد تین سو ہے اور ان کو "اخیار" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چالیس اور ہیں جن کو "ابدال" کہا جاتا ہے۔ سات اور ہیں جن کو "ابرار" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور چار لور ہیں جن کو "اوتاد" کہا جاتا ہے۔ اور تین اور ہیں جن کو "نقباء" کہا جاتا ہے۔ ایک اور ہے جس کو "غوث" یا "قطب" کہا جاتا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں کہ ہر ایک ولی اللہ ہے لور اپنے امور میں ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں (یعنی

افسر و ماتحت کا سا تعلق ہوتا ہے) ان کا احادیث میں بھی ذکر آیا ہے۔ اور اہلسنت و الجماعت کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ یہاں ان کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

یہ جو میں نے کہا ہے کہ اولیاء ایک دوسرے کو جانتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ ہیں اس کے متعلق بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر وہ جانتے ہیں کہ ہم اولیاء اللہ ہیں تو عاقبت کا خوف ان کے دل سے اٹھ جاتا ہو گا۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ ایک ولی اللہ کے دل سے عاقبت کا خوف اٹھ جاتا ہے۔ اس طرح تو ہر مومن بھی جانتا ہے کہ وہ مومن ہے لیکن خوف عاقبت اس کے دل سے نہیں جاتا۔ چنانچہ ایک ولی بھی جانتا ہے کہ وہ ولی ہے لیکن خوف عاقبت اس کے دل میں بدستور رہتا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بطور کرامت حق تعالیٰ ولی کو عاقبت کے خوف اور لوگوں کے شر سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے متعلق مشائخ کے درمیان قدرے اختلاف ہے یہ جو میں نے کہا ہے کہ چار ہزار اولیائے مستورین اپنے آپ کو جانتے ہیں کہ ہم ولی اللہ ہیں اس کے متعلق بعض مشائخ کہتے ہیں کہ صحیح ہے بعض کا خیال ہے کہ صحیح نہیں ہے۔ فقہا میں سے بھی بعض پہلے گروہ سے متفق ہیں بعض دوسرے سے۔ متکلمین حضرات میں سے استاد ابو اسحاق اسفرائی رحمتہ اللہ علیہ اور بعض متقدمین کا خیال یہ ہے کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ ولی ہے لیکن استاد ابوبکر ابن فواک رحمتہ اللہ علیہ اور متقدمین کی ایک جماعت کا خیال اس کے برعکس ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ولی کو اپنی ولایت کا علم ہو تو اس میں کیا ہرج اور کیا آفت ہے۔ اس کا جواب وہ لوگ یہ دیتے ہیں کہ اس سے ولی کے اندر غرور پیدا ہوتا ہے کہ میں ولی ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ولی اللہ تو حفاظت حق میں ہوتا ہے اور آفت غرور سے مامون ہوتا ہے۔ یہ بات سخت عامیانہ (جاہلانہ) ہے کہ ولی ہوتے ہوئے اس کے دل میں غرور جیسے گندے

خیالات آئیں یا وہ یہ بھی نہ جانے کہ میں ولی ہوں حالانکہ اس سے کرامات کا اظہار بھی ہو رہا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ پہلے گروہ کے معتقد ہو گئے ہیں اور بعض دوسرے کے۔

شرح حقیقت تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص مقام ولایت پر پہنچتا ہے تو اپنے آپ کو حقیر ترین گناہگار ترین اور بدترین سمجھتا ہے اور غرور اور تکبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غرور و تکبر کچے لوگوں کو ہوتا ہے۔ اولیاء کرام اس سے کوسوں دور ہوتے ہیں -

ترجمہ لیکن فرقہ معتزلہ کے لوگ قطعی طور پر فضیلت اور کرامات اولیاء کے منکر ہیں۔ حالانکہ ولایت نام ہی اسی فضیلت اور کرامت کا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تمام مسلمان جو احکام خداوندی کی پیروی کرتے ہیں اولیاء اللہ ہیں ان کا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جو خدا کے احکام میں یقین رکھتا ہو' اور خدا تعالیٰ کی صفات اور دیدار کا منکر ہو' اور فاسق فاجر مسلمان کو ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا اعتقاد رکھے اور احکام میں عقل کو وحی پر ترجیح دیتا ہو وہ ولی اللہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بے شک وہ ولی ہے لیکن (ولی اللہ نہیں) ولی الشیطان ہے بمعتزلہ کہتے ہیں کہ اگر کرامات ولایت کی شرط ہیں تو تمام مسلمان صاحب کرامت ہوتے کیونکہ وہ ایمان میں مشترک ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب اصل میں مشترک ہیں تو فرع (نتائج) میں بھی مشترک ہونا چاہئے۔ معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مومن اور کافر دونوں صاحب کرامت ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ بات درست ہے کہ طویل مسافت ایک رات میں طے ہو سکتی ہے تو یہ بات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت بھی حاصل ہوتی جب آپ نے مکہ کا سفر اختیار فرمایا۔ لیکن اس سفر کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جانور[1] تمہارا بوجھ اٹھا کر جاتے ہیں اس شہر تک جہاں تم تھک کر پہنچتے ہو" لیکن میں کہتا ہوں کہ ان کی یہ بات

---

[1] سورۃ النحل آیت ۷

غلط ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا ...... "پاک ہے وہ ذات کہ جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو ایک رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک ......" جہاں تک پہلی آیت یعنی صحابہ کرامؓ کا جانوروں پر سوار ہو کر مکہ مکرمہ جانے کا تعلق ہے اس میں عام سفر کی بات کی گئی ہے لیکن کرامت خاص چیز ہوتی ہے عام نہیں۔ دوسری آیت میں کرامت کا ذکر ہے جو خاص چیز ہے۔ اگر تمام صحابہ کرامؓ سواری کے بغیر کرامت کے ذریعے مکہ پہنچ جاتے تو کرامت عام ہو جاتی اور ایمان بالغیب کی ضرورت ختم ہو جاتی اور ہر قسم کے ایمان بالغیب کا خاتمہ ہو جاتا۔ ایمان کا تعلق ہر خاص و عام سے ہے خواہ وہ نیک ہے یا بد۔ لیکن ولایت ایک خاص چیز ہے پس عام بات یہ ہے کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اصحابؓ کے ساتھ مکہ تشریف لے گئے تو سواری کی ضرورت ہوئی۔ لیکن خاص بات (کرامت) یہ ہے کہ ایک ہی رات میں حق تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کو مکہ سے بیت المقدس پہنچا دیا اور پھر وہاں سے قاب قوسین تک پہنچا دیا اور کائنات کے اسرار و رموز سے آگاہ فرمایا اور جب واپس تشریف لائے ابھی رات کا کافی حصہ باقی تھا۔ خلاصہ کلام یہ کہ ایمان عمومی چیز ہے اور اس کا تعلق عام لوگوں سے ہے لیکن کرامت خاص چیز ہے اور اس کا تعلق خواص سے ہے اور خواص کی نفی کرنا بہت بڑا انکار ہے۔

شرح دنیا کا کوئی ایسا شعبہ، فن یا علم نہیں ہے کہ جس میں عوام اور خواص کا وجود نہ ہو۔ تعلیم کو لیجئے اس میں بھی قابلیت کے ہزاروں درجے ہیں کوئی پرائمری پاس ہوتا ہے کوئی مڈل پاس، کوئی میٹرک، کوئی بی اے کوئی ایم اے کوئی پی ایچ ڈی۔ اب سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا اور ایک جیسا خیال کرنا اور سب کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے اسی طرح ہر فن اور ہر شعبہ زندگی میں عوام و خواص موجود ہوتے ہیں ایک محکمہ میں مالی اور چپڑاسی سے لے

کر وزیر تک شامل ہوتے ہیں لیکن ان کی قابلیت' فرائض اور تنخواہوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہی اصول مذہب یعنی قرب الٰہی میں بھی کارفرما ہے بعض لوگ عام مسلمان ہوتے ہیں۔ بعض زیادہ عبادت گزار ہوتے ہیں لہٰذا ان کے قرب کے مراتب زیادہ بلند ہوتے ہیں اور بعض ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں جو شب و روز مجاہدات و ریاضات کے ذریعے بلند ترین مراتب قرب تک پہنچ جاتے ہیں۔ قرب حق میں بلند ترین مدارج پر فائز ہونے والوں کو قرآن کی اصطلاح میں اولیاء اللہ کہا گیا ہے۔ جن کا مرتبہ عام مسلمانوں سے بہت زیادہ بلند ہوتا ہے اس سے زیادہ بلند درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے۔ غرضیکہ فرق مراتب سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس انکار کو حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے "مکابرہ عیاں" کہا ہے۔

ترجمہ چنانچہ ایک بادشاہ کے محل میں خدام بھی ہوتے ہیں' دربان بھی اور امیر و وزیر بھی اگرچہ ملازمت کے لحاظ سے سب برابر ہیں یعنی سب بادشاہ کے نوکر ہیں لیکن ان کے مراتب و مدارج میں بہت فرق ہے لہٰذا اگرچہ ایمان کا لفظ تمام عام اور خاص مسلمانوں پر صادق آتا ہے لیکن ایک مسلمان جاہل ہے ایک عالم' ایک نیک ہے ایک بد۔ ظاہر ہے کہ ان کے درمیان کتنا زیادہ فرق ہے لہٰذا اولیاء اللہ کی تحقیق اور فضیلت کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔

رموز ولایت

مشائخ عظام نے ولایت کے اسرار و رموز بیان فرمائے ہیں یہاں جس قدر ممکن ہو سکا وہ اسرار و رموز بیان کئے جائیں گے۔ کیونکہ اس میں بہت فوائد ہیں خدا تعالیٰ نصیب کرے۔

رموز میں ابو علی جرجانی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان

حضرت شیخ ابو علی جرجانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

الولی ھو الفانی فی حالہ والباقی فی مشاھدۃ الحق' لم یکن لہ عن نفسہ اخبار ولا مع غیر اللّٰہ قرار "ولی وہ ہے جو اپنے حال سے فانی ہو اور مشاہدۂ حق میں باقی ہو اس کے لئے ممکن نہیں کہ اپنے حال سے خبر دے یا خداوند تعالیٰ کے بغیر قرار پکڑے"۔ کیونکہ بندہ صرف اپنے حال (وجود) سے خبر دے سکتا ہے جب وہ فانی فی اللہ ہو گیا تو اپنے آپ سے کیسے خبر دے سکتا ہے۔ نیز چونکہ قرب حق میں اس پر اسرار و رموز حق تعالیٰ مکشوف ہوتے ہیں اس لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے اسرار و رموز دوسروں کے سامنے بیان کر سکے۔ نیز مشاہدۂ حق میں مشاہدۂ غیر اس کے لئے محال ہوتا ہے اور جب رویت غیر نہ ہو تو غیر حق یعنی مخلوق کے ساتھ وہ کیسے قرار پا سکتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا بیان رموز کے بارے میں

حضرت خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ : **الولی ان لایکون لہ خوف لان الخوف ترقب مکروہ یحل فی المستقبل و انتظار محبوب یفوت فی المستانف.....** (ولی وہ ہے جس کو کوئی خوف نہ ہو اس وجہ سے کہ خوف اس وقت ہوتا ہے کہ جب مستقبل میں آنے والے زمانے میں کسی واقعہ کے ہونے سے دل میں ڈر ہو یا کسی محبوب ترین چیز کے چلے جانے کا اندیشہ ہو۔) ولی ابن الوقت ہوتا ہے اس کے لئے زمانہ مستقبل نہیں ہے کہ اس کے واقعات سے خوف کھائے اور نہ اسے مستقبل میں آنے والی کسی چیز کی تمنا ہوتی ہے نہ چلے جانے والی چیز کا خوف ہوتا ہے نہ ہی اسے کوئی غم ہوتا ہے کیونکہ غم بھی کسی کام میں ناکامی سے پیدا ہوتا ہے لیکن ولی وہ ہے جو کسی چیز سے مغموم نہیں ہوتا

بلکہ ہر وقت رضائے الٰہی اور شکر میں مست رہتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا
کہ الآ اِنَّ اَولِیَآءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ولی کو اس لئے خوف نہیں ہوتا کہ نہ اسے کسی آنے والی بری چیز سے کراہت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی اچھی آنے والی چیز کے ساتھ رغبت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک ولی امید و بیم کی کش مکش سے بھی آزاد ہوتا ہے جو محض رضائے حق پر راضی ہو اسے نہ کوئی غم ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی چیز اسے خوش کر سکتی ہے کیونکہ خوشی و غمی اور خوف و ہراس تمام بشری تقاضے ہیں۔ جب انسان بشریت سے بالاتر ہو جاتا ہے تو نہ خوف رہتا ہے نہ امید و بیم کے چکر میں پریشان ہوتا ہے اس وقت وہ رضائے الٰہی میں مستغرق ہوتا ہے اور سارے جہان سے مستغنی ہو جاتا ہے۔

شرح بشریت سے بالاتر ہو جانے کا نام تصوف کی اصطلاح میں فنا فی اللہ ہے۔

حضرت ابو عثمان مغربی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان

حضرت ابو عثمان مغربیؒ فرماتے ہیں کہ : **الولی قد یکون مشهورا ولا یکون مفتونا** (ولی مشہور ہوتا ہے مفتون (فتنے میں ڈالا ہوا) نہیں ہوتا) ایک اور صاحب کا قول ہے کہ : **الولی قد یکون مستورا ولا یکون مشهورا** (ولی مستور (پوشیدہ) ہوتا ہے لیکن مشہور نہیں ہوتا۔) اس لئے کہ شہرت میں فتنہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ابو عثمان رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ مشہور ہو جائے لیکن اس کی مشہوری فتنہ کے بغیر ہوتی ہے کیونکہ فتنہ جھوٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ولی اپنی ولایت میں صادق ہوتا ہے۔ کاذب (جھوٹے) پر تو ولی کا نام صادق ہی نہیں آتا نیز کرامت کا ظہور بھی کاذب سے ناممکن ہوتا ہے۔ اس لئے فتنہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان دونوں اقوال میں اختلاف اس بے نظر

آتا ہے کہ ولی یہ نہیں جانتا کہ ولی ہے۔ اگر جانتا ہو تو مشہور ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراھیم بن ادھمؒ نے ایک شخص سے پوچھا کہ کیا تو ولی بننا پسند کرتا ہے۔ اولیاء اللہ میں سے۔ اس نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ آپ نے فرمایا :

"لا ترغب فی شئی من الدنیا والآخرۃ و فرغ نفسک للّٰہ و اقبل بوجھک علیہ" (دنیا کی کسی چیز سے دل نہ لگا اور اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے لئے وقف کر دے اور اپنی توجہ حق تعالیٰ پر مرکوز کر) ۔

کیونکہ دنیا سے دل لگانے کا مطلب ہے حق تعالیٰ کو چھوڑ کر فانی چیز سے دل لگانا اور عقبیٰ سے دل لگانے کا مطلب ہے فانی (دنیا) کی بجائے باقی رہنے والی (عاقبت) سے دل لگانا اور جب فانی چیز سے اجتناب کیا جائے تو وہ اجتناب بھی فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب باقی رہنے والی چیز (عاقبت) سے اجتناب کیا (حق کی خاطر) تو وہ اجتناب بھی پائیدار ہوتا ہے۔ اس قول کا فائدہ یہ ہے کہ خدا پر دنیا اور عقبیٰ قربان کر دے اور پھر تمام تر توجہ خداوند تعالیٰ پر مرکوز کر دے جب یہ اوصاف تیرے اندر پیدا ہوں گے تو تو ولی اللہ بن جائے گا۔

حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان

جب حضرت ابو یزید بسطامیؒ سے پوچھا گیا کہ ولی کون ہے تو فرمایا :

"الولی ھو الصابر تحت الامر والنھی (ولی وہ ہے جو خدا تعالیٰ کے احکام پر صابر رہے) کیونکہ جس قدر دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت زیادہ ہو گی اسی قدر اللہ کے احکام کی پابندی زیادہ سخت ہو گی۔ اور جس کام سے اللہ منع کرتا ہے اس سے اسی قدر باز رہے گا۔ حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ایک دفعہ مجھے بتایا گیا کہ فلاں شہر میں ایک ولی ہے۔ چنانچہ میں ان کی زیارت کے لئے روانہ ہوا۔ جب ان کی مسجد میں پہنچا تو وہ گھر سے باہر آئے تو مسجد کی

طرف تھوک دیا۔ یہ دیکھ کر میں بغیر سلام کئے واپس آگیا۔ دل میں یہ کہتے ہوئے کہ ولی وہ ہے جو پابند شریعت ہے۔ حق تعالیٰ اس کی ولایت کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر یہ شخص ولی ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کی ولایت کی حفاظت کرتا اور وہ مسجد کی طرف نہ تھوک سکتا۔ اسی رات میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابویزید جو عمل تونے کیا اس کی برکات تیرے اندر پہنچ چکی ہیں۔ دوسرے روز مجھے وہ مقام نصیب ہوا جسے تم لوگ دیکھ رہے ہو۔

سنا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص حضرت ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے آیا لیکن مسجد کے اندر پہلے بایاں پاؤں رکھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس شخص کو واپس بھیج دو۔ جس کو خدا کے گھر میں آنے کی تمیز نہیں ہے ہم اس سے ملنا پسند نہیں کرتے اور ملحدین کا ایک گروہ ہے جنہوں نے طریقت میں یہ سمجھ رکھا ہے کہ عمل اس وقت تک ضروری ہے جب تک ولایت حاصل نہ ہو۔ جب ولایت حاصل ہوجائے عمل کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ کھلی گمراہی ہے۔ قرب حق میں کوئی ایسا مقام نہیں ہے کہ جہاں عبادت یا عمل ساقط ہوجائے۔ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آرہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

کرامت کے ثبوت کے بیان میں

یاد رہے کہ کرامت کا ظہور ولی اللہ سے جائز ہے بشرطیکہ وہ احکام شریعت کی پابندی کرتا ہے۔ اہل سنت والجماعت بھی اس پر متفق ہیں نیز عقل کی رو سے بھی یہ بات قابل تسلیم ہے کیونکہ کرامت بھی خداوند تعالیٰ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے جس کا ظہور شریعت کے اصولوں میں سے کسی اصول کے خلاف نہیں اور کسی صورت میں اس کے اندر وہم کی گنجائش نہیں۔ کرامت ایک ولی کی صداقت کا ثبوت ہے جس کا ظہور کاذب سے نہیں ہوسکتا بلکہ کاذب کے دعوہ

ہائے کرامت الٹا جھوٹے ثابت ہوتے رہتے ہیں۔

کرامت ایک ایسا مافوق العادت فعل ہے جو پابندی شریعت سے وجود میں آتا ہے اور وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کی بدولت بطریق استدلال حق و باطل میں تمیز کر سکے وہ بھی ولی ہے اور بعض اہل سنت کہتے ہیں کہ ولی سے کرامت جائز ہے نہ کہ معجزہ مثلاً دعا کا قبول ہونا اور مراد پانا جیسے کام جو عام طور پر وجود میں نہیں آتے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایک ولی کے ہاتھ پر جو پابند شریعت ہے کوئی خرق عادت فعل سرزد ہو تو اس میں کیا قباحت ہے۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے کام خداوند تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہیں تو یہ کھلی گمراہی ہے۔ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ امر خدا کی قدرت میں ہے لیکن اگر کرامت کا ظہور ایک ولی کے ہاتھ پر ہو تو نبوت کی تردید ہے اور ان کی تخصیص ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ ولی سے معجزہ سرزد ہوتا ہے بلکہ جو خرق عادت فعل ولی سے سرزد ہوتا ہے اسے کرامت کہا جاتا ہے اور جو نبی سے سرزد ہو وہ معجزہ کہلاتا ہے۔ **والمعجزة لم تكن معجزة بعينها انما كانت معجزة لحصولها ومن شرطها اقتران دعوى النبوة۔ بها فالمعجزة تختص للانبياء والكرامة تكون للاولياء** (معجزہ فی الواقع عاجز کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ اس کا حصول عاجز کرنے والا ہوتا ہے بشرطیکہ یہ کام نبی کے ہاتھ پر سرزد ہو کیونکہ جو خلاف عادت فعل نبی سے سرزد ہو معجزہ کہلاتا ہے اور جو ولی سے سرزد ہو کرامت کہلاتا ہے)۔ اب چونکہ ولی ولی ہے اور نبی نبی اور اس میں کوئی اشکال نہیں۔ ضرورت سے زیادہ احتیاط مناسب نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب کا فرق ان کی ذاتی عظمت و عصمت پر ہوتا ہے نہ کہ معجزہ یا کرامت کی بنا پر۔ اب چونکہ معجزات میں سب نبی برابر ہیں تاہم ان کے مراتب میں فرق ہے اس لئے یہ بھی ممکن اور جائز ہے کہ خرق عادات میں نبی اور ولی ایک دوسرے کے مشابہ

ہوں لیکن مراتب میں فرق ہو۔ اب چونکہ محض خرق عادت کی وجہ سے ایک نبی دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ایک ولی کے ہاتھ پر خرق عادت کے سرزد ہونے سے ولی نبی کے برابر نہیں ہوسکتا۔ جب ایک مافوق العادت فعل کسی ایک شخص کی دوسرے پر فضیلت کا باعث نہیں بن سکتا تو اگر وہ فعل فوق العادت ولی سے سرزد ہو تو وہ مرتبہ میں نبی کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اس دلیل پر غور کیا جائے تو تمام شبہات و شکوک دور ہوجاتے ہیں اور یہ بات ناممکن ہے کہ کرامت کی بناء پر ایک ولی نبوت کا دعوہ کرے کیونکہ ولایت کی شرط صداقت ہے اور ایک صادق کی طرف سے جھوٹا دعوۂ نبوت ناممکن ہے۔ کاذب ولی نہیں ہوسکتا اور چونکہ ایک غیر نبی کے لئے دعوۂ نبوت کفر ہے لہٰذا ایک ولی کبھی بھی نبوت کا دعوہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ نبی آخرالزماں کے بعد نبوت کا دعوہ کرنا کفر ہے۔ بلکہ ولی کی کرامت نبی کی نبوت کا ثبوت ہے۔ اس لئے کرامت اور نبوت کو مخلوط کر کے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کی ضرورت نہیں جس طرح ایک نبی معجزہ کے ذریعے اپنی نبوت ثابت کرتا ہے ایک ولی بھی اپنی کرامت کے ذریعے اپنے نبی کی نبوّت کو ثابت کرتا ہے اور اپنی ولایت کو بھی۔ پس سچا ولی وہی کرتا ہے جو سچا نبی کرتا ہے۔ ولی کی کرامت عین معجزۂ نبی ہے۔ لہٰذا ایک ولی کی کرامت سے نبی کی نبوت میں زیادہ یقین پیدا ہونا چاہئے نہ کہ شک۔ اس وجہ سے کہ ولی اور نبی کے عقائد اور افعال کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہوتا جس سے ایک سے دوسرے کی نفی ممکن ہوسکے بلکہ ولی کا دعوہ عین نبی کا دعوہ ہے بالفاظ دیگر ایک کا دعوہ دوسرے کے دعوہ کی دلیل اور ثبوت ہے جیساکہ شریعت کی رو سے جب چند دعویداروں کے دعوے یکساں ہیں تو اگر ایک کا دعوہ صحیح ثابت ہوجائے تو دوسروں کا دعوہ خود بخود صحیح ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر ان کے دعوے مختلف ہوں تو پھر وہ بات نہیں رہتی۔ پس جب نبی اپنے معجزات کے ذریعے اپنی نبوت ثابت کرتا ہے اور ولی اپنی

کرامت کے ذریعے اپنے نبی کی نبوت کی تصدیق کرتا ہے تو تمام شبہات دور ہوجاتے ہیں۔

معجزات اور کرامات میں فرق

جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ معجزہ اور کرامت کاذب (جھوٹے) سے ناممکن ہے تو اب ہم ان کی زیادہ وضاحت کرتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح معجزہ کا ظاہر کرنا ضروری ہے اسی طرح کرامت کا چھپانا ضروری ہے اس وجہ سے کہ معجزہ کا اثر دوسروں پر ہوتا ہے اور کرامت ولی کے لئے مخصوص ہے۔ نیز نبی کو قطعی طور پر یقین ہوتا ہے کہ یہ معجزہ ہے لیکن ولی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کرامت ہے یا استدراج۔

شرح استدراج سے مراد شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے کیونکہ بعض اوقات شیطان کی طرف سے کوئی کام ہوجاتا ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ یہ کرامت ہے۔ بعض اوقات جادو کے ذریعے بھی فوق العادت امور کا ظہور ہوتا ہے۔ شیطان کی طرف سے کرامت کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ جیسے جلیل القدر ولی اللہ کو شیطان نے نور کا لبادہ اوڑھ کر کہا کہ اے عبدالقادر اب تم اس قدر بلند مراتب پر پہنچ گئے ہو کہ تمہارے لئے عبادت ضروری نہیں رہی۔ چونکہ حضرت شیخ کو معلوم تھا کہ عبادت کبھی ختم نہیں ہوتی آپ جان گئے کہ یہ کرامت نہیں استدراج اور شیطان کا دھوکہ ہے لہٰذا آپ نے لاحول پڑھا اور شیطان بھاگ گیا۔ اس طرح غیر مسلم لوگوں سے جو بظاہر کرامات ظاہر ہوتی ہیں ان میں بھی شیطان اور خبیث ارواح کا دخل ہوتا ہے اس لئے ان کو استدراج کہا جاتا ہے۔

ترجمہ دوسری بات یہ ہے کہ نبی صاحب شریعت ہوتا ہے وہ اپنے معجزات کی

حکم خداوندی کے تحت نفی و اثبات کرسکتا ہے لیکن صاحب کرامت کو احکام خداوندی میں تسلیم و رضا کے سوا چارہ نہیں کیونکہ اس کی کرامات سے شرع میں رد و بدل کی قطعاً اجازت نہیں ہوتی۔

اور یہ بات کہ ولی کی کرامت دراصل نبوت کے معجزہ کی تصدیق ہے اس واقعہ سے واضح ہوجاتی ہے کہ جب حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو کفار نے مکہ میں پھانسی دی تو اس کا علم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوگیا جو اس وقت مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے اور صحابہ کرام کو پھانسی کے واقعات بتارہے تھے۔ نیز اس وقت حق تعالیٰ نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے بھی حجاب دور کر دیئے جس کی وجہ سے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا اور سلام کیا خداوند تعالیٰ نے ان کا سلام بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دیا اور آنحضرتؐ کا جواب بھی ان کو سنوا دیا۔ اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا سے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا منہ قبلہ کی جانب ہوگیا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ بیٹھے ہوئے مکہ میں ان کی پھانسی کے واقعات کو دیکھنا اور ان کا مکہ میں ہوتے ہوئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنا خرق عادت ہے اور یہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی کرامت ہے کیونکہ غیب کی چیز کا دیکھنا بالاتفاق کرامت ہے۔ اب چونکہ غیب مکانی اور غیب زمانی میں کوئی فرق نہیں اس لئے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی کرامت جس سے انہوں نے غیبت مکانی کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کرلیا اور اولیائے متاخرین کی غیب زمانی کے دوران کرامات کے ظہور میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور یہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ ولی کی کرامت نبی کے معجزہ کے خلاف نہیں بلکہ نبی کے معجزہ کی تصدیق ہے۔ جو مومن مطیع و فرمانبردار کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا اولیاء کی کرامات دراصل معجزۂ پیغمبر علیہ السلام ہیں

چونکہ اسلام قیامت تک باقی رہے گا اس لئے اسلام کی حجت (کرامات) بھی قیامت تک جاری رہے گی۔ چنانچہ اولیاء کرام کا وجود گواہ ہے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ و السلام کی صداقت کا لہٰذا کرامت کا ظہور غیرولی کے ہاتھ پر نہیں ہو سکتا۔ اس بات کی تصدیق مندرجہ ذیل حکایت سے ہوتی ہے۔

حکایت حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حسب عادت گوشہ نشینی کے لئے صحرا کی طرف جارہا تھا کہ ایک کونے سے ایک شخص ظاہر ہوا اور میرے ساتھ جانے کی اجازت طلب کی۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی شکل و صورت سے نفرت ہوئی۔ اس شخص نے میری کیفیت دیکھ کر کہا کہ اے ابراہیم رنجیدہ خاطر نہ ہو میں ایک عیسائی ہوں اور ملک روم سے آپ کی صحبت اختیار کرنے کے لئے آیا ہوں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اس کی شکل دیکھ کر مجھے کیوں نفرت ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ اے راہب میرے پاس تو کھانے پینے کا سامان نہیں ہے مجھے ڈر ہے کہ تم اس صحرا میں تکلیف اٹھاؤ گے۔ اس نے جواب دیا کہ اے ابراہیم آپ کی ولایت کی شہرت تو سارے جہان میں پھیل چکی ہے پھر بھی آپ کھانے پینے کی فکر کر رہے ہیں۔ اس کے اس اعتقاد سے مجھے حیرت ہوئی اور میں نے اس کو ساتھ چلنے کی اجازت دے دی تاکہ تجربہ ہوجائے کہ اپنے دعوہ میں وہ کس قدر پکا ہے۔ جب سات دن رات گزر گئے تو ہم پر پیاس کا غلبہ ہوا۔ اس نے اسی جگہ رک کر کہا اے ابراہیم آپ کی شہرت کا آوازہ تو سارے جہاں میں بلند ہے اب کوئی کرامت دکھایئے کیونکہ پیاس کی وجہ سے میرا آگے جانا محال ہے۔ میں نے سر سجدہ میں رکھا اور بارگاہ حق تعالیٰ میں عرض کی یا الٰہی مجھے اس غیر مسلم کے سامنے رسوا نہ کیجئے کیونکہ غیرمذہب ہونے کے باوجود اس کو مجھ سے اعتقاد ہے۔ اگر تو اس کافر کا حسن ظن پورا کردے تو تیرے خزانے میں کیا کمی ہوجائے گی۔ جب میں نے سر

اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تشتری میں دو روٹی اور دو پیالے شربت کے سامنے پڑے ہیں۔ چنانچہ ہم سیر ہو کر آگے بڑھے۔ جب مزید سات دن گزر گئے تو میرے دل میں خیال آیا کہ اب اس راہب کا امتحان لینا چاہئے تاکہ اسے اپنی ذلت معلوم ہو۔ قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی مطالبہ کرے۔ چنانچہ میں نے کہا کہ اے عیسائی راہب اب تمہاری باری ہے۔ اپنی عبادت کا ثمر دکھاؤ اور کچھ لاؤ تاکہ ہم کھائیں۔ اس نے سر سجدہ میں رکھا اور کچھ دعا مانگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تشتری برآمد ہوئی جس میں چار روٹیاں اور چار شربت کے پیالے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا اور کچھ رنجیدہ خاطر بھی ہوا اور اپنی حالت پر پریشان بھی ہوا۔ اس لئے دل میں ارادہ کر لیا کہ ایک کافر کی ہمت سے جو کچھ ملا ہے اس کو میں استعمال میں نہیں لاؤں گا۔ اس نے کہا ابراہیم کھاؤ۔ میں نے کہا ہرگز نہیں کھاؤں گا۔ اس نے کہا کیا وجہ ہے ؟ میں نے کہا تم اس کرامت کے اہل نہیں ہو۔ کیونکہ کافر سے کرامت ناممکن ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ اے ابراہیم خوشی سے کھاؤ کیونکہ یہ آپ کی کرامت ہے۔ میں آپ کو دو خوشخبریاں سناتا ہوں ایک یہ کہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں اور کلمہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتا ہوں۔ دوم یہ کہ حق تعالیٰ کے ہاں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے میں نے کہا وہ کس طرح۔ اس نے جواب دیا کہ ہم عیسائیوں کو ان کرامات کی کوئی خبر نہیں۔ میں نے آپ سے شرمسار ہو کر سر زمین پر رکھا اور عرض کیا کہ یا الٰہی اگر دین محمدیؐ سچا ہے اور تیرا پسندیدہ ہے تو مجھے دو روٹیاں اور دو شربت کے پیالے عطا کر اور اگر ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ تیرا ولی ہے تو مجھے دو مزید روٹیاں اور دو پیالے عطا کر۔ جب میں نے سر اٹھایا تو یہ تشتری ظاہر ہوئی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور وہ راہب مسلمان ہو گیا اور بعد میں ولایت کے مقام پر پہنچا۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ ولی کی یہ کرامت عین معجزۂ نبی ہے اور یہ بہت ہی عجیب بات ہے کہ نبی کی عدم موجودگی میں ایک غیر مسلم کو اسلام کی حقانیت کا ثبوت مل جائے اور ایک ولی کی موجودگی میں ایک غیر مسلم کو کرامت حاصل ہو۔ دراصل ولایت کی انتہا نبوت کی ابتداء ہے۔ وہ راہب فرعون کے جادوگروں کی طرح مکتوم (یعنی محجوب) تھا۔ حضرت ابراہیم خواصؒ نے تو اپنی کرامت کے ذریعے نبوت کا معجزہ ثابت کردیا اور وہ راہب چونکہ صدق نبوت اور صدق ولایت دونوں کا طلبگار ہوا۔ حق تعالیٰ نے اس کی مراد پوری کردی۔ یہ ہے فرق کرامت اور معجزہ کے درمیان۔ یہ مضمون بہت طویل ہے جس کی اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں اور یہ بات بھی جان لو کہ اولیاء کی طرف سے کرامت کا ظاہر ہونا بھی ایک کرامت ہے کیونکہ کرامت کا اظہار ممنوع ہے۔

شرح یعنی جب کسی ولی سے کرامت ظاہر ہوجائے تو یہ بات چونکہ غیر معمولی ہے اس لئے یہ بھی اس کی کرامت سمجھی جائے کیونکہ اس کا چھپانا ضروری تھا مگر کسی مجبوری کے تحت اسے ظاہر کرنا پڑا۔

ترجمہ لیکن میرے شیخ علیہ رحمہ فرماتے ہیں کہ اگر تبلیغ کی خاطر ولی اپنی ولایت ظاہر کرے تو اس کا کوئی ہرج نہیں۔ ہاں اگر بلا ضرورت ظاہر کرے تو یہ رعونت ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خدائی کے دعویدار سے اظہار معجزہ کے بیان میں

مشائخ طریقت اور علمائے اہلسنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ کافر کے ہاتھ پر بھی افعال خرق عادت ظاہر ہوسکتے ہیں حالانکہ اس کے کافر ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تک نہ ہو بلکہ اس کا یہ فعل اس کے جھوٹ کو ثابت

کرے۔ جیسے فرعون کی عمر چار سو سال تھی لیکن وہ کبھی بیمار نہ ہوا اور جب چڑھائی پر جاتا تھا تو پانی اس کے پیچھے چڑھائی پر جاتا تھا' جب وہ ٹھہر جاتا تھا تو پانی بھی ٹھہر جاتا تھا اور جب وہ چلتا تھا تو پانی بھی چلتا تھا لیکن عقل مند اس کو خدا نہیں سمجھتا تھا کیونکہ خداوند تعالیٰ مجسم اور مرکب انسان کی طرح نہیں ہے۔ چنانچہ ایسے شخص سے جتنے افعال خرق عادت ظاہر ہوں اس کے دعوے کو کوئی عقل مند صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ شداد جس نے بہشت بنائی اور نمرود کا بھی یہی حال ہے۔ نیز مخبر صادق جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے ہمیں خبردار کیا ہے کہ آخری زمانے میں دجال آئے گا اور خدائی کا دعوہ کرے گا اس کی دونوں جانب دو پہاڑ ہوں گے ایک جائے آرام ہوگا اور دوسرا جائے عقوبت۔ جو شخص اس کی بات نہیں مانے گا وہ اس کو سزا دے گا اور وہ خلق خدا کو مارے گا اور زندہ کرے گا اور سارے جہان میں اس کا حکم چلے گا۔ اگر اس کی طرف اس قسم کے ہزاروں خرق عادت افعال صادر ہوں تاہم اس کو کوئی عقل مند خدا نہیں سمجھے گا کیونکہ خدا نہ گدھے پر سوار ہو سکتا ہے نہ ایک آنکھ سے نابینا ہو سکتا اور نہ تبدل و تغیر پذیر ہوتا ہے۔ اس چیز کو استدراج کہا جاتا ہے۔

شرح جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ استدراج کا مطلب ہے ایسے خلاف عادت امور کا ظہور جو شیطان یا جادو کے ذریعے کافروں کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔ یہ امور بھی خلق کی آزمائش کے لئے ہوتے ہیں کہ کون دھوکہ کھاتا ہے اور کون بچ نکلتا ہے۔

(ترجمہ) رسالت کے دعویدار سے خرق عادت کا ظہور

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبوت کے جھوٹے دعویدار کے ہاتھ پر خرق عادت امور کا ظہور ہو۔ یہ بھی اس کے کذب کی دلیل ہوگی۔ جیسا کہ صادق کے ہاتھ پر

خرق عادت کا ظہور اس کی صداقت کی دلیل ہے۔ ہاں اگر اس بات میں شک ہو کہ آیا یہ کام خرق عادت ہے یا خرق عادت نہیں ہے تو پھر سچے اور جھوٹے کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے اور طالب حقیقت یہ نہیں بتا سکے گا کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ولایت کے دعویدار کے ہاتھ پر کرامت جیسے کسی فعل کا ظہور ہو حالانکہ وہ شخص دیندار تو ہے لیکن معاملات میں پختہ نہیں ہے اس وجہ سے کہ اس کی اس کرامت سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت ثابت ہوتی ہے اور اس سے حق تعالیٰ کا فضل و کرم ظاہر ہوتا ہے نہ کہ اس فعل کو وہ اپنی قوت یا طاقت سمجھتا ہے جو شخص کسی کرامت کے بغیر شریعت میں پختہ ہے وہ کرامت کے ساتھ دیگر احوال میں بھی صادق سمجھا جائے گا کیونکہ اس کا اعتقاد ہر حال میں ولی کے اعتقاد کی طرح ہوتا ہے خواہ اس کے اعمال اس کے اعتقادات پر پورے نہ اتریں۔ خام اعمال کی وجہ سے وہ ولایت سے خارج نہیں ہوتا جیساکہ خام اعمال سے انسان اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ دراصل کرامت ہو یا ولایت یہ وہبی ہے یعنی حق تعالیٰ کا عطیہ ہے نہ کہ کسبی یعنی کوشش سے حاصل ہو۔ اس لئے کہ بندہ کی طرف سے کوشش کی وجہ سے ہدایت یا ولایت حاصل نہیں ہوتی۔

ولی معصوم نہیں محفوظ ہوتے ہیں

اس سے پہلے بیان ہوچکا ہے کہ ولی معصوم نہیں ہوتے بلکہ نبی معصوم ہوتے ہیں لیکن ولی محفوظ ہوتے ہیں اس آفت سے جس کی وجہ سے ولایت کی نفی ہوجائے اور ولایت کی نفی اس چیز سے ہوتی ہے جس سے ایمان کی نفی ہو۔ اس کو ارتداد (مرتد ہونا) کہتے ہیں نہ کہ معصیت اور یہی عقیدہ ہے حضرت محمد بن

علی حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ' جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ' ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ اور حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر بے شمار اہل حق کا۔ لیکن اہل معاملات مثل حضرتؒ سہل بن عبداللہ تستری' ابوسلیمان دارانی رحمتہ اللہ علیہ' ابوحمدون قصار رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کا مسلک یہ ہے ولایت کی شرط یہ ہے کہ اطاعت پر مداومت (ہیشگی) رکھے اور جونہی اس سے گناہ کبیرہ سرزد ہوتا ہے ولایت سے معزول ہو جاتا ہے اور اس سے قبل بیان کرچکا ہوں کہ اجماع امت اس بات پر ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے انسان ایمان (اسلام) سے خارج نہیں ہوتا۔ اب جبکہ گناہ کی وجہ سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا تو اس وجہ سے ولایت سے کیسے خارج ہوسکتا ہے جبکہ ایمان ولایت کی جڑ ہے۔ اس موضوع پر مشائخ کے درمیان اختلاف ہے جس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔

شرح شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ایک ولی حق تعالی کا دوست ہوتا ہے دوست سے گناہ کبیرہ ہو جائے تو یہ بہت بڑی اور بہت بری چیز ہے جس کی وجہ سے وہ دوستی کے قابل نہیں رہتا اور دوستی کا مرتبہ یعنی ولایت اس سے چھین لی جاتی ہے۔

ولی سے کرامت کس حال میں سرزد ہوتی ہے

اس معاملے میں سب سے اہم بات جو جاننے کے قابل ہے یہ ہے کہ ایک ولی اللہ سے کرامت کس حال میں سرزد ہوتی ہے آیا صحو (ہوشیاری) کی حالت میں یا سکر (استغراق) کی حالت میں۔ بالفاظ دیگر آیا کرامت مغلوب الحال سے سرزد ہوتی ہے یا غالب الحال سے۔ صحو اور سکر کی شرح اس سے پہلے حضرت خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ کے ذکر میں بیان ہوچکی ہیں۔

اس بارے میں حضرت ابویزید رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ذوالنون مصری رحمتہ

اللہ علیہ، حضرت محمد بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ، حضرت حسین بن منصور رحمتہ اللہ علیہ اور یحییٰ بن معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر اولیاء کرامؒ کا مؤقف یہ ہے کہ ولی سے کرامت کا ظہور حالت سکر میں ہوتا ہے اور جو کچھ حالت صحو میں ظاہر ہوتا ہے اسے معجزۂ انبیاء کہا جاتا ہے۔ ان حضرات کے مسلک میں کرامت اور معجزہ میں یہی فرق واضح ہے کہ ولی سے کرامت کا اظہار حالت سکر میں ہوتا ہے جبکہ وہ مغلوب الحال ہوتا ہے اور تبلیغ اسلام کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی اور نبیؑ سے معجزہ حالت ہوشیاری میں ظاہر ہوتا ہے جب وہ لوگوں سے مقابلہ کرتا ہے اور اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ ایک نبی کو اختیار ہوتا ہے کہ جب چاہے معجزہ ظاہر کرے اور جب چاہے مخفی رکھے۔ لیکن اولیاء کو یہ اختیار نہیں ہوتا۔ بعض اوقات وہ کرامت دکھانا چاہتے ہیں لیکن نہیں دکھا سکتے۔ بعض اوقات وہ نہیں چاہتے لیکن کرامت کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ولی داعی نہیں ہوتا جس کو ظاہر ہونا پڑے بلکہ وہ مکتوم (مخفی) ہوتا ہے جس کو ظاہر ہونے کی ضرورت نہیں۔ یعنی نبی صاحب شریعت ہوتا ہے اور ولی صاحب سِرّ (راز)۔ لہٰذا کرامت کا اظہار حالتِ سکر (بے اختیاری) میں ہونا چاہئے نہ کہ ہوشیاری میں۔ اس وقت اس کا تصرف خدا تعالیٰ کا تصرف ہوتا ہے۔ اس کا کلام کلامِ حق ہوتا ہے۔ اس لئے ولی سے کرامت کا اظہار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے آپ سے غائب اور حالت محویت میں نہ ہو۔

بشریت کی صفت یا لاہی (غافل ہونا) یا ساہی (بھولنے والا) ہوتی ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام ان دو صفات سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کا منصب نہ لاہی ہوتا ہے نہ ساہی بلکہ الٰہی ہوتا ہے۔

انسان بشریت کی حالت میں محجوب ہوتا ہے اس لئے اس سے کرامت کا ظہور حالت بشریت (ہوشیاری) میں نہیں ہوتا۔ جب بشریت کا پردہ اٹھ جاتا ہے تو

وہ محو اور مستغرق ہوجاتے ہیں اور کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حالت کا نام درجۂ قرب ہے۔ اس وقت پتھر اور سونا اس کے لئے برابر ہوتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی شخص دائمی طور پر اس حالت میں نہیں رہ سکتا چنانچہ ایک دن حضرت حارثہؓ پر یہی حالت طاری ہوئی تو فرمایا۔

اعرضت نفسی عن الدنیا فلستوی عندی حجر ھا و ذھبھا و فضتھا و مدرھا (جب میں نے اس دنیا میں اعراض (ترک) کیا تو میرے نزدیک اس کا پتھر' سونا' چاندی اور ڈھیلے برابر ہوگئے)۔

دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ کھجور کے درخت پر چڑھ کر پھل اتار رہے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ یہ کیا کررہے ہیں تو فرمایا روزی کمارہا ہوں کہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ وہ بھی وقت تھا یہ بھی ایک وقت ہے۔

شرح پہلا وقت قرب' فنا اور محویت کا تھا۔ دوسرا وقت دوئی' بقا اور ہوشیاری کا۔ پہلے مقام کو سکر کہا جاتا ہے دوسرے کو صحو۔ پہلے مقام پر انسان مغلوب الحال ہوتا ہے۔ دوسرے پر غالب الحال۔ پہلے مقام پر ابن الحال ہوتا ہے دوسرے پر ابوالحال۔

ترجمہ مقام صحو پر اولیاء اللہ عام انسانوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ (جیسے حارثہؓ کھجور پر چڑھ گئے) اور مقام سکر پر وہ انبیاء علیہم السلام کے مدارج کا ثبوت بن جاتے ہیں۔ جب اس مقام سے نیچے آتے ہیں تو عام آدمیوں کی طرح بن جاتے ہیں جب اپنے آپ سے غائب ہوجاتے ہیں تو حق تعالیٰ سے پیوست ہوجاتے ہیں۔ غرضیکہ قرب حق میں سونا بن جاتے ہیں اور ان کے نزدیک سارا جہان سونا بن جاتا ہے جیسا کہ شبلیؒ نے فرمایا ہے۔

ذهب ابنما ذهبنا و در
حمث درنا و فضته فی الفضا

جہاں ہم چلے چاندی تھی' جہاں ہم بیٹھے وہاں ہیرے تھے اور جہاں ہم سوئے وہاں سونا تھا۔ میں نے حضرت استاذ امام ابوالقاسم قشیری رحمتہ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک دفعہ میں نے حضرت طبرانی رحمتہ اللہ علیہ سے ان کی ابتدائی حالت کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ ایک دفعہ مجھے پتھر کی ضرورت ہوئی (طہارت کے لئے) جس پتھر کو اٹھاتا تھا وہ ہیرا بن جاتا تھا اور میں اسے پھینک دیتا تھا۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ دونوں (پتھر اور ہیرا) ان کے نزدیک برابر تھے۔ بلکہ اس وقت ان کے لئے ہیرا پتھر سے زیادہ بے کار تھا۔ کیونکہ ان کو پتھر کی ضرورت تھی۔ نیز میں نے امام خرامی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا۔ فرماتے تھے کہ ایام طفلی میں میں شہر سرخس کے ایک محلے میں ریشم کے کیڑوں کے لئے توت کے پتے توڑ رہا تھا۔ اس کوچہ سے حضرت شیخ ابوالفضل ابن الحسن رحمتہ اللہ علیہ کا گزر ہوا۔ میں اس وقت درخت کے اوپر بیٹھا تھا انہوں نے عالم مستی میں سر اٹھایا اور کہا کہ یا الٰہی ! ایک سال ہوگیا ہے کہ تو نے مجھے ایک پیسہ بھی نہیں دیا کہ حجامت بنواؤں۔ کیا دوستوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ کہنا تھا کہ سارا درخت پتوں' شاخوں اور جڑ سمیت سونا بن گیا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے کہا کہ "عجیب بات ہے ہر بات پر ہمارا مذاق اڑایا جاتا ہے کہ ہم دل کھول کر بات بھی نہیں کرسکتے"۔ اسی طرح حضرت شیخ شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے چار ہزار دینار دریائے دجلہ میں پھینک دیئے۔ جب آپ سے سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ پتھر کے لئے پانی بہتر ہے۔ جب لوگوں نے کہا کہ یہ بہتر تھا کہ آپ یہ رقم کسی غریب کو دے دیتے۔ آپ نے فرمایا :۔

" سبحان اللہ ! مجھے کیا حق حاصل ہے کہ پردے کو اپنے دل سے ہٹا کر

ایک مسلمان بھائی کے دل پر ڈال دوں۔ یہ دینداری نہیں ہے کہ مسلمان بھائیوں کی بدخواہی کروں۔"

یہ تمام حالات مقام سکر کا نتیجہ ہیں جس کی شرح پہلے کرچکا ہوں۔ یہاں میری مراد بیان کرامت ہے۔ لیکن حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ' ابوالعباس سیاری رحمتہ اللہ علیہ' ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت محمد بن علی حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ جو سب صاحب مذہب تھے (یعنی امام وقت تھے) کا موقف یہ ہے کہ کرامت کا ظہور حالت صحو اور تمکین میں ہوتا ہے نہ کہ حالت سکر میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ منتظمانِ جہاں اور مشرفانِ عالم ہیں اور خداوند تعالیٰ نے ان کو خلق کا حکمران بنایا ہے اور حل و عقد (امور کا انجام دینا) کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اور احکام جہاں کا والی مقرر فرمایا ہے لہٰذا لازمی طور پر ان کی رائے تمام لوگوں کی رائے سے صحیح ترین ہوگی اور ان کے قلوب تمام قلوب سے شفیق ترین ہوں گے خلق خدا پر۔ سکر اور تلوین ابتدائی مراتب ہیں۔ جب بلوغ آتا ہے تو تلوین' تمکین میں بدل جاتی ہے۔ اس وقت وہ صحیح معنوں میں ولی ہوتا ہے اور اس کی کرامات صحیح ہوتی ہیں۔ اہل اللہ جانتے ہیں کہ اوتاد کا فرض ہے کہ شب بھر میں سارے جہان کا دورہ کرے اور جس جگہ ان کی نظر نہیں پڑتی دوسرے دن وہاں کوئی نہ کوئی خلل واقع ہوتا ہے اس وقت وہ اپنے قطب کی طرف توجہ کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی برکت سے اس خلل کو خلق خدا سے دور کریں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ سونا اور پتھر ان کے نزدیک برابر ہوتا ہے یہ تمام سکر کی باتیں ہیں اور مقام کی کوتاہی کی وجہ سے ہے۔ اس کی زیادہ وقعت نہیں ہے۔ عارفین اور مقربین کے ہاں فضیلت اس بات میں ہے کہ ان کے نزدیک سونا سونا ہو اور پتھر پتھر۔ لیکن اس کی آفت (فتنہ) سے آگاہ ہوں۔ اور یہ کہے کہ اے سونا اور اے چاندی تم مجھے فریب نہیں دے سکتے۔ میں تمہاری وجہ سے مغرور نہیں ہوتا۔ میں تمہارے

فتنہ و فریب سے بخوبی آگاہ ہوں۔ لہٰذا جو شخص سونا چاندی کی آفات کو جان کر اسے ترک کرتا ہے ثواب حاصل کرتا ہے۔ اور جو شخص اس کو پتھر سمجھتا ہے پتھر کا ترک کرنا کون سی بہادری ہے۔ تو نے دیکھ لیا کہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ صاحب سکر تھے اس لئے سونا چاندی اور پتھر ان کے لئے برابر تھے لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صاحب صحو تھے ان کو آفت دنیا معلوم ہو گئی تھی اور ترک دنیا کے فوائد سے آگاہ تھے اس لئے اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ حتیٰ کہ جب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ و السلام نے پوچھا کہ بال بچوں کے لئے کیا چھوڑ کر آئے ہو تو جواب دیا کہ "اللہ اور رسولؐ۔"

قطب مدار کی زیارت

حضرت ابوبکر وراق ترمذی رحمتہ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت محمد بن علی حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ نے مجھ سے کہا کہ اے ابوبکر آج میں تجھے ایک جگہ پر لے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ بندہ حاضر ہے۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک سخت مشکل صحرا میں پہنچ گئے۔ وہاں کچھ سبزہ تھا اور ایک درخت کے نیچے ایک سنہری تخت پڑا تھا جس پر خوبصورت لباس میں ملبوس ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ جب محمدؒ بن علی رحمتہ اللہ علیہ ان کے نزدیک پہنچے تو انہوں نے اٹھ کر ان کو اپنے پاس تخت پر بٹھایا۔ اس کے بعد ہر طرف سے بزرگ آنا شروع ہوئے حتیٰ کہ ان کی تعداد چالیس ہو گئی۔ اس کے بعد اس بزرگ نے اشارہ کیا اور آسمان سے کھانے کی چیز نازل ہوئی اور ہم سب نے کھائی۔ اس کے بعد محمدؒ بن علی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک سوال کیا جس کے جواب میں اس بزرگ نے بہت طویل جواب دیا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کچھ دیر کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو حضرت محمدؒ بن علی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا اے ابوبکر جاؤ تجھے سعادت مل گئی۔ کچھ عرصے کے بعد جب میں

دوبارہ ترمذ آیا تو ان سے دریافت کیا کہ یا شیخ وہ کیا مقام تھا اور وہ کون بزرگ تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ بنی اسرائیل کا صحرا تھا اور وہ بزرگ قطب مدار تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یا شیخ ہم تھوڑی سی دیر میں کس طرح بنی اسرائیل کے صحرا میں پہنچ گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ اے ابوبکر تمہارا کام پہنچنا ہے نہ کہ پوچھنا۔ اور یہ کام صحت حال سے انجام پاتا ہے نہ کہ سکر سے۔

شرح جیساکہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ قطب مدار دنیا میں ایک ہوتا ہے جو خداوند تعالیٰ کے حکم سے باطنی طور پر حکمرانی کرتا ہے۔ ان کو غوث زماں بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے نیچے دو قطب ہوتے ہیں ایک دائیں جانب اور ایک بائیں جانب۔ پھر ان دونوں اقطاب کے ماتحت اور بزرگ ہوتے ہیں جن کو ابدال' اوتاد وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کے سپرد دنیا کے مختلف علاقے اور مختلف کام ہوتے ہیں۔ ان کو رجال الغیب یا اولیائے مکتوم کہا جاتا ہے۔

ترجمہ اب میں اس مضمون کو مختصر طریق پر بیان کرتا ہوں کیونکہ اگر تفصیل میں جاؤں تو ایک طویل کتاب وجود میں آئے گی اور میرا مقصد (اختصار) فوت ہوجائے گا۔ بعض دلائل جو اس کتاب سے متعلق تھے میں نے پیش کردیے ہیں تاکہ ان کے مطالعہ سے مریدوں کو تنبیہہ ہو' علماء کو تقویت' محققین کو حقیقت اور عوام کو یقین اور رفع شبہات نصیب ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ و باللہ التوفیق (اور توفیق دینے والا اللہ ہے)۔

اولیاء اللہ کی کرامات قرآن پاک میں

جاننا چاہئے کہ جب عقلی دلائل سے کرامات کا وجود ثابت ہوگیا اب ہم چاہتے ہیں کہ علمی دلائل سے بھی لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ کیونکہ جو کچھ قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ میں کرامات اور افعال خرق العادت کے متعلق وارد ہوچکا

ہے اگر ان کا انکار کیا جائے تو اس سے قرآن اور حدیث کا انکار لازم آتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے کلام پاک میں فرمایا ہے :

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى (ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور من و سلویٰ اتارا۔)

چنانچہ اس قوم پر ہمیشہ ابر کا سایہ رہتا تھا اور ہر رات من و سلویٰ کھانے کو ملتا تھا۔ اب اگر کوئی اولیاء کی کرامات کا منکر یہ کہے کہ یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا اس سے اولیاء کی کرامات کیسے ثابت ہو سکتی ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ فی الواقع یہ حضرت موسیٰ کا معجزہ تھا۔اولیائے امت سے جو کرامات سرزد ہوتی ہیں وہ بھی ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ و السلام کے معجزہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اولیائے امت کی کرامات نبی علیہ الصلوٰۃ و السلام کی عدم موجودگی میں کس طرح صحیح ہوسکتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام لوگوں سے غیب ہوکر کوہ طور پر چلے گئے تب بھی وہ کرامت جاری رہی۔ اس لئے موجودگی اور عدم موجودگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کرامات ان کی عدم موجودگی میں صحیح ہوسکتی ہیں۔ تو اولیائے امت کی کرامات بھی ان کی عدم موجودگی میں صحیح ہو سکتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے چاہا کہ ملکہ بلقیس کا تخت لایا جائے تو عاصف بن برخیا کی کرامت سے وہ تخت فی الفور پہنچ گیا۔ اس کی خبر قرآن مجید کی اس آیت سے ملتی ہے۔

قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَن تَقُومَ مِن مَّقَامِكَ (ایک جن عفریت نے کہا کہ میں لاکر دیتا ہوں قبل اس کے کہ آپ مجلس برخاست کریں۔)

لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اس سے بھی جلدی

چاہئے تو ان کے ایک صحابی آصف بن برخیا نے کہا کہ :۔

اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ (میں آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے لا سکتا ہوں)۔

اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام ناراض نہ ہوئے اور نہ منع فرمایا اور نہ ہی ان کو یہ بات ناممکن نظر آئی۔ یہ کسی صورت میں نبی کا معجزہ نہیں تھا کیونکہ آصف پیغمبر نہیں تھے بلکہ لامحالہ ایک کرامت تھی جو غیر نبی سے سرزد ہوئی۔ اگر معجزہ ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا۔

دوسرا واقعہ حضرت مریمؑ کا ہے۔ وہ یہ کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام ان کے پاس آئے تو گرمی کے موسم میں موسم سرما کا میوہ ان کے پاس دیکھا۔ حالانکہ گرمی کے موسم میں گرمی کا میوہ ہونا چاہئے تھا۔ جب حضرت زکریا علیہ السلام نے پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ مریمؑ پیغمبر نہیں تھیں۔ نیز حق تعالیٰ نے صریحی طور پر فرمایا ہے کہ :

وَهُزِّيٓ إِلَيۡكِ بِجِذۡعِ ٱلنَّخۡلَةِ تُسَٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبٗا جَنِيّٗا (کھجور کے درخت کو ہلاؤ تو تازہ کھجوریں گریں گی)۔

نیز قرآن حکیم میں اصحاب کہف کے جو حالات بیان فرمائے ہیں ان میں کتے سے کلام کرنا' غار میں ان کا تین سو سال سوئے رہنا اور دائیں بائیں کروٹ لینا یہ تمام افعال خرق عادت ہیں اور ہرگز معجزہ نہیں کہلائے جا سکتے۔ بلکہ کرامات ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کرامت کا ظہور دعاؤں کے قبول ہونے کی صورت میں ہو یا مشکلات کے حل ہو جانے سے ہو یا طویل سفر تھوڑی دیر میں طے ہو جائے یا غیب سے طعام مل جائے یا کسی کے دل کا حال معلوم ہو جائے۔

وغیرہ۔

کرامات اولیاء کا ذکر احادیث اور آثار میں

نیز صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ جب اصحاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیاکہ پرانے زمانے کی امتوں کے حالات سے آگاہ فرمادیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ تین آدمی سفر کررہے تھے۔ جب رات ہوئی تو انہوں نے غار کے اندر جاکر رات بسر کی' جب رات کا کچھ حصہ گزر چکا تو پہاڑ سے ایک چٹان گری جس سے غار کا منہ بند ہوگیا اس سے وہ لوگ سخت پریشان ہوئے اور آپس میں کہا کہ اب رہائی ناممکن ہے سوائے اس کے کہ ہم اپنے بہترین اعمال کو وسیلہ بناکر حق تعالیٰ سے دعا کریں۔ چنانچہ ایک نے کہا کہ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا میرے پاس ایک بکری تھی جس کا دودھ ان کو پلاتا تھا اور جنگل سے لکڑی کاٹ کر فروخت کرتا اور اس سے روٹی خرید کر ان کو کھلاتا تھا۔ ایک رات میں دیر سے پہنچا اور دیکھا کہ وہ بھوکے سوگئے ہیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ دودھ کا پیالہ بھر کر ان کے بستر کے پاس ساری رات کھڑا رہا تاکہ جس وقت وہ بیدار ہوں تو دودھ پیش کروں اسی طرح رات گزر گئی۔ جب صبح کو وہ بیدار ہوئے تو ان کو دودھ پیش کیا۔یا الٰہی اگر میرا یہ کام تیری بارگاہ میں مقبول ہو تو ہمیں اس آفت سے نجات دلائیں۔ یہ کہتا تھا کہ اس چٹان میں حرکت ہوئی اور غار کا منہ ذرا سا کھل گیا۔ اس کے بعد دوسرے آدمی نے کہا کہ میرے چچا کی ایک لڑکی تھی جو بہت حسین تھی۔ میرا دل اس سے لگ گیا میں جس قدر اس کے پیچھے جاتا تھا وہ اتنا ہی دور بھاگتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے اس کو ایک سو بیس دینار دے کر راضی کیا۔ جب رات کو میرے پاس آئی تو مجھ پر خوف خدا طاری ہوگیا چنانچہ میں اس گناہ سے باز آیا اور وہ رقم بھی اس کو بخش دی۔ یا الٰہی اگر میرا یہ کام بارگاہ معلی میں قبول ہوا ہو تو ہماری جان رہا فرمائی جائے۔ اس پر اس چٹان

میں مزید حرکت ہوئی اور وہ سوراخ زیادہ بڑا ہوگیا لیکن اب تک اتنا زیادہ بڑا نہ ہوا تھا کہ وہ لوگ باہر نکل سکتے۔ تیسرے نے کہا کہ ایک دفعہ میرے ہاں کچھ مزدور کام کررہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد سب مزدور اپنی اجرت لے گئے لیکن ایک مزدور اجرت لئے بغیر غائب ہوگیا۔ میں نے اس کی رقم سے ایک بھیڑ خرید لی۔ دوسرے سال دو بھیڑیں ہوگئیں اسی طرح ہر سال بھیڑیں بڑھتی رہیں اور ایک اچھا خاصہ ریوڑ بن گیا۔ جب وہ مزدور واپس آیا تو مجھ سے مزدوری طلب کی۔ میں نے کہا یہ سب بھیڑیں تمہاری ہیں لے جاؤ۔ اس نے کہا آپ میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں میں نے کہا مذاق نہیں حقیقت ہے۔ چنانچہ وہ سب بھیڑیں لے کر چلا گیا۔ یا الٰہی اگر میرا یہ کام تیری بارگاہ میں مقبول ہوا ہو تو ہمیں اس غار سے نجات دلائی جائے۔ یہ کہنا تھا کہ چٹان کو مزید حرکت ہوئی اور ہم تینوں صحیح و سلامت باہر آگئے۔ یہ بھی کرامت ہے۔

نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ گہوارے میں سوائے تین بچوں کے اور کسی نے بات نہیں کی۔ ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو مشہور واقعہ ہے دوسرا واقعہ جریج کا ہے جو بنی اسرائیل میں ایک راہب تھا۔ وہ بہت عبادت گزار بزرگ تھا۔ ایک دن اس کی ماں اسے ملنے گئی تو وہ نماز میں مشغول تھا۔ دوسرے دن گئی تو اس نے دروازہ نہ کھولا۔ تیسرے دن گئی تو پھر بھی نہ مل سکی۔ اب اس نے بد دعا کی کہ الٰہی میرے بیٹے کو رسوا کر تاکہ میرا حق ادا کرے۔ اس زمانے میں ایک بدکار عورت تھی۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ میں جریج کو گمراہ کرسکتی ہوں۔ چنانچہ وہ اس کے عبادت خانہ میں داخل ہوئی لیکن جریج نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اس عورت نے وہاں سے مایوس ہوکر راستے میں ایک چرواہے کو بدکاری پر آمادہ کیا اور حاملہ ہوگئی۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس نے کہا کہ یہ جریج کا بیٹا ہے۔ لوگ جریج کو

پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے گئے جریج نے شیر خوار بچے کو مخاطب کر کے کہا کہ تو کس کا بیٹا ہے اس نے کہا میری ماں تجھ پر غلط الزام لگارہی ہے۔ میرا باپ فلاں چرواہا ہے۔ تیسرا ایک عورت کا بچہ تھا۔ ایک دن وہ عورت اپنے بیٹے کو گود میں لئے بیٹھی تھی کہ وہاں سے ایک سوار گزرا جو بہت خوبصورت اور خوش لباس تھا۔ ماں نے کہا یا الٰہی میرے بیٹے کو اس سوار کی طرح بنا دے۔ لیکن گود والے بچے نے کہا کہ یارب مجھے اس طرح نہ بنا۔ اس کے بعد وہاں سے ایک بدنام عورت گزری تو اس نے کہا کہ یا الٰہی میرے بچے کو اس عورت کی طرح نہ بنا۔ لیکن بچے نے کہا یارب مجھے اس عورت کی طرح بنا۔ یہ سن کر اس کی ماں حیران ہوئی اور کہنے لگی کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بچے نے کہا کہ وہ سوار ایک ظالم شخص تھا اور یہ عورت ایک نیک خاتون ہے۔ لیکن خلق اس کو یوں ہی بدنام کر رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ظالم نہ بنوں بلکہ اس عورت کی طرح نیک بنوں۔

ایک اور مشہور حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خادمہ زیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سلام عرض کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا اے زیدہ تو بہت دیر بعد آئی ہے۔ تیری نیکی مجھے پسند ہے اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ آج صبح میں لکڑیاں جمع کرنے کے لئے جنگل میں گئی۔ جب ایک گٹھا جمع ہوگیا تو میں نے اسے ایک چٹان پر رکھا تاکہ اٹھا کر سر پر رکھوں کیا دیکھتی ہوں کہ آسمان سے ایک سوار زمین پر آیا اور مجھ پر سلام کہہ کر کہنے لگا کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو میرا سلام کہو اور یہ بتاؤ کہ بہشت کے دربان رضوان نے کہا ہے کہ آپؐ کو مبارک ہو کہ حق تعالیٰ نے بہشت کو آپ کی امت پر اس طرح تقسیم کیا ہے کہ امت کا ایک حصہ بے حساب بہشت میں جائے گا۔ دوسرے حصہ کا حساب کتاب آسان کر دیا جائے گا اور تیسرا حصہ آپ

کی شفاعت سے بخشا جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ فرشتہ آسمان کی طرف اڑا اور جاتے وقت میری طرف نظر کی اور جب دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا مجھ سے اٹھایا نہیں جاسکتا تو اس نے کہا کہ زیدہ فکر نہ کرو۔ اس نے پتھر کی چٹان کو کہا کہ اے پتھر تم چل کر اسے عمر کے گھر پر پہنچا دو۔ چنانچہ پتھر چل پڑا اور لکڑیوں کا گٹھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازہ تک پہنچا دیا۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اٹھے اور صحابہ کرامؓ کو ساتھ لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر پر تشریف لے گئے اور پتھر کی آمد و رفت کے نشانات ملاحظہ فرمائے اور فرمایا کہ الحمدللہ کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھایا جب تک رضوان کے ذریعے میری امت کے لئے یہ بشارت نہ دی اور جب تک میری امت کی ایک خاتون کو مریم کے درجہ تک نہ پہنچایا۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے جو مشہور ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علا بن الحضرمی رضی اللہ عنہ کو کسی لڑائی کے لئے روانہ فرمایا۔ راستے میں ایک دریا کو پار کرنا پڑا صحابہ کرامؓ سطح آب پر قدم رکھ کر پار ہوگئے اور ان کے پاؤں بھی تر نہ ہوئے۔ نیز حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ کہیں جارہے تھے کہ راستے میں ایک شیر بیٹھا تھا جس کے خوف سے لوگ آگے نہیں جارہے تھے۔ آپ نے شیر کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اے کتے اگر تو خدا کے حکم سے یہاں بیٹھا ہے تو بیٹھا رہ ورنہ دور ہوجا۔ یہ سن کر شیر اٹھا اور عاجزی سے سر جھکاتا ہوا چلا گیا۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے ایک بزرگ کو اوپر ہوا میں بیٹھا ہوا دیکھا تو پوچھا کہ آپ نے یہ مرتبہ کیسے پایا۔ انہوں نے کہا بہت آسانی سے۔ وہ اس طرح کہ میں نے دنیا سے روگردانی کی اور احکام خداوندی بجا لایا تو مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا چاہتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ

میرا مقام ہوا میں کردیا جائے تاکہ میرا دل اس دنیا سے نہ لگے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملنے کی خاطر ایک شخص آیا۔ جب اسے بتایا گیا کہ آپ فلاں جگہ پر ہیں تو وہ وہاں پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ زرہ سر کے نیچے رکھے ہوئے آپ سو رہے ہیں۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ اس کی وجہ سے ساری دنیا میں فتنہ برپا ہے کیوں نہ یہاں اس کا کام تمام کردیا جائے چنانچہ اس نے تلوار نکالی تھی کہ دو شیر نمودار ہوئے اور اس شخص پر حملہ آور ہوئے۔ جب اس نے فریاد کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیدار ہوگئے۔ اس نے سارا ماجرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کیا اور مسلمان ہو گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراق کے علاقے میں بھیجا گیا تو وہاں کے لوگوں نے ان کو کچھ تحائف پیش کئے جن میں ایک ڈبیہ میں ایسی زہر قاتل تھی کہ جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس ڈبیہ کو کھولا اور زہر نکال کر بسم اللہ پڑھی اور کھالی۔ لیکن آپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر کافی لوگ مسلمان ہو گئے۔

حضرت خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں عبادان گیا۔ وہاں ویرانوں میں ایک سیاہ فام آدمی رہتا تھا۔ ایک دن میں بازار سے کچھ چیز خرید کر اس کے پاس گیا۔ اس نے کہا کہ یہ کیا ہے۔ میں نے کہا کھانے کی چیز ہے جو آپ کے لئے لایا ہوں۔ اس نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور دیوار کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ دیکھو۔ کیا دیکھتا ہوں کہ در و دیوار سب زر خالص ہے۔ یہ دیکھ کر میں بہت شرمندہ ہوا اور ہیبت کے مارے سب کچھ وہاں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے ایک چرواہے سے پانی مانگا اس نے کہا میرے پاس دودھ بھی ہے اور پانی بھی کیا چاہئے۔ میں نے کہا مجھے پانی چاہئے۔ وہ اٹھا اور اپنی لاٹھی پتھر پر ماری جس سے سفید اور میٹھا پانی بہنے لگا۔ جب میں نے تعجب کا اظہار کیا تو اس نے کہا تعجب کی کیا بات ہے جب انسان حق تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار ہو جاتا ہے تو سارا جہاں اس کا مطیع و فرمانبردار ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابودردا اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہما اکٹھے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور طعام میں سے تسبیح کی آواز سن رہے تھے۔

شرح سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے :۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

ترجمہ حضرت ابوسعید خراز رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک زمانے میں میں ہر تیسرے دن کھانا کھاتا تھا۔ ایک دفعہ صحرا میں سفر کر رہا تھا کہ کھانے کو کچھ نہ ملا اور بھوک سے بیتاب ہو گیا۔ چنانچہ میں نڈھال ہو کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ غیب سے آواز آئی کہ اے ابوسعید نفس کی خواہش کے لئے طعام طلب کرتے ہو یا طاقت طلب کرتے ہو بغیر طعام۔ عرض کیا کہ یا الٰہی مجھے طاقت درکار ہے۔ چنانچہ میرے اندر ایسی طاقت پیدا ہوئی کہ بارہ منزل مزید بغیر طعام سفر کر لیا۔

یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ شہر تستر میں حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کا گھر موجود ہے۔ جو بیت السباع کے نام سے موسوم ہے۔ اہل

تستو کہتے ہیں کہ اس گھر میں جنگلی جانور آتے تھے اور آپ ان کو طعام کھلاتے تھے۔

حضرت ابوالقاسم مروی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضرت ابوسعید خرار رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ ہم سفر تھا۔ دریا کے کنارے پر ایک نوجوان کو دیکھا جو گدڑی پوش تھا۔ لیکن کتابوں کا بستہ بھی بغل میں لٹکا ہوا تھا۔ ابوسعید نے کہا اس جوان کی پیشانی میں بندگی کے آثار نظر آتے ہیں لیکن بستہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ طالب علم ہے۔ آؤ معلوم کرتے ہیں کہ کون ہے۔ ابوسعید نے کہا اے نوجوان خدا تعالٰی کا راستہ کونسا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ خدا کے دو راستے ہیں۔ ایک عوام کا۔ دوسرا خواص کا۔ تجھے خواص کے راستے کا تو علم نہیں ہے لیکن عوام کا راستہ وہی ہے جو تم چل رہے ہو اور عمل کو وصول (قرب) حق کا ذریعہ سمجھتے ہو۔ اور قلم دوات کو حجاب سمجھتے ہو۔

شرح قلم دوات سے مراد علم ہے۔ انہوں نے یہ بات شاید اس لئے کہی کہ اکثر صوفیاء کرام کا قول ہے کہ العلم حجاب الاکبر (علم سب سے بڑا حجاب ہے راہ حق میں) اس لئے عمل پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس بزرگ کا مطلب یہ تھا قرب حق عمل پر مبنی نہیں بلکہ فضل ربی پر ہے۔ بعض ایسے اولیاء کرام بھی ہوئے ہیں جو ناخواندہ تھے لیکن قرب و معرفت میں یگانہ روزگار تھے۔ مثل حضرت ابوالحسن خارقانی رحمتہ اللہ علیہ ' حضرت عبدالعزیز دباغؒ و دیگر۔ نیز علماء دیوبند کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ بھی اپنے مریدوں کی نسبت بہت کم تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن علمائے دہر ان کے خادم تھے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی امی اور ناخواندہ تھے لیکن سارے جہاں کے استاد ہیں۔ حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے خوب کہا ہے ؎

یتیمے کہ نا کردہ ابجد درست
کتب خانہ ء چند ملت بشست

خواجہ حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

نگار من کہ بمکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ نکتہ آموز صد معلم شد

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں ۔

امی و دقیقہ دانِ عالم
بے سایہ و سائبانِ عالم

خلاصہ یہ کہ اعلیٰ ولایت وہبی ہے نہ کہ کسبی۔ کسب یا عمل کا وہم ہو تو مراتب میں کمی آجاتی ہے۔

ترجمہ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مصر سے جدہ کا بحری سفر کر رہا تھا اس کشتی میں ایک مرقعہ پوش جوان بھی تھا۔ جس کی صحبت کو میرا جی چاہا لیکن اس کا رعب وجلال مانع تھا۔ سفر کے دوران ایک شخص کا دیناروں سے بھرا تھیلا گم ہو گیا اور سب کا گمان یہ تھا کہ اس نوجوان نے چوری کیا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے لیکن میں نے اس سے نرمی سے کہا کہ لوگ آپ پر سختی کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے ان کو منع کیا۔ اور بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے آسمان کی طرف منہ کرکے کچھ کہا جس کا اثر یہ ہوا کہ سمندر کی مچھلیاں منہ میں ایک ایک موتی لے کر سطح پر آگئیں۔ اس نے ایک موتی لے کر اس شخص کو دیا جسکا تھیلا گم ہوا تھا اور خود پانی پر قدم رکھ کر غیب ہو گیا۔ یہ دیکھ کر جس شخص نے تھیلا چرایا تھا اس نے تھیلا نکال کر مالک کے

حوالہ کر دیا اور کشتی کے سب لوگ شرمسار ہو کر رہ گئے۔

حضرت ابراہیم رقی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ابتدائے حال میں حضرت مسلم مغربی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے روانہ ہوا۔ جب ان کی مسجد میں داخل ہوا تو آپ نماز پڑھا رہے تھے۔ لیکن الحمد غلط پڑھ رہے تھے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ میں نے مفت میں سفر کیا ہے میں ایک رات وہاں ٹھہرا۔ دوسرے دن طہارت کے لئے دریائے فرات پر گیا۔ راستے میں ایک شیر کو بیٹھا دیکھ کر واپس آیا۔ لیکن راستے میں ایک اور شیر نے میرا پیچھا کیا جس سے میں خوف زدہ ہوا اور شور مچایا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مسلم رحمتہ اللہ علیہ خلوت خانہ سے باہر تشریف لائے اور شیروں نے ان کو دیکھ کر دم ہلانا شروع کیا۔ آپ نے ہر ایک شیر کو کان سے پکڑ کر فرمایا کہ۔ اے خدا کے کتو کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ ہمارے مہمانوں کو نہ چھیڑنا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ اے ابواسحاق تم مخلوق کے خوف سے ظاہر کو درست کرنے میں مشغول ہوئے۔ اور مخلوق سے ڈرنے لگے اور ہم خدا کے خوف سے باطن کو درست کرنے میں مشغول ہوئے اس لئے مخلوق ہم سے خوف کھاتی ہے۔

ایک دفعہ میرے شیخ علیہ رحمہ نے بیت الجن سے دمشق کا سفر اختیار فرمایا میں ان کے ساتھ تھا۔ چونکہ راستے میں بارش ہو رہی تھی ہم کیچڑ میں مشکل سے چل رہے تھے۔ لیکن جب میں نے حضرت شیخ کے قدموں کی طرف نگاہ کی تو دیکھا آپ کے قدم اور جوتا بالکل صاف ہیں۔ جب میں نے آپ سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ جب میں نے توکل اختیار کر کے تو ہمت کو دل سے نکالا ہے اور دل کو حرص سے پاک کیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے میرے قدموں کو کیچڑ سے پاک رکھا ہے۔

ایک دفعہ مجھے (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی رحمتہ اللہ علیہ کو) ایک

مشکل پیش آئی تو حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کا قصد کیا۔ جب میں ان کی خدمت میں پہنچا تو آپ مسجد میں بیٹھے ایک ستون کے ساتھ اسی مشکل کا حل بیان فرما رہے تھے۔ چنانچہ مجھے سوال کئے بغیر مشکل کا حل معلوم ہو گیا۔ تاہم میں نے عرض کیا کہ اے شیخ آپ ستون کے ساتھ یہ بات کیوں کہہ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹا حق تعالیٰ کے حکم سے اس ستون نے وہی سوال کیا جس کا جواب میں نے دیا ہے۔

ملک فرغانہ میں ایک گاؤں ہے جس کا نام سلاتک ہے۔ اس گاؤں میں ایک بزرگ رہتے تھے جن کا شمار اوتاد میں ہوتا تھا۔ ان کا نام باب عمر تھا۔ وجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں بزرگوں کو باب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ میں ان کی زیارت کے لئے گیا تو فرمایا۔ کیسے آئے ہو۔ میں نے کہا اس لئے کہ آپ کی زیارت کروں اور آپ مجھ پر شفقت فرمائیں۔ انہوں نے فرمایا اے بیٹا میں ایک دن سے تم کو دیکھ رہا ہوں اور جب تک کوئی تجھے غیب نہ کر لے دیکھتا رہوں گا۔ اور جب میں نے دنوں کا شمار کیا وہی دن نکلا جب میں نے توبہ کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی خادمہ فاطمہ سے کہا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اس درویش کے لئے لے آؤ۔ چنانچہ وہ تازہ انگوروں کا طباق لے آئیں جس پر کچھ تازہ کھجور بھی تھی۔ حالانکہ نہ انگور کا موسم تھا نہ کھجور اس علاقے میں پائی جاتی تھی۔

ایک دفعہ میں حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر جو شہر منہ میں واقع ہے' حاضر تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید کبوتر قبر کے غلاف کے اندر غیب ہو گیا ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید یہ کبوتر کسی کے ہاتھ سے چھوٹ کر آیا ہے۔ لیکن جب غلاف اٹھا کر دیکھا تو نیچے کچھ بھی نہ تھا۔ دوسرے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ اور حیران رہ گیا۔ اس رات میں نے حضرت شیخ کو

خواب میں دیکھا تو یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کبوتر میرے حال کی صفائی ہے جو روزانہ میری ہم نشینی کے لئے آتی ہے۔

فصل

اولیاء پر انبیاء کی فضیلت

یاد رہے کہ ہر حال و مقام کے مشائخ طریقت کا اسبات پر اتفاق ہے کہ اولیاء کرام انبیاء علیہم السلام کے تابع فرمان ہوتے ہیں۔ اور ان کی دعوت کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام اولیاء کرام سے افضل ہیں۔ اس وجہ سے کہ ولایت کی انتہا نبوت کی ابتدا ہوتی ہے۔ تمام انبیاء ولی ہوتے ہیں لیکن کوئی ولی نبی نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ صفات بشری کی نفی پر قادر ہوتے ہیں لیکن اولیاء کو یہ چیز کبھی کبھی نصیب ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر جو چیز اولیاء کے لئے حال کہلاتی ہے وہ انبیاء کا مقام ہوتا ہے۔

شرح حال اور مقام کی اس کتاب میں کئی بار وضاحت ہو چکی ہے کہ حال عارضی چیز ہے کبھی آتا ہے کبھی جاتا ہے لیکن مقام دائمی طور پر قائم رہتا ہے۔

ترجمہ اور اولیاء کو جو چیز یا مقام حاصل ہے وہ انبیاء کے لئے حجاب (پردہ) ہے۔

شرح قرب کے جس قدر مراتب طے ہوتے ہیں حجابات دور ہوتے جاتے ہیں۔ اب چونکہ انبیاء علیہم السلام کا درجہ قرب اولیاء سے زیادہ بلند ہوتا ہے انبیاء کے نزدیک یہ قرب دوری کہلائے گا۔ جس کو دوسرے الفاظ میں حجاب کہا

گیا ہے۔

ترجمہ اور علمائے اہلسنت و الجماعت اور مشائخ طریقت میں سے کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہے سوائے فرقہ حشویہ کے جو خراسان میں پائے جاتے ہیں اور اہل تجسیم کے نام سے موسوم ہیں۔ وہ حقیقت توحید سے ناواقف ہیں اور نہ ہی طریقت کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو ولی کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ولی ہیں لیکن وہ شیطان کے ولی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اولیاء افضل ہیں انبیاء سے۔ اور یہ بہت بڑی گمراہی ہے کہ وہ ایک جاہل شخص کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے افضل سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک گروہ اور بھی ہے جو مشبہین کے نام سے مشہور ہے۔ وہ لوگ اپنے آپ کو اہل طریقت بھی سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ حلول ونزول اور ذات حق کے تجزیہ اور تقسیم کے بھی قائل ہیں ان کا ذکر آگے آرہا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

شرح فرقہ حشویہ کو انگریزی زبان میں Anthropomorphist کہا جاتا ہے جو خدا تعالیٰ کو انسانی جسم کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔

۲۔ تجسیم کا بھی یہی مطلب ہے کہ حق تعالیٰ کا ایک جسم ہے اور وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہے۔

۳۔ فرقہ مشبہ بھی حق تعالیٰ کے جسم کا قائل ہے۔

۴۔ حلول سے وہ لوگ یہ مراد لیتے ہیں کہ حق تعالیٰ کسی انسان میں اتر آتا ہے اس انسان کو وہ لوگ اوتار کہتے ہیں اور پھر اس کی پرستش جائز سمجھتے ہیں جیسے ہندو رام اور کرشن کو، عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا سمجھ کر اس کی پرستش کرتے ہیں اسلامی عقیدۂ توحید میں یہ تمام امور کفر اور شرک ہیں۔

۵- نظریہ تجزیہ و تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ایک جسم ہے جس کے کئی جزو اور اعضاء ہیں یہ کفر ہے۔

ترجمہ غرضیکہ یہ دونوں گروہ جو مسلمان ہونے کا دعوہ کرتے ہیں دراصل یہ لوگ انبیاء علیہم السلام کی عدم فضیلت کے بارے میں برہمنوں کے ہم عقیدہ ہیں حالانکہ انبیاء کی فضیلت کی نفی کرنا کفر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام خلقت کو حق تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے ہیں اور اولیاء و ائمہ ان کے تابع ہیں اس لئے یہ بات غلط ہے کہ مقتدی امام سے افضل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تمام اولیاء کے احوال و اقوال کو یکجا کیا جائے اور ایک نبیؑ کے مراتب سے اس کا توازن کیا جائے تو نبی کے مرتبہ کے سامنے ہیچ ہوں گے۔ بالفاظ دیگر اولیاء منزل مقصود کے طالب ہوتے ہیں۔ اور انبیاء منزل مقصود پر پہنچے ہوتے ہیں۔ وہ خلق خدا کو حق تعالیٰ کی طرف بلانے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ بے دین لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح ایک بادشاہ کا قاصد اس شخص سے افضل نہیں ہوتا۔ جس کے پاس پیغام بھیجا جاتا ہے۔ یا جس طرح جبرائیلؑ جو انبیاء کے لئے پیغام لایا کرتے تھے انبیاء سے افضل نہیں ہوسکتے اسی طرح انبیاء جو مخلوق کے پاس بھیجے جاتے ہیں مخلوق سے افضل نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ایک رسول کسی قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے تو وہ لازماً اس قوم کے افراد سے افضل ہوتا ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں سے افضل ہوتے ہیں اور کوئی عقل مند اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ پس ایک پیغمبر تمام اولیاء سے افضل ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جب عرفان کی وجہ سے منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں تو اپنے مشاہدہ کے مطابق بات کرتے ہیں اور حجابات بشریت سے نکل جاتے ہیں خواہ وہ بشر ہوتے ہیں۔ رسول کا پہلا قدم مشاہدہ ہے اور چونکہ رسول کی ابتداء ولی کی انتہا ہوتی ہے لہذا ولی کو نبی پر قیاس نہیں کرنا

چاہئے۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمام اولیاء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ کثرت کا وحدت میں گم ہو جانا اور ذات حق کے ساتھ ایک ہو جانا ولایت کا کمال ہے یعنی کثرت مجاہدات و ریاضات سے بندہ اس مقام پر ترقی کر جاتا ہے جہاں غلبہ محبت سے مغلوب ہو کر ساری کائنات کو حق تعالیٰ کا عین دیکھتا ہے۔

شرح یہاں پھر حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے وحدت الوجود کی تصدیق فرمائی ہے۔ **کائنات کو حق تعالیٰ کا عین سمجھنا اور دیکھنا وحدت الوجود ہے۔**

ترجمہ جیسا کہ حضرت علی رودباری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر ہم کو دیدار حق نصیب نہ ہو تو اس کی عبادت ترک کر دیں۔ یعنی بندگی ساقط ہو جائے کیونکہ ہمارے لئے عبادت بغیر رویت نہیں ہے۔

شرح یہاں بھی حضرت شیخ نے رویت یعنی دیدار الٰہی ثابت کیا ہے یعنی باطنی آنکھوں کے ساتھ۔

ترجمہ لیکن یہ مقامات انبیاء علیہم السلام کے لئے ابتدائی مقامات ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کے لئے تفرقہ متصور نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ نفی اثبات سلوک' قطع سلوک' توجہ' عدم توجہ' ابتداء و انتہا سے گزرتے ہیں بلکہ ابتداء ہی سے مقام جمع (فنا) پر قائم و دائم ہوتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ابتداء ہی میں آفتاب اور چاند ستارے میں ذات حق دیکھ کر پکار اٹھے کہ یہ میرا رب ہے کیونکہ مقام جمع پر ثابت قدم ہونے کی وجہ سے وہ غیر حق کو نہیں دیکھتے تھے۔

شرح یہاں بھی رویت باری تعالیٰ اور وحدت الوجود کا اثبات ہوتا ہے۔

ترجمہ یہ بھی مقام جمع کی خاصیت تھی کہ عین دیدار کے وقت اپنی ذات سے

بھی تبرا کیا اور فرمایا کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ " میں زوال پذیر کو دوست نہیں رکھتا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ابتداء بھی مقام جمع پر تھی اور انتہا بھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ ولایت کیلئے ابتداء و انتہا ہے لیکن نبوت کیلئے نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام جب تک رہے نبی رہے۔ جب تک رہیں گے نبی رہیں گے اور پیدا ہونے سے پہلے علم الٰہی میں بھی وہ نبی تھے۔ جب حضرت ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ انبیاء کی حقیقت کیا ہے تو فرمایا "انبیاء علیہم السلام کے متعلق کچھ کہنا ہماری بساط سے باہر ہے اس وجہ سے کہ ان کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ان کے متعلق ہم جو کچھ سوچتے ہیں وہ ہماری قیاس آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کو ایسا بلند مقام عطا فرمایا ہے کہ انسان کی عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ جس طرح اولیاء کا درجہ عوام کے عقل سے بالاتر ہے اسی طرح انبیاء کا درجہ اولیاء کی عقل سے بالاتر ہے"۔

حضرت ابو یزید رحمتہ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ :

" ابتدا میں جب میں نے وحدانیت کی طرف سیر کی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے باطن کو آسمان کی طرف لے گئے ہیں لیکن اس نے راستے میں کسی چیز کی طرف توجہ نہ کی بہشت اور دوزخ دکھائے گئے لیکن اس کی طرف بھی توجہ نہ ہوئی حتیٰ کہ میں تنزیہہ و تقدیس کے میدانوں سے گزرتا ہوا کائنات کے حجابات سے بلند ہوا تو اپنے آپ کو ایک پرندہ کی صورت میں پایا جس کا جسم احدیت سے بنا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ میں ازلیت کے مقام پر جا پہنچا اور احدیت کے درخت پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ میں ہوں۔ چنانچہ بارگاہ خداوندی میں عرض کیا کہ یاالٰہی اپنی خودی کی وجہ میری تجھ تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اور میں اپنی خودی سے آگے نہیں نکل سکتا اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ فرمان ہوا کہ اے ابو یزید تیری نجات ہمارے دوست (رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے اتباع میں ہے اس کے

پاؤں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤ اور ان کی موافقت پر کمربستہ ہو جاؤ۔"

یہ قصہ بہت طویل ہے اہل طریقت اس کو حضرت ابویزید رحمتہ اللہ علیہ کا معراج کہتے ہیں معراج سے مراد قرب ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کا معراج جسم کے ساتھ ہوتا ہے اور اولیاء کا معراج روحانی طور پر ہوتا ہے اور انبیاء کا جسم اولیاء کی روح کی طرح ہوتا ہے اور یہ فضیلت ظاہر ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ولی کو مغلوب الحال کر کے قرب حق میں لے جایا جاتا ہے اور نبی کے جسم کو قرب میں لے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان کتنا فرق ہے۔ واللہ اعلم۔

شرح جب انبیاء علیہم السلام کا جسم روح کی طرح ہو جاتا ہے تو جسم کا سایہ بھی نہیں رہتا یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سایہ نہیں تھا۔ سایہ اجسام کا ہوتا ہے نور کا سایہ نہیں ہوتا۔

فصل

انبیاء اور اولیاء کی ملائک پر فضیلت

یاد رہے کہ علماء اہلسنت والجماعت اور مشائخ طریقت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام جو معصوم ہوتے ہیں اور اولیاء کرام جو محفوظ ہوتے ہیں دونوں فرشتوں سے افضل ہیں لیکن فرقہ معتزلہ کے لوگ فرشتوں کو انبیاء علیہم السلام سے افضل سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ چونکہ فرشتے پیدائشی طور پر انسان سے زیادہ لطیف اور حق تعالیٰ کے زیادہ مطیع و فرمانبردار ہیں اس لئے انبیاء سے افضل ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ فضیلت کا انحصار پیدائش اور فرمانبرداری پر نہیں ہے فضیلت اس کو حاصل ہے جس کو اللہ تعالیٰ افضل قرار

دے۔ ملائک کے جتنے فضائل معتزلہ لوگ بیان کرتے ہیں وہ تو شیطان کو بھی حاصل تھے۔ لیکن سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شیطان ملعون ہے۔ لہٰذا افضل وہ ہے جس کو حق تعالیٰ افضل قرار دے۔ انبیاء علیہم السلام کی فضیلت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ملائک کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ جس کو سجدہ کیا جاتا ہے وہ سجدہ کرنے والے سے افضل ہوتا ہے اگر وہ لوگ یہ کہیں کہ سجدہ تو کعبہ کو بھی کیا جاتا ہے تو کیا پتھر انسان سے افضل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کعبہ یا پتھر کو کوئی شخص سجدہ نہیں کرتا بلکہ ہر شخص خدا کو سجدہ کرتا ہے لیکن ملائک نے تو انسان کو سجدہ کیا۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں اور جہاں مومنین کے سجدہ کا تعلق ہے تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ خدا کو سجدہ کرو اور نیک کام کرو لہٰذا خانہ کعبہ کی مثال غلط ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب مسافر جانور کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے نماز ادا کرتا ہے تو خواہ اس کا رخ کعبہ کی طرف نہ ہو اس کا سجدہ خدا کیلئے ہوتا ہے اسی طرح جب جنگل میں کعبہ کی سمت معلوم نہ ہو تو جس طرف رخ کرے گا نماز درست ہو گی اس سے ظاہر ہے کہ مسلمان کا سجدہ خانہ کعبہ کیلئے نہیں ہوتا بلکہ اس کا مسجود درحقیقت حق تعالیٰ ہوتا ہے اور جب ملائک کو آدم علیہ السلام کیلئے سجدہ کا حکم ہوا تو انہوں نے کوئی عذر نہ کیا۔ جس نے عذر کیا وہ ملعون ٹھہرا۔ یہ دلائل کم سے کم عقل رکھنے والے کیلئے بھی کافی ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ملائک انبیاء علیہم السلام سے کیسے افضل ہو سکتے ہیں جب کہ ان کی فطرت میں شہوت ہے ہی نہیں۔ نہ ان کے دل میں دنیا کی لالچ اور طلب ہے ان کی غذا عبادت ہے اور وہ ہر وقت حق تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں۔ اس کے برعکس انسان کی فطرت میں شہوت ہے جو گناہوں پر اس کو مجبور

کرتی ہے نیز دنیا کی زینت بھی انسان کو فریفتہ کرنے کیلئے کافی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شیطان انسان کے رگ و ریشہ میں خون کی مانند چلتا ہے اور نفس امارہ جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے شیطان کا ہم نشین ہے۔ لہذا وہ شخص جس کا وجود ان تمام خطرات سے دوچار ہو اور شہوت کے غلبہ کے باوجود برے کاموں سے پرہیز کرے اور حرص و ہوا جو اس کی فطرت میں ہے' کے باوجود دنیا سے دل نہ لگائے اور شیطانی وساوس کے باوجود گناہوں سے اجتناب کرے اور خواہشات نفس کو دبا کر عبادت پر قائم ہو جائے' خدا کی بندگی کو اپنا شعار بنا لے' نفس سے جہاد کرے اور شیطان کے ساتھ جنگ میں مشغول رہے' ایسا شخص یقیناً ملائکہ سے افضل ہے جن کی فطرت میں نہ شہوت کا غلبہ ہے' نہ کھانے پینے کی خواہش ہے' نہ دنیا کی لذت جن کو لبھا سکتی ہے' نہ جن کو بیوی بچوں اور دیگر رشتہ داروں کی فکر ہے نہ دنیا کی لالچ میں مبتلا ہیں۔ مجھے اپنی جان کی قسم ہے کہ میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو دنیاوی مال و دولت کو باعث عزوجاہ سمجھتا ہے ایسا شخص جلدی اپنا زوال دیکھے گا کیونکہ اس کے نزدیک عزت حق تعالیٰ کی اطاعت و بندگی میں نہیں بلکہ ناپائیدار مال اور دنیا کی زیب و زینت میں ہے۔ وہ جبرائیل جو ہزاروں سال خلعت کی امید میں عبادت کرتا رہا آخر کار اس کی خلعت یہ ہوئی کہ شب معراج محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حاشیہ برداری اس کو نصیب ہوئی اور براق لا کر نبی علیہ الصلواۃ والسلام کیلئے سواری مہیا کرنے کو اپنا فخر اور خوش قسمتی سمجھا' وہ ایک نبی سے کس طرح افضل ہو سکتا ہے ؟ جو دنیا میں اپنے نفس کو ریاضت کی بھٹی میں ڈالے۔ دن رات مجاہدات میں بسر کرے اور حق تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ملائکہ کے اندر بھی شیخی پیدا ہوئی اور اپنے اعمال کی صفائی کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کے خلاف زبان درازی کے مرتکب ہوئے لیکن حق تعالیٰ نے چاہا کہ ان کی حقیقت ان پر ظاہر

کرے تو ان میں سے تین فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین پر جا کر خلافت الٰہیہ کے فرائض انجام دو اور خلقت کی اصلاح کرو ان میں سے ایک تو زمین کی خرابی دیکھ کر دست بردار ہو گیا اور جو دو فرشتے زمین پر آئے حق تعالیٰ نے ان کی فطرت کو تبدیل کر دیا اور انسانوں کی طرح ان کے اندر کھانے پینے اور شہوت رانی کے جذبات پیدا کر دیئے جب وہ دنیا میں اترے تو شہوت میں مبتلا ہو گئے اور نفسانی خواہشات پورا کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے ان کو سزا دی۔ اس سے ملائک نے اپنی آنکھوں سے انسان کی فضیلت کا مشاہدہ کر لیا۔ خلاصہ یہ کہ تمام علماء اور مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ مومنوں میں سے خاص مومن' خاص فرشتوں سے افضل ہیں اور عام مومن' عام فرشتوں سے افضل ہیں۔ چنانچہ انسانوں میں وہ انسان جو گناہوں سے پاک اور معصوم رہے یعنی اولیاء اور انبیاء وہ جبرائیل اور میکائیل سے افضل ہیں اور عام مومن جو گناہوں سے محفوظ و معصوم نہیں ہیں وہ عام فرشتوں یعنی کراما" کاتبین اور ان جیسے دیگر فرشتوں سے افضل ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس مضمون پر مشائخ نے بہت کچھ کہا ہے یہ تھے سلسلہ حکیمیہ کے خیالات جو مختصر طور پر بیان کئے گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ولایت اسرار الٰہی میں سے ایک راز ہے جو سوائے مجاہدات اور ریاضات کے ظاہر نہیں ہوتا اور ولی کو ولی کے سوا کوئی نہیں پہچان سکتا اور ولایت کا تمام عقلمندوں پر ظاہر کرنا جائز ہوتا تو پھر ولی اور غیر ولی میں کوئی فرق نہ ہوتا اور واصل اور غافل برابر ہوتے پس خداوند عالم کی مشیت یہ ہوئی کہ خلقت کو رسوائی سے بچانے کیلئے ولایت کے موتی کو صدف میں رکھ کر سمندر کی گہرائیوں میں ڈال دیا تاکہ اس کا طالب اپنی عزیز جان کو جوکھوں میں ڈال کر اس مہلک سمندر میں غوطے لگائے اور مرادیں حاصل کرے۔

فصل

سلسلہ خرازیہ

خرازیہ سلسلہ کے لوگ حضرت ابراہیم خرازؒ سے منسوب ہیں اس سلسلہ کی تصانیف بہت مشہور ہیں۔ اور تجرید و تفرید پر انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں تک کہ فنا اور بقا کی اصطلاحات بھی سب سے پہلے انہوں نے تحریر کی ہیں۔ اور اپنی طریقت کو ان دو الفاظ پر مشتمل سمجھا ہے۔ اب ہم ان دونوں اصطلاحات کی حقیقت بیان کریں گے۔ اور ان کی غلطیوں کو ظاہر کریں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کا مذہب (مسلک) کیا ہے۔ اور ان دو اصطلاحات کا مطلب کیا ہے۔

فصل

فنا اور بقا کی حقیقت

حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے کہ : مَا عِنْدَكُمْ ....

"جو کچھ تمہارے پاس ہے فنا ہو جائے گا۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے اس کو بقا ہے۔"

نیز فرمایا : كُلُّ مَنْ ...

"جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے اور صرف تیرے پروردگار کی ذات پاک باقی رہ جائے گی۔"

یاد رہے کہ لفظ فنا اور بقا کے لغوی معنی اور ہیں اور اہل طریقت کے

نزدیک اصطلاحی معانی اور ہیں اور علمائے ظاہر سلسلہ خرازیہ کی عبارات میں سے کسی عبارت سے اتنے حیران نہیں جتنے کہ لفظ فنا اور بقا سے متحیر ہیں۔

اب لفظ بقا کے علمی اور لغوی لحاظ سے مطالب بیان کئے جائیں گے۔ ایک وہ چیز ہے کہ جس کی نہ ابتداء ہو نہ انتہا۔ جیسے کہ یہ جہان جو نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ رہے گا۔ اور صرف زمانہ حال میں موجود ہے۔ دوم وہ چیز جس کا وجود شروع میں نہ تھا لیکن ہمیشہ رہے گا۔ جیسے بہشت دوزخ اور آخرت۔ سوم وہ ہستی جو ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ ذات حق تعالیٰ اور اس کی صفات ہیں جو ازل سے ابد تک قائم و دائم ہیں۔ ذات حق کی بقا سے مراد اس کا وجود ہے جو ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

پس فنا کا علم یہ ہے کہ تجھے معلوم ہو جائے کہ دنیا فانی ہے اور بقا کا علم یہ ہے کہ عقبیٰ باقی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ : وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى

"عالم عقبیٰ بہتر اور باقی رہنے والا ہے"

اس آیت میں لفظ اَبْقٰى مبالغہ کا صیغہ ہے جو اس کی اہمیت جتانے کے لئے ہے۔ اس وجہ سے کہ عالم آخرت کو فنا نہیں ہے۔ عام طور پر فنا اور بقا کی تعریف یہ ہے کہ فنا سے مراد جہل کا فنا ہونا اور علم کا باقی رہنا ہے۔ اور نافرمانی کا فنا ہونا اور اطاعت کا باقی رہنا۔ یعنی جب انسان بندۂ حق بن جاتا ہے تو غفلت کو فنا کر کے ذکر اللہ یعنی یاد خدا کو باقی رکھتا ہے۔ یعنی بری صفات کو فنا کر کے نیک خصائل پر قائم ہو جاتا ہے۔

لیکن مشائخِ طریقت کی فنا و بقا سے مراد یہ نہیں جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک فنا اور بقا کا تعلق علم اور جہل سے نہیں۔ بلکہ اس سے اولیائے کرام کے کمالات اور بلند روحانی مقامات مراد ہیں۔ یعنی ان حضرات کے کمالات جو

مجاہدات کی تکلیف سے آزاد اور تغیر احوال سے بالاتر ہو جاتے ہیں' جو مطلب سے گزر کر مطلوب تک پہنچ جاتے ہیں' جو تمام قابل دید چیزوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور قابل شنید چیزوں کو سن چکے ہیں۔ اور سب قابل فہم چیزوں کا فہم کر چکے ہیں۔ اور قابل حصول اسرار کو حاصل کر چکے ہیں۔ اور اس کوچہ کی عام آفات سے آگاہ ہو کر ان سے پیچھا چھڑا چکے ہیں' جو تمام مرادات پا چکے ہیں اور مزید تلاش سے مستغنی ہو چکے ہیں۔ جن کے کرامات حجابات بن جاتے ہیں۔ جن کے مقامات مشاہدہ بن چکے ہیں' جن کی تکوین تمکین بن چکی ہے۔ جن کی مراد نامرادی بن چکی ہے۔ جن کا کھانا پینا ساقط ہو چکا ہے جو تمام مالوفات و مطلوبات سے نکل کر حق کے ساتھ پیوستہ ہو چکے ہیں۔ بمصداق بیت ۔

" میری خواہش کے مٹ جانے سے میری فنا فنا ہو گئی۔ اور تیری محبت کے سوا دل میں کوئی خواہش نہیں رہی ۔ "

لہذا جب سالک اپنی ہستی سے فانی ہو جاتا ہے بقاباللہ میں مکمل ہو جاتا ہے تو اس وقت قرب و بعد' وحشت وانس' صحو و سکر (ہوشیاری و مستی) ہجر و وصال' طمس و اصطلام (امید و بیم)' نام و نشان' اطراف و جوانب اس کے لیے یکساں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام کے متعلق ایک شیخ فرماتے ہیں :

" میرا مقام و نشان فنا ہو چکے ہیں اب نہ مجھے قرب کا شعور ہے نہ بُعد کا پس اپنی ذات سے فانی ہو کر ذاتِ حق کے ساتھ باقی ہو چکا ہوں۔ اب طلب گم اور مطلوب حاصل ہے۔"

شرح یہ جو حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے اوپر فرمایا ہے کہ مجاہدات کی تکلیف سے آزاد ہو جاتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ عبادات ترک کر دیتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان پر مجاہدات آسان ہو جاتے ہیں' نیز فرائض'

واجبات اور سنن مؤکدہ کے پابند تو ہوتے ہیں لیکن نوافل یعنی زائد نفلی نماز' نفلی روزے اور دیگر اختیاری اور غیر مؤکدہ عبادات نہیں کرتے اس وجہ سے کہ ذات حق میں ہمہ وقت شاغل رہتے ہیں سوائے ادائیگی فرائض اور واجبات۔

یہ بھی اوپر فرمایا ہے کہ تغیر احوال سے بالاتر ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے تلوین سے گزر کر تمکین پر متمکن ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر سکر اور مغلوبیت سے نکل کر غالب الحال ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ طلب سے گزر کر مطلوب تک پہنچ جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے واصل باللہ ہو کر قلب مطمئنہ پا لیتے ہیں۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ تلاش سے مستغنی ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کو پا لیا تو تلاش ختم ہو گئی۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ جن کے کرامات حجابات بن جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کشف و کرامات نچلے درجے کی چیزیں ہیں جو ابتدا ہی میں حاصل ہو جاتی ہیں لیکن جب اولیائے کرام انتہائی مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو سوائے شغل ذات کے کسی چیز میں مشغول نہیں ہوتے۔ بلکہ جب کشف کرتے ہیں تو اس سے الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور مراتب کم ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر میں جوش جوانی میں کشف و کرامات سے پرہیز کرتا تو میرے مراتب زیادہ بلند ہوتے۔

یہ بھی فرمایا ہے کہ جن کے مقامات مشاہدہ بن چکے ہیں یعنی وہ مقام مشاہدۂ حق تک پہنچ چکے ہیں۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ جن کی مراد نامرادی بن چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے خاصان خدا اپنی مرضی اور خواہشات کو ترک کر کے ذات حق کی رضا قبول کر لیتے ہیں اور کسی قسم کی فرمائش یا آرزو نہیں کرتے۔ نامرادی کا مطلب ہے دل میں کوئی مراد اور خواہش نہ رکھنا۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ جن کا کھانا پینا ساقط ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کھانا پینا بالکل بند ہو جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بہت ہی کم ہو جاتا ہے کیونکہ جس قدر اوصاف

بشری کم ہوتے جاتے ہیں۔ نفسانی خواہشات اور کھانے پینے کی رغبت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت ابراھیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ رمضان کا چاند دیکھ کر روزہ رکھ لیتے تھے اور شوال کا چاند دیکھ کر افطار کرتے تھے۔ اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ پندرہ دن کے بعد کھاتے تھے۔ حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ حقیقی بھوک چالیس دن کے بعد لگتی ہے۔

ترجمہ غرضیکہ کسی چیز سے فنا ہونا اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خرابی سے آگاہ نہیں ہوتا اور اس کی خواہش ترک نہیں ہوتی۔ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ کسی چیز سے فنا ہونا اس چیز سے حجاب نہ ہوئے بغیر درست ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ مثلاً یہ غلط ہے کہ کوئی شخص کسی کو دوست رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس سے باقی ہوں یا کسی چیز کو ناپسند کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں اس سے فانی ہوں کیونکہ یہ دونوں حالتیں یعنی محبت اور دشمنی طالب کی موجودگی کی ہیں۔ لیکن مقام فنا میں نہ طالب ہے نہ محبت ہے نہ عداوت۔ اور نہ ہی مقام بقا پر جمع و تفرقہ ہے۔ بعض لوگوں کو یہ غلطی لگی ہے کہ کسی شخص کی فنا کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ہستی نیست و نابود ہو جائے اور بقا یہ ہے حق تعالیٰ کی بقا بندہ پر حاوی ہو جائے۔ یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں اور ہندوستان میں میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو عالم و فاضل ہونے کا دعویدار تھا۔ ایک دن جب اس کے ساتھ مناظرہ ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ نہ وہ مقام فنا کو پہنچا تھا نہ بقا تک۔ اور نہ قدیم اور حادث میں فرق جانتا تھا۔ چنانچہ اس قسم کے بہت سے جاہل ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مکمل فنا ممکن ہے۔ یہ گمراہی ہے کیونکہ مادی اشیاء کا گم ہونا ممکن نہیں۔ ایسے جاہلوں سے جب ہم وضاحت طلب کرتے ہیں وہ اگر یہ کہیں کہ فنا کے وقت سالک کا وجود فنا (ختم) ہو جاتا ہے۔ تو یہ محال (ناممکن) ہے اگر وہ یہ کہیں کہ اس

کی صفات فنا ہو جاتی ہیں تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ ایک صفت کے فانی ہونے سے دوسری صفت میں باقی ہونا ممکن ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ انسان کسی اور کی صفات سے باقی ہو سکے۔ مثلاً روم کے **نسطوریوں** بلکہ عام عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے حضرت مریم رضی اللہ عنہا تمام جسمانی (بشری) صفات سے فانی ہو کر بقائے لاہوتی سے پیوست ہو گئی تھیں۔ جس سے ان کو بقا حاصل ہوئی۔ اور باقی باللہ ہو گئیں۔ اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی کا نتیجہ تھے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ترکیب کا اصل مادۂ انسانی نہ تھا بلکہ ان کی بقا بقائے الٰہی تھی۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی اولاد اور خداوند تعالیٰ تینوں ایک ہی بقا کے ساتھ باقی ہیں جو قدیم اور صفت الٰہی ہے۔ یہ تمام عقائد فرقہ حشویہ، مجسمہ اور مشبہہ کے مطابق ہیں جو ذاتِ حق کو حوادث کا محل قرار دیتے ہیں اور قدیم کے لئے حادث کی صفت روا رکھتے ہیں۔ میں ان سب سے کہتا ہوں کہ حادث قدیم کا اور قدیم حادث کا محل (جائے وقوع) کیسے بن سکتا ہے۔ یہ دہریہ مذہب ہے جس کی رو سے کائنات حادث نہیں رہتی بلکہ خالق اور مخلوق دونوں قدیم بن جاتے ہیں یا پھر دونوں کو حادث ماننا پڑتا ہے۔ یہ سب خرابی خالق و مخلوق کو ایک جیسا سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ غرضیکہ خالق و مخلوق کو حادث سمجھنا یا پھر دونوں کو قدیم سمجھنا کھلی گمراہی ہے۔ غرضیکہ جب دو چیزوں کو ایک دوسرے کا ہم جنس، متحد اور ایک سمجھا جائے تو دونوں کا حکم ایک جیسا ہوتا ہے۔ چنانچہ بقا ہماری صفت اور فنا بھی ہماری صفت ہے۔ یعنی ہماری فنا بقا کی طرح ہے اور ہماری بقا فنا کی طرح۔ پس فنا سے مراد ایک صفت کا فنا ہونا دوسری صفت کی بقا کی وجہ سے ہے۔ پس فنا سے مراد ایک حقیقت کا فنا ہونا ہے۔ دوسری صفت کی بقا کی وجہ سے۔ لہٰذا اگر فنا سے یہ مراد لی جائے کہ جس کا بقا سے تعلق نہیں تو یہ جائز ہے۔ اسی طرح اگر بقا سے وہ مراد لی جائے جس کا فنا سے کوئی تعلق

نہیں تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ اس فنا سے مراد ماسویٰ اللہ کی فنا ہے اور بقا سے مراد حق تعالیٰ کی بقا ہے۔ جو اپنی مراد سے فانی ہو جاتا ہے وہ حق تعالیٰ کی مراد سے باقی ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ تیری مراد فانی اور حق تعالیٰ کی مراد باقی ہے جب تو اپنی مراد سے فانی ہو جائے گا تو تیرا قیام فنا پر ہو گا۔ مثلاً جو چیز آگ میں گر جائے اس کی صفت اختیار کر لیتی ہے اور آگ بن جاتی ہے۔ پس آگ کا غلبہ اس چیز کے اندر آگ کی صفت پیدا کر سکتا ہے تو حق تعالیٰ تو آگ سے زیادہ طاقتور ہے لیکن یاد رہے کہ آگ لوہے کی صفت کو تبدیل کر سکتی ہے۔ اس کی فطرت (یعنی ذات یا وجود) کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یعنی لوہا آگ نہیں بن سکتا۔

شرح اس ساری بحث کا مطلب یہ ہے کہ وحدت الوجود کا مطلب یہ نہیں کہ حادث (بندہ) خدا بن جاتا ہے۔ خود ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ ۔

العبد عبد وان تعرّج - والرّبّ ربّ و ان تنزّل

(یعنی بندہ بندہ رہتا ہے خواہ کتنی ترقی کرے اور رب رب ہے خواہ کتنا نزول فرمائے)

اس سے ظاہر ہے نہ حادث قدیم بن سکتا ہے نہ قدیم حادث۔ وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عالم مجاز میں خالق کو قدیم اور مخلوق کو حادث (فنا ہونے والا) مانا جاتا ہے لیکن عالم حقیقت میں چونکہ مخلوق حق تعالیٰ کی صفت خلق کا ظہور ہے اور چونکہ صفت موصوف کا غیر نہیں ہوتی' مخلوق بھی ایک لحاظ سے خالق کی غیر نہیں۔ اور چونکہ عالم مجاز میں مخلوق خالق کی غیر ہے اس لئے اس لحاظ سے مخلوق خالق کا عین نہیں۔ چنانچہ مشائخ نے فرمایا ہے **صفت اللّٰہ هی لا عینه ولا غیره** (اللہ تعالیٰ کے صفات نہ اس کی عین ہیں نہ غیر) جس طرح آئینہ میں زید کا عکس نہ زید کا عین ہے نہ غیر' اور عین بھی ہے اور غیر بھی' یعنی ایک لحاظ سے عین ہے' ایک لحاظ سے غیر ہے۔ اگر عکس زید کا غیر ہوتا تو زید کے چ

جانے کے بعد آئینہ میں عکس قائم رہتا۔ اگر عین ہوتا تو عکس پر کیچڑ ڈالنے سے زید پر بھی کیچڑ پڑ جاتی۔ لہٰذا ارباب وحدت الوجود بھی یہ کہتے ہیں کہ ایک لحاظ سے یعنی مجاز کے نقطہ نگاہ سے مخلوق خالق کی غیر ہے اور حقیقت کے لحاظ سے اس کی عین ہے۔ صرف نقطہ نگاہ کا فرق ہے۔ عالم مجاز میں کثرت وجود ہے اور عالم حقیقت میں وحدت الوجود ہے جیسے بظاہر برف کا وجود مجاز کے نقطہ نگاہ سے پانی سے جدا ہے۔ لیکن حقیقت میں برف پانی ہے۔ لہٰذا عارفین کا قول ہے کہ اشیائے عالم خدا نہیں لیکن خدا سے جدا بھی نہیں۔ جیسے زید کا ہاتھ زید نہیں کہلایا جا سکتا لیکن زید سے جدا بھی نہیں۔ لیکن اس مثال سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اشیائے عالم وجود حق کا حصہ ہیں جیسے زید کا ہاتھ زید کا ایک حصہ ہے' اللہ تعالٰی کا وجود غیر منقسم ہے اور اجزاء و اعضاء سے پاک ہے۔ زید کی مثال صرف بات سمجھانے کے لئے دی گئی ہے۔ ورنہ اللہ تو بے مثل اور بے مثال ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (القرآن)

اب اگر فنا اور بقا کو وحدت الوجود کے حوالہ سے دیکھا جائے تو مجاز کے نقطہ نگاہ سے بندہ بندہ ہے اور خدا خدا ہے' نہ بندہ خدا بن سکتا ہے نہ خدا بندہ۔ لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو بندہ کا وجود ہی ثابت نہیں ہوتا۔ بندہ نیست ہے اور حق ہست یعنی جب انسان ریاضات اور مجاہدات کے ذریعے اپنی خودی کو مٹا دیتا ہے اور ذات حق میں واصل ہو جاتا ہے تو اس وقت اس کو حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ کہ مخلوق بحیثیت صفت حق خالق کی عین ہے۔ لیکن جب مراقبہ سے باہر آتا ہے تو عالم مجاز سے ٹکر کھا کر اپنی غیریت کا احساس کرتا ہے اور عبادت حق کو فرض سمجھتا ہے۔

فصل

فنا و بقا کے متعلق مشائخ کے رموز و اسرار

مشائخ عظام میں سے ہر ایک نے اس مضمون پر لطیف نکات بیان فرمائے ہیں چنانچہ حضرت ابو سعید خراز رحمتہ اللہ علیہ صاحب مذہب ہیں (یعنی مضمون فنا و بقا کے ماہر ہیں) فرماتے ہیں کہ :

"الفناء فناء العبد عن رویتہ العبود یہ والبقاء بقاء العبد بمشاھدۃ الالٰھیتہ"۔

(فنا سے مراد بندہ کا اپنی بندگی کو دیکھنے سے فانی ہونا ہے اور بقا سے مراد بندہ کا مشاہدہ حق کی ساتھ باقی رہنا ہے)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی عبادت پر نظر رکھنا یا اس پر فخر کرنا آفت ہے اور بندگی کی وجہ سے بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ کہ اپنی عبادت (بندگی) کی نفی کر دیتا ہے۔ یعنی اس سے فانی ہو جاتا ہے۔ اور خداوند تعالٰی کے فضل سے باقی بن جاتا ہے۔ یعنی اپنے فعل کی وجہ سے نہیں بلکہ فضل الٰہی کیوجہ سے سرفراز ہوا ہے۔ پس جب بندہ اپنی ہستی اور اعمال وغیرہ سے فانی ہوتا ہے تو فضل الٰہی کی وجہ سے باقی بن جاتا ہے۔

حضرت یعقوب نہرجوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" صحتہ العبودیتہ فی الفناء والبقاء " (عبدیت فنا و بقا سے صحیح ہوتی ہے) کیونکہ جب تک بندہ اپنی ہر چیز سے بیزار نہیں ہوتا حق تعالٰی کی حضوری کے قابل نہیں ہوتا پس بشریت سے آزاد ہونا فنا اور عبدیت میں مخلص ہونا بقا ہے۔

حضرت ابراھیم شیبانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" فنا اور بقا سمجھنے کا دار و مدار خالص وحدانیت اور صحیح عبودیت پر ہے اور جو کچھ اس کے سوا ہے غلط اور بے دینی ہے "

مطلب یہ کہ جب بندہ حق تعالیٰ کی وحدانیت کا معترف ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے سامنے مغلوب دیکھتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ مغلوب غالب کے سامنے فانی ہے اور جب اپنی فنا کا اقرار کرتا ہے تو اپنی عاجزی کا اقرار ہے اور سوائے بندگی چارہ نہیں۔ لیکن جو شخص اس کے سوا سمجھے اور فنا کو اپنی ذات کی فنا اور بقا کو حق کی بقا سمجھے تو یہ کھلی گمراہی ہے اور یہ نصرانی (عیسائی) لوگوں کا مذہب ہے۔

شرح یعنی یہ سمجھنا کہ بندہ بندہ نہیں رہا بلکہ بندہ خدا بن گیا ہے اور بندہ خدا کی طرح باقی ہے تو یہ کفر ہے۔ فنا اور بقا کے متعلق صحیح عقیدہ وہی ہے جو حضرت اقدس ؒ نے اوپر بیان کیا ہے۔

ترجمہ میں علی بن عثمان سمجھتا ہوں کہ ان تمام اقوال کا مطلب در اصل ایک ہے لیکن الفاظ مختلف ہیں۔ مطلب یہ کہ جلال خداوندی کے دیکھنے اور اس کی عظمت کے ظہور اور غلبۂ جلال کی وجہ سے اس کے دل سے دنیا اور عقبیٰ فراموش ہو جائے اور اپنے روحانی احوال و مقامات اور کرامات ہیچ نظر آئیں حتیٰ کہ اپنی زندگی، عقل و نفس کا شعور بھی نہ رہے تو یہ بندہ کی فنا کہی جاتی ہے۔ اس مقام کو فناء الفناء کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اس وقت وہ حق تعالیٰ کی زبان سے بولتا ہے اور اس کے دل اور جسم پر خشوع و خضوع طاری ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت اس عہد عبودیت کی تصدیق ہے جو پشت آدم سے نکلتے وقت ارواح سے روزِ الست کو باندھا گیا تھا۔ اس مضمون کو ایک بزرگ نے یوں بیان کیا ہے۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تجھ تک پہنچنے کا طریقہ کیا ہے تو اپنے علائق سے فانی ہو کر ہر وقت تیرے لئے روتا رہتا۔"

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں :

"میری فنا سے مراد فنائے فنا ہے اور اپنی فنا میں تجھ کو باقی دیکھا۔ میں نے اپنا نام و نشان مٹا دیا اور مجھ سے پوچھا گیا کہ تو کون ہے میں نے کہا تو ہے۔"

یہ ہے سلسلہ خرازیہ کی اصل فنا اور بقا کے متعلق جو ہم نے یہاں مختصر طور پر بیان کر دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شرح فنائے فنا یا فناء الفناء کا مطلب یہ ہے کہ ذات حق میں اس قدر گم ہو جائے کہ یہ شعور بھی نہ رہے کہ میں فنا ہو گیا ہوں بلکہ ایک لاشعوری کی کیفیت طاری ہو جائے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

گم شدن گم کن وصل این است و بس (احساس فنا بھی جاتا رہے یہ ہے اصل وصالِ حق)۔

سلسلہ خفیفیہ

یہ سلسلہ حضرت عبداللہ بن محمد خفیف شیرازی رحمتہ اللہ علیہ سے منسوب ہے جن کا شمار وقت کے اکابر صوفیہ و مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ تھے اور طریقت کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کے مناقب اس قدر ہیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے بزرگ، متقی اور پرہیز گار تھے اور نفس کشی میں مشہور تھے۔ سنا ہے کہ آپ نے چار سو عورتوں کے ساتھ نکاح کیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے آپ شیراز

کے شہزادوں میں سے تھے۔ جب آپ کو بزرگی حاصل ہوئی تو امراء اور وزراء کی لڑکیاں حصول برکت کے لئے آپ سے نکاح کرنے لگیں آپ ان کے ساتھ نکاح کر لیتے تھے لیکن صحبت کے بغیر طلاق دے کر رخصت کر دیتے تھے۔ لیکن ان میں سے چالیس عورتیں وقتاً" فوقتاً" آپ کی خدمت گزاری میں رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک جو وزیر کی بیٹی تھی چالیس سال تک آپ کی خدمت کرتی رہی۔ میں نے شیخ ابوالحسن علی بن بکران شیرازیؒ سے سنا ہے کہ ایک دن ان کی تمام بیویوں نے مل کر ایک دوسری سے گفتگو کی تو سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ حضرت شیخ نے ان میں سے کسی کے ساتھ صحبت نہیں کی تھی۔ اس کے بعد سب کو خیال ہوا کہ وزیر کی بیٹی کے ساتھ ضرور خلوت کی ہوگی۔ جب اس سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ جس روز میرا شیخ کے ساتھ نکاح ہوا کسی نے مجھے آکر اطلاع دی کہ آج رات وہ میرے کمرہ میں آئیں گے۔ یہ سن کر میں نے بہترین لباس زیب تن کیا اور آراستہ پیراستہ ہو کر شیخ کے لئے نہایت اچھے کھانے تیار کرائے۔ جب وہ تشریف لائے تو کھانا پیش کیا گیا۔ لیکن انہوں نے نہ کھانے کو ہاتھ لگایا نہ مجھے بلکہ کبھی کھانے کو دیکھتے تھے اور کبھی میری طرف دیکھتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر قمیض کے اندر اپنے پیٹ پر رکھا تو میں نے محسوس کیا کہ سینہ سے لے کر ناف تک پندرہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ سب گرہیں صبر کی سختی کی وجہ سے پڑ گئی ہیں کیونکہ میں نے ساری زندگی اچھے چہروں اور اچھے کھانوں سے پرہیز کیا ہے۔ یہ بات کہہ کر آپ کھڑے ہوئے اور چلے گئے۔ چنانچہ میری زیادہ سے زیادہ یہی خلوت ان کے ساتھ ہوئی۔ اس کے بعد میں کئی سال آپ کی خدمت میں مشغول رہی لیکن آپ نے کسی نفسانی خواہش کا اظہار نہ کیا۔

تصوف میں اس سلسلہ کا اصل اصول غَیبت اور حضور ہے جس کے متعلق

اب بات ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

غَیبت و حضور

یہ وہ الفاظ ہیں جو اگرچہ بظاہر متضاد نظر آتے ہیں دراصل وہ ہم معنی ہیں۔ حضور سے مراد حضور قلب ہے' ایسے یقین کے ساتھ جس سے غیب آنکھوں کے سامنے آجائے اور غَیبت سے مراد یہ ہے کہ خود غائب اور حق تعالیٰ موجود ہو۔ اس کی علامت یہ ہے کہ انسان تمام رسومات سے بے نیاز ہوجاتا ہے پس اپنے آپ سے غائب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ حاضر ہونا اور اپنے آپ کے ساتھ حاضر ہونے سے مراد حق تعالیٰ سے غائب ہونا ہے۔ جب جذبات الٰہی میں سے کوئی جذبہ سالک کے دل پر غلبہ کرتا ہے تو وہ خود سے غائب اور حق تعالیٰ کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔ ماسویٰ اللہ دل سے اٹھ جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی اپنی خودی مٹ جاتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے؎

"میرے دل کا صرف تو مالک ہے
دیگر کسی کی اس کے اندر جگہ نہیں ہے"

چنانچہ جب دل کا مالک خدا ہو تو خواہ اسے حضور میں رکھے یا غیابت میں یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔

شرح جیسا کہ حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ غَیبت اور حضور کا مطلب ایک ہے۔ یعنی جب مراقبہ فنا طاری ہوتا ہے تو عاشق کا وجود ذاتِ محبوب میں گم ہوجاتا ہے۔ اس حال میں عاشق غائب اور معشوق ظاہر یا موجود ہوتا ہے اور جب مقام دوئی یا بقا باللہ پر ہوتا ہے تو عاشق موجود اور محبوب غائب ہوتا ہے۔ اب چونکہ مقام دوئی میں سالک باقی باللہ ہوتا ہے اس لئے دونوں حالتوں میں وہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے خواہ حضور ہو یا غیوب۔

ترجمہ اب رہا یہ سوال کہ ان حالتوں یعنی غیوب و حضور میں سے کیا افضل ہے۔ اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ بعض حضرات غیوب کو افضل سمجھتے ہیں بعض حضور کو۔ جو حضرات غیوب کو افضل سمجھتے ہیں وہ ہیں ابن عطا رحمتہ اللہ علیہ، حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ، ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ، بندار بن حسین رحمتہ اللہ علیہ، ابوحمزہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ اور سمنون محب اللہ رحمتہ اللہ علیہ۔ ان کا کہنا ہے کہ راہ حق میں سب سے بڑا حجاب تو خود ہے۔ جب تو اپنے آپ سے غائب ہوا تو تیری تمام خواہشات نفسانی کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور تمام آفات سے نجات پاتا ہے کیونکہ جب تو اپنے آپ سے غائب ہوتا ہے، حق کے ساتھ بے حجاب حاضر ہوتا ہے۔ لیکن جب تو اپنی صفات بشری میں ظاہر ہوتا ہے تو حق تعالیٰ سے محجوب ہوجاتا ہے اس لئے تیری ہلاکت تیری ہستی میں ہے۔

اس کے برعکس حضرت حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ، جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ، سہل بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ، ابو حفص، حضرت محمد بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ و دیگر مشائخ حضور کو غیوب سے افضل سمجھتے ہیں کیونکہ تمام خوبیاں حضور حق میں ہیں اور اپنے آپ سے غائب ہونے کا مطلب بھی حق تعالیٰ کی طرف راستہ اختیار کرنا ہے۔ جب منزل پر پہنچ گیا تو راستہ خود آفت بن جاتا ہے۔ جب خود سے غیب ہوا تو لا محالہ حق تعالیٰ کے ساتھ حاضر ہوا اور غیبت وہ محمود ہوتی ہے جس سے حضوری حاصل ہو اگر حضوری حاصل نہ ہو تو جنون ہے اس لئے چاہئے کہ غفلت ترک کرے تاکہ حضوری حاصل ہو جب منزل مل گئی تو راستے سے کیا تعلق۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

"غائب سے مراد یہ نہیں کہ گھر یا ملک سے چلا جائے بلکہ غیب کا مطلب ہے ترکِ مراد۔ اور حاضر کا مطلب یہ نہیں کہ گھر میں موجود ہے بلکہ یہ ہے کہ خواہشات نفسانی سے نجات پائے۔"

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں :

"جو شخص اپنی خواہشات کو فنا نہیں کرتا وہ نفس کا غلام ہے ۔"

ایک دفعہ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کا ایک مرید حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے گیا اور دروازے پر دستک دی تو حضرت شیخ نے اندر سے پوچھا کہ کون ہے اور کس سے ملنا چاہتا ہے اس نے کہا کہ حضرت بایزید سے ملنا ہے۔ آپ نے فرمایا "ابویزید کون ہے اور کیا کام کرتا ہے۔ میں ایک مدت سے اس کی تلاش میں ہوں لیکن وہ ملنے میں نہیں آتا"۔ جب وہ مرید واپس گیا اور سارا ماجرا اپنے شیخ سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میرا بھائی ابویزید فانی فی اللہ ہوچکا ہے۔ اسی طرح ایک شخص حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے ملنے کے لئے گیا اور عرض کیا کہ تھوڑی دیر زیارت کا شرف عطا فرما دیں۔ میں چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اے جوان جو کچھ تو مجھ سے معلوم کرنا چاہتا ہے میں عرصہ ہوا اس کی جستجو میں ہوں کئی سال ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اپنی طرف ذرہ بھر توجہ کروں لیکن ایسا نہیں کرسکا۔ اب بتاؤ کہ تمہاری طرف کس طرح توجہ کر سکتا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ غیبت (فنا) میں حجاب (جدائی) کا خوف ایک مزید آفت ہے اور حضور میں کشف کے مزے ہیں اور کشف میں کسی حجاب کا خوف نہیں ہوتا۔ حضرت ابوسعید فرماتے ہیں :- (دوست کے چاند جیسے چہرے سے جدائی کے بادل چھٹ گئے اور غیب کے اندھیرے نورِ صبح سے دور ہوئے)۔

مشائخ کے ہاں یہ ایک عجیب لطیفہ ہے کہ اگرچہ غیبت اور حضوری پر بہت بحث ہوئی ہے لیکن اصل میں دونوں ہم معنی ہیں حق تعالیٰ کے ساتھ حاضر ہونا اور اپنے آپ سے گم ہونا ایک ہی بات ہے کیونکہ اپنے آپ سے گم ہونے کا مطلب بھی حق تعالیٰ کے ساتھ حاضر ہونا ہے جو اپنے آپ سے گم نہیں ہوتا حق

تعالیٰ کے ساتھ حاضر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام بے قراری کے وقت اس لئے بے قرار نہیں تھے کہ اپنی ذات کی طرف متوجہ تھے بلکہ اس حال میں بھی آپ اپنے حال سے بے خبر (غیبت) تھے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ان کی بے قراری کو عدم صبر (بے صبری) قرار نہ دیا۔ چنانچہ جب انہوں نے فریاد کی تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ۔ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا (بلا شبہ وہ صابر تھا)۔

حضور و غیوب کے ہم معنی ہونے کی حقیقت حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔

حضرت جنیدؒ کے متعلق روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ ایک وہ وقت تھا کہ اہل آسمان اور زمین میری حیرت (حالت تحیر) پر روتے تھے، پھر یہ ہوا کہ مجھے ان کی غیبت پر رونا آتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ نہ مجھے ان کی خبر ہے نہ اپنی۔ حضور کے متعلق یہ بہت اچھی مثال ہے۔ یہ تھے غیبت و حضور کے متعلق سلسلہ خفیفیہ اور دیگر مشائخ کے خیالات۔ وباللہ التوفیق۔ (توفیق دینے والا اللہ عزوجل ہے)۔

سلسلہ سیّارہ

یہ سلسلہ حضرت ابی عباس سیاری رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ منسوب ہے۔ آپ ولایت مرو کے امام اور تمام علوم سے آراستہ تھے۔ آپ حضرت ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے تھے۔ آج بھی مرو اور نسا میں ان کے سلسلہ کے لوگ موجود ہیں۔ اگرچہ مرور زمانہ کی وجہ سے تمام سلسلوں میں تبدل و تغیر آجاتا ہے لیکن یہ سلسلہ آج تک بدستور قائم ہے۔ اور کسی وقت یہ علاقہ مشائخ سے خالی نہیں رہا آپ کے رسائل اہل نسا نے اہل مرو کے پاس ارسال کئے

تھے۔ میں نے ان کو خود دیکھا ہے۔ جو بہت لطیف ہیں ان کا موضوع جمع و تفرقہ ہے۔

جمع اور تفرقہ کے متعلق تمام مشائخ نے بیانات دیئے ہیں۔ لیکن اس کے متعلق ان کے خیالات مختلف ہیں۔ مثلاً علم ریاضی جاننے والے جمع و تفرقہ سے اعداد کی جمع و تفریق مراد لیتے ہیں' علم نحو جاننے والے لوگ اسماء و صفات کے ہم معنی اور مختلف المعنی ہونا ظاہر کرتے ہیں۔ فقہا قیاس کا جمع ہونا اور نصوص کی صفات کا علیحدہ ہونا مراد لیتے ہیں۔ علم الہیات کے ماہر صفات ذاتیہ کا یکساں ہونا اور صفات فعلیہ کا مختلف ہونا مراد لیتے ہیں لیکن اس سلسلہ سیارہ کی مراد یہ نہیں ہے۔ اب ہم اس سلسلہ کے عقائد اور مشائخ کے اختلافات بیان کریں گے۔

حقیقت جمع و تفرقہ

یاد رہے کہ حق تعالیٰ نے ساری خلقت کو یہ کہہ کر جمع کردیا کہ :

"اللہ سب کو دارالسلام کی طرف بلاتا ہے"۔

اس کے بعد یہ کہہ کر ہدایت میں فرق کردیا کہ "جسے وہ چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے"۔

مطلب یہ کہ دعوت سب کے لئے عام ہے لیکن ہدایت اس کی مشیت پر منحصر ہے۔ یعنی پہلے دعوت میں سب کو جمع کردیا لیکن ہدایت میں تفریق پیدا کردی۔ جس سے بعض لوگ مقبول اور بعض مردود ہوئے۔ ایک گروہ کو رحمت سے نوازا' دوسرے کو آفت میں مبتلا کیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن مشیت حق یہ تھی کہ ذبح نہ کریں۔ اسی طرح ابلیس کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے اور مشیت یہ تھی کہ سجدہ نہ کرے۔ پس جمع یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام پر سب کو پابند کیا اور تفرقہ یہ ہے کہ اپنے افعال

(مشیت) سے ان میں فرق کردیا۔ جمع و تفرقہ کی مندرجہ بالا تصریحات پر سوائے فرقہ معتزلہ کے تمام اہلسنت و الجماعت متفق ہیں۔ لیکن الفاظ میں فرق ہے۔ ایک گروہ جمع کو توحید کے لئے استعمال کرتا ہے اور جمع کے دو درجے قائم کرتا ہے۔ ایک کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے دوسرے کا بندہ سے۔ جس کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے وہ توحید ہے یعنی رموز توحید جو کوشش سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ خداوند تعالیٰ کی دَین ہے اور جو بندہ سے منسوب ہے وہ ہے توحید پر اعتقاد رکھنا اور ایمان لانا۔ یہ حضرت ابو علی رودباری رحمتہ اللہ علیہ کا مقولہ ہے۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ جمع احکام الٰہی ہیں اور تفرقہ افعال الٰہی۔ اس سے بندہ کی کوشش کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ حق تعالیٰ کی الوہیت ہے۔ اس میں کسی کو حقِ کلام نہیں۔ پس لفظ جمع کا اطلاق اس کی ذات و صفات پر ہوتا ہے کیونکہ قانون **الجمع التسویتہ فی الاصل** کے مطابق سوائے ذات و صفاتِ حق کے اور کوئی دو چیزیں مساوی (برابر) نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں اور اسی کے ساتھ قائم ہیں۔ اور یہ کہ اس کی ذات اور صفات ایک ہیں علیحدہ نہیں ہوسکتیں کیونکہ توحید میں دوئی نہیں ہے اور جمع کا یہی مطلب ہے۔

تفرقہ

لیکن تفرقہ کا تعلق احکام الٰہی سے ہے۔ اور یہ افعال الٰہی ہیں جن میں تفرقہ پایا جاتا ہے اور ایک جگہ وجود کا حکم صادر ہوتا ہے دوسری جگہ عدم کا لیکن وہ عدم جو ممکن الوجود ہو۔ ایک جگہ حکمِ فنا ہوتا ہے۔ دوسری جگہ بقا کا۔

ایک اور گروہ ہے جو جمع سے مراد فنا لیتے ہیں اور تفرقہ سے مراد بقا لیتے ہیں۔ ایک اور گروہ ہے جو جمع سے مراد علم توحید اور تفرقہ سے مراد احکام لیتے

ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جمع سے مراد اجتماع علماء ہے اور تفرقہ سے مراد اختلاف علماء ہے۔ مشائخ تصوف تفرقہ سے مراد مکاسب (انسان کی کوشش) اور جمع سے مراد مواہب (فضل رب) لیتے ہیں۔ یعنی مجاہدہ اور مکاشفہ۔ یعنی جو کچھ بندہ کو مجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے وہ تفرقہ ہے اور جو عنایت حق تعالیٰ سے حاصل ہوتا ہے وہ جمع ہے لیکن بندہ کی سلامتی اس میں ہے کہ اپنے افعال اور کوششوں کو بھی منجانب اللہ سمجھے۔ لہٰذا بندہ کا کمال یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال و افعال کو حق تعالیٰ کے ساتھ منسوب کرے اور خود کو درمیان میں نہ لائے اور پورے طور اس کا قیام و بقا حق کے ساتھ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی صفات کا مظہر ہو اور اس کے صفات کا وکیل و کارساز ہو اور بندہ اپنے ہر فعل کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرے اور اپنے کسب کو بھول جائے۔ چنانچہ ایک حدیث قدسی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ نوافل (زائد عبادت) کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کی آنکھیں، کان، ہاتھ اور زبان بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے دیکھتا ہے میری قدرت سے کام کرتا ہے اور مجھ سے بولتا ہے۔

یعنی ہمارے ذکر میں مغلوب ہوجاتا ہے اور اپنے کسب کا خیال اس کے دل سے نکل جاتا ہے اور ہمارے ذکر پر غالب آجاتا ہے۔ نسبت آدمیت اس سے منقطع ہوجاتی ہے۔ پس اس کا ذکر ہمارا ذکر بن جاتا ہے۔ اسی غلبہ حال کی وجہ سے حضرت ابویزید بسطامیؒ پکار اٹھے : "**سبحانی ما اعظم شانی**" (میں پاک ہوں اور میری شان بلند ہے)۔ حالانکہ جو کچھ وہ کہہ رہے تھے ان کی زبان سے حق بول رہا تھا۔

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

الحق ینطق علی لسان عمرؓ (اللہ تعالیٰ حضرت عمرؓ کی زبان سے بولتا ہے)

وجہ یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ کی قاہریت انسان پر غلبہ کرتی ہے تو اس کی ہستی کو اس سے ضبط کرلیتی ہے اور پھر اس انسان کا کلام حق تعالیٰ کا کلام ہوتا ہے حلول اور اتحاد کے بغیر۔ کیونکہ حق تعالیٰ ان سب چیزوں سے پاک اور بالاتر ہے جو ملحدین اس سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کا قرب بندہ کے دل پر حاوی ہوجاتا ہے اور اس کی ہستی اور اعمال ساقط ہوجاتے ہیں۔ اس درجے کو جمع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جیساکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ذات حق میں اس قدر مستغرق اور مغلوب تھے کہ ان کے فعل کو حق تعالیٰ نے اپنا فعل قرار دیا اور فرمایا :

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (اے پیغمبرؐ وہ آپ نہیں تھے جس نے دشمن پر کنکریاں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں)۔ اسی طرح جب ایک فعل حضرت داؤد علیہ السلام سے سرزد ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ (اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اس وقت حالت تفرقہ میں تھے۔ ان دو باتوں میں فرق ہے یعنی بندہ کے فعل کو اس بندہ سے منسوب کرنا جو محل آفت ہے اور بندہ کے فعل کو اپنے ساتھ منسوب کرنا جو قدیم ہے اور آفات و حوادث سے بالاتر ہے۔ پس جب انسان سے کوئی مافوق العادت فعل سرزد ہوتا ہے تو یہ فعل انسان کا نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ معجزات اور کرامات اسی قبیل سے ہیں۔ پس وہ اعمال جو عادت کے مطابق ہوتے ہیں تفرقہ کی حالت ظاہر کرتے ہیں اور وہ افعال جو فوق العادت ہوتے ہیں (یعنی کرامات و معجزات) وہ حالت جمع ظاہر کرتے ہیں کیونکہ ایک رات میں مقام قاب قوسین تک پہنچنا عادت کے مطابق نہیں بلکہ

یہ فعل حق تعالیٰ کے سوا نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح غیب کے متعلق صحیح بات بتانا بھی خلاف معمول (یعنی کرامت) ہے اس لئے یہ بھی حق تعالیٰ کی صفت ہے نیز آگ سے نہ جلنا یہ بھی فطرت کے خلاف ہے اس لئے یہ بھی فعل حق ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو معجزات اور اپنے اولیاء کرام کو کرامات عطا فرمائے اور اپنے فعل کو ان کا فعل کہا اور ان کے فعل کو اپنا فعل قرار دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کا فعل اس کا فعل ہوتا ہے اور ان کے ساتھ بیعت اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیعت ہوتی ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "بلاشبہ جن لوگوں نے رسولؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اس نے اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی"۔ "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔

پس اولیاء اللہ باطن میں اللہ کے ساتھ حالت جمع میں ہوتے ہیں اور ظاہر میں حالت تفرقہ میں ہوتے ہیں تاکہ مقام جمع سے اسرار دوستی مستحکم ہوں اور تفرقہ سے اقامت عبودیت ظاہر ہو جیسا کہ ایک بزرگ نے مقام جمع کے متعلق فرمایا ہے :

" تو میرے باطن میں مسلط ہو گیا اور تو نے میری زبان سے بات کی پس کئی باتوں میں ہم جمع ہیں اور کئی باتوں میں جدا ہیں ۔ "

یہاں اجتماع باطنی کو جمع اور مناجات لسانی کو تفرقہ کہا گیا ہے اور پھر جمع و تفرقہ کو اپنے ساتھ منسوب فرمایا ہے اور اس کی اصل خود اپنے آپ کو قرار دیا ہے۔ یہ نہایت ہی لطیف اور ادق کلام ہے۔ وباللہ التوفیق ۔

شرح جمع سے مراد مقام فنا فی اللہ ہے اور تفرقہ سے مراد مقام بقا باللہ ہے۔ مقام فنا پر وحدت الوجود ہے اور مقام تفرقہ پر کثرت الوجود ہے۔ دوسرے الفاظ میں مقام فنا کو عالم حقیقت اور مقام بقا کو عالم مجاز کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مشائخ عظام

کا کہنا ہے کہ حقیقت میں وحدت الوجود ہے اور مجاز میں کثرت الوجود یا دوئی ہے۔

فصل

جمع و تفرقہ میں اختلاف

ہمارا اختلاف اس گروہ سے ہے جو یہ کہتا ہے کہ جمع کا اثبات تفرقہ کی نفی ہے ان کا خیال یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ مقام جمع کا حصول وہبی (خداداد) ہے اور تفرقہ کسبی (کوشش و مجاہدہ سے حاصل ہونے والا) ہے اس لئے جب مقام جمع حاصل ہوگیا تفرقہ ختم ہوجاتا ہے۔ ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ مجاہدہ کا ترک کرنا تعطل محض (دائمی ترک) ہے جو اسلام میں جائز نہیں ہے کیونکہ جب تک انسان زندہ ہے اور اس میں عبادت کی طاقت موجود ہے اس کے لئے عبادت کا ترک کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ جمع و تفرقہ دو علیحدہ چیزوں کا نام نہیں ہے جیسے روشنی سورج سے جدا نہیں' عرض جوہر سے جدا نہیں اسی طرح شریعت حقیقت سے جدا نہیں اور مجاہدہ وصول سے جدا نہیں۔ اگر یہ ہوسکتا ہے تو کبھی مجاہدہ وصال سے پہلے ہوتا ہے اور کبھی بعد میں۔ جس سے مجاہدہ پہلے کرایا جاتا ہے اس کے لئے تکلیف زیادہ ہے اور جس سے مجاہدہ بعد میں کرایا جاتا ہے اس کو تکلیف نہ ہوگی۔ اس لئے کہ مجاہدہ کے وقت اس کو وصال حق حاصل ہوگا۔

شرح صوفیاء کی دو اقسام ہیں ایک مرید دوسرا مراد۔ مرید وہ ہے جو طالبِ حق ہے اور مراد وہ ہے جو مطلوبِ حق ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتے ہیں۔

"اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔" (سورۃ البقرہ آیہ ۱۴۲)

یہ مراد کا مقام ہے اور مرید کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ :

"جو میری طرف آتا ہے میں اس کو اپنا راستہ بتاتا ہوں۔" (سورۃ یونس آیہ ۲۵)

اس لئے مشائخ عظام کے نزدیک صوفیاء کرام کے دو گروہ ہیں ایک کو سالک مجذوب کہا جاتا ہے دوسرے کو مجذوب سالک۔ سالک مجذوب مجاہدہ کے بعد مقام وصال تک پہنچتا ہے اور مجذوب سالک کو پہلے اپنا بنایا جاتا ہے اور پھر اس سے مجاہدات کرائے جاتے ہیں چنانچہ مجذوب سالک کو مراد اور سالک مجذوب کو مرید کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

ترجمہ اور جو شخص (مجذوب سالک) کے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو وصال حق بغیر مشقت کے حاصل ہوا اس لئے وہ مجاہدہ کی ضرورت سے انکار کرتا ہے سخت غلطی پر ہے۔ جاہلوں کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ مقصود کا حصول ہمارے اعمال پر منحصر نہیں ہے۔ اس لئے ہماری عبادات و مجاہدات بے کار ہیں اس لئے ناقص اعمال سے بہتر یہ ہے کہ اعمال کو ترک کردیا جائے۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ اعمال کو تم لوگ اور ہم بھی اپنا فعل سمجھتے ہیں۔ جب تم لوگ افعال کو نقصان دہ سمجھتے ہو تو لامحالہ ناکردہ عمل کو بھی فعل کہنا لازم آئے گا اور جب دونوں فعل ہیں اور فعل نقصان دہ ہے تو پھر تم ناکردہ عمل کو کیسے بہتر سمجھتے ہو۔ یہ ظاہراً غلط بات ہے اور کفر اور ایمان کے درمیان واضح فرق ہے۔ اس لئے کہ کافر اور مومن دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے اعمال پُر عیب (ناکافی) ہیں۔ لیکن مومن کرنے کو نہ کرنے سے بہتر سمجھتا ہے اور کافر نہ کرنے کو کرنے سے بہتر سمجھتا ہے۔

اب ہم اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں تاکہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

اقسام جمع یاد رہے کہ جمع کی بھی دو اقسام ہیں ایک جمع سلامت' دوسری جمع تکسیر۔

جمع سلامت جمع سلامت یہ ہے کہ فیضان الٰہی کی واردات کے وقت سالک غایت شوق میں مست اور مستغرق ہوجائے لیکن خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے احکام شریعت کی پابندی کی قوت موجود رہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ابو حفص حداد رحمتہ اللہ علیہ' ابوالعباس سیاری مروی رحمتہ اللہ علیہ جو صاحب مذہب تھے' ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ' ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ' ابوالحسن حصریؒ اور دیگر مشائخ کبار علیہم الرحمہ ہمیشہ مغلوب الحال رہتے تھے۔ لیکن جب نماز کا وقت آتا تو ہوشیاری میں آکر نماز ادا کرتے تھے اور پھر مغلوب ہوجاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک سالک تفرقہ کی حالت میں ہے (بقا باللہ کی جدائی کے وقت) اس پر پابندی شریعت واجب ہے اور حق تعالیٰ اس کو صوم و صلوٰۃ کی توفیق عطا فرماتے ہیں اول اس وجہ سے کہ بندگی کے آثار باقی رہ جائیں۔ دوم اس وجہ سے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت منسوخ نہ ہو جس کا اس نے تا قیام قیامت وعدہ فرمایا ہے۔

جمع تکسیر جمع تکسیر یہ ہے کہ سالک قرب حق میں بالکل مست و بے خود ہوجائے اور صوم و صلوٰۃ کا ہوش نہ رہے۔ اس حال کے سالک کو مجذوب کہتے ہیں۔ پس مجذوبِ بے ہوش معذور ہوتا ہے اور مجذوبِ با ہوش مشکور و مقبول ہوتا ہے۔ اس کا حال مجذوب بے ہوش سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ حالت جمع کے لئے کوئی خاص حال ضروری نہیں۔ جمع کا مطلب ہے کہ اپنی ہمت کو یکجا کرکے دوست میں محو ہوجانا۔ بعض اوقات یہ چیز احوال کے دوران ہوتی ہے اور بعض اوقات مقامات کے دوران۔

شرح احوال جمع ہے حال کی اور مقامات جمع ہے مقام کی۔ اس کتاب میں کئی بار بیان ہوچکا ہے کہ حال ایک عارضی جذبہ ہوتا ہے جو آتا ہے اور جاتا ہے۔ جب حال دائمی طور پر بندہ پر طاری ہوجاتا ہے تو اس کو مقام کے نام موسوم کیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ کا مطلب یہ ہے کہ کبھی جمع کی حالت جس سے مراد فنا فی اللہ ہے ابتداء میں یعنی دوران احوال واقع ہوتی ہے اور کبھی دوران مقام وارد ہوتی ہے۔ دونوں حالتوں میں سالک کا اپنا ارادہ ختم ہوجاتا ہے۔ (اور ارادۂ حق اس پر حاوی ہوجاتا ہے)۔

ترجمہ کسی نے خوب کہا ہے :

لان التفرقۃ فصل و الجمع وصل (تفرقہ سے مراد جدائی ہے اور جمع سے مراد وصل ہے)

جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی پوری ہمت حضرت یوسف علیہ السلام پر مرکوز تھی۔ اس کے سوا ان کو کسی چیز سے سروکار نہ تھا اور مجنون کی پوری ہمت لیلیٰ پر جمی ہوئی تھی یہاں تک کہ سارا جہان اس کے لئے لیلیٰ بن چکا تھا۔ اس قسم کی مثالیں بہت ہیں ایک دفعہ حضرت ابویزید رحمتہ اللہ علیہ اپنے حجرہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے آکر باہر سے آواز دی کہ کیا ابویزید گھر پر ہے۔ حضرت ابویزید رحمتہ اللہ علیہ نے اندر سے آواز دی کہ :

ھل فی البیت الا اللہ (اس گھر میں اللہ کے سوا کون ہے)۔

نیز روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک درویش مکہ مکرمہ پہنچا اور ایک سال مشاہدہ حق میں غرق رہا۔ نہ کھانا کھایا نہ پانی پیا اور نہ وضو کی ضرورت پیش آئی بلکہ مشاہدہ حق اس کی غذا بن چکا تھا۔

ان تمام امور کی اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی محبت کو اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیا اور ہر شخص کو اس میں سے حصہ ملا۔ پھر اس پر مندرجہ ذیل پردے ڈال دیئے۔ بشریت کا پردہ' طبیعت کا پردہ' مزاج کا پردہ' روح کا پردہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ ہر دوست محبت الٰہی سے مغلوب ہوا اور اس کی تمام مساعی اور حرکات و سکنات محبوب حقیقی پر مجتمع ہو گئیں۔ اس وجہ سے اہل لغت و معانی نے اس کا نام جمع رکھا ہے۔ چنانچہ اسی مقام سے حضرت حسین بن منصور حلاجؒ فرماتے ہیں کہ :

لبیک لبیک یا سیدی و مولائی
لبیک لبیک یا مقصودی و معنائی

(میں حاضر ہوں' میں حاضر ہوں یا میرے آقا یا میرے مولیٰ۔ میں حاضر ہوں' میں حاضر ہوں اے میرے مقصود اور اے میرے مطلوب..... اے میری آنکھوں کی روشنی' اے میری ہمت کی آخری منزل' اے میری قوت گویائی' میری بصارت' میری سماعت' اے میرے جسم و جان' اے میری روح رواں میں تیرے ہر حکم کے لئے حاضر ہوں۔)

پس جو شخص اس مقام پر پہنچ جاتا ہے اس کی ہستی مٹ جاتی ہے۔ دنیا کی طرف توجہ کرنا اسکے لئے کفر کے برابر ہوتا ہے اور تمام موجودات اس کے لئے عدم بن جاتے ہیں۔ بعض اہل علم و معرفت نے اس مقام کو جمع الجمع کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اگرچہ یہ لفظ بظاہر اچھا نظر آتا ہے معانی کے اعتبار سے بہتر یہ ہے کہ اس کو جمع الجمع نہ کہا جائے کیونکہ جمع کی لئے تفرقہ کا پایا جانا لازم آتا ہے لیکن یہاں تفرقہ چونکہ مفقود ہے لفظ جمع درست نہیں آتا۔ اب چونکہ اس مقام پر دوست کے سوا کچھ نظر نہیں آتا جیساکہ شب معراج رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ حق تعالیٰ پر جمی رہی اور دائیں بائیں کچھ نہ دیکھا اس حال کو حق

تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یوں بیان فرمایا ہے۔

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (نہ ان کی نظر بھٹکی نہ وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہوا)۔

اس مضمون پر میں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے کتاب البیان لاہل العیان۔ اور اپنی کتاب بحر القلوب میں بھی جمع کے مضمون پر ایک طویل باب باندھا ہے لیکن یہاں میں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے اسی پر اکتفا کیا ہے۔

یہ ہے مسلک سلسلہ سیاریہ جو سلاسل طریقت میں سے ایک سلسلہ ہے۔ اب میں اس گمراہ فرقے کا ذکر کرتا ہوں جنھوں نے اپنے آپ کو اس سلسلے میں منسوب کرکے اپنے ملحدانہ خیالات ظاہر کیے ہیں تاکہ ان کی حقیقت خلق خدا پر عیاں ہوجائے اور ان کے غلط عقائد سے سالکین آگاہ ہوجائیں اور ان کے مکرو فریب سے بچ سکیں۔ توفیق حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

فرقہ حلولیہ

اس مردود و ملعون فرقے کا نام حلولیہ ہے۔ اس کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ اپنے آپ کو سلسلہ سیاریہ سے منسوب کرتا ہے اور غلط عقائد لوگوں میں پھیلاتا ہے۔ یہ لوگ ابی حلمان دمشقی سے عقیدت رکھتے ہیں اور اس کی روایات بیان کرتے ہیں حالانکہ یہ روایات ان روایات کے برعکس ہیں جو مشائخ نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں۔ یہ لوگ ابو حلمان دمشقی کو اہل جذب و محویت قرار دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ عقیدہ حلول و امتزاج اور تناسخ کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔

شرح حلول سے وہ لوگ یہ مراد لیتے ہیں کہ حق تعالیٰ کسی شخص میں اتر آیا مثلاً ہندو رام و کرشن کو اوتار مانتے ہیں اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) خدا مانتے ہیں۔ لفظ امتزاج بھی حلول کا ہم معنی ہے۔ تناسخ ہندوؤں کا عقیدہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے وقت روح ایک جسم سے نکل کر

دوسرے جسم میں چلی جاتی ہے اگر انسان نیک ہے تو موت کے بعد اس کی روح کسی اچھے آدمی یا بادشاہ کی صورت میں دوبارہ پیدا ہوگی۔ لیکن یہ دونوں عقائد غلط اور اسلامی شریعت کے برعکس ہیں۔

ترجمہ ایک اور گروہ ہے جو اپنے آپ کو فارس سے منسوب کرتا ہے اور یہ دعوہ کرتا ہے کہ یہ حسین بن منصور حلاجؒ کے مذہب پر ہے حالانکہ حسین بن منصورؒ کے سلسلے کے لوگوں میں سے کسی کے بھی یہ عقائد نہیں ہیں جیساکہ میں نے ابو جعفر صیدلانیؒ اور ان کے چار ہزار مریدوں کو عراق میں پھیلا ہوا دیکھا کہ ان میں سے کوئی شخص یہ ملحدانہ عقائد نہیں رکھتا۔ وہ سب حلاجی تھے اور فارس پر طعن اور لعنت کرتے تھے اور حسین بن منصور حلاجؒ کی تصانیف میں بھی ان عقائد کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔

میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا کہ ابو حلمان اور فارس کون ہیں اور انہوں نے کیا کہا ہے۔ لیکن جو شخص یہ عقائد رکھتا ہے جو شریعت کے خلاف ہیں اس کو دین سے کچھ حصہ نہیں ملتا۔ جب دین سے کچھ نہیں ملتا تو اس کا تصوف اور معرفت تو اور بھی خراب ہوں گے کیونکہ تصوف دین کی فرع اور نتیجہ ہے اور صوفیاء کرامؒ کی کرامات اور کمالات صحیح عقیدۂ توحید کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوتے چونکہ ان لوگوں نے حقیقت روح کو سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔ اب ہم شریعت کے مطابق حقیقت روح بیان کریں گے اور ان لوگوں کے غلط اور کافرانہ عقائد کو ظاہر کریں گے تاکہ تو ان کے فتنہ و فساد سے محفوظ رہے۔ وباللہ التوفیق۔
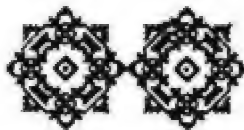
فصل

حقیقت روح

یاد رہے کہ روح کی ہستی کا علم وہبی یا الہامی طور پر ہمیں ہوتا ہے لیکن اس کی چگونگی (فطرت' ماہیت) سمجھنے سے انسانی عقل عاجز ہے۔ علماء اور حکماء امت نے اس کے متعلق قیاس سے کام لیا ہے اور کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ نیز کفار نے بھی اس مضمون پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جب یہودیوں کے کہنے پر قریش مکہ نے نضر بن حارث کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج کر یہ سوال کرایا کہ روح کی کیا کیفیت ہے تو حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے فرمایا۔ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي ۔

شرح اس آیت مبارکہ کے مطالب کے متعلق علماء اور صوفیاء کے درمیان اختلاف ہے عام طور پر علماء ظواہر اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ "کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے"۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کی کیا چیز حق تعالیٰ کے حکم سے وجود میں نہیں آئی۔ جب حکم کن سے سارا جہان پیدا فرمایا تو اس میں روح بھی بقول ان کے شامل ہے تو پھر اس کا کیا مطلب ہے۔ "روح میرے رب کے حکم سے ہے"۔ اولیائے کرام فرماتے ہیں کہ یہاں امر سے مراد حکم نہیں ہے بلکہ عالم امر مراد ہے۔ یاد رہے کہ عالم کی دو قسمیں ہیں عالم امر اور عالم خلق۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک جہان عالم امر ہے اور ایک جہان عالم خلق۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عالم خلق کیا ہے اور عالم امر کیا ہے۔ عالم خلق سے مراد یہ ہے یہ ناسوتی کائنات ہے اور عالم امر کا

مطلب عالم بالا' عالم قدس یا ذات و صفات باری تعالیٰ ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ۔ **اول ماخلق اللہ نوری و خلق کلی شئی من نوری** (سب سے پہلے حق تعالیٰ نے میرا نور (روح) پیدا کیا اور ہر چیز کو میری روح سے پیدا کیا)۔ نیز حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے کہ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (میں نے آدم میں اپنی روح میں سے پھونکا)۔ اس سے ظاہر ہے کہ روح انسانی ایک نفحۂ ہے نفحاتِ الٰہی میں سے۔ بالفاظ دیگر روح کا تعلق مادی دنیا سے نہیں بلکہ روحانی دنیا سے ہے اور قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي کے بعد یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ہم نے آپ کو اس کے متعلق قلیل علم عطا کیا ہے"۔ اگرچہ حق تعالیٰ کے نقطۂ نظر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم روح کی حقیقت کے متعلق اللہ تبارک و تعالیٰ نے عطا فرمایا وہ قلیل تھا لیکن ہمارے انسانی نقطۂ نگاہ سے یہ بہت بڑا اور عظیم الشان علم ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا علم بطون جس سے کتابیں بھری پڑی ہیں اسی "قلیل" علم کا نتیجہ ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وسعت علم ہے کہ فرمایا :

"قرآن کا ایک ظاہری مطلب ہے اور ایک باطنی اور پھر اس باطنی مطلب کا باطنی مطلب ہے سات بواطن تک' ایک روایت کے مطابق نو بواطن تک"

اور یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بظاہر "قلیل علم" کا نتیجہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے اور اس دروازے کے علم کا حال ملاحظہ ہو۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اگر میں سورہ فاتحہ کی شرح لکھوں تو ستر اونٹ کا بوجھ بن جائے گا۔ جب ایک رات حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کے پاس گئے اور سورہ فاتحہ کے معنی سمجھنا چاہے تو حضرت علیؓ نے تقریر شروع کردی حتیٰ کہ جب دوسری صبح کی اذان ہوئی تو ابھی آپ بسم اللہ کے پہلے حرف با کی شرح بیان فرمارہے تھے۔ یہ ہیں اس "قلیل" علم کے شاخسانے۔

علاوہ ازیں احادیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیع اور بے پایاں علوم باطنی کا کثرت سے ذکر آیا ہے۔

ترجمہ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

" ارواح بیشمار جمع شدہ لشکر کی طرح ہیں۔ پس ان میں سے جو عالم ارواح میں ایک دوسرے کے شناسا ہوئے وہ دنیا میں بھی باہمی محبت کرتے ہیں اور جو وہاں شناسا نہ ہوئے دنیا میں بھی اختلاف کرتے ہیں "

روح کی ہستی کے متعلق اس طرح کے بیشمار دلائل موجود ہیں ۔

شرح اب تو روس جیسے دہریہ ملک میں بھی طاقتور کیمروں کے ذریعے روح کے فوٹو لئے جارہے ہیں اور یہ حقیقت سائنس کے ذریعے پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ انسان کے اندر روح ہے اور روحانی قوت کو پوری طرح بڑھایا جائے تو اس سے کرامات سرزد ہو سکتی ہیں بلکہ چھوٹی موٹی کرامات اہل روس حاصل کر بھی چکے ہیں مثلاً زمین سے ایک انچ ہوا میں معلق ہونا اور ٹیلی پیتھی کے ذریعے پیغام رسانی وغیرہ۔

ترجمہ لیکن روح کی کیفیت اور چگونگی کے متعلق بہت کم کہا گیا ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ روح اس جان کا نام ہے جس سے انسان زندہ ہے۔ متکلمین اسلام میں سے بعض کا بھی یہی خیال ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے روح ایک عرض ہے کہ جاندار اس سے زندہ ہیں۔

شرح عرض اور جوہر کا اس کتاب میں کافی ذکر آیا ہے۔ جوہر وہ صفت ہے جو کسی ذی روح یا غیر ذی روح کے ذریعے ظاہر ہو۔ جس چیز کے ذریعے وہ صفت ظاہر ہے اس کو عرض اور اس صفت کو جوہر کہا جاتا ہے۔ مثلاً سرخ کپڑا ہے سرخ رنگ جوہر کہلائے گا اور کپڑا عرض۔

ترجمہ چنانچہ ہر جاندار میں حرکات و سکنات اسی روح کی بدولت ہیں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ روح زندگی یا جان کے علاوہ ایک چیز ہے جس کے بغیر وہ جان ناممکن ہے جیسے روح بغیر جسم ممکن نہیں، غرضیکہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ممکن نہیں۔ اس نظریہ کے مطابق بھی روح عرض ہے جیسا کہ جان عرض ہے۔

لیکن سب مشائخ اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ روح جوہر ہے نہ کہ عرض (صفت)۔ جو اپنی ذات سے قائم ہے نہ کہ وہ صفت جس سے وہ زندہ ہے۔ اپنی حکمت ازلی کے مطابق حق تعالیٰ روح کو جسم میں ڈالتا ہے جس سے وہ زندہ رہتا ہے۔ یعنی روح ایک امانت ہے جو جسم کے اندر رکھی گئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات انسان روح کے بغیر بھی زندہ رہ سکے یعنی خواب کی حالت میں۔ جب روح سیر کرتی ہے اور جسم پڑا رہتا ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ خواب کی حالت میں انسان کا علم و عقل برقرار رہے اور کارفرما رہے کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شہیدوں کی روحیں پرندوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ روح جوہر ہے نہ کہ عرض۔ نیز فرمایا کہ ارواح جمع شدہ لشکر ہیں۔ لامحالہ وہ لشکر باقی ہیں لیکن عرض باقی نہیں رہتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ روح جوہر ہے نہ کہ عرض۔ خلاصہ یہ کہ روح ایک لطیف جسم ہے جو خداوند تعالیٰ کے حکم سے جسم کے اندر آتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔ نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "معراج کی رات میں نے حضرت آدم صفی اللہ، یوسف صدیق، موسیٰ کلیم اللہ، ہارون حلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ اور ابراہیم خلیل اللہ علیہم السلام کو آسمانوں میں دیکھا"۔ لامحالہ یہ ان کی ارواح ہیں۔ اگر روح عرض ہوتا تو اجسام کے بغیر قائم نہ رہتا۔ نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روح دکھائی نہیں دیتا۔ اگر عرض ہوتا تو وہ کسی مکان یا جگہ میں ہوتا اور دکھائی دیتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ

روح ایک لطیف جسم ہے اور جب وہ جسم ہے تو اس کا مشاہدہ بھی ممکن ہوا البتہ روحانی آنکھوں سے نہ کہ جسمانی آنکھوں سے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ارواح طیور کی مانند یا ایک لشکر کی مانند ہوں جو ادھر ادھر جا سکتے ہیں جیسا کہ احادیث میں بتایا گیا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ : قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ

باقی رہا یہ سوال کہ کفار روح کو قدیم سمجھتے ہیں اور اس کو خالق کائنات اور مدبر کائنات سمجھتے ہیں اس لئے اس کی پرستش کرتے ہیں اور یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ روح ایک جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس غلط فہمی پر جس قدر لوگ متفق ہیں اور کسی پر نہیں۔ مثلاً تمام عیسائیوں کا یہی عقیدہ ہے اگرچہ گفتگو میں اس کو ظاہر نہیں کرتے۔ اسی طرح ہندو اور اہل چین و ماچین و اہل تبت یہی عقائد رکھتے ہیں۔ نیز شیعہ' قرامطہ اور باطنیہ فرقوں کا بھی یہی عقیدہ ہے اور وہ دو ملحد فرقے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہی کچھ کہتے ہیں۔

پس اب ہم ان تمام گروہوں سے پوچھتے ہیں کہ اس لفظ قدیم سے تمہاری کیا مراد ہے۔ قدیم ذاتی سمجھتے ہو یا قدیم زمانی۔ اگر وہ یہ جواب دیں کہ قدیم سے مراد قدیم زمانی ہے تو پھر سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ روح قدیم زمانی ہے کہ جہان میں کوئی ایسا وقت نہ تھا جب کہ روح موجود نہ ہو۔ نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے ہیں کہ :

"حق تعالیٰ نے ارواح کو ہزاروں سال اجسام سے پہلے پیدا فرمایا"

اس سے ظاہر ہے کہ روح اگرچہ زمانہ کے اعتبار سے قدیم ہے' دراصل حادث ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حادث محدث کے بغیر نہیں رہ سکتا بلکہ عدم سے وجود میں آنے کے لئے کسی فاعل کا محتاج ہے اور فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روح مخلوق ہے عالم مخلوق میں سے جو دوسری جنس یعنی جسم کے ساتھ مل کر انسان کے اندر جان پیدا کر دیتی ہے۔

تناسخ غلط ہے

لیکن اس روح کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں جانا غلط ہے۔ کیونکہ جس طرح ایک جسم کے لئے دو زندگیاں ناممکن ہیں اسی طرح ایک روح کے لئے بھی دو زندگیاں محال ہیں۔ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم یہ خبر نہ دیتے تو صرف عقل کے ذریعے روح کا مطلب سوائے جان کے اور کچھ نہ ہوتا اور وہ ایک صفت ہوتی قائم بذات خود۔ اگر وہ لوگ یہ کہیں کہ قدیم سے مراد ہمیشہ سے رہنے والا مراد ہے جو نہ کسی وقت عدم تھا اور نہ کبھی عدم ہوگا تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ اپنی ذات سے قائم ہے یا کسی اور کا محتاج ہے اگر وہ یہ جواب دیں کہ قائم بذات خود ہے تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ خالق کائنات ہے یا نہیں ہے۔ اگر وہ کہیں کہ خالق کائنات نہیں ہے تو اس سے خالق کائنات کے سوا دوسرے قدیم کا ثابت کرنا لازم آتا ہے اور یہ بات خلاف عقل ہے کیونکہ قدیم ذاتی کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اور نہ وہ کسی چیز سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن یہاں (ان کے نزدیک) ایک قدیم کے وجود (ذات) کی ابتداء دوسرے سے ہے اور وہ اس سے گھرا ہوا ہے اور یہ محال ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ روح کا قدیم بالذات ہونا بھی محال ہے کیونکہ جس چیز کی ابتداء ہو اور انتہا ہو اور وہ دوسری چیز سے گھرا ہوا ہو تو وہ قدیم نہیں ہوسکتا بلکہ حادث ہے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ روح خالق عالم ہے تو ہم کہتے ہیں کہ قدیم ہوا اور خلق حادث۔ یہ بھی محال ہے کہ حادث قدیم کے ساتھ بطور سرایت موجود ہو یا حادث قدیم کا محل بن سکے کیونکہ جو چیز دوسری سے پیوست ہو وہ اس کی ہم جنس ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ باہم مل جانا اور جدا ہونا یہ بھی حادث اشیا کی خصوصیت ہے کیونکہ حادث چیزیں ایک دوسرے کی ہم جنس ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے۔

اگر وہ یہ کہیں کہ روح قائم بذات خود نہیں بلکہ اس کا قیام غیر کے ساتھ

ممکن ہے تو یہ سخن دو امکانوں میں سے ایک امکان ہو گا۔ یا وہ صفت ہو گا یا عرض اگر وہ کہیں کہ یہ صفت ہے تو لامحالہ اسے کسی جگہ کے اندر ماننا پڑے گا یا بغیر جگہ کے۔ اگر وہ محل یا جگہ کے اندر کہیں تو اس کا وہ محل بھی عرض ہو گا اور دوسرے کے ذریعے قائم ہو گا اس صورت میں اس پر قدیم کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اگر محل کے اندر کہا جائے تو یہ بات بھی خلاف عقل ہے اگر وہ کہیں کہ یہ صفت قدیم ہے جیسے تناسخ والے اور حلولی فرقہ کے لوگ سمجھتے ہیں اور پھر اس کو حق تعالیٰ کی صفت قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی محال ہے کہ حق تعالیٰ کی قدیم صفت حادث کی صفت ہو جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ صفت قدیم' حادث مخلوقات کی صفت بن جائے تو لامحالہ وہ اس سے متصف ہو گی۔ لیکن یہ محال ہے کہ صفت قدیم کا موصوف حادث ہو۔ اس لئے لامحالہ قدیم کو حادث کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا ان ملحدوں کے یہ نظریات باطل ہیں۔ اس ساری بحث سے یہ ثابت ہوا کہ روح مخلوق ہے قدرت خداوندی سے۔ اور جو شخص اس کے علاوہ کچھ اور سمجھتا ہے غلط ہے بلکہ وہ شخص حادث اور قدیم میں فرق نہیں جانتا اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی حقیقی ولی اللہ حق تعالیٰ کی صفات سے واقف نہ ہو۔ لہٰذا حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے از راہ کرم ہمیں ان غلط عقائد سے محفوظ رکھا ہے اور وہ سمجھ عطا فرمائی ہے کہ ہم اس کی خلق میں غور کر سکیں اور دل کو نور ایمان سے منور فرمایا جس سے ہم حق تعالیٰ کو پہچاننے کے قابل ہوئے۔ حق تعالیٰ اس قدر حمد و ثناء کا مستحق ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب کیونکہ لامحدود نعمت کا محدود زبان سے شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ جب اہل ظاہر نے اہل حقیقت کی وہ باتیں سنیں جن کا تعلق تصوف سے نہیں تو انہوں نے خیال کیا کہ تمام صوفیاء کا یہی عقیدہ ہے اور اس بڑی غلطی کی وجہ سے وہ اولیائے کرام کے کمالات اور جمالات سے بے خبر رہے اور ولایت الٰہی کے انوار و تجلیات سے محروم رہے۔ حالانکہ اہل

طریقت اور مشائخ عظام کے نزدیک خلق کا رد و قبول یکساں ہے۔

فصل

روح کے متعلق اقوال مشائخ

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ۔ **الروح فی الجسد کالنار فی الحطب فالنار مخلوقتہ والفحم مصنوعتہ** (جسم کے اندر روح اس طرح ہے جیسے لکڑی میں آگ۔ لیکن آگ اور انگارہ دونوں مخلوق ہیں اور قدم (قدیم ہونا) ذات و صفات حق کے سوا کسی اور چیز کے لئے روا نہیں)

مشائخ میں سے حضرت ابوبکر واسطیؒ نے روح کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :

الارواح علی عشرہ مقامات (ارواح دس مقامات پر قائم ہیں)۔

۱- گناہ گاروں کی ارواح جو اندھیرے میں بند ہیں اور یہ نہیں جانتیں کہ ان کے ساتھ کیا حشر ہو گا۔

۲- نیک لوگوں کی ارواح جو پہلے آسمان میں اپنے نیک اعمال کی وجہ سے خوش و خرم ہیں۔ اپنی عبادت کی وجہ سے مطمئن اور اس کی طاقت سے سیر کرتی ہیں۔

۳- طالبان حق کی ارواح جو چوتھے آسمان میں ہیں اور اپنے صدق کی لذت اور اعمال نیک کے سایہ میں ملائک کی ہم نشین ہیں۔

۴- اہل سخاوت کی ارواح جو نور کی قندیلوں سے عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی ہیں۔ ان کا کھانا محبت اور پینا لطف اور قرب ہے۔

۵- اہل وفا کی ارواح جو مقام صفا و اصطفا پر خوش ہیں۔

۶- شہداء کی ارواح جو طیور کی صورت میں بہشت کے باغوں میں چہکتی پھرتی ہیں۔
۷- عاشقوں کی ارواح جو نوری پردوں میں ادب کے ساتھ مقیم ہیں۔
۸- عارفین کی ارواح جو عالم قدس میں صبح و شام حق تعالی کا کلام سنتی ہیں۔
۹- اولیاء اللہ کی ارواح جو مشاہدہ جمال حق اور کشف میں مستغرق ہیں اور خدا کے سوا نہ کسی کو جانتی ہیں نہ اس سے مطمئن ہوتی ہیں۔
۱۰- درویشوں کی ارواح جو مقام فنا اور قرب حق کے مزے لے رہی ہیں۔

مشائخ کا کہنا ہے کہ انہوں نے ان ارواح کو اپنی اپنی صورتوں میں دیکھا ہے اور یہ ممکن ہے۔ اس لئے کہ روح ایک جسم لطیف ہے جو ہر جگہ موجود ہے اور اس قابل ہے کہ دیکھی جاسکے اور حق تعالی جس طرح چاہے خاص بندوں کو دکھا سکتا ہے۔

اور میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ ہماری زندگی اور پائندگی خدا تعالی کے ساتھ قائم ہے اور ہمیں زندہ رکھنا فعل حق ہے اور ہم اس کے فعل تخلیق کے سبب زندہ ہیں نہ کہ اس کی ذات و صفات کے ساتھ۔فرقہ باطن کے لوگوں کے عقائد باطل ہیں اور تخلیق کے متعلق ان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ روح کو قدیم کہتے ہیں۔ وہ لوگ مختلف الفاظ میں بات کرتے ہیں۔کئی لوگ روح کو "نفس" اور "ہیولی" کہتے ہیں۔ کوئی نور و ظلمت۔ اور طریقت کے جھوٹے دعویدار مقامات فنا و بقا' یا جمع و تفرقہ وغیرہ کا نام تو لیتے ہیں لیکن اپنے کافرانہ عقائد پر فریفتہ ہیں۔ صوفیاء کرام ان سے بیزار ہیں۔ ولایت' حقیقت اور محبت کے دعوے معرفت کے بغیر صحیح نہیں ہو سکتے اور جو شخص قدیم اور محدث میں فرق نہیں کرسکتا وہ یہ نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ ہی کوئی ذی عقل ان کی باتوں کو تسلیم کرتا ہے۔ ان دو فرقوں کے عقائد باطل ہم نے ان دو ابواب میں

بیان کردیئے ہیں۔ اس سے زیادہ ضرورت ہو تو ہماری دوسری کتابوں میں دیکھا جائے۔ اب ہم مختلف حجابات کے دور کرنے اور مضامین طریقت اور اہل تصوف کے حقائق و معارف بیان کرتے ہیں تاکہ مقصود کا سمجھنا آسان ہوجائے اور ممکن ہے کہ منکرین کو بھی اس سے ہدایت ملے اور یہ راستہ اختیار کریں اور مجھے ثواب حاصل ہو۔ انشاء اللہ۔

شرح حضرت مصنف علیہ الرحمہ کی کتاب کشف المحجوب کا مندرجہ بالا باب اس وجہ سے نہایت اہم ہے کہ دشمنان اسلام نے سفید جھوٹ سے کام لیتے ہوئے فرقہ ہائے باطل مثل قرامطیہ وغیرہ کے عقائد باطل کو تصوف اور اہل تصوف سے منسوب کرکے ان کو بدنام کرنے کی کوششیں کیں جس سے ظاہربین اور سطحی نظر کے مسلمان بھی گمراہ ہورہے تھے۔ بلکہ زمانہ حاضر میں جبکہ اقوام مغرب نے اسلامی ممالک پر تسلط جما رکھا ہے یورپی مصنفین جن کو عرف عام میں مستشرقین کہا جاتا ہے نے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی مہم تیز ترکردی ہے۔ تاکہ مسلمانوں کو یہ باور کرائیں کہ عیسائی اقوام ہی حق پر ہیں لہٰذا دنیا پر حکومت کرنے کا ان کو حق حاصل ہے۔ فرقہ قرامطیہ نے اسلامی دنیا میں جو تباہی مچائی تھی اس سے ہرکس و ناکس آگاہ ہے۔ یہاں تک کہ مکہ مکرمہ سے حجراسود چرا کر بحرین لے گئے اور دو سال تک اس پر قابض رہے۔ نیز ڈاکٹر نکلسن کی تحقیق کے مطابق حکومت وقت نے شیخ حسین بن منصور حلاجؒ کو اس لئے پھانسی دی کہ مخالفین تصوف نے ان کے نعرہ اناالحق کو قرامطہ کے عقیدہ کے حلول (INCARNTAION) کے ساتھ جان بوجھ کر مخلوط کردیا تھا۔ چونکہ اس وقت قرامطیہ عروج پر تھے حکومت وقت کو اس سے خطرات لاحق ہوئے اور حضرت شیخ کو قتل کردیا۔

فرقہ قرامطیہ کے سربراہ حسن بن صباح کو کون نہیں جانتا یہ لوگ اسلام

سے اس قدر منحرف تھے کہ انہوں نے قلعہ الموت میں اپنی بہشت اور دوزخ بنا رکھی تھی اور ان کے اندر داخل کر کے سزا و جزا دیتے تھے۔ ملتان اور اوچ بھی ان کے گڑھ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سلاطین اسلام مثل سلطان محمود غزنویؒ قرامد کو تباہ و برباد کرنے کے لئے پے در پے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ نیز سلطان محمود غزنویؒ نے گجرات اور سومناتھ پر بھی اس لئے حملہ کیا کہ وہاں کے ہندو راجے ملتان اور اوچ کے قرامطی حکمرانوں کو فوجی امداد دے رہے تھے لیکن انگریزوں نے ہندوؤں کو خوش کرنے اور اسلام کو بدنام کرنے کے لئے غازی سلطان محمود غزنویؒ کو تاریخ ہند میں بہت بدنام کیا اور ڈاکو اور لٹیرہ قرار دیا ہے۔
عالم اسلام میں قرامد بہت بڑا فتنہ تھا جس کو مٹانے کی خاطر سلاطین اسلام' علمائے کرام اور صوفیاء عظام نے بے حد جدوجہد کی اور آخر اس کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ صوفیائے کرام کی تصانیف میں کسی جگہ قرامطیہ عقائد کی تائید نہیں آئی بلکہ ان کی ہر جگہ سخت مذمت کی گئی ہے لیکن یار لوگوں نے صوفیاء اور تصوف کو اس بہانے بدنام کیا کہ قرامد بھی اپنے آپ کو اہل باطن کہتے تھے اس لئے ان کا ایک نام فرقہ باطنیہ بھی پڑ گیا اور صوفیائے کرام بھی عالم بطون کی باتیں کرتے تھے۔ لیکن قرامد اور صوفیاء کے عقائد میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جہاں قرامد کے عقائد سراسر شریعت اسلامیہ کے خلاف تھے صوفیاء کرام نے شریعت کی نہ صرف مدافعت کی بلکہ سختی سے اس پر کاربند رہے۔ حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے جن کا شمار اکابر صوفیہ میں ہوتا ہے ساری عمر خربوزہ اس لئے نہ کھایا کہ ان کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خربوزہ کس طرح کاٹا اور کس طرح کھایا تاکہ دوسرے طریقے سے کاٹ کر خلاف سنت کا ارتکاب نہ ہو۔ اسی طرح حضرت جنید بغدادیؒ کی پابندی شریعت کلیہ عالم تھا کہ ان کے ایک عزیز نے ایک دن ان کے پاس کچھ کھانا بھیجا۔ چونکہ وہ شخص

سرکاری ملازم تھا۔ آپ نے وہ کھانا مشکوک سمجھ کر نہ کھایا اور دریا میں پھینک دیا اور اس روز کے بعد اس دریا سے مچھلی کھانا بند کر دیا اس خیال سے کہ مچھلیوں نے وہ کھانا کھایا ہو گا جو مال حرام تھا۔ اسی طرح تمام صوفیاء کرامؒ کی شریعت سے محبت اور شدت سے پابندی کی داستانیں اسلامی دنیا میں ضرب المثل بن چکی ہیں۔

قرامطہ کے بطون اور صوفیاء کے بطون میں زمین و آسمان کا فرق اس بات سے عیاں ہے کہ جہاں قرامطہ اسلامی صوم و صلوٰۃ کے منکر تھے صوفیاء کرام اس پر سختی سے پابند تھے۔ جہاں تک لفظ باطن یا بطون کا تعلق ہے یہ الفاظ تو قرآن و حدیث میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قرآن کے ایک ظاہری معانی ہیں ایک باطنی اور پھر باطنی معانی کے اور باطنی معانی ہیں سات بواطن تک۔ قرآن مجید میں بھی ظاہری دنیا اور باطنی دنیا یعنی عالم ارواح، ملائک وغیرہ کا کثرت سے ذکر آیا ہے۔ جب صوفیائے کرام عالم بطون کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد حق تعالیٰ کے ساتھ باطنی قرب ہوتا ہے لیکن قرامطہ بطون سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اسلام نام ہے باطن کا۔ اگر دل میں خدا کو تسلیم کر لیا جائے اور دل میں اس کی یاد رکھی جائے تو ظاہری اعمال یعنی صوم و صلوٰۃ کی ضرورت نہیں ہے اور یہ کھلی بے دینی اور کفر ہے جس کی صوفیائے کرام نے سخت مخالفت کی ہے اور منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ کے واقعہ سے تصوف کے خلاف مخالفین نے جو کچھ کہا ہے صوفیاء کرامؒ نے اس کی تردید میں بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور تصوف اور شریعت کو ایک قرار دیا ہے۔ دراصل قرامطہ کے عقیدۂ حلول کے قائل خود عیسائی لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا سمجھتے ہیں لیکن اپنی سیاہی چھپانے کی خاطر انہوں نے نہایت عیاری سے الٹا مسلمانوں پر یہ الزام ٹھونس دیا۔ لیکن اب یورپ میں فضا بدل چکی ہے

اور بہت سے مستشرقین (یعنی یورپ کے سکالر) تصوف کو عین شریعت قرار دیتے ہوئے کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اس کا ثبوت میری کتاب "اسلامک صوفی ازم" اور "روحانیت اسلام" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نیز کتاب ہذا کے مقدمہ از شارح میں وضاحت کی گئی کہ اب ہندو اور عیسائی ریسرچ سکالر اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ تصوف کی اصل قرآن و حدیث ہے اور یہ کہ صوفیاء کرام' ہندو اور عیسائی ارباب روحانیت سے متاثر نہیں ہوئے۔ بلکہ الٹا عیسائی اور ہندو ارباب روحانیت نے صوفیائے اسلام سے روحانی تعلیم و تربیت حاصل کی ہے۔

روشن از عکس جمالش عالم امکان ما
یک نگاہ ناز جاناں قیمت ایمان ما

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما
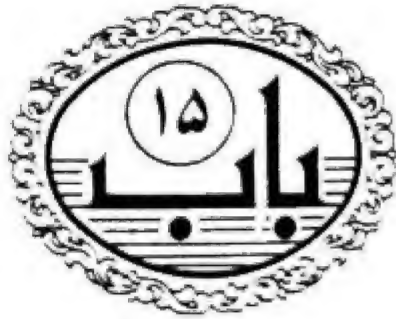
پہلے پردہ کا اٹھنا

معرفتِ الٰہی کے بیان میں

حق تعالی نے فرمایا ہے کہ : مَا قَدَرُوا...

"ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہیں جانی جیسا کہ جاننے کا حق تھا"

اور رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

"اگر تم کو حق تعالی کی معرفت حاصل ہو جاتی جیسا کہ معرفت کا حق ہے تو تم پانی پر چلتے اور تمہاری دعا سے پہاڑ لرز جاتے"۔

اقسام معرفت معرفت الہی کی دو اقسام ہیں ایک علمی' دوسری حالی۔

شرح حق تعالی کے متعلق ایمان اور یقین کے ویسے تو اتنے کثیر مراتب ہیں جتنے کہ انسان ہیں۔ ہر شخص کا مرتبہ یقین مختلف ہے لیکن عام طور پر ایمان و

یقین کے تین مراتب ہیں، علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ علم الیقین کی کیفیت ایسی ہے جیسے کسی شخص نے آگ نہیں دیکھی اور سنتا ہے آگ جلاتی ہے۔ عین الیقین یہ ہے کہ اپنی آنکھ سے آگ کو جلاتے ہوئے دیکھے اور حق الیقین یہ ہے کہ آگ میں ہاتھ ڈال کر اس کی جلانے والی صفت کا ذاتی تجربہ کر لے۔ چنانچہ حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے یہ جو فرمایا ہے کہ معرفت کی دو قسمیں ہیں علمی اور حالی۔ علمی معرفت یہ ہے کہ قرآن پڑھ کر معلوم کرے یا بزرگوں سے سن لے کہ اللہ موجود ہے اور حالی معرفت یہ ہے کہ اپنی آنکھوں سے بھی مشاہدہ حق کرے اور ذاتی تجربہ بھی کر لے۔ یہ ذاتی تجربہ حق الیقین کا مرتبہ ہے جس سے مراد مقام فنا فی اللہ کا حصول ہے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ حق تعالٰی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ جب تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے اور باطنی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں تو پھر روحانی آنکھوں سے جو مشاہدہ ہوتا ہے تو اسے عین الیقین کہا جاتا ہے اور جب مقام فنا فی اللہ حاصل ہوتا ہے تو اسے حق الیقین سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ علم الیقین کو حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے "معرفتِ علمی" اور عین الیقین اور حق الیقین کو "معرفتِ حالی" کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔

ترجمہ معرفت علمی تمام حسنات اور خیرات (نیک کام) کی بنیاد ہے اور بہت ضروری چیز ہے لیکن حق تعالٰی کے نزدیک سب سے زیادہ اہم چیز "معرفتِ حالی" ہے حق تعالٰی نے فرمایا ہے **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (ای لیعرفون)**

"نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انسان کو سوائے عبادت کے" یہاں عبادت سے مراد معرفت ہے۔

شرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں **لِيَعْبُدُونِ** سے مراد **لیعرفون** ہے یعنی معرفت کا حاصل کرنا۔ ویسے **لِيَعْبُدُونِ** کے باطنی معانی بھی

مقام عبدیت کا حصول ہے۔ جسے بقا باللہ بھی کہا جاتا ہے۔

ترجمہ لیکن بہت سے لوگ اس کے متعلق کوتاہی کر رہے ہیں اور مقصد حیات سے غافل ہیں سوائے اولیاء کرام کے جن کو حق تعالیٰ نے برگزیدہ فرمایا اور جہالت کی تاریکی سے نکال کر ان کے قلوب کو اپنی معرفت سے زندہ فرمایا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ہم[1] نے اس کیلئے روشنی پیدا کر دی جس سے وہ لوگوں میں چلتا ہے" اور ابوجہل کے متعلق فرمایا ہے کہ "اس[2] کی حالت یہ ہے کہ تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور نکلنے کی کوئی صورت نہیں"۔

پس معرفت سے مراد حیات دل ہے حق تعالیٰ کے ساتھ اور غیر اللہ سے روگردانی۔ ہر شخص کی قیمت اس کے معرفت کے مطابق ہوتی ہے جس کو معرفت حاصل نہیں اس کی کوئی قیمت (وقعت) نہیں۔ علماء اور فقہا خداوند تعالیٰ کے متعلق علم کو معرفت کا نام دیتے ہیں اور مشائخ طریقت صحتِ حال یعنی قرب خداوندی کو معرفت قرار دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک علم سے معرفت افضل ہے۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ معرفتِ حالی' معرفتِ علمی کے بغیر ممکن نہیں۔ یعنی علم کے بغیر عارف نہیں ہو سکتا لیکن معرفت کے بغیر عالم ہو سکتا ہے۔ لیکن دونوں گروہوں میں سے جو لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے خواہ مخواہ بحث و مباحثہ میں مشغول ہیں اور ایک دوسرے کی تکذیب میں مصروف ہیں اب ہم اس مسئلہ کی حقیقت بیان کرتے ہیں تاکہ دونوں کو فائدہ ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

[1، 2] سورۃ الانعام آیت ۱۲۲

فصل

معرفت کے متعلق اختلاف

یاد رہے کہ خداوند تعالیٰ کی معرفت اور اس کے متعلق علم کے سوال پر بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ فرقہ معتزلہ کا خیال ہے کہ معرفت کا دارومدار عقل پر ہے اور جو بے عقل ہے اس کو معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ بات غلط ہے کیونکہ مجذوبوں کو معرفت ہوتی ہے لیکن ان کی عقل کام نہیں کرتی۔ اسی طرح اگرچہ بچوں کو علم نہیں ہوتا لیکن ان کو ایمان حاصل ہوتا ہے۔ اگر معرفت کا انحصار عقل پر ہوتا تو جو عقلمند نہیں ہیں ان کو معرفت حاصل نہ ہوتی۔ اور کافروں کو عقل ہے لیکن معرفت نہیں ہے۔ اگر عقل معرفت کیلئے شرط ہوتی تو ہر عقلمند عارف ہوتا اور تمام بے عقل بے ایمان ہوتے۔ اور یہ کھلی گمراہی ہے۔ بعض کے نزدیک معرفت کا انحصار استدلال پر ہے یعنی جس کے اندر قوت استدلال نہیں عارف نہیں ہو سکتا یہ بات بھی غلط ہے۔

شرح حضرت مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ نے مندرجہ ذیل شعر کے ذریعے استدلال کو رد کیا ہے۔

گر باستدلال کارِ دین بدے
فخر رازی راز دانِ دین بدے

"اگر استدلال سے کام چلتا تو فخرالدین رازی رحمتہ اللہ علیہ عارف ہوتے"

ترجمہ شیطان کو دیکھو اس نے حق تعالیٰ کی علامات یعنی نشانیاں بہت دیکھی ہیں

مثلاً بہشت' دوزخ' عرش' کرسی لیکن ان شواہد کے باوجود بھی معرفت حق تعالیٰ سے محروم رہا نیز حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ :

" اگر ہم کفار پر فرشتے بھی نازل کرتے اور مردے بھی ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی نعمتیں ان کے لئے جمع کر دیتے تو بھی وہ ایمان نہ لاتے جب تک کہ اللہ نہ چاہے"۔ (سورۃ الانعام آیت ۱۱۱)

اس لئے اگر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا دیکھنا اور استدلال سے ثابت کرنا معرفت حق کیلئے کافی ہوتا تو شیطان کو معرفت حاصل ہو جاتی لیکن نہ ہوئی۔ معرفت کا انحصار حق تعالیٰ کی مشیت پر ہے۔

اہلسنت و الجماعت کے نزدیک آیات (علامات) کا دیکھنا اور عقل کا صحیح ہونا معرفت کا ذریعہ ہے نہ کہ علت۔ معرفت کی علت حق تعالیٰ کی مشیت (مرضی) ہے۔

شرح ذریعہ یعنی سبب اور علت میں فرق ہے مثلاً آپ تعلیم حاصل کرنے کیلئے شہر لاہور میں جاتے ہیں تو ریل گاڑی پر سوار ہو کر جاتے ہیں۔ چنانچہ ریل گاڑی لاہور جانے کا ذریعہ کہلائے گی نہ کہ علت' لاہور جانے کی علت حصول تعلیم ہے اسی طرح علم اور عقل کے ذریعے معرفت حاصل ہو سکتی ہے لیکن اس کی اصلی علت حق تعالیٰ کی منشا ہو گی۔

ترجمہ اس لئے کہ اگر مشیت حق شامل حال نہ ہو تو عقل بھی نابینا ہو جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کو خود عقل کی معرفت نہیں ہے۔ عقلاء اور حکماء میں سے کسی کو آج تک عقل کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکی جب عقل خود اپنی حقیقت سے جاہل ہے تو دوسروں کو کیا پہچانے گی۔ نیز اگر عنایت حق و منشائے حق شامل حال نہ ہو تو استدلال اور غور و فکر اور آیات حق سے بھی معرفت حاصل

نہیں ہوتی کیونکہ تمام گمراہ فرقے اور ملحد لوگ اگرچہ استدلال میں کمال رکھتے ہیں اکثر معرفت حق سے بے بہرہ ہیں اور جن پر عنایت حق ہوئی وہ اہل معرفت ہیں۔

دراصل بندہ کا حقیقی راہنما اور دل کو کھولنے والا حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ باقی رہا دلائل کے ذریعے ہدایت حاصل کرنا قرآن کی رو سے اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب تک کہ حق تعالیٰ کی مشیت شامل حال نہ ہو' نہ عقلی دلائل سے ہدایت حاصل ہو سکتی ہے نہ قرآن پڑھنے سے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے[1]: "اگر کفار دنیا میں واپس بھیج دیئے جائیں تو پھر بھی وہ کام کریں گے جن سے ان کو روکا گیا تھا۔"

اسی طرح جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے معرفت کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا "میں نے حق تعالیٰ کو اس کے فضل سے پہچانا اور غیر اللہ کو اللہ کے نور سے پہچانا ہے۔" پس خدا تعالیٰ نے جسم کو پیدا فرمایا تو اس کو روح سے زندہ کیا پس جب عقل و استدلال کو جسم کے زندہ کرنے کی طاقت نہیں تو ناممکن ہے کہ دل کو زندہ کر سکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ[2] "ہم نے اس کے لئے نور پیدا فرمایا جس سے وہ چلتا پھرتا ہے"۔ نیز فرمایا کہ[3] "کیا وہ شخص جس کا دل حق تعالیٰ نے اسلام سے کھول دیا ہے اور اس کی وجہ سے وہ روشنی پر نہیں ہے"۔ اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ دل کھولنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ نیز فرمایا کہ[4] "اللہ نے مہر لگا دی ان کے قلوب پر' ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر"۔ پس جب دل کا کھولنا' بند کرنا' وسعت دینا' خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو ناممکن ہے کہ اس کی ہدایت کسی اور چیز میں ہو۔ علم و ہدایت حاصل کرنے کے جتنے ظاہری ذرائع ہیں سب اسباب کہلاتے ہیں علت نہیں کہلاتے۔ علت حق تعالیٰ کی رضا ہے جتنے اسباب و ذرائع ہیں راہ بُر ہو سکتے ہیں۔ راہبر نہیں ہو سکتے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا

---

[1] سورۃ الانعام آیت ۲۸ [2] سورۃ الانعام آیت ۱۲۲ [3] سورۃ الزمر آیت ۲۲ [4] البقرہ آیت ۷

ہے کہ " اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب کردیا اور اس کو تمہارے قلوب کی زینت بنایا "۔

یہاں بھی ایمان اور زینت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ منسوب کیا ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ تقویٰ سے معرفت حاصل ہوتی ہے تو تقویٰ بھی اللہ تعالیٰ کیطرف سے ہے۔ متقی خود بخود متقی نہیں بن جاتا اس سے ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کی عنایت کے بغیر معرفت کا حصول ممکن نہیں۔ حضرت ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں کہ۔

لا دلیل علی اللّٰہ سواہ انما العلم یطلب لاداب الخدمتہ (اللہ تعالیٰ کی معرفت کی دلیل (وجہ) خود اللہ تعالیٰ ہے۔ علم اس لئے حاصل کیا جاتا ہے کہ آداب بندگی معلوم ہوجائیں)۔ نہ کسی اور کو یہ قدرت حاصل ہے کہ کسی کو خدا تک پہنچا دے۔ ورنہ استدلال میں ابوطالب سے زیادہ کوئی کامل نہیں تھا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا دلائل پیش کرنے والا کوئی نہیں تھا لیکن جب مشیت ایزدی میں ہدایت ان کی قسمت میں نہ تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استدلال کامیاب نہ ہوا۔ یاد رہے کہ خود دلائل پیش کرنا ہی غیراللہ میں غور کرنا ہے۔ اور ہدایت کا حصول غیراللہ سے اجتناب ہے۔ تمام کام دلائل سے انجام پاتے ہیں یہ قاعدہ کلیہ ہے لیکن معرفت حق کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جب معرفت کا کمال یہ ہے کہ آخر عارف کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور حیرت طاری ہوجاتی ہے تو عقل کے ذریعے معرفت کیسے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہے جو بندہ کے قلوب کے قفل کھولتا ہے۔ اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ حادث (فانی) ہے اور حادث صرف حادث تک راہنمائی کرسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک راہنمائی اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ خالق

لے سورۃ الحجرات آیت ۷

مخلوق کے کسب (کوشش) سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جو کچھ کسب سے حاصل ہوگا وہ عقل کا مغلوب ہوگا اور حق تعالیٰ مغلوب نہیں ہوسکتا۔ عقل کا کمال یہ نہیں کہ وہ حق تعالیٰ کی ہستی کو ثابت کرے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ اپنی ہستی کی نفی کرے۔ پس عقل سے کام لینے والے کو معرفت علمی حاصل ہوگی اور عقل کی نفی کرنے والے کو معرفت حالی حاصل ہوگی اور وہ لوگ جو عقل کو معرفت کی علت سمجھتے ہیں ان سے پوچھو کہ عقل سے تم کو کونسی معرفت حاصل ہوئی ہے۔ بات یہ ہے کہ عقل کے ذریعے جو کچھ حاصل ہوتا ہے معرفت اس کی نفی کرتی ہے یعنی عقل کے ذریعے خداوند تعالیٰ کی ہستی کا جو تصور دل میں قائم ہوسکتا ہے وہ حقیقت حال کے برعکس ہوتا ہے۔ پس عقل کی کیا مجال ہے کہ حق تعالیٰ کو پاسکے۔

شرح عقل کے ذریعے اتنا پتہ چلتا ہے کہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آئی اس کے بنانے والا کوئی ضرور ہے۔ لیکن ذات و صفات حق تعالیٰ کو کماحقہ' سمجھنا عقل کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ عقل محدود ہے اور ذات حق لامحدود۔ منطق کا قاعدہ ہے کہ لامحدود محدود میں نہیں سما سکتا۔ لہٰذا عقل کے ذریعے خدا تعالیٰ کا جو تصور دل میں قائم ہوگا وہ تمہارا اپنا تراشا ہوا بت ہوگا۔ خدا نہ ہوگا۔ خدا وہ ہے جو وحی کے ذریعے خود انسان کو بتاتا ہے کہ میں کیسا ہوں اور کس طرح ہوں اور وحی کا نزول عنایت الٰہی ہے۔ کسبی نہیں ہے یعنی وحی کا نازل ہونا کسی کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔

ترجمہ چنانچہ عقل کے ذریعے جو کچھ معلوم ہوسکتا ہے وہم کے سوا کچھ نہیں۔ پس معرفت حق تعالیٰ کی توفیق اور عنایت سے حاصل ہوتی ہے۔ نہ اسباب سے بلکہ معرفت سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کا اپنا وجود اعتباری' عارضی اور موہوم ہے۔ لہٰذا جو خود موہوم ہے وہ حق کو کیسے پہچان سکتا ہے۔

شرح اور یہی انسان اور کائنات کا موہوم ہونا وحدت الوجود ہے۔ یعنی تمام موجودات وہمی ہیں حق تعالٰی کا وجود حقیقی ہے۔

ترجمہ ایک گروہ کا خیال ہے کہ معرفت الہام کا نتیجہ ہے یہ بھی ناممکن ہے کیونکہ معرفت ہی سے تو کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے کا علم ہوتا ہے لہٰذا معرفت سے پہلے آدمی کس طرح جان سکتا ہے کہ اس کا الہام صحیح ہے یا غلط۔ ایک کہتا ہے کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ خداوند تعالٰی لامکان ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ اسے مکان چاہئے۔ اب ان دو متضاد دعووں میں سے ایک صحیح ہوگا اور ایک غلط۔ ان دونوں میں سے کونسا صحیح ہے اور کون سا غلط۔ اس کے لئے ثبوت کی ضرورت ہے۔ اس لئے الہام سے کام نہیں چلتا یہ برہمنوں اور الہامیوں کے اقوال ہیں۔ میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا ہے کہ اس بارے میں بہت مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور اپنے متعلق پارسائی کے دعویدار ہیں لیکن وہ سب گمراہ ہیں اور ان کے عقائد کو اہل اسلام اور اہل کفر دونوں خلاف عقل سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ الہام کا دعوہ کرتے ہیں لیکن ان کا الہام ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی ان کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صرف وہ الہام غلط ہے جو خلاف شرع ہو تو میں کہتا ہوں کہ تم غلط کہتے ہو کیونکہ جب تم اپنے الہام کو شریعت کی رو سے پرکھتے ہو تو پھر معرفت کا انحصار شریعت اور عنایت حق پر ہوا نہ کہ الہام پر۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ معرفت حق فطرتی امر ہے یہ بھی غلط ہے کیونکہ اگر یہ چیز ہر انسان کی فطرت میں ہوتی تو پھر ذی عقل لوگوں کے درمیان اختلاف کیوں ہوتا۔ کیونکہ بعض لوگ خود حق تعالٰی کی ہستی کے منکر ہیں اور "تشبیہ" اور "تعطیل" کو روا رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ غلط ہے۔

شرح تشبیہ کے قائل وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کا جسم اور شکل و صورت ثابت کرتے ہیں۔ اہل مغرب اس عقیدہ کو ANTHROPOMORPHISM کے نام سے موسوم کرتے ہیں یعنی یہ سمجھنا کہ خدا انسان کی طرح جسم اور شکل و صورت رکھتا ہے۔ تعطیل سے مراد شاید عدم وجود ہے جو دہریت کے مترادف ہے۔

ترجمہ نیز اگر معرفت الٰہی فطری امر ہوتا تو اس پر سب لوگوں کو مکلف کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔ مثلاً خود اپنا وجود' زمین و آسمان' دن و رات' خوشی اور غمی وغیرہ ایسی فطری چیزیں ہیں کہ ان کے متعلق کسی کے دل میں شک و شبہ نہیں ہوتا اگر کوئی چاہے کہ ان کو نہ پہچانے تو ایسا نہیں کر سکتا کہ ان کو نہ پہچانے۔

لیکن بعض صوفیاء یقین کے غلبہ کی بناء پر کہتے ہیں کہ ہم نے فطری طور پر خدا کو پہچانا ہے یعنی اس یقین کامل کو فطرت کا نام دے دیتے ہیں تو اگرچہ بنیادی طور پر وہ سچ کہتے ہیں لیکن ان کا طرز بیان صحیح نہیں ہوتا کیونکہ فطری علم ہر شخص کو ہونا چاہئے نہ کہ صرف خواص کو۔ نیز فطری علم وہ ہے جو بغیر سبب کے ہر دل میں ہو اور اس کے لئے عنایت ایزدی کی ضرورت نہ ہو۔ لیکن معرفت کے لئے عنایت حق ضروری ہے۔

استاذ ابو علی دقاق رحمتہ اللہ علیہ اور شیخ ابو سہل سلوکی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے والد جو نیشاپور کے اکابر علماء میں شمار ہوتے ہیں فرماتے ہیں کہ معرفت کی ابتداء استدلال اور انتہا فطری تقاضا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ بہشت میں خدا تعالیٰ کی معرفت فطری ہوگی۔ لہٰذا اس دنیا میں کیوں اس سے مختلف ہو۔ علاوہ ازیں تمام انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں بھی جو حق تعالیٰ کی آواز سنتے ہیں یا ملائکہ کے ذریعے پیغام حاصل کرتے ہیں وہ بھی حق تعالیٰ کو فطری

تقاضے سے جانتے ہیں۔ اس کے متعلق میرا جواب یہ ہے کہ جہاں تک بہشت میں لوگوں کا تعلق ہے وہاں شریعت کے احکام ختم ہوجائیں گے اس لئے لوگ حق تعالیٰ کو فطری طور پر پہچان لیں گے اور جہاں تک انبیاء علیہم السلام کا تعلق ہے ان کو حق تعالیٰ سے جدائی کا کوئی خوف نہیں ہوتا لہٰذا وہ اسی طرح محفوظ ہوتے ہیں جیسے اہل فطرت۔ لیکن معرفت اور مذہب کا کمال غیوب یعنی پوشیدگی میں ہے۔ اگر حقیقت ظاہر ہوجائے تو پھر ایمان لانا جبر یعنی خود بخود ضروری ہو جاتا۔ انکار کی کسی کو گنجائش نہ ہوتی۔ اس صورت میں شریعت کے تمام اصول درہم برہم ہوجاتے ہیں نہ کوئی مرتد ہوتا ہے نہ ابلیس نہ بلعم باعور اور نہ برصیصا کو مرتد کہا جاتا۔ لیکن حق تعالیٰ نے ابلیس کے مردود ہونے کی خبر ہمیں قرآن میں دی ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ شیطان نے قسم کھا کر کہا کہ تیری عزت کی قسم میں تمام اولاد آدم کو گمراہ کروں گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلام ہونا اور جواب سننا معرفت کی وجہ سے تھا۔ عارف کو گمراہی کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ عوام کے لئے خطرناک ہے لہٰذا اس کے متعلق زیادہ گہرائی میں نہیں جانا چاہئے۔ بس اس قدر جان لو کہ حق تعالیٰ کی معرفت اس کی عنایت کے بغیر نہیں ہوتی لیکن یہ بات ضرور ہے کہ معرفت کے متعلق کسی کا یقین زیادہ ہوتا ہے کسی کا کم۔ لیکن معرفت کم و بیش نہیں ہوتی۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں نقص ہے۔ معرفت میں تقلید نہیں۔ حق تعالیٰ کو اس کی صفات کمال سے پہچاننا چاہئے اور یہ بات حق تعالیٰ کے لطف و کرم سے حاصل ہوتی ہے' جس کے تصرف میں ہمارا قلب ہے۔ تو اپنے کسی عمل یا فعل کو معرفت کی علت قرار نہ دے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کو یہ قدرت ہے کہ ہمارے کسی فعل کو باعث ہدایت بنائے یا باعث گمراہی بنائے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک قوم کے لئے معرفت کی دلیل بن گئے اور دوسری کے لئے حجاب۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے کہا کہ وہ

خداوند تعالیٰ کے بندہ ہیں اور بعض نے کہا کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں۔ اس طرح بت، سورج، چاند ایک گروہ کے لئے حق کی دلیل ہوئے اور دوسرا گروہ حق سے محروم رہا۔ اگر دلیل (استدلال) معرفت کی علت ہوتی تو چاہئے تھا کہ ہر دلیل لانے والا عارف ہوتا جو کھلی گمراہی ہے پس استدلال معرفت کا ذریعہ ہے علت نہیں ہے۔ مجھے اپنی جان کی قسم ہے کہ علت کا ثابت کرنا عارف کے لئے معرفت الٰہی میں زنار ہے اور غیر حق کی طرف توجہ کرنا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ : "جس[1] کو اللہ نے گمراہ کیا اس کے لئے کوئی ہادی نہیں ہوسکتا"۔

جس کی تقدیر میں لوح محفوظ میں گمراہی لکھی جاچکی ہے دلیل اور استدلال اس کو کیسے ہدایت پر لاسکتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے کہ **من التفت الی الاغیار فمعرفتہ زنار** (جس نے غیر کی طرف نظر کی اس کی معرفت زنار یعنی شرک ہے)۔ جو شخص قہر الٰہی میں مبتلا ہے حق تعالیٰ کے سوا کوئی چیز اس کو گلے سے پکڑ کر باہر نہیں نکال سکتی۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام غار سے نکلے تو دن کا وقت تھا اور دن کے وقت حق تعالیٰ کی معرفت کے حصول کے لئے کافی دلائل و براہین موجود تھے۔ اگر دلائل سے معرفت کا حصول ممکن ہوتا تو آپ کو دن میں معرفت حاصل ہوجاتی۔ لیکن جب رات ہوئی تو آپ نے ستارہ دیکھا اور معرفت حاصل کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جب چاہتا ہے بندہ کو اپنی طرف راہ دکھاتا ہے اور اپنی معرفت سے اس کو آگاہ کرتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ عارف اپنی معرفت کا دعوہ کرتا ہے (یعنی اس کو اپنا کمال سمجھتا ہے)۔ اب یہ دعوہ اس کے لئے آفت بن جاتا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے درمیان حجاب حائل ہوجاتا ہے۔ اس وجہ سے حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ : "عارف لوگ تو اپنی معرفت پر فخر کرتے ہیں اور میں اپنی جہالت کا اقرار

---

[1] سورۃ الاعراف آیت ۱۸۶

کرتا ہوں"۔

اس لئے معرفت کا دعوہ ہرگز نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ موجب ہلاکت ہے البتہ معرفت کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے جو نجات کا باعث ہے۔

فصل

معرفت کے متعلق مشائخ کے اسرار و رموز

یاد رہے کہ مشائخ نے معرفت کے متعلق بہت اسرار و رموز بیان فرمائے ہیں جن میں سے چند یہاں بیان کئے جاتے ہیں تاکہ فائدہ حاصل ہو۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"معرفت یہ ہے کہ عارف کو کسی چیز سے تعجب نہ ہو"۔

تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی قدرت سے زیادہ کوئی کام کر دکھائے۔ اب چونکہ حق تعالیٰ کو ہر چیز پر کمال قدرت حاصل ہے اس لئے عارف کو کسی عجیب سے عجیب چیز پر بھی تعجب نہیں آنا چاہئے۔ البتہ اگر تعجب کرتا ہے تو اس بات پر تعجب کرنا چاہئے کہ حق تعالیٰ نے مشت خاک (انسان) کو کن کمالات سے آراستہ فرمایا ہے اور ایک خون کے قطرہ کو اتنے بڑے مدارج سے سرفراز فرمایا کہ حق تعالیٰ کی معرفت اور قرب و وصال کا طلبگار ہوا۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندہ کو اپنے اسرار و رموز سے آگاہ فرماتا ہے بذریعہ لطائفِ انوار۔"

لطائفِ انوار کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ قلبِ بندہ کو از راہ کرم اپنے

نور سے منور کرتا ہے اور تمام آفات سے محفوظ رکھتا ہے جس کی وجہ سے ساری کائنات کی قدر و قیمت اس کے سامنے رائی کے دانہ کے برابر ہوجاتی ہے اور ظاہری و باطنی مشاہدات اس پر غلبہ نہیں کرتے۔ جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو تمام غیب کی چیزیں اس پر آشکارا ہوجاتی ہیں۔

حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

المعرفتہ دوام الحیرۃ (معرفت دائمی حیرت کا نام ہے)

حیرت کی دو قسمیں ہیں ایک ہستی کے متعلق دوسری چگونگی (کیفیت) کے متعلق۔ ہستی میں حیرت کفر و شرک ہے اور چگونگی میں حیرت معرفت ہے۔ اس لئے کہ حق تعالی کی ہستی کے متعلق عارف کو نہ شک ہوتا ہے نہ حیرت۔ لیکن اس کی چگونگی میں عقل کی کیا مجال ہے کہ سمجھ سکے۔ یعنی حق تعالی کی ہستی میں یقین اور اس کی کیفیت اور ماہیت میں حیرت۔ اس لئے ایک بزرگ نے فرمایا ہے :

یا دلیل المتحیرین زد نی تحیرا (اے حیرت زدوں کے راہنما میری حیرت کو زیادہ کر)۔

یعنی پہلے حق تعالی کی ہستی کا یقین کیا اور پھر حیرت میں اضافے کی درخواست کی کیونکہ عقل حق تعالی کی حقیقت و ماہیت سمجھنے سے عاجز ہے۔ یہ بات سخت لطیف (مشکل) ہے کیونکہ حق تعالی کی ذات میں تحیر سے بندہ اپنی ہستی کے متعلق متحیر ہوجاتا ہے۔ جب بندہ دیکھتا ہے کہ اس کی اپنی ہستی کے حرکات و سکنات سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں تو اس کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں کون ہوں جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے رب کو

پہچان لیا ہے)۔

یعنی جب اپنے آپ کو فنا سے پہچانا ' حق تعالیٰ کو بقا سے پہچانا۔ کیونکہ جب حالت فنا میں اس کی عقل و دانش ختم ہوجاتی ہے تو حیرت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" معرفت یہ ہے تو تجھے معلوم ہوجائے کہ تیری حرکات و سکنات حق تعالیٰ سے ہیں"۔

اور کسی شخص کو اس کے ملک میں اختیار نہیں ہے اور یہ کہ کوئی آدمی کوئی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ حق تعالیٰ اس کے دل میں اس کام کے کرنے کی توفیق پیدا نہ کرے اور یہ کہ انسان کے تمام افعال استعارۃً انسان کے افعال ہیں دراصل حقیقتاً حق تعالیٰ کے افعال ہیں۔ فاعل حقیقی وہی ہے۔

حضرت محمد بن واسع رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

من عرف اللہ قل کلامۂ و دام تحیرۂ (جس نے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرلی اس کا بولنا کم ہوجاتا ہے اور حیرت دائمی ہوجاتی ہے)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی اس چیز کے متعلق بات کر سکتا ہے جس کے متعلق کوئی بات ہو سکے اب چونکہ انسان کا دماغ محدود ہے اور ذاتِ حق لامحدود' اس لئے اس کے متعلق کوئی کہے تو کیا کہے۔ لہٰذا حیرت درحیرت کے سوا چارہ نہیں۔

حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

حقیقتہ المعرفتہ العجز عن المعرفتہ (معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ تو حصول معرفت سے عاجز آجائے)۔

جب حق تعالیٰ کی حقیقت و ماہیت معلوم نہ ہو تو اس کی متعلق بندہ کیا کہہ سکتا ہے۔ بعض جھوٹے دعویدار باوجودیکہ ان کے ہوش و حواس صحیح ہیں اور شریعت ان پر لاگو ہے یہ خیال کرتے ہیں کہ معرفت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی حقیقت معلوم کرنے سے عاجز آجانا اور چونکہ ہم اس سے عاجز آگئے ہیں اس لئے معرفت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قول صریحی گمراہی اور خسارہ ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کس چیز سے آپ لوگ عاجز آگئے ہیں۔ کیونکہ عجز کی دو علامات ہیں اور وہ دونوں تم میں موجود نہیں ہیں۔ اول یہ کہ تمہارے ہوش و حواس جاتے رہیں دوم یہ کہ حق تعالیٰ کی تجلیات کا غلبہ ہو جس کی وجہ سے نہ کوئی پہچان ہوسکتی ہے نہ تمیز۔ یہاں تک کہ عاجز یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ عاجز ہے۔ تم لوگوں کے ہوش و حواس بحال ہیں اور نہ تم غلبۂ تجلیات ربانی سے مغلوب ہو۔ جب تک غیر اللہ تمہارے دل میں بسا ہوا ہے تم معرفت سے عجز کا دعوہ کس منہ سے کرتے ہو۔

حضرت ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"جب سے میں نے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کی ہے میرے دل میں اندیشہ حق و باطل تک نہیں آتا۔"

حضرت ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"جس نے حق تعالیٰ کو پہچان لیا وہ دنیا سے علیحدہ ہوگیا بلکہ دنیا کے متعلق بیان کرنے سے گونگا ہوگیا۔ اور اپنے اوصاف سے فانی ہوگیا۔"

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ :

لا احصی ثنآء علیک (میں تیری صفت و ثناء بیان کرنے سے عاجز ہوں) اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ :

انا افصح العرب و العجم (میں عرب اور عجم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں) اس کا راز یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ حضوری پر فائز تھے تو آپ نے مناجات کیں کہ یا اللہ عزوجل میں تیری حمد و ثناء بیان کرنے سے عاجز ہوں' پس تو ویسا ہے جیسا کہ تونے ہمیں اپنے متعلق خبر دی ہے۔ اس پر فرمان ہوا کہ اے محمدؐ اگر تو نہیں کہتا تو ہم خود کہتے ہیں کہ تیری جان کی قسم جب تو میری حمد و ثناء سے خاموش ہے تو سارے جہاں کا حمد و ثناء میں مشغول ہونا تیری طرف سے ثناء خوانی کے مترادف ہے یعنی سارا جہاں آپ کی بدولت میری حمد و ثناء کررہا ہے اور وہ آپ ہی کی حمد و ثناء ہے۔

غریبم یارسول اللہ غریبم
ندارم در جہاں جز تو حبیبم
بریں نازم کہ ہستم امتِ تو!
گنہگارم ولیکن خوش نصیبم

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما
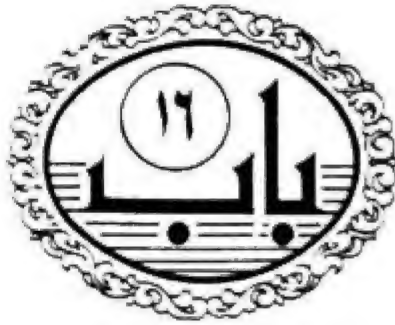
دوسرے پردہ کا کھولنا

توحید کے بیان میں

حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ : "تمہارا معبود ایک معبود ہے۔"[1]

نیز فرمایا کہ : "کہہ دیجئے کہ وہ اللہ احد (اکیلا) ہے۔"[2]

نیز فرمایا : "تم دو معبود اختیار مت کرو بلاشبہ وہ اکیلا معبود ہے۔"[3]

شرح حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو کبھی واحد کہا ہے اور کبھی احد۔ واحد اور احد کے درمیان فرق ہے واحد کے معنی ہیں ایک اور احد کے معنی ہیں اکیلا۔ لفظ اکیلا کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے سوا کوئی موجود نہیں ہے اور وہ اکیلا موجود ہے۔ اور یہ وحدت الوجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وجود صرف ایک ہے جو اللہ تعالیٰ کا وجود ہے باقی اشیائے کائنات اس کے ظل یعنی سایہ کی طرح ہیں۔

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۱۶۳ [2] سورۃ الاخلاص آیت ۱ [3] سورۃ النحل آیت ۵۱

وحدت الوجود کی شرح اس کتاب میں ہو چکی ہے۔

ترجمہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

" تم سے پہلے ایک شخص تھا جس نے توحید کے سوا کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو وصیت کی کہ جب میں مرجاؤں تو مجھے جلا کر میری خاک کو خشکی اور پانی میں پھینک دینا۔ انہوں نے اس کی وصیت پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی کو حکم دیا کہ جو کچھ تم کو اس خاک سے ملا ہے اس کو قیامت تک محفوظ رکھنا۔ جب وہ آدمی قیامت کے دن حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا تو حق تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا۔ وہ کہے گا کہ میں سخت گنہگار تھا۔ مجھے تیری جناب سے شرم آتی تھی اس لئے میں نے یہ کام کیا۔ تو حق تعالیٰ اس کو بخش دے گا۔"

یاد رہے کہ دراصل توحید کا مطلب ہے ایک کرنا اور ایک ماننا۔ یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ ایک ہے اور ذات و صفات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور نہ افعال میں اس کا کوئی شریک ہے۔ اہل توحید اس کو اسی صفت سے جانتے ہیں اور عقل نے بھی اسی یکتائی کو توحید کہا ہے۔

شرح ذات و صفات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اب چونکہ وجود بھی حق تعالیٰ کی ایک صفت ہے لہٰذا صفتِ وجود میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہونا چاہئے ورنہ وہ لاشریک فی صفت الوجود نہیں رہے گا اس لئے جملہ مشائخ وحدت الوجود کو حق سمجھتے ہیں اور قرآن و حدیث میں بھی اس کے شواہد کثرت سے موجود ہیں کہ وجود صرف ایک ذاتِ حق کا وجود ہے باقی تمام اشیاء کا وجود ظلی، اعتباری اور اضافی ہے۔ اگر کائنات کے وجود کو حق تعالیٰ کے وجود سے الگ تصور کیا جائے تو اس سے ذاتِ حق کی صفتِ لامحدودیت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اس

کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے لیکن کائنات کی اشیاء میں نہیں ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ محدود ہے اور حق تعالیٰ کو محدود ماننا کفر ہے۔ اس لئے وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ وجود حق میں وجود کائنات شامل ہے۔ یعنی ہر چیز نہ خدا ہے نہ خدا سے جدا ہے۔

(ترجمہ) اقسامِ توحید

توحید کی تین قسمیں ہیں۔ اول حق تعالیٰ کا علم اپنی توحید کے متعلق یعنی جس طرح کماحقہٗ وہ ہے۔ دوم حق تعالیٰ کی توحید خلقت کے نقطۂ نگاہ سے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے بندہ کے دل میں توحید کا خیال اور جذبہ پیدا کر دینا۔ سوم خلقت کا علم اللہ تعالیٰ کے متعلق یعنی اس کی یکتائی اور وحدانیت سے آگاہ ہونا۔

پس یاد رہے کہ خدا تعالیٰ ایک ہے جو فصل و وصل سے بالاتر ہے دوئی اس پر صادق نہیں آتی' اس کا ایک ہونا عدد کے لحاظ سے نہیں کہ کسی اور کے وجود کے ساتھ مل کر دو وجود ہو جائیں۔ وہ محدود نہیں ہے جو جہات میں گھر سکے۔ وہ لامکان ہے جو کسی جگہ میں سما نہیں سکتا۔ کیونکہ اگر اس کے لئے مکان ہوتا تو پھر مکان کے لئے بھی اور مکان ہوتا جس سے حکم فاعل و فعل' قدیم و حادث باطل ہو جاتا۔ وہ عرض نہیں جو جوہر کا محتاج ہو۔ وہ جوہر بھی نہیں ہے جو عرض کا محتاج ہو۔ وہ طبعی نہیں جس سے حرکات و سکنات پیدا ہوں۔ وہ روح نہیں جو جسم کا محتاج ہو۔ وہ جسم سے پاک ہے جس کے اعضاء ہوں۔ وہ اشیاء کے اندر حائل نہیں جس سے وہ اشیاء کا ہم جنس بن جائے۔ وہ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں جس سے نظریہ اتحاد ثابت ہو سکے۔ وہ ہر نقص سے منزہ اور خامی سے بالاتر ہے۔ وہ تمام خامیوں اور نقائص سے پاک ہے۔ اس کے مانند یا مثل کوئی نہیں جس سے اپنے مانندہ کے ساتھ مل کر دو ہو جائے۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں ورنہ وہ

جنس انسانی بن جاتا۔ اس کی ذات و صفات تغیر و تبدل سے پاک ہے جس سے اس کے وجود میں تبدیلی واقع ہو سکے۔ وہ ان صفاتِ کمال سے متصف ہے جس کی خبر اس نے مومنین اور موحدین کو دی ہے۔ وہ ان تمام صفات سے بری ہے جو کافر لوگ اس سے منسوب کرتے ہیں حالانکہ وہ اس کی صفات نہیں ہیں۔ وہ حی (ہمیشہ رہنے والا) ہے' علیم ہے' رؤف ہے' رحیم ہے' مرید (ارادہ رکھنے والا) ہے' قدیر ہے' سمیع ہے' بصیر ہے' متکلم ہے' باقی ہے' اس کا علم اس کے اندر حائل نہیں ہے نہ اس کی قدرت اس کے اندر ٹھونسی گئی ہے نہ ہی اس کی سماعت و بصارت اس کے ساتھ متصل ہے۔ اس کے کلام میں نہ تبعیض ہے نہ تجدید۔ وہ ہمیشہ سے اپنی صفات سمیت قدیم ہے۔ نہ کوئی علم اس کے علم سے باہر ہے نہ کوئی موجود اس کے ارادہ سے خارج ہے۔ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی چاہتا ہے جو جانتا ہے اس میں مخلوق کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کا ہر حکم صحیح ہے جو اس کے دوست بہ سروچشم قبول کرتے ہیں وہ خیر و شر کا پیدا کرنے والا ہے اور خوف و امید اسی کی ذات سے ہے۔ نفع و نقصان کا خالق بھی وہی ہے' اس کا ہر حکم حکمت ہے۔ نہ کوئی اس کو پاسکتا ہے نہ اس تک کسی کی رسائی ہے (یعنی کما حقہٗ)۔ بہشتیوں کو اس کا دیدار ہو گا لیکن آمنے سامنے ہونا نہ ہو گا اور نہ شکل و صورت جہت کا تصور ہو سکے گا۔ دنیا میں اولیاء اللہ کو مشاہدہ حق ہو سکتا ہے۔ (دیدۂ بتر سے نہ دیدۂ سَر سے)۔

جو شخص حق تعالیٰ کے ان اوصاف تسلیم کرتا ہے اہل حق ہے اور جو تسلیم نہیں کرتا دین سے خارج ہے۔ اس مضمون پر کافی بحث باقی ہے لیکن طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیا گیا ہے اور میں علی بن عثمان جلابی اس باب کے شروع میں کہہ چکا ہوں کہ توحید کا مطلب ہے کسی چیز کو ایک جاننا اور یہ بات علم کے بغیر ناممکن ہے۔ اہلسنت والجماعت نے صحیح طور پر مسئلہ توحید کو سمجھا ہے۔

جب انہوں نے حق تعالیٰ کی قدرت کے عجیب و غریب کرشمے دیکھے تو لامحالہ وہ فاعل حقیقی کے قائل ہوئے کیونکہ کوئی چیز بغیر فاعل کے وجود میں نہیں آ سکتی ظاہر ہے کہ یہ جہان' یہ زمین و آسمان' یہ آفتاب' مہتاب' بر و بحر' پہاڑ' صحرا' دریا' انکے حرکات اور سکنات' انکی بقا و حیات ان تمام کے لئے کسی عظیم صانع کا ہونا ضروری ہے جو اکیلا ہے قائم بذات خود ہے' اور کسی غیر کا محتاج نہیں ہے۔ اب چونکہ ہر چیز کے لئے خالق کی ضرورت ہے اور اگر ایک سے زائد خالق ہوتے تو ایک دوسرے کے محتاج ہوتے اس سے ثابت ہوا کہ خالق کائنات وہی ایک ذات ہے اس لئے ہمارے عقائد ثنویوں سے (جو دوئی کے قائل ہیں) اس لئے مختلف ہیں کہ وہ نور و ظلمت کے قائل ہیں اور مجوسیوں سے اس لئے مختلف ہیں کہ وہ دو خداؤں کے قائل ہیں۔ یعنی یزدان اور اہرمن (نیکی اور بدی کا خدا)۔ اور نیچریوں سے اس لئے مختلف ہیں کہ وہ نیچر کی قوت کے قائل ہیں' اور نجومیوں سے اس لئے مختلف ہیں کہ وہ سات ستاروں کے قائل ہیں۔ اور معتزلیوں سے اس لئے مختلف ہیں کہ وہ بیشمار خالقوں کے قائل ہیں۔ ان تمام فرقوں کی ہم نے اپنی کتاب **الرعایتہ بحقوق اللہ** میں تردید کر دی ہے اس مسئلہ کے طالب کو اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے یا پھر علمائے اہلسنت والجماعت کی کتب سے۔ اب ہم توحید کے بارے میں مشائخ کے اسرار و رموز بیان کریں گے۔

فصل

توحید کے متعلق مشائخ کے اسرار و رموز

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"توحید نام ہے قدیم کو حادث سے علیحدہ کرنے کا"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو قدیم ہے اس کو حادث نہیں سمجھنا چاہئے اور جو حادث ہے اس کو قدیم نہیں جاننا چاہئے۔ حق تعالیٰ قدیم ہے اور تم حادث ہو۔ حادث اور قدیم کبھی ہم جنس نہیں ہو سکتے۔ جب کائنات کے وجود سے پہلے قدیم موجود تھا تو تخلیق کائنات کے بعد قدیم کیسے حادث کا محتاج ہو سکتا ہے۔ یہ عقیدہ ان لوگوں کے عقائد کی نفی کرتا ہے جو ارواح کو قدیم مانتے ہیں۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کسی چیز یا کسی شخص کے اندر اتر آیا ہے تو اس سے حق تعالیٰ کی قدامت پر حرف آتا ہے یہ دہریوں کا مذہب ہے۔ خدا پناہ دے۔ الغرض حق تعالیٰ کی توحید' قدرت اور قِدم کائنات کی تمام حرکات و سکنات میں نمایاں ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کے سوا کسی اور کو چاہنا اور اس کے بغیر کسی اور چیز میں خوش رہنا حد درجہ کی غفلت ہے۔

جب حق تعالیٰ تجھے پیدا کرنے میں کسی کا محتاج نہ ہوا تو تیری پرورش کرنے میں وہ کیوں کر کسی کا محتاج ہوگا۔ حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ :

اول قدم فی التوحید فناء التفرید (توحید میں پہلا قدم فنائے تفرید ہے) کیونکہ تفرید کا مطلب ہے کسی شخص کا آفات سے جدا ہونا اور توحید کا مطلب ہے کسی چیز کا ایک کرنا لہٰذا تفرید میں غیر کا ثابت کرنا جائز ہے اور حق تعالیٰ کے سوا کسی کو اس سے موصوف کرنا جائز نہیں اور وحدانیت میں غیر کا ثابت کرنا جائز نہیں۔ سوائے حق تعالیٰ کے کوئی اس صفت سے موصوف نہیں ہو سکتا پس لفظ تفرید مشترک ہے اور ممکن اور واجب تعالیٰ پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر توحید شرک کی نفی کرتی ہے۔ پس توحید میں پہلا قدم شراکت کی نفی ہے اور راستے سے غیر اللہ کو ہٹانا ہے کیونکہ توحید کے میدان میں غیر اللہ کی موجودگی ایسے ہے جیسے راستے کو چراغ کی روشنی میں تلاش کرنا۔

حضرت شیخ حصری رحمتہ اللہ علیہ کا بیان

حضرت شیخ حصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ہمارے اصول توحید میں پانچ چیزیں ہیں۔"

۱۔ حادث کی نفی
۲۔ قدیم کا ثابت کرنا
۳۔ ترک وطن
۴۔ ترک اخوان
۵۔ معلوم اور نامعلوم کو بھول جانا۔

حادث کی نفی سے مراد ہر اس چیز کا ترک کرنا ہے جو توحید کے منافی ہے۔

قدیم کے اثبات کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کو قدیم سمجھے۔ یہ بات حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے قول میں پہلے بیان ہو چکی ہے۔

ترک وطن سے مراد مالوفات نفس ولذات نفس کا ترک کرنا ہے۔ یہ عوام کے لئے ہے۔ خواص اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ کشف و کرامات کی لذات سے اجتناب کیا جائے۔

ترک اخوان کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی چیز کے ساتھ دل نہیں لگانا چاہئے کیونکہ غیر اللہ سے محبت حجاب بن جاتا ہے بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان۔ جس قدر محبت ہوگی اسی قدر بڑا حجاب ہوگا۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ توحید سے مراد ہر کام اللہ کی خاطر کرنا ہے اور تفرید اس کی نفی کا نام ہے۔

معلوم اور نامعلوم کو بھول جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کا علم یا تو اس کی ماہیت اور کیفیت یا جنس اور طبیعت کے متعلق ہوتا ہے لیکن توحید ان سب کوائف کی نفی کرتی ہے جو خداوند تعالیٰ کے متعلق انسان کا دماغ سوچ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہل علم کی نفی کا نام ہے۔ علم توحید انسانی دماغ سے بالاتر ہے۔ اگرچہ علم و جہل دونوں کا تعلق انسانی دماغ سے ہے تاہم علم صحیح تخیل کا

نام ہے اور جہل غلط تخیل کا۔

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حصری رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بیٹھا تھا اور آپ کسی مضمون پر گفتگو فرما رہے تھے۔ لیکن مجھے نیند آ گئی خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے آسمان سے اتر آئے ہیں اور حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ کی باتیں سن رہے ہیں۔ ایک فرشتے نے دوسرے سے کہا کہ جو کچھ یہ بزرگ بیان کر رہے ہیں توحید کے الفاظ ہیں نہ کہ خود توحید۔ چنانچہ جب میں خواب سے بیدار ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ توحید بیان کر رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اے فلاں توحید الفاظ کے بغیر بیان نہیں ہو سکتی۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا قول

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توحید کا مطلب یہ ہے کہ :

"تو خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں محض ایک مٹی کے پتلے کی طرح ہو جائے جس طرح وہ حکم چلائے۔ تجھے اس سے سروکار نہیں ہونا چاہئے نیز یہ کہ تم بحر توحید میں غرق ہو جاؤ اور خلق خدا کی مدح اور ذم کا خیال نہ رہے۔ اور پھر اس طرح مقام فنا فی اللہ کے حصول کے بعد نہ تو باقی رہے اور نہ تیرا اختیار۔ بلکہ جس طرح پیدائش سے پہلے نیست و نابود تھا اب بھی اسی طرح نیست و نابود ہو جائے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ مؤحد کو چاہئے کہ اپنا ارادہ اور اختیار حق تعالیٰ کے ارادہ اور اختیار میں مدغم اور اپنی ہستی کو ہستیِ حق میں گم کر دے۔ جیسا کہ یوم میثاق کے وقت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں تھا یہاں تک کہ سوال کرنے والا بھی وہ خود تھا اور جواب دینے والا بھی خود۔ جب یہ حالت ہو جاتی ہے تو تو کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا اس وقت نہ دعوت کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ دعوت قبول

کرنے کا۔ اس مقام کو فنا فی الصفات اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے' جس میں سالک غلبۂ قہر الٰہی سے مغلوب ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ ایک بے جان پتلے کی مانند بن جاتا ہے کہ اگر اس کے اندر نیزہ بھی چلایا جائے تو محسوس نہ ہو۔ اس حالت میں وہ اسرار الٰہی کا خزانہ بن جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا قول اللہ کا قول' اس کا فعل اللہ کا فعل بن جاتا ہے اور اس کی صفات اللہ کی صفات بن جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ تابع شریعت ہوتا ہے خواہ رسمی طور پر ہی سہی کیونکہ اس وقت وہ ذاتِ حق میں گم ہوتا ہے۔

شبِ معراج رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی حالت تھی کہ طویل مسافت کے باوجود آپؐ کو غایت درجہ کا قرب حاصل تھا آپؐ کی قربت بلا مسافت تھی۔ آپؐ کو قرب حق کا وہ مقام حاصل تھا کہ انسانی عقل و فہم اس کے سمجھنے سے عاجز ہے یہاں تک کہ عالم کون و مکان سے آپ بالاتر ہو گئے اور آپ نے اپنے آپ کو عالم بے چوں وچگون میں گم کر دیا۔ چنانچہ بے صفت و بے چوں ہو کر رہ گئے۔ جس سے آپ کی طبیعت مبارک اور مزاج میں تبدیلی آگئی۔ یہاں تک کہ آپ کا نفس' دل بن گیا۔ دل' جان بن گیا۔ اور جان' ستر (راز) بن گئی۔ اور ستر سراسر قرب میں مبدل ہو گیا چنانچہ آپ باہمہ اور بے ہمہ ہو گئے اور چاہا کہ ہمیشہ اسی حالت میں رہ جائیں۔ لیکن چونکہ حق تعالیٰ کا مقصد یہ تھا کہ آپ کو خلق خدا کے لئے نمونہ (مثالی شخصیت) بنایا جائے۔ فرمان ہوا کہ "اپنی حالت پر قائم ہو جاؤ"۔ یہ فرمان سنتے ہی آپ کے اندر طاقت آگئی یہ طاقت دراصل خدا تعالیٰ کی طاقت تھی جس سے آپ مقام فنا سے مقام بقا پر پہنچ گئے اور فرمایا :

انی لست کاحدکم انی ابیت عند ربی لیطعمنی و یسقینی (میں تم میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہوں میں اپنے رب کے ساتھ بسر کرتا ہوں وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے) میری زندگی اور پائندگی اسی سے قائم ہے نیز فرمایا :

لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل (مجھے حق تعالیٰ کے ساتھ وہ مقام حاصل ہے کہ جہاں نہ کسی مقرب فرشتے کی رسائی ہے نہ نبی مرسل کی)۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کا قول

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"اللہ تعالیٰ کی ذات اگرچہ صفت علم سے موصوف ہے تاہم نہ حواس ظاہری و باطنی سے اس کا ادراک ممکن ہے اور نہ وہ دنیا میں آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ موجود ہے بغیر حد و حلول کے حقیقت ایمان میں۔ البتہ آخرت میں اس کو ظاہراً" و باطناً" آنکھیں دیکھیں گی اس کے ملک اور قدرت میں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنی ذات کی حقیقت سے محجوب کر رکھا ہے اور اپنی قدرت کی نشانیوں کو مخلوق کی ہدائت کا ذریعہ بنایا ہے۔ عارفین کے قلوب اس کو پہنچانتے ہیں۔ عقلیں اس کو معلوم نہیں کر سکتیں اور مومن قیامت کے دن اس کا احاطہ اور ادراک کئے بغیر اپنی آنکھوں سے اس کا دیدار کریں گے۔"

اور یہ الفاظ جامع ہیں توحید کے تمام لوازمات پر ۔

قول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "توحید الٰہی کے متعلق سب سے بلند کلام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی معرفت کی طرف سوائے اعترافِ عجز کے اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا"۔

لیکن عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس قول سے معرفت کی نفی ہے۔ حالانکہ

منطق کی رو سے یہ امر محال ہے۔ کیونکہ عاجز ہونا موجود کے متعلق ہوتا ہے معدوم کے متعلق نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مردہ حیات سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ موت میں موت سے عاجز ہوتا ہے کیونکہ اس کی موت کو عجز کا نام دینا محال ہے۔ اس طرح اندھا بینائی سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ نابینائی میں بینائی سے عاجز ہوتا ہے۔ اور اپاہج کھڑا ہونے سے عاجز نہیں ہوتا۔ بلکہ بیٹھنے کی حالت میں وہ بیٹھنے سے عاجز ہوتا ہے۔ جیسے کہ عارف معرفت میں معرفت کے حصول سے عاجز آجاتا ہے۔ اس وقت معرفت کا حصول اس کے لئے ایک احتیاج بن جاتا ہے۔ پس ہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے قول کو اسبات پر محمول کرتے ہیں۔ یہ جو حضرت ابوسہل سعلوکی رحمتہ اللہ علیہ اور استاذ ابوعلی دقاق رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ کہ معرفت ابتداء میں کسبی ہوتی ہے اور انتہا میں لازمی بن جاتی ہے اور علم لازمی وہ ہے جو صاحب علم اس کو ٹالنے یا نہ ٹالنے سے عاجز ہوتا ہے۔ اس قول سے ظاہر ہے کہ توحید بندہ کے دل میں ایک فعل الٰہی ہے۔

حضرت شیخ ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ کا قول

شیخ ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"**التوحید حجاب الموحد عن جمال الاحدیتہ**" (توحید موحد کے لئے حجاب ہے۔ جمالِ احدیت سے۔)

اس کی وجہ یہ ہے کہ توحید فعلِ بندہ ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ فعل بندہ سے کشفِ حق ہو سکے اور جو چیز کشف حق میں مانع ہے وہ یقیناً حجاب ہے۔ انسان اپنی تمام صفات سمیت غیر اللہ میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اگر اس کی صفات کو حق تعالیٰ کی صفات قرار دیا جائے تو موصوف (انسان) خدا بن جاتا ہے۔ اور پھر واحد' موحد اور وحدت غیر اللہ نہیں رہتے اور یہ قوم نصاریٰ کی تثلیث کے مترادف ہے۔

جو صفت انسان کو مشاہدہ حق سے محجوب رکھے وہ خود حجاب ہے۔ اور جو محجوب ہے وہ موحد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ **لان ملسواہ من الموجودات باطل** (کائنات میں غیر اللہ کا وجود نہیں ہے۔) جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ غیر اللہ کا وجود باطل ہے تو جب تک سالک اپنے آپ کو غیر اللہ گردانتا ہے خود باطل ہے۔ کلمہ طیبہ **لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ** کا یہی مطلب ہے۔

یہ روایت مشہور ہے کہ جب حضرت ابراھیم خواص رحمتہ اللہ علیہ حضرت حسین بن منصور کی زیارت کے لئے کوفہ تشریف لے گئے تو شیخ منصور نے دریافت کیا کہ "اے ابرھیم آج تک تم نے کیا کیا ہے؟" انہوں نے جواب دیا کہ میں توکل درست کرنے میں لگا رہا۔

شیخ منصور رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ :

"تم نے اپنا باطن سنوارنے میں عمر ضائع کر دی توحید میں فنا کہاں گئی ؟"

صوفیائے کرام نے توحید کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ توحید فنا کا دوسرا نام ہے۔ لیکن فنا کے ساتھ معیت راست نہیں آتی۔ بعض کا قول ہے کہ فنا اور توحید متضاد چیزیں ہیں جیسے جمع و تفرقہ۔

اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ توحید حق تعالیٰ کی طرف بندہ کے لئے ایک راز ہے جو عبارت میں نہیں آسکتا۔ خاص طور پر وہ عبارات جو مبہم ہوں۔ مختصر یہ کہ توحید کے موضوع پر غیر اللہ کے وجود کو ثابت کرنا شرک ہے۔ اور موحد مشرک نہیں ہو سکتا۔ یہ ہیں احکام توحید ارباب معرفت کے نزدیک جو اختصار کے ساتھ بیان ہوئے۔ **(واللہ اعلم بالصواب)**

شرح یہ باب جس کا تعلق توحید باری تعالیٰ سے ہے کتاب ہٰذا کے مشکل ترین ابواب میں سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق ذات باری تعالیٰ

سے ہے جس کا کماحقہ، سمجھنا انسان کے لئے ناممکن ہے کیونکہ انسان محدود ہے اور ذات حق لامحدود ۔ لامحدود کا محدود کی سمجھ میں آنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر انسان کی روحانی آنکھیں روشن ہو جائیں تو وجود باری تعالیٰ کسی حد تک سمجھ میں آسکتا ہے۔ چنانچہ کتاب کشف المحجوب کا مقصد ہی یہی ہے کہ روحانی آنکھیں کھول جائیں تاکہ جو حقائق ظاہری آنکھوں سے پوشیدہ ہیں منکشف ہو جائیں۔

اس باب میں حضرت مصنف نے توحید کے متعلق دو قسم کے اقوال پیش فرمائے ہیں جو بظاہر متضاد نظر آتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو تضاد باقی نہیں رہتا ہے۔ مثلاً آپ نے شروع میں حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول پیش کیا ہے :

التوحید افراد القدیم عن الحادث (توحید کیا ہے ذات قدیم کا حادث سے جدا کرنا) اس کے بعد آپ نے حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول پیش کیا ہے :

اول قدم فی التوحید فناء التفرید "توحید میں پہلا قدم تفرید کو ختم کرنا ہے"

پہلے قول میں قدیم اور حادث کے فرق کو اجاگر کیا جا رہا ہے اور دوسرے قول میں اس فرق کو مٹانے کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے یہ تضاد بیانی نہیں ہے بلکہ دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے نقطہ نگاہ ' مسلک اور مقام کے مطابق بات کی ہے۔ حضرت منصور رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک وہی ہے جو حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک آخری مقام فنا فی اللہ ہے لیکن حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک آخری مقام بقا باللہ ہے اور یہ مسلک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ہے جس کو عبودیت' عبدیت' جامعیت اور فرق بعد الجمع کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اولیاء

امت کی زبردست اکثریت کا مسلک یہی بقاباللہ ہے۔ صرف گنتی کے چند اولیاء کرامؒ نے دائمی طور پر مقام فنافی اللہ پر قیام فرمایا۔ چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے قول کے مطابق مقام بقاباللہ کے حصول کی تلقین کی گئی ہے اور شیخ منصورؒ اور ان کے ہم مسلک شیخ شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے قول کے مطابق مقام فنا فی اللہ کی تلقین وارد ہوئی ہے۔ یہ تضاد بیانی نہیں بلکہ نقطہ نگاہ اور مقام کا فرق ہے۔

اب چونکہ حضرت سید علی ہجویری قدس سرہ کا مسلک باقی اکابرین اولیاء کے مطابق بقا باللہ ہے انہوں نے دونوں مسلکوں کو اپنی اپنی جگہ پر صحیح قرار دیا ہے کسی کی تردید نہیں فرمائی حالانکہ فنا فی اللہ درمیانی منزل ہے آخری منزل بقا باللہ ہے لیکن فنا فی اللہ بھی اپنی جگہ پر محبوب و مطلوب ہے۔

دوسری بات جو حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے اس باب میں فرمائی ہے یہ ہے کہ توحید کے مضمون میں غیر اللہ کا وجود ثابت کرنا شرک ہے۔ یہ بہت اہم اور ادق بات ہے جس کا روحانی ترقی کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ مختصر یہ کہ اس سے آپ کی مراد مسئلہ وحدت الوجود کا اثبات ہے۔ چونکہ قرآن و حدیث میں جا بجا ذات حق کو لامحدود کہا گیا ہے لہٰذا اگر کائنات کو غیر اللہ قرار دیتے ہوئے وجود حق سے علیحدہ اور الگ سمجھا جائے تو وجود حق محدود ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ کو محدود سمجھنا کفر اور شرک ہے کیونکہ کائنات کو غیر اللہ قرار دینے سے وجود حق پر حد مقرر ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ لا محدود ہے۔ اس لئے حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ :

(اثباتِ غیر اندر توحید اثباتِ شرک بود)

(کسی چیز کے وجود کو وجود حق سے باہر یا علیحدہ سمجھنا شرک ہے) یہی بات آپ نے کئی مقامات پر فرمائی ہے جس کی نشان دہی ہر مقام پر کر دی گئی ہے۔
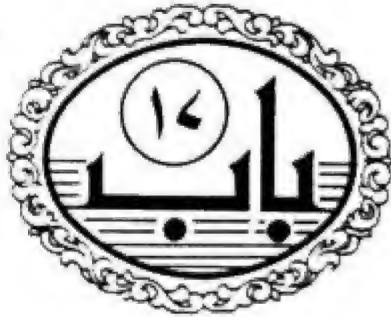
تیسرے پردہ کا اٹھنا

حق تعالی نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے :

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ

(اے ایمان والو' ایمان لے آؤ اللہ کے ساتھ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ)

قرآن میں متعدد بار یہی کلمات دہرائے گئے ہیں۔ نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے : **"الایمان ان تؤمن باللّٰہ و ملائکتہ و کتبہ"** (ایمان کیا ہے اللہ' ملائکہ اور اس کی کتابوں پر ایمان لے آنا)۔

لغت میں ایمان کا مطلب ہے تصدیق کرنا ۔ اس بارے میں علمائے امت میں اتفاق بھی بہت ہے اور اختلاف بھی۔ معتزلہ کے نزدیک لفظ ایمان میں علم و عمل دونوں شامل ہیں اس وجہ سے گنہگار کو وہ لوگ خارج از اسلام قرار دیتے ہیں۔ خوارج کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جس سے گناہ صادر ہو اس کو کافر قرار دیتے

ہیں۔

ایک اور فرقے کے نزدیک ایمان صرف زبانی اقرار کا نام ہے (عمل کی ضرورت نہیں) ایک اور فرقے کے نزدیک ایمان سے مراد صرف معرفت حق ہے۔ جب کہ سنی متکلمین کے ایک گروہ کے نزدیک ایمان سے مراد تصدیق ہے۔ اس موضوع پر میں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ یہاں ایمان سے میری مراد وہی ہے جو مشائخ صوفیاء کا عقیدہ ہے۔ اس سلسلے میں دو مکاتب فکر ہیں جس طرح کہ فقہا کے دو مکاتب فکر ہیں۔ بعض مشائخ کے نزدیک جن میں حضرت خواجہ فضیل ابن عیاض' بشر حافی' خیر النساج' سمنون المحب' ابو حمزہ بغدادی اور ابو محمد حریری رحمتہ اللہ علیہم شامل ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان مشتمل ہے زبانی اقرار' قلبی تصدیق اور عمل پر۔ لیکن صوفیاء کے ایک گروہ مثل ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ' ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ' ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ' ابوسلیمان دارانی رحمتہ اللہ علیہ' حارث محاسبیؒ' جنید بغدادیؒ' سہل بن عبداللہ تستری' شقیق بلخیؒ اور محمد بن فضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک ایمان سے مراد اقرار لسانی اور تصدیق قلبی ہے۔ ان کے علاوہ فقہا کی ایک جماعت ہے جس میں امام مالک رحمتہ اللہ علیہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ' امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ شامل ہیں۔ وہ قول اول سے متفق ہیں اور امام ابو حنیفہ' حسن بن فضل بلخیؒ' اصحاب ابو حنیفہ مثل محمد بن حسن' داؤد طائی' امام ابو یوسف علیہم الرحمہ قول ثانی کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن ان کے مابین جو اختلاف ہے وہ صرف نزاع لفظی ہے۔ نزاع حقیقی نہیں ہے۔ اب میں اس کی تفصیل بیان کرتا ہوں تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ ان سب کا مقصد ایک ہے۔ صرف الفاظ کا فرق ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ مجھے یہ توفیق عطا فرمائے۔

فصل

ایمان کے متعلق

یاد رہے کہ اہلسنت و الجماعت اور اہل تحقیق و معرفت کے نزدیک ایمان کی ایک اصل (جڑ) ہے اور ایک فرع (شاخ)۔ ایمان کی اصل ہستی حق تعالیٰ کا دل کے ساتھ تصدیق (یقین) کرنا ہے۔ اور فرع سے مراد ہے اس دل کے یقین پر عمل پیرا ہونا۔ عربی زبان میں بعض اوقات کسی چیز کی فرع کو اصل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ آفتاب اصل ہے اور اس کی روشنی فرع ہے۔ لیکن عام لغت میں آفتاب کی روشنی کو آفتاب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے اعمال کو (جو فرع کا درجہ رکھتے ہیں) ایمان کا نام دیا جاتا ہے جس کے بغیر انسان سزا سے نجات نہیں پا سکتا۔ حالانکہ خالی تصدیق دل نجات کے لئے کافی نہیں۔ عمل بھی ضروری ہے۔ جس قدر عمل زیادہ کرے گا عقوبت دوزخ سے اسی قدر زیادہ امن حاصل ہو گا۔ اب چونکہ عقوبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے عمل ضروری ہے اعمال صالحہ کو ایمان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایک فرقہ کے نزدیک نجات کا ذریعہ معرفت ہے نہ کہ اعمال۔ اعمال بغیر معرفت بیکار ہیں۔ ہاں اگر معرفت حاصل ہے لیکن اعمال نہیں تاہم بندہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت سے نجات پاسکتا ہے۔ یا پھر سزا اسی قدر ملے گی جس قدر اس کے گناہ ہوں گے اور سزا بھگتنے کے بعد انسان دوزخ سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اصحاب معرفت خواہ مجرم کیوں نہ ہوں معرفت کی وجہ سے دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ لیکن اصحاب عمل معرفت کے بغیر صرف اعمال کی بنا پر بہشت کے مستحق نہ ہوں گے۔ پس

معلوم ہوا کہ صرف اعمال نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے۔

"تم میں سے کوئی اعمال کی وجہ سے نجات نہیں پائے گا۔ جب صحابہ نے پوچھا کہ کیا آپ بھی تو فرمایا ہاں میں بھی اعمال کے ذریعے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نجات پاؤں گا۔"

پس از روئے تحقیق و حقیقت اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ ایمان در اصل معرفت ہے تصدیق بالقلب و عمل صالح کے ساتھ۔ جو شخص حق تعالیٰ کو پہچانے گا اس کی صفات سے پہچانے گا۔ اور صفاتِ الٰہی کی تین اقسام ہیں۔ صفاتِ جمال، صفاتِ جلال اور صفاتِ کمال۔ جہاں تک صفات کمال کا تعلق ہے انسان کے لئے ان کو جاننا ممکن نہیں سوائے اس بات کے ہم سب حق تعالیٰ کے کمال کے معترف ہیں اور اسے ہر قسم کے نقص سے مبرا اور بالاتر سمجھتے ہیں۔ باقی رہی صفات جمال و جلال، ہر وہ شخص جس کی معرفت کا تعلق مشاہدہ جمال سے ہے وہ ہمیشہ طالب دیدار رہتا ہے اور جس کی معرفت مشاہدہ جلال پر مبنی ہے وہ ہمیشہ ہیبت زدہ رہتا ہے یہاں تک کہ اپنی صفاتِ بشری سے بھی نفرت کرتا ہے۔ پس جس طرح شوقِ دیدار محبت کی وجہ سے ہے اسی طرح صفات بشری سے نفرت بھی محبت کی وجہ سے ہے اس وجہ سے کہ صفات بشری سے آگاہی محبت کے بغیر ناممکن ہے اس سے ثابت ہوا کہ ایمان اور معرفت محبت کا دوسرا نام ہے اور محبت کی علامت (ظاہری صورت) طاعت ہے اس وجہ سے کہ جس طرح دل محل مشاہدہ ہے، اور آنکھ محل رویت ہے اور جان محل عبرت ہے اس طرح جسم بھی محل طاعت و عبادت ہونا چاہئے۔ جس شخص کا جسم تارک عبادت ہے اس کا دل محل معرفت نہیں ہو سکتا۔ لیکن آج کل ملحدین کے ایک گروہ نے یہ فتنہ پیدا کر دیا ہے کہ جب صوفیاء کے کمالات اور قدر و منزلت کو دیکھتے ہیں تو اپنے آپ کو بھی

انہی کی طرح سمجھنے لگتے ہیں اور یہ دعوے کرنے لگ جاتے ہیں کہ عبادت اس وقت تک ضروری ہے جب تک معرفت حاصل نہیں ہوتی' جب معرفت حاصل ہو گئی تو عبادت کی کیا ضرورت۔ لیکن یہ بہت بڑی غلطی ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جب تو نے حق تعالٰی کی معرفت حاصل کر لی اور اس کو پہچان لیا تو حق تعالٰی کے فرمان کی تعظیم بڑھ جانی چاہئے ہاں ہم یہ بات مانتے ہیں کہ طاعت گزار بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کو عبادت سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ شوق کی زیادتی کی وجہ سے اس پر عبادت آسان ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جس عبادت سے عام لوگوں کو زحمت ہوتی ہے بندۂ مومن کو اس سے راحت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات غایت عشق و محبت کے بغیر ممکن نہیں۔

نیز بعض لوگ ایسے ہیں جو ایمان کو خدا تعالٰی کی طرف سے سمجھتے ہیں اور بعض بندہ کی طرف سے۔ یہ اختلاف زیادہ تر علاقہ ماوراء النہر میں پایا جاتا ہے۔ پس جو لوگ ایمان کو من جانب اللہ خیال کرتے ہیں وہ عقیدۂ جبر کے قائل ہیں جس میں بندہ کو کوئی اختیار نہ ہو۔ اور جو لوگ ایمان کو بندہ سے منسوب کرتے ہیں وہ عقیدۂ قدر کے قائل ہیں۔ حالانکہ بندہ خدا کے عطا کردہ علم کے بغیر خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ اور حقیقت جبر اور قدر کے درمیان ہے۔ حقیقت میں ایمان فعل بندہ ہے حق تعالٰی کی ہدایت سے۔ کیونکہ جس کو خدا تعالٰی گمراہ کرے وہ راہ راست پر نہیں آسکتا اور جس کو حق تعالٰی ہدایت دے وہ گمراہ نہیں ہو سکتا جیسا کہ حق تعالٰی نے فرمایا ہے : فَمَنْ يُّرِدِ...

"جس شخص کو اللہ تعالٰی ہدایت دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرتا ہے اس کے سینہ میں سختی اور تنگی پیدا کر دیتا ہے"
اس اصول کے تحت ایمان یا اسلام کی طرف مائل کرنا اللہ کا فعل ہے اور مائل ہونا بندہ کا فعل ہے۔ پس دل کے مائل ہونے کی علامت دل میں اعتقاد توحید کا

راسخ کرنا ہے اور آنکھ کا حرام چیزوں سے پرہیز ہے۔ اور قدرت کے کرشموں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہونا ہے۔ اور کان کا حرام باتوں کے سننے سے پرہیز ہے۔ اور پیٹ کا حرام کھانے سے اجتناب ہے۔ زبان کا غلط باتوں کا ترک کرنا ہے۔ اور سارے جسم کا گناہ کے کاموں سے پرہیز ہے۔ تاکہ زبان سے جو دعویٰ کیا عمل اس کے مطابق ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرقے کے مطابق معرفتِ ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ لیکن امت کا اتفاق اس بات پر ہے کہ معرفتِ ایمان میں کمی بیشی ممکن نہیں۔ اگر معرفتِ ایمان میں کمی یا بیشی ممکن ہوتی تو لازماً معروف (ذاتِ حق) میں بھی کمی و بیشی ممکن ہوتی۔ حالانکہ جب خدا تعالیٰ میں کمی و بیشی ناممکن ہے تو معرفتِ ایمان میں کمی و بیشی کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر معرفت ناقص ہے تو وہ معرفت ہی نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کمی یا بیشی فرع یعنی اعمال میں واقع ہوتی ہے نہ کہ اصل ایمان میں۔ یعنی عبادت میں کمی و بیشی ہو سکتی ہے ایمان میں کمی و بیشی ممکن نہیں۔

لیکن فرقہ حشویہ جو اپنے آپ کو مذکورہ بالا دونوں فرقوں سے منسوب کرتے ہیں یہ قول قبول نہیں کرتے۔ حشویہ کا عقیدہ ہے کہ عبادت ایمان کا نام ہے۔ لیکن ان کے ایک گروہ کے نزدیک ایمان زبانی قیل و قال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ دونوں عقائد انصاف سے بعید ہیں۔ غرضیکہ ایمان در حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام اعضاء طلب حق میں مستغرق ہو جائیں۔ اور اس بات پر تمام اہل معرفت کا اتفاق ہے کہ جب معرفت کا غلبہ ہوتا ہے تو نسیان جیسی تمام خصائل کا خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ جہاں ایمان آیا نسیان رفو چکر ہوا۔ جیسا کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ :

اذا طلع الصباح عطل المصباح "جب آفتاب نکلتا ہے چراغ بے کار ہو جاتا ہے۔" روزِ روشن کو دلیل و بیان سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔

شرح جیسا کہ مولانا رومؒ نے فرمایا ہے ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

ترجمہ نیز حق تعالیٰ نے فرمایا ہے :

"[1]جب کسی مقام پر بادشاہوں کا گزر ہوتا ہے تو اسے تباہ کر دیتے ہیں"

(یہاں بادشاہ سے مراد غلبۂ معرفت اور فیضانِ حق ہے) جب عارف کے قلب میں آفتابِ معرفت طلوع ہوتا ہے شکوک و شبہات کا اندھیرا ختم ہو جاتا ہے۔ جس سے اس کے حواس مسخر ہو جاتے ہیں اس وقت وہ جو کچھ دیکھتا ہے' کہتا ہے یا کرتا ہے سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

شرح عارف رومیؒ فرماتے ہیں ؎

گفتہ او گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

ترجمہ روایت ہے کہ جب کسی نے حضرت ابراھیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے حقیقت ایمان کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ فی الحال میں اس کا جواب نہیں دیتا کیونکہ جو کچھ میں کہوں گا زبانی جمع خرچ ہو گا۔ لیکن میں حقیقی جواب دینا چاہتا ہوں۔ میں مکہ مکرمہ میں جا رہا ہوں تم میرے ساتھ چلو تا کہ مناسب وقت پر اپنے سوال کا جواب حاصل کرو۔ وہ آدمی کہتا ہے کہ میں ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جب ہم وسط صحرا میں پہنچے تو روزانہ غیب سے دو روٹی اور دو پانی کے پیالے آجاتے تھے۔ ایک مجھے عطا کرتے تھے اور ایک خود تناول فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دن گھوڑے پر سوار ایک بزرگ ظاہر ہوئے اور حضرت شیخ کو دیکھتے ہی گھوڑے سے اترے اور ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر کے گفتگو میں

---

[1] سورۃ النمل آیت ۳۴

مصروف ہو گئے۔ اس کے بعد وہ بزرگ گھوڑے پر سوار ہوئے اور چلے گئے۔ یہ دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ یا شیخ ذرا مجھے تو بتائیے کہ وہ بزرگ کون تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ تمہارے سوال کا جواب تھے۔ میں نے کہا کہ وہ کس طرح؟ انہوں نے فرمایا کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے جو میری صحبت اختیار کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے قبول نہ کیا۔ میں نے پوچھا کہ کس وجہ سے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے خوف لاحق ہوا کہ شاید ان کی صحبت کے بھروسہ پر میرے حق تعالیٰ پر بھروسے کو نقصان پہنچے اور میرا توکل تباہ ہو جائے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

" اور اللہ پر توکل کرو اگر تم مومن ہو "

اور شیخ محمد بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

الایمان تصدیق القلب بما علم به الغیوب " ایمان تصدیق قلب کا نام ہے جس سے امور غیب کا کشف حاصل ہوتا ہے "

ایمان بالغیب کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ حق تعالیٰ جسمانی آنکھوں سے نظر نہیں آتا اس کو باطنی آنکھوں سے دیکھنا اس وقت میسر آتا ہے جب تائید الٰہی حاصل ہوتی ہے چنانچہ عارفین کو معرفت اور علماء کو علم حق تعالیٰ کی رحمت سے حاصل ہوتا ہے کوشش سے حاصل نہیں ہوتا۔ پس جس کو معرفت حق حاصل ہے۔ مومن وہی ہے اور واصل بحق وہی ہوتا ہے۔ چونکہ اس مضمون پر کتاب ہٰذا میں بہت کچھ کہا گیا اس وقت اتنا کافی ہے۔ تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ اور یہ مقدار اہل بصیرت کے لئے کافی ہے۔ اب میں اعمال (معاملات) پر گفتگو کروں گا اور ان کے حجابات دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔
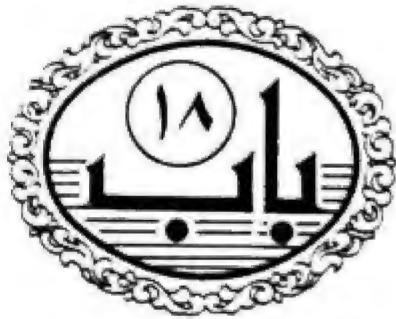
چوتھے پردہ کا کھولنا

طہارت کے بیان میں

ایمان باللہ کے بعد پہلی چیز جو بندہ پر فرض ہے طہارت ہے۔ طہارت سے مراد ہے جسم کو نجاست و جنابت سے پاک کرنا' ہاتھ' منہ اور پاؤں کا دھونا' سر کا مسح کرنا ہے یا اگر پانی نہیں ملتا یا مریض ہے تو شریعت کے مطابق تیمم کرنا۔ طہارت کے احکام سب کو معلوم ہیں۔

اقسام طہارت

یاد رہے کہ طہارت کی دو قسمیں ہیں یعنی ظاہری طہارت اور باطنی طہارت جس طرح جسمانی (ظاہری) طہارت کے بغیر نماز جائز نہیں اسی طرح باطنی طہارت کے بغیر معرفت ناممکن ہے نیز جس طرح جسمانی طہارت کا ذریعہ خالص اور پاک پانی ہے اسی طرح باطنی طہارت کے لئے خالص توحید کے پانی کی ضرورت ہے کہ جس میں شکوک و شبہات کی ملاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ چنانچہ

اولیاء کرام ہر وقت ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت یعنی توحید میں منہمک رہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا کہ ہمیشہ باوضو رہا کرو۔ دونوں فرشتے (کراماً کاتبین) تمہاری حفاظت کریں گے۔ نیز حق تعالیٰ نے فرمایا ہے : اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ...

" اللہ دوست رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور طہارت کے ساتھ رہنے والوں کو۔"

پس جو شخص ظاہری طہارت سے رہتا ہے ملائک اس کو دوست رکھتے ہیں اور جو شخص باطنی طہارت کے ساتھ یعنی توحید پر قائم رہتا ہے اس کو حق تعالیٰ دوست رکھتا ہے۔ نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتے تھے :

اللّٰھم طھر قلبی من النفاق "یا اللہ میرے قلب کو نفاق سے پاک رکھ" حالانکہ نفاق کا ہرگز آپ کے قلب مبارک پر گزر نہیں ہوتا تھا بات یہ ہے کہ انسان کا اپنی کرامات کو دیکھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک غیراللہ کو دیکھنے کے مترادف ہے اور غیراللہ کا دیکھنا اہل توحید کے نزدیک نفاق ہے۔

مشائخ نے جس قدر کشف و کرامات کو مریدین کی آنکھوں کا سرمہ بنایا ہے حصول کمال کے لئے بالآخر یہ چیز حجابِ اعظم ثابت ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز غیراللہ ہو اس کا مشاہدہ باعث فتنہ و فساد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے :-

نفاق العارفین افضل من اخلاص المریدین " عارفین کا نفاق مریدین کے اخلاص سے بہتر ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ مرید کے لئے بلند مقام کہلاتا ہے وہ کامل کے لئے حجاب ہے۔ مرید یہ کوشش کرتا ہے کہ کرامات حاصل ہوں اور کامل کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مکرم (حق تعالیٰ) تک رسائی ہو۔ غرضیکہ کرامات کا حصول

اہل حق کے لئے غلاق کا درجہ رکھتا ہے اس وجہ سے کہ یہ مشاہدۂ غیر ہے۔ پس حق تعالیٰ کے دوستوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ تمام گناہگار گناہوں سے نجات پائیں اور گناہگاروں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ تمام کافر کفر سے نجات پائیں۔ اگر کافروں کو معلوم ہو جائے کہ ان کا کفر خداوند تعالیٰ کو ناپسند ہے اور اگر گناہگاروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے گناہ خدا تعالیٰ کو ناپسند ہیں تو کافر کفر سے اور گناہگار گناہوں سے نجات پا سکتے ہیں اور تمام آفات سے پاک اور مطہر ہو سکتے ہیں لہٰذا ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت بے حد ضروری ہے۔ یعنی جب آدمی ہاتھ دھوئے تو دل میں خیال کرے کہ دنیا کی محبت سے ہاتھ دھو رہا ہے۔ جب استنجا کرے تو دل میں خیال کرے کہ دل کو بھی غیراللہ کی محبت کی نجاست سے صاف کر رہا ہے۔ اور جب منہ میں پانی ڈالے تو یہ سمجھے کہ غیراللہ کی بو تک سونگھنا حرام ہے اور جب منہ دھوئے تو خیال کرے کہ تمام مالوفات (پسندیدہ امور) سے منہ موڑ لیا ہے اور حق تعالیٰ سے دل لگا لیا ہے۔ جب بازو دھوئے تو یہ خیال کرے کہ تمام دنیاوی اغراض سے ہاتھ دھو ڈالے ہیں۔ اور جب سر کا مسح کرے تو یہ خیال کرے کہ اپنے تمام امور خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیئے ہیں۔ اور جب پاؤں دھوئے تو یہ خیال کرے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی چیز کی طرف نہیں جائے گا۔ تاکہ دونوں قسم کی طہارت (ظاہری و باطنی) حاصل ہو۔ کیونکہ ظاہری شریعت کے تمام امور عالم باطن سے وابستہ ہیں جیسا کہ ایمان کے معاملہ میں زبان سے ظاہری اقرار کے ساتھ باطنی طور پر تصدیق قلب بھی ضروری ہے اور عبادت کی ظاہری صورت دل میں خلوص نیت کے ساتھ وابستہ ہے۔

پس باطنی طہارت کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی بے ثباتی کو سمجھے' اسے اپنے حق میں غدار خیال کرے اور دل کو دنیا کی محبت سے خالی کر دے اور یہ چیز مجاہدات کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور سب سے زیادہ اہم مجاہدہ یہ ہے کہ ظاہری

شریعت کے احکام کی ہر حال اور ہر صورت میں پابندی کرے۔

حضرت ابراھیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" میری دعا ہے کہ حق تعالیٰ مجھے دنیا میں ابدی زندگی عطا کرے تاکہ جس طرح ساری خلقت دنیا کی نعمتوں میں مست ہے اور خدا کو بھول چکی ہے میں آداب شریعت بجالاؤں اور ہر وقت یاد خدا میں مست رہوں۔ "

روایت ہے کہ حضرت ابوبکر طاہر حرمی رحمتہ اللہ علیہ چالیس سال حرم مکہ میں مقیم رہے لیکن طہارت کے لئے حدود حرم سے باہر جاتے تھے اس خیال سے کہ جس سرزمین کو حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ منسوب کیا ہے اس پر طہارت کا پانی کیسے پھینکوں۔

حضرت ابراھیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب آپ مسجدِ رَے میں پیٹ کے درد میں مبتلا تھے آپ نے ایک رات کے اندر ساٹھ بار غسل کیا اور آخر غسل کرتے ہوئے وفات پائی۔

حضرت ابوعلی رود باری رحمتہ اللہ علیہ ایک مدت تک طہارت کے وسوسہ میں مبتلا رہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں دریا پر چلا گیا اور صبح تک وہاں رہا۔ چونکہ اس وقت میں غم میں مبتلا تھا میں نے پکار کر دعا کی کہ یا اللہ عافیت عطا فرما۔ ہاتف نے دریا کی طرف سے آواز دی کہ عافیت علم میں ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ بیماری کی حالت میں ایک نماز کے لئے ساٹھ مرتبہ طہارت کی اس خیال سے کہ جب دنیا سے جاؤں تو طہارت کے ساتھ جاؤں۔

کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے مسجد میں داخل ہونے کے لئے وضو کیا تو ہاتف نے آواز دی کہ ظاہری طہارت تو کی' باطن کو کب

آراستہ کرو گے۔ یہ سنتے ہی مسجد سے باہر چلے گئے۔ اور اپنا تمام مال خیرات کر دیا حتیٰ کہ ایک جوڑے پر اکتفا کیا۔ جس میں نماز ادا کرتے تھے۔ اس حالت میں جب حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا۔ اے ابوبکر تم نے بہت اچھی طہارت کی ہے۔ خدا تعالیٰ تجھے ہمیشہ باطہارت رکھے۔ چنانچہ آپ ساری عمر باوضو رہے حتیٰ کہ جب وفات کا وقت آیا تو آپ نے مرید سے کہا کہ مجھے وضو کراؤ۔ لیکن مرید ڈاڑھی کا خلال کرانا بھول گیا تو آپ نے ڈاڑھی کی طرف اشارہ کر کے خلال کروایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی بھی آداب وضو میں سے کوئی ادب ترک نہ کیا۔

حضرت ابویزید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جس وقت میرے دل میں دنیا کا خیال آتا ہے تو وضو کرتا ہوں اور جب آخرت کا خیال آتا ہے تو غسل کرتا ہوں اس وجہ سے کہ دنیا حادث ہے اس کے خیال کی وجہ سے وضو کی ضرورت ہے لیکن عقبیٰ کو بقا ہے اور اس کے خیال کی وجہ سے غسل ضروری ہے۔

حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک دن وضو کیا اور مسجد میں داخل ہونے کو تھے کہ اوپر سے آواز آئی کہ اے ابوبکر کیا تم کو اس قدر طہارت حاصل ہو گئی ہے کہ ہمارے گھر کے اندر آرہا ہے۔ یہ سن کر باہر نکل آئے۔ آواز آئی کہ ہماری درگاہ سے پیٹھ پھیر کر جا رہے ہو۔ کہاں جاؤ گے ؟ یہ سن کر انہوں نے نعرہ مارا۔ آواز آئی کہ تو ہم پر طعنہ زنی کرتا ہے۔ یہ سن کر کھڑے ہو گئے۔ آواز آئی کہ تو ہمارے سامنے صبر و تحمل کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس پر شبلیؒ نے کہا :

المستغاث منک الیک "یا خدا میں تجھ سے تیری بارگاہ میں فریاد کرتا ہوں"

طہارت کے موضوع پر مشائخ عظام کے بیشمار اقوال ہیں جن میں انہوں

نے مریدین کو طہارت ظاہری و باطنی کی تاکید فرمائی ہے تاکہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں رسائی ہو سکے۔ جو شخص ظاہری طور پر حاضر ہونا چاہتا ہے اسے ظاہری طہارت کی ضرورت ہے۔ جو شخص باطنی طور پر قرب حاصل کرنا چاہتا ہے اسے باطنی طہارت کی ضرورت ہے۔ ظاہری طہارت پانی سے ہوتی ہے اور باطنی طہارت توبہ اور شوق دیدار سے ہوتی ہے۔ اب ہم توبہ کے احکام بیان کریں گے تاکہ حقیقت معلوم ہو جائے۔

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا
او نشیند در حضور اولیاء
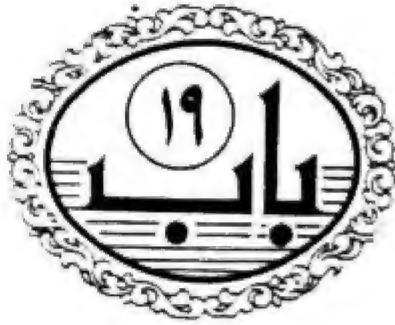
توبہ اور اسکے متعلقات کے بیان میں

حقیقتِ توبہ

یاد رہے کہ جس طرح عبادت کیلئے پہلا قدم طہارت ہے اسی طرح سالکانِ راہِ حقیقت کیلئے پہلا قدم توبہ ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ...

"اے ایمان والو توبہ کرو سچے دل سے۔" نیز فرمایا : وَتُوْبُوْآ...،

"اے ایمان والو توبہ کرو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تاکہ فلاح پاؤ"۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"اللہ تعالیٰ کو جوانی میں توبہ کرنے سے زیادہ محبوب چیز کوئی نہیں۔"

نیز فرمایا :

"توبہ کرنے والا ایسا ہے کہ جس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں" نیز فرمایا :

"جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوست رکھتا ہے اس کو کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا۔" پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ...

"اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو طہارت میں رہنے والوں کو۔"

جب صحابہ کرام نے پوچھا کہ توبہ کی علامت کیا ہے تو فرمایا کہ ندامت اور یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ گناہ' دوستانِ خدا کو نقصان نہیں دیتا اس کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن گناہ سے کافر نہیں ہو جاتا اور اس کے ایمان میں خلل نہیں آتا۔ کیونکہ وہ گناہ جس کا انجام نجات ہے حقیقت میں نقصان دہ نہیں ہوتا۔

یاد رہے کہ لغت عرب میں توبہ کا مطلب رجوع کرنا۔ چنانچہ تاب کے معنی ہیں **رجع** (رجوع کیا) پس توبہ کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کے خوف سے خدا کے منع کردہ کام کو ترک کرنا اور اس کے حکم کو بجا لانا اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ندامت توبہ ہے اور یہ وہ قول ہے کہ جس میں توبہ کی تمام شرائط پنہاں ہیں اس وجہ سے کہ توبہ کی تین شرطیں ہیں اول حکم عدولی پر افسوس' دوم برے کام سے پرہیز' سوم گناہ نہ کرنے کا عزم اور لفظ ندامت میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں۔ جب دل میں ندامت پیدا ہوتی ہے تو باقی دو شرطیں بھی خودبخود پیدا ہو جاتی ہیں۔

ندامت کے اسباب

توبہ کی طرح ندامت کے بھی تین اسباب ہیں ایک یہ کہ جب سزا کا خوف طاری ہوتا ہے تو بدکاری سے دل غمگین ہوتا ہے اور ندامت ہوتی ہے' دوم یہ کہ نعمت کا خیال دل میں آتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گناہ کی وجہ سے نعمت

نہیں ملے گی جس سے پریشانی لاحق ہوتی ہے' سوم خداوند تعالیٰ سے شرم لاحق ہوتی ہے اور گناہ سے انسان پشیمان ہوتا ہے۔ پس ان میں سے پہلے شخص کو تائب کہا جائے گا' دوسرے کو منیب اور تیسرے کو اواب۔ اس لحاظ سے توبہ کی بھی تین اقسام ہوئیں' اول توبہ دوم انابت' سوم اوابت۔ توبہ سزا سے خوف کی وجہ سے ہوتی ہے۔ انابت طلب ثواب کیلئے اور اوابت فرمان خداوندی کی تعمیل کیلئے۔ چنانچہ توبہ عام مسلمانوں کا مقام ہے جو گناہ کبیرہ کے ترک کا ارادہ ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ (سورۃ التحریم آیہ ۸)

"اے ایمان والو توبہ کرو اللہ تعالیٰ کی جناب میں سچی توبہ۔"

انابت مقام اولیاء اور مقربین ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے :

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ

"جو شخص رحمٰن سے ڈرا بن دیکھے اور رجوع کرنے والا دل لایا"

اور اوابت مقام انبیاء علیہم السلام ہے جیسا کہ (حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق) خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے :

نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ

"(سلیمانؑ) بہترین بندہ ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے"

اسی طرح توبہ نام ہے گناہ کبیرہ ترک کر کے عبادت اختیار کرنے کا۔ انابت کا مطلب ہے صغیرہ گناہ ترک کر کے محبت اختیار کرنا اور اوابت نام ہے خود کو چھوڑ کر خدا کا ہو جانا۔ لیکن ان تینوں باتوں میں بہت فرق ہے یعنی گناہ کبیرہ چھوڑ کر عبادت کی طرف آنے اور گناہ صغیرہ اور وساوس چھوڑ کر اللہ کی محبت اختیار کرنے اور اپنی خودی چھوڑ کر خدا کی طرف آنے کے درمیان فرق ہے۔

اصل توبہ اللہ تعالیٰ کی وعید کو دیکھ کر غفلت سے بیداری کی طرف آنے کا

نام ہے جب اپنی زبون حالی کو دیکھ کر اسے ترک کرتا ہے تو اللہ تعالی اس پر توبہ آسان کر دیتا ہے اور معصیت کی بدبختی سے نکال کر عبادت کی حلاوت عطا کرتا ہے۔

نیز اہلسنت و الجماعت اور جملہ مشائخ کا عقیدہ ہے کہ اگر انسان ایک گناہ سے توبہ کر لے اور دوسرا گناہ کرتا رہے تو اس کو پہلی نیکی کا ثواب ملتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ توبہ کی برکت سے دوسرے گناہ بھی خود بخود ترک ہو جائیں مثلاً ایک شخص ایسا ہے جو شراب بھی پیتا ہے اور زانی بھی ہے اب اگر وہ زنا سے توبہ کرتا ہے لیکن شراب پیتا رہتا ہے تو اس صورت میں اس کی زنا سے توبہ درست سمجھی جائے گی خواہ دوسرا گناہ بھی کرتا ہے لیکن معتزلہ میں سے فرقہ تھشمیان کا خیال یہ ہے کہ تمام گناہوں سے توبہ کئے بغیر توبہ درست نہیں ہوتی لیکن یہ بات محال ہے کیونکہ بندہ جو گناہ کرتا ہے اس کی اس کو سزا ملے گی۔ جب ایک گناہ سے توبہ کرتا ہے تو اس کی سزا سے بچ جاتا ہے۔ جیسے اگر انسان ایک فرض ادا کرتا ہے اور دوسرے فرائض ترک کرتا ہے تو جس فرض کو ادا کرتا ہے اس کا ثواب اس کو ملتا ہے اور جو فرض ترک کرتا ہے اس کی سزا پاتا ہے۔ نیز جو شخص آلۂ معصیت نہیں رکھتا اور نہ گناہ کی اس کو طاقت ہے اگر وہ اس گناہ سے توبہ کرتا ہے تو وہ بھی تائب کہلائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توبہ میں اصل چیز ندامت ہے چنانچہ توبہ سے اس کو ندامت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس ندامت کی وجہ سے دیگر گناہوں سے بھی پرہیز کا ارادہ رکھتا ہے۔ خواہ آلۂ معصیت یا اسباب معصیت ہوں یا نہ ہوں۔ وہ معصیت کی طرف نہیں جائے گا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ توبہ کی تعریف اور اس کی صحت کے متعلق مشائخ کے درمیان بھی کچھ اختلاف ہے مثلاً حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر مشائخ کے نزدیک توبہ یہ ہے۔

التوبۃ ان لا تنسی ذنبک

"توبہ یہ ہے کہ تو اپنا گناہ نہ بھول جائے"

اور ہمیشہ اس کی پشیمانی دل میں رہے خواہ کتنی زیادہ نیکیاں کرے ان پر مغرور نہ ہو جائے کیونکہ برے کام کا غم اچھے اعمال سے زیادہ ضروری ہے۔ ایسا شخص ہرگز غرور میں مبتلا نہیں ہوتا جو اپنے سابقہ گناہوں کو یاد رکھتا ہے۔

اس کے برعکس بعض مثل جنیدؒ اور دیگر مشائخ کا اصول یہ ہے کہ **التوبۃ ان تنسی ذنبک** "توبہ یہ ہے کہ تو گناہ بھول جائے" اس وجہ سے کہ تائب محب خدا اور صاحب مشاہدہ ہوتا ہے اور مشاہدہ کے دوران گناہ کا یاد رہنا محرومی ہے۔ اس مضمون پر مذہب سہلیاں کے عنوان کے تحت کافی بحث ہو چکی ہے وہاں دیکھنا چاہئے۔

جو شخص تائب کو قائم بخود سمجھتا ہے وہ گناہ کی فراموشی کو اس کی غفلت سے منسوب کرتا ہے اور جو شخص تائب کو قائم بحق سمجھتا ہے وہ گناہ کے یاد کرے کو شرک کہتا ہے۔ غرضیکہ جب تک قائم بخود ہے اس کو اسرار حق سے آگاہی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر وہ قائم بحق ہے (یعنی فانی فی اللہ) ہے تو وہ خدا کے سوا کسی اور کا سوچ بھی نہیں سکتا چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قائم بخود تھے تو پکار اٹھے تُبْتُ اِلَیْکَ "میری توبہ ہے تیری درگاہ میں" اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قائم بحق تھے تو مقام فنا فی اللہ میں تھے اس لئے عرض کیا کہ **لا احصی ثناء علیک** "میں تیری شان بیان نہیں کر سکتا" دراصل فنا کے وقت گناہ کا یاد کرنا خود گناہ ہے۔ حقیقی تائب وہ ہے جو ذات حق میں گم ہو گیا جب گم ہو گیا تو گناہ کیسے یاد رہ سکتا ہے۔ گناہ کا یاد کرنا بھی گناہ ہے کیونکہ گناہ کے وقت بھی انسان خدا سے اعراض کرتا ہے اور گناہ کو یاد کرتے وقت بھی اعراض کا مرتکب ہوتا ہے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت

کتابیں پڑھیں ہیں لیکن اتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا کہ اس شعر سے ہوا ۔

اذا قلت ما اذنبت قلت مجیبتہ
حیواتک ذنب لا یقاس بہ ذنب

"جب میں نے محبوب سے کہا کہ میں نے کیا گناہ کیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ تیرا وجود ہی وہ گناہ ہے جس کے برابر کوئی گناہ نہیں۔"

جب عاشق کا محبوب کے سامنے وجود میں ہونا ہی گناہ ہے تو باقی صفات کا کیا ذکر۔

غرضیکہ توبہ تائید ربانی سے حاصل ہوتی ہے اور گناہ ایک جسمانی فعل ہے۔ جب دل میں ندامت پیدا ہوتی ہے تو اسے کوئی چیز نہیں ہٹا سکتی۔ جب شروع میں توبہ کو کوئی چیز نہیں روک سکتی تو آخر میں کیسے روک سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "اس[1] (آدم) نے توبہ کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو بڑا بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔" اس مضمون پر قرآن میں کثرت سے آیات ہیں جو اس قدر معروف ہیں کہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اقسام توبہ توبہ کی تین اقسام ہیں ۔

۱- گناہ چھوڑ کر نیکی کی طرف رجوع کرنا۔
۲- ایک نیکی چھوڑ کر اس سے بہتر نیکی کی طرف رجوع کرنا۔
۳- خودی چھوڑ کر حق تعالیٰ سے واصل ہونا۔

پہلی قسم کی توبہ کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا ہے :

"جو[2] لوگ گناہ کرتے ہیں وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور پھر اللہ کو یاد کر کے معافی مانگتے ہیں ....."

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۳۷ [2] سورۃ آل عمران آیت ۳۵

دوسری قسم کی توبہ کی مثال اس آیت سے ملتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تُبْتُ اِلَیْکَ "میں تیری درگاہ میں معافی کا طلبگار ہوں"۔

تیسری قسم کی توبہ کی مثال یہ حدیث ہے۔

و انہ لیغان علی قلبی و انی لاستغفر اللّٰہ فی کل یوم سبعین مرۃ

"جب میرے قلب پر غلبہ ہوتا ہے تو ستر مرتبہ دن میں توبہ کرتا ہوں"

شرح حضرت شیخ ابوالقاسم **قشیری** رحمتہ اللہ نے رسالہ **قشیریہ** میں اس کی شرح یوں بیان فرمائی ہے :

"جب میرے قلب پر تجلیات ربانی کا غلبہ ہوتا ہے تو درخواست کرتا ہوں کہ ستر پردے درمیان میں حائل کر دے"

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ لفظ **غفر** کے معنی ہیں پردہ۔ یعنی جب تجلیات ربانی ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں اور جل کر راکھ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ درمیان میں پردے حائل کر دے تاکہ بچ جاؤں۔

ترجمہ برے کام سے نیک کام کی طرف رجوع کرنا عوام کی توبہ ہے۔ کیونکہ گناہ بری چیز ہے اور گناہ سے توبہ کر کے نیکی کا ارادہ کرنا اچھا عمل ہے اور جب ایک اچھے کام سے توبہ کر کے زیادہ اچھے (خوب تر) کام کا ارادہ کیا جاتا ہے تو یہ خواص کی توبہ ہے کیونکہ راستے میں رک جانا اور آگے نہ بڑھنا بھی حجاب ہے لیکن اولیاء کرام کیلئے گناہ سے توبہ محال ہے کیونکہ ان سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک اچھے کام سے توبہ کر کے زیادہ اچھے کام کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حالت دیکھ لی۔ سارا جہاں تو دیدار الٰہی کی تمنا کر رہا ہے اور وہ اس سے توبہ کر رہے ہیں۔

شرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توبہ اس وقت کی جب آپ نے رب ارنی کہہ کر دیدار کی خواہش کی اور حق تعالیٰ سے جواب سنا کہ تجھے میرے دیدار کی طاقت نہیں ہے۔ البتہ میں پہاڑ پر اپنی ایک تجلی ڈالتا ہوں۔ دیکھو اس کو برداشت کر سکتے ہو۔ لیکن تجلی ظاہر ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بے خود اور محو ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو بارگاہ باری تعالیٰ میں عرض کیا کہ تُبْتُ اِلَیْکَ "یااللہ میری توبہ ہے۔"

ترجمہ اس وجہ سے کہ انہوں نے دیدار الٰہی کی طلب اپنے اختیار سے کی اور عشق میں اپنا اختیار کرنا آفت ہے اور آفت کا ترک کرنا حق کو اختیار کرنا ہے لیکن خلقت کو یہ نظر آیا کہ شاید انہوں نے دیدار سے توبہ کی ہے۔

اور اپنی خودی سے توبہ کر کے حق کے ساتھ واصل ہونا عاشقوں کا درجہ ہے اب جس طرح کہ اچھے کام کو ترک کر کے اس سے زیادہ اچھے کام کو اختیار کیا جاتا ہے اسی طرح دیدار اور بلند مقامات پر پہنچ کر عارفین ان سے زیادہ بلند مقامات پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہر لحہ بلند سے بلند تر مقامات کے لئے محو پرواز تھے۔ جب نیچے کے مقام سے ترقی کر کے اوپر کے مقام پر پہنچتے تو نیچے والے مقام سے توبہ کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

یاد رہے کہ توبہ کی قبولیت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ پھر کبھی وہ گناہ نہیں کرے گا اور توبہ کرنے والا توبہ کے بعد کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے تو بھی اس کو پہلی توبہ کا ثواب ملتا ہے۔ سالکین میں ایسے لوگ بھی ہو گزرے ہیں جو توبہ

کے بعد گناہ کے مرتکب ہوئے اور پھر توبہ کی۔ حتیٰ کہ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے ستر بار توبہ کی اور پھر معصیت میں مبتلا ہوا یہاں تک کہ اکہترویں بار توبہ پر کامیاب ہوا۔ حضرت ابو عمرو بن نجید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سب سے پہلے حضرت عثمان حیری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں توبہ کی۔ کچھ عرصہ توبہ پر قائم رہنے کے بعد معصیت میں مبتلا ہو گیا اور ان کی صحبت سے دور ہو گیا اور میں جس جگہ بھی ان کو دیکھتا تھا چھپ جاتا تھا۔ لیکن ایک دن ان کے سامنے آگیا تو انہوں نے فرمایا کہ بیٹا گناہ کی حالت میں دشمنوں کی صحبت سے پرہیز کرو کیونکہ جب وہ تیرے عیب دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور تجھے معصوم دیکھ کر غمگین ہوتے ہیں۔ اگر تجھے معصیت سے نجات نہیں ملتی تو ہمارے پاس آکر رہ تاکہ تجھے اس بلا سے نکالا جائے اور تمہارے دشمن کی مراد پوری نہ ہو۔ ان کی اس بات سے میرے دل سے گناہ کی رغبت جاتی رہی اور پکے طور پر تائب ہو گیا۔ نیز میں نے سنا ہے کہ ایک شخص توبہ کے بعد پھر گناہ کا مرتکب ہوا تو اس سے وہ بہت پشیمان ہوا ایک دن اپنے دل میں کہنے لگا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ حق تعالیٰ کی درگاہ میں پھر واپس آتا۔ اس پر ہاتف نے آواز دی کہ :

"تو نے ہماری اطاعت کی تو ہم خوش ہوئے تم نے ہمیں ترک کیا تو ہم نے تجھے مہلت دی۔ اب تم نے ہماری طرف رجوع کیا ہے تو ہم نے قبول کیا۔"

اب ہم مشائخ عظام کے اس بارے میں اقوال بیان کرتے ہیں رحمتہ اللہ علیہم اجمعین۔

فصل

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" عوام کی توبہ گناہوں سے ہوتی ہے اور خواص کی غفلت سے "

یعنی کہ عوام کی پرسش ظاہری اعمال کے متعلق ہو گی اور خواص کی پرسش حقیقت حال پر ہوگی کیونکہ جہاں عوام غفلت میں خوش ہوتے ہیں۔ خواص کے لئے غفلت حجاب بن جاتی ہے۔

حضرت ابو حفص حداد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

لیس للعبد فی التوبتہ شئی لان التوبتہ الیہ لا منہ

" توبہ میں بندے کو کوئی دخل نہیں کیونکہ یہ حق تعالیٰ کا عطیہ ہے نہ کہ بندے کی طرف سے ہے۔ "

اس وجہ سے کہ توبہ وہبی (عطیہ) ہوتی ہے نہ کہ کسبی (کوشش کا نتیجہ) یہی حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔

حضرت ابوالحسن بوشنجی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"توبہ یہ ہے کہ جب تو گناہ کا خیال کرے تو اس خیال سے لذت نہ ہو"

اس وجہ سے کہ گناہ کے خیال سے یا حسرت (غم) ہوتی ہے یا فخر۔ اگر گناہ کی یاد سے غم محسوس کرتا ہے تو یہ توبہ ہے۔ اگر فخر محسوس کرتا ہے تو یہ گناہ ہے۔ کیونکہ معصیت میں اتنا نقصان نہیں جتنا کہ اس پر اترانے سے ہوتا ہے کیونکہ گناہ کا ارتکاب ایک لمحہ میں ہوتا ہے اور لیکن اس پر فخر کی آفت دیر تک رہتی ہے اس لئے کہ جسم کے ساتھ گناہ کا ارتکاب تو تھوڑی دیر میں ہو جاتا ہے

لیکن دل میں اس کا احساس دیر تک قائم رہتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" توبہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ توبہ انابت اور توبہ حیاء۔ توبہ انابت یہ ہے کہ بندہ سزائے خداوندی کے خوف سے توبہ کرے اور توبہ حیاء یہ ہے کہ اس کی شان کریمی سے شرما کر توبہ کرے۔ پس توبۂ خوف نظارۂ کشف الجلال سے ہے اور توبہ حیاء نظارۂ کشف الجمال سے ہے۔ ایک آتش جلال میں جلتا ہے دوسرا جمال کے نور سے روشن ہوتا ہے ان میں سے ایک گروہ اصحاب سکر (مستی) کا ہوتا ہے ایک اصحاب صحو (ہوش) کا۔ اہل حیاء اصحاب سکر ہوتے ہیں اور اصحاب خوف اصحاب صحو۔ یہ مضمون بہت طویل ہے جس کو مختصر کر دیا گیا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

روزیکہ مقدسان خلکی مدفن
گردند باز سوار برمرکب تن
آغشتہ بخوں آلودہ کفن
از خاک سر کوئے تو خیزم من

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما
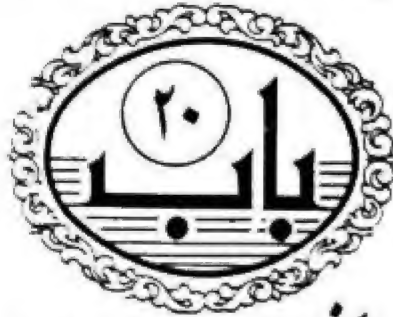
پانچویں پردہ کا اٹھانا

نماز کے بیان میں

خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو"[1]

نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

" نماز کا خیال رکھو اور وہ لوگ جو تمہارے ہاتھ میں غلام اور لونڈیاں ہیں۔"

لفظ صلوۃ (نماز) کے لغوی معنی ہیں ذکر اور فرمانبرداری لیکن فقہاء کی اصطلاح میں اس سے مراد یہی پنجگانہ نماز ہے جس کا حکم بارگاہ خداوندی سے صادر ہوا ہے۔ لیکن نماز سے پہلے طہارت (پاکی) شرط ہے۔ طہارت کی دو قسمیں ہیں، طہارت ظاہری جس کا مطلب ہے جسم سے ناپاکی کو دور کرنا۔ اور باطنی طہارت جس سے مراد خواہشات نفس سے نجات ہے۔ اس طرح کپڑوں کی طہارت ظاہری یہ ہے کہ ناپاکی کو دھویا جائے اور باطنی یہ کہ کپڑا رزق حلال سے ہو۔ تیسری طہارت جائے صلوۃ کا پاک ہونا ہے اس کی دو قسمیں ہیں اول یہ کہ

[1] سورۃ البقرہ آیت ۴۳

جس جگہ نماز ادا کی جائے نجاست سے پاک ہو' دوم یہ کہ وہ جگہ کفر و شرک و فتنہ فساد سے پاک ہو۔ نماز کی چوتھی شرط قبلہ کی طرف منہ کرنا ہے چنانچہ قبلہ ظاہر کعبہ ہے اور قبلہ باطن حق تعالیٰ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں مشاہدۂ حق حاصل ہو۔

شرح جیسا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نماز میں مرتبہ احسان (بہترین مرتبہ) یہ ہے کہ اس طرح نماز پڑھو کہ جیسے تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ اگر دیکھ نہیں سکتے تو یہ خیال کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ لیکن یہ مشاہدہ اور دیکھنا ظاہری آنکھوں سے نہیں ہو سکتا کیونکہ ظاہری جسمانی آنکھیں مادی ہیں اور وجود حق تعالیٰ غیر مادی ہے۔ مادی کیلئے غیر مادی کا مشاہدہ محال ہے بلکہ نماز میں یا نماز سے باہر مشاہدہ حق سے مراد چشم باطنی سے مشاہدہ ہے۔

ترجمہ نماز کی پانچویں شرط قیام ہے یعنی قیام ظاہر جسمانی قدرت (قوت) کے ساتھ اور قیام باطن قدرت حق کے ساتھ۔ اور نماز میں چھٹی شرط خلوص نیت ہے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں۔ ساتویں شرط تکبیر ہے مقام ہیبت اور فنا میں اور حصول مقام وصل میں۔ اور قرأت' قواعد تجوید اور عظمت کے ساتھ۔ رکوع' خشوع کے ساتھ اور سجود' عجز و نیاز کے ساتھ۔ سکون کے ساتھ التحیات میں بیٹھنا اور بشری صفات کے ساتھ فنا ہونے پر ثابت قدمی کی دعا مانگنا۔ روایات میں آیا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھتے تھے تو آپ کے قلب مبارک سے دیگ کے ابلنے کی سی آواز آتی تھی۔ اور جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے تھے تو آپ پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ اور فرماتے تھے کہ اب اس امانت کے برداشت کرنے کا وقت آگیا جس کو آسمان و زمین نہ برداشت کر سکے۔

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے حاتم اصم رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا

کہ آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ جب نماز کا وقت آتا ہے تو میں دو وضو کرتا ہوں ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ ظاہری وضو پانی سے کرتا ہوں اور باطنی وضو توبہ سے اس کے بعد مسجد میں داخل ہوتا ہوں اور اس بات کا مشاہدہ کرتا ہوں کہ بیت اللہ میں کھڑا ہوں۔ مقام ابراہیم میرے سامنے ہے بہشت میری دائیں طرف ہے' دوزخ میری بائیں طرف' پل صراط میرے قدموں کے نیچے ہے اور ملک الموت میرے پیچھے کھڑا ہے۔ اس کے بعد غایت تعظیم کے ساتھ اللہ اکبر کہتا ہوں' احترام کے ساتھ قیام کرتا ہوں' ہیبت کے ساتھ قرأت پڑھتا ہوں' عاجزی کے ساتھ رکوع کرتا ہوں' نیاز کے ساتھ سجدہ کرتا ہوں' صبر کے ساتھ تشہد میں بیٹھتا ہوں اور وقار اور شکر کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

فصل

اہل معرفت کی نماز

یاد رہے کہ نماز وہ عبادت ہے کہ جس کی بدولت **سالکین** ابتداء سے انتہا تک روحانی سفر طے کرتے ہیں اور بلند سے بلند تر مقامات طے کرتے ہیں اور نماز میں پورا سلوک الی اللہ دہرایا جاتا ہے۔ مثلاً **سالکین** کے لئے طہارت کی قائم مقام توبہ ہے' قبلہ رو ہونے کا قائم مقام شیخ طریقت کی اطاعت ہے' قیام میں صلوٰۃ کا قائم مقام مجاہدہ نفس ہے' تلاوت قرآن کا قائم مقام دوام ذکر ہے' رکوع کا قائم مقام صوفیاء کا عجز و انکسار ہے' سجود کا قائم مقام معرفت نفس ہے' تشہد کا قائم مقام سکون قلب ہے' سلام کا قائم مقام تفرید یعنی ترک دنیا ہے اور تمام علائق سے خلاصی۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کھانے پینے سے بالاتر ہو کر مقام کمال حیرت پر سراپا شوق ہو جاتے تو بلالؓ کو آواز دیتے کہ :

ارحنا یا بلال بالصلوٰۃ "اے بلال مجھے اذان سے آرام دلاؤ"

مشائخ عظام نے اس پر بہت بحث کی ہے اپنے درجات کے مطابق۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ نماز ذریعہ حضور (حضوری) ہے دوسرا کہتا ہے کہ نماز ذریعہ غیبت (غیوب) ہے۔ بعض حضرات ایسے ہیں جن کو نماز کے ذریعے حالت غیوب سے مقام حضوری حاصل ہوتا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کو نماز کی وجہ سے حضوری سے غیوب حاصل ہوتا ہے جیسا کہ اگلے جہاں میں رویت یعنی دیدار الٰہی کے وقت جو لوگ خود سے غیب ہوں گے حاضر ہو جائیں گے اور جو حاضر ہوں گے غیب ہو جائیں گے۔

لیکن میں علی بن عثمان جلابی (خدا مجھ سے راضی ہو) کہتا ہوں کہ نماز ایک حکم خداوندی ہے نہ یہ ذریعہ حضور ہے نہ ذریعہ غیوب۔ اس وجہ سے کہ حکم کسی چیز کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ حضوری کا ذریعہ حضور ہے اور غیوب کا ذریعہ غیوب ہے۔ اگر نماز حضور کا ذریعہ ہوتی تو بندہ کو کوئی چیز ہرگز خدا تعالیٰ کے دربار میں حاضر نہ کر سکتی اور اگر نماز غیوب کا ذریعہ ہوتی تو لازماً نماز کو ترک کرنے والا دربار میں حاضر ہو جاتا لہٰذا جب حاضر اور غائب کو نماز کے ادا کرنے یا ترک کرنے میں کوئی امر مانع نہیں تو یہ کہنا بجا ہو گا کہ نماز بذات خود ایک غلبہ ہے غیبت اور حضور سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

شرح غیبت اور حضور کی بحث حد درجہ لطیف (باریک) ہے اور عام فہم نہیں ہے اس لئے ذرا وضاحت کی ضرورت ہے۔ مشائخ عظام کے نزدیک غائب وہ ہے جو خود سے غائب ہے اور فانی فی اللہ ہونے کی وجہ سے ذات حق میں غرق

ہے اور حاضر وہ ہے جو مقام فنا سے نکل کر بقاء میں آچکا ہے اور اپنی خودی پر قائم ہے۔

ترجمہ یاد رہے کہ نماز پر زیادہ زور وہ لوگ دیتے ہیں جو مجاہدات کے دور سے گزر رہے ہیں یعنی مبتدی یا وہ حضرات جو اہل استقامت (یعنی ارباب بقاباللہ جن کو اہل تکوین کہا جاتا ہے) چنانچہ مشائخ عظام مریدین (مبتدین) کو روزانہ چار سو رکعت نفل کا حکم دیتے ہیں تاکہ نماز کی عادت پختہ ہو جائے اور ارباب استقامت (اصحاب بقا باللہ جن کو ارباب تکوین کہتے ہیں) بارگاہ الٰہی میں قبولیت کے شکرانے کے طور پر نماز پر زیادہ زور دیتے ہیں' اب باقی رہے درمیانی منازل والے سالک (جن کو متوسط یا ارباب تکوین اور ارباب فنا کہا جاتا ہے) ان کی دو اقسام ہیں۔ اول وہ لوگ جو حالت فنا میں غلبہ استغراق کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ دوم وہ جو استغراق سے نکل کر مقام دوئی میں نماز پڑھتے ہیں (لیکن ہیں دونوں ارباب فنا)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"

یعنی میری ساری راحت نماز میں ہے۔ اس وجہ سے کہ اہل استقامت (منتہیان) کو نماز میں سکون قلب ملتا ہے حتیٰ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے اور مقام قرب میں پہنچے اور علائق دنیا سے آزاد ہوئے تو اس درجے پر فائز ہوئے کہ آپ کا نفس (جسمانیت) قلب میں مبدل ہو گیا۔ آپ کے قلب کو روح کا درجہ حاصل ہوا اور آپ کا روح سراپا راز بن گیا۔ پھر وہ راز کوائف سے آزاد ہو کر مقام حیرت میں محو ہو گیا۔ نہ نام رہا نہ نشان' اس وقت مجاہدہ مشاہدہ میں مبدل ہو گیا اور معائنہ در معائنہ حاصل ہوتا

گیا۔ نفسانیت جاتی رہی، بشریت سے بالاتر ہوئے، طبیعت کے تقاضے نیست ہوئے۔ آپ کی ولایت شواہد ربانی سے متصف ہوئی۔ خودی سے بے خود ہوئے۔ حقیقت حقیقت سے یکجا ہوئی اور مشاہدۂ لم یزلی میں غرق ہوگئی اس محویت کی حالت میں بارگاہ رب العزت میں مناجات کیں کہ "بار خدایا! مجھے سرائے پربلا میں واپس نہ بھیجو اور ہوا و ہوس کی قیود میں مجھے پھر نہ ڈالیو"۔ فرمان ہوا کہ ہمارا حکم یہ ہے کہ دنیا میں واپس جایئے اور احکام شرع کو نافذ کیجئے تاکہ ہم آپ کو وہاں بھی وہی کچھ عطا کریں جو یہاں عطا ہوا ہے۔ جب آپ دنیا میں تشریف لائے تو جب بھی آپ کے دل میں اسی بلند مقام کی خواہش ہوتی تو آپ بلالؓ سے فرماتے کہ :

ارحنا یا بلال بالصلوٰۃ "اے بلال اذان دے کر ہمیں راحت پہنچاؤ"

چنانچہ آپ کی ہر نماز آپ کے لئے نیا معراج اور نیا قرب بن گئی۔ لوگوں کے خیال میں آپ نماز میں ہوتے تھے لیکن آپ کا قلب نیاز میں اور روح راز میں غرق ہوتا تھا۔ اور دل میں وہ سوز و گداز کہ نماز سے اسے ٹھنڈا فرماتے تھے۔ آپ کا جسم دنیا میں ہوتا تھا لیکن روح عالم ملکوت میں ہوتی تھی۔ آپ کا جسم خاکی تھا لیکن جان نوری تھی۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" صدیق کی علامت یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ مامور فرما دیتا ہے جو اس کو نماز پر آمادہ کرتا ہے اور اگر سو رہا ہے تو جگا دیتا ہے۔"

اور یہ علامت حضرت سہل رحمتہ اللہ علیہ میں ظاہر تھی کیونکہ جب آپ بہت بوڑھے اور اس قدر کمزور ہو گئے کہ چل بھی نہیں سکتے تھے لیکن جب نماز کا وقت آتا تو تندرست ہو جاتے اور نماز کے بعد اپنی جگہ سے نہیں اٹھ سکتے تھے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ :

" نمازی کیلئے چار چیزوں کی ضرورت ہے' فنائے نفس' ذہاب طبیعت (طبیعت یا خواہشات کا مٹ جانا) ' صفاء السِر (تزکیۂ روح) اور کمالِ مشاہدہ"۔

اور یہ چار چیزیں اس وقت تک حاصل نہیں ہوتیں جب تک کمالِ ہمت سے کام نہ لیا جائے۔ کمالِ ہمت سے نفس کا زور ختم ہو جاتا ہے۔ انسان کا نفس (وجود) باعثِ تفرقہ (لحد) ہے جب نفس مٹ جاتا ہے تو مقام جمع (فنا فی اللہ) حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک دوسری صفت یعنی خواہشات کے مٹانے کا سوال ہے یہ چیز جلالِ حق تعالیٰ سے حاصل ہوتی ہے جہاں جلال آیا غیر نیست ہوا۔ جہاں تک تیسری صفت یعنی صفائے بِتر کا تعلق ہے یہ چیز عشق کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اب رہی چوتھی صفت یعنی کمالِ مشاہدہ یہ باطن کی روشنی کے بغیر ممکن نہیں۔

روایات میں آیا ہے کہ حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ روزانہ چار سو رکعت نفل ادا کرتے تھے۔ جب کسی نے پوچھا کہ اتنے مراتب کے باوجود اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہو تو فرمایا یہ جو رنج و راحت تم لوگوں کو نظر آرہی ہے جب انسان مقام فنا تک پہنچ جاتا ہے نہ رنج اثر کرتا ہے نہ راحت۔ خبردار کاہلی کو قرب' اور حرص کو طلب حق کا نام نہ دینا۔

ایک شخص کہتا ہے کہ ایک دفعہ میں حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا وہ اللہ اکبر کہتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سخت ضعیفی کی حالت میں بھی عالم جوانی کے اوراد پڑھا کرتے تھے۔ جب کسی نے کہا کہ یا شیخ اب تو آپ ضعیف ہو گئے ہیں بعض اوراد ترک کر دیجئے۔ فرمایا کہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کی بدولت میں

نے ابتداء میں فیوض حاصل کئے اب انتہا میں ان کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ فرشتے دائمی طور پر عبادت میں مشغول ہیں اور ان کا کھانا پینا عبادت ہے اس وجہ سے کہ وہ روحانی ہیں اور جسمانیت اور نفسانیت سے پاک ہیں۔ انسان کو جو چیز عبادت سے باز رکھتی ہے وہ اس کا نفس ہے لہٰذا نفس کو مجاہدات کے ذریعے جس قدر کمزور کیا جاتا ہے۔ اسی قدر عبادت آسان ہو جاتی ہے جب انسان نفس سے نجات پالیتا ہے تو فرشتوں کی طرح عبادت اس کی غذا بن جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے یاد ہے میرے زمانہ طفلی میں ایک عورت تھی جو بہت عبادت گزار تھی۔ ایک دفعہ اسے بچھو نے چالیس بار نماز میں ڈنگ لگایا لیکن اس کی حالت میں کوئی تبدل واقع نہ ہوا۔ جب نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے کہا کہ اماں آپ نے بچھو کو کیوں نہ ہٹایا۔ اس نے کہا تم ابھی چھوٹے ہو میری بات کیسے سمجھ سکتے ہو۔ میں تو خدا تعالیٰ کے کام میں مشغول تھی اپنے کام میں کس طرح مشغول ہو سکتی تھی۔

حضرت ابوالخیر اقطعؒ رحمتہ اللہ علیہ کے پاؤں میں ناسور پیدا ہو گئی۔ اطبا نے کہا کہ پاؤں کاٹنا پڑے گا لیکن آپ رضامند نہیں ہوتے تھے۔ آپ کے مریدوں نے اطبا کو مشورہ دیا کہ اگر نماز کے دوران ان کا پاؤں کاٹا جائے تو ان کو خبر نہ ہو گی۔ اس پر عمل کیا گیا اور جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو کٹا ہوا پاؤں دیکھ کر حیران ہوئے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ جب رات کی نمازیں (تہجد وغیرہ) ادا کرتے تو قرأت آہستہ پڑھتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں سے وجہ دریافت فرمائی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ جس

کو سناتا ہوں وہ بلند اور آہستہ آواز دونوں کو سن سکتا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں سوتے ہوؤں کو جگاتا اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم ذرا اونچی آواز سے پڑھا کرو۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم ذرا نیچی آواز سے پڑھا کرو تاکہ عادت ترک ہو جائے۔ اس لئے بعض مشائخ فرائض لوگوں کے سامنے ادا کرتے ہیں اور نوافل چھپا کر۔ تاکہ عبادت ریاکاری میں شمار نہ ہو جائے۔ کیونکہ جو شخص دکھا کر نماز پڑھتا ہے اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے تو یہ بھی ریا ہے۔ بعض مشائخ فرائض اور نوافل دونوں خلق کے سامنے ادا کرتے ہیں وہ یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ ریا باطل ہے اور عبادت حق ہے ہم کیوں باطل کے خوف سے حق کو چھپائیں۔ اصل مرض ریا ہے اس کو دل سے نکال دیا جائے تو جہاں چاہو نماز پڑھ سکتے ہو۔ چنانچہ مشائخ عظام نے نماز کے آداب کو خوب ملحوظ رکھا ہے اور مریدین کو بھی پابند آداب کرایا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں چالیس برس سفر میں رہا لیکن ایک نماز بھی جماعت کے بغیر ادا نہ کی اور ہر جمعہ کی نماز کسی شہر میں جا کر ادا کرتا تھا۔ غرضیکہ نماز کے احکام اس قدر ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ ان سب میں سے محبت زیادہ اہم ہے۔ اب ہم محبت کے احکام بیان کرتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
نا قصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

یا علیؓ مدد
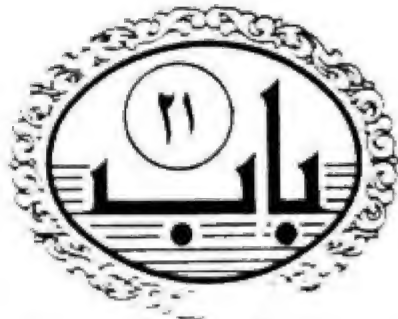
اللہ تعالیٰ کی محبت اور اُس کے متعلقات کا بیان

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ : یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ...

"اے ایمان والو تم میں سے جو کوئی دین سے پھر جائے گا تو اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم پیدا کر دے گا جس کو وہ دوست رکھے گا اور وہ اللہ کو دوست رکھیں گے۔"

نیز فرمایا : وَمِنَ النَّاسِ...

"بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش کرتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہئے لیکن جو ایمان والے ہیں وہ شدت سے اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں۔"

حدیث میں اللہ تعالٰی اور اولیاء کرام کے ساتھ محبت کی تاکید۔

نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

" میں نے جبرائیل علیہ السلام سے سنا کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ جس نے میرے ولی کی اہانت کی وہ میرے ساتھ اعلان جنگ کرتا ہے اور مجھے کسی چیز سے اتنا فکر نہیں ہوتا جتنا کہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایک مومن کی روح قبض کرتا ہوں اور وہ اس کو ناپسند کرتا ہے میں اس کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔ حالانکہ موت ضروری ہے اور جب میرا بندہ میرے مقرر کردہ فرائض پر عمل کرتا ہے تو اس کو میرا قرب حاصل ہوتا ہے اور جب نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو میں اس کو محبوب رکھتا ہوں اور اس سے اس قدر قریب ہو جاتا ہوں کہ میں اس کی آنکھیں' کان' ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے سنتا ہے' کام کرتا ہے اور چلتا ہے اور وہ مجھ سے جو کچھ طلب کرتا ہے دیتا ہوں اور جب مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو اس کو پناہ دیتا ہوں"

نیز فرمایا :

من احب لقاء اللّٰہ احب اللّٰہ لقاءہ ومن کرہ کرہ اللّٰہ لقاءہ

" جس نے اللہ کا لقاء چاہا اللہ اس کا لقاء چاہتا ہے جس نے نفرت کی اللہ اس کے لقا سے نفرت کرتا ہے"

نیز فرمایا :

" جب اللہ تعالٰی اپنے کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے تو جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو دوست رکھتا ہوں پس تو بھی اس کو دوست رکھ۔

تو جرائیل علیہ السلام اس کو دوست رکھتا ہے اور پھر جرائیل علیہ السلام تمام فرشتوں کے سامنے اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے۔ پس تم بھی اس سے محبت کرو پس تمام فرشتے اس سے محبت کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس بندہ کو اہل زمین میں بھی مقبول کر دیتا اور اہل زمین اس سے محبت کرتے ہیں"۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام میں اللہ تعالیٰ کی بندہ کے ساتھ اور بندہ کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ثابت ہے اور قرآن و حدیث اس پر ناطق ہیں اور اس پر ساری امت کا اتفاق ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسی صفات سے متصف ہے کہ خلق کا بجا طور پر محبوب ہے اور اپنے چاہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

لفظ محبت کا مآخذ

لفظ محبت ماخوذ ہے لفظ حِبہ سے۔ حا کی زیر کے ساتھ۔ جس کا مطلب ہے وہ تخم (بیج) جو زمین میں ڈالا جاتا ہے پس حبہ کو حب کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یعنی جس طرح تخم زمین میں ڈالا جاتا ہے پھر اس پر بارش ہوتی ہے اور آفتاب کی روشنی اور موسم کی سردی اور گرمی سے اس تخم میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور پھول اور پھل لاتا ہے اسی طرح محبت دل کے اندر جگہ پکڑتی ہے اور رنج و راحت اور بلا و مصیبت سے اثر پذیر نہیں ہوتی اور بالآخر برگ و بار لاتی ہے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اپنی دوستی (خلت) کی خلعت عطا فرمائی تو آپ ساری کائنات سے علیحدہ ہو کر حق تعالیٰ کے ساتھ پیوست ہو گئے کیونکہ کائنات آپ کے لئے حجاب تھی۔ اس لئے آپ پکار اٹھے کہ :

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ

"میرے لئے حق تعالیٰ کے سوا سب کچھ دشمن ہے"۔

اسی مفہوم کو حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے یوں بیان فرمایا ہے :

" محبت کو اس لئے محبت کہا جاتا ہے کہ وہ دل سے محبوب کے سوا سب کو مٹا دیتی ہے۔"

بعض کہتے ہیں کہ لفظ محبت ماخوذ ہے حب سے جو دل کی صفت ہے اور دل کا قیام اسی کی بدولت ہے۔ چنانچہ محبت بھی دل ہی میں ہوتی ہے۔ بعض لوگ محبت کو حباب سے مشتق قرار دیتے ہیں جو غلبۂ آب سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ محبت بھی ایک غلبہ ہے دیدار دوست کیلئے۔

محبت کے مختلف مطالب

یاد رہے کہ علماء کے نزدیک لفظ محبت کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ محبت کے ایک معنی ہیں محبوب کیلئے دل میں بے سکونی' خواہش' طلب' تمنا اور انس کا ہونا لیکن ان تمام قسم کی بے چینیوں کا اطلاق ذاتِ قدیم پر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام چیزیں ہم جنس مخلوق کے ساتھ روا ہو سکتی ہیں' خالق کے ساتھ نہیں۔ خداوند تعالیٰ جنسیت سے بلند و بالا تر ہے **علوا" کبیرا۔**

محبت کا دوسرا مفہوم حق تعالیٰ کا احسان ہے یعنی حق تعالیٰ مہربانی فرما کر اپنے بندے پر رحمت کرتا ہے اور اس کو قرب و ولایت کے گوناگوں مراتب سے نوازتا ہے۔

محبت کا تیسرا مفہوم بندہ کی طرف سے حق تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے۔ متکلمین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ جس محبت کا ذکر حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اس سے مراد ایک رسمی تعلق ہے جیسے کہ اللہ نے قرآن میں اپنے لئے ہاتھ اور پاؤں کا ذکر کیا ہے لیکن دراصل اعضا سے پاک ہے۔ اس لئے ہم محبت کا لفظ رسمی طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن عملاً اس سے گریز کرتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ خدا کے ساتھ محبت

کرنے کو روا نہیں رکھتے اس قسم کے اقوال بہت ہیں۔ اب میں اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حقیقت محبت

جاننا چاہئے کہ حق تعالیٰ کی بندہ کے ساتھ محبت کا مطلب ہے بندہ کے ساتھ ارادۂ مہربانی اور رحمت کرنا۔ محبت حق تعالیٰ کے ارادہ کا نام ہے جیسے اس کی رضا' اس کی سختی نرمی اور رافت وغیرہ۔ ان صفات کے اجراء کا دوسرا نام ارادۂ حق ہے۔ یہ اس کا ارادہ ہی ہے جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ارادہ حق تعالیٰ کی قدیم صفت ہے جس سے اس کے افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اب چونکہ حق تعالیٰ کی بعض صفات دوسری صفات سے زیادہ غالب ہوتی ہیں حق تعالیٰ کی بندہ پر کمال شفقت اور مہربانی اور نعمت اور آخرت میں ثواب عطا کرنے' گناہ سے بچانے' عذاب سے نجات دینے' بلند مراتب قرب عطا کرنے' غیر اللہ سے مستغنی کرنے اور عنایت ازلی کی وجہ سے سارے جہاں سے اس کا تعلق چھڑا کر اپنے ساتھ وابستہ کرنے اور اس قسم کے خصوصی برتاؤ سے مرہون کرنے کا نام محبت آیا ہے۔ حضرت حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ ' حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ و دیگر مشائخ کا مسلک یہی ہے نیز فقہاء و متکلمین اہلسنت والجماعت کا مسلک بھی یہی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ جب کسی بندہ کی اچھے الفاظ میں تعریف کرتا ہے اس کا نام محبت ہے تو اللہ تعالیٰ کے الفاظ اس کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے اس صورت میں مخلوق کا غیر مخلوق کے ساتھ تعلق کیسے روا ہو سکتا ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ محبت حق تعالیٰ کے احسان کا نام ہے احسان بھی بذریعہ افعال الٰہی ظاہر ہوتا ہے غرضیکہ یہ تمام اقوال ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

دراصل بندہ کی اللہ تعالیٰ کیلئے محبت ایک جذبہ ہے جو مومن کے دل میں

تعظیم و تکریم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ بندہ محبوب کی رضا طلب کرتا ہے اور دیدار کے شوق میں محو اور قرب کی تمنا میں بے قرار ہو جاتا ہے اور محبوب کے بغیر کسی اور سے اس کا دل نہیں لگتا۔ ہر وقت اس کے ذکر میں منہمک رہتا ہے اور غیر کے ذکر سے پرہیز کرتا ہے۔ اس کا آرام کافور ہو جاتا ہے اور قرار مفقود۔ تمام علائق سے روگردانی کر لیتا ہے اور تمام خواہشات اور حرص و ہوا اس کے دل سے نکل جاتی ہے۔ محبوب کی محبت کا غلبہ اس پر سوار ہو جاتا ہے جس کے آگے وہ سر تسلیم خم کر لیتا ہے۔ حق تعالیٰ کی تمام صفاتِ کمال کو پہچانتا ہے۔ لیکن بندہ کی حق تعالیٰ سے محبت اس طرح نہیں جس طرح کہ دیگر مخلوق کے ساتھ ہوتی ہے کیونکہ محبوبان مجازی کے ساتھ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کا ادراک و احاطہ کیا جائے جو محبوبان مجازی کے ساتھ تو ممکن ہے۔ لیکن محبوب حقیقی کے ساتھ ناممکن ہے۔ حق تعالیٰ کے عاشقان تو اس کے قرب کے حصول میں مست ہوتے ہیں اس کے ادراک و احاطہ کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ طالب بخود قائم ہوتا ہے (یعنی اس کی خودی برقرار ہوتی ہے) لیکن وہ حضرات جو محبوب میں محو و مستغرق ہیں وہ قائم باللہ ہوتے ہیں۔ اور بہترین عشاق وہ ہیں جو کار زار محبت میں ہلاک اور فنا ہو جاتے ہیں اس وجہ سے کہ محدَث (انسان) قدیم (حق تعالیٰ) کے ساتھ واصل نہیں ہو سکتا بغیر اپنے آپ کو فنا کئے۔ پس جس نے محبت کی حقیقت کو پہچان لیا اس کے لئے نہ کوئی ابہام (شک) باقی رہتا ہے نہ کوئی شبہ نہ مشکل۔

اقسام محبت

پس محبت کی دو اقسام ہیں اول انسان کی ہم جنس انسان کے ساتھ محبت اور یہ نفسانی محبت کہلاتی ہے جس میں ایک دوسرے کو چھونا اور بغلگیر ہونا ممکن ہوتا ہے۔ دوم غیر جنس سے محبت جس میں طالب محبوب کی کسی صفت سے قرار

حاصل کرتا ہے اور آرام پاتا ہے مثلاً اس کی بات سنتا اس کا دیدار کرنا۔ اس قسم کے عاشقوں کی بھی آگے دو قسمیں ہیں ایک وہ جو حق تعالیٰ کے انعام و اکرام اور نعمتوں کو دیکھ کر اس سے محبت کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو غلبہ محبت میں آکر انعام و اکرام کو بھی حجاب سمجھتے ہیں بلکہ محبوب کے انعام و اکرام کو ذریعہ بنا کر محبوب تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور یہ زیادہ بلند مرتبہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

محبت کے مختلف مفہوم

غرضیکہ محبت کا وجود خلق خدا کے تمام طبقات میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ تمام کتب لغات میں بھی اس کا ذکر ہے اور دانشوروں میں سے کوئی شخص اس کا انکار نہیں کرتا اور مشائخ میں حضرت سمنون المحب رحمتہ اللہ علیہ کا مشرب و مسلک خالصتہ "محبت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ ہی محبت ہے اور احوال و مقامات اس کی منازل ہیں اور یہ کہ ہر چیز کی محبت معرض زوال و خطر میں ہو سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت کو کوئی زوال نہیں یہ راستہ ہمیشہ کیلئے کھلا ہے۔ تمام مشائخ عظام کا اس بات پر اتفاق ہے اب چونکہ محبت کا اطلاق بہت وسیع ہو گیا اور ہر ظاہر پرست نے محبت کو غیر اللہ پر چسپاں کرنے کی کوشش کی تو اہل حق نے اس کا نام تبدیل کر کے اسے صفوت (یعنی تصوف) کے نام سے موسوم کیا اور محب کو صوفی کا نام دیا۔ اور جب طالبان حق نے اپنی مرضی کو ترک کر کے رضائے حق تعالیٰ کی تلاش کی کوشش کی تو مشائخ کے ایک گروہ نے اس مسلک کو فقر کا نام دیا اور طالب کو فقیر کے نام سے

موسوم کیا کیونکہ میدان محبت میں کمترین درجہ حق تعالیٰ کی رضا کے ساتھ راضی رہنا ہے اور حق تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا جوئی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ (ہم معنی ہیں)۔ اس لئے ہم نے اس کتاب کے شروع میں فقر اور صفوت کو بیان کردیا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت سمنون المحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

الحب عند الزهاد اظهر من الاجتهاد " محبت زاہدوں کے نزدیک اجتہاد سے زیادہ ظاہر ہے"

و عند التائبين اوجد من انين و حنين " اور تائبین کے نزدیک آہ و فغان سے آسان تر ہے۔"

و عند الاتراک اشهر من الفتراک " اور ترکوں کے نزدیک فتراک (شکار کا تھیلہ) سے زیادہ مشہور ہے۔"

و عند الهنود صبى الحب اظهر من صبى المحمود " اور ہندوؤں کے نزدیک لڑکے کی محبت محمود غزنوی کے ایاز کی محبت سے زیادہ بہتر ہے۔"

و عند الروم قصته الحب و الحبيب اشهر من الصليب "اور ملک روم میں قصہ حب و محبوب صلیب سے زیادہ مشہور ہے۔"

و فی العرب قصته الحب ادب فی کل حی منه طرب اوويل وهرب و حزن "اور ملک عرب میں محبت کا موضوع باقاعدہ علم ہے جس میں خوشی اور ہلاکت یا کامیابی و ناکامی کی داستانیں ہر قبیلے میں مروّج ہیں۔"

ان تمام اقوال کا مطلب یہ ہے کہ بنی نوع انسان میں سے کوئی بشر ایسا نہیں کہ جس نے محبت کا زخم نہ کھایا ہو یا اس سے خوش نہ ہوا ہو۔ کبھی تو اس کا دل مستِ شراب ہے یا پھر قہرِ دوست سے خراب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دل

کی ترکیب میں بے چینی و ۔ بے قراری ہے اور عقل بے کار ہے محبت دل کی غذا ہے اور وہ دل جو محبت سے خالی ہے بگِل (خاک) ہے۔ محبت کو کوشش اور محنت سے ہٹایا نہیں جا سکتا اور نفس ان لطائف سے بے خبر ہے جو دل پر گزرتے ہیں۔

حضرت عمر بن عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ کتابِ محبت میں فرماتے ہیں کہ :

" خداوند تعالیٰ نے دلوں (یعنی قلوب کو) جسموں سے سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور مقام قرب میں رکھا اور روحوں کو دلوں سے سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور درجات انس میں رکھا اور اسرار کو روحوں سے سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور درجات وصل میں رکھا اور ہر روز تین سو ساٹھ بار لطیفہ سِتر پر تجلی فرمائی اور تین سو ساٹھ بار نظر رحمت فرمائی اور محبت کے کلمات روح کو سنائے اور تین سو ساٹھ بار انس کی نگاہ سے دل کو دیکھا۔ لیکن جب انہوں نے کائنات میں اپنے آپ کو معزز پایا تو ان کے اندر فخر پیدا ہوا اس لئے حق تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر لطیفہ سِتر کو روح کے اندر، روح کو دل کے اندر اور دل کو جسم کے اندر قید کر دیا۔ اس کے بعد ان کے ساتھ عقل کو رکھا اور انبیاء علیہم السلام کو بھیج کر احکام ارسال فرمائے اس کے بعد ان میں سے ہر ایک کو اپنے مطلوب کی تلاش میں لگا دیا۔ چنانچہ جسم کو نماز میں لگا دیا، دل کو محبت میں مصروف کیا روح کو قرب میں اور سِتر کو وصل میں قرار حاصل ہوا خلاصہ یہ کہ محبت کی حقیقت لفظ محبت سے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ محبت ایک حال ہے اور حال ہرگز قال میں نہیں آسکتا۔ اگر سارا جہان مل کر یہ کوشش کرے کہ محبت کو پیدا کیا جائے یہ ہرگز نہیں ہو سکے گا اور اگر سارا جہان مل کر اس کو مٹانا چاہے تو ہرگز نہیں مٹا سکتا۔ کیونکہ حال وہبی (عطیہ) ہوتا ہے نہ کہ کسبی (کوشش سے)۔ انسان لاہی (حادث) ہے اور حال (الٰہی) ہے۔ لاہی ہرگز الٰہی پر قادر نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

فصل

حقیقتِ عشق

عشق کے متعلق مشائخ کے اقوال بہت ہیں ان میں سے بعض نے بندہ کا حق تعالیٰ سے عشق تسلیم کیا ہے لیکن حق تعالیٰ کا بندہ سے عشق تسلیم نہیں کیا۔ اس وجہ سے کہ ان کے نزدیک عاشق وہ ہے جو محبوب تک نہیں پہنچ سکتا لیکن حق تعالیٰ کے لئے بندہ تک پہنچنا محال نہیں ہے۔ اس لئے بندہ عاشق حق ہو سکتا ہے۔ حق تعالیٰ عاشق بندہ نہیں ہو سکتا۔ بعض کا کہنا ہے کہ عشق اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی روا نہیں کیونکہ عشق کا مطلب ہے حد سے تجاوز کرنا۔ لیکن ذات حق لامحدود ہے اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ عشق دونوں جہانوں میں روا نہیں کیونکہ عشق کا مقصد ادراکِ ذات باری تعالیٰ ہے اور ذات باری تعالیٰ ادراک سے بالاتر ہے۔ ہاں محبت روا ہو سکتی ہے کیونکہ محبت صفت کے ساتھ ہوتی ہے ادراک ذات سے اس کا تعلق نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق آنکھ سے دیکھے بغیر ممکن نہیں لیکن محبت سماعت کے ذریعے ممکن ہے اب چونکہ عشق کا تعلق دیکھنے سے ہے اور یہ روا نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی اسے دیکھ سکے۔ اس لئے حق تعالیٰ کے ساتھ عشق ناممکن ہے۔ لیکن چونکہ حق تعالیٰ کی طرف اس کی محبت کا تقاضا ہوا تو ہر شخص نے دعوہ محبت کیا۔ حاصل کلام یہ کہ چونکہ حق تعالیٰ کی ذات کا ادراک محال ہے اس سے کسی کا عشق نہیں ہو سکتا اور چونکہ وہ اپنی صفات سے اولیاء کرام کو نوازتا ہے اس لئے اس کے ساتھ محبت روا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام یوسفؑ کے فراق میں آنکھیں کھو بیٹھے تو جب ان کی قمیص کی خوشبو آئی تو آنکھیں بینا ہو گئیں۔ لیکن چونکہ

زلیخا یوسفؑ کے عشق میں غرق تھی جب تک یوسفؑ کا وصال حاصل نہ ہوا اس نے دوبارہ بینائی نہ پائی۔ یہ طریق بھی عجیب ہے کہ ایک کے لئے خواہش جائز ہے دوسرے کے لئے ناجائز۔ نیز بعض کہتے ہیں کہ چونکہ نہ عشق کی کوئی ضد ہے نہ حق تعالیٰ کی۔ اس وجہ سے عشق حق تعالیٰ کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس مضمون پر بہت سے لطیف اقوال ہیں جو طوالت کے خوف سے ترک کئے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

رموز محبت

اسرار و رموز محبت کے متعلق مشائخ کے اقوال اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے یہاں صرف چند پر اکتفا کیا جاتا ہے بطور تبرک۔

حضرت استاذ ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

المحبتہ محو المحب بصفاتہ و اثبات المحبوب بذاتہ

محبت یہ ہے کہ صفت حق میں فانی اور ذات حق کے ساتھ باقی ہو جائے یعنی اسے ولایتِ مطلق حاصل ہو اور محبت کی ہستی کا فنا ہونا محبوب کی بقا کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ محب اپنی ہستی بھی قائم رکھے کیونکہ جب تک وہ اپنی ہستی قائم رکھے گا جمالِ محبوب سے محروم رہے گا جب یہ جان لے گا کہ اس کی بقا محبوب کے جمال کے ساتھ قائم ہے تو خود بخود اپنی ہستی کو فنا کرنے کے در پے ہوگا کیونکہ اپنی ہستی قائم رکھنا محبوب سے محجوبی ہے پس محبوب کی محبت کی وجہ سے اپنی ہستی کا دشمن ہو جاتا ہے۔ جب حضرت حسین بن منصور حلاج رضی اللہ

عنہ کو دار پر لٹکایا گیا تو آپ کا آخری کلام یہ تھا۔

"حسب الواجد افراد الواحد لہ" (واجد یعنی واصل کے لئے اتنا کافی ہے کہ ایک کے ساتھ ایک ہو جائے۔)

(نوٹ - بعض نسخوں میں "حسب" کی بجائے لفظ حب آیا ہے اس صورت میں بھی اس عبارت کے معنی وہی ہوں گے کہ واصل باللہ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ مقام فردیت حاصل کرے)۔ محب کو یہ بات محبوب ہے کہ محبوب کی محبت میں اس کی ہستی مٹ جائے اور اس کے نفس کی حکومت ملیا میٹ ہو جائے۔

شرح کتب تصوف میں اکثر مقام تجرید و تفرید کا ذکر آتا ہے۔ تجرید سے مراد ترک دنیا اور تفرید سے مراد ترک خود یعنی اپنی ہستی کو فنا کر کے ذات حق کے ساتھ ایک ہو جائے مشائخ عظام فرماتے ہیں کہ سلوک الی اللہ میں آخری مقام فردیت ہے جب کہ بندہ نہیں رہتا۔ گم ہو جاتا ہے ذات حق میں۔ اکثر یہ مقام مشائخ کو آخری عمر میں حاصل ہوتا ہے جب خلفاء مقرر کر کے فارغ ہو جاتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں سے فارغ البال ہو کر ایک کے ساتھ ایک ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھانے پینے سے بھی مستغنی ہو جاتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

تفرد باللہ فرید فرید

فظل وحید والمشوق وحید

(ماخوذ از شرح تعرف)

(دوست کے ساتھ دوست ایک ہو گیا اور محب اور محبوب کا فرق مٹ گیا)

ترجمہ حضرت شیخ ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

المحبتہ استقلال الکثیر من نفسک و استکثار القلیل من حبیبک

(محبت یہ ہے کہ اپنی زیادہ عبادت کو کم سمجھے اور حق تعالیٰ کی طرف سے کم رحمت کو بہت زیادہ جانے)۔ حق تعالیٰ بھی بندے کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے اس نے نعمت دنیا کو قرآن میں قلیل کہا ہے۔ فرمایا :

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ (اے پیغمبر فرما دیجئے کہ دنیا کا مال و متاع جو تم کو دیا ہے قلیل ہے)۔ لیکن ذاکرین کے ذکر کو کثیر کے لفظ سے یاد فرماتے ہیں جیساکہ آیہ ذیل میں ہے۔ "وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ"۔ (اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور عورتیں)۔ تاکہ خلقت کو معلوم ہوجائے کہ حقیقی دوست اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ یہ صفت خلق پر صادق نہیں آتی۔ جو چیز حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو ملتی ہے کسی حالت میں کم نہیں اور خلق کی ہر چیز کم ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"**المحبتہ معانقتہ الطاعات و مباینتہ المخالفات**"۔ (محبت یہ ہے کہ تو اس کی عبادت سے بغلگیر ہوجائے اور اس کے ممنوعات سے کنارہ کش ہوجائے) کیونکہ دل میں جس قدر دوست کی محبت قوی ہوگی اس کی فرمانبرداری اسی قدر آسان ہوگی یہ بات ملحدوں کے اس قول کے خلاف ہے کہ محبت میں بندہ اس درجہ کو پہنچ جاتا ہے کہ عبادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ کھلی بے دینی ہے۔ کیونکہ عقل کا تقاضا ہے کہ بندہ سے بندگی کبھی رفع (ساقط) نہیں ہوتی۔ اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہرگز منسوخ نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر ایک شخص سے شریعت رفع ہوجائے تو عقل کے مطابق ساری خلقت سے رفع ہوجانا چاہئے اور یہ کھلی بے دینی ہے۔ البتہ مغلوب الحال (مجذوب وغیرہ) کے لئے دوسرا حکم ہے (یعنی جو بے ہوش ہے اور معذور ہے)۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کو دوستی (ولایت) کے اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں اس پر عبادت آسان ہوجاتی ہے اور یہ بات رسول خدا صلی

اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیات طیبہ سے ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ نے "لعمرک" کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی کی قسم کھائی تو اس قدر رات دن عبادت میں مشغول ہوئے کہ دوسرے کاموں کو انجام نہ دے سکے اور پاؤں مبارک پر ورم آنے لگی تو حق تعالیٰ نے فرمایا۔ طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (ہم نے قرآن کو اس لئے آپ پر نازل نہیں کیا کہ آپ اپنے اوپر سختی کریں)۔ نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فرمانبرداری کے جذبہ میں اگر انسان یہ بھی بھول جائے کہ میں فرمانبرداری کررہا ہوں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ۔

انہ لیغان علی قلبی و انی لاستغفراللّٰہ فی کل یوم سبعین مرۃ
(میرے قلب پر اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ روزانہ ستر بار استغفراللہ کہتا ہوں)۔ وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے اعمال کو ہیچ سمجھتے تھے اور ستر مرتبہ حق تعالیٰ سے معذرت کرتے تھے اور یہ اقرار کرتے تھے کہ میرے اعمال تیرے لائق نہیں۔

حضرت سمنون المحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" ذھب المحبون للّٰہ بشرف الدنیا و الاخرۃ لان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال المرء مع من احب (اللہ کے عاشق ساری دنیا و آخرت کی بازی لے گئے کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کو سب سے زیادہ محبت ہے)۔ چونکہ یہ حضرات دنیا و آخرت میں رات دن حق تعالیٰ کی محبت میں بسر کرتے ہیں اس لئے ان کو دنیا و آخرت کی بازی لے جانے والا کہا گیا ہے اور جس کے ساتھ اللہ عزوجل ہو اس سے کیا گناہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ شرف دنیا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ان کے ساتھ ہو اور شرفِ آخرت یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہوں۔

حضرت یحییٰ معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

حقیقتہ المحبتہ مالا ینقص بالجفاء ولا یزید بالبر والعطا" (محبت یہ ہے کہ نہ دوست کی جفا سے کم ہو نہ اس کی عطا سے زیادہ ہو)۔ اس وجہ سے کہ محبت کے یہ دو اسباب ہیں لیکن جب محبت موجود ہے تو اسباب بیکار ہوجاتے ہیں اور دوست کے لئے دوست کی جفا محبوب ہوتی ہے محبت کے میدان میں جفا اور وفا دونوں برابر ہیں۔ محبت ہے تو جفا بھی وفا بن جاتی ہے۔

روایت ہے کہ جب حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ جنون کی وجہ سے شفا خانہ میں تھے تو چند لوگ طبع پرسی کے لئے گئے۔ آپ نے پوچھا تم کون ہو۔ انہوں نے کہا ہم آپ کے دوست ہیں۔ یہ سن کر شیخ نے ان پر پتھر پھینکے اور وہ بھاگنے لگے۔ آپ نے فرمایا اگر تم میرے دوست ہوتے تو میری جفا سے نہ بھاگتے۔ اس مضمون پر بزرگوں کے اقوال بہت ہیں جو طوالت کے خوف سے ترک کئے جاتے ہیں۔

بادہ از ماست شد نے ما ازو
قالب از ماہست شد نے ما ازو

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد است
عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد است
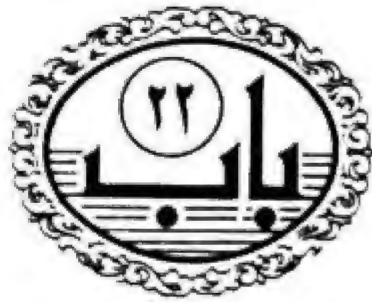
چھٹے پردہ کا کھولنا

زکوٰۃ کے متعلق

حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :- **وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ**...

"نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔" اس قسم کی بے شمار آیات و احادیث ہیں جن کے ذریعے زکوۃ ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے جو فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن زکوۃ کے لئے ایک مالی حد ہے یعنی اگر کسی کے پاس دو سو روپے ہوں تو اس کی زکوۃ پانچ روپے ادا کرنا فرض ہے۔ اور اگر بیس دینار (زر) ہے تو اس پر نصف دینار زکوۃ فرض ہوگی۔ اگر اس کی ملکیت پانچ اونٹ ہیں تو اس پر ایک بکری زکوۃ عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر مال پر زکوۃ واجب ہے۔ نیز مرتبہ پر بھی زکوۃ واجب ہے۔ (یعنی مرتبہ حاصل ہونے پر خدا کا شکر ادا کرنا مرتبہ کی زکوۃ ہے۔) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے : **ان اللہ تعالیٰ فرض علیکم زکواۃ جاھکم** (اللہ تعالیٰ نے تمہارے مرتبہ پر بھی زکوۃ فرض کی ہے)۔ **کما فرض علیکم زکواۃ مالکم** (جیسے تم پر مال کی زکوۃ فرض ہے) نیز

برا کہا گیا ہے)۔ لیکن جن حضرات کا فقر مجبوری کی وجہ سے تھا انہوں نے زکوٰۃ قبول کی ہے اس لئے نہیں کہ اس کی ان کو ضرورت تھی بلکہ اس لئے کہ ایک مسلمان بھائی کی گردن سے فریضۂ زکوٰۃ کی ادائیگی کا بوجھ ہلکا کریں۔ جب یہ نیت ہو تو اوپر والا ہاتھ لینے والے کا ہوگا نہ کہ دینے والے کا۔ اگر دینے والے کا ہاتھ اونچا اور لینے والے کا نیچا مانا جائے تو اس سے خداوند تعالیٰ کے اس فرمان کی تکذیب لازم آتی ہے کہ وَيَأْخُذُ الصَّدَقٰتِ (اور وہ (پیغمبر) صدقات وصول کرتا ہے)۔ کیونکہ اس سے زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ لینے والے سے افضل ہو جاتا ہے اور یہ اعتقاد بے دینی ہے۔ لہٰذا اوپر والا ہاتھ وہی ہے جو خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق مسلمان بھائی سے زکوٰۃ وصول کرتا ہے تاکہ اس کی گردن سے فریضہ کا بوجھ اتر جائے۔ درویش دنیا دار نہیں ہوتے بلکہ اہل عقبیٰ ہوتے ہیں اگر درویش دنیا داروں کی گردن سے بوجھ نہ اتاریں تو ان سے فریضہ کی ادائیگی کا بوجھ نہیں اترے گا۔ اور قیامت کے روز وہ جواب دہ ہوں گے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اہل عقبیٰ کا مناسب طور پر امتحان لیا ہے تاکہ اہل دنیا کی گردن سے بوجھ اتر جائے۔ اس لئے لامحالہ اوپر والا ہاتھ فقراء کا ہوتا ہے جو شریعت کے مطابق اپنا حق وصول کرتے ہیں جو ان پر حق تعالیٰ نے واجب کر دیا ہے اگر لینے والا ہاتھ سفلی (نیچے والا) ہاتھ ہوتا جیسا کہ فرقہ حشویہ کا خیال ہے تو (نعوذ باللہ) انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام کا ہاتھ سفلی ہاتھ ہوتا جو خدا تعالیٰ کا مقرر کردہ حق وصول کرتے ہیں اور مختلف مصارف میں لے آتے ہیں۔ لیکن یہ بات غلط ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد ائمہ کرام کا مسلک بھی یہی رہا ہے کہ بیت المال کا حق وصول کرتے تھے اس لئے لینے والے ہاتھ کو سفلی اور دینے والے ہاتھ کو افضل سمجھنا غلط ہے۔ ان دونوں باتوں کو تصوف میں بڑی اہمیت حاصل ہے اب چونکہ اس مضمون کو جود و سخاوت سے گہرا تعلق ہے اس لئے سطور ذیل میں اس کے متعلق قدرے بیان کیا جاتا ہے۔ وباللہ التوفیق و العصمتہ۔

فصل

جود و سخا کی اہمیت

رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا کہ :

"السخی قریب من الجنتہ و بعید من النار و البخیل قریب من النار و بعید من الجنتہ" (سخی جنت سے قریب ہے اور دوزخ سے بعید اور بخیل دوزخ سے قریب اور جنت سے بعید)۔ علماء کے نزدیک لفظ جود و سخا ہم معنی ہیں لیکن حق تعالیٰ کو جواد کہا گیا ہے سخی نہیں کہا گیا کیونکہ نہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کو سخی کہا گیا ہے نہ حدیث میں۔ علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خداوند تعالیٰ کے جو اسمائے گرامی قرآن و حدیث میں مذکور ہیں ان کے علاوہ اس کو کوئی اور نام دیا جائے مثلاً لفظ عالم' فقیہہ اور عاقل جو ہم معنی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو عالم کہنا جائز ہے کیونکہ قرآن و حدیث میں اس کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے لیکن فقیہہ یا عاقل کہنا روا نہیں اسی طرح حق تعالیٰ کو جواد کہنا صحیح ہے کیونکہ اس پر قرآن و حدیث ناطق ہے لیکن سخی کہنا صحیح نہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک لفظ جود و سخا کے مختلف معنی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سخی وہ ہے جو دیتے وقت اس بات کی تمیز (چھان بین) کرے کہ دینے کا جواز موجود ہے یا نہیں۔ اور یہ بات جود کا ابتدائی مقام ہے اور جود یہ ہے کہ بلا تمیز و بلا سبب عطا کرے اور یہ بات دو انبیاء علیہم السلام پر صادق آتی ہے حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ اور حضرت محمدؐ حبیب اللہ۔ صحیح روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے

تھے جب تک کوئی مہمان نہ ہوتا۔ ایک دفعہ دو تین دن متواتر تک کوئی مہمان نہ آیا۔ اس دوران میں ایک آتش پرست کا وہاں سے گزر ہوا آپ نے پوچھا تو کون ہے اس نے جواب دیا کہ آتش پرست۔ آپ نے اس کو مہمان نوازی کے لائق نہ سمجھا اسی وقت حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب آیا کہ جس شخص کی ہم نے ستر سال پرورش کی ہے تجھ سے یہ بھی نہ ہوسکا کہ اس کو ایک روٹی دیتا۔ لیکن جب حاتم طائی کا بیٹا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اپنی چادر بچھا کر اس کو بٹھایا اور فرمایا۔

"جب کسی قوم کا سردار آئے تو اس کی عزت کرنی چاہئے"

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمیز (چھان بین) سے کام لیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمیز کئے بغیر نبوت کی چادر ایک کافر کے سامنے دراز کردی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام سخا اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ و السلام کا مقام جود تھا۔ اس سلسلے میں بہترین روش یہ ہے کہ دل میں جو پہلا خیال آئے اس پر عمل کرنا چاہئے دوسرا خیال بخل کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور پہلا خیال اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اہل اللہ اس شخص کو افضل قرار دیتے ہیں جو خیال اول کے مطابق کام کرے۔

نیشاپور میں ایک سوداگر تھا جو اکثر حضرت ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت شیخ سے کسی شخص نے کچھ طلب کیا۔ اس وقت سوداگر کے پاس ایک دینار اور کچھ ریزگاری تھی۔ پہلے اس کے دل میں خیال آیا کہ اس کو دینار دوں۔ پھر خیال آیا کہ ریزگاری دینا چاہئے چنانچہ اس نے ریزگاری دے دی۔ اس کے بعد حضرت شیخ سے دریافت کیا کہ آیا حق تعالیٰ کے ساتھ نزاع جائز ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ تو نے حق تعالیٰ کے ساتھ نزاع کیا ہے

حق تعالیٰ نے تیرے دل میں خیال ڈالا کہ ایک دینار اس کو دینا چاہئے لیکن تو نے اسے ریزگاری دے دی۔

میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت شیخ عبداللہ رود باری رحمتہ اللہ علیہ اپنے ایک مرید کے گھر گئے۔ وہ مرید گھر پر نہیں تھا۔ شیخ نے فرمایا کہ اس کے سامان کو بازار لے جا کر فروخت کردیا جائے۔ جب مرید واپس آیا تو شیخ کے اس کام سے خوش ہوا کہ جس کام میں شیخ کی خوشی ہو۔ جب اس کی بیوی آئی تو یہ حال دیکھ کر اس نے اندر جا کر اپنے کپڑے اتار دیئے اور باہر پھینک کر کہا کہ لو یہ بھی گھر کے سامان میں شامل ہے۔ اس کے خاوند نے پکار کر کہا کہ یہ تو نے تکلف کیا ہے یہ کام تم نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ عورت نے کہا کہ جو کام شیخ نے کیا ہے وہ جود میں شامل ہے ہمیں چاہئے کہ اپنے نفس کو بھی پیش کردیں تاکہ ہم بھی جود میں شامل ہوجائیں۔ مرد نے کہا یہ ٹھیک ہے جب ہم نے شیخ کو قبول کیا ہے تو تکلف سے جود کو اختیار کرنا چاہئے۔

شرح شاید شیخ کا مطلب مرید کا امتحان تھا۔ یا زائد از ضرورت سامان کا گھر سے نکالنا مطلوب تھا۔ بیوی کی نیت بھی درست تھی اس کا مطلب بغاوت نہیں تھا۔ بلکہ مرد سے بھی زیادہ سخاوت پر آمادہ تھی۔ نیز صوفیاء کا قول ہے کہ :

الصوفی لایَملِک ولا یُملک "صوفی وہ ہے جس کا کوئی مال و متاع نہ ہو اور وہ بھی کسی کی ملکیت نہ ہو یعنی متوکل علی اللہ ہو۔"

انسان کو چاہئے کہ ہمیشہ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی متابعت میں رکھے یہی وجہ ہے کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے :

الصوفیؔ دمہ ھدر و ملکہ مباح (صوفی وہ ہے جس کا خون معاف ہے

اور جس کا مال لوگوں کے لئے حلال ہے)۔ نیز میں نے شیخ ابو مسلم فارسی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ایک دفعہ میں ایک جماعت کے ساتھ حجاز کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں حلوان کے قریب کردوں نے حملہ کرکے ہمارے کپڑے چھین لئے۔ لیکن ہم نے کوئی پرواہ نہ کی اور فراخ دلی سے کام لیا۔ لیکن ہماری جماعت میں ایک ایسا آدمی تھا جس نے واویلا کیا۔ ایک کرد تلوار کس کر اس کے سر پر آگیا اور قتل کرنے لگا۔ ہم نے اس کے پاس جا کر منت سماجت کی لیکن اس نے کہا یہ آدمی کذاب ہے اس کو ضرور قتل کروں گا۔ ہم نے پوچھا آخر کیا وجہ ہے اس نے کہا کہ وجہ یہ ہے کہ یہ صوفی نہیں ہے اور اولیاء کے حق میں خیانت کررہا ہے۔ ہم نے کہا کہ کیا خیانت کررہا ہے۔ اس نے کہا کہ تصوف کا کمترین درجہ جود ہے لیکن اس کی گٹھڑی میں روٹی کے ٹکڑے بندھے ہوئے ہیں یہ کیسے صوفی ہوسکتا ہے کہ جو اپنے دوستوں کے ساتھ اس قدر بخل سے کام لے رہا ہے۔ ہم لوگ کئی سال سے تصوف کی خدمت میں مصوف ہیں۔ ہم صوفیوں کو اس لئے لوٹتے ہیں کہ ان کو علائق دنیا سے علیحدہ کیا جائے۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ایک حبشی بکریوں کی چرواہی کا کام کر رہا ہے۔ جب روٹی کھانے بیٹھا تو ایک کتا آگیا۔ اس نے ایک روٹی کتے کے آگے ڈال دی جو اس نے فوراً کھالی۔ حبشی نے دوسری روٹی ڈالی تو وہ بھی کتے نے جلدی سے کھالی پھر تیسری روٹی بھی ڈال دی۔ حضرت عبداللہ نے اس کے پاس جاکر کہا کہ روزانہ تم کو کتنی روٹیاں ملتی ہیں۔ اس نے کہا بس یہی جو آپ نے دیکھی ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ تم نے تمام روٹیاں کتے کو کیوں دے دیں۔ اس نے کہا یہ کتوں کی رہائش کی جگہ نہیں ہے یہ مسافر کتا تھا جو دور سے آیا تھا۔ مجھے یہ بات گوارا نہ ہوئی کہ اس کو محروم رکھوں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ بات بہت پسند آئی اور اس غلام سمیت تمام

بکریاں مالک سے خرید کر اس کے حوالے کر دیں۔ کہ اب یہ تمہارا مال ہے۔ لیکن حبشی غلام کی جوانمردی ملاحظہ ہو وہ تمام بکریاں فی سبیل اللہ دیکر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

ایک دفعہ کوئی سائل حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے گھر پر حاضر ہوا اور کہا کہ اے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرزند مجھ پر چار سو درہم قرضہ ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلوم سے فرمایا کہ اس کو چار سو درہم دیدیئے جائیں۔ لیکن گھر میں جا کر رونے لگے۔ جب آپ سے رونے کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ سوال کرنے سے پہلے اس کا حال دریافت نہ کیا۔ اگر پہلے مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس نے چار سو درہم قرضہ دینا ہے تو میں اس کو فوراً دے دیتا اور اس کو سوال کرنے کی زحمت نہ ہوتی۔

حضرت ابو سہل صعلوکی رحمتہ اللہ علیہ جب خیرات دیتے تھے تو لینے والے کے ہاتھ میں نہیں دیتے تھے بلکہ زمین پر رکھ دیتے تھے اور وہ اسے اٹھا لیتا تھا۔ جب ان سے وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا کہ دولت دنیا کی اتنی وقعت نہیں کہ مسلمان کے ہاتھ میں دی جائے جس سے میرا ہاتھ اوپر اور لینے والے کا ہاتھ نیچے رہ جائے۔

ایک دفعہ حبشہ کے بادشاہ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت دو سیر مشک تحفہ کے طور پر ارسال کی۔ آپ نے اس کو پانی میں پھینک دیا اور خوشبو دار ہاتھوں کو اپنے اور اصحاب کے جسم پر مل دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ کسی قوم کا سردار رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اس کو دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں جس قدر بکریاں چر رہی تھیں سب بطور تحفہ دے دیں۔ اس نے اپنی قوم کے پاس جا کر کہا اے میری قوم مسلمان ہو جاؤ کہ

محمدؐ کی جود و سخاوت کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور وہ مفلسی سے نہیں ڈرتے۔ یہ بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کہیں سے اسی ہزار درہم آئے آپ نے اسے توشک کے نیچے رکھا اور لوگوں میں تقسیم کرتے رہے اور جب تک وہ رقم ختم نہ ہوئی۔ وہاں سے نہ اٹھے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا تھا۔

یہ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ ایک درویش کے پاس بادشاہ نے تین ہزار دینار بھیجے اس وقت وہ ایک غسل خانہ میں تھے۔ چنانچہ تھیلہ لے کر جتنے لوگ وہاں کھڑے تھے ان میں تقسیم کر دیا۔ اور خالی ہاتھ چلے گئے۔ اس سے قبل ہم نے ایثار کے باب فصل نوریان میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے یہاں اختصار سے کام لیتے ہوئے کچھ بیان کر دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مپنداری کہ عشق تو رود از دل عاشق
چوں میرد مبتلا چوں خیزد مبتلا خیزد
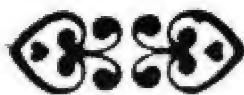
ساتویں پردہ کا کھولنا

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے :

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ "اے ایمان والو ! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

الصوم لی و انا اجزی بہ "روزہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کی جزا ہوں"۔

شرح یعنی جو روزہ رکھتا ہے میں خود اس کی جزا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ ملتا ہے۔ بعض لوگ اس حدیث کا یوں ترجمہ

کرتے ہیں "روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دیتا ہوں" لیکن ہر نیکی کا بدلہ تو اللہ تعالٰی خود دیتا ہے یہاں روزہ کی تخصیص کی کیا ضرورت تھی۔ اس لئے حدیث کا مطلب وہی ہے جو حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے کہ "روزہ میرے لئے رکھا جاتا ہے اور میں خود اس کی جزا ہوں۔"

ترجمہ یعنی میری ذات سے بہتر اور کیا جزا ہو سکتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ وہ عبادت ہے جو بطون سے تعلق رکھتی ہے اس کا ظاہر سے کوئی تعلق نہیں اور غیر اللہ کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس لئے اس کی جزا لاانتہا ہے۔ کہتے ہیں کہ بہشت میں داخلہ خدا تعالٰی کی رحمت سے ہوگا۔ درجات عبادت کی وجہ سے حاصل ہوں گے اور اس کے اندر ہمیشہ رہنا روزہ کی جزا ہے کیونکہ حق تعالٰی نے فرمایا ہے کہ **انا اجزی بہ** "میں خود اس کی جزا ہوں"۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

الصوم نصف الطریقتہ "روزہ نصف طریقت ہے"

میں نے ایسے مشائخ کو دیکھا جو ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو صرف رمضان المبارک میں روزہ رکھتے تھے۔ ہمیشہ روزہ رکھنا اجر کے لئے تھا اور صرف رمضان میں روزہ رکھنا اپنے اختیار کو ترک کرنے اور ریا سے بچنے کیلئے تھا۔ میں نے ایسے مشائخ بھی دیکھے ہیں جو روزہ رکھتے تھے لیکن کسی کو معلوم نہ ہونے دیتے تھے کیونکہ جب ان کے سامنے کھانا رکھا جاتا تو کھا لیتے تھے۔

شرح یہ نفلی روزہ کے متعلق حکم ہے۔

ترجمہ یہ سنت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مطابق ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا کہ

آج ہم نے آپ کے لئے حلوہ تیار کیا ہے آپ نے فرمایا اگرچہ آج ہمارا روزہ ہے تاہم لے آؤ میں اس کے بدلے کسی اور دن روزہ رکھ لوں گا۔

شرح یہ بھی نفلی روزہ کے متعلق ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نفلی روزہ توڑا جا سکتا ہے تو اس کے بدلے دوسرا روزہ رکھنے کا کیا مطلب۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نفل کی نیت باندھ کر نماز شروع کر دی اور پھر وضو ٹوٹ جائے تو پھر اس نفل کا دوبارہ ادا کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

ترجمہ میں نے بعض ایسے مشائخ دیکھے ہیں جو ایام بیض اور ایام عاشورہ میں روزہ رکھتے تھے اور بعض شعبان و رمضان میں بھی روزہ رکھتے تھے (ایام بیض سے مراد ہر قمری ماہ کا تیرھواں' چودھواں اور پندرھواں دن ہے) بعض صوم داؤد رکھتے تھے جسے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خیر الصیام (بہترین روزہ) قرار دیا ہے۔ یعنی ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنا۔

ایک دن میں حضرت شیخ احمد بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے پاس گیا ان کے سامنے حلوہ کا ایک تھال پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے کھانے کا اشارہ فرمایا لیکن میں نے بچپن سے کہا کہ مجھے روزہ ہے۔ انہوں نے فرمایا کس واسطے ؟ میں نے عرض کیا کہ فلاں بزرگ کے مطابق. فرمایا ایک مخلوق کو دوسری مخلوق کی موافقت کرنا درست نہیں۔ جب میں نے روزہ چھوڑنے کا ارادہ کیا تو فرمایا کہ جب کسی اور بزرگ کی موافقت درست نہیں تو میری موافقت کیسی درست ہو سکتی ہے۔ کیونکہ میں بھی مخلوق ہوں ہم دونوں برابر ہیں۔ دراصل روزہ کا مقصد امساک (نفس پر قبضہ) ہے اور تمام تصوف اسی ایک لفظ میں بھرا پڑا ہے روزے کا ادنیٰ مقصد بھوک ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ :

الجوع طعام اللّٰہ فی الارض "بھوک اللہ کی طرف سے ضیافت ہے"

لور بھوک کی ہر قوم میں تعریف آئی ہے۔ شرعی اور عقلی طور پر ایک ماہ کے روزے ہر عاقل، بالغ، مسلم، تندرست اور مقیم کیلئے فرض ہیں ان کی ابتداء ماہ رمضان کے پہلے دن سے ہوتی ہے۔ ہر روزے کیلئے نیت صحیح ہونا اور سچی محبت ہونا لازمی ہے۔

شرائط روزہ

روزے کی شرائط بہت ہیں۔ مثلاً پیٹ کو کھانے پینے سے بچائے آنکھ کو بری نگاہ اور کان کو غیر شرع آواز سے اور زبان کو بے ہودہ گفتار سے بچائے اور دل کو دنیا کی محبت سے محفوظ رکھے اس کے بعد وہ شخص روزہ دار کہلائے گا جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

"جب تو روزہ رکھے تو کان کا بھی روزہ رکھ، آنکھ کا بھی، ہاتھ کا بھی لور سارے اعضاء کا۔"

نیز فرمایا :

"بعض روزہ دار ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو بھوک اور پیاس کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

میں علی بن عثمان الجلابی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے وصیت فرمائیں" فرمایا **احبس حواسک** "اپنے حواس پر قبضہ کرو"۔ حواس پر قبضہ کرنا تمام مجاہدات کی جڑ ہے۔ کیونکہ تمام معلومات کا ذریعہ یہ پانچ دروازے ہیں : آنکھ، کان، زبان، ناک لور چھونا (حساس) یہ پانچ حواس علم و عقل کے سپہ سالار ہیں ان میں سے چار حواس کا مقام مخصوص ہے لیکن پانچواں سارے جسم پر پھیلا ہوا ہے آنکھ دیکھنے کی جگہ ہے۔ جو شکل و رنگ کو دیکھتی ہے کان سننے کا ذریعہ ہے

جس سے آواز اور بات سنائی دیتی ہے زبان ذوق یعنی چکھنے کا کام دیتی ہے اور مزہ اور بے مزہ کی خبر دیتی ہے ناک کا کام سونگھنا ہے جس سے اچھی یا بری بو کا علم ہوتا ہے اور لمس (چھونے) کا کوئی مقام مخصوص نہیں یہ خصوصیت تمام اعضاء پر پھیلی ہوئی ہے جس سے سختی' نرمی' سردی اور گرمی کا احساس ہوتا ہے۔ تمام اشیاء کا علم ان پانچ دروازوں سے ہوتا ہے سوائے الہام الٰہی کے۔ الہام الٰہی میں کوئی خرابی نہیں لیکن حواس خمسہ میں اچھائی بھی ہے اور برائی بھی۔ چنانچہ ان حواس کے ذریعے علم' عقل و ہدایت بھی حاصل ہوتی ہے اور شہوت نفس بھی۔ یعنی نیکی اور بدی کے یہ پانچوں حواس ذریعہ مشترکہ ہیں۔ مثلاً آنکھ اور کان سے حق تعالیٰ کی دوستی بھی حاصل ہوتی ہے اور جھوٹ اور نظر شہوت بھی۔ زبان' ناک اور دیگر اعضاء کے ذریعے شریعت کی موافقت بھی ہو سکتی ہے اور مخالفت بھی۔ اس لئے روزہ دار کو چاہئے کہ ان تمام حواس پر قبضہ رکھے تاکہ مخالفت کی بجائے موافقت شرع نصیب ہو۔ کیونکہ روزے کے وقت صرف کھانے پینے سے پرہیز کرنا' عورتوں اور بچوں کا کام ہے اصل روزہ لذت نفس' لہو گوئی اور غیبت کا ترک کرنا ہے نہ کہ کھانے پینے کا کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ : وَمَا جَعَلْنٰهُمْ۔

"ہم نے جسم بنائے ہیں جو کھاتے ہیں طعام"۔

نیز فرمایا: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا "کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ ہم نے تم کو کسی مقصد کے بغیر پیدا کیا ہے"۔

یعنی ہم نے ہر مخلوق کو کھانے پینے کا محتاج بنایا ہے اور کسی کو کھیل کود کیلئے پیدا نہیں کیا۔

شرح جس کھیل کود کا مقصد جسمانی ورزش ہے وہ حرام نہیں ہے۔ بلکہ جسمانی قوت کو اسلام کے لئے صرف کرنے کی تاکید آئی ہے۔

ترجمہ لہٰذا حرام چیز اور لہو و لعب سے پرہیز لازم ہے نہ کہ رزق حلال سے مجھے اس شخص کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے جو نفلی روزے رکھتا ہو لیکن فرائض ترک کر دیتا ہے۔ کیونکہ فرض کا ادا نہ کرنا گناہ ہے اور نفلی روزہ سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس بدنصیبی سے بچائے۔ جب انسان گناہ سے محفوظ رہتا ہے تو ہر کام اس کے لئے روزہ ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ جب پیدا ہوئے تو روزہ دار تھے اور جس دن دنیا سے رخصت ہوئے اس وقت بھی روزہ دار تھے۔ جب تفصیل دریافت کی گئی تو بیان کیا گیا کہ جب آپ پیدا ہوئے صبح کا وقت تھا اور شام تک آپ نے دودھ نہ پیا۔ جب وفات پائی تب بھی روزہ دار تھے یہ روایت حضرت ابو طلحہ المالکی رحمتہ اللہ علیہ نے بیان کی ہے۔

صومِ وصال

لیکن مسلسل روزہ رکھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے منع فرمایا ہے کیونکہ جب آپ صوم وصال رکھتے تو صحابہ بھی ان کی موافقت کرتے تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کو یہ کہہ کر منع کر دیا کہ **انی لست کا حد کم انی ابیت عند ربکم یطعمنی و یسقینی** "میں تمہاری طرح نہیں ہوں میں تمہارے رب کے ہاں شب گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔"

اس پر اہل مجاہدہ کا کہنا ہے کہ یہ امتناع شفقت ہے نہ کہ امتناع حرمت۔

شرح یعنی آپ نے امت پر شفقت کی وجہ سے فرمایا کہ متواتر روزے نہ رکھو نہ کہ اس وجہ سے کہ امت کیلئے متواتر روزہ رکھنا حرام کر دیا۔

ترجمہ: بعض کہتے ہیں کہ صوم وصال خلاف سنت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود صوم وصال محال ہے کیونکہ جب دن گزر گیا تو رات کیلئے روزہ نہیں ہے اور جب رات کے روزہ کی نئی نیت باندھی گئی تو وصال (تسلسل) ختم ہو گیا۔

حضرت سہل بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کا روزہ

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ ہر پندرہ دن کے بعد ایک بار کھانا کھاتے تھے اور ماہ رمضان کے دوران عید تک کچھ نہیں کھاتے تھے اور ہر رات چار سو رکعت نفل ادا کرتے تھے یہ بات انسان کے حد امکان سے باہر ہے اور فقط توفیق الٰہی سے ممکن ہے اور یہی تائید الٰہی پھر غذا بن جاتی ہے چنانچہ ایک شخص کیلئے غذا طعام ہے دوسرے کیلئے غذا تائید الٰہی ہے۔

حضرت ابو نصر سراج رحمتہ اللہ علیہ کا روزہ

حضرت شیخ ابو نصر سراج طاؤس الفقراء رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ ایک دفعہ ماہ رمضان میں بغداد پہنچے اور مسجد شونیزیہ میں معتکف ہو گئے۔ درویشوں نے آپ کو امام تسلیم کر لیا۔ حتیٰ کہ عید تک آپ نے تراویح کی امامت کی اور ماہ مبارک میں پانچ ختم قرآن کئے ہر رات خادم ایک روٹی لاتا اور کمرہ میں رکھ دیتا تھا۔ عید کے دن جب آپ نماز کیلئے عیدگاہ تشریف لے گئے تو خادم نے کمرہ کے اندر دیکھا کہ تیس روٹیاں برحال پڑی ہیں۔

حضرت حفصؒ اور ابراھیم بن ادھمؒ کا روزہ

حضرت علی بن بکار رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت حفص رحمتہ اللہ علیہ ماہ رمضان میں ہر پندرہ دن کے بعد کھاتے تھے۔ حضرت ابراھیم بن ادھم

رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ رمضان کے دوران کچھ نہیں کھاتے تھے اور ہر روز گرمی کے موسم میں مزدوری پر گندم کاٹتے اور جو کچھ وصول ہوتا درویشوں کو کھلاتے تھے اور ساری رات صبح تک نماز میں مشغول رہتے تھے۔ دوست جس قدر اصرار کرتے تھے نہ آپ کھاتے تھے نہ سوتے تھے۔

حضرت ابو عبداللہ بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ کا مجاہدہ

حضرت شیخ ابوعبداللہ خفیف رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو چالیس مسلسل چلے کر چکے تھے۔ اور میں نے ایک درویش دیکھے کہ صحرا میں ہر سال دو چلے کیا کرتے تھے اور جب حضرت ابو محمد بالعزئ دانشمند رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے رخصت ہوئے میں اس جگہ موجود تھا آپ نے اسّی دن تک کچھ نہیں کھایا تھا اور اس دوران میں ان کی کوئی نماز باجماعت فوت نہ ہوئی۔ متاخرین میں سے ایک درویش تھے انہوں نے بھی اسّی دن تک کچھ نہ کھایا اور نہ نماز باجماعت ترک کی۔ شہر مرو میں دو درویش تھے ایک کا نام مسعود تھا اور دوسرے کا شیخ بوعلی سیاہ۔ کہتے ہیں کہ شیخ مسعود رحمتہ اللہ علیہ نے شیخ بوعلی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک آدمی بھیج کر کہا کہ آؤ چالیس دن چلہ کریں اور کچھ نہ کھائیں انہوں نے کہلا بھیجا کہ آؤ ہم دن میں تین بار کھانا کھائیں اور چالیس دن تک ایک وضو سے رہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق اختلاف اب تک جاری ہے جاہل لوگ سمجھتے ہیں کہ صوم وصال جائز ہے اور اطبا اس سے انکار کرتے ہیں اور میں اس مسئلہ کا جواب دیتا ہوں تاکہ اختلاف ختم ہو جائے۔

حضرت سید علی ہجویری قدس سرہٗ کا مسئلہ صومِ وصال کے متعلق فیصلہ۔

یاد رہے کہ اس طرح صوم وصال رکھنا کہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی نہ ہو

یہ ایک کرامت ہے اور کرامت کا ظہور خواص سے ہوتا ہے نہ کہ عوام سے اور جب کرامت عوام کی چیز نہیں ہے تو اس کا عوام پر اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر کرامت کا ظہور عوام سے ہوتا تو پھر ایمان لانا لازمی ہو جاتا اور عارفین کو عرفان کا ثواب نہ ملتا۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحب معجزہ تھے آپ نے صوم وصال کو ظاہر فرمادیا اور اصحابِ کرامت کے لئے اس کا اظہار ممنوع کردیا اس وجہ سے کہ کرامت کا چھپانا اور معجزہ کا ظاہر کرنا ضروری ہے۔ معجزہ اور کرامت کے درمیان یہی فرق ہے۔ پس اختلاف دور کرنے کے لئے یہی کافی ہے۔

چلہ کا جواز

چلہ کا جواز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات سے واضح ہے جب طالب اس مقام پر پہنچتا ہے تو حق تعالیٰ سے ہمکلام بھی ہو سکتا ہے چنانچہ جب اولیاء کرام چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کلام سماعت کریں چالیس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ تیس دن کے بعد مسواک کرتے ہیں۔ اور مزید دس دن روزہ رکھتے ہیں تو لامحالہ حق تعالیٰ پوشیدہ طور پر ان سے ہمکلام ہوتے ہیں کیونکہ جو چیز انبیاء علیہم السلام کو برملا حاصل ہوتی ہے اولیاء کو پوشیدہ طور پر ملتی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا کلام اپنی ہستی مٹائے بغیر نہیں سنا جاسکتا۔ اس لئے ہستی کو مٹانے کے لئے چالیس روز تک کھانے پینے سے پرہیز کیا جاتا ہے تاکہ نفس مغلوب ہو جائے۔ اب چونکہ حصول ولایت کے لئے حد درجہ کا تزکیۂ نفس ضروری ہے اس لئے اب ہم بھوک کے فوائد اور اس کے متعلقات بیان کرتے ہیں تاکہ حقیقت آشکارا ہو جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

فصل

بھوک اور اس کے متعلقات

خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ

"ہم آزماتے ہیں تم کو کچھ خوف، بھوک سے اور مال و جان اور پھلوں کے نقصان سے ......"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے :

بطن جائع احب الیٰ اللہ تعالیٰ من سبعین عابد غافل

"بھوکا پیٹ اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے ستر غافل عابدوں سے" یاد رہے کہ بھوک کے درجات بہت بلند ہیں اور تمام اقوام و مذاہب میں اس کی تعریف آئی ہے کیونکہ بھوک سے دل و دماغ تیز تر، مہذب تر اور تندرست تر ہوتے ہیں۔ خاص کر وہ شخص جس کی طبیعت میں لالچ کم ہو اس کو اس ریاضت سے زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ **لان الجوع للنفس خضوع و للقلب خشوع** "بھوک سے نفس میں خضوع اور قلب میں خشوع پیدا ہوتا ہے" وجہ یہ ہے کہ بھوک سے نفس کا غلبہ کم ہوتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اجیعوا بطونکم و اظمئوا اکبادکم و اعروا اجسادکم لعل قلوبکم تری اللہ عیانا فی الدنیا (بھوکا رکھو اپنے پیٹ کو، پیاسا رکھو اپنے جگر کو، پرہیز

کرو جسموں کے زیب و زینت سے تاکہ تمہارے قلوب صاف مشاہدہ کریں اللہ کا اس دنیا میں) بھوک جسم کے لئے بلا ہے لیکن قلب کے لئے ضیاء (روشنی) اور روح کے لئے صفا اور سِرّ کے لئے لقا (دیدار) ہے۔ جب اس سے قلب کو ضیاء' روح کو صفا اور جان کو لقا نصیب ہو تو اگر جسم کو ذرا سی تکلیف پہنچے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا کوئی عظمت کی بات نہیں ہے اگر اس میں کوئی بزرگی ہوتی تو جانور بھی بزرگ ہوتے۔ کیونکہ پیٹ بھر کر کھانا جانوروں کا کام ہے۔ بھوک بیماروں کا علاج ہے۔ جہاں بھوک روح کی تعمیر ہے پیٹ بھر کر کھانا پیٹ کی تعمیر ہے۔ جو شخص ساری عمر تعمیر روح میں صرف کرتا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے۔ پس جو شخص حق تعالیٰ میں منہمک ہے اور جو دنیا میں منہمک ہے کس طرح برابر ہو سکتے ہیں۔ ایک ساری عمر تن پروری میں صرف کرتا ہے اور دوسرا روح پروری میں۔ ایک کی زندگی کا نصب العین پیٹ بھرنا ہے دوسرے کا نصب العین خدا تعالیٰ ہے۔ دونوں کے درمیان کتنا فرق ہے۔ ایک وہ ہے جس کے نزدیک کھانا صرف زندہ رہنے کے لئے ہوتا ہے اور دوسرا وہ ہے جس کے نزدیک زندہ رہنا صرف کھانے پینے کے لئے ہے۔

مشائخ کا کہنا ہے کہ :

الجوع طعام الصدیقین و مسلک المریدین و قید الشیاطین۔

(بھوک صدیقوں کا کھانا' مریدین کا دستور اور شیطان کی قید ہے)۔ قضا و قدر سے قطع نظر حضرت آدم ؑ کا بہشت سے نکلنا اور حق تعالیٰ کے قرب سے محروم رہنا ایک لقمہ کھانے کا نتیجہ ہے۔ دراصل جو شخص بھوک کی حالت میں بے قرار ہوتا ہے وہ مجاہد نہیں کیونکہ جو شخص کھانے کے لئے بے قرار ہے وہ کھانے والے کے برابر ہے۔ پس حقیقی تارک طعام وہ ہے جو طعام سے بے نیاز ہے جو شخص بھوک سے بیتاب ہے اور اپنے آپ کو تارک طعام کہتا ہے وہ پیٹو ہے اور شیطان کا

قیدی اور نفس کا غلام ہے۔ حضرت شیخ کتانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

" مرید وہ ہے جس میں یہ تین چیزیں پائی جائیں۔ وہ اس وقت سوئے جب نیند کا غلبہ ہو۔ اس وقت بات کرے جب ضروری ہے اور اس وقت کھائے جب فاقہ سے مجبور ہو جائے "۔

فاقہ کی مقدار

بعض کے نزدیک فاقہ یہ ہے کہ دو دن رات کچھ نہ کھائے، بعض کے نزدیک تین دن، بعض کے نزدیک ایک ہفتہ اور بعض کے نزدیک چالیس دن ہے کیونکہ محققین کے نزدیک حقیقی بھوک چالیس دن کے بعد لگتی ہے جو صرف جان کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ اس سے پہلے جو کچھ ہے وہ حرص اور غرور نفس ہے۔

خدا تجھے معاف کرے تو جان لے کہ اہل معرفت کے رگ و ریشہ میں اسرار خداوندی بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے قلوب بارگاہ معلیٰ کی جلوہ گاہ ہیں ان کے قلوب سے ان کے سینہ کی طرف ایک دروازہ کھلتا ہے جس پر دو چوبدار بیٹھے ہوئے ہیں ایک عقل دوسرا شہوت ۔ روح عقل کی مدد کرتا ہے اور نفس شہوت کی۔ چنانچہ انسان کو جس قدر خوراک ملتی ہے اس کا نفس اتنا زیادہ موٹا ہوتا ہے اور حرص و ہوا کی اتنی پرورش ہوتی ہے اس سے نفس کا تمام اعضاء پر غلبہ ہو جاتا ہے اور رگ و ریشہ پر حجابات چھا جاتے ہیں لیکن طالب جس قدر تن پروری سے باز رہتا ہے اس کا نفس کمزور تر اور عقل قوی تر ہو جاتا ہے اور اس کے رگ و ریشہ پر سے نفس کا غلبہ کم تر ہوتا ہے اور انوار و تجلیات کا ظہور زیادہ تر ہوتا ہے۔ پس جب نفس مرگیا اور اپنی حرکات سے باز آیا تو باطل مٹ جاتا ہے اور حق کا ظہور ہوتا ہے اور مرید کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوالعباس قصاب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "عبادت اور معصیت کا انحصار دو روٹیوں پر ہے جب کھاتا ہوں تو اپنے اندر نفس کا غلبہ پاتا ہوں اور جب ترک کرتا ہوں تو اپنے اندر عبادت کا غلبہ پاتا ہوں"۔ لیکن اگر بھوک سے مشاہدۂ حق حاصل نہ ہو جو تمام مجاہدات کا ماحصل ہے تو پھر اس بھوک سے وہ سیری بہتر ہے جس کے ساتھ مشاہدہ ہو۔ کیونکہ مشاہدہ معرکہ گاہ مرداں ہے جبکہ مجاہدہ بچوں کا کھیل ہے کسی نے خوب کہا ہے :

فالشبع بمشاهد الحق خير من الجوع بمشاهد الخلق

(وہ سیری جس کے ساتھ مشاہدۂ حق ہو اس بھوک سے بہتر ہے جس سے مشاہدۂ خلق ہو)۔ اس مضمون پر اقوال بہت ہیں جو طوالت کے خوف سے ترک کئے جا رہے ہیں۔ وباللہ التوفیق۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یا رب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازو
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

باب ۲۴
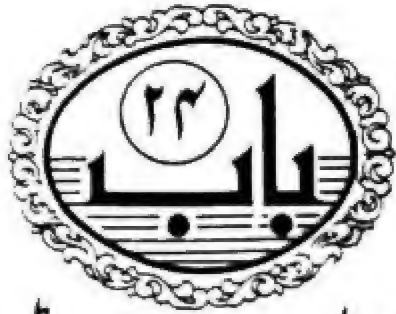
آٹھویں حجاب کا اٹھنا

حج کے بیان میں

حج کا فرض ہونا

حق تعالیٰ عزوجل نے فرمایا ہے :

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا

(اللہ تعالیٰ کے لئے لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے حسب استطاعت) یعنی صحت عقل، بلوغ، اسلام اور استطاعت ہو تو حج فرض ہے جو مشتمل ہے حد میقات سے احرام، وقوف عرفات، طواف زیارت پر۔ اس پر سب کا اتفاق ہے لیکن صفا مروہ کے درمیان دوڑنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے (کہ حج کے لئے ضروری ہے یا نہیں)۔ لیکن احرام کے بغیر حرم میں داخل نہیں ہونا چاہئے اور حرم کو اس لئے حرم کہتے ہیں کہ اس کے اندر مقام ابراہیم ہے اور جائے امن ہے حضرت ابراہیم کے دو مقام تھے ایک آپ کا جسم دوسرا دل۔ آپ کا مقام تن

مکہ تھا اور مقام دل خلت (یعنی دوستی)۔

مقام جسم کے لوازمات

پس جو شخص مقام تن کا خواہشمند ہے اس کو چاہئے کہ تمام لذات اور خواہشات نفسانی کو ترک کرے اور احرام باندھ لے گویا کفن پہن لے' شکار سے باز رہے' تمام حواس کو قابو میں رکھے' عرفات میں حاضری دے' وہاں سے مزدلفہ اور مشعر الحرام جائے اور کنکریاں جمع کرے۔ مکہ جا کر طواف کرے اور پھر منیٰ آکر وہاں تین دن قیام کرے اور شیطانوں کو کنکریاں مارے۔ سر کے بال منڈوائے' قربانی کرے اور احرام کھول کر اپنے کپڑے پہنے۔

مقام خلت کے لوازمات

لیکن جو شخص حضرت ابراہیمؑ جیسے مقام خلت کا طلبگار ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مرغوبات (خواہشات نفس) کو ترک کرے' لذات نفس سے پرہیز کرے اغیار یعنی غیر اللہ کی یاد دل میں نہ رکھے کیونکہ خلق کی طرف توجہ کرنا باعث ضرر ہوتا ہے اس کے بعد عرفات یعنی مقام معرفت حق میں قیام کرے' وہاں سے مزدلفہ کا قصد کرے یعنی جائے الفت کا۔ وہاں سے طواف کعبہ کا قصد کرے یعنی مقام تنزیہہ (ذات بحت) کی طرف رجوع کرے۔ (جو مقام فنا فی اللہ ہے)۔ اس کے بعد خواہشات نفس اور خیالات فاسد کے پتھر منیٰ میں پھینک کر نفس کو قربان گاہ حق میں قربان کرے۔ یہ ہے مقام خلت کا حصول۔ پس مقام تن میں داخل ہونا دشمن کی تلوار سے امن و امان ہے اور مقام دل میں داخل ہونے سے مراد حق تعالیٰ سے جدائی ختم کرکے وصال کا حاصل کرنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

" حاجی لوگ خدا تعالیٰ کا وفد ہیں اللہ تعالیٰ ان کو دیتا ہے جو کچھ طلب

کرتے ہیں اور قبول کرتا ہے جو دعائیں وہ مانگتے ہیں"

لیکن بعض حضرات ایسے ہیں جو نہ کچھ طلب کرتے ہیں نہ دعا مانگتے ہیں بلکہ تسلیم و رضا اختیار کرتے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (جب اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ فرمان قبول کرو تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے رب العالمین کا فرمان قبول کیا)۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مقام خلت پر پہنچے تو تمام علائق دنیا سے فارغ ہوگئے اور غیر اللہ سے رشتہ توڑ دیا۔ اب حق تعالیٰ نے چاہا کہ آپ کی خصوصیات کو دنیا پر ظاہر کرے چنانچہ نمرود کے ذریعے آپ کو اپنے والدین سے جدا کرایا۔ آگ جلائی گئی۔ ابلیس نے وہاں پہنچ کر منجنیق ایجاد کی آپ کو گائے کی کھال میں سی کر منجنیق پر رکھا گیا اس وقت حضرت جبرائیل نے آکر منجنیق کو پکڑ لیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ **ھل لک الی من حاجتہ** (کیا آپ کو میری امداد کی ضرورت ہے) آپ نے جواب دیا کہ :

اما الیک فلا (لیکن آپ سے نہیں) جبرائیل نے کہا کیا آپ کو خدا کی امداد کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا **حسبی من سوالی علمہ بحالی** (مجھے سوال کرنے کی ضرورت نہیں وہ میرے حال سے آگاہ ہے)۔ یعنی وہ جانتا ہے کہ اس کی خاطر مجھے آگ میں ڈالا جارہا ہے۔ لہٰذا میری زبان بند ہے اس پر حضرت محمدؐ بن الفضل رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس شخص پر تعجب آتا ہے جو دنیا میں خانہ خدا کی طرف تو جاتا ہے لیکن مشاہدۂ خدا طلب نہیں کرتا۔ خانہ خدا کی زیارت تو کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی لیکن مشاہدۂ حق دائمی ہے۔ اگر خانہ سنگ کی زیارت جس پر سال میں ایک بار حق تعالیٰ کی نظر ہوتی ہے فرض ہے تو خانہ دل کی زیارت زیادہ اہم ہے جس پر ہر روز حق تعالیٰ کی تین سو ساٹھ بار نظر رحمت ہوتی ہے اور اہل حقیقت کو قدم قدم پر نئے انعامات ملتے ہیں اور ہر

قدم پر نئی خلعت پاتے ہیں۔

حضرت ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ مجھے عبادت کی جزا کل قیامت کو ملے گی اس کو کہہ دو کہ اس نے آج عبادت کی ہی نہیں۔ کیونکہ اصل عبادت وہ ہے کہ جس کی جزاء اسی وقت مل جاتی ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "جب میں پہلی بار حج کو گیا تو صرف خانہ خدا کو دیکھا۔ جب دوسری بار گیا تو خانہ خدا کو بھی دیکھا اور صاحب خانہ کو بھی جب تیسری بار گیا تو خداوند تعالیٰ کو دیکھا خانہ خدا کو معدوم پایا۔ غرضیکہ حرم اس کے لئے ہے جسے مشاہدہ حاصل ہے جس شخص کیلئے سارا جہان مشاہدہ گاہ قرب ہے اور خلوت گاہ محبت نہیں اس کو دوستی (ولایت) کی بھی خبر نہیں جب بندہ کو کشف حاصل ہے تو سارا جہان اس کے لئے حرم ہے اور جب وہ محجوب (محروم) ہے حرم پاک بھی اس کے لئے سب سے زیادہ ظلمت کدہ ہے کسی نے خوب کہا ہے **اظلم الاشیاء دار الحبیب بلا حبیب** "دنیا میں سب سے زیادہ تاریک مقام محبوب کا گھر ہے جب محبوب موجود نہ ہو"۔

لہٰذا اصل چیز مقام خلت میں مشاہدۂ حق ہے جس کا سبب حق تعالیٰ نے زیارت کعبہ کو بنایا ہے نہ کہ کعبہ کو۔ تاہم سبب کو محض سبب ہونے کی وجہ سے دیکھنا چاہئے نہ کہ اصل مقصود ہونے کی نیت سے۔ معلوم نہیں عنایت حق کس کمین گاہ سے رونما ہوتی ہے اور طالب کی مراد کہاں سے پوری ہوتی ہے۔ چنانچہ مردان خدا کا سفر طے کرنے اور کوہ و دشت سے گزرنے کا مقصد صرف زیارت کعبہ نہیں بلکہ دوست مقصود ہے۔ دوستان خدا کیلئے زیارت حرم حرام ہے ان کیلئے حرم ہے عشق حبیب میں جلنا اور شوق ملاقات میں گھلنا۔

حج المقربین

ایک دفعہ ایک شخص حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں

حاضر ہوا آپ نے پوچھا کہاں سے آئے ہو۔ اس نے کہا ابھی حج کر کے آیا ہوں۔ آپ نے پوچھا کیا تم نے حج کیا اس نے کہا جی ہاں آپ نے فرمایا جب تم گھر چھوڑ کر نکلے تو کیا گناہوں کو بھی چھوڑ کر نکلے۔ اس نے کہا نہیں' آپ نے فرمایا پس تم نے سفر ہی نہیں کیا۔ آپ نے پوچھا جب تم نے راستے میں ہر شب نئی منزل پر قیام کیا تو کیا تم نے قرب حق کی منازل بھی طے کیں۔ اس نے کہا نہیں فرمایا تو تم نے منازل طے ہی نہیں کیں۔ آپ نے پوچھا کہ جب تم نے میقات پر پہنچ کر احرام باندھا تو کیا تم صفات بشریت سے جدا ہوئے۔ اس نے کہا نہیں فرمایا پس تم نے احرام باندھا ہی نہیں۔ آپ نے پوچھا جب تم نے عرفات میں وقوف (قیام) کیا تو کیا مقام کشف پر بھی وقوف کیا۔ اس نے کہا نہیں آپ نے فرمایا تو پھر تم نے عرفات میں وقوف کیا ہی نہیں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ جب تم نے مزدلفہ میں قیام کیا تو کیا تم نے تمام دنیاوی خواہشات سے نجات پائی اس نے کہا نہیں آپ نے فرمایا تو پھر تم نے مزدلفہ میں قیام کیا ہی نہیں۔ آپ نے پوچھا کہ جب تم نے کعبہ کا طواف کیا تو کیا باطنی آنکھوں سے جمال حق تعالیٰ کا مشاہدہ کیا اس نے کہا نہیں فرمایا تو پھر تم نے طواف کیا ہی نہیں آپ نے پوچھا کہ جب تم نے صفاء و مروہ کے درمیان سعی کی تو کیا حقیقت مقام صفاء اور مقام مروہ کا کشف ہوا اس نے کہا نہیں آپ نے فرمایا تو پھر تم نے سعی کی ہی نہیں۔ فرمایا جب تم منیٰ پہنچے تو کیا تمہاری ہستی ساقط ہو گئی۔ اس نے کہا نہیں آپ نے فرمایا تو پھر تم منیٰ میں پہنچے ہی نہیں۔ آپ نے کہا جب تم نے قربانی کی تو کیا اپنے نفس کو قربان کیا۔ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا تو تم نے قربانی کی ہی نہیں۔ فرمایا جب تم نے کنکریاں پھینکیں تو کیا تم نے اپنی خواہشات نفسانی کو نکال کر پھینک دیا۔ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے کنکریاں پھینکی ہی نہیں۔ پس تم نے حج نہیں کیا واپس جاؤ اور پھر حج کرو تاکہ مقام ابراہیم حاصل ہو۔ (یعنی مقام خلت یا دوستی حق)۔

سنا ہے کہ ایک بزرگ خانہ کعبہ میں بیٹھے یہ اشعار پڑھ رہے تھے "بار خدایا حج کے دوران میں اپنی محبوبہ کے خیال میں رہا۔ جس سے میرا حج فاسد ہوگیا۔ اس لئے دوسرے سال آکر پھر حج کروں گا کیونکہ پہلا حج کیسے قبول ہوسکتا ہے"۔ حضرت فضیل ابن عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں میں نے ایک نوجوان دیکھا جو سر جھکائے خاموش کھڑا تھا جب کہ تمام لوگ دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں نے کہا "اے جوان تم بھی دعا مانگو خاموش کیوں کھڑے ہو"۔ اس نے کہا کہ میرے دل سے کوئی دعا نہیں نکلتی کیا کروں کیونکہ میرا مشاہدہ گم ہوگیا ہے نعرہ لگایا اور گر کر جاں بحق ہوگیا۔

حضرت ذوالنون رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے منیٰ میں دیکھا کہ ایک شخص خاموش بیٹھا ہے۔ جب کہ تمام لوگ قربانیوں میں مشغول تھے۔ میں نے اسے غور سے دیکھنا شروع کیا تو اس نے مناجات کی کہ خدایا ساری دنیا قربانیاں دے رہی ہے میں بھی تیری بارگاہ میں اپنے نفس کی قربانی دیتا ہوں میری قربانی قبول فرما۔ یہ کہتے ہوئے اپنی انگلی سے گردن کی طرف اشارہ کیا اور گر کر مر گیا۔ رحمتہ اللہ علیہ۔

اقسام حج

پس حج کی دو اقسام ہیں ایک حج حضوری ' دوسرا حج غیوب۔

شرح یعنی حق تعالیٰ کے ساتھ مقام حضوری۔ اس مقام کو معیت ' قرب اور فنا فی اللہ کے ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : وَهُوَ مَعَكُمْ (وہ تمہارے ساتھ ہے) اس سے بھی یہی معیت ' حضوری اور قرب و وصال ہے۔

ترجمہ جس شخص کو کعبہ میں مقامِ قرب و وصال حاصل نہیں تو گویا وہ اپنے گھر

میں بیٹھا ہے اور جس شخص کو اپنے گھر میں قرب و وصال حق حاصل ہے وہ گویا خانہ کعبہ میں بیٹھا ہے خواہ گھر میں ہے۔ لہٰذا مشاہدہ اور قرب حق کا انحصار حج پر نہیں بلکہ مجاہدہ پر ہے نیز ایک لحاظ سے مجاہدہ بھی کشف کا ذریعہ نہیں بلکہ مشاہدہ کا انحصار فضل ربی ہے۔ پس حج کا مقصد مشاہدۂ کعبہ نہیں بلکہ مشاہدۂ حق ہے۔ اب ہم مشاہدۂ حق کے مضمون کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ تجھے مقصود حاصل ہو۔

باب المشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

" اجیعوا بطو نکم ' دعوا الحرص ' و اعروا اجساد کم ' قصروا الامل ' واظماء وا اکباد کم ' دعوا الدنیا لعلکم ترون اللہ بقلوبکم "

(اپنے پیٹ کو بھوکا رکھو' حرص ترک کرو' جسم کی زینت کو چھوڑ دو' امیدوں کو کوتاہ کرو' جگر کو پیاسا رکھو' حب دنیا ترک کرو تاکہ تمہارے قلوب کو مشاہدۂ حق حاصل ہو)۔

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سوال کے جواب میں فرمایا۔ مرتبہ احسان یہ ہے کہ :

" ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک "

(اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اس کو دیکھتے ہو' اگر تم دیکھ نہیں سکتے تو وہ تو تم کو دیکھتا ہے)۔

نیز حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ :

" یا داود اتد ری ما لمعرفتی ' قال لا ' قال ھی حیٰوۃ القلب لی

مشاھدتی"

(اے داؤد کیا تو جانتا ہے کہ میری معرفت کیا چیز ہے۔ عرض کیا نہیں' فرمایا یہ حیات قلب ہے میرے مشاہدہ کے ساتھ)۔

صوفیاء کرام کے نزدیک لفظ مشاہدہ کا مطلب ہے دل کی آنکھوں سے حق تعالیٰ کا دیدار خلوت اور جلوت میں بغیر چون و چگوں کے۔ حضرت ابوالعباس بن عطا رحمتہ اللہ علیہ حق تعالیٰ کے قول اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ کے متعلق فرماتے ہیں کہ : اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ **(بالمجاھدۃ)** ثُمَّ اسْتَقَامُوْا **(علی بسلط المشاھدۃ)**

(جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے مجاہدہ کے ساتھ اور پھر مقام مشاہدہ پر جم گئے)

حقیقت مشاہدہ

حقیقت مشاہدہ دو اقسام پر ہے ایک پکے یقین کے ذریعے دوسرے غلبۂ محبت کے ذریعے۔ غلبۂ محبت کی وجہ سے سالک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ کلیتہً حدیثِ دوست بن جاتا ہے اور دوست کے بغیر کچھ نہیں دیکھتا۔ حضرت محمدؒ بن واسع رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

ما رائیت شیئا قطّ الاورائیت اللّٰہ فیہ بصحتہ الیقین

(میں نے ہرگز کسی چیز کو نہ دیکھا سوائے اس کے کہ اللہ کو اس میں دیکھا صحت یقین کے ساتھ)

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ : **ما رائیت شیئا الاورائیت اللّٰہ فیہ قبلہ**

(میں نے جس چیز کو دیکھا اس میں حق تعالیٰ کا مشاہدہ کیا)۔ اس سے مراد

حق تعالیٰ کا دیدار ہے کائنات کی ہر چیز میں۔

حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

ماراَیت شیئا قط الا اللہ (میں نے ہرگز نہ دیکھا کسی چیز کو مگر اللہ کو دیکھا) یعنی غلبۂ محبت و مشاہدہ سے۔

غرضیکہ ایک وہ ہے جو فعلِ حق تعالیٰ دیکھتا ہے یعنی وہ جو حق تعالیٰ کو دیکھتا ہے چشم باطن سے۔ اور چشم ظاہر سے فعل کو دیکھتا ہے اور دوسرا وہ ہے جس کو فاعل کی محبت اسے ہر چیز سے بیگانہ کردیتی ہے حتیٰ کہ خود فاعل کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پہلا طریقہ (فعل کا دیکھنا) طریق استدلال کہلاتا ہے اور دوسرا طریقہ طریق جذب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک وہ ہے جو دلائل منطق سے اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو جذب اور عشق حق میں سرشار ہے جس کے لئے دلائل حجاب بن جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو محض محبوب کی معرفت حاصل کرلیتا ہے وہ اس کے غیر کے ساتھ سکون نہیں پاسکتا' اور جو محض حق تعالیٰ کو دوست رکھتا ہے کسی چیز پر نگاہ نہیں کرتا۔ اور ہر قسم کے استدلال اور اختلاف کو چھوڑ دیتا ہے۔ جیساکہ حق تعالیٰ نے شب معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق فرمایا ہے۔

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (نہ اس کی آنکھ جھپکی نہ کسی اور طرف دیکھا) یعنی شدت شوق اور غلبہ محبت کی وجہ سے۔ کیونکہ جب دل میں محبت گھر کرلیتی ہے تو آنکھ غیر اللہ کو نہیں دیکھتی۔ جیساکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے :

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (آنحضرتؐ نے دیکھا حق تعالیٰ کی اعلیٰ قدرتوں کو) ۔

نیز فرمایا :

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ **ای ابصار العیون من الشهوات و ابصار القلوب عن المخلوقات**

(کہہ دیجئے مومنوں کو کہ آنکھیں نیچی رکھیں یعنی جسمانی آنکھوں کو شہوات سے بچائیں اور قلب کی آنکھوں کو مشاہدۂ خلق سے)

پس جو شخص چشم سَر کو شہوات سے باز رکھتا ہے وہ لامحالہ حق تعالیٰ کو چشم سِرّ سے دیکھتا ہے۔ **فمن کان اخلص مجاهدة کان اصدق مشاهدة** (جس نے سب سے زیادہ خالص مجاہدہ کیا سب سے زیادہ خالص مشاہدہ سے سرفراز ہوا)۔ کیونکہ ظاہری مجاہدہ کا باطنی مشاہدہ سے گہرا تعلق ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ **من غض بصره عن اللّٰه طرفته عین لا یهتدی طول عمره** (جس نے ایک لمحہ کے لئے آنکھ کو اللہ سے باز رکھا گویا ساری عمر ہدایت سے محروم رہا)۔ اس وجہ سے کہ غیر اللہ سے التفات کرنا حق تعالیٰ سے روگردانی ہے اور جس نے حق سے روگردانی کی برباد ہوا۔ پس اہل مشاہدہ اس لئے زندہ رہتے ہیں کہ ہمیشہ حق تعالیٰ کے مشاہدہ میں رہیں اور عمر کا جو حصہ غیبت میں گزارا اس کو زندگی نہیں سمجھتے۔ اس کو موت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ آپ کی عمر کتنی ہے فرمایا چار سال۔ انہوں نے کہا یہ کس طرح تو آپ نے فرمایا کہ میں ستر سال حجاب میں رہا۔ لیکن چار سال ہوئے کہ مشاہدۂ حق حاصل ہوا ہے۔ حجاب کا عرصہ عمر میں شامل نہیں کرتا۔

حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ یہ دعا مانگتے تھے :

"بار خدایا بہشت اور دوزخ کو اپنے غیب کے خزانوں میں چھپا دے تاکہ اس کا خیال لوگوں کے دل سے نکل جائے اور تیری خالص عبادت کریں اور

بہشت کی خاطر کوئی تیری عبادت نہ کرے"۔ بہشت کی طرف طبعاً ہر شخص کا میلان ہے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ اس کی خاطر عبادت کی جائے لیکن چونکہ اس کے دل میں محبت نہیں ہوتی لامحالہ عاقل مشاہدۂ حق سے محجوب (محروم) ہوتا ہے۔

مشاہدۂ حق میں اختلاف کی وجہ

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد شب معراج حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوا۔ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ دیدار حق حاصل ہوا۔ ان روایات سے خلق خدا میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے لیکن اہل حق نے جو حق بات تھی سمجھ لی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ دیدار ہوا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ چشم باطن سے دیدار ہوا اور جب آپؐ نے فرمایا کہ دیدار نہ ہوا تو اس سے مراد چشم ظاہر سے دیدار کی نفی تھی۔ کیونکہ ان سننے والے حضرات میں سے ایک اہل باطن تھے دوسرے اہل ظاہر ہر ایک کے حال کے مطابق کلام فرمایا۔ چشم باطن سے دیکھنا ہی تو اصل مشاہدہ ہے۔ چشم ظاہر سے نہ ہوا تو کیا مضائقہ۔ جیساکہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

"اگر خداوند تعالیٰ مجھ سے کہیں کہ مجھے دیکھو تو نہیں دیکھوں گا کیونکہ محبت کے میدان میں آنکھ بھی غیر ہے اور غیر کے ذریعے مشاہدہ مجھے پسند نہیں۔ جب مجھے چشم ظاہر کے بغیر مشاہدہ حاصل ہے تو آنکھ کے واسطہ کو کیا کروں گا۔"

واللہ الھادی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ شعر

میں تیرے دیکھنے والوں کا رشک کرتا ہوں لیکن جب خود تیری طرف دیکھتا ہوں تو آنکھیں بند کرلیتا ہوں کیونکہ آنکھ بھی غیر (بیگانہ) ہے۔

شرح حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ آنکھ بھی غیر ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ آنکھ جسمانی ہے جو مشاہدۂ حق سے قاصر ہے۔ مشاہدۂ حق صرف چشم باطن سے ممکن ہے۔ نہ کہ چشم ظاہر سے۔

ترجمہ جب حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ خدا تعالیٰ کا دیدار کرنا چاہتے ہیں تو فرمایا نہیں، کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیدار طلب کیا تو انکار ہوا۔ لیکن جب محمد علیہ السلام نے نہ طلب کیا تو دیدار ہوگیا۔ ہماری طلب ہمارے لئے حجاب اکبر ہے۔ کیونکہ محبت میں طلب ممنوع ہے اور باعث حجاب بن جاتی ہے۔ جب طلب دنیا میں ختم ہوجاتی ہے تو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔

شرح طلب اس لئے حجاب بن جاتی ہے کہ طلب کے وقت دوئی ہوتی ہے۔ ایک طالب، دوسرا مطلوب۔ لیکن مشاہدہ دوئی کے مٹ جانے کے بعد ہوتا ہے نہ کہ دوئی کی حالت میں۔ دوئی خود حجاب ہے اس لئے فرمایا کہ دنیا عقبیٰ بن جاتی ہے عقبیٰ دنیا۔ کیونکہ دنیا کا عقبیٰ بن جانا اس وقت ہوتا ہے جب دوئی مٹ جائے۔

ترجمہ حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ : "حق تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ اگر دنیا و آخرت میں دیدار سے محروم رہیں تو مطرود ہوجائیں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرات دنیا و آخرت میں دائمی طور پر غرق رہتے ہیں اور محبت میں زندہ رہتے ہیں اس لئے جب مشاہدہ سے محروم ہوتے ہیں تو مطرود ہوجاتے ہیں۔

شرح اس کا مطلب یہ نہیں کہ واقعی راندۂ درگاہ ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو محروم اور بے دین سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے وصل اور مشاہدۂ حق کا۔ اگر یہ حاصل نہ ہو تو یہ بلند نظر حضرات اپنے آپ کو مسلمان

ہی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کو مشاہدہ حاصل ہوا تو بارگاہ الٰہی میں مناجات کیں کہ اب میں کفر سے تائب ہوا اور اسلام قبول کرتا ہوں۔

ترجمہ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ لڑکے ایک جوان کو پتھر مار رہے تھے۔ میں نے کہا کس وجہ سے مار رہے ہو۔ انہوں نے کہا یہ دیوانہ ہے اور کہتا ہے کہ میں خدا کو دیکھتا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اے جوان کیا یہ لوگ سچ کہتے ہیں یا جھوٹ بولتے ہیں۔ اس نے کہا میں سچ کہتا ہوں کیونکہ اگر میں حق تعالیٰ کو ایک لمحہ کے لئے نہ دیکھوں اور محجوب ہو جاؤں تو عبادت کیسے کروں۔ یہاں بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ رویت (دیدار) اور مشاہدہ کے لئے (حق تعالیٰ کی) صورت کا متصور ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے خداوند تعالیٰ شکل و صورت سے بالاتر ہے اور جو شخص خداوند تعالیٰ کی شکل و صورت کا قائل ہے وہ وہم و گمان میں مبتلا ہے یہ فرقہ حشویہ (قائلان تجسیم) کا عقیدہ ہے۔ حق تعالیٰ جسم سے پاک ہے۔ اس لئے عقل، فہم و وہم میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ مشاہدۂ حق سے مراد حق تعالیٰ کا جسمانی مشاہدہ نہیں بلکہ ویسا مشاہدہ ہے جو آخرت میں ہوگا۔ اب چونکہ حق تعالیٰ اس دنیا میں اور آخرت میں جسم سے پاک ہے دونوں جہانوں میں اس کا مشاہدہ یکساں ہے۔ چونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بات پر متفق ہیں کہ آخرت میں مشاہدۂ حق جائز ہے اس لئے دنیا میں بھی اسی قسم کا مشاہدہ جائز ہوا۔ دونوں جہانوں کے مشاہدہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان دونوں مشاہدات میں صرف مشاہدہ کا جواز ثابت کیا گیا ہے کسی نے مشاہدہ کا دعوہ نہیں کیا کہ مجھے مشاہدہ ہوا ہے یا اب نہیں ہے۔ کیونکہ مشاہدہ کا تعلق باطن سے ہے اس کا دعوہ زبان سے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ زبان کا تعلق عالم ظاہر (مادی جہان) سے ہے۔ جب زبان سے مشاہدہ

کا دعوہ کیا جاتا ہے تو یہ مشاہدہ نہیں ہوتا بلکہ دعوہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جو چیز انسان کے عقل میں نہ آسکے (یعنی مشاہدہ) اس کو زبان کیسے بیان کر سکتی ہے۔ زبان تو عالم مجاز (مادی دنیا) کی بات کر سکتی ہے **لان المشاهدة قصر اللسان بحضور الجنان** (مشاہدہ قلب سے ہوتا ہے زبان اس کے بیان سے قاصر ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ کلام سے سکوت برتر ہے۔ کیونکہ سکوت علامت مشاہدہ ہے اور کلام جسمانی آنکھ سے دیکھنے پر منحصر ہے۔ کسی چیز کو آنکھ سے دیکھنے (شہود) اور قلب سے مشاہدہ کرنے میں بڑا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے غایت مقام قرب حق میں فرمایا :

لا احصی ثناء علیک (میں تیری حمد و ثنا کماحقہٗ بیان کرنے سے قاصر ہوں) اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ مقام مشاہدہ پر تھے اور مشاہدہ کا مطلب ہے کمال یگانگی (ایک کے ساتھ ایک ہوجانا)۔ اور یہ وہ مقام ہے جو عبارت یا بیان میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ یگانگی کو بیان کرنا بیگانگی (بُعد) ہے۔ اس کے بعد فرمایا **انت کما اثنیت علی نفسک** (تیری ذات ایسی ہے جیساکہ تونے خود بیان فرمایا ہے) یہاں تیرا ثنا بیان کرنا میرا بیان کرنا ہے اور تیری ثنا میری ثنا ہے۔ میری زبان میں یہ اہلیت نہیں کہ تیرے مقام کو بیان کرسکے۔ اور نہ میرا مقام (قرب) بیان کرسکتی ہے۔ کسی اہل معرفت نے خوب کہا ہے :

"میری تمنا تھی کہ تیرا مشاہدہ کروں لیکن جب مشاہدہ ہوا تو مبہوت ہوکر رہ گیا نہ زبان میرے قابو میں رہی نہ آنکھ"۔ یہ ہے مشاہدۂ حق جو مختصر طور پر یہاں بیان کیا گیا۔ وباللہ التوفیق۔

شرح مشاہدۂ حق سے مراد مقام فنا فی اللہ ہے۔ جب عبادات، طاعات، ریاضات، مجاہدات، شب بیداری اور کثرت ذکر و شغل کے بعد سالک کو غایت درجہ کا تزکیۂ نفس حاصل ہوتا ہے تو اس کی روح ذاتِ حق سے اس قدر قریب

ہوجاتی ہے کہ روح حق (ذات حق) میں واصل اور گم ہوجاتی ہے اور دوئی مٹ جاتی ہے اس مقام قرب کو فنا فی اللہ کہا جاتا ہے۔ اس مقام کو مشاہدہ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ بات اس لئے بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ عام طور پر لفظ مشاہدہ کے اور معنی لئے جاتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز کا میں نے مشاہدہ کیا تو دو چیزیں ذہن میں آتی ہیں مشاہدہ کرنے والا اور وہ چیز جس کا مشاہدہ کیا جائے۔ لیکن علم روحانیت کی اصطلاح میں لفظ مشاہدہ سے وہ حقیقت مراد نہیں جو عام طور پر مروج ہے۔ علم روحانیت کی اصطلاح میں شاہد و مشہود کا تصور مفقود ہے۔ مقام فنا میں نہ شاہد ہے نہ مشہود۔ بلکہ شاہد مشہود میں گم ہوکر اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے جس کے بعد نہ اس کی زبان باقی ہوتی ہے جس سے کلام کرے اور اپنا حال بیان کرے' اور نہ شعور کہ جس سے الفاظ تیار کرے اور نہ ہی عقل و شعور و الفاظ میں یہ فنا کی کیفیت آسکتی ہے۔ اس لئے سکوت ہی سکوت طاری ہوتا ہے۔

لیکن جہاں دیگر مذاہب یعنی ہندو مذہب' عیسائیت اور بدھ مت میں دائمی فنا اختیار کی جاتی تھی' اسلام میں فنا کے بعد بقا باللہ کا مقام ہے۔ یعنی جب طالب ذات حق میں واصل ہوکر حق تعالیٰ کی صفات سے متصف ہوجاتا ہے تو اس کو دوبارہ اپنی خودی یا اپنی ہستی میں واپس آنا پڑتا ہے تاکہ دنیاوی امور میں حصہ لے سکے۔ فریضہ ہدایت خلق ادا کرے اور خود بھی فرائض کی پابندی کرسکے کیونکہ مقام فنا میں استغراق ہی استغراق ہے۔ نہ انسان حق عبادت ادا کرسکتا ہے نہ فرائض زندگی۔ نہ فرائض ہدایت خلق۔ مقام بقا باللہ پر وہ استغراق سے نکل کر ہوش میں آتا ہے اور فرائض زندگی پہلے سے زیادہ احسن طریق پر انجام دے سکتا ہے کیونکہ اب وہ صفات باری تعالیٰ سے متصف ہوکر . بمصداق حدیث قدسی (بخاری) حق تعالیٰ کی بصیرت سے دیکھتا ہے اس کی قوت سماعت سے سنتا ہے اور اس کی قدرت سے ہر کام کرتا ہے۔ اسی مقام پر اس سے کشف و کرامات کا ظہور

ہوتا ہے اور بحیثیت انسان کامل ۔مصداق آیہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً
منصب خلافت الٰہیہ کے فرائض انجام دیتا ہے۔ لیکن بقا باللہ کا مطلب یہ نہیں کہ
وہ مقام فنا سے محروم ہوجاتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے
اور باقی باللہ بھی۔ اس مقام کو جامعیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یعنی فنا و
بقا کا بیک وقت اجتماع جو بہت ہی بلند بلکہ بلند ترین مقام شمار کیا جاتا ہے۔ اس
مقام کو نزول اور عبدیت یا عبودیت کے ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی خصوصیت یہی مقام عبدیت (بشریت)
ہے۔ آپ کو عروج میں بھی کمال حاصل تھا اور نزول میں بھی۔ نہ آپؐ سے زیادہ
کوئی عبد ہوا ہے نہ واصل باللہ اور فنا فی اللہ۔ اس لئے آپؐ فرمایا کرتے تھے
کہ :

لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی نبی المرسل و ملک المقرب

(مجھے ذات حق کے ساتھ وہ مقام قرب حاصل ہے جہاں نہ کسی نبی کی
رسائی ہوئی ہے نہ کسی مقرب فرشتہ کی)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چونکہ مقام نزول و عبدیت پر ہوتے ہوئے
دیدار حق کی تمنا کی تھی تو لامحالہ یہ جواب ملا کہ تم دیدار نہیں کر سکتے یعنی مقام
دوئی میں بطور موسیٰ مشاہدۂ حق ناممکن ہے۔ مشاہدہ کے لئے موسیٰ کا گم ہونا
ضروری ہے۔ لہٰذا آیہ مبارکہ "لَنْ تَرٰنِیْ" میں رویت بر مقام دوئی کی نفی ہے
نہ کہ بر مقام وصل و فنا۔ مشاہدہ مقام وصل و فنا کے بغیر محال ہے۔ البتہ مقام
جامعیت پر مشاہدہ روا ہے کیونکہ اس مقام پر طالب بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہے
اور باقی باللہ بھی۔ فنا کے اعتبار سے وہ واصل باللہ ہے اور دائمی مشاہدہ میں ہے۔
اور بقا (دوئی) کے اعتبار سے بیک وقت مہجور بھی ہے۔ جیساکہ عارف شیرازی نے
فرمایا ہے ۔

عجب این نیست کہ سرگشتہ بود طالب دوست
عجب این است کہ من واصل و مہجورم

واللہ اعلم بالصواب۔

نگار من بہ مکتب نرفت و خط نہ نوشت
بہ غمزہ نکتہ آموز صد معلم شد
یتیمیکہ نا کردہ ابجد درست
کتب خانہ چند ملت بشست
امی و دقیقہ دان عالم
بے سایہ و سائبان عالم

از درد فراق اگر ننالم چہ کنم
روز و شب اگر نہ در خیالم چہ کنم
میگوئی باتوام نہ ام ہرگز دور
در عین حضور بی وصالم چہ کنم
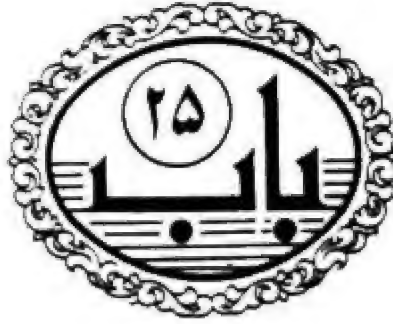
نانویں پردہ کا کھلنا

صحبت اور اسکے آداب کے بیان میں

خداوند تعالی فرماتے ہیں : یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ نَارًا ای ادبوھم (اے مسلمانو : اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آتش دوزخ سے بچاؤ) یعنی ان کو آداب نجات سکھاؤ۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

حسن الادب من الایمان (اچھے آداب ایمان کا نتیجہ ہیں)

نیز فرمایا :

ادبنی ربی فاحسن تادیبی (حق تعالی نے مجھے بہترین آداب سکھائے)

یاد رہے کہ تمام امور دینی و دنیاوی کی زینت آداب سے ہے۔ تمام مذاہب

میں ادب کو لازمی قرار دیا گیا ہے خواہ کوئی کافر ہے یا مسلمان' ملحد ہے یا موحد ہے' سنی ہے یا بدعتی۔ حسن خلق پر سب متفق ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ادب ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ آداب کی تین اقسام ہیں۔ اول' لوگوں کے باہمی میل جول میں آداب کا لحاظ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور خوش خلقی سے پیش آنا۔ دوم' دین کے معاملات میں آداب' جس سے مراد ہے سنت کی پیروی۔ سوم' محبت کے آداب جس سے مراد ایک دوسرے کی عزت ہے۔ ان تینوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جس کے دل میں مروت نہیں اور جو سنت کی پیروی نہیں کرتا' اس کے دل میں دوسروں کا عزت و احترام نہیں آسکتا۔ اور جس کی باہمی تعلقات کو بحال رکھنے کے لئے سخت ضرورت ہے۔ حق تعالٰی کی تعظیم اور شعائر اللہ کا احترام تقویٰ کہلاتا ہے۔ جو شخص شعائر اللہ کا احترام نہیں کرتا اس کو طریقت و تصوف سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ نیز حالت سکر و استغراق میں بھی شعائر اللہ کی تعظیم نہیں چھوٹنی چاہئے۔ کیونکہ ادب خاصان خدا کے رگ و ریشہ میں سما کر عادت بن جاتی ہے اور عادت طبیعت بن جاتی ہے اور طبیعت کو انسان کسی طرح بھی نہیں بدل سکتا۔ جب تک زندگی باقی ہے طبیعت برقرار رہتی ہے لہٰذا آداب ہر حال میں قائم رکھنا ضروری ہے کبھی تکلیف کے ساتھ اور کبھی بلا تکلف۔ اولیاء کرام حالت صحو (ہوشیاری) میں ہوتے ہیں تکلف (کوشش) کے ساتھ آداب بجا لاتے ہیں اور جب ان پر حالت استغراق طاری ہوتی ہے تو حق تعالٰی اپنی نگاہ کرم سے ان کو آداب بجا لانے کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ غرضیکہ اولیاء کرام کسی حالت میں بھی تارک آداب نہیں ہوتے۔ تارک ادب ولی نہیں ہوتا۔ کسی نے خوب کہا ہے :-

لان المودة عند الاداب و حسن الادب صفته الاحباب

"محبت ادب ہے اور ادب صفت احباب ہے"

جس کسی کو حق تعالیٰ کرامت عطا کرتا ہے اس پر آداب دین آسان کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس ملحدین کہتے ہیں خدا ان پر لعنت نازل کرے۔ کہ جب انسان محبت میں مغلوب ہو جاتا ہے تو اتباع شریعت اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کو اور مقام پر تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اقسامِ آداب

آداب کی تین اقسام ہیں۔ اول' یہ کہ حق تعالیٰ کے ساتھ خلوت ہو یا جلوت ہر حال میں حق تعالیٰ کا ادب بجا لائے۔ اور بے حرمتی سے پرہیز کرے۔ اور حق تعالیٰ کے حضور میں اس طرح رہے جیسے سلاطین کے دربار میں انسان ہر وقت باادب رہتا ہے۔ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں پھیلا کر بیٹھے تھے کہ جبرائیل علیہ السلام آئے اور کہا کہ :

یا محمد اجلس جلسته العبد (اے محمدؐ عبد (غلام) کی سی نشست اختیار کرو) یعنی آپ خدا کے بندہ ہیں اس کی درگاہ میں بندوں کی طرح بیٹھیں۔ کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر حضرت حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ چالیس سال تک رات دن دیوار کے ساتھ پشت لگا کر نہ بیٹھے اور ہمیشہ دوزانو ہو کر بیٹھتے تھے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنے اوپر اس قدر سختی کیوں کرتے ہیں فرمایا مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ حق تعالیٰ کے مشاہدہ کی حالت میں بندوں کی نشست اختیار نہ کروں۔

اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ میں نے خراسان کے ایک دور افتادہ گاؤں میں جس کو کمند کہتے تھے۔ ایک بزرگ کو دیکھا جن کو ادیب کمندی کہتے تھے اور بڑے صاحب کمال تھے۔ یہ بزرگ بیس سال سے پاؤں پر کھڑے تھے اور سوائے نماز میں التحیات کے ہرگز نہیں بیٹھتے تھے۔ جب میں نے ان سے

وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ مجھے اب تک وہ درجہ نصیب نہیں ہوا کہ مشاہدۂ حق کی حالت میں بیٹھ سکوں اور جب کسی نے حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ نے جو کچھ پایا کیسے پایا؟ تو فرمایا کہ : **بحسن الصحبتہ مع اللّٰہ عزوجل** (حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حسن آداب سے) یعنی ہر وقت خلوت میں بھی اس طرح ادب کے ساتھ رہتا تھا جس طرح کہ جلوت میں یعنی لوگوں کے سامنے۔ خلق خدا کو چاہئے کہ مشاہدۂ محبوب میں آداب کا برقرار رکھنا زلیخا سے سیکھیں۔ جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خلوت میں تھی اور اپنی بات منوانی چاہی تو پہلے اس نے جا کر اپنے بت کے منہ پر پردہ ڈالا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ یہ کیا کر رہی ہو تو جواب دیا کہ اس لئے کہ وہ مجھے تمہارے ساتھ بے حرمتی کی حالت میں نہ دیکھے۔ کیونکہ یہ خلاف ادب ہے۔ اس کے بعد جب حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنے والد سے ملاقات ہو گئی۔ خداوند تعالیٰ نے زلیخا کو پھر سے جوانی عطا فرمائی اور اسلام سے مشرف فرمایا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے نکاح میں آئی تو آپ نے زلیخا کے قریب ہونا چاہا لیکن وہ دور ہو گئی۔ آپ نے فرمایا اے زلیخا میں وہی تمہارا محبوب ہوں۔ مجھ سے کیوں بھاگ رہی ہو ؟ کیا میری محبت تمہارے دل سے جاتی رہی ؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم آپ کی محبت ہرگز میرے دل سے نہیں نکلی بلکہ زیادہ ہو گئی ہے۔ لیکن میں ہمیشہ اپنے معبود کے آداب بجا لاتی آئی ہوں جب میں نے پہلے آپ کی خلوت چاہی تو میرا معبود ایک بت تھا جس کی اگرچہ آنکھیں نہیں تھیں تاہم میں نے اس کے سامنے بے ادبی نہ کی۔ اب میرا معبود خداوند عالم ہے جو دانا و بینا ہے اور مجھے ہر حال میں دیکھتا ہے میں اس کے سامنے بھی بے ادب نہیں ہونا چاہتی۔ اسی طرح جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تو ادب کی وجہ سے آپ نے کائنات کی طرف نہ دیکھا چنانچہ خداوند تعالیٰ نے ان کے متعلق

فرمایا کہ : مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (نہ ان کی آنکھ بہکی نہ زیادتی کی) یعنی نہ ان کی آنکھ کو دنیا اپنی طرف کھینچ سکی اور نہ آخرت اپنی طرف)۔

ادب کی دوسری قسم

ادب کی دوسری قسم خود اپنے ساتھ ادب بجا لاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر حالت میں اپنے نفس پر حکم تادیب جاری رکھے۔ اور جو برتاؤ کہ خلق کے ساتھ یا حق تعالیٰ کے ساتھ روا نہیں رکھتا اپنی خلوت کی حالت میں بھی روا نہ رکھے۔ مثلاً غلط بات سے پرہیز کرے۔ یعنی اپنے ساتھ ان صفات کو منسوب نہ کیجے جو ان کے اندر نہیں ہیں۔ یہ خلاف حقیقت ہو گا دوسری بات یہ ہے کہ کم کھائے تاکہ بیت الخلا میں زیادہ نہ جائے۔ نیز جس طرح اپنی شرمگاہ دوسروں کو نہیں دیکھنے دیتا خود بھی اس کو نہ دیکھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ اپنی شرمگاہ پر کبھی نگاہ نہیں کرتے تھے جب آپ سے وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ اس چیز کو دیکھوں جس کا دیکھنا دوسروں کے لئے حرام ہے۔

آداب کی تیسری قسم

آداب کی تیسری قسم یہ ہے کہ خلقت خدا کے ساتھ سفر ہو یا حضر خوش خلقی سے پیش آئے۔ یہ اور حفظ سنت' یہ وہ آداب ہیں جن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اب میں حتی الامکان ان امور کو ترتیب وار بیان کرونگا تاکہ پڑھنے والوں کو سہولت ہو۔ انشاء اللہ عزوجل۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

صحبت اور اس کے متعلقات کا بیان

خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں :-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا

(بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دیتا ہے) یعنی جب وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ حسن خلق سے پیش آتے ہیں' ان کے حقوق ادا کرتے ہیں اور ان کو خود پر فضیلت دیتے ہیں تو حق تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" تین کام ہیں جن سے تیرے بھائی کے دل میں تیری محبت پیدا ہوتی ہے۔ اول' یہ کہ جب کسی سے ملاقات ہو تو اس کو سلام کرے۔ دوم' یہ کہ اس کے لئے مجلس میں جگہ پیدا کرے۔ سوم' یہ کہ تو اس کو اس نام سے یاد کرے جو اس کو زیادہ پسندہ ہو۔ "

نیز خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ (سب مسلمان آپس میں بھائی ہیں پس صلح کراؤ بھائیوں کے درمیان) تاکہ ان کے درمیان کشیدگی اور ترشی باقی نہ رہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

"جس قدر ہو سکے زیادہ سے زیادہ بھائی بناؤ کیونکہ حق تعالیٰ شرم والا ہے اور کریم ہے اور شرم کرتا ہے اس بات سے کہ تم کو عذاب دے تیرے بھائیوں کے سامنے۔"[۱۶]

لیکن یاد رکھو کہ یہ دوستی حق تعالیٰ کی خاطر ہونی چاہئے نہ کہ نفسانی خواہشات یا دنیاوی اغراض کی خاطر تاکہ بندہ کے ساتھ خدا راضی ہو۔ حضرت مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے داماد مغیرہ سے فرمایا کہ :

"اے مغیرہ تو اس بھائی اور دوست سے صحبت ترک کر دے جس سے تجھ کو دینی فائدہ نہ پہنچے تاکہ تو سلامت رہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ صحبت یا اپنے سے بڑے کے ساتھ رکھو یا اپنے سے چھوٹے کے ساتھ کیونکہ جب تو اپنے سے بڑے کے ساتھ صحبت رکھتا ہے تو اس سے تجھ کو فائدہ ہو گا اور اگر اپنے سے چھوٹے کے ساتھ صحبت رکھتا ہے تو اس کو تجھ سے فائدہ حاصل ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

ان من تمام التقوی تعلیم من لم یعلم (تحقیق تمام تقویٰ یہ ہے کہ تو تعلیم دے اس کو جو نہیں جانتا)

اور حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تین قسم کے لوگ برے دوست ہوتے ہیں اول وہ جس کو تو یہ کہنے کی ضرورت محسوس کرے کہ میرے لئے دعا کرنا کیونکہ دوست وہ ہے جو بغیر کہے تیرے لئے دعا کرے۔ دوم وہ جس کے ساتھ ہمیشہ تکلف کی زندگی برتی جائے۔ سوم وہ ہے کہ اگر تجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو تجھے اس سے معافی مانگنے کی ضرورت پڑے کیونکہ معافی مانگنا بیگانگی کی علامت ہے۔ اور صحبت میں بیگانگی بری بات ہے۔

نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے :

" آدمی اپنے دوست کا دین اختیار کرتا ہے پس تم اچھی طرح دیکھ لو کہ کس کے ساتھ دوستی لگا رہے ہو۔"

کیونکہ اگر وہ خود برا ہے تو نیکوں کی صحبت اس کو نیک کر دے گی اور اگر وہ نیک ہے تو بروں کی صحبت اس کو برا بنا دے گی۔

حکایت ایک دفعہ ایک آدمی کعبہ کے گرد طواف کے دوران یہ دعا کر رہا تھا "یااللہ میرے بھائیوں کو نیک بنا دے" جب اس سے پوچھا گیا کہ تم اپنے لئے دعا کیوں نہیں مانگتے تو اس نے جواب دیا کہ میرے کچھ بھائی ہیں جن کے پاس مجھے واپس جانا ہے اگر وہ نیک ہوں گے تو مجھے بھی نیک بنا دیں گے اور بد ہوں گے تو مجھے بھی بد بنا دیں گے۔ جب میری اصلاح کا دارومدار ان کی صحبت پر ہے تو ان کے لئے دعا کرتا ہوں کہ وہ نیک بن جائیں جس سے میں بھی نیک بن جاؤں گا۔

اصل وجہ یہ ہے کہ چونکہ انسان کو دوستوں کی صحبت میں سکون ملتا ہے تو جس قسم کے لوگوں کے ساتھ اس کو سکون ملتا ہے انکی عادات و خصائل اختیار کرلیتا ہے کیونکہ لوگ اچھے کام بھی کرتے ہیں اور برے کام بھی۔ جب دوستوں کے اعمال اچھے ہوتے ہیں تو ان کی صحبت میں رہنے والوں کے اعمال اچھے ہو جاتے ہیں۔ اگر برے کام کرتے ہیں تو ساتھ رہنے والوں کے اعمال بھی برے ہو جاتے ہیں۔ عالم کی صحبت میں رہ کر انسان عالم بن جاتا ہے۔ جیسے طوطا انسان کی صحبت میں رہ کر بولنا سیکھ لیتا ہے۔ نیز ایک گھوڑا بھی انسان کی صحبت میں رہ کر اپنے بہیمی خصائل چھوڑ کر انسانی خصائل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح تمام عادات ہیں۔ چنانچہ مشائخ عظام بھی ایک دوسرے کی صحبت کا حق ادا کرتے ہیں اور پھر مریدین کو وہی کچھ تعلیم کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ صحبت ان کے ہاں ایک

فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ صحبت کے مضمون پر مشائخ عظام نے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے اس مضمون پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "تصحیح الارادت" ایک کتاب حضرت احمد بن خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ نے لکھی ہے جس کا نام ہے "الرعایتہ بحقوق اللہ" اور حضرت محمدؒ بن علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "آداب المریدین" ہے۔ حضرت ابوالقاسم حکیمؒ" ابوبکر وراقؒ" حضرت سہل بن عبداللہؒ" حضرت ابوعبدالرحمٰن السلمی رحمتہ اللہ علیہ اور استاذ ابوالقاسم قشیریؒ نے بھی اس مضمون پر کتابیں تالیف فرمائی ہیں اور یہ تمام حضرات اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ میری اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام کتابوں کا نچوڑ یہاں بیان کیا جائے تاکہ تمام دوسری کتابوں کے دیکھنے کی ضرورت نہ رہے۔ اب صحبت کے آداب بیان کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ واللہ اعلم۔

فصل

آداب صحبت مشائخ

جب تمہیں معلوم ہوگیا کہ مریدین کے لئے اہم ترین کام صحبت ہے تو لامحالہ حق صحبت ادا کرنا فرض بن جاتا ہے۔ کیونکہ تنہائی مرید کے لئے خطرناک ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :-

الشیطان مع الواحد وھو من الاثنین ابعد

(اکیلے آدمی سے شیطان قریب تر اور دو آدمیوں سے بعید تر ہوتا ہے)۔

خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے :

مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ

(جب تم تین ہوتے ہو تو تمہارے ساتھ چوتھا خدا ہوتا ہے)۔ پس مرید کے لئے تنہائی سے زیادہ بڑی آفت کوئی نہیں۔

حکایت ایک دفعہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک مرید کے دل میں خیال آیا کہ اب میں کمال کو پہنچ گیا ہوں اس لئے اب میرے لئے صحبت سے تنہائی بہتر ہے۔ چنانچہ اس نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ جب رات ہوئی تو ایک اونٹ ان کے پاس لایا جاتا تھا اور ان کو اونٹ پر بٹھا کر بتایا جاتا کہ اب آپ بہشت کی طرف جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ایسی جگہ پر پہنچ جاتے جو بہت خوبصورت تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے موجود تھے۔ باغوں میں نہریں چل رہی ہوتیں۔ صبح تک وہ وہاں رہتے اور پھر وہاں سوجاتے تھے۔ جب بیدار ہوتے تو اپنے آپ کو عبادت خانہ میں پاتے۔ اس سے ان کے دل میں تکبر بھر گیا اور بزرگی کے دعوے کرنے لگے۔ جب حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کو اس بات کی اطلاع ملی تو آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور دیکھا کہ واقعی وہ اپنے آپ کو بہت باکمال درویش سمجھ رہا ہے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے جب اس سے حال دریافت کیا تو اس نے سارا ماجرا بیان کردیا۔ آپ نے فرمایا کہ آج رات جب تو اس مقام پر پہنچے تو تین بار **لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم** پڑھ دینا۔ جب رات ہوئی تو اس کو لینے کے لئے لوگ اونٹ لے کر آگئے۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں حضرت جنیدؒ کے متعلق شکوک پیدا ہوئے (کہ شاید غلط نصیحت کی تھی) لیکن کچھ دیر کے بعد تجربہ کی خاطر اس نے **لاحول ولا قوۃ** پڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ سب لوگ بھاگ گئے اور اس نے اپنے آپ کو ایسی جگہ پر پایا جہاں گندگی پھیلی ہوئی تھی اور چاروں طرف مردار جانوروں کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس نے توبہ کی اور پھر شیخ کی صحبت میں واپس آگیا۔ چنانچہ مرید کے لئے تنہائی سے بڑھ کر کوئی

بڑی آفت نہیں ہے۔ صحبت کی شرائط یہ ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ اس کے مقام کے مطابق سلوک کریں۔ بزرگوں کی عزت کریں' ہم جنسوں کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آئیں۔ بچوں پر شفقت کریں۔ یعنی بزرگوں کے ساتھ اپنے والدین جیسا سلوک کریں' ہم عمروں کو بھائی سمجھیں اور چھوٹے بچوں سے اپنی اولاد کی طرح محبت کریں۔ حسد' کینہ' تکبر سے پرہیز کریں۔ ہر شخص کو نیک نصیحت کریں۔ ایک دوسرے کی غیبت ترک کریں۔ خیانت نہ کریں اور قول و فعل سے ایک دوسرے پر اعتراض نہ کریں اور چونکہ صحبت کا اصلی مقصد حق تعالیٰ کی رضا جوئی ہے انسان کے قول و فعل میں کوئی ایسی بات نہ ہو۔ جس سے دوسروں کا دل رنج ہو۔ ایک دفعہ میں نے شیخ المشائخ حضرت ابوالقاسم گورگانی رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ شرط صحبت کیا ہے فرمایا یہ کہ تو خود غرضی سے باز رہے کیونکہ صحبت کی تمام آفات اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ صحبت میں خود پسندی اور خود غرضی سے بہتر تنہائی ہے جب تو خود غرضی اور مطلب پرستی اختیار کرے گا تو مصیبت میں مبتلا ہو گا۔

حق صحبت

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں کوفہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔ جب میں نے ان کی صحبت کی درخواست کی تو فرمایا کہ سفر میں ایک امیر کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک فرمانبردار کی۔ تم کیا بننا پسند کرتے ہو۔ امیر بننا پسند کرتے ہو یا مجھے بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا آپ کو امیر بنانا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر فرمایا کہ اب تم کو ہر کام میرے کہنے کے مطابق کرنا ہو گا۔ میں نے کہا مجھے قبول ہے۔ جب ہم منزل پر پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ اور خود پانی بھرنے چلے گئے۔ چونکہ سردی کا موسم تھا اس کے بعد انہوں نے لکڑی جمع کی اور آگ جلا کر فرمایا کہ آؤ

گرم ہو جاؤ۔ غرضیکہ جب میں کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا تو مجھے فرماتے کہ بیٹھو اپنا وعدہ یاد کرو۔ جب رات ہوئی تو سخت بارش ہونے لگی۔ آپ اٹھے اور اپنی گدڑی (مرقعہ) مجھ پر تان کر ساری رات کھڑے رہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت شرم آئی لیکن کیا کرتا' شرائط سفر کے مطابق خاموش رہا۔ جب صبح ہوئی تو آپ سے عرض کیا کہ یا شیخ آج امیر میں بننا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا بہت خوب۔ جب ہم منزل پر پہنچے تو انہوں نے اسی طرح سب کام کرنا شروع کئے۔ میں نے کہا حضور امیر کی فرمانبرداری ضروری ہے فرمایا کہ امیر کی فرمانبرداری یہ ہے کہ اس کی خدمت کی جائے۔ غرضیکہ مکہ تک آپ اسی طرح سب کام خود کرتے رہے جب ہم مکہ پہنچے تو شرم کے مارے میں ان کی صحبت سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد منیٰ میں ملاقات ہوگئی تو فرمایا کہ بیٹا درویشوں کے ساتھ صحبت میں اسی طرح کرنا جس طرح کہ میں نے کیا تھا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت کی خدا کی قسم آپ نے نہ کبھی اف کہا نہ میرے کسی کام سے خفا ہوئے اور نہ ہی کبھی یہ فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا اور کیوں نہ کیا۔

اقسامِ درویشاں

یاد رہے کہ درویشوں کی دو اقسام ہیں ایک مقیم' دوم مسافر۔ مشائخ کی سنت یہ ہے کہ مسافر درویش' مقیموں کی خدمت کریں کیونکہ مسافر اپنی مرضی کے مطابق چلتے ہیں اور مقیم حضرات حق تعالیٰ کی خدمت میں جم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نیز مقیمان کی افضلیت اس بات میں بھی ہے کہ وہ صاحب یافت ہیں اور مسافر صاحب طلب ہیں۔ لہٰذا مقیم افضل ہے مسافر سے۔ نیز مقیمان کو بھی چاہئے

کہ مسافروں کو اپنے آپ سے افضل سمجھیں کیونکہ مقیمان علائق دنیا میں مبتلا ہوتے ہیں اور مسافران علائق سے آزاد ہوتے ہیں۔ نیز مسافران طلب میں ہوتے ہیں اور مقیم نے وقوف اختیار کرلیا ہے۔ اسی طرح بوڑھوں کو چاہئے کہ جوانوں کو فضیلت دیں اس وجہ سے کہ ان کی عمر کم ہے اور کم گناہ کئے ہیں اسی طرح جوانوں کو چاہئے کہ بوڑھوں کو اپنے آپ پر فضیلت دیں کیونکہ ان کی عمر زیادہ ہے اور زیادہ عبادت کر چکے ہیں اور خدمت کے مستحق ہیں۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو تمام قسم کے لوگ نجات پائیں گے ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔

فصل

حقیقتِ آداب صحبت

آداب کا مطلب ہے نیک خصائل کا اجتماع۔ عام رواج یہ ہے کہ جو شخص علم لغت اور صرف و نحو جانتا ہے اس کو ادیب کہا جاتا ہے لیکن صوفیاء کے نزدیک ادیب وہ ہے جس میں تمام اچھی صفات جمع ہوں۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ :

ادب اچھے کام کا نام ہے یعنی تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ظاہری و باطنی آداب ملحوظ رکھے۔ اگر تمہارے اندر یہ خصائل ہیں تو اگرچہ تو عجمی ہے ادیب کہلائے گا۔ لسانی اور لفظی باتوں سے انسان ادیب نہیں بن جاتا بلکہ عمل کی ضرورت ہے اور دنیا کے ہر شعبہ میں زبانی باتیں بنانے والوں سے عملی کام کرنے والے زیادہ افضل سمجھے جاتے ہیں۔

ایک دفعہ کسی نے ایک بزرگ سے سوال کیا کہ شرط ادب کیا ہے۔ فرمایا

کہ ادب یہ ہے کہ جب تو کوئی بات کرے تو سچ کہے، جب کسی سے معاملہ کرے تو حق کو مد نظر رکھے۔ کیونکہ سچی بات اگرچہ کڑوی لگتی ہے تاہم فائدہ مند ہوتی ہے اور لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اگرچہ مشکل ہوتا ہے تاہم اس کا انجام اچھا ہوتا ہے لہٰذا جب تم کوئی بات کہو سچ کہو اور خاموشی اختیار کرو تو حکمت سے خالی نہ ہو۔ اس سلسلے میں حضرتِ شیخ ابونصر سراج رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اللمع میں فرمایا ہے :

"ادب کے لحاظ سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔ اول وہ جو دنیا دار ہیں ان کے نزدیک ادب یہ ہے کہ علوم کی تدوین و تحقیق میں فصاحت و بلاغت سے کام لیا جائے بادشاہوں کے حالات اور شعراء کا کلام یاد کر لیا جائے۔ دوسری قسم کے لوگ اہل دین کہلاتے ہیں ان کے نزدیک ادب یہ ہے کہ ریاضات و مجاہدات کے ذریعے تادیب نفس کی جائے، اور اطاعت حق میں نفسانی خواہشات کی مخالفت کی جائے۔ تیسری قسم کے لوگ وہ خواص ہیں جن کے نزدیک ادب یہ ہے کہ تزکیہ نفس کیا جائے، اسرار و رموز الٰہی کی حفاظت کی جائے ہر وقت متوجہ الی اللہ رہے، اور مقامات قرب و وصال اور حضوری حاصل کرے۔" کس قدر جامع بات کہی گئی ہے۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں جا بجا کردی گئی ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

فصل

آدابِ صحبت در قیام مشائخ

جب درویش اقامت اختیار کرے تو اس کے آداب کی شرط یہ ہے کہ جب کوئی مسافر اس کے پاس پہنچے تو خندہ پیشانی سے پیش آئے اور اس کا احترام

کرے اور یہ سمجھے کہ گویا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں میں سے ہے۔ یعنی وہ فرشتے جو ان کے مہمان ہوئے اور ان کے ساتھ وہ سلوک کرے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔ یعنی جو کچھ گھر میں موجود تھا پیش کردیا۔ جیساکہ خداوند تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا ہے کہ مہمانوں کی خاطر آپ موٹا بھنا ہوا بچھڑا لائے اور یہ بھی دریافت نہ فرمایا کہ کہاں سے آئے ہو۔ اور کہاں جارہے ہو۔ یا تمہارا نام کیا ہے۔ یہ سب ادب کی وجہ سے تھا پس اگر مہمان آئے تو یہ سمجھے کہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ اور حق تعالیٰ کی طرف جارہا ہے اور یہ سمجھے کہ اس کا نام بندۂ حق ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھے کہ آیا اس کو زیادہ آرام خلوت سے ہوگا یا صحبت سے اور وہ خلوت پسند کرے تو اس کو تنہائی میں جگہ دے۔ اگر صحبت اختیار کرے تو اس کو اپنے پاس رکھے اور خوش خلقی سے پیش آئے۔ اور جب رات کے وقت سوئے تو مقیم کو چاہئے کہ اس کے پاوں دبائے اگر وہ یہ عذر کرے کہ میری عادت نہیں ہے تو چھوڑ دے تاکہ اس کی طبیعت خراب نہ ہو۔ جب دوسری صبح ہو تو اسے گرم پانی سے نہلانے کا انتظام کرے اور اس کے کپڑوں کی ناپاکی سے حفاظت کرے۔ اور اس کی خدمت کے لئے کسی نااہل کو تعینات نہ کرے۔ اور اس بات کا بھی خیال رکھے کہ اس کی تمام میل دور ہوجائے۔ اس کی پیٹھ کو بھی صاف کرے اور پاوں کی میل اچھی طرح صاف کرے اور اگر استطاعت ہو تو اس کو نئے کپڑے بنوا دے اور یہ استطاعت نہ ہو تو پھر تکلف سے کام نہ لے اور پھر یہ کرے کہ اس کے کپڑے دھو ڈالے تاکہ جب حمام سے باہر آئے تو صاف کپڑے پہن سکے۔ اس کے بعد اس کو دو تین دن اپنا مہمان رکھے اگر شہر میں کوئی بزرگ رہتے ہوں یا کوئی جماعت ہو' یا کوئی امام رہتے ہوں تو مسافر سے پوچھا جائے کہ ان کی زیارت پسند کرتا ہے یا نہیں اور وہ نہ چاہے تو مجبور نہ کرے۔ کیونکہ بعض اوقات بزرگان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

ان کا دل بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب حضرت ابراہیم خواصؒ سے لوگوں نے کہا کہ اپنے سفر کی عجائبات سے آگاہ کریں تو آپ نے فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت خضر علیہ السلام نے مجھ سے صحبت کی درخواست کی تو میں نے اجازت نہ دی کیونکہ اس وقت میرا دل یہ چاہتا تھا کہ حق تعالیٰ کے سوا میرے پاس کوئی نہ ہو۔

یہ بھی روا نہیں کہ مقیم مسافر کو دنیا داروں کے پاس لے جائے۔ یا کسی دعوت میں شریک کرے یا کسی کے ماتم پر لے جائے اور مقیم کے لئے یہ بھی مناسب نہیں کہ مسافر سے گداگری کرائے اور دربدر پھرائے۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ اس کو مہمان نہ ہی بنائے۔

اور مجھ (علی بن عثمان الجلابی) کو سفر میں اس سے زیادہ کبھی تکلیف نہ ہوئی کہ جاہل خادم اور میزبان مجھے فلاں امیر اور فلاں زمیندار کے پاس لے جاتے جس سے مجھے سخت روحانی کوفت ہوتی تھی لیکن صبر سے برداشت کرتا تھا اور انہوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا میں نے عہد کر لیا کہ میں اپنے مہمانوں سے کبھی یہ سلوک روا نہیں رکھوں گا۔ ہاں بے ادب لوگوں سے ایک یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کریں تو اس سے پرہیز کرے۔ اور ان کی بے ادبی کو برداشت کرنے کی عادت پیدا کرے۔ اگر کوئی مسافر زیادہ ٹھہرنے کی یا کچھ مال طلب کرنے کی خواہش ظاہر کرے تو اس کی خواہش پوری کرے۔ ہاں اگر کوئی جھوٹا دعویدار ہے یا لالچی ہے تو مقیم کو چاہئے کہ اس کی ہر تمنا کو پورا نہ کرے۔ یہ درویشوں کا طریق نہیں ہے بلکہ اس کو بازار میں جا کر روزی کمانی چاہئے یا امیروں کے پاس جا کر اپنی حاجات طلب کرے۔ درویشوں سے اس کا کیا کام۔

ایک دفعہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ اپنے احباب کے ساتھ ریاضت و عبادت میں مصروف تھے کہ ایک مسافر آگیا اگرچہ انہوں نے تکلف کے ساتھ

کھانا پیش کیا لیکن وہ کہنے لگا کہ مجھے فلاں چیز چاہئے اس پر حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم بازار جاؤ۔ تم بازاری آدمی ہو تجھے مساجد اور خانقاہوں سے کیا کام۔ ایک دفعہ میں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ حضرت ابن معلا رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے دمشق گیا۔ اس وقت وہ رملہ میں قیام پذیر تھے۔ راستے میں ہم نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہمیں چاہئے کہ اپنے مقاصد دل میں رکھیں تاکہ حضرت شیخ ہمارے باطن کا مشاہدہ کر کے ہماری مشکلات حل کریں۔ چنانچہ میں نے اپنے دل میں یہ مقصد رکھا کہ وہ مجھے کچھ ایسے اشعار سنائیں جن میں حضرت منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ کی تعریف کی گئی ہو۔ دوسرے نے کہا کہ میری تمنا یہ ہے کہ میرا مرض طحال ٹھیک ہو جائے۔ تیسرے نے کہا کہ مجھے تو حلوہٗ صابونی چاہئے۔ جب ہم ان کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے میرے لئے جو چند اشعار لکھ رکھے تھے مجھے دے دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے دوسرے آدمی کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو اس کا طحال غیب ہوگیا تیسرے آدمی سے فرمایا کہ صابونی حلوہ تو عوام کی غذا ہے۔ تم نے درویشوں کا لباس پہن رکھا ہے تمہارے لئے عوام کی غذا درست نہیں یا حلوہ کھاؤ یا درویشی اختیار کرو۔

غرضیکہ مقیم درویش کے لئے مسافر درویش کی وہ تمنا پوری کرنا ضروری نہیں جو مسلک درویشی کے خلاف ہو۔ کیونکہ درویش ایک دوسرے کے راہبر (رہنما) ہوتے ہیں نہ کہ راہ بُر (راہزن)۔ جب ایک درویش خواہش نفس چاہتا ہے تو دوسرے کو چاہئے کہ اس کی مخالفت کرے۔ اور جو شخص نفسانی خواہشات ترک کرے اس کی موافقت کرنا چاہئے تاکہ حق راہ نمائی اوا ہوں۔

روایات میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہوا تھا۔ دونوں اصحاب صفہ میں شامل تھے اور دونوں باطنی دولت سے

مالا مال تھے۔ ایک دن جب حضرت سلمان رضی اللہ عنہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے گھر پر تشریف لے گئے تو ان کی اہلیہ نے شکایت کی کہ آپ کے یہ بھائی نہ دن کو کچھ کھاتے ہیں نہ رات کو سوتے ہیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کوئی کھانے کی چیز لاؤ۔ جب کھانا لایا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اے بھائی ! ذرا اپنی بیوی کی خواہش پوری کرو کیونکہ یہ روزہ جو رکھا ہوا ہے نفلی ہے فرض نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے کھانا کھا لیا۔ جب رات ہوئی تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے بھائی اب سونے میں بھی میری موافقت کرو کیونکہ جسم کا بھی آپ پر حق ہے' آپ کی بیوی کا بھی آپ پر حق ہے۔اور حق تعالیٰ کا بھی آپ پر حق ہے دوسرے دن جب دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی یہی کہتا ہوں جو سلمان نے کہا کہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دوستی کا حق ادا کیا۔

ایک دفعہ میں (علی بن عثمان الہجویری) عراق کے سفر میں ترک دنیا کے کاموں میں مصروف تھا میرے پاس کچھ رقم تھی جو لوگوں کی ضروریات پوری کرنے میں صرف کر رہا تھا۔ ایک بزرگ نے مجھے خط لکھا کہ بیٹا خبردار جو لوگ خدا سے غافل ہیں ان کی امداد میں مصروف رہ کر خدا تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہو جاؤ۔ ہاں اگر کوئی شخص طالب خدا ہے تو اس کی خدمت ضرور کرو۔ بندگان خدا کو خدا تعالیٰ کے ساتھ مشغول رہنا چاہیئے۔ یہ ہیں آداب مقیمان با مسافران بطریق مختصر۔

فصل

سفر میں آداب درویشی

جب درویش وطن چھوڑ کر سفر اختیار کرنا چاہے تو پہلی شرط یہ ہے کہ وہ سفر حق تعالیٰ کی خاطر ہو نہ کہ ہوائے نفس کے لئے۔ یعنی جس طرح ظاہراً" وطن کو ترک کرتا ہے باطناً" خواہشات نفس کو بھی ترک کرے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ہمیشہ باوضو رہے اور اپنے معمولات ترک نہ کرے۔ تیسری شرط یہ ہے سفر نیک مقاصد کے لئے کیا جائے۔ مثلاً حج کے لئے' جہاد کے لئے' علم یا زیارت بزرگان کے لئے یا زیارت مزارات کے لئے یا دیگر دینی مقاصد کے لئے۔ اس کے علاوہ جو سفر اختیار کرے گا نقصان اٹھائے گا۔ سفر کی اور شرط یہ ہے کہ مرقعہ (گدڑی) جائے نماز' لوٹا' رسی' جوتا' لاٹھی ساتھ لے جائے تاکہ مرقعہ سے اپنا سر ڈھانپے' جائے نماز پر نماز ادا کرے' لوٹے سے وضو کرے اور لاٹھی سے موذی جانور کو دور کرے۔ اس کے علاوہ اگر سوئی دھاگہ' کنگھی' سرمہ ساتھ رکھے تو یہ بھی جائز ہے۔ اگر اس سے زائدہ سامان ساتھ لے جانا چاہے تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ وہ کس مقام پر ہے۔ اگر وہ سلوک طے کررہا ہے تو اس کے لئے سامان میں سے ہر چیز بت اور حجاب بن جائے گی۔ ہاں اگر مقام تمکین (تکمیل) حاصل ہے تو پھر جائز ہے۔

شرح اس لئے جائز ہے کہ روحانی تکمیل کے بعد نفس اس کے قبضے میں آچکا ہے اور اس کے شر سے محفوظ رہے گا۔

ترجمہ میں نے شیخ ابو مسلم فارس بن غالب فارسی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے

کہ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر فضل اللہ بن محمد کی خدمت میں بقصد زیارت حاضر ہوا میں نے دیکھا کہ آپ ایک تخت پر چار تکیے لگائے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر شان سے سوئے ہوئے ہیں اور ایک نہایت قیمتی مصری شال اوڑھے ہوئے ہیں اور میرے کپڑے میل کچیل سے بھرے ہوئے تھے' بدن سخت میلا تھا اور مجاہدات کی وجہ سے چہرہ زرد تھا۔ ان کو اس حالت میں دیکھ کر میرے دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ کیا یہی درویشی ہے۔ میرا کیا حال ہے اور وہ کس شان و شوکت میں ہیں۔ میرے دل کی بات ان پر ظاہر ہوگئی اور میری نخوت (تکبر) کو دیکھ کر فرمایا اے ابو مسلم! تونے کس کتاب میں پڑھا ہے کہ خود بین درویش ہوتا ہے۔ جب میں نے ہر جگہ حق تعالیٰ کو دیکھا مجھے اس نے تخت عطا کیا۔ تم نے خود کو دیکھا تخت سے محروم رہے۔ اس لئے میرے نصیب مشاہدہ ہوا اور تمہارے نصیب مجاہدہ۔ یہ دونوں مقام راہ حق میں پیش آتے ہیں۔ حق تعالیٰ ان سے بالاتر ہے اور درویش ان مقامات سے علیحدہ اور اس سے الگ ہے۔ شیخ ابومسلم کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا۔ جب افاقہ ہوا تو میں نے معافی مانگی اور انہوں نے اجابت فرمائی۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضور اب میں اجازت چاہتا ہوں کیونکہ میرے اندر آپ کے پاس بیٹھنے کی طاقت نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا تم سچ کہتے ہو اور پھر یہ شعر پڑھا۔

آنچہ گوشم نتوانست شنیدن بخبر
ہمہ چشمم بلعیاں بکسو دیداں بہ بصر

(جو چیز کان نہیں سن سکتے تھے میں نے آنکھوں سے دیکھ لیا صاف صاف)

پس مسافر کو چاہئے کہ ہمیشہ سنت رسولؐ کے مطابق سفر بجا لائے اور جب میزبان کے پاس جائے تو عزت و احترام ملحوظ رکھے۔ پہلے سلام کرے' اس کے بعد پہلے

بائیں پاؤں سے جوتا اتارے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے لیکن جب اندر جائے تو پہلے دایاں پاؤں اندر کرے اور پھر بایاں لیکن جب پاؤں دھوئے تو پہلے دایاں پھر بائیاں پاؤں دھوئے۔ وضو کے بعد دو رکعت نماز تحیتہ الوضو بھی سنت ہے اس کے بعد آداب درویشاں بجا لائے لیکن مقیم پر ہرگز اعتراض نہ کرے نہ کسی کے ساتھ زیادتی کرے اور نہ سفر کی مشکلات بیان کرے اور نہ لوگوں کے سامنے حکایات اور روایات بیان کرنے لگے کیونکہ یہ تمام رعونت (تکبر) کی علامات ہیں۔ اگر کوئی جاہل آدمی تکلیف دے تو حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسے خوشی سے برداشت کرے کیونکہ اس میں بڑی برکات ہیں۔ اگر مقیم درویش یا ان کا کوئی خادم کوئی بات کہے یا کسی جگہ کی زیارت کی دعوت دے تو انکار نہ کرے۔ خواہ دل سے ان چیزوں کو پسند بھی نہ کرتا ہو۔ اگر کوئی شخص بدسلوکی کرے تو اس کو معذور سمجھے اور دل رنجہ نہ کرے۔ نیز خود کو کسی کا بوجھ نہ بنائے اور نہ اپنے میزبان پر یہ فرمائش رکھے کہ مجھے بادشاہ یا امیروں کے پس لے چلو۔ غرضیکہ مسافر اور مقیم دونوں کو ہر حال میں حق تعالیٰ کی رضا طلب کرنی چاہئے اور ایک دوسرے کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنا چاہئے۔ ہمیشہ صاف گوئی اختیار کرے اور کسی کو سامنے یا پس پشت برا نہ کہے کیونکہ طالب حق کے سامنے بری باتیں کرنا خطا ہے اس لئے کہ اہل حق ہر چیز کا فاعل حق تعالیٰ کو سمجھتے ہیں اور چونکہ خلق خدا جس صفت پر بھی ہے خداوند تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے خواہ وہ اچھی ہے یا بری، کسی کے فعل کو برا کہنا حق تعالیٰ کے فعل کو برا کہنے کے برابر ہے۔ اگر ہر چیز کو انسانیت سے دیکھے گا تو کسی چیز پر اعتراض نہیں کرے گا کیونکہ ہر چیز خداوند تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ نیک و بد سب اسی کی پیداوار ہے اس میں کسی کو اختیار نہیں۔ سب کچھ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

فصل

کھانا کھانے کے آداب

جاننا چاہئے کہ انسان کو غذا کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ قوائے جسمانی کا قیام کھانے پینے کے بغیر نہیں ہوتا۔ لیکن ادب کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں مبالغہ نہ کرے اور دن رات کھانے پینے کی فکر میں نہ رہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

من کان ہمتہ ٗ مایدخل فی جوفہ کان قیمتہ ما یخرج منہ (جس شخص کی ساری کوشش اس بات پر لگی ہوئی ہے کہ پیٹ بھرا جائے اس شخص کی قیمت وہ ہے جو پیٹ سے خارج ہوتا ہے)۔ ایک مرید (طالب حق) کے لئے بہت کھانے سے زیادہ کوئی چیز مضر (نقصان دہ) نہیں ہے۔ اس کتاب میں بھوک کے باب میں قدرے لکھا جاچکا ہے۔ یہاں بھی اس کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ آپ بھوک کی اس قدر تعریف کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر فرعون بھوکا ہوتا تو ہرگز خدائی کا دعوہ نہ کرتا اور اگر قارون بھوکا ہوتا تو حق تعالیٰ کا باغی نہ ہوتا۔ ثعلبہ جب تک بھوکا رہا ٹھیک رہا جب خوب کھانا شروع کیا تو گمراہ ہوگیا۔ حق تعالیٰ نے کفار کے متعلق فرمایا ہے :

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (کافروں کو ان کے حال پر چھوڑ دو کھائیں پئیں اور دنیا کمائیں لمبی امیدیں باندھیں ان کو جلدی پتہ چل جائے گا)۔ نیز فرمایا :

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ

(اور جو کافر ہیں وہ دنیا میں مست ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جیسے جانور' ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے)۔

حضرت سہل بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"مجھے شراب سے بھرا ہوا پیٹ حلال کھانے سے بھرے ہوئے پیٹ سے زیادہ پسند ہے" جب ان سے وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا کہ جب پیٹ شراب سے بھر جاتا ہے تو عقل گم ہو جاتی ہے' آتش شہوت مر جاتی ہے اور خلق خدا اس کے ہاتھ اور زبان سے بچ جاتی ہے لیکن جب پیٹ طعام سے بھر جاتا ہے نفسانی خواہشات بڑھ جاتی ہیں' قوت شہوت میں اضافہ ہوتا ہے اور نفس بے لگام ہو جاتا ہے۔ مشائخ نے فرمایا ہے کہ۔ "کھانا اس قدر کھائے جس قدر کہ مریض کھاتا ہے' نیند اس قدر کرے کہ جس قدر غرق شدہ کرتا ہے اور بات اتنی کرے جتنی کہ مردہ بچے کی ماں۔"

کھانے کے آداب

پس کھانے کے آداب یہ ہیں کہ اکیلا نہ کھائے اور جب مل کر کھائیں تو دوسروں کے لئے ایثار کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں۔

شر الناس من اکل وحدہ و ضرب عبدہ و منع رفدہ (بد ترین انسان وہ ہے جو اکیلا کھائے' نوکر کو مارے اور قاصد کی نہ سنے)۔ کھانے کے آداب میں سے یہ بھی ہیں کہ جب دستر خوان پر بیٹھے تو بسم اللہ سے شروع کرے اور کھانے کی چیزیں اٹھانے یا رکھنے میں کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو احباب کو پسند نہ ہو اور سب سے پہلے نمکین کھانے سے شروع کرے اور اپنے رفیق کے ساتھ انصاف کرے۔ جب حضرت سہل بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے اس آیت کا مطلب

دریافت کیا گیا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (تحقیق اللہ تعالیٰ عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے)۔ تو فرمایا کہ عدل یہ ہے کہ کھانا کھاتے وقت بھی اپنے ساتھی کے ساتھ انصاف کرے اور احسان یہ ہے کہ خود قربانی کرے اور اس کو اچھی چیز دے۔ میرے شیخ علیہ رحمتہ فرماتے تھے کہ مجھے اس مدعی (دعویدار) پر تعجب آتا ہے جو تارک دنیا ہونے کا دعوہ کرے اور لقمے کی فکر میں رہے۔ کھانے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ کھانا دائیں ہاتھ سے کھائے اور دوسروں کے لقمے کی طرف نہ دیکھے' کھانا کھاتے وقت پانی کم پیے۔ جب پیاس لگے تو اس قدر پیے کہ جگر تر ہوسکے۔ لقمہ بڑا نہ لے' کھانے اور چبانے میں جلدی نہ کرے کیونکہ اس سے بدہضمی ہوتی ہے اور سنت رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے بھی خلاف ہے۔ جب کھانے سے فارغ ہو تو الحمدللہ پڑھے اور ہاتھ دھوئے۔ اگر جماعت میں سے کچھ آدمی چھپ کر دعوت پر چلے جائیں تو بعض مشائخ کے نزدیک یہ ناجائز ہے اور صحبت میں خیانت کے برابر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اگر ایک جماعت ہے تو جماعت میں سے ایک یا اس سے زیادہ آدمیوں کو منتخب کرکے کسی کی دعوت پر بھیج دیا جائے تو یہ جائز ہے۔ اس بارے میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ کسی درویش کی دعوت کو رد نہ کیا جائے اور دنیا دار کی دعوت کو قبول نہ کیا جائے۔ نہ ان کے مکان پر جائے اور نہ ان سے کوئی چیز طلب کرے کیونکہ یہ اہل طریقت کے شایان نہیں اور نہ اہل دنیا اہل طریقت کے محرم راز ہوتے ہیں۔ لیکن مال و متاع کی فراوانی کی وجہ سے انسان دنیا دار نہیں بن جاتا اور نہ ہی مال کی قلت کی وجہ سے درویش کہلانے کا مستحق ہوتا ہے بلکہ دنیا دار وہ ہے جو فقر کا منکر ہو (یعنی جو درویشی کو برا سمجھے) خواہ وہ نادار بھی ہو اور جو شخص درویشی کو امیری سے برتر سمجھے وہ دنیا دار نہیں ہے خواہ وہ بادشاہ بھی ہو۔ نیز جب کسی

دعوت پر جائے تو یہ نہ کہے کہ یہ چیز مجھے پسند ہے اور یہ چیز پسند نہیں ہے اور رواج کے مطابق کھانا کھائے۔ اگر دعوت دینے والا محرم ہے (یعنی لاحجابی ہے) تو اس کے اندرون خانہ جائے ورنہ اندر نہ جائے۔ لیکن کھانا گھر نہیں لے جانا چاہئے کیونکہ یہ ذلیل عادت ہے۔ سب توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

مشائخ کے چلنے کے آداب

خدا تعالیٰ عزوجل نے فرمایا ہے کہ :

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا .... (اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں)۔ (یعنی اکڑ کر نہیں چلتے)۔ اہل حق کو چاہئے کہ جو قدم اٹھائیں یہ سمجھ کر اٹھائیں کہ آیا یہ قدم راہ حق میں ہے یا راہ حق کے خلاف ہے۔ اگر قدم راہ حق میں لیا ہے تو اور بھی زیادہ کرے اور خلاف حق لیا ہے تو استغفار پڑھے۔ حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک دفعہ دوائی لی۔ جب کسی نے کہا کہ آپ ذرا صحن میں ٹہل لیں تاکہ دوائی کا اثر ہو تو فرمایا کہ مجھے خدا تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ خدا تعالیٰ قیامت کے دن یہ سوال کرے کہ تونے نفسانی خواہش کے لئے کیوں قدم اٹھائے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے :

وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ کیا کام کیے)۔ پس درویش کو چاہیے نہ مراقبہ کی حالت میں سر جھکا کر چلے اور

ادھر ادھر نہ دیکھے۔ بلکہ سامنے دیکھے اور جب کوئی شخص پاس سے گزرے تو درویش کو چاہئے کہ اس سے دامن بچانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ سب مومنوں کے کپڑے پاک ہوتے ہیں۔ نیز اس بات سے رعونت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ہاں اگر کوئی کافر سامنے آئے اور اس پر کوئی ناپاکی کے اثرات ہوں تو پھر اس سے احتیاط کرے۔ جب ایک جماعت کے ساتھ چل رہا ہے تو آگے چلنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ یہ تکبر کی علامت ہے نیز عجز و انکسار کی خاطر زیادہ پیچھے بھی نہ رہ جائے کیونکہ یہ دکھلاوہ بن جاتا ہے اور دکھلاوہ تکبر ہے۔ چلتے وقت جہاں تک ہوسکے اپنے جوتے اور پاؤں کو پلیدی سے بچائے تاکہ خدا تعالیٰ اس کے باطن کو ناپاکی سے بچائے۔ اگر ایک جماعت کے ساتھ جارہا ہے تو راستے میں کسی شخص سے بات کرنے کے لئے ٹھہر نہ جائے کیونکہ اس سے اس کے ہمراہیوں کو تکلیف ہوگی۔ رفتار نہ اتنی تیز ہو کہ حریص نظر آئے اور نہ اتنی ست کرے جیساکہ متکبر لوگ کرتے ہیں۔ نیز جو قدم اٹھائے پورا اٹھائے۔ (یعنی چھوٹے چھوٹے قدم نہ اٹھائے اس سے سکی ہوتی ہے)۔

غرضیکہ طالب حق کا چلنا ہمیشہ راہ حق میں ہونا چاہئے تاکہ جب کوئی پوچھے کہ کہاں جارہے ہو تو یہ کہے کہ : **انی ذاھب الی ربی سیھدین** (تحقیق میں اپنے رب کی جانب جارہا ہوں جو مجھے ہدایت دیتا ہے)۔

راہ حق کے علاوہ چلنا درویش کے لئے باعث وبال ہے کیونکہ قدموں کا چلنا خیالات کے مطابق ہوتا ہے جس کا خیال حق تعالیٰ پر جما ہوا ہے تو اس کا قدم بھی حق کی جانب اٹھے گا۔ حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"مراقبہ کے بغیر درویش کا چلنا علامت غفلت ہے۔ اور مقصود دو قدموں سے حاصل ہوتا ہے ایک قدم اپنی خواہشات نفس پر اور دوسرا فرمان حق پر۔ ایک

قدم میں اپنی خودی سے دور ہو جائے اور دوسرے قدم میں واصل بحق ہو جائے"۔
اگرچہ طالب کا سفر فاصلہ طے کرنے کے لئے ہوتا ہے لیکن خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے فاصلہ طے کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور جب فاصلہ طے کرنے کی ضرورت نہیں تو طالب کو خاموش بیٹھ کر مراقبہ کے ذریعے روحانی سفر طے کرنے کے سوا اور کیا کرنا چاہئے۔ واللہ ولی التوفیق۔

شرح مطلب یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے بمصداق آیت پاک وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ہم انسان سے اس کی شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں)۔ تو پھر وصال یا قرب حق کے لئے کسی مادی یا زمینی سفر کی ضرورت نہیں ہے بلکہ گھر بیٹھے عبادات' ریاضات' اذکار اور مراقبات کے ذریعے یہ سفر طے کرے۔ مادی سفر میں چلنے کی ضرورت ہوتی ہے روحانی سفر میں چلنے کی کوئی ضرورت نہیں سوائے مشائخ کی زیارت' مزارات اور کعبہ کی زیارت کے جس سے روحانی سفر طے کرنے میں مدد ملتی ہے۔ روحانی سفر کے متعلق ایک شاعر نے خوب کہا ہے۔

صوفی چہ فغان است من این الے این
کیں نکتہ عیان است من العلم الے العین

(یعنی جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف کا سفر تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مرتبہ علم الیقین سے ترقی کر کے مقام عین الیقین اور حق الیقین تک پہنچنا چاہئے جس سے مراد فنا فی اللہ ہے۔ یعنی یہ سفر جسمانی نہیں روحانی ہے۔

فصل

درویشوں کی نیند کے متعلق آداب سفر اور حضر میں

یاد رہے کہ اس بارے میں مشائخ کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ طالب کو غلبہ نیند کے بغیر نہیں سونا چاہئے یعنی جب غلبہ قابل برداشت نہ ہو تو سو جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ : **النوم اخت الموت** (نیند موت کی بہن ہے)

چنانچہ زندگانی خدا تعالیٰ کی نعمت ہے اور موت بلا ہے اور نعمت لامحالہ موت سے بہتر ہوتی ہے۔ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

اطلع الحق فقال من نام غفل و من غفل حجب (حق تعالیٰ نے مجھ پر القا فرمایا کہ جو سویا غافل ہوا اور جو غافل ہوا۔ محجوب ہوا)۔ اور بعض مشائخ کا کہنا ہے کہ طالب کو اختیار ہے کہ جب چاہے سو جائے۔ یعنی عبادت وغیرہ سے فارغ ہو کر آرام کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ "تین آدمیوں کے اعمال نہیں لکھے جاتے۔ ایک وہ جو سو رہا ہے۔ دوسرا وہ جو بچہ ہے بلوغ سے پہلے۔ تیسرا وہ جو مجنون ہے جب تک اس کو ہوش نہ آئے"۔ چنانچہ سونے والے کے اعمال نہیں لکھے جاتے جب تک وہ سویا ہوا ہے اور خلق اس کے شر سے مامون ہے۔ اس وقت وہ بے اختیار ہوتا ہے' اس کا نفس خاموش ہوتا ہے' فرشتے اس کے نامہ اعمال لکھنے سے فارغ ہوتے ہیں۔ اس کی زبان ساکن ہوتی ہے نہ جھوٹ بول سکتی ہے نہ غیبت کر سکتی ہے اور اس کا دل

تکبر اور ریا سے فارغ ہوتا ہے۔ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيٰوةً وَلَا نُشُورًا (نہ وہ نفع نقصان پر قادر ہے نہ موت پر نہ حیات پر نہ قیامت کے دن اٹھائے جانے پر) یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ :

"جب گنہگار سوتا ہے تو شیطان پر دشوار گزرتا ہے اور وہ اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کب بیدار ہوگا اور گناہ کرے گا"۔

اس بارے میں حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا حضرت علی بن سہل اصفہانی سے اختلاف ہے حضرت علی بن سہل نے اس مضمون پر حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کو کئی خطوط لکھے جو بہت لطیف ہیں اور امت میں مقبول ہیں۔ مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ سونا غفلت ہے اور محبوب سے اعراض (بے پروائی) ہے۔ طالب کے لئے واجب ہے رات دن محبوب کے لئے بے قرار رہے' نیند کی حالت میں محبوب سے محروم ہوتا ہے۔ بلکہ اپنے نفع و نقصان سے بھی غافل ہوتا ہے اور حق تعالیٰ سے دور ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ :

"اے داؤد اس نے جھوٹ بولا جس نے میری محبت کا دعویٰ کیا اور رات بھر سوتا رہا۔" حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی کہ ہماری بیداری ہمارا فعل ہے راہ حق میں نیند فعل حق ہے ہم پر۔ پس جو کچھ ہمارے اختیار کے بغیر حق تعالیٰ کی طرف سے واقع ہوتا ہے وہ ہمارے لئے بہتر ہے اس چیز سے جو ہمارے اختیار سے سرزد ہو حق کی خاطر۔ **والنوم موهبته من الله تعالٰے علی المحبین** (اور نیند عطیہ خداوندی ہے عاشقوں پر)۔ دراصل اس کا تعلق مسئلہ سکر و صحو (فنا و بقا) کے ساتھ ہے جس پر مکمل بحث پہلے آچکی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا تعلق اصحاب صحو سے ہے

(یعنی آپ بقا کو فنا پر ترجیح دیتے ہیں) لیکن یہاں سکر (فنا) کے حق میں بات کررہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خاص وقت پر حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ پر سکر کا غلبہ ہوگا جس کی وجہ سے آپ نے اس کی حمایت کی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہو کہ نیند عین صحو (بقا) ہے اور بیداری سکر ہے کیونکہ نیند انسان کی صفت ہے اور جب تک وہ اپنی صفات سے متصف ہے وہ صاحب صحو ہے اور سونا صفت حق ہے۔ جب انسان پر صفات حق طاری ہو (بوقت فنا) تو اسے سکر کہا گیا ہو۔ یعنی مغلوب الحال۔

میں نے بعض مشائخ کو دیکھا ہے جو نیند کو بیداری سے افضل سمجھتے تھے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کی طرح کیونکہ اکثر اولیاء و انبیاء علیہم السلام کا کشف نیند میں ہوا ہے نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

" بیشک اللہ تعالیٰ فخر کرتا ہے اس بندہ پر جو سجدہ میں سوجائے۔ اور ملائکہ سے فرماتا ہے کہ دیکھو میرے بندے کو کہ جس کا روح میرے ساتھ راز و نیاز میں ہے اور جسم عبادت کی حالت میں ہے"۔

نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ :

" جو شخص باوضو ہو کر سوتا ہے اس کی روح کو اجازت ہوتی ہے کہ عرش کا طواف کرے اور حق تعالیٰ کو سجدہ کرے"۔

روایت ہے کہ حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ چالیس سال نہ سوئے۔ جب ایک رات سوئے تو حق تعالیٰ کی زیارت ہوگئی۔ اس کے بعد آپ سویا کرتے تھے تاکہ زیارت ہو۔ قیس عامری (مجنون) نے خوب کہا ہے۔ اس کے شعر کا ترجمہ یہ ہے۔

تیرے عشق میں نیند آتی ہی نہیں
پھر بھی سوتا ہوں کہ زیارت ہوجائے

بعض مشائخ کو میں نے دیکھا کہ بیداری کو نیند پر فضیلت دیتے تھے۔ حضرت علی بن سہل رحمتہ اللہ علیہ کی طرح۔ اس وجہ سے کہ انبیاء علیہم السلام کی وحی اور اولیاء کرام کی کرامات بیداری میں ہوئیں ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ :

"اگر نیند اچھی ہوتی تو بہشت میں بھی نیند ہوتی۔"

یعنی اگر نیند میں خیر و برکت ہوتی یا محبت اور قرب حق نیند کے باعث ہوتا تو چونکہ بہشت قرب حق ہے وہاں بھی نیند ہوتی۔ لیکن چونکہ بہشت میں نہ نیند ہے نہ حجاب اس لئے معلوم ہوا کہ نیند حجاب ہے۔ نیز ارباب معرفت فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام بہشت میں سوئے تو ان کے بائیں پہلو سے حوا پیدا ہوئیں اور تمام مصیبتوں کا باعث ہوئیں۔ بزرگان یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا کہ :

"اے بیٹے میں نے نیند میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔"

تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا کہ۔ "یہ نیند یعنی حق تعالیٰ سے غفلت کی وجہ سے ہے اگر آپ نہ سوتے تو بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم نہ ملتا"۔ یعنی آپ کی غفلت نے آپ کو بیٹے سے محروم اور مجھے بے جان کیا۔ لیکن میرا درد تو ایک لمحہ ہوگا آپ کی نیند ہمیشہ قائم رہے گی۔

حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں پانی میں نمک ملا کر رکھ دیتا تھا۔ جب نیند کا غلبہ ہوتا تو وہ پانی آنکھوں میں ڈال لیتا تھا۔

اور میں علی بن عثمان جلابی (اللہ کی رحمت ہو مجھ پر) نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب فرائض سے فارغ ہوتے تو سو جاتے تھے۔ نیز میں نے شیخ احمد سمر

قندی رحمتہ اللہ علیہ کو بخارا میں دیکھا کہ چالیس سال تک رات کو نہیں سوئے تھے۔ صرف دن کے وقت تھوڑی دیر سو جاتے تھے۔

اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ جس کسی کو موت زندگانی سے زیادہ محبوب ہے تو وہ نیند کو بیداری سے زیادہ پسند کرتا ہے اور جس کو زندگانی موت سے زیادہ عزیز ہے وہ بیداری کو نیند سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ پس اہم تر یہ بات نہیں کہ آدمی تکلف سے جاگتا رہے بلکہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ اسے بیدار رکھا جائے۔ (یعنی خداوند تعالیٰ اسے بیدار رکھے)۔ جیساکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو خداوند تعالیٰ کے برگزیدہ اور سب سے بلند درجہ پر فائز تھے آپ نہ تکلف سے سوتے تھے اور نہ تکلف سے بیداری اختیار فرماتے تھے۔ چنانچہ فرمان ہوا کہ : قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗ ..... "رات کو جاگو لیکن تھوڑا' نصف شب یا اس سے کم و بیش"

اور نہ ہی یہ بات کوئی اہمیت رکھتی ہے کہ تکلف سے سویا جائے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کو سلایا جائے۔ جیسا کہ اصحاب کہف کو حق تعالیٰ نے بزرگی عطا فرمائی اور بلند مراتب عطا فرمائے اور کفر سے نجات دی اور پھر ان کو طویل عرصہ تک نیند میں رکھا۔ نہ کہ بیداری میں تاکہ حالت نیند میں حق تعالیٰ ان کو بے اختیار کر کے ان پر فضل کرے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا "تم کو خیال ہے کہ وہ بیدار تھے حالانکہ وہ نیند میں تھے اور ہم نے ان کو دائیں بائیں پہلو تبدیل کرائے" اور ان دونوں حالتوں میں وہ بے اختیار تھے۔

غرضیکہ جب بندہ اس مقام پر پہنچ جائے کہ اختیار اس کے ہاتھ میں نہ رہے اور وہ ہر چیز سے منقطع ہو جائے اور غیر اللہ سے بیگانہ ہو جائے تو پھر خواہ وہ بیدار ہے یا نیند کرے دونوں چیزیں اس کے لئے مستحسن ہیں۔ پس جب طالب سوئے تو یہ خیال کرے کہ یہ زندگی کی آخری نیند ہے (یعنی موت کو قریب سمجھے)

اس لئے گناہوں سے توبہ کرے اور مخالفین کو راضی کرے۔ پھر وضو کر کے اس طرح سوئے کہ منہ قبلہ کی طرف ہو۔ نیز سونے سے پہلے سب کام درست کر لے۔ نعمت اسلام کا شکر ادا کرے اور دل میں یہ عہد کرے کہ اگر بیدار ہوا تو گناہ نہیں کروں گا۔ چنانچہ جس نے بیداری میں اپنے تمام امر درست کر لئے اسے نہ نیند سے کوئی خوف ہوتا ہے نہ موت سے۔ حکایات میں آیا ہے کہ ایک بزرگ ایک مسجد کے امام جو جاہ و جلال اور تکبر سے رہتا تھا کے پاس جا کر یہ کہتے تھے کہ اے فلاں تجھے مر جانا چاہئے جس سے وہ امام بہت ناراض ہوتا تھا کہ یہ درویش مجھے روزانہ کیوں پریشان کرتا ہے۔ ایک دن امام نے عہد کر لیا کہ جب درویش آئے گا تو پہلے میں اس سے کہوں گا کہ تجھے مر جانا چاہئے چنانچہ دوسرے دن جب وہ درویش آیا تو امام نے کہا کہ اے فلاں تجھے مر جانا چاہئے۔ چنانچہ درویش نے مصلیٰ بچھایا اور لیٹ کر کہا کہ میں مر گیا۔ یہ کہا اور جاں بحق ہو گیا اس سے اس امام کو تنبیہ ہوئی کہ درویش سچ کہتا تھا اس لئے موت کی تیاری کرنا چاہئے اور میرے شیخ علیہ الرحمہ اپنے مریدوں کو یہ فرماتے تھے کہ جب تک نیند کا غلبہ نہ ہو سونا نہیں چاہئے اور جب بیدار ہو تو پھر نہیں سونا چاہئے کیونکہ جاگ کر پھر نیند کرنا طالبان حق کیلئے حرام اور غفلت ہے۔ کیونکہ نیند سے غفلت ہوتی ہے اس مضمون پر بہت کچھ کہنا باقی ہے لیکن اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شرح جب نیند بھی بیداری بن جائے تو دونوں میں فرق مٹ جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "میری نیند بھی میری بیداری ہے" اسی طرح اولیاء کرام جب سوتے ہیں تو مراقبہ ذات میں مشغول ہوتے ہیں لہٰذا وضو بھی برقرار رہتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نیند کی طرح زور سے سانس لیتے تھے لیکن پھر

اٹھ کر نماز شروع کر دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ میری آنکھیں سوتی ہیں میرا قلب جاگتا ہے۔

فصل

مشائخ کے آداب کلام و سکوت

خداوند تعالٰی فرماتے ہیں : وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا "اس سے اچھا کلام کرنے والا کون ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور خود بھی نیک عمل کئے۔"

نیز فرمایا : قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ (اچھی بات کہنا چاہئے)۔ نیز فرمایا: قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا (کہو ہم ایمان لائے)۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق تعالٰی کا فرمان یہ ہے کہ بندہ نیک بات کرے۔ مثلاً اس کی خداوندی کا اقرار کرے' اس کی حمد و ثنا بیان کرے اور خلق کو خدا کی طرف بلائے۔ نطق یعنی بات کرنے کی توفیق حق تعالٰی کی بہت بڑی نعمت ہے بندہ پر۔ اور اسی صفت کلام سے انسان دوسرے جانوروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ خداوند تعالٰی نے فرمایا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ "ہم نے انسان پر کرم فرمایا"۔ بعض مفسرین نے اس سے قوت کلام مراد لی ہے۔ لیکن جس طرح قوت گفتار بندہ کے لئے خدا تعالٰی کی نعمت ہے اس کی آفت بھی بہت ہے جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا "وہ چیز جس سے اپنی امت کے لئے میں زیادہ ڈرتا ہوں زبان ہے۔"

غرضیکہ کلام (گفتار) شراب کی طرح عقل کو مست کر دیتی ہے۔ جس طرح انسان شراب کا عادی ہو کر اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ گفتار سے بھی نہیں چھوٹ

سکتا۔ جب اہل طریقت کو معلوم ہو گیا کہ گفتار میں آفت ہے تو ضرورت سے زیادہ کلام نہیں کرتے۔ یعنی ابتداء سے انتہائے سلوک تک اپنی گفتار پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ حق بات کہنی ہو تو بولتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ عالم الاسرار (غیب کو جاننے والا) ہے اگر کوئی یہ اعتقاد نہ رکھے تو گناہ ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے :

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ

"کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھیدوں اور راز کی گفتگو کو نہیں سنتے' ہاں ہم سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے اس کو لکھتے بھی ہیں"۔

اور رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ **من صمت نجی** "جس نے خاموشی اختیار کی نجات پائی"۔ پس خاموشی میں بہت فوائد و برکات ہیں اور گفتگو میں بہت آفات ہیں۔

بعض مشائخ سکوت (خاموشی) کو گفتار پر فضیلت دیتے ہیں اور بعض گفتار کو خاموشی سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ان میں سے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الفاظ ہوں یا عبارات یہ سب خالی دعوے ہیں۔ اصل چیز معانی ہیں۔ الفاظ بیکار ہیں۔ بعض اوقات انسان کلام کرنے سے معذور ہوتا ہے اور خوف یا تقیہ وغیرہ کی وجہ سے بات نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت مجبوری میں بات نہ کرنا معرفت کے خلاف نہیں۔ یعنی معرفت کو وہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ ہاں اگر حقیقت نہ ہو اور محض دعوہ ہو تو پھر آدمی کو بات نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ منافقت بن جائے گی۔ منافقت یہ ہے کہ محض دعوہ ہو اور اس کے پیچھے حقیقت نہ ہو۔ اگر حقیقت ہے اور دعوہ نہیں کرتا تو یہ اخلاص (خلوص) کی علامت ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے :

من اسس بنيانه على بيان لا يستغني عن اللسان ومن اسس بنيانه

علی عمان استغنی فیھا بنہ و بین ربہ من اللسان

"جس شخص کا انحصار محض زبانی جمع خرچ (دعوہ) پر ہے اس کو زبان یعنی گفتگو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور جس کو مشاہدہ حاصل ہے اس کے لئے گفتار کی ضرورت نہیں۔ تعلق باللہ ایسی چیز ہے جس میں گفتار کی ضرورت نہیں۔"

اور تعلق باللہ ہی اصل چیز ہے۔ یہ قول جنید" اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ **من عرف اللّٰہ کل لسانہ** "جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوئی اس کی زبان بند ہوئی"۔

یعنی جس نے حق تعالیٰ کو دل سے پہچان لیا (مشاہدۂ حق حاصل ہوا) اس کی زبان بند ہو جاتی ہے کسی نے خوب کہا ہے "عیاں راچہ بیان"۔ حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ ایک دن آپ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے یکایک کھڑے ہو گئے اور "یا مرادی" کا نعرہ لگایا اس کے ساتھ ہاتھ اوپر اٹھا کر حق تعالیٰ کی طرف اشارہ بھی کیا۔ اس پر حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اے ابوبکر اگر تیرا مقصود حق تعالیٰ ہے تو اشارہ کی کیا ضرورت تھی کیونکہ وہ سمت (طرف) سے پاک ہے اور اگر تیرا مطلب حق تعالیٰ نہ تھا تو تم نے غلط کیا کیونکہ حق تعالیٰ تیرے دل کی بات جانتا ہے۔ یہ سن کر حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے توبہ کی۔

اور مشائخ کا وہ گروہ جو گفتار کو خاموشی پر ترجیح دیتا ہے یہ کہتا ہے کہ اپنے باطنی احوال و عقائد کو زبان سے بیان (اقرار) کرنے کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے اگر کوئی شخص ہزار سال تک باطن میں عارف ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتا تو یہ بھی کفر میں شمار ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے جا بجا مومنوں کو حمد و ثناء کی تلقین فرمائی ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا کہ :

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ "حق تعالیٰ کی نعمت بیان کرو"

نعمت کا شکر ادا کرنا گفتار ہی تو ہے۔ چنانچہ ہماری گفتار حق تعالیٰ کے حکم کی تعظیم کا درجہ رکھتی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

ادْعُوْنِیٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ "مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کرتا ہوں"۔

نیز فرمایا :

اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ "جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو اس کو جواب دیتا ہوں"۔

اس قسم کے احکام بہت ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے روحانی احوال بیان نہیں کرتا اس کو کوئی حال نصیب نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو کچھ باطن میں ہے خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کسی نے خوب کہا ہے :

لسان الحال افصح من لسانی - و صمتی عن سوالی ترجمانی

" میرے حال کی زبان میری جسمانی زبان سے زیادہ فصیح ہے اور میری خاموشی میرا بیان ہے۔"

حکایت ایک دفعہ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ بغداد کے علاقہ کرخ میں جا رہے تھے ایک جھوٹے مدعی کو یہ کہتے ہوئے دیکھا **السکوت خیر من الکلام** "خاموشی کلام سے بہتر ہے"۔ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا **سکوتک خیر من کلامک و کلامی خیر من سکوتی** "تیرا سکوت تیرے کلام سے بہتر ہے اور میرا کلام میرے سکوت سے بہتر ہے کیونکہ تیرا کلام لغو (بیہودہ) ہے اور تیرا سکوت فضول ہے اور میرا کلام میری خاموشی سے اس لئے بہتر ہے کہ میری خاموشی حلم (قوت برداشت) ہے اور میرا کلام علم (معرفت) ہے۔"

یعنی اگر میں معرفت کی باتیں نہ کروں تو یہ میری قوت برداشت (حلم) کی وجہ سے ہوتا ہے اور جب معرفت بیان کرتا ہوں تو یہ میرے علم کا نتیجہ ہوتا

ہے۔ یعنی جب خاموش ہوتا ہوں تو حلیم ہوتا ہوں اور جب بولتا ہوں تو علیم (عارف) ہوتا ہوں۔

قول مصنّف رحمتہ اللہ علیہ اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ کلام کی بھی دو اقسام ہیں اور سکوت کی بھی۔ کلام حق بھی ہوتا ہے اور باطل بھی اور سکوت یا تو باطنی مشاہدہ کی وجہ سے ہوتا ہے یا غفلت سے پس ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے کلام اور سکوت کو پرکھے اگر اس کا کلام حق ہے تو کلام بہتر ہے سکوت سے۔ اگر کلام باطل ہے تو سکوت بہتر ہے کلام سے۔ جھوٹے صوفیوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ گفتار بہتر ہے سکوت سے اور جاہلوں کا ایک گروہ ہے جو مینار اور کوئیں کے درمیان فرق نہیں جانتے کہتے ہیں کہ سکوت بہتر ہے گفتار سے۔ مگر دونوں برابر ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ :

الامن نطق اصاب او غلط ومن انطق عصم من الشطط

"جو کوئی بات کرتا ہے یا صحیح کہتا ہے یا غلط لیکن جس کو حق تعالیٰ بات کراتا ہے اس کو خطا سے بچاتا ہے"۔ جیسا کہ ابلیس نے کہا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ "میں آدم سے بہتر ہوں" ۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کہلوایا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا "اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا"۔

اور مشائخ طریقت جب بات کرتے ہیں تو خدائی حکم (القا) سے بات کرتے ہیں اور جب خاموش ہوتے ہیں تو شرم زدہ و مجبور ہوتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے : **من کان سکوتہ حیاء کان کلامہ حیٰوۃ** "جس کا سکوت شرم و حیا سے ہے اس کا کلام حیات بخش ہے" اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی گفتار مشاہدہ پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر مشاہدہ نہ ہو تو گفتار بے کار ہے جب اپنے آپ میں (باخود) ہوتے ہیں تو وہ خاموشی کو گفتار سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ لیکن جب بے خود ہوتے ہیں تو خلق خدا ان کے کلام کو اپنے دل پر لکھ لیتی ہے۔ اس لئے ایک

بزرگ فرماتے ہیں کہ :

من کان سکوتہ ذھبا کان کلامہ مذھبا "جس کا سکوت سونا ہے اس کا کلام کیمیا یعنی سونا بنانے والا ہوتا ہے" پس طالب حق جو عبودیت میں مشغول ہے کو چاہئے کہ اپنی زبان بند رکھے تاکہ ربوبیت کی زبان بول اٹھے اور مریدوں کے دلوں کو لبھائے۔

لہٰذا ادب گفتار یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم کے بغیر بات نہ کرے اور جو بات کرے حکم الٰہی کے سوا کچھ نہ ہو اور خاموشی کے آداب یہ ہیں کہ نہ جاہل ہو اور نہ جہالت پر اکتفا کرے نہ غافل رہنا پسند کرے نیز مرید کو چاہئے کہ شیخ کے کلام پر اعتراض نہ کرے اور نہ اس میں تصرف کرے اور جس زبان سے توحید کا اقرار کیا ہے اس سے جھوٹ نہ بولے اور غیبت نہ کرے نہ اس سے مسلمانوں کو ایذا پہنچائے اور نہ درویشوں کو نام لے کر مخاطب کرے جب تک اس سے سوال نہ کیا جائے کوئی بات نہ کرے۔ بات کرنے میں پہل نہ کرے درویش کی خاموشی کی شرط یہ ہے کہ باطل پر چپ نہ رہے اور گفتار کی شرط یہ ہے حق گوئی کے سوا بات نہ کرے۔ اس کی تفصیل بہت دراز اور لطائف بے شمار ہیں لیکن یہاں ہم نے اختصار سے کام لیا ہے تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

مشائخ کے آداب سوال

خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے :

لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا "لوگوں سے نہیں مانگتے لپٹ کر۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔ اور جب ان سے کوئی شخص سوال کرے تو انکار نہ کریں جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے :

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ "اور سائل کو نہ جھڑکو"

اور جہاں تک ممکن ہو سکے خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے سوال نہ کرے اور غیر اللہ کو قاضی الحاجات نہ سمجھے۔ کیونکہ سوال کا مطلب ہے خدا کو چھوڑ کر غیر کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور جب بندہ خدا سے منہ موڑتا ہے تو یہ ڈر ہے کہ وہ نہ منہ موڑ لے میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک دنیادار نے رابعہ بصری رحمتہ اللہ علیہا سے کہا کہ مانگو مجھ سے جو چاہو۔ رابعہ نے فرمایا کہ مجھے تو اس بات سے بھی شرم آتی ہے کہ دنیا کے خالق سے دنیا طلب کروں بھلا تجھ سے کیسے طلب کر سکتی ہوں۔

حکایت ایک دفعہ ابو مسلم کے عہد حکومت میں ایک درویش کو بے گناہ قید کر دیا گیا جب رات ہوئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں فرمایا کہ اے ابو مسلم مجھے خدا تعالیٰ نے تیرے پاس اسلئے بھیجا ہے کہ اس کا ایک دوست بے گناہ تیری قید میں ہے۔ اٹھو اور اس کو رہا کرو۔ ابو مسلم فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور سر اور پاؤں سے ننگا قید خانہ کی طرف دوڑا اور حکم دیا کہ دروازہ کھول دیا جائے جب وہ درویش باہر آیا تو اس سے معافی مانگی اور یہ کہا کہ جس چیز کی ضرورت ہو طلب کریں درویش نے کہا اے امیر جو شخص ایسا خدا رکھتا ہے جس نے آدھی رات کو تجھے بستر سے اٹھا کر مجھے رہا کرنے کا حکم دیا ہے کیا وہ شخص کسی غیر سے حاجت طلب کر سکتا ہے یہ سن کر ابو مسلم پر گریہ طاری ہو گیا اور وہ درویش چلا گیا۔

بعض مشائخ کہتے ہیں کہ درویش کیلئے سوال کرنا جائز ہے کیونکہ حق تعالیٰ

نے فرمایا ہے :

لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا "نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ سوال کرنا جائز ہے لیکن لپٹ کر سوال نہیں کرنا چاہئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اصحاب کی خاطر سوال کئے اور ہم سے بھی فرمایا کہ :

اطلبوا الحوائج عند حسان الوجوہ "اپنی حاجتیں نیک لوگوں سے طلب کرو۔"

بعض مشائخ نے تین وجوہات کی بناء پر سوال کرنا جائز قرار دیا ہے۔ اول فراغ دل کیلئے (یعنی روٹی کی فکر سے فارغ ہو کر عبادت میں مشغول ہو جانا) وہ کہتے ہیں کہ دو روٹی کی اتنی قدر و قیمت نہیں کہ ہم دن رات اسکی فکر میں رہیں (بلکہ باہر سے آجائے تو بہتر ہے تاکہ بے فکر ہو کر عبادت میں مشغول ہو جائیں) یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابویزید رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت شقیق بلخی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید سے پوچھا کہ تمہارے شیخ کیا کرتے ہیں تو اس نے کہا کہ وہ خلق خدا سے بے نیاز ہو کر توکل پر جمے بیٹھے ہیں اس پر حضرت ابویزید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اپنے شیخ سے جا کر کہو کہ خداوند تعالیٰ کو دو روٹی سے نہ آزماؤ۔ جب بھوک لگے تو دو روٹی کسی سے لے کر کھا لے اور راہ خدا میں مشغول رہے اور توکل کی کتاب کو ایک طرف رکھ دے تاکہ وہ شہر اور ملک اس نحوست سے زمین میں نہ دھنس جائیں۔

شرح ایک کتاب میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابو یزید رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت شقیق بلخی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید سے ان کے پیر کے متعلق دریافت کیا تو اس نے کہا کہ ان کا توکل اس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ اگر زمین پتھر بن جائے اور کچھ نہ اگائے اور آسمان لوہا بن جائیں اور بارش بند ہو جائے تو ان کے توکل

میں فرق نہیں آئے گا۔ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ نے یہ سن کر فرمایا کہ بڑا شرک ہوا۔ اس کو کہو کہ دو روٹی ہمسایہ سے مانگ کر کھالے اور اپنے توکل پر نہ اترائے کیونکہ اپنے کام پر اترانا بھی شرک ہے. نہایت باریک ہونے کی وجہ سے جس کا علم حضرت شقیق رحمتہ اللہ علیہ کو نہ ہو رہا تھا۔

ترجمہ سوال کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مشائخ سوال کر کے اپنے نفس کو ذلیل کرتے ہیں اور اس کے تکبر کو توڑتے ہیں اس کا رنج و ملال برداشت کرتے ہیں اور اپنی ہیچ مقداری کو محسوس کرتے ہیں تاکہ نفس موٹا نہ ہو۔ ایک دفعہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مرید ابوبکر شبلی سے کہا کہ اے ابوبکر تجھے اس بات پر فخر ہے کہ تو امیر سامرہ کا بیٹا ہے جو بادشاہ کا مقرب ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تم بازار جاؤ اور ہر شخص سے بھیک مانگو تاکہ تجھے اپنی ذلت کا احساس ہو۔ چنانچہ وہ ہر روز بازار جا کر چھ سال تک بھیک مانگتے رہے۔ حتی کہ اس حال کو پہنچے کہ ہر شخص ان کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور کچھ نہ دیتا تھا۔ جب حضرت شیخ کے پاس واپس آئے تو انہوں نے فرمایا اے ابوبکر اب تجھے اپنی قدر و قیمت معلوم ہوئی کہ خلق خدا تجھے ذلیل سمجھتی ہے اب تم ان کے ساتھ دل مت لگاؤ اور کسی قیمت پر ان سے میل ملاپ نہ رکھو۔ چنانچہ یہ فعل ریاضت نفس کیلئے تھا نہ کہ روزی کمانے کیلئے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرا ایک رفیق تھا جو فوت ہو گیا میں نے اس کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے۔ اس نے کہا مجھے حق تعالیٰ نے بخش دیا ہے۔ میں نے پوچھا کس بات پر اس نے کہا حق تعالیٰ نے مجھے کھڑا کر کے فرمایا کہ تم نے ذلیل اور کمینہ لوگوں سے بہت تکلیف اٹھائی ہے کیونکہ ان کے سامنے دست سوال دراز کیا اور صبر سے کام لیا۔ اس لئے ہم نے تجھے بخش دیا ہے۔

سوال کے جواز کی تیسری وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی عظمت کی خاطر لوگوں سے یہ جان کر سوال کرے کہ در حقیقت دنیا کا مال و دولت حق تعالیٰ کی ملکیت ہے اور دنیا دار لوگ صرف حق تعالیٰ کے وکیل یا کارندہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے جب وکیل سے کوئی چیز طلب کرتے ہیں تو دراصل خدا سے طلب کرتے ہیں اور بندہ بن کر وکیل کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں۔ اور اس کی عزت و احترام کرتے ہیں پس ان کا غیر سے سوال کرنا حق تعالیٰ کی عزت اور عظمت کی علامت ہے نہ کہ اس سے روگردانی کی۔

حکایت میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک دن حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ کی بیٹی نے اپنی ماں سے کہا کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے۔ ماں نے کہا کہ خدا تعالیٰ سے طلب کرو۔ بیٹی نے کہا اماں مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ خواہش نفس کو خدا تعالیٰ سے طلب کروں اور جو کچھ تو مجھے دے گی وہ بھی تو خدا کا دیا ہوا ہے جو میرے مقدر میں لکھا ہے۔

پس سوال کرنے کا ادب یہ ہے کہ اگر سوال کرنے سے کچھ مل جائے تو خوش نہیں ہونا چاہئے اور نہ ملے تو غم نہیں کرنا چاہئے۔ اور خلق خدا پر نگاہ نہ رکھے نیز عورتوں اور بازاری لوگوں سے سوال نہ کرے اور سوال بھی اس سے کرے جس کا مال حلال کا ہے۔ نیز ضرورت سے زیادہ کا سوال بھی نہ کرے نہ آرام و آسائش کا سامان کرے نہ اسے اپنی ملکیت سمجھے صرف وقتی ضرورت پوری کرلے اور کل کیلئے انتظام نہ کرے ورنہ ہلاکت جاویدانی میں مبتلا ہو جائے گا اور خداوند تعالیٰ کو مال کمانے کا ذریعہ نہ بنائے۔ نیز اپنے آپ کو نیک و پارسا دکھا کر بھی سوال نہ کرے۔

حکایت ایک دفعہ ایک درویش جو بہت بڑے بزرگ تھے صحرا سے واپس شہر

میں آئے جب بھوک نے ستایا تو ایک چڑیا کو ہاتھ پر بٹھا کر لوگوں سے یہ سوال کرتے تھے کہ اس چڑیا کیلئے کچھ کھانے کو دو۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے انہوں نے جواب دیا کہ میں کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کیلئے مجھے کوئی چیز دو۔ اس لئے اس حقیر چیز کو درمیان میں لایا ہوں۔ یہ مضمون تو طویل ہے لیکن اختصار کی خاطر اسی پر اکتفا کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل

مشائخ کے تزویج (شادی) اور تجرید (مجرد) ہونے کے بیان میں

خدا تعالیٰ نے فرمایا :

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ "عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔"

نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے : "نکاح کرو اور امت کو بڑھاؤ میں قیامت کے دن سب امتوں پر کثرت کی وجہ سے فخر کروں گا"

نیز فرمایا : "تمام عورتوں میں سے بہترین وہ ہے جو کم خرچ کرنے والی ہو خوبصورت ہو اور پاکدامن ہو۔"

اور یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نکاح مباح ہے تمام مردوں اور عورتوں پر اور فرض ہے ان پر جو حرام سے نہ بچ سکیں۔ اور سنت ہے اس پر جو اپنے اہل و عیال کا حق ادا کر سکے۔ نیز اس بارے میں مشائخ کا قول یہ ہے کہ

شادی اس لئے کی جائے کہ شہوت دفع ہو اور روزی اس لئے کمائی جائے کہ فراغت دل حاصل ہو بعض مشائخ کا کہنا ہے کہ شادی اولاد کی نیت سے کی جائے کیونکہ جب بیٹا پیدا ہوتا ہے تو یا تو باپ سے پہلے فوت ہو جاتا ہے یا بعد میں۔ اگر پہلے فوت ہو گیا تو باپ کی شفاعت کرے گا اور بعد میں فوت ہوا تو باپ کیلئے فاتحہ پڑھے گا۔ نیز روایت ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے ان کی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا رشتہ طلب کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بچی کی عمر کم ہے اور آپ کی عمر زیادہ ہے میرا ارادہ ہے کہ اپنی بیٹی کو اپنے بھتیجے عبداللہ بن جعفر کو دوں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہلا بھیجا کہ یا ابوالحسن دنیا میں زیادہ عمر کی خواتین بہت ہیں لیکن ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنے میں میری نیت دفع شہوت نہیں بلکہ اثبات (دوام) نسل ہے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا کہ "تمام حسب و نسب موت پر ختم ہو جاتے ہیں مگر میرا حسب و نسب کبھی ختم نہیں ہوتا" ایک اور روایت میں یہ ہے کہ : "تمام اسباب اور انساب ختم ہو جائیں گے لیکن میرا سبب (نسبت) اور نسب قطع نہیں ہو گا"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ چونکہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ جو نسبت ہے وہ تو ختم نہیں ہو گی میری خواہش ہے کہ ان کے ساتھ میرا نسب بھی قائم ہو جائے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ دو تعلق قائم ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی ام کلثوم بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا اور ان کے بطن مبارک سے حضرت زید بن عمر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

" عورتوں سے نکاح چار وجوہات کی بناء پر کرو' مال' حسب' حسن اور

دین۔ تمہارے لئے نیک عورت سے شادی کرنا زیادہ ضروری ہے کیونکہ اسلام کے بعد بہترین نعمت یہ ہے کہ ایک مومن اور دل پسند بیوی کی صحبت سے دل خوش رہے"

نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ :

الشیطان مع الواحد "شیطان اکیلے آدمی کے ساتھ ہوتا ہے"

کیونکہ جب مرد یا عورت اکیلے رہتے ہیں تو شیطان کو شہوت کے بہانے سے گمراہ کرنے کا اچھا موقعہ مل جاتا ہے اور زنا سے بچنے کے لئے میاں بیوی کی صحبت سے کوئی صحبت بہترین نہیں ہے بشرطیکہ دونوں کے درمیان محبت ہو اگر دونوں کے درمیان محبت نہیں تو اس سے زیادہ بری صحبت کوئی نہیں ہے۔ پس درویش کو چاہئے کہ سب سے پہلے خوب غور کرے اور اس بات کا فیصلہ کرے کہ علیحدہ رہنے اور نکاح کرنے میں سے کون سی چیز اس کے لئے آسان ہے۔ کیونکہ دونوں آفات ہیں یعنی ایک آفت ترک نکاح ہے دوسری شہوت کی پرورش یعنی حرام کاری کا امکان نیز نکاح کے بھی دو آفتیں ہیں ایک دل کا غیر اللہ یعنی بیوی کے ساتھ سکون پانا' دوسری نفسانی خواہش (شہوت) کا پورا کرنا اور یہ مسئلہ گوشہ نشینی سے حل ہوتا ہے۔ جس شخص کا دل خلق خدا کی صحبت پسند کرتا ہے اس کے لئے نکاح ضروری ہے اور جس شخص کی طبیعت عزلت یعنی گوشہ نشینی کی طرف مائل ہے اس کے لئے نکاح نہ کرنا بہتر ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ہے کہ : "آگے بڑھو کہ مفرد لوگ سبقت حاصل کر گئے"

حضرت حسین بن ابی الحسین بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"ہلکے بوجھ والے (مجرد لوگ) فلاح پا گئے اور بھاری بوجھ والے (یعنی شادی شدہ لوگ) ہلاک ہوئے"

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں ایک بزرگ کی زیارت کیلئے ایک گاؤں میں گیا تو دیکھا کہ ایسا پاکیزہ گھر ہے جیسے کسی ولی اللہ کا عبادت خانہ ہے اس گھر میں دو محراب تھے ایک محراب میں وہ بزرگ بیٹھے تھے اور دوسرے کے اندر ایک نیک خاتون بیٹھی تھی اور وہ دونوں عبادت کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکے تھے۔ جب مجھے دیکھا تو بہت خوش ہوئے تین دن تک میں انکا مہمان رہا جب میں رخصت ہونے لگا تو اس بزرگ سے پوچھا کہ اس خاتون کا آپ کے ساتھ کیا رشتہ ہے انہوں نے جواب دیا کہ اس کے ساتھ میرے دو رشتے ہیں ایک یہ کہ وہ میرے چچا کی بیٹی ہے دوسرے وہ میری بیوی ہے یہ سن کر میں نے کہا کہ ان تین دنوں میں مجھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا آپ کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے انہوں نے کہا ہاں پینسٹھ سال سے یہی حال ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے فرمایا کہ بچپن ہی سے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ عشق تھا لیکن اس کا باپ مجھے رشتہ نہیں دیتا تھا کیونکہ ہمارے عشق کا اس کو علم ہو گیا تھا۔ ہم نے ایک مدت تک جدائی کا دکھ برداشت کیا جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو میرے باپ نے جو اس کے چچا تھے اس کا میرے ساتھ نکاح کر دیا۔ جب پہلی رات ہماری ملاقات ہوئی تو بیوی نے کہا کہ تجھے معلوم ہے خداوند تعالیٰ نے ہم پر کس قدر کرم فرمایا اور ایک دوسرے کو ملا کر مدت کی آرزو پوری کر دی ہے میں نے کہا بالکل سچ کہتی ہو اس نے کہا لہذا ہمیں چاہئے کہ آج رات شکرانہ کے طور پر نفسانی خواہش سے باز رہیں شہوت پر قابو پائیں اور ساری رات عبادت میں گزار دیں۔ میں نے کہا بہت اچھا' دوسری رات بھی اس نے یہی کہا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ دو راتیں آپ کے کہنے پر عبادت میں صرف کی ہیں اب دو راتیں میرے کہنے پر عبادت میں صرف کریں چنانچہ آج پینسٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے کہ ہم نے پرہیز سے کام لیا ہے اور عبادت میں مصروف رہے ہیں۔

پس جب کوئی درویش کسی عورت سے نکاح کرے تو اس کو چاہئے کہ پہلے مال حلال سے اس کے نان نفقہ کا انتظام کرے اور پھر حلال رزق سے اس کا حق المہر ادا کرے۔ یعنی جبتک احکام خداوندی پورے نہ ہوں حظ نفس سے باز رہے اور جب اپنے اوراد و وظائف ختم کر چکے تو پھر اس کے ساتھ ہم بستری کرے تاکہ شہوت نفس کا زور ختم ہو جائے اور خداوند تعالیٰ کی اس طرح مناجات کرے کہ :

"یااللہ تو نے جہان کو قائم رکھنے کی خاطر انسان کے اندر شہوت کو پیدا فرمایا اور اپنے علم میں تو نے چاہا کہ مجھے یہ صحبت نصیب ہو۔ یااللہ اس صحبت سے میری دو مرادیں پوری کر دے۔ ایک یہ کہ اس فعل حلال کی وجہ سے حرام میں مبتلا نہ ہو جاؤں' دوم یہ کہ مجھے ایسا بیٹا عطا فرما جو تیرا ولی اور محبوب ہو نہ ایسا بیٹا جو میرے اور تیرے درمیان حائل ہو۔"

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ جب ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو جب بھی وہ بچہ ماں سے کھانا طلب کرتا تو وہ کہتی کہ خدا سے طلب کرو چنانچہ وہ لڑکا محراب میں جا کر سجدہ کرتا اور کھانے کی دعا کرتا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں چپکے سے اس کے پاس اس طرح کھانا رکھ دیتی تھی کہ اس کو خبر نہ ہوتی تھی۔ اس سے لڑکے کے دل میں یہ یقین پختہ ہو گیا کہ جو کھانا اسے ملتا ہے خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے ایک دن جب وہ لڑکا مدرسے سے واپس آیا تو ماں موجود نہ تھی۔ اس نے محراب میں جا کر سجدہ کیا اور کھانے کیلئے دعا مانگی تو کھانا مل گیا جب اس کی ماں واپس آئی تو بیٹے سے پوچھا کہ کھانا کہاں سے آیا اس نے کہا جہاں سے روزانہ آتا ہے۔

اسی طرح جب حضرت زکریا علیہ السلام حضرت بی بی مریم علیہا السلام کے پاس تشریف لے جاتے تو گرمی کے موسم میں سردی کے پھل اور سردی کے

موسم میں گرمی کے پھل پڑے ہوئے دیکھتے تھے۔ جب اس کی وجہ دریافت فرماتے وہ یہ جواب دیتی تھیں کہ "یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں"۔

لیکن بزرگوں کی ان روایات کا مطلب یہ نہ ہونا چاہئے کہ درویش خداوند تعالیٰ سے دنیا طلب کرے' یا حرام کی خواہش کرے یا عیش و عشرت طلب کرے کیونکہ درویش دل کی خرابی کی وجہ سے تباہ ہوتا ہے جیسا کہ ایک دنیا دار آدمی مال و دولت کی تباہی سے تباہ ہوتا ہے۔ لیکن جہاں ایک امیر آدمی اپنے نقصان کا ازالہ کر سکتا ہے درویش کا نقصان اس قسم کا ہے کہ اس کا ازالہ نہیں کیا جا سکتا اور اس زمانے میں درویشوں کے مزاج کے مطابق ایسی بیوی کا ملنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے جو ضرورت سے زیادہ طلب نہ کرتی ہو یا فضول چیزوں سے پرہیز کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے تجرد کو پسند کیا اور اپنی پشت پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا۔ جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

"آخری زمانے میں بہترین شخص وہ ہو گا جس کا بوجھ کم ہو گا" جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ حضور کم بوجھ سے کیا مراد ہے تو فرمایا کہ "جس کے اہل و عیال نہ ہوں"۔

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ :

"تیز چلو کیونکہ بے اہل و عیال تم سے سبقت لے گئے"۔

تمام مشائخ عظام اس بات پر متفق ہیں کہ بہترین اور افضل ترین درویش وہ ہیں جن کا دل تجرد کی حالت میں (یعنی بغیر شادی) دنیا کی محبت سے پاک ہے اور شہوات نفس اس کے قابو میں ہوں۔ عوام غلطی سے مندرجہ ذیل حدیث کو شہوت رانی کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ :

"تمہاری دنیا میں تین چیزیں مجھے پسند ہیں۔ خوشبو' عورت اور میری

آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔"

ان لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو پسند ہے اس لئے فاضل ترین کام عورت سے نکاح کرنا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ :

"میرے دو پیشے ہیں ایک فقر دوسرا جہاد۔"

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت تم کو پسند ہے تو فقر اور جہاد کو کیوں افضل قرار نہیں دیتے ہو اور صرف عورتوں کو کیوں پسند کرتے ہو اگر کوئی شخص پچاس سال تک اپنی خواہش کے تابع رہے اور یہ خیال کرے کہ وہ سنت پر عمل کر رہا ہے تو غلطی پر ہے۔

غرضیکہ پہلا فتنہ جو حضرت آدم علیہ السلام پر مقدر ہوا اس کی اصل بھی عورت ہوئی ہے اور ہابیل اور قابیل کا پہلا فتنہ جو دنیا میں ظاہر ہوا اس کا سبب بھی عورت ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں یعنی ہاروت و ماروت کو زمین پر بھیجا تو ان کی گمراہی کا سبب بھی عورت تھی جس کا نام زہرہ تھا اور آج تک تمام دنیاوی اور دینی خرابیوں کا سبب عورتیں ہیں (یعنی عورت سے ناجائز تعلقات رکھنے کی وجہ سے لوگ فتنہ و فساد میں مبتلا ہوتے ہیں نہ کہ عورت کا وجود فتنہ ہے)۔

نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

"میں نے لوگوں کے لئے اپنے بعد عورتوں سے زیادہ فتنہ کوئی نہیں چھوڑا۔"

شرح اس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ عورت کا وجود فتنہ نہیں بلکہ عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھنا فتنہ ہے۔ اس میں عورت بچاری کا کیا قصور ہے، قصور تو اس مرد کا ہے جو عورت کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔

ترجمہ غرضیکہ طریقت میں تجرد ضروری ہے کیونکہ جب شادی ہو جاتی ہے حال دگرگوں ہو جاتا ہے اور پھر اس کو کوئی چیز نہیں روک سکتی سوائے اجتہاد (جہاد بالنفس) کے کیونکہ جو آفت تیرے اندر سے پیدا ہوتی ہے اسے تیرے سوا کوئی نہیں مٹا سکتا اور شہوت دو طریقوں سے دبائی جا سکتی ہے اول تمہاری اپنی کوشش سے دوم بیرونی اثرات سے۔ جہاں تک تمہاری کوشش کا تعلق ہے نفس کو بھوکا رکھنے سے شہوت کا زور کم ہوتا ہے اور جہاں تک بیرونی اثرات کا تعلق ہے یہ خدا کا خوف اور خدا کی محبت ہے جس سے شہوات نفس کا زور کم ہوتا ہے اور تمام مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

احمد حماد سرخسیؒ سے جو بہت بڑے بزرگ اور میرے دوست تھے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ کو شادی کی خواہش ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے پوچھا کس وجہ سے ؟ آپ نے جواب دیا وجہ یہ ہے کہ کبھی میں حالت غیوب میں ہوتا ہوں اور کبھی حالت حضور میں۔ جب میں غیب ہوتا ہوں تو مجھے کونین کی خبر نہیں ہوتی۔ اور جب اپنے آپ میں حاضر ہوتا ہوں تو اپنے نفس پر اس قدر قابو رکھتا ہوں کہ جب مجھے ایک روٹی مل جاتی ہے تو اسے ہزار حوروں سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں پس دل کو قابو میں رکھنا بہت بڑی فتح ہے خواہ کچھ ہو جائے۔

بعض کا خیال ہے کہ نکاح کرنے یا نہ کرنے میں ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہم تو اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ تقدیر الٰہی کیا ہے اگر نکاح نہ کرنا ہماری تقدیر میں ہے تو ہم پاکدامن رہنے کی کوشش کریں گے اور اگر نکاح کرنا مقدر ہے تو ہم سنت پر عمل کریں گے اور حق تعالیٰ کے احکام کی پابندی کریں گے۔ ہمارے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال موجود ہے جب آپؑ زلیخا کے فتنے میں مبتلا ہوئے تو اپنے نفس پر اس قدر قادر رہے کہ گناہ میں مبتلا نہ ہوئے اور مراد سے بے مراد رہے۔ اور شادی ہو جائے تو پھر بھی حضرت ابراہیم

علیہ السلام کی طرح اللہ پر توکل رکھے اور ہمہ تن بیوی کے ساتھ مشغول نہ ہو جائے یعنی جب پہلی بیوی حضرت سارا رضی اللہ عنہا کے دل میں دوسری بیوی کا رشک پیدا ہوا تو انہوں نے نفس پر قابو پا کر دوسری بیوی کو صحرا میں پہنچا دیا اور خدا کے سپرد کر دیا اور پھر ان کی طرف التفات نہ کیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کی پرورش فرمائی۔ پس بندہ کی ہلاکت نہ تجرید میں ہے نہ تزویج میں۔ بلکہ اس کی ہلاکت متابعت نفس میں ہے اگر شادی کر لی ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ اپنے معمولات پر باقاعدگی سے جما رہے اور کوئی چیز قضا نہ کرے تاکہ اسکی روحانی ترقی میں خلل نہ آئے نیز اپنی اہلیہ کو بھی خوش رکھے اور اس کی ضروریات پوری کرے اور نان و نفقہ حاصل کرنے کیلئے سلاطین و امراء کی خوشامد نہ کرے۔

حکایت ایک دفعہ حضرت احمد بن حرب نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں کچھ امراء و رؤساء سلام کی خاطر حاضر ہوئے جب وہ سب حضرت شیخ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے تو آپ کا لڑکا شراب کے نشے میں مست گاتا ہوا پاس سے گزر گیا اور کسی کی پرواہ نہ کی یہ دیکھ کر سب کو تعجب ہوا۔ ان کو تعجب کی حالت میں دیکھ کر حضرت شیخ نے فرمایا کہ وہ معذور ہے وجہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ہمارے ہمسایہ نے ہمارے پاس کچھ کھانا بھیجا اور میں نے اور میری بیوی نے وہ کھانا کھا لیا اسی رات جب ہم بستر ہوئے اور نیند کا اس قدر غلبہ ہوا کہ ہم دونوں اپنے معمولات بھول گئے۔ جب صبح کے وقت ہم نے پشیمان ہو کر ہمسایہ سے دریافت کیا کہ وہ کھانا کہاں سے آیا تھا تو اس نے جواب دیا کہ کل بادشاہ کے ہاں کوئی شادی کی تقریب تھی وہ کھانا وہاں سے آیا تھا۔

اور مجرد آدمی کے آداب یہ ہیں کہ اپنی آنکھ کی حفاظت کرے اور نہ دیکھنے والی چیزوں کو نہ دیکھے نیز کان کو بھی ناجائز باتوں کے سننے سے باز رکھے اسی طرح دماغ کو بھی ناجائز سوچ سے باز رکھے اور شہوت کی آگ کو بھوک کے پانی سے

بجائے دل کو دنیا کے ساتھ مشغول نہ کرے۔ ہوائے نفس کو علم یا الہام قرار نہ دے۔ اگر شیطان کی طرف سے کوئی مکر پیش آئے تو اس کو سچ نہ سمجھے۔ تاکہ طریقت میں ثابت قدم رہے یہ ہیں مختصر الفاظ میں آداب صحبت و معاملات۔ واللہ اعلم۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

روشن از عکس جمالش عالم امکان ما
یک نگاه ناز جاناں قیمت ایمان ما
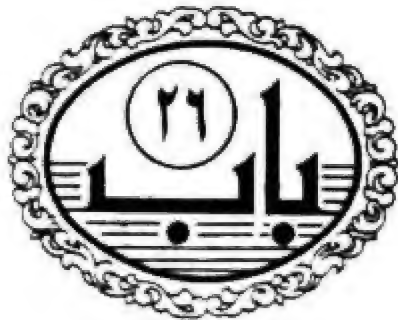
دسویں حجاب کا کھلنا

اصطلاحات تصوف اور اُن کے حقائق و معارف کے بیان میں

اللہ تعالیٰ تجھے سعادت مندی عطا فرمائے تجھے جاننا چاہئے کہ دنیا کے ہر فن اور پیشے کے ماہرین کے ہاں کچھ اصطلاحات ہوتی ہیں جن کے مطالب ان کے سوا کوئی نہیں جانتا ان اصطلاحات کے وضع کرنے کے دو فوائد ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ مشکل بات آسان ہو جائے اور اس کے مطالب اچھی طرح سمجھ میں آجائیں دوم یہ کہ نا اہلوں سے اسرار و رموز کو چھپایا جا سکے۔ یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ اہل لغت نے اپنے فن میں مخصوص اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں مثلاً فعل ماضی، فعل حال، فعل مستقبل، صحیح، معتل، اجوف، لفیف اور ناقص وغیرہ۔ اسی طرح اہل علم نحو نے بھی اپنے علم کی اصطلاحات مقرر کر لی ہیں۔ جیسے رفع، ضم، نصب، فتح، خفض، کسر،

جزم، جر، منصرف وغیرہ اسی طرح اہل علم عروض کی بھی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً بحور، دوائر، سبب، و تد، فاصلہ وغیرہ اور علم ہندسہ کی اپنی اصطلاحات ہیں مثل فرد، نوح، ضرب، قسمت و کعب، جذر، اضافت، تنصیف، جمع و تفریق وغیرہ اسی طرح علم فقہ کی اصطلاحات ہیں مثلاً علت، معلول، قیاس، اجتہاد، رفع، الزام وغیرہ نیز علم حدیث کی بھی مخصوص اصطلاحات ہیں مثلاً مسند، مرسل، احاد، متواتر، جرح، تعدیل وغیرہ اسی طرح علم الکلام کی اپنی اصطلاحات ہیں مثل عرض و جوہر، کل و جزو، جسم و حدث، جبر، قدر، ہیولی وغیرہ۔ اسی طرح اہل طریقت کی بھی مخصوص اصطلاحات ہیں تاکہ اظہار خیالات کر سکیں اور جسے چاہیں اپنی بات بتا سکیں اور جس سے چھپانا چاہیں چھپا سکیں۔ چنانچہ ہم ان اصطلاحات کی تشریح کرتے ہیں تاکہ آپ کو اور اس کتاب کے تمام پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کا کیا مطلب و مفہوم ہے اور سب لوگ اس سے فائدہ حاصل کر سکیں اور میرے حق میں دعائے خیر کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ان میں سے بعض اصطلاحات یہ ہیں۔

حال اور وقت اور دونوں کے درمیان فرق

لفظ وقت اہل تصوف کے ہاں ایک عام اصطلاح ہے جس کے متعلق مشائخ نے بہت کچھ فرمایا ہے اب میں اس کی مختصر شرح بیان کروں گا۔ وقت سے مراد ایسی کیفیت ہے جس کی وجہ سے سالک زمانہ ماضی و مستقبل سے بے خبر ہو جاتا ہے یا جیسے حق تعالیٰ کی طرف سے ایک وارد (فیضان) قلب پر وارد ہوتا ہے جو قلب پر کشف کی طرح مسلط ہو جاتا ہے جس سے زمان و مکان کا تعین نہیں رہتا۔ یعنی نہ ماضی کا شعور رہتا ہے نہ مستقبل کا اور یہ چیز عام لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی۔ عام لوگ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کل ہماری کیا کیفیت تھی اور آج کیا ہے لیکن جن لوگوں پر یہ واردات ہوتی ہیں وہ جان جاتے ہیں کہ یہ کیا کیفیت ہے اور یہ کہ اس سے ایسی محویت طاری ہوتی ہے کہ نہ ماضی کا شعور باقی رہتا ہے نہ

مستقبل کا بلکہ حق تعالی کے ساتھ منہمک ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ماضی و مستقبل کا تصور بھی ان کے لئے حجاب بن جاتا ہے اور حجاب کا وارد ہونا ان کے لئے بہت بڑی مصیبت ہے اور وقت کو مشائخ عظام بہت اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خراز رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے عزیز وقت کو عزیز ترین چیز کے سوا کسی اور چیز میں صرف نہ کر اور بندہ کیلئے عزیز ترین چیز کیا ہے حق تعالی کے ساتھ مشغولی ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ :

لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل

" مجھے حق تعالی کے ساتھ ایسا مقام حاصل ہے کہ نہ وہاں مقرب فرشتہ پہنچ سکتا ہے نہ نبی مرسل"۔

یعنی اس وقت اٹھارہ ہزار عالم بھی مجھے حق تعالی سے نہیں ہٹا سکتے یہی وجہ ہے کہ شب معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حق کے ساتھ وہ انہماک تھا کہ کسی اور طرف آپ کی نظر جاتی ہی نہیں تھی۔ چنانچہ حق تعالی نے اس کیفیت کو یوں بیان فرمایا ہے :

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی "نہ ان کی نظر دوسری طرف اٹھی نہ ہٹی"۔

اب چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لئے خداوند تعالی کی ذات عزیز ترین نعمت تھی۔ عزیز سوائے عزیز کے کسی طرف مشغول نہ ہوا۔

وقت کی اقسام

اب وقت (کیفیت) کی بھی دو اقسام ہیں اول فقد دوم وجد۔ یعنی فراق اور وصال۔ اور سالک ان دونوں حالتوں میں مغلوب الحال ہوتا ہے۔ کیونکہ وصل کی حالت میں وہ حق تعالی کے ساتھ منہمک اور محو ہوتا ہے اور فراق کی حالت میں درد و غم میں مستغرق ہوتا ہے اور دونوں حالتوں میں اس کا اختیار و اکتساب ختم ہو

جاتا ہے۔ اب چونکہ وہ بے اختیار ہوتا ہے اس لئے جو کچھ اس سے سرزد ہوتا ہے اس کے وقت (کیفیت) کا کرشمہ ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ صحرا میں ایک درویش کو کانٹے دار جھاڑی کے نیچے بیٹھا دیکھا جو سخت بے قراری کی حالت میں تھا اور ناہموار زمین پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اے برادر آپ کی اس زبوں حالی کی کیا وجہ ہے اس نے جواب دیا کہ مجھ پر ایک حال طاری تھا جو اس جگہ زائل ہو گیا۔ میں نے کہا آپ کب سے یہاں بیٹھے ہیں اس نے جواب دیا کہ بارہ سال سے اور یہ بھی کہا کہ اے شیخ میرے لئے دعا کریں کہ خداوند عالم مجھے اس حالت سے نجات دے۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں آگے چلا گیا اور حج کے وقت اس کے لئے دعا کی اور اس کی مصیبت دور ہو گئی۔ جب میں واپس آیا تو اس درویش کو وہاں بیٹھا پایا۔ میں نے کہا کہ اے درویش اب تو آفت دور ہو گئی ہے اب کیوں یہاں بیٹھا ہے اس نے کہا یا شیخ جب میں اپنا سرمایہ گم کئے ہوئے اس جگہ بیٹھا رہا تو اب جب کہ سرمایہ اسی جگہ پر واپس مل گیا ہے اس جگہ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں اب تو بیٹھا رہوں گا حتیٰ کہ میرے جسم کی خاک اس جگہ کی خاک میں مل جائے اور قیامت کے دن اسی خاک سے اٹھوں۔

شرح کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

کرا دماغ کہ از کوئے یار برخیزد
نشستہ ایم کہ ازما غبار برخیزد

"کس کی مجال ہے کہ کوئے دوست سے اٹھے۔ ہم بیٹھے رہیں گے حتیٰ کہ ہماری خاک کو باد صبا اڑا کر لے جائے"

ترجمہ وقت (باطنی واردات) وہ چیز ہے جو نہ کوشش سے حاصل ہو سکتی ہے

نہ بازار میں فروخت ہوتی ہے تاکہ عاشق جان دے کر اسے خرید سکے۔ اور نہ ہی انسان کو یہ طاقت ہے کہ اسے لا سکے یا رفع کر سکے اس لئے مشائخ نے فرمایا ہے کہ **الوقت سیف قاطع** "وقت کاٹنے والی تلوار ہے" کیونکہ تلوار کا کام کٹنا ہے اور وقت کا بھی یہی کام ہے انسان کو ماضی اور مستقبل سے علیحدہ یعنی بے خبر کر دیتا ہے اور آج یا کل کی فکر سے آزاد کرتا ہے اور تلوار بہت خطرناک چیز ہے **اما ھلک و اما ملک** "یا ہلاک کرتی ہے یا بادشاہی دیتی ہے" اگر کوئی شخص ہزار سال تک تلوار کو گردن میں لٹکائے رکھے تب بھی اس کو یہ تمیز نہیں ہوتی کہ مالک کی گردن پر چل رہی ہے یا دشمن کی گردن پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی صفت قہر ہے اس کو دوست رکھنے سے اس کا قہر دور نہیں ہوتا۔

شرح مطلب یہ کہ وقت سے مراد وہ حالت ہے جو دیرپا ہو اور حال سے مراد وہ حالت ہے جو اچانک وارد ہو۔

حال اور حال سے مراد وہ کیفیت ہے جو وقت پر طاری ہو جاتی ہے اور اس کو اس طرح مزین کرتی ہے جس طرح روح جسم کو آراستہ و پیراستہ کرتی ہے اس لحاظ سے وقت محتاج ہوتا ہے حال کا کیونکہ وقت کو حال سے زینت ملتی ہے اور اسی سے قائم رہتا ہے۔ لہٰذا جب صاحب وقت' صاحب حال بن جاتا ہے تو وہ تبدل و تغیر سے بالاتر ہو جاتا ہے اور وہ صاحب تمکین و استقلال بن جاتا ہے۔ وقت بغیر حال محل زوال میں ہوتا ہے (یعنی دیرپا نہیں ہوتا) اور جب وقت اور حال جمع ہو جاتے ہیں تو ساری زندگی وقت بن جاتی ہے اور زوال کا خطرہ رفع ہو جاتا ہے اور فیضان کی جو آمد و رفت ہوتی ہے وہ خفا اور ظہور کی وجہ سے ہوتی ہے جیسا کہ اس سے پہلے صاحب وقت پر نازل ہوتا ہے اور غفلت واقع ہوتی ہے اور حال نازل ہوتا ہے تو وقت متمکن ہوتا ہے اس لئے کہ صاحب وقت پر غفلت روا ہوتی ہے صاحب حال پر غفلت روا نہیں ہوتی۔ یعنی صاحب وقت کیلئے

غفلت ممکن ہے لیکن صاحب حال کیلئے ممکن نہیں۔ چنانچہ مشائخ نے فرمایا ہے کہ :

الحال سکوت اللسان فی فنون البیان "صاحب حال کی زبان بیان حال سے عاجز ہوتی ہے۔"

بلکہ اس کا راز اس کے حال سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ :

السوال عن الحال محال "حال الفاظ میں نہیں آسکتا" کیونکہ حال دراصل فنائے مقال ہے۔ استاذ ابوعلی دقاق رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "دنیا اور آخرت میں خوشی ہو یا غمی تیرا وقت وہی ہے جس کے اندر تو ہے لیکن یہ حال نہیں ہے۔ حال حق تعالیٰ کی طرف سے ایک فیضان ہے۔ جب وہ بندہ پر نازل ہوتا ہے تو خوشی و غمی سے متاثر نہیں ہوتا۔"

جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام صاحب وقت تھے۔ کیونکہ ایک وقت آپ کی آنکھیں غم سے سفید ہو جاتی تھیں اور ایک وقت وصال کی حالت میں بینا ہو جاتی تھیں۔ کبھی تو گریہ و زاری سے بال کی طرح کمزور ہو جاتے تھے اور کبھی خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحب حال تھے۔ نہ فراق میں آکر غمگین ہوتے تھے اور نہ وصل میں آکر مسرور ہوتے تھے۔ آفتاب' ماہتاب اور ستارے آپ کی مدد کرتے تھے اور رویت حق کی وجہ سے رویت ماہ و آفتاب سے فارغ تھے۔ جس چیز میں نگاہ کرتے حق دیکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ **لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ** "میں زوال پذیر اشیاء سے بیزار ہوں"۔ پس صاحب وقت کیلئے جہاں دوزخ بن جاتا ہے کیونکہ حالت فراق میں ہوتا ہے اور محبوب سے جدائی کی وجہ سے وہ وحشت زدہ ہوتا ہے اور کبھی اس کا دل مشاہدہ حق کی وجہ سے بہشت کی طرح شگفتہ ہوتا ہے لیکن صاحب حال خواہ وہ حالت

کشف میں ہے یا حجاب میں اس پر بلا نازل ہو یا نعمت ہر حال میں یکساں رہتا ہے چنانچہ حال صفت مراد (محبوب حق) ہے اور وقت درجہ مرید (محب حق) ہے صاحب وقت اپنے وقت میں مشغول اور صاحب حال حق کے ساتھ مشغول ہوتا ہے ان دونوں مقاموں میں بڑا فرق ہے۔ واللہ اعلم۔

شرح اس باب میں جو اصطلاحات بیان کی گئی ہیں وہ ہم معنی ہیں اور ان کے درمیان باریک فرق ہے۔ یہ حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ کے عرفان کا کمال ہے کہ فرق کی باریکیاں بیان کی ہیں۔ مرید اور مراد کا فرق پہلے بیان ہو چکا ہے۔ مرید اللہ کا طالب ہوتا ہے اور مراد اللہ کا مطلوب۔ چنانچہ وقت صفت مرید ہے اور حال صفت مراد۔ یہ فرق اس آیت قرآن پر مبنی ہے اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (شوریٰ) "اللہ جس کو چاہے اپنا بنا لیتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اس کو جو اس کا طالب ہو"۔

فصل

مقام اور تمکین اور دونوں میں فرق

نوٹ مقام اور تمکین بھی ہم معنی اصطلاحات ہیں جن کا فرق بیان کرنا معرفت کا کمال ہے۔ ایک بلند پایہ عارف ہی ہم معنی اصطلاحات کا باریک فرق جان سکتا ہے اور بیان کر سکتا ہے۔

مقام مقام سے مراد ہے طالب کا مطلوب کے حصول کیلئے پوری ہمت اور خلوص نیت سے جدوجہد کرنا۔ طالبان حق میں سے ہر ایک کیلئے ایک مقام ہے۔ جو ابتداء میں طلب حق کا سبب بنتا ہے اگرچہ طالب ہر مقام سے بے بہرہ ہوتا ہے

لیکن اس کا قرار ان مقامات میں سے صرف ایک مقام پر ہوتا ہے جو اس کی طبیعت اور جبلت (فطرت) کے مطابق ہو نہ کہ اس کے فعل یا عمل سے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ : وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ

" اور ہم میں سے ہر ایک کیلئے ایک مقام متعین ہوتا ہے۔"

پس حضرت آدم علیہ السلام کا مقام توبہ تھا' حضرت نوح علیہ السلام کا زہد' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تسلیم' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انابت' حضرت داؤد علیہ السلام کا حزن' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رجاء' حضرت یحییٰ علیہ السلام کا خوف اور ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر تھا۔ اگرچہ ان مقامات میں سے ہر ایک پیغمبر علیہ السلام کا حصہ تھا تاہم ان کا رجوع آخر میں اپنے مقام کی طرف ہوا۔ حال اور مقام کا فرق اس سے پہلے محاسیان کے باب میں کچھ ہو چکا ہے۔ یہاں مختصر طور پر اس کا اعادہ کیا جاتا ہے۔

حال اور مقام کے درمیان فرق

یاد رہے کہ حق تعالیٰ کی طرف تین قسم کے راستے ہیں' اول مقام' دوم حال' سوم تمکین۔ حق تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو اپنی طرف کا راستہ بتانے کیلئے بھیجا ہے تاکہ ان مقامات کی تفصیل بیان کریں کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں اور ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد پر ہر مقام کے آدمیوں کیلئے ایک حال ظاہر ہوا اور وہاں جا پہنچے جہاں پر کسب (کوشش) ان سے منقطع ہو گئی۔ حتیٰ کہ دین مکمل ہو گیا اور نعمت کی تکمیل ہوئی اور خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ :

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ .... " آج میں نے تمہارے لئے دین مکمل کر دیا اور نعمت کو غایت تک پہنچایا اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا۔"

اس وقت اہل تمکین کی تمکین ظاہر ہوئی اگر اس کی تفصیل بیان کروں تو کتاب کا مقصد (یعنی اختصار) فوت ہو جائے گا۔

شرح مطلب یہ کہ جہاں انبیاء علیہم السلام ماسبق کے زمانوں میں اولیاء کرام زیادہ تر مقام فنا تک پہنچے تھے امت مسلمہ کا خاصہ یہ ہے کہ نبی آخر الزمانؐ کے فیوض و برکات سے اولیائے امت محمدیہؐ کو مقام بقا باللہ نصیب ہوا جس کی بدولت غاروں اور جنگلوں میں دائمی زندگی کی بجائے دنیاوی امور میں حصہ لینے کی توفیق بھی حاصل ہوگئی کیونکہ مقام فنا میں سراسر استغراق و محویت ہے اور مقام بقا میں ہوشیاری ہے جس سے دنیاوی کام ممکن ہو سکتے ہیں۔

تمکین تمکین سے مراد **سالکین** کا درجہ کمال کو پہنچ جانا۔ اہل مقام کا اوپر کے مقامات طے کرنا ممکن ہے۔ لیکن اہل تمکین کا تمکین کے اوپر کوئی درجہ نہیں کیونکہ مقام مبتدیوں کا اور تمکین منتہیوں کا درجہ ہے۔ ابتداء سے انتہا تک جانا ممکن ہے۔ لیکن انتہا سے آگے جانا ممکن نہیں۔ کیونکہ مقامات تو راستے کی منازل کا نام ہے لیکن تمکین بارگاہ حق میں قرار پانے کا نام ہے۔ اولیاء اللہ اپنے آپ سے بیگانہ اور حق تعالیٰ کے ساتھ یگانہ اور اس کی بارگاہ معلی میں قرار پانے والے ہوتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی شاعر اپنے ممدوح کے پاس پہنچ جاتا تھا تو تلوار نکال کر اونٹ کے پاؤں کاٹ دیتا تھا اور تلوار توڑ ڈالتا تھا۔ اس وجہ سے کہ جب محبوب کی بارگاہ میں رسائی ہوگئی تو سواری کس کام کی اور تلوار اس لئے توڑتے تھے کہ محبوب تک پہنچے اور دشمنان کے مقابلے کے لئے تلوار ضروری تھی۔ جب محبوب تک رسائی ہوگئی تو تلوار کس کام کی۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہی فرمایا کہ :

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ وَ اَلْقِ عَصَاكَ (جوتا اتار دیں) اور (عصا پھینک دیں)۔

کیونکہ جوتا اور عصا دونوں سفر کی علامات ہیں۔ جب وصال ہوگیا تو سفر کی کیا

ضرورت۔ پس دوستی کی ابتداء طلب اور انتہا قرار ہے۔ جیسے پانی جب تک ندی نالے میں ہوتا ہے رواں دواں رہتا ہے جب سمندر میں داخل ہوتا ہے تو قرار پکڑ لیتا ہے۔ اس کے بعد جس شخص کو جواہرات کی طلب ہوتی ہے سمندر میں غوطے لگا کر جواہرات حاصل کرتا ہے یا اس تمنا میں جان کی بازی لگا کر ختم ہو جاتا ہے۔

تلوین مشائخ میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ : **التمکین رفع التلوین** (تمکین کیا ہے، تلوین کا خاتمہ ہونا ہے)۔ تلوین بھی مشائخ کی ایک اصطلاح ہے۔ جس طرح تلوین اور حال ہم معنی ہیں اسی طرح تمکین اور مقام بھی ہم معنی ہیں لیکن دونوں میں لطیف فرق ہے۔ تلوین کا مطلب ہے رنگ بدلنا یعنی (روحانی حالت کا تبدیل ہونا) اور ایک حال سے دوسرے حال میں جانا اور تمکین یا صاحب تمکین سے یہ مراد ہے کہ تغیر پذیر نہ ہو مکمل طور پر حق تعالیٰ کی بارگاہ میں قرار پکڑ لے اور غیر اللہ کو دل سے نکال دے تاکہ نہ کوئی چیز اس کو تبدیل کر سکے اور نہ کوئی حال اس کے باطن کو دگرگوں کر سکے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت حالت تلوین میں تھے جب کہ حق تعالیٰ نے کوہ طور پر تجلی فرمائی اور آپ مغلوب الحال ہو گئے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا (اور موسیٰ علیہ السلام تجلی ذات میں محو ہو گئے)۔

شرح بعض لوگ اس آیت کے یہ معنی کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ یہ پیغمبرؑ کی شان میں بے ادبی ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ آپؑ تجلیات حسن و جمال میں محو ہو گئے۔

ترجمہ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقام تمکین پر تھے کہ مکہ مکرمہ سے لے کر قاب قوسین تک تجلیوں کی کثرت کے باوجود بھی متغیر نہ ہوئے۔ یہ وہ درجہ اعلیٰ تھا جسے خدا بہتر جانتا ہے۔

اقسامِ تمکین

تمکین کی دو قسمیں ہیں اول وہ جس کا تعلق مشاہدۂ حق سے ہو' دوم وہ جس کا تعلق مشاہدۂ خود سے ہو۔ شاہد خود باقی الصفت ہوتا اور شاہد حق فانی الصفت۔

شرح یعنی اول الذکر فانی فی اللہ ہوتا ہے اور آخر الذکر باقی باللہ۔

ترجمہ فانی فی اللہ پر مقامات محو و صحو' حق و محق' فنا و بقا' وجود و عدم صادق نہیں آتے۔ جب موصوف مستغرق ہو تو صفات کہاں باقی رہے۔ یہ مضمون طویل ہے۔ اختصار کی خاطر بیان ختم کیا جاتا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

شرح قارئین کرام نے دیکھ لیا کہ جس طرح وقت و حال ہم معنی تھے۔ مقام و تمکین بھی ہم معنی ہیں۔ دونوں کے درمیان بہت باریک فرق ہے جو حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ جیسے بلند پایہ عارف ہی جان سکتے ہیں اور بیان فرمایا ہے۔

فصل

"محاضرہ و مکاشفہ"

اور دونوں کے درمیان فرق

نوٹ چونکہ یہ مضمون نہایت ہی ادق اور مشکل ہے۔ اصل فارسی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے تاکہ قارئین کرام حسب استعداد خود اس کے معانی سمجھ سکیں۔

متن فارسی بدانکہ محاضرۃ بر حضور دل افتد اندر لطایف بیان و مکاشفہ بر حضور تحیر سر افتد اندر خطیرۂ عیان پس محاضرہ اندر شواھد آیات باشد و مکاشفہ اندر شواھد مشاھدات و علامت محاضرہ دوام تفکر باشد اندر رویت آیت و علامت مکاشفہ دوام تحیر اندر کنہ عظمت فرق میان آنکہ اندر افعال متفکر شود و متفکر اندر میان آنکہ اندر جلال متحیر بود کہ ازین دو یکی رویف خلت بود و دیگر قرین محبت ندیدی کہ چون خلیل صلوات اللہ علی نبینا و علیہ اندر ملکوت آسمان ھا نگاہ کرد و اندر حقیقت وجود آن تامل و تفکر کرد دلش بدان کلمہ حاضر شد برویت فعل طالب فاعل گشت تا حضور وی فعل را نیز دلیل فاعل گردانید تا در کمال معرفت گفت اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا و حبیب را چون . بملکوت بردند چشم از رویت کل فرا کرد فعل ندید و خلق ندید و خود را ھم ندید تا بفاعل مکاشف شد پس اندر کشف شوق بر شوقش بیفزود و قلقش بر قلق زیادہ شد طلب رویت کرد رویت روی نبود رای قربت کرد قربت ممکن نشد و قصد وصلت کرد وصلت صورت نہ بست ھرچند

که بر دل حکم تنزیه دوست ظاهر تر شد شوق زیادت تر شد نه روی اعراض بود و نه امکان اقبال متحیر شد بس آنجا که خلت بود کفر نمود و اینجا که محبت بود وصلت شرک آمد و حیرت سرمایه شد ازانچه در خلت حیرة اندر هستی بود و آن شرک باشد و در محبت حیرت اندر چگونگی و این توحید باشد و ازین معنی بود که پیوسته شبلی رحمته الله علیه گفتی یا دلیل متحیرین زدنی تحیرا ازانچه زیادتی تحیر اندر مشاہدت زیادتی درجه باشد و اندرین معنی گویند و اندر حکایات مشهور است که چون ابو سعید خراز رحمته الله علیه با ابراہیم سعد علوی رحمهما الله بر لب دریا آن دوست خدای را بدیدند پرسیدند از وی که راه به حق چه چیزست گفت راه بحق دو است یکی راه عوام و دیگر راه خواص گفتند که این را شرح کن گفت راه عوام آنست که تو برانی که بعضی قبول کنی و بعضی رد کنی و راه خواص آنکه ایشان معلل علت بینند نه علت و حقیقت این حکایات بشرح گذشته است و مراد جز این نیست و بالله التوفیق۔

ترجمہ جاننا چاہئے کہ کیفیت محاضرہ کائنات میں حق تعالی کی قدرت کے کرشمے دیکھ کر پیدا ہوتی ہے اور مکاشفہ اس روحانی کیفیت کا نام ہے جو حق تعالی کے باطنی اسرار و رموز کے مشاہدہ سے طاری ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر کیفیت محاضرہ کا تعلق آیات یعنی قدرت کے ظاہری کرشموں سے ہے اور مکاشفہ کا تعلق باطنی مشاہدات سے ہے۔ یا یوں کہیں کہ محاضرہ کی علامت افعال الہی (قدرت کے کرشمے) ہیں اور مکاشفہ کی علامت کنہ ذات حق میں تحیر دوام ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ محاضرہ اس تفکر کا نام ہے جو افعال الہی یعنی کائنات کے کرشموں کے متعلق ہوتا ہے اور مکاشفہ اس تفکر کا نام ہے جو ذات حق میں مستغرق ہو جانے سے ہوتا ہے۔

شرح تفکر محاضرہ کو تصوف کی اصطلاح میں مراقبۂ فنا فی الصفات اللہ کہا

جا سکتا ہے جس کا اشارہ مندرجہ ذیل حدیث قدسی (بخاری) میں ہے :

" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ نوافل یعنی زائد عبادت کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اس سے اسقدر قریب ہو جاتا ہوں کہ میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے دیکھتا ہے۔ میں اس کے کان بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے سنتا ہے۔ اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے ہر کام کرتا ہے۔ میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے چلتا ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ میں اس کی زبان بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے بات کرتا ہے اور وہ جو کچھ طلب کرتا ہے میں عطا کرتا ہوں"۔

اور یہ جو ایک حدیث میں آیا ہے کہ **الحق ینطق علی لسان عمر** (عمر کی زبان پر حق بولتا ہے) یہ اسی قبیل سے ہے۔ نیز یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ **اتقوا فراسة المومن انه ینظر بنور اللّٰه** (مومن کی باطنی نگاہ سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) یہ بھی اسی فنا فی صفات اللہ کا کرشمہ ہے۔ نیز یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ۔

" میں پیچھے کی طرف بھی اسی طرح دیکھ سکتا ہوں جیسے آگے کی طرف "

یہ بھی محاضرہ یعنی مراقبہ فنا فی صفات اللہ کا نتیجہ ہے۔ محاضرہ یعنی مقام فنا فی الصفات اللہ کے اوپر مقام فنا فی ذات اللہ ہے جو " مکاشفہ " کہلاتا ہے۔

ترجمہ ان میں سے ایک یعنی محاضرہ " مقام خلت " کا ثمرہ ہے اور دوسرا یعنی مکاشفہ " مقام محبت " کا نتیجہ ہے۔

شرح "خلت" کا مطلب ہے دوستی، اور "محبت" سے مراد ہے پیار، یگانگت، انس۔ "دوست" کا مقام اور ہوتا ہے اور "محبوب" کا مقام اور ہے۔ آپ کے دوست ہزاروں ہو سکتے ہیں لیکن محبوب ایک ہوتا ہے۔

ترجمہ تم نے نہیں پڑھا کہ جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے کائنات میں قدرت کا تماشا دیکھا تو قادر کی طرف متوجہ ہوئے یعنی فعل کو دیکھ کر فاعل کا پتہ لگایا اور پکار اٹھے۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا (بے شک میں نے اپنے چہرے کو اس ذات کی طرف پھیر لیا جو کائنات کا پیدا کرنے والا ہے)۔

لیکن جب حبیب خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تو آپؐ نے ہر چیز سے آنکھیں بند کرلیں۔ نہ فعل کو دیکھا، نہ خلق کو، نہ خود کو بلکہ فاعل یعنی ذات حق میں مستغرق ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوق پر شوق اور بے چینی پر بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ رویت (دیدار) کی طلب کی تو رویت نہ ہوئی۔ قرب کے خواہش کی تو قرب نہ ملا۔ وصل کی تمنا کی تو وصل نصیب نہ ہوا۔ اور "مقام تنزیہہ" میں جسقدر پرواز فرمائی ذوق و شوق بڑھتا رہا اب اس مقام پر پہنچے کہ پس و پیش ناممکن تھا پس آپؐ پر حیرت طاری ہو گئی کیونکہ مقام خلت پر کفر نظر آتا ہے اور مقام محبوبیت پر شرک نظر آتا ہے۔ اس لئے حیرت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقام خلت پر کائنات کے کرشمے دیکھ کر حیرت طاری ہوتی ہے جو شرک کے مترادف ہے اور مقام محبوبیت پر ذات حق میں حیرت طاری ہوتی ہے جو توحید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شبلیؒ پکار اٹھے کہ: **یا دلیل متحیرین زدنی تحیرا**

(اے حیرت زدوں کے راہنما میری حیرت میں اضافہ کر)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مقام تحیر کی زیادتی سے درجے بلند ہوتے ہیں۔

شرح یہ جو اوپر کہا گیا ہے کہ رویت کی طلب کی تو رویت نہ ہوئی ' قرب کی خواہش کی تو قرب نہ ہوا۔ وصل کی خواہش کی تو وصل نہ ملا ' اس کے دو مطالب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ قریب سے قریب تر ہونے کی خواہش ہوئی ' اور قریب تر ہوئے تو چونکہ ذات حق کی کوئی حد نہیں اوپر قرب کی اور منزل نظر آئی جب وہاں پہنچے تو اوپر اور منزل نظر آئی 'جب وہاں رسائی ہوئی تو اوپر اور منزل نظر آئی غرضیکہ دل کی تمنا پوری نہ ہوئی اور ذوق و شوق اور بے چینی بڑھتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین کا قول ہے کہ " قلندر آنکہ فوق الوصل جوید (قلندر وہ ہے جو وصل سے بھی اوپر کے مقام کا طلب گار ہوتا ہے)۔ " رویت کی طلب کی تو رویت نہ ہوئی۔" اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج جسمانی تھا رویت ناممکن تھی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جسمانی معراج میں رویت باری تعالیٰ کیسے ناممکن ہے۔ اس کا جواب سننے اور سمجھنے کے لئے مقامات قرب جاننے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ کتاب ہذا کے مقدمہ میں ہم نے بیان کیا ہے کہ قرب کا پہلا درجہ فنا فی صفات اللہ ہے . بمصداق حدیث **بی یبصر و بی یسمع** دوسرا درجہ فنا فی ذات اللہ ہے' تیسرا درجہ فناء الفناء ہے اور چوتھا درجہ بقا باللہ ہے ۔جہاں پہلے تین مدارج پر سالک پر استغراق اور محویت غالب آجاتی ہے۔ مقام بقاباللہ کا مطلب یہ ہے کہ حتی الامکان قرب کی بلند ترین منازل طے کرکے سالک کو عروج سے نزول کا حکم ملتا ہے اور وہ اپنی خودی میں واپس آکر یعنی فنا فی اللہ کے استغراق سے نکل کر مقام صحو یعنی شعور میں آتا ہے اور فرائض زندگی ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر سالک مقام فنا پر مغلوب الحال ہوتا ہے اور مقام بقا پر آکر غالب الحال ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں پھر وہ مقام فنا سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ وہ بیک وقت

فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ یعنی وہ وصل یار کے مزے بھی لیتا ہے اور ہجرو فراق کی لذت بھی پاتا ہے۔ اس مقام کو حضرت شیخ سعدیؒ نے یوں بیان فرمایا ہے ؎

عجب ایں نیست کہ سرگشتہ بود طالب دوست
عجب این است کہ من واصل و مہجورم

(تعجب کی بات یہ نہیں کہ میں فراق میں سرگردان ہوں بلکہ تعجب کی بات یہ ہے کہ میں بیک وقت واصل بھی ہوں اور مہجور بھی)

اس مقام کو تصوف کی اصطلاح میں " جامعیت " کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس کو قرب حق میں بلند ترین مقام کہا جاتا ہے ۔ اس مقام کا خاصہ یہ ہے کہ سالک استغراق و محویت کی بجائے صحو اور ہوشیاری کی حالت میں مزید مقامات قرب طے کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت خواجہ غلام فریدؒ نے مقابیس المجالس میں فرمایا ہے کہ : شدہ عکس در عکس ایں بنا کہ فنا بقا ہے بقا فنا

یعنی میری حالت میں دو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ایک یہ کہ میری فنا ' بقا بن گئی ہے اور میری بقا ' فنا بن گئی ہے یعنی میں مقام بقا میں ہوتے ہوئے بھی اسی طرح قرب ذات میں ترقی کر رہا ہوں جیسے فنا کی حالت میں۔ اس مقام پر پہنچ کر سالک کے لئے قرب بھی بعد بن جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ اب میری حالت یہ ہے کہ میرے لئے قرب بھی بعد بن چکا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرب کی کسی منزل پر مجھے چین نہیں آتا اور مزید در مزید قرب کے لئے بے چین ہوں ۔ امید ہے اب قارئین کرام کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر شب معراج شوق پر شوق اور بے چینی پر بے چینی میں کیوں اضافہ ہوتا گیا ۔

اور رویت کی خواہش کی تو رویت حاصل نہ ہوئی یعنی خوب سے خوب تر کی تمنا پوری نہ ہوئی اور وصل کی خواہش کی تو وصل نہ ملا کیونکہ جب آپ کی امت کا ایک قلندر فوق الوصل کا متمنی ہوتا ہے تو قلندروں کے استاد ولیوں کے آقا اور نبیوں کے سردار کیونکر قرب کی کسی ایک منزل پر اکتفا کر سکتے تھے اور مزید در مزید مقامات قرب کے لئے کیسے بے چین نہ ہوتے۔

یہ جو اوپر ہم نے کہا ہے کہ جسمانی معراج میں رویت ناممکن ہے اس نکتہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ "شمائم امدادیہ" میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مولانا اشرف علی چشتیؒ نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے دریافت کیا کہ آیا رویت حق ممکن ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ ہاں ممکن ہے۔ مولانا اشرف علیؒ نے کہا کہ آیہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ میں تو اس کی نفی آئی ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ اس آیت میں ادراک کی نفی ہے رویت کی نفی نہیں ہے۔ اس پر مولانا اشرف علیؒ نے کہا کہ حضور یہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رویت باری تعالیٰ کی تمنا کی لیکن ان کو جواب ملا کہ لَنْ تَرٰىنِيْ (تم نہیں دیکھ سکتے) کیا اس آیت میں رویت کی نفی نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ نفی موسیٰ علیہ السلام کے لئے تھی کیونکہ جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے وجود میں تھے یعنی حالت بقا باللہ میں تھے رویت ناممکن تھی کیونکہ رویت یا مشاہدہ مقام فنا میں ہوتا ہے مقام بقا یعنی دوئی اور جسد بشری کے ساتھ رویت ناممکن ہے اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ جسمانی آنکھوں سے دیکھنے کی تمنا ہے تو پہاڑ پر میں اپنی ایک تجلی پھینکتا ہوں دیکھیں تم اس کو برداشت کر سکتے ہو یا نہیں۔ جب تجلی پھینکی گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام برداشت نہ کر سکے اور محو اور مدہوش ہو کر رہ گئے اب چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج جسمانی تھا اور آپ بقا باللہ کی حالت میں مراتب قرب طے کر رہے تھے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپؐ

بھی رویت کی تمنا میں بے چین تھے لیکن جسد بشری کے ساتھ چونکہ رویت محال ہے اس لئے آپ کے شوق اور بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔

اور یہ جو حضرت سید علی ہجویری علیہ رحمہ نے اوپر فرمایا ہے کہ :

"بس آنجاکہ خلت بود کفر نمود وا۔نجاکہ محبت بود وصلت شرک آمد"

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام چونکہ خلت تھا انہوں نے مخلوق کو دیکھ کر خالق کو پہچانا اور یہ کفر اس لئے نظر آیا کہ منطقی استدلال کے ذریعے مخلوق کو دیکھ کر جو محض خالق کی ہستی کو مانتا ہے تو یہ کفر ہے اس لئے کہ وہ خالق یا خدا اس کے اپنے دماغ کی اختراع ہوگا اور محدود دماغ کی جو چیز پیداوار ہو گی وہ بت ہی ہوگا۔ حق تعالیٰ وہ ہے جس کی خبر حق تعالیٰ نے خود وحی کے ذریعے دی ہے۔ ایک دفعہ ہمارے ایک پیر بھائی نے جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے ہمارے حضرت شیخ مولانا سید محمد ذوقی علیہ رحمہ سے پوچھا کہ کیا نبی علیہ السلام پر ایمان لائے بغیر بھی اگر کوئی محض خدا تعالیٰ کی ہستی میں یقین کرے تو کافی ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ وحی کے بغیر حق تعالیٰ کو کیسے جانے گا۔ اس نے کہا اپنی عقل کے ذریعے جان سکتا ہے۔ اس پر حضرت شیخ نے فرمایا کہ پھر تو وہ خدا اس کے محدود دماغ کی پیداوار ہوگا جو خدا نہیں ہوگا ایک بت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سید علی ہجویری قدس سرہ نے فرمایا کہ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خلق کے ذریعے خالق کو پہچانا اس لئے یہ کفر کی سی صورت پیدا ہونے لگی۔ چنانچہ قرآن کی ایک آیت میں آیا ہے کہ چاند' تاروں اور سورج کو دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ ھٰذَا رَبِّیْ (یہ میرا رب ہے) اور جب سورج غروب ہوا تو پھر فرمایا کہ غروب ہونے والا میرا رب نہیں ہو سکتا۔ اور یہ جو حضرت سید علی ہجویری قدس سرہٗ نے کشف المحجوب میں ایک موقعہ پر فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب سورج اور چاند کو اپنا رب کہا وہ اس لئے کہا کہ نبی ہونے کی

حیثیت سے آپ وحدت الوجود کے قائل تھے لہٰذا ہر چیز میں ان کو خدا نظر آیا۔ لیکن وحدت الوجود میں بھی جزو کو کل کا درجہ دینا جائز نہیں ہے جو انکو کفر نظر آیا اس لئے انہوں نے اس کے فوراً بعد فرمایا کہ سورج اور چاند چونکہ آفلین یعنی زوال پذیر ہیں اس لئے خدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ابو سعید خرازؒ کو جس بزرگ نے کہا کہ تمہارا راستہ علت معلول ہے ان کا مطلب یہی تھا کہ منطقی استدلال سے ذات حق کا قائل ہونا بھی شرک ہے اب رہی یہ بات کہ حضرت مخدوم سید علی ہجویریؒ نے اوپر فرمایا ہے کہ :

" و آنجا کہ خلت بود کفر نمود و اینجا محبت بود وصلت شرک آمد و حیرت سرمایہ شد ازاں چہ در خلت حیرت اندر ہستی بود آں شرک باشد ' و در محبت حیرت اندر چگونگی و این توحید باشد "۔

یہ تو ہم نے اوپر دیکھ لیا کہ مقام خلت میں مخلوق کے ذریعے خالق کو ماننا کیسے کفر کے مترادف ہے اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ مقام محبت یعنی مقام محبوبیت میں جو ہمارے نبی علیہ الصلواۃ والسلام کا مقام تھا وصل کیسے شرک ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھ لیا ہے کہ شب معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ جسم کے ساتھ قرب حق میں سفر کر رہے تھے اس لئے دوئی موجود تھی۔ یعنی ایک طالب ' دوسرا مطلوب۔ اور دوئی کا ہونا شرک کہلاتا ہے جیسا کہ حضرت مصنف علیہ الرحمہ نے بار بار کشف المحجوب میں فرمایا ہے کہ کائنات کا وجود ثابت کرنا شرک ہے کیونکہ وحدت الوجود میں غیر اللہ یا دوئی کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہر چیز وجود حق میں شامل ہے۔ چنانچہ حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کو بارگاہ رب العزت کی طرف سے کچھ الہامات ہوئے۔ ان میں سے ایک الہام یہ ہے :

من ارد العبادۃ بعد الوصل کفر (جس نے وصل کے بعد عبادت کی کافر ہوا)

اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ وحدت الوجود حقیقت ہے جب انسان ذات حق میں فنا ہو جاتا ہے یعنی مقام فنا فی اللہ پر پہنچ جاتا ہے تو کس کی عبادت کرے۔ لہٰذا جب وہ عبادت کرتا ہے تو وہ وحدت الوجود سے منحرف ہو کر عبادت کرتا ہے اس انحراف کو کفر کا نام دیا گیا ہے۔ کفر کے لفظی معنی بھی چھپانے کے ہیں مطلب یہ کہ چونکہ وحدت الوجود حقیقت ہے جب بھی سالک مقام فنا (وحدت الوجود) سے واپس آکر اپنی مفروضہ دوئی میں آتا ہے اور عبادت کرتا ہے تو اس کا عبادت کرنا گویا حق بات کو چھپانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اور حق بات کا چھپانا کفر ہے۔ اس کفر کو کفر حقیقی کہا جاتا ہے۔ عبادت عالم مجاز میں فرض ہے عالم حقیقت میں یکتائی اور وحدت ہے جہاں دوئی کا وجود مشکل ہے اور من و تو کا سوال مٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے لئے آخری مقام فنا فی اللہ نہیں تھا جہاں عبادت مشکل ہو جاتی ہے بلکہ آخری مقام بقاباللہ تھا جہاں عبادت آسان ہے۔ اس لئے تمام عارفین لازماً" فنا ترک کر کے بقا میں آتے ہیں اور حق عبودیت ادا کرتے ہیں۔ امت میں چند ایک فنا میں اٹک گئے اور مجذوب ہو کر عبادت سے محروم رہے۔

استدلال اور وحی میں فرق

ایک دفعہ کینیڈا کی ایک یونیورسٹی میں اس موضوع پر بحث ہوئی کہ آیا وحی (Revelation) کو صحیح مانا جائے یا عقل (Reason) کو۔ بالفاظ دیگر آیا بیت المقدس سے راہنمائی حاصل کی جائے یا یونان سے۔ ہم نے اس کے جواب میں ایک مضمون لکھا جس میں ان لوگوں سے سوال کیا گیا کہ چونکہ ہر شخص کے عقل کا معیار جداگانہ ہے کس کے عقل سے راہنمائی حاصل کی جائے۔ اگر وہ یہ جواب دیں کہ سب سے زیادہ عاقل یونان کے فلاسفر تھے اس

لئے ان کے عقل کو راہنما قرار دیا جا سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یونان کے فلاسفروں کے درمیان بھی اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً ارسطو کو اپنے استاد افلاطون سے چند باتوں میں اختلاف تھا اس لئے وہ لکھتے ہیں کہ :

Plato is dear but Truth is dearer

(افلاطون ہمارا محبوب ہے لیکن مجھے حقیقت اس سے زیادہ محبوب ہے)

بات آکر اسی جگہ ختم ہوتی ہے کہ محدود عقل سے جو خدا تسلیم کیا جائے گا وہ آپ کے عقل کا تراشا ہوا بت ہو گا نہ کہ حقیقی خدا۔ حقیقی خدا وہی ہے جس کی خبر اور کیفیت ہمیں خود خداوند تعالیٰ نے وحی کے ذریعے بتائی ہے۔ عقل کے ذریعے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ضرور ہے۔ لیکن عقل یہ جاننے سے عاجز ہے کہ خدا تعالیٰ کی ماہیت کیا ہے۔ خدا تعالیٰ کی ماہیت اور معرفت جسمانی عقل سے نہیں انسان کی روحانیت سے کسی قدر معلوم کی جاسکتی ہے۔ یعنی جب عقل کو وحی کے تابع کیا جائے۔ عقل کی بے بسی اور بے چارگی کے متعلق حضرت مولانائے روم علیہ رحمہ فرماتے ہیں ۔

زیرکی بفروش و حیرانی بخر
زیرکی ظن است و حیرانی نظر

(عقل کو فروخت کر دے اور حیرانی (حیرت) خرید لے۔ کیونکہ عقلندی شک ہے اور حیرانی نظر۔)

نیز فرمایا ۔

گر بہ استدلال کارِ دین بدے
فخر رازی راز دارِ دین بدے

(اگر منطق استدلال دین میں کام آتا تو فخرالدین رازی (جو بڑے فلسفی تھے) دین کے راز دار ہوتے۔)

علامہ اقبالؒ عقل کی بے بسی کو یوں بیان فرماتے ہیں ۔

بے دھڑک کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل محو تماشا ہے لب بام ابھی

مقام حیرت مقام حیرت کے متعلق امام غزالیؒ "کیمیائے سعادت" میں فرماتے ہیں کہ عارفین کا آخری مقام حیرت ہے یعنی ذات و صفات حق تعالیٰ میں حیران و ششدر رہ جانا۔

روایت ہے کہ جب ابن منصور حلاجؒ کعبۃ اللہ پہنچے تو آپ پر حیرت طاری ہوگئی اور آنکھیں کھول کر کعبہ پر اسقدر نظر جمائی کہ ایک سال تک وہاں کھڑے رہے حتیٰ کہ آپ کے جسم کی چربی پگھل کر بہنے لگی اور پرندے آکر آپ کے سر پر بیٹھ جاتے تھے۔

اولیائے اسلام نے مقام حیرت کو اشعار کی زبان میں بڑھ چڑھ کر بیان کیا ہے۔

حضرت نیاز بریلویؒ فرماتے ہیں ۔

مست گشتم از دو چشم ساقی بادہ فروش
الوداع اے ننگ و ہستی الفراق اے عقل و ہوش

(ساقی کی مست نگاہوں نے مجھے مست کر دیا اور میں نے اپنی ننگ و ہستی اور عقل و ہوش کو الوداع کہہ دیا۔)

ایک صاحب فرماتے ہیں ۔

ساکنان کوئے تو نباشند بہوش
کیں زمینیکہ ازو ہمہ مجنون خیزد

(اے دوست تیرے کوچے میں بسنے والے لوگ کبھی ہوش میں نہیں ہوتے کیونکہ یہ وہ زمین ہے جہاں مجنوں ہی مجنوں پیدا ہوتے ہیں۔)

حضرت فخرالدین عراقیؒ فرماتے ہیں۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
زچشم مست ساقی وام کردند

(پہلی شراب جو پیمانہ کے اندر آئی کہاں سے آئی، میرے ساقی کی چشم مست سے آئی۔)

حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

بادہ از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما ہست شد نے ما ازو

(شراب کے اندر مستی ہم سے آئی نہ کہ شراب سے ہم کو۔ اور یہ جسم ہم سے زندہ ہوا نہ کہ ہم اس سے)

خواجہ حافظؒ فرماتے ہیں۔

منم کہ گوشۂ میخانہ خانقاہ منست
دعائے پیر مغاں وردِ صبح گاہ منست

(میں ہوں کہ میخانہ کے کونے میں مست پڑا ہوں اور اپنے ساقی کے آگے جو صبح شام التجا کرتا ہوں وہی میری نماز ہے۔)

نیز فرمایا۔

ایں خرقہ کہ من دارم در رہنِ شراب اولی
ویں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولی

(یہ جو میرا پارسائی کا جبہ ہے اسے شراب خانہ میں گروی رکھا جائے تو

اچھا ہے اور یہ بے مقصد کتب خانہ اگر شراب کے لئے رہن رکھا جائے تو بہتر ہے۔)

مولانا جامیؒ فرماتے ہیں ۔

من خرقہ گرو کردم عریانِ خراباتم
خوردم ہمہ رخت خود مہمانِ خراباتم

(میں نے جبہ پارسائی شراب خانہ میں گرو کر دیا ۔ اب سارا سامان کھا کر شراب خانہ کا مہمان ہوں ۔)

نیز فرمایا ۔

ایں قدر مستم کہ از چشم شراب آید بروں
وز دلِ پرحسرتم بوئے کباب آید بروں

حضرت بو علی قلندرؒ فرماتے ہیں ۔

منم محو جمال اونمے دانم کجا رفتم
شدم غرق وصال اونمے دانم کجا رفتم

مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

دلم کز بادۂ جبار شد مست
تنم از صحبتِ دلدار شد مست

بہ میخانہ گذر کردم چو دیدم
خطیب و قاضی و خمار شد مست

ازیں مے جرعہ پاکاں چشیدند
جنیدؒ و شبلیؒ و عطارؒ شد مست

بروحِ پاکِ شمس الدینؒ تبریز
کہ ملا بر سرِ بازار شد مست

حضرت احدیؒ فرماتے ہیں ۔

دوش در میخانہ دیدم یار و ہم اغیار مست
بادہ و ہم جام مست و ساقی و خمّار مست

مسجد و محراب مست و کعبہ و بتخانہ مست
مومن و تسبیح مست و کافر و زنار مست

حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ۔

خوش بدیدم صوفیاں را صحبتِ خمار مست
عاشقاں باصدق ماندہ وعدۂ دیدار مست

مست عاشق مست معشوق ہم بہ اندر رازِ خود
پیر مست و میر مست و شیخ در اسرار مست

محتسب را مست دیدم درمیان میکدہ
صحن مست و خلق مست و جملگی بازار مست

یہ سب " مقام حیرت " کی کارستانیاں ہیں جو عروج بشری کا آخری مقام ہے۔ اور شب معراج جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حیرت طاری تھی اسی کے ورثہ میں اولیائے امت کو ملی ہیں۔ لیکن شریعت اسلامیہ کا تقاضا یہ ہے کہ سالک راہِ حقیقت ان سرمستیوں پر غالب آکر مقام بقاباللہ پر متمکن ہو جائے۔ فرائض زندگی ادا کرے۔ عبادت میں مشغول ہو جائے عبدیت کا حق ادا کرے اور خلق خدا کی ہدایت کا منصب پورا کرے۔ یاد رہے کہ جہاں مقام فنا میں دائمی مستی و محویت تھی۔ مقام بقا پر دائمی سوز و گداز ' درد و داغ اور ہجر و فراق کی آگ بھی

جلنا نصیبِ عاشقاں ہے۔

جیسا کہ مرزا بیدلؒ فرماتے ہیں ۔

ہمہ عمر باتو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمارِ ما
چہ قیامتے کہ نے رسی ز کنارِ ما بکنارِ ما

(اے محبوب ہم نے ساری عمر تیرے وصل کے پیالے نوش کئے لیکن یہ کیا قیامت اور ستم ظریفی ہے کہ تو میری آغوش سے میری آغوش میں نہیں آتا ۔)

یہ خوب سے خوب تر اور قریب سے قریب تر کی تلاش ہے جو تاقیامت بلکہ بعد قیامت ابدالآباد تک عشاق کے دل کو چیرتی رہے گی۔

اور شب معراج یہی قریب سے قریب تر کی تمنا تھی۔ جو بقول مصنفؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے چین اور بے قرار کر رہی تھی۔ یہی بیقراری تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساری رات عبادت میں گزار دیتے تھے اور پاؤں مبارک پر ورم آجاتا تھا۔ اور یہی وہ بیقراری ہے جو اولیائے امت کو بحالت بقاباللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ورثہ میں ملی ہے اور سب اولیائے کرام یہ دعا کرتے آئے ہیں ۔

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا !

واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

قبض اور بسط

یاد رہے کہ قبض اور بسط سالکین کے احوال میں سے دو حال ہیں جو ان پر بے اختیار مسلط ہوجاتے ہیں۔ نہ کوشش سے آتے ہیں نہ کوشش سے جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ (اللہ بند کرتا ہے اور کھولتا ہے) قبض سے مراد ہے روحانی طور پر قلب پر حجاب کا طاری ہونا۔ اور بسط کا مطلب ہے قلب سے حجاب رفع ہونا اور یہ دونوں حال من جانب اللہ ہوتے ہیں اس میں انسان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جب یہ تنگی کی حالت ابتدائی دور میں واقع ہوتی ہے تو اسے خوف کہا جاتا ہے اور جب مشائخ پر یہ حالت طاری ہوتی ہے تو اسے قبض کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ابتدائی دور میں کشادگی کی حالت کو (رجا) اور مشائخ کے حق میں اسے بسط کہا جاتا ہے بعض مشائخ کے نزدیک قبض افضل ہے بسط سے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ قرآن حکیم میں قبض کا ذکر پہلے آیا ہے۔ دوم یہ کہ قبض میں نفس پر تشدد اور قہر کیا جاتا ہے اور بسط میں لطف و کرم ہے۔ ظاہر ہے کہ نفس کے لئے تشدد و قہر' لطف و کرم سے زیادہ بہتر ہے کیونکہ لطف و کرم بہت بڑا حجاب بن جاتا ہے۔

لیکن بعض مشائخ کے نزدیک بسط افضل ہے قبض سے۔ ان کے نزدیک کلام پاک میں قبض کا ذکر پہلے ہونا اور بسط کا بعد میں ہونا اس بات کی علامت ہے کہ بسط افضل ہے قبض سے۔ کیونکہ عرب کے محاورہ میں جو چیز افضل ہوتی ہے اس کا ذکر مؤخر کرتے ہیں۔ جیساکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ (بعض اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں اور بعض میانہ روی اختیار کرتے ہیں)۔ نیز فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (اللہ دوست رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور پاک لوگوں کو)۔ نیز فرمایا۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (اے مریم اپنے رب کی فرمانبردار ہوجا اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر)۔ دوسری بات یہ ہے کہ بسط میں خوشی ہوتی ہے اور قبض میں دکھ ہوتا ہے اور عارفین کی خوشی وصل میں ہے اور غمی فراق میں ہے۔ چنانچہ وصل افضل ہے فراق سے۔

لیکن میرے شیخ علیہ رحمہ فرماتے ہیں کہ قبض اور بسط دونوں کا مطلب ایک ہے کیونکہ دونوں حال خداوند تعالیٰ کی طرف سے وارد ہوتے ہیں اور دونوں حالتوں میں یا تو قلب مسرور ہوتا ہے اور نفس مقہور یا قلب مقہور اور نفس مسرور ہوتا ہے۔ پہلی حالت میں قلب حالت بسط میں ہوتا ہے اور نفس حالت قبض میں اور دوسری حالت میں قلب حالت قبض میں ہوتا ہے اور نفس حالت بسط میں اور جو شخص اس کے برعکس استدلال کرتا ہے اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

قبض القلوب فی بسط النفوس و بسط القلوب فی قبض النفوس

(قلوب کی قبض نفوس کی بسط ہے اور قلوب کی بسط نفوس کی قبض ہے)۔ چنانچہ نفس کی قبض سے نفس خلل سے محفوظ ہوتا ہے اور قلب کی بسط سے قلب لغزش سے محفوظ ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ دوستی میں غیرت ضرور ہوتی ہے

اور قبض حق تعالیٰ کی غیرت کی وجہ سے طاری ہوتی ہے نیز دوستی میں چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی ہے اور بسط چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔

روایت ہے حضرت یحیٰی علیہ السلام جب تک رہے روتے رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تک رہے ہنستے رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یحیٰی علیہ السلام پر حالت قبض طاری تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حالت بسط۔ جب ایک دوسرے سے ملے تو حضرت یحیٰی علیہ السلام نے کہا کہ اے عیسیٰ کیا آپ جدائی کے خوف سے مامون تھے۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے یحیٰی کیا آپ حق تعالیٰ کی رحمت سے نا امید تھے۔ نہ میرا ہنسنا قضا کو ٹال سکتا ہے نہ آپ کا رونا۔

پس خواہ قبض ہے یا بسط ممس ہے یا انس، محو ہے یا صحو، علم ہے یا جہل سب حال من جانب اللہ ہیں۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقرر ہوچکا ہے وہی ہوتا ہے۔

فصل

انس و ہیبت

جاننا چاہئے اللہ تجھے سعادت نصیب کرے کہ ہیبت اور انس تصوف کی اصطلاحات میں سے ہیں جب حق تعالیٰ کسی کے دل پر صفت جلال سے تجلی

فرماتے ہیں تو اس پر ہیبت طاری ہوتی ہے اور جب صفت جمال سے تجلی فرماتے ہیں تو قلب پر انس کی حالت طاری ہو جاتی ہے چنانچہ اہل ہیبت تجلی جلال سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔ اور اہل انس تجلی جمال سے خوش ہوتے ہیں۔ بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ ہیبت عارفین کا مقام ہے اور انس مریدین (مبتدی) کا کیونکہ مقام قرب میں ہیبت زیادہ ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ انس ہم جنس کے ساتھ ہوتا ہے اب چونکہ بندہ حق تعالی کا ہم جنس اور ہم شکل نہیں ہے حق تعالی کے ساتھ انس نہیں ہو سکتا اور نہ حق تعالی کی طرف سے مخلوق کے لئے انس ہو سکتا ہے۔

شرح یہاں لفظ انس سے مراد محبت نہیں بلکہ یگانگت اور لاحجابی ہے جسے انگریزی زبان میں INTIMACY کہا جاتا ہے لیکن حق تعالی کے ساتھ محبت ممکن ہے اور حقیقت بھی ہے قرآن و حدیث میں جابجا اللہ تعالی کی محبت اور دوستی کا ذکر آیا ہے۔ انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا۔ اگرچہ جسم ذات حق کا ہم جنس نہیں ہے۔ روح تو ہے جیسا کہ حق تعالی نے خود قرآن میں فرمایا ہے کہ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (ہم نے انسان کے اندر اپنی روح میں سے پھونکا)۔ اس لئے حق تعالی کے ساتھ محبت ممکن ہے۔ اور ہر انسان کا دل خود گواہی دے رہا ہے کہ محبت ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ مومنین وہ ہیں جو شدت کے ساتھ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

ترجمہ اگر انس ممکن ہے تو وہ ذکر کہلائے گا۔ نیز ہیبت مشاہدۂ عظمت کی پیداوار ہے اور عظمت صفت حق تعالی ہے اور بہت فرق ہے ان دو آدمیوں کے درمیان جن میں سے ایک ہر کام اپنی ذات سے منسوب کرتا ہے اور دوسرا خودی کو فنا کر کے باقی باللہ ہو چکا ہے۔ حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں کہ :

" میں سمجھتا رہا کہ میں انس اور محبت حق میں سرشار ہوں لیکن اب

معلوم ہوا کہ انس ہم جنس سے ہوتا ہے غیر جنس سے نہیں ہوتا"۔ بعض مشائخ کا خیال ہے کہ ہیبت فراق اور عقوبت کا نتیجہ ہے اور انس وصل و رحمت کا۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ ہیبت کی باتوں سے پرہیز کریں اور انس کے ساتھ پیوستہ رہیں کیونکہ انس محبت کا تقاضا ہے۔

میرے شیخ علیہ رحمہ فرماتے ہیں کہ :

" مجھے یہ سن کر تعجب ہوتا ہے کہ انس حق تعالیٰ کے ساتھ ممکن نہیں اس لئے کہ حق تعالیٰ نے جا بجا فرمایا ہے۔ اِنَّ عِبَادِیْ ' قُلْ لِعِبَادِیَ ' وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ ' یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ لامحالہ جب بندہ اس مقام پر حق تعالیٰ کے فضل و کرم کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے اور جب محبت کرتا ہے تو انس پیدا ہوتا ہے کیونکہ ہیبت بے گانگی' اور انس یگانگی ہے اور یہ انسان کی صفت ہے کہ احسان کرنے والے سے انس کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ سے انسان کو اس قدر نعمتیں حاصل ہیں جن میں معرفت حق بھی شامل ہے تو ناممکن ہے کہ ہم ہیبت کی بات کریں۔

میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ دونوں گروہ اختلاف کی وجہ سے مصیبت میں ہیں اصل بات یہ ہے کہ ہیبت کا غلبہ نفس اور خواہشات نفس کو مٹاتا ہے اور انس کا غلبہ باطن میں معرفت کی پرورش کرتا ہے۔ پس حق تعالیٰ اپنے جلال کی تجلیات سے دوستوں کے نفوس کو فانی کرتا ہے اور اپنے جمال کی تجلیات سے ان کے باطن کو باقی کرتا ہے پس جو لوگ مقام فنا فی اللہ میں ہوتے ہیں تو انہوں نے ہیبت کو افضل قرار دیا ہے اور جو مقام بقا باللہ پر ہوتے ہیں وہ انس کو افضل قرار دیتے ہیں اور اس سے پہلے فنا و بقا کی تشریح ہو چکی ہے۔

شرح حضرت مصنف کے اس قول سے پتہ چلتا ہے کہ آپ میدان حقیقت د

معرفت کے کتنے بڑے شہسوار تھے کہ مشائخ واصلین و مقربین کی رہنمائی فرما رہے ہیں۔ اس لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ نے سچ فرمایا ہے کہ :

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

فصل

قہرو لطف

تصوف کی اصطلاحات میں سے قہر و لطف دو اصطلاحات ہیں۔ قہر سے ان کی مراد ہے حق تعالیٰ کی تائید سے خواہشات نفس کو فنا کرنا ہے کیونکہ ان کے مقصد کا حصول اس سے ہے اور لطف سے ان کی مراد ہے تائید حق سے دائمی مشاہدۂ حق کا قائم رکھنا اور اس حال میں استقامت حاصل کرنا ہے۔ یہاں تک کہ بعض مشائخ کے نزدیک اسی مراد کا حصول کرامت ہے۔ یہ اہل لطف کہلاتے ہیں اور بعض کے نزدیک کرامت یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندہ کو اپنی مرضی پر چلائے اور بندہ کی مراد پوری نہ ہونے دے۔ اور نامرادی سے اس کو مقہور کرے۔ یہاں تک کہ اگر پیاس بجھانے کی خاطر دریا کی طرف جائے تو دریا بھی خشک ہو جائے۔

کہتے ہیں کہ بغداد میں دو درویش رہتے تھے جو بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے۔ ان میں سے ایک صاحب قہر تھے دوسرے صاحب لطف۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ بحث کرتے تھے اور اپنے مسلک کو بہتر سمجھتے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا لطف سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے

کہ۔ اَللّٰہُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِہٖ (اللہ اپنے بندوں پر لطف و کرم کرتا ہے)۔ دوسرا کہتا تھا کہ قہر حق تعالٰی کی نعمتوں میں سے بہترین نعمت ہے کیونکہ حق تعالٰی نے فرمایا ہے کہ۔ وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ (اللہ تعالٰی اپنے بندوں پر قاہر ہے)۔ اس مسئلہ پر ان کے درمیان کافی بحث مباحثہ تھا حتیٰ کہ صاحب لطف نے مکہ مکرمہ کا سفر اختیار کیا۔ لیکن صحرا میں اس قدر گم رہا کہ عرصہ دراز تک اس کی کوئی خبر نہ ملی ایک آدمی نے جو مکہ سے بغداد جارہا تھا اسے صحرا کے اندر دیکھا۔ اس بزرگ نے بغداد جانے والے مسافر سے کہا کہ بھائی جب تم بغداد پہنچو تو میرے فلاں دوست سے کہنا کہ اے دوست اگر تو صحرا کو بغداد کی طرح خوش و خرم دیکھنا چاہے تو تم یہاں آجاؤ اور دیکھو کہ حق تعالٰی نے صحرا کو میرے لئے کس قدر باغ و بہار بنا دیا ہے۔ اس دوست نے کہا اگر تم واپس جاؤ تو میرے دوست سے کہنا کہ یہ کوئی شرف کی بات نہیں کہ صحرا کو حق تعالٰی تیرے لئے بغداد کی طرح خوش و خرم بنا دے کیونکہ حق تعالٰی نے اس لئے تمہارے حق میں ایسا کیا ہے تاکہ تو اس کے دربار سے نہ بھاگ جائے بلکہ شرف یہ ہے کہ حق تعالٰی نے بغداد کو اس کی رونق اور شادمانی کے باوجود ہمارے حق میں صحرا کی طرح پر مشقت بنا دیا ہے اور ہم اس کے اندر خوش و خرم ہیں۔

شرح اس حکایت کا مطلب یہ ہے کہ بعض سالکین قہر کو پسند کرتے ہیں اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں اور بعض اللہ تعالٰی کے لطف کو پسند کرتے ہیں اور اس سے خوش ہوتے ہیں لیکن بہترین روش یہ ہے کہ انسان اپنے اختیار کو ترک کردے اور سب کچھ اللہ تعالٰی کی مرضی پر چھوڑ دے۔ اگر وہ اسے قہر کی حالت میں رکھتا ہے تو بھی خوش رہے اور اگر لطف و کرم سے نوازے تو بھی خوش رہے۔

ترجمہ حضرت شیخ ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ بارگاہ حق میں یوں مناجات کرتے

تھے۔

"بارِ خدایا اگر تو آسمان کو میری گردن کا طوق اور زمین کو میرے پاؤں کی بیڑی بنادے اور سارے جہان کو میرے خون کا پیاسا بنادے تب بھی میں تجھ سے نہیں پھروں گا"۔

میرے شیخ علیہ رحمہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک صحرا میں اولیاء اللہ کا اجتماع ہوا اور میرے مرشد حضرت حصریؒ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ بعض اولیاء کو میں نے دیکھا کہ تخت پر سوار ہو کر آرہے ہیں اور بعض ہوا میں اڑتے آرہے ہیں لیکن میرے مرشد حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ نے کسی کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ جب انہوں نے ایک ایسے جوان کو دیکھا جو ٹوٹی ہوئی جوتی پہنے اور ٹوٹی ہوئی لاٹھی ہاتھ میں لئے ہوئے آرہا ہے وہ سر سے ننگا تھا جسم جلا ہوا تھا اور بدن لاغر تھا۔ اس کو دیکھتے ہی حضرت حصری اٹھے اس کا استقبال کیا اور اونچی جگہ پر بٹھایا۔ یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا اور جب مجلس ختم ہوئی تو اس کے بارے میں حضرت شیخ سے میں نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ ایسا ولی ہے کہ وہ ولایت کے تابع نہیں بلکہ ولایت اس کے تابع ہے۔ وہ کرامات کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتا۔ غرضیکہ ہم جو کچھ اپنے لئے اختیار کرتے ہیں وہ ہمارے لئے مصیبت بن جاتا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سوا کچھ نہیں چاہتا تاکہ اس مقام تسلیم و رضا میں مجھے ہر آفت سے بچائے رکھے۔ اگر وہ اپنے قہر میں مجھے جگہ دے تو میں لطف کی تمنا نہیں کروں گا اور اگر لطف و کرم سے نوازے تو قہر طلب نہیں کروں گا کیونکہ ہمارے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے۔

شرح یہ جو اوپر فرمایا گیا ہے کہ وہ جوان ولایت کے تابع نہیں تھا بلکہ ولایت اس کے تابع تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اگرچہ کشف و کرامات کی قدرت رکھتا ہے لیکن پھر بھی کشف و کرامات اور آرام طلبی سے پرہیز کرتا ہے اور اپنے

آپ کو حق تعالیٰ کی رضا پر چھوڑ دیتا ہے کہ ہر چہ از دوست نیکوست (جو کچھ دوست کی طرف سے آئے وہی بہتر ہے)۔ اپنی طلب اور اختیار کو ترک کرکے ہر کام حق تعالیٰ کی رضا پر چھوڑ دیتا ہے۔

فصل

نفی و اثبات

مشائخ طریقت نفسانی خواہشات کو مٹانے اور حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے کو نفی و اثبات کی اصطلاحات سے یاد کرتے ہیں۔ نفی سے ان کی مراد اپنی بشریت کی فنا اور اثبات سے حق تعالیٰ کی ہستی کی بقا ہے لیکن چونکہ نفی سے مراد مکمل نفی ہے اور چونکہ انسان کی ذات کی نفی ممکن نہیں اس لئے یہاں نفی سے مراد صفات ذمیمہ کا ترک اور صفات حمیدہ کا اختیار کرنا ہے۔ اس بارے میں باب فقر و صفوت اور فنا و بقا میں بحث ہوچکی ہے اس لئے یہاں اختصار سے کام لیا جارہا ہے۔ مشائخ یہ بھی فرماتے ہیں کہ نفی سے مراد بندہ کے اختیار کی نفی اور اثبات سے مراد حق تعالیٰ کی رضا کو اختیار کرنا ہے اس لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ :

اختیار الحق لعبدہ مع علمہ لعبدہ خیر من اختیار عبدہ لنفسہ مع جہلہ بربہ (جو کچھ حق تعالیٰ بندہ کے متعلق اپنے علم کی بنا پر بندہ کے لئے چاہتا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو بندہ حق تعالیٰ سے جہل کی بنا پر اپنے لئے پسند کرے)۔ کیونکہ دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ عاشق اپنی مرضی کو ترک کرکے محبوب کی مرضی کو اختیار کرے اور یہی مشائخ کا مسلک ہے۔

حکایت ایک دفعہ ایک درویش دریا میں غوطے کھا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک دوست نے پکار کر کہا کہ بھائی کیا آپ نجات پسند کرتے ہیں۔ اس نے کہا نہیں جب دوست نے کہا کہ کیا غرق ہونا پسند کرتے ہیں تو اس نے کہا نہیں۔ دوست نے کہا عجیب آدمی ہے نہ نجات چاہتا ہے نہ غرق ہونا پسند کرتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے نہ نجات کی خواہش ہے نہ غرق ہونے کی۔ میری خواہش وہی ہے جو دوست (حق تعالیٰ) کی خواہش ہے۔ مشائخ کا کہنا ہے کہ دوستی حق میں کم ترین درجہ اپنے اختیار (ارادہ) کی نفی ہے حق تعالیٰ کے اختیار کی خاطر۔ جس کی نفی ممکن نہیں۔ اور بندہ کا اختیار عارضی ہے جس کی نفی ممکن ہے اور حق کا اختیار ازلی ہے جس کی نفی ناممکن ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ عارضی اختیار کو خاک میں ملا کر حق تعالیٰ کے ازلی اختیار کو ترجیح دی جائے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر دیدار حق تعالیٰ کی خواہش کا اظہار کیا تو گویا انہوں نے اپنے اختیار (مرضی) کے مطابق کام کیا اور کہا کہ رَبِّ أَرِنِيٓ (مجھے دیدار کرا) حق تعالیٰ سے جواب ملا کہ لَن تَرَىٰنِي (تو نہیں دیکھ سکتا)۔ عرض کیا کہ یا الٰہی دیدار حق ہے۔ اس سے آپ مجھے کس وجہ سے منع فرما رہے ہیں۔ فرمان ہوا کہ بیشک دیدار حق ہے لیکن دوستی (عشق) میں اختیار (ارادہ) باطل ہے یہ مضمون بہت طویل ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تجھے معلوم ہوجائے کہ ان اصطلاحات سے مشائخ عظام کی کیا مراد ہے۔ اسی طرح اصطلاحات جمع و تفرقہ، فنا و بقا، غیبت و حضور کا ذکر بھی صوفیہ کے مذاہب کے باب میں پہلے ہوچکا ہے جہاں صحو و سکر کا بھی بیان ہوچکا ہے۔ واللہ اعلم ۔

فصل

مسامرہ اور محادثہ

کاملان کے احوال و مقامات میں سے مسامرہ اور محادثہ دو حالات کا نام ہے۔
محادثہ (بات کرنا) یہ ہے کہ بندہ کے دل پر کوئی راز ظاہر کیا جائے اور مسامرہ کا مطلب ہے وہ خوشی جو راز کے چھپانے سے محسوس ہوتی ہے یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ مسامرہ رات کے وقت بندہ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ راز و نیاز کا نام ہے اور محادثہ دن کے وقت ظاہری احوال کا نام ہے۔ چنانچہ مناجات شب کو مسامرہ اور دعوات روز کو محادثہ کہا جاتا ہے لہٰذا دن کا حال کشف پر مبنی ہوتا ہے اور رات کا حال ستر یعنی راز کے چھپانے کا نام ہے۔ راہ سلوک میں مسامرہ کو محادثہ سے افضل قرار دیا گیا ہے اور شب معراج میں جو کچھ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بتایا گیا ہے وہ مسامرہ کے قبیل سے ہے کہ جب حق تعالیٰ نے چاہا تو جبرائیلؑ کو براق دے کر بھیجا اور مکہ سے قاب قوسین تک رات کے وقت پہنچا دیا اور راز و نیاز کی باتیں ہوئیں تو کشف جلال سے آپ کی زبان بند ہو گئی اور دل کنہ عظمت سے متحیر ہوا اور دماغ ادراک سے عاجز آگیا اس لئے فرمایا :

لااحصی ثناء علیک.... (میں تیری ثنا کماحقہ بیان نہیں کر سکتا)

اور محادثہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے کہ جب آپ کے دل میں حق تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی خواہش ہوئی تو چالیس دن کے چلہ کے بعد آپ کو کوہ طور پر بلایا گیا اور حق تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا اور پھر دیدار کی خواہش کی لیکن مراد پوری نہ ہوئی' حواس باقی نہ رہے اور جب ہوش میں آئے تو عرض کیا کہ۔ **تُبْتُ اِلَيْكَ** (تیری بارگاہ میں میری توبہ)۔ اس سے فرق ظاہر ہو گیا

درمیان اس ہستی کے جن کو عرش پر بلایا گیا اور جن کے حق میں "سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ ...." نازل ہوا اور ان کے درمیان جو وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا کے مطابق جائے مقررہ پر حاضر ہوئے۔

پس شب دوستوں کی خلوت کا وقت ہے اور دن بندگان خدا کی عبادت کا۔ جب بندہ اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے تو اس کو تنبیہہ ہوتی ہے لیکن دوست کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کہ اس سے تجاوز کرنے سے ملامت کا مستحق ہو کیونکہ جو کچھ دوست کرتا ہے وہ دوست کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

فصل

علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین

یاد رہے کہ ان تینوں کلمات کا مطلب علم ہے کسی چیز کے متعلق لیکن اگر یقین نہ ہو تو وہ علم، علم نہیں ہوتا۔ یقین کے بعد غیب چیز کا علم ایسے ہو جاتا ہے جیسے حاضر کا کیونکہ کل قیامت کے دن جب مومنین حق تعالیٰ کا دیدار کریں گے تو وہ دیدار اس علم کے مطابق ہوگا جو ان کو دنیا میں حاصل تھا، اگر ان کا یہ دیدار ان کے علم کے مطابق نہ ہوا تو پھر یا تو ان کا علم صحیح نہ تھا یا دیدار صحیح نہ ہوا۔ یہ دونوں صورتیں توحید کے خلاف ہیں جس کا علم اس دنیا میں صحیح ہے اس کا دیدار کل قیامت کو صحیح ہوگا۔ پس علم الیقین، عین الیقین ہو جائے گا اور حق الیقین ان کے علم الیقین کے مطابق ہوگا۔ پس جن لوگوں کا دعوہ ہے کہ عین الیقین رویت حق کے متعلق پورا علم ہے وہ غلطی پر ہیں کیونکہ رویت حصول علم کا ایک ذریعہ ہیں جیسے سننا ا ... ذریعہ ہے لیکن سننے سے پورا علم نہیں ہوتا پس ان حضرات کی

مراد علم الیقین سے دنیا میں اللہ تعالیٰ کو جاننا ہے اور عین الیقین سے مراد نزع کے وقت کا علم ہے اور حق الیقین سے بہشت میں مشاہدۂ حق مراد ہے۔ اس لحاظ سے علم الیقین علماء کا مقام ہے اس لئے کہ شریعت کے احکام پر یہ حضرات ثابت قدم ہوتے ہیں اور عین الیقین عارفین کا مقام ہے حسب استعداد۔ اور حق الیقین فنا گاہ دوستان ہے جو ہر چیز سے روگردانی کرلیتے ہیں چنانچہ علم الیقین مجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ عین الیقین محبت سے اور حق الیقین مشاہدہ سے۔ پہلا درجہ عوام کا ہے دوسرا خواص کا اور تیسرا خاص الخاص کا۔

شرح یہ ساری بحث مندرجہ ذیل مثال سے کچھ سمجھ میں آسکتی ہے۔ مثلاً آپ نے آگ نہیں دیکھی اور آپ کو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ آگ جلاتی ہے اس قسم کے علم کو علم الیقین کہا جاتا ہے جب آپ کے سامنے آگ جلائی جائے اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ واقعی آگ جلاتی ہے تو ایمان کے اس درجہ کو عین الیقین کہا جاتا ہے جو پہلے درجہ یعنی علم الیقین سے زیادہ قوی ہے لیکن جب آپ آگ کے اندر ہاتھ ڈال کر ذاتی تجربہ کرلیتے ہیں کہ واقعی آگ جلاتی ہے تو ایمان و یقین کے اس درجہ کو حق الیقین کہا جاتا ہے چنانچہ حق تعالیٰ کے متعلق بھی ایمان کے یہی تین درجے ہیں۔ جب ہمیں قرآن اور حدیث میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے تو ہمارے اس یقین کو علم الیقین کہا جائے گا۔ لیکن جب عبادات اور مجاہدات کے ذریعے تزکیہ نفس ہوجاتا ہے اور آپ کو حق تعالیٰ کا دیدار دل کی آنکھوں سے ہوتا ہے تو ایمان کے اس درجے کو عین الیقین کہا جاتا ہے لفظ عین کا مطلب ہے آنکھ۔ یعنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا۔ لیکن آنکھوں سے دیکھنے سے زیادہ مضبوط ایمان کا درجہ وہی ذاتی تجربہ ہے جو آپ نے آگ میں ہاتھ ڈال کر محسوس کرلیا کہ واقعی آگ جلاتی ہے اور ایمان کا یہ بلند ترین درجہ (حق الیقین) اس وقت حاصل ہوتا ہے جب سالک ذات حق میں فنا ہو

جاتا ہے۔ چنانچہ مرتبہ حق الیقین سے مراد مقام فنا فی اللہ کا حصول ہے۔ یعنی جب سالک راہ حقیقت اپنی ہستی کو ذات حق میں گم کردیتا ہے اسی مقام پر وحدت الوجود صادق آتا ہے۔ بعض علمائے ظواہر کہتے ہیں کہ دیدار حق انسان کے لئے ناممکن ہے لیکن قرآن حکیم میں حق تعالی فرماتے ہیں کہ جو اس دنیا میں اندھا ہے آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ جو اس دنیا میں نابینا ہے آخرت میں بھی نابینا ہوگا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو اس دنیا میں مشاہدۂ حق حاصل نہیں ہوا آخرت میں بھی حاصل نہیں ہوگا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مرتبہ احسان یہ ہے کہ تو خدا تعالی کی اس طرح عبادت کرے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اگر نہیں دیکھ سکتا تو پھر یہ خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ کیا شب معراج آپ نے اللہ تعالی کا دیدار کیا ہے تو آپ نے انکار فرمایا۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رحمتہ اللہ علیہ نے دریافت کیا تو فرمایا کہ دیدار حاصل ہوا۔ حضرت عائشہؓ سے انکار جسمانی آنکھوں سے دیکھنے کے متعلق تھا اور حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حضورؐ کا اقرار روحانی آنکھوں سے دیکھنا تھا۔ نیز حضرت علیؓ سے جب کسی نے پوچھا کہ کیا اللہ تعالی کو آپ نے دیکھا ہے تو آپ نے فرمایا کہ کیا میں اس کی عبادت کرتا ہوں جس کو نہیں دیکھا جب پوچھا گیا کہ اللہ تعالی کیسے ہیں تو فرمایا کہ جسم کی آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں روحانی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔ نیز فرمایا کہ وہ بے حد نزدیک ہے لیکن چھوا نہیں جا سکتا اور بے حد دور ہے لیکن تجھ سے الگ نہیں۔

علم و معرفت

علمائے دین علم اور معرفت میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ البتہ حق تعالی کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ عالم ہے' عارف نہیں کہتے۔ لیکن مشائخ طریقت ہر اس علم

کو معرفت کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو ان کو نیک اعمال، مجاہدات اور تزکیہ نفس کے ذریعے غیب سے حاصل ہوتا ہے اور اس قسم کے علم کے جاننے والے کو عارف کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ پس وہ شخص جو کسی چیز کی ماہیت اور حقیقت کو جانتا ہے اس کو عارف کہتے ہیں اور جس شخص کو محض ظاہری علم ہو اس کو عالم کہا جاتا ہے۔ اس لئے صوفیاء کرام عام علم رکھنے والے کو دانشمند کہتے ہیں نہ کہ عارف اور یہ بات عام لوگوں کو اچھی نہیں لگتی حالانکہ اس سے ان کی مراد ملامت نہیں بلکہ علم کی کمی ہوگی۔ صوفیاء کرام کا قول ہے کہ۔ **العالم قائم بنفسه و العارف قائم بربه** (عالم اپنی ذات سے قائم ہوتا ہے اور عارف اپنے رب کے ساتھ)۔ اس مضمون پر کشف حجاب معرفت کے باب میں کافی وضاحت ہو چکی ہے۔

فصل

شریعت اور حقیقت

یہ دونوں اصطلاحات اس قوم (صوفیاء) کی ہیں جو شریعت سے ظاہری اعمال کی صحت اور حقیقت سے باطنی احوال (کیفیات) کی پختگی مراد لیتے ہیں۔ شریعت و حقیقت کے متعلق دو گروہ غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اول علمائے ظاہر جو شریعت و حقیقت میں فرق نہیں سمجھتے اور یہ کہتے ہیں کہ شریعت خود حقیقت ہے اور حقیقت شریعت ہے۔ دوسرا گروہ ان ملحدین (بے دینوں) کا ہے جو ایک کا دوسری کے بغیر قائم رہنا جائز رکھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب حقیقت آشکارا ہوگئی تو شریعت اٹھ گئی۔ یہ عقیدہ فرقہ مشبہ، قرامطہ، مشبعہ اور موسوسان کا ہے (یعنی وسوسہ ڈالنے والے)۔ ان کی دلیل کہ شریعت حقیقت سے جدا ہے

یہ ہے کہ ایمان کے لئے زبان کے اقرار سے دل کی تصدیق جدا ہے۔ اور ہماری یہ دلیل ہے کہ اصل میں دل کی تصدیق کے لئے زبان سے اقرار ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ صرف دل کی تصدیق سے یعنی زبان کے اقرار کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا اور نہ ہی صرف زبان کے اقرار سے یعنی بغیر تصدیق قلب انسان مومن نہیں بن سکتا۔ لہٰذا قول اور تصدیق کے درمیان جو فرق ہے ظاہر ہے۔ چنانچہ حقیقت وہ چیز ہے جس کا نسخ (منسوخ ہونا) ناممکن ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جہان کے فنا ہونے تک حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مثلاً حق تعالیٰ کے معرفت اور اعمال کی صحت خلوص نیت پر مبنی ہے اور شریعت وہ چیز ہے کہ جس کے اندر تبدل و تغیر جائز ہے جیسا کہ احکام و اوامر الٰہی (مثلاً قرآن میں بعض آیات ناسخ اور بعض منسوخ ہیں)۔ پس شریعت فعل بندہ ہے اور حقیقت خدا تعالیٰ کی نگہبانی' حفاظت اور عصمت کا نام ہے۔ پس شریعت کا قیام حقیقت کے بغیر محال ہے اور حقیقت کا قائم کرنا شریعت کے بغیر محال ہے۔ مثال کے طور پر ہر شخص جان (روح) کے ساتھ زندہ ہے اور جب روح نکل جاتی ہے تو انسان مردہ ہوجاتا ہے۔ روح اور جسم کے اکٹھا ہونے سے انسان زندہ ہے۔ یہی شریعت و حقیقت کا باہمی تعلق ہے۔ شریعت بغیر حقیقت کے ریا ہے اور حقیقت بغیر شریعت کے منافقت ہے۔ خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (جو لوگ ہماری خاطر جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو اپنی طرف کی راہیں دکھاتے ہیں)۔ اس آیت میں مجاہدہ (جدوجہد) شریعت ہے اور ہدایت سے مراد حقیقت سے آگاہی ہے۔ شریعت فعل بندہ ہے یعنی اس کے ظاہری اعمال اور حقیقت فعل حق ہے یعنی باطنی قرب حق کا عطا ہونا۔ بالفاظ دیگر شریعت کا تعلق مکاسب (اعمال) سے ہے اور حقیقت کا تعلق مواہب سے ہے یعنی حق تعالیٰ کے انعامات اور عطیات۔ جو کچھ اوپر بیان ہوا یہ صوفیاء کی پہلی قسم کی اصطلاحات ہیں

اب دوسری قسم کی اصطلاحات بیان کی جاتی ہیں جن کا تعلق استعارات سے ہے اور جو زیادہ مشکل ہیں۔

شرح حضرت مصنفؒ کا یہ فرمانا کہ شریعت بغیر حقیقت ریا اور حقیقت بغیر شریعت منافقت ہے معرفت کا بے بہا خزانہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ شریعت پر عمل کرتے ہیں لیکن وصال حق سے محروم ہوتے ہیں وہ ریاکاری یعنی دکھلاوے میں مشغول ہیں اور جو لوگ واصل باللہ ہونے کا دعوہ کرتے ہیں لیکن شریعت پر عمل نہیں کرتے منافق ہیں کیونکہ ان کا یہ دعوہ باطل ہوتا ہے یعنی شریعت کے بغیر واصل نہیں ہو سکتے اور پھر وصال کا دعوہ کرتے ہیں اس لئے منافق ہیں۔

اصطلاحات کی دوسری قسم

چونکہ ان اصطلاحات کا تعلق استعارات (اشارات) سے ہے ان کا سمجھنا زیادہ مشکل ہے۔

الحق یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے جو مندرجہ ذیل آیت میں مذکور ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (یہ بات اس لئے ہے کہ اللہ حق ہے)۔

حقیقت حقیقت سے مراد بندہ کا واصل باللہ ہونا اور ذات منزہ عن الصفات میں جم جانا۔

خطرات تفرقہ کی باتیں جو دل پر گزریں (یعنی عالم مجاز میں بندہ اور مولا کے درمیان امور وغیرہ۔)

وطنات اسرار الٰہی میں سے جو چیزیں انسان کے باطن میں جاگزیں ہو جائیں۔

طمس جو چیز دل میں رہ جائے اس کا مٹانا۔

رمس کسی چیز کا جڑ سمیت دل سے نکال دینا۔

علائق وہ معاملات جن کی وجہ سے انسان حقیقت سے باز رہ جائے۔

وسائط وہ معاملات جن کی بدولت انسان حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔

زوائد دل میں انوار الٰہی کی برکت۔

فوائد باطن انسان میں ضروری امور کا ادراک۔

ملجا حصول مراد کی جگہ۔

منجا آفت کی باتوں سے بچ جانے کا مقام۔

کلیت اوصاف بشریت کا پوری طرح ختم ہو جانا۔

لوائح انوار الٰہی کی جلوہ گری "آنا" "فانا"۔

لوامع انوار الٰہی کی جلوہ گری جن میں کچھ ثبات ہو۔

طوالع انوار الٰہی کی جلوہ گری جن کی قوت تاثیر لوامع سے زیادہ ہو۔

طوارق وہ واردات الٰہی جو رات کو مناجات کے وقت بشارت یا مذمت کی صورت میں ظاہر ہوں۔

لطائف ان حقائق و معارف کا دل پر منکشف ہونا جو الفاظ کے ذریعے سمجھ میں نہ آسکیں۔

سر محبت کے راز و نیاز کا چھپانا۔

نجویٰ اپنی خامیوں کو چھپانا۔

اشارات واضح الفاظ کے بغیر مطالب بیان کرنا۔

وارد معارف کا قلب پر نزول۔

انتباہ غفلت کا دل سے دور ہونا۔

اشتباہ حق و باطل کی تمیز میں شکوک کا ہونا۔

قرار شکوک و شبہات کا مٹ جانا۔

انزعاج وجد کی حالت میں دل کا تڑپنا۔

بعض دیگر اصطلاحات بغیر استعارات

یہ وہ الفاظ ہیں جو توحید کے ضمن میں استعمال ہوتے ہیں بغیر استعارات۔

العالم خداوند تعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا ہے اس کو عالم کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اٹھارہ ہزار یا پچاس ہزار جہان ہیں۔ اہل فلسفہ کی اصطلاح کے مطابق دو جہان ہیں ایک عالم علوی دوسرا عالم سفلی۔ اور علمائے متکلمین کا کہنا ہے کہ عرش سے تحت الثریٰ تک جو کچھ موجود ہے عالم ہے۔ غرضیکہ عالم سے مراد مختلف اقسام کی مخلوق کا مجموعہ ہے۔ اہل طریقت کے نزدیک عالم ارواح و عالم نفوس دو جہان بھی مذکور ہیں۔ لیکن ان کی وہ مراد نہیں جو اہل فلسفہ کی ہے۔ ان کی مراد ہے ارواح اور نفوس کا اجتماع (جیساکہ انسان)۔

محدث محدث سے مراد وہ وجود ہے جو پہلے نہ تھا بعد میں وجود میں آیا۔

قدیم وہ ہستی جو ازل سے ابد تک موجود ہے اور یہ لفظ سوائے ذات حق کسی اور پر صادق نہیں آتا۔

ازل وہ جس کی کوئی ابتدا نہ ہو۔

ابد وہ جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔

ذات کسی چیز کی ہستی یا حقیقت کو لفظ ذات سے موسوم کیا جاتا ہے۔

صفت جو موصوف نہ ہو سکے کیونکہ وہ بخود قائم نہیں۔

شرح لفظ ذات و صفات حق تعالیٰ کے متعلق استعمال کئے جاتے ہیں۔ ذات میں صفات مندرج ہوتے ہیں۔

اسم وہ لفظ یا عبارت جس سے حق تعالیٰ کی جانب اشارہ کیا جائے۔

تسمیہ موسوم کے متعلق خبر دینا۔

نفی جو قابل نفی اشیاء کے عدم کو ظاہر کرے۔

اثبات جو قابل اثبات کے وجود کو ظاہر کرے۔

مثیان دو چیزوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ممکن ہونا۔

ضدان دو چیزوں کا ایک دوسرے کا مخالف ہونا۔

غیران دو چیزوں میں سے ایک کا ہونا اور دوسری کا بالکل عدم (نہ ہونا)۔

جوہر ہر چیز کی اصلیت جو بذات خود قائم ہو۔

عرض جو جوہر سے قائم ہو۔ اپنی ذات سے قائم نہ ہو۔

جسم جو اجزاء پراگندہ سے مرکب ہو۔

سوال حقیقت کی طلب۔

جواب حقیقت کی خبر دینا

الحسن وہ جو موافق ہو۔

القبح وہ چیز جو غیر موافق ہو۔

السفہ حکم کا نہ ماننا۔

ظلم کسی چیز کا بے جا ہونا۔

عدل ہر چیز کا مناسب جگہ پر ہونا۔

مالک وہ جس کے حکم پر اعتراض نہ ہو سکے۔

اصطلاحات صوفیہ کی ایک اور قسم

یہ وہ اصطلاحات ہیں جن کی شرح کی ضرورت ہے اور صوفیاء کے درمیان مروج ہیں اور ان کا مطلب وہ نہیں جو عام اہل لغت کا ہوتا ہے۔ مثلاً۔

الخاطر اس خیال کو کہا جاتا ہے جو دوسرے خیال کے آتے ہی دل سے ہٹ جائے۔ مشائخ اکثر پہلے خیال کو صحیح سمجھتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت خیرالنساج رحمتہ اللہ علیہ کے دل میں خیال آیا کہ ان کے پیر حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ دروازہ پر کھڑے ہیں۔ آپ نے اس کو بے معنی سمجھ کر ہٹانے کی کوشش کی تو تیسرا خیال آیا کہ شاید حضرت شیخ دروازہ پر آئے ہوں۔ چنانچہ باہر گئے تو ان کو دروازہ پر کھڑے پایا۔ انہوں نے فرمایا کہ اے خیر ! اگر تم مشائخ کی

سنت پر عمل کرتے اور پہلے خیال پر عمل کرتے تو مجھے اتنی دیر دروازہ پر نہ رکنا پڑتا۔ چونکہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ حضرت خیرالنساج رحمتہ اللہ علیہ کے پیر تھے ان کے دل کی بات معلوم کرلی۔

شرح اس سے ظاہر ہے کہ بعض اوقات ایک ولی کو دوسروں کے دل کی بات کا معلوم نہ ہونا ممکن ہوسکتا ہے۔ لیکن عام بے سمجھ لوگ اسی بات کے ذریعہ بزرگوں کا امتحان لیتے ہیں اگر دل کی بات ان کو معلوم نہ ہوسکے تو ان کو بزرگ ہی نہیں مانتے۔ کشف قلوب کا ہونا یا نہ ہونا حق تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ۔

گہے بر طارم عرش بنشینم
گہہ بپشت پائے خود نبینم

(بعض اوقات میری یہ حالت ہوتی ہے کہ عرش پر پہنچ جاتا ہوں اور بعض اوقات اپنے پاؤں کی پشت نہیں دیکھ سکتا)۔ مشائخ کا مقولہ ہے۔ **مشاہدۃ الابرار بین التجلی و الاستتار** (عارفین کا مشاہدہ کشف اور استتار کے مابین ہوتا ہے)

الواقع واقع سے ان کی مراد وہ خیال ہے جو دل میں آئے اور قرار پکڑ لے بخلاف خاطر کے جو دل میں آئے اور رفع ہو جائے اور واقع کسی صورت میں دل سے رفع نہیں ہوتا اہل لغت واقع کو اشکال (مشکل) کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ واقع حاصل ہو گیا لیکن صوفیاء کے نزدیک واقع وہ ہے جو دل میں آئے اور پھر رفع نہ ہو۔

اختیار اختیار سے مشائخ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اپنے اختیار پر حق تعالیٰ کے اختیار (مرضی) کو ترجیح دیں یعنی خیر ہو یا شر جو کچھ اللہ تعالیٰ ان کے لئے پسند

کریں اس کو کافی سمجھیں نیز بندہ کا حق تعالیٰ کی مرضی کو اختیار کرنا بھی حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر یہ حقیقت نہ ہوتی تو بندہ اپنے اختیار کو ہرگز نہ چھوڑ سکتا۔ چنانچہ حضرت ابویزید رحمتہ اللہ علیہ سے جب کسی نے پوچھا کہ امین کون ہوتا ہے تو فرمایا کہ امین وہ ہے جس کا اپنا اختیار ختم ہوگیا ہو اور حق تعالیٰ کا اختیار اس کا اختیار بن چکا ہو۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ کو بخار ہوگیا تو آپ نے یوں دعا کی کہ بارخدایا مجھے عافیت عطا فرما۔ آپ کے باطن سے ندا آئی کہ تو کون ہے جو میرے ملک میں کلام کرے اور اپنی تدبیر اختیار کرتا ہے میں اپنے ملک کی تدبیر تجھ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ تو میرے اختیار کو اختیار کر اور اپنے آپ کو صاحب اختیار مت سمجھ۔ واللہ اعلم۔

امتحان امتحان سے مشائخ عظام کی مراد ہے حق تعالیٰ کی طرف سے اولیاء کی آزمائش کی خاطر ان کو مختلف اوہام و مصائب میں مبتلا کرنا۔ مثلاً خوف، غم، قبض اور ہیبت وغیرہ۔ جیسا کہ حق تعالیٰ کے اس قول سے ظاہر ہے۔

"یہ وہ[1] لوگ ہیں جن کی آزمائش کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ان کو ابتلا میں ڈالا تاکہ ان کی مغفرت ہو اور درجے بلند ہوں" اور یہ بلند مقام ہے۔

بلا اسی طرح بلا (آفات) میں اولیاء کو مبتلا کیا جاتا ہے مثلاً مصیبت، مرض اور غم وغیرہ اور جس قدر تکلیف زیادہ ہوتی ہے قرب حق زیادہ حاصل ہوتا ہے اس وجہ سے بلا لباس (زینت) ہے اولیاء اللہ کیلئے۔ آرامگاہ ہے اہل صفا کیلئے اور غذا ہے انبیاء کے لئے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

نحن معاشر الانبیاء اشد الناس بلاءً

"ہم انبیاء کا گروہ سب سے زیادہ مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔"

---

[1] سورۃ الحجرات آیت ۳

نیز فرمایا : **اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الاولیاء ثم الامثل فالا مثل**
"سب سے زیادہ مصیبت میں انبیاء ہوتے ہیں پھر اولیاء اور پھر درجہ بدرجہ بزرگ۔"

غرضیکہ بلا اس غم کا نام ہے جو بندۂ مومن کے دل اور تن پر ڈالا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک نعمت ہے لیکن اس راز سے بندہ آگاہ نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے اس کو ثواب ملتا ہے۔ لیکن کافروں پر جو مصیبت نازل ہوتی ہے وہ بلا (امتحان) نہیں ہوتی بلکہ ان کے گناہوں کی وجہ سے نازل ہوتی ہے اس سے ان کے مراتب بلند نہیں ہوتے۔

پس بلا کا مرتبہ امتحان سے زیادہ ہے کیونکہ امتحان کا اثر صرف دل پر ہوتا ہے لیکن بلا سے دل اور جسم دونوں مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تحلی تحلی کا مطلب ہے نیک لوگوں کی تشبیہ کرنا قول اور فعل میں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

"ایمان یہ نہیں کہ کسی کی مشابہت کی جائے یا اس جیسا بننے کی تمنا کی جائے بلکہ ایمان وہ یقین ہے جو دل میں پیدا ہو اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔"

پس تحلی سے مراد یہ ہے کہ کسی اچھی قوم کی سی شکل و صورت اختیار کی جائے لیکن اس جیسے اعمال نہ کئے جائیں اس قسم کے لوگ جلدی رسوا ہو جاتے ہیں اور ان کا راز فاش ہو جاتا ہے لیکن اہل اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ اولیاء اللہ کو ان کا راز پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔

تجلی تجلی سے مراد وہ انوار الٰہی ہیں جو بندہ کے قلب پر اس کی قابلیت و

صلاحیت کے مطابق وارد ہوتے ہیں اور جن کی بدولت وہ حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن مشاہدہ اور رویت (آنکھ سے دیکھنا) کے درمیان فرق ہے۔ مشاہدہ کی حالت میں اگر وہ چاہیں تو مشاہدہ کرتے ہیں نہ چاہیں تو نہیں کرتے۔ یا کبھی مشاہدہ کرتے ہیں اور کبھی نہیں کرتے لیکن رویت یہ ہے کہ اہل بہشت اگر دیکھنا چاہیں یا نہ دیکھنا چاہیں رویت جاری رہتی ہے۔ بالفاظ دیگر تجلی کیلئے حجاب روا ہو سکتا ہے رویت کیلئے کبھی حجاب نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

تجلی تجلی سے مراد ان چیزوں سے پرہیز ہے جو قرب حق میں مانع ہوں۔ ان چیزوں میں سے ایک دنیا ہے جس کو ہاتھ نہ لگائے۔ دوسری عقبیٰ (آخرت یعنی بہشت) جس کا خیال دل سے نکال دیا جائے۔ ان میں سے تیسری چیز ہے حرص و ہوا جس کو دل سے نکال دینا ضروری ہے اور چوتھی چیز صحبت خلق ہے جس سے اپنے آپ کو دور رکھے اور دل میں اس کا خیال تک نہ آنے دے۔

شرود شرود کا مطلب ہے ترک کرنا۔ یعنی ان آفات اور حجابات کا ترک کرنا جو طلب حق میں مانع ہوں۔ چنانچہ طالبان حق کا حجابات کو دور کرنا' سفر اختیار کرنا وغیرہ سب شرود کے زمرہ میں آتے ہیں۔ جو طالب اس کا زیادہ اہتمام کرتا ہے وصال حق میں زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔

قصود قصود (جمع قصد) سے ان کی مراد ہے طلب حق میں کمربستہ ہو جانا۔ قصود حرکات و سکنات سے وابستہ نہیں کیونکہ طالب حق خواہ خاموش بیٹھا ہے خواہ سفر کرتا ہے طلب حق ہر وقت اس کے دل میں ہے لیکن عام لوگوں کا یہ دستور نہیں ہوتا کیونکہ عام لوگ یا تو طلب کی کوئی صورت اختیار کرتے ہیں یا تحریک کرتے ہیں لیکن طالبان حق کی طلب ان کے قلب میں جاگزیں ہوتی ہے اور وہ ہمہ تن قصد و تمنا بن جاتے ہیں۔

اصطناع لفظ اصطناع سے ان کی مراد ہے حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے بندہ کے دل سے تمام مرادوں کا ختم ہونا اور خواہشات نفسانی کا مٹ جانا تاکہ غایت تزکیہ نفس سے آراستہ ہو کر وہ بے خود ہو جائیں اور اپنے آپ کو بھول کر ہمہ تن خدا کے ساتھ مشغول ہو جائیں یہ انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے تاہم بعض مشائخ کے نزدیک یہ مقام اولیاء کو بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اصطفاء اصطفاء یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندہ خاص کے قلب کو معرفت سے بھر دے اور پھر اس معرفت کے ذریعے اس کا باطن منور ہو جائے اور یہ چیز عام ہے ہر خاص و عام خواہ وہ نیک ہے یا بد' ولی ہے یا مطیع یا نبی سب کو حاصل ہو سکتی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

" اور پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب دی جن کو ہم نے برگزیدہ کیا پس ان میں سے بعض اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں۔ بعض میانہ روی اختیار کرنے والے اور بعض نیک کاموں میں سب سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔"

اصطلام اصطلام وہ تجلی حق ہے جس سے سالک مکمل طور پر مغلوب ہو کر اپنا اختیار و ارادہ کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ قلب ممتحن اور قلب مصطلم ہم معنی ہو جاتے ہیں حالانکہ صوفیاء کی اصطلاح میں اصطلام کو امتحان سے زیادہ خصوصیت حاصل ہے۔ واللہ اعلم۔

رین رین سے مراد قلب پر وہ حجاب ہے جو ایمان باللہ کے بغیر رفع نہیں ہوتا اور یہ حجاب کفر اور ضلالت ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ :

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ " ہرگز ایسا نہیں بلکہ وہ لوگ جو کفر اور شرک کرتے تھے اس سے ان کے قلوب پر زنگ (حجاب) آگیا ہے۔"

ایک گروہ کے نزدیک رین وہ حجاب ہے کہ جس کا رفع کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ازلی کافر اسلام قبول نہیں کرتے اور جو لوگ ایمان لے آتے ہیں وہ ازلی مومن ہوتے ہیں۔ علم حق میں۔

غین غین سے مراد قلب پر وہ حجاب ہے جو استغفار سے رفع ہو سکتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک حجاب خفیف' دوسرا حجاب کثیف۔ یہ دوسری قسم کا حجاب غفلت اور گناہ کبیرہ سے پیدا ہوتا ہے اور حجاب خفیف ہر شخص کیلئے حائل ہو سکتا ہے خواہ وہ ولی ہو یا نبی۔ جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

انہ لیغان علی قلبی و انی لاستغفر اللہ فی کل یوم مائتہ مرہ

"پس میرے قلب پر ہلکا سا پردہ آ جاتا ہے جس کو میں رفع کرتا ہوں روزانہ ایک سو بار استغفار سے"

پس حجاب کثیف توبہ سے دور ہوتا ہے اور حجاب خفیف حق تعالٰی کی طرف رجوع صادق سے۔ توبہ کا مطلب ہے گناہ ترک کرنا۔ بذریعہ طاعت اور رجوع کا مطلب ہے اپنے آپ کو ترک کر کے حق تعالٰی کی طرف رجوع۔ چنانچہ توبہ جرم سے کی جاتی ہے اور بندوں کا جرم حق تعالٰی کی نافرمانی ہے اور دوستان حق کا جرم اپنے آپ کو دیکھنا ہے جب کوئی شخص گناہ کے بعد حق تعالٰی کی طرف رجوع کرے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے توبہ کی اور اگر ایک نیکی سے زیادہ اچھی نیکی کی طرف لوٹے تو اس کو رجوع کرنے والا کہا جاتا ہے یہ سب باتیں ہم نے توبہ کے باب میں بیان کر دی ہیں۔

تلبیس تلبیس کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کی حقیقت کے خلاف ظاہر کرنا جیساکہ خدا تعالٰی نے فرمایا ہے :

وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُوْنَ

"اور ہم ان کو مشتبہ کریں گے جیسے وہ مشتبہ کرتے ہیں۔"

(یعنی حق و باطل کو ملا کر مشتبہ بنا دیتے ہیں) اور یہ صفت سوائے حق تعالیٰ کے اور کسی پر صادق نہیں آتی کیونکہ وہی کافر کو مومن کی صفت میں اور مومن کو کافر کی صفت میں ظاہر کر سکتا ہے حتیٰ کہ اس کے ظہور کا وقت آجاتا ہے۔

چنانچہ جب کوئی بزرگ اپنے اچھی صفات کو چھپا کر بری صفات ظاہر کرنا چاہتا ہے (یعنی ملامتیہ فرقہ والے) تو اس عمل کو بھی تلبیس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی لفظ استعمال نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ریا اور نفاق (منافقت) کو بھی تلبیس نہیں کہتے۔ حالانکہ یہ بھی تلبیس ہے۔ کیونکہ تلبیس فعل حق کے سوا کسی جگہ استعمال نہیں ہوتا۔

شرب صوفیاء کرام کی اصطلاح میں حلاوت طاعت' لذت کرامت اور راحت انس کو شرب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور کوئی شخص شرب کی لذت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ جیسا کہ جسم کی لذت پانی سے حاصل ہوتی ہے اور دل کی لذت اور راحت بندگی سے ہوتی ہے۔ میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے مرید بے شرب اور عارف بے شرب' مریدی اور معرفت سے بیگانہ ہوتا ہے کیونکہ مرید کیلئے اپنی بندگی کی لذت ضروری ہے تاکہ حق بندگی بخوبی ادا کر سکے۔ اسی طرح عارف کیلئے بھی حق تعالیٰ کی معرفت کی لذت ضروری ہے تاکہ نفسانیت کی لذت کے ساتھ مخلوط نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

ذوق ذوق بھی شرب کی مانند ہے لیکن شرب اور ذوق میں فرق یہ ہے کہ شرب صرف راحت کی حالت میں استعمال ہوتا ہے اور ذوق رنج و راحت دونوں کے لئے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے "ذوق حلاوت اور ذوق بلا" یہ دونوں درست ہیں یا

یہ کہا جاتا ہے کہ "شربت وصل اور شربت ہجر" وغیرہ۔ کیونکہ جب حق تعالیٰ نے شرب کا ذکر فرمایا تو یہ آیت آئی کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا "کھاؤ پیو اور خوش رہو" لیکن جب ذوق کا ذکر فرمایا تو یہ آیت آئی ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ "عذاب کا مزہ چکھو ......" دوسرے مقام پر حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ "دوزخ کے چھونے کا مزہ چکھو۔" یہ ہیں صوفیاء کے درمیان مروجہ اصطلاحات جو بیان کیے گئے۔ اگر تمام کو بیان کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آجائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

من خرقہ گرو کردم عریان خراباتم
خوردم ہمہ رخت خود مہمان خراباتم

گیارہویں پردہ کا اٹھانا

دربیانِ سماع

جواز سماع یاد رہے کہ حصول علم کے ذرائع پانچ ہیں۔ سمع (سننا) ، بصر (دیکھنا) ، سونگھنا ، چکھنا اور چھونا۔ (یعنی حواس خمسہ) یعنی حق تعالیٰ نے دل کیلئے یہ پانچ دروازے کھول دیئے ہیں اور علم کی ہر قسم ان پانچ حواس میں سے کسی نہ کسی ذریعے کے ساتھ وابستہ ہے جیسا کہ آوازوں اور خبروں کا علم کانوں سے ہوتا ہے اور رنگوں اور مادی چیزوں کا علم آنکھوں سے ہوتا ہے۔ میٹھے اور کڑوے کا علم زبان سے ہوتا ہے اچھی یا بری بو کا علم ناک سے ہوتا ہے اور سخت اور نرم چیز کا علم قوتِ لامسہ سے ہوتا ہے ان پانچ حواس میں سے چار کو ایک خاص مقام (سر کے اندر) رکھا گیا ہے پانچویں حس کو سارے جسم میں پھیلا دیا گیا ہے۔

چنانچہ اس عجیب و غریب کائنات کے دیکھنے اور اس کی عمدہ اشیاء کو

سونگھنے' عمدہ نعمتوں کے چکھنے اور نرم چیزوں کو چھونے میں انسانی عقل کیلئے دلائل ہیں اور ان دلائل کے ذریعے خداوند تعالیٰ تک راہنمائی ہوتی ہے کیونکہ ان حواس کے ذریعے ہی عقل کو یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ یہ جہان حادث ہے کیونکہ وہ تبدل و تغیر کا حال ہے اور جو چیز تغیر پذیر ہوتی ہے وہ حادث (فنا ہونے والی) ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس جہان کے پیدا کرنے والا بھی ضروری ہے جو اس جہان کا ہم جنس نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ جہان مخلوق ہے جس کیلئے خالق کا ہونا ضروری ہے یہ جہان مادی ہے اور اس کا خالق مادہ پیدا کرنے والا ہے اور یہ کہ یہ خالق قدیم ہے۔ اور یہ جہان حادث ہے۔

نیز عقل کے ذریعے یہ علم بھی ہوتا ہے کہ خالق لامتناہی (لامحدود) ہے اور کائنات متناہی (محدود) ہے اور یہ کہ وہ قادر ہے ہر چیز پر اور ہر کام پر وہ توانا ہے اور ہر چیز کا عالم ہے۔ ساری کائنات پر اس کا تصرف (قبضہ۔ اختیار) ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے اس نے پکے دلائل کے ساتھ پیغمبر بھیجے لیکن ان انبیاء علیہم السلام پر ایمان اس وقت تک نہیں لایا جا سکتا جب تک کہ ان کے لائے ہوئے پیغام یعنی ضروریات شرع اور دین کو کانوں سے نہ سن لے یہی وجہ ہے اہلسنت و الجماعت سننے کو دیکھنے پر فضیلت دیتے ہیں اگر کوئی کم عقل یہ کہے کہ آنکھوں سے دیکھنا کانوں کے سننے سے افضل ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کا دیدار اس کا کلام سننے سے بہتر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اپنے کانوں کے ذریعے یہ سنا ہے کہ بہشت میں مومن کیلئے خدا تعالیٰ کا دیدار ہو گا اور عقل کے ذریعے دیدار ہونے میں جو حجاب ہے وہ کشف سے بہتر نہیں۔ کیونکہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خبر دینے سے معلوم کر لیا ہے کہ حق تعالیٰ مومنوں کو دیدار دے گا اور ان کی آنکھوں سے حجاب اٹھا لے گا اور وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ لیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ سننا افضل ہے دیکھنے سے۔ نیز تمام احکام شریعت کا

دارومدار سننے پر ہے اگر سننا ممکن نہ ہوتا تو اس کا ثبوت ممکن نہ ہوتا۔ اسی طرح جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے انہوں نے بھی ابتدا بات کرنے اور احکام سنانے سے کی اور ان کی بات سن کر لوگ مسلمان ہوئے اس کے بعد معجزات دکھائے اور معجزات دیکھنے کی تاکید بھی سننے سے ہوئی۔ چنانچہ ان دلائل کے باوجود جو محض سننے سے انکار کرتا ہے وہ احکام شریعت سے انکار کرتا ہے اور جان بوجھ کر اس کے احکام کو چھپاتا ہے اور اب میں سماع کے متعلق مختلف امور بیان کرتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

فصل

سماع القرآن

یاد رہے کہ قلب کی افزائش' باطن کی پرورش اور کان کی لذت کیلئے بہترین سماع کلام باری تعالیٰ ہے جس کیلئے تمام مسلمان مامور اور تمام کافر خواہ انسان ہوں یا جنات مکلف ہیں۔ معجزات قرآن میں سے ایک معجزہ یہ ہے کہ اس کے پڑھنے اور سننے سے جی نہیں بھرتا بلکہ اس سے قلب میں ایسی رقت پیدا ہوتی ہے کہ کافر لوگ رات کو چھپ کر آتے تھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت سن کر بہت محظوظ ہوتے تھے اور حیرت زدہ ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ نضر بن حارث جو کافروں میں فصاحت اور بلاغت میں یکتا تھا اور عتبہ بن ربیعہ جو اپنی فصاحت و بلاغت سے سننے والوں کو مسحور کر دیتا تھا اور ابوجہل بن ہشام جو خطابت اور تقاریر میں ید بیضا رکھتا تھا اور بہت بڑا شاعر تھا ان جیسے بہت ادیب و شعراء کلام پاک سن کر مست ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز میں قرأت سن کر عتبہ بے ہوش ہو

گیا۔ ابو جہل بھی کہتا تھا کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں ہے۔ کلام پاک کی وہ شان ہے کہ حق تعالیٰ جنّات کو جوق در جوق بھیج کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قرأت سننے کا حکم فرماتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس بات کی خبریوں دی ہے کہ:

فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا

"وہ کہتے تھے کہ ہم نے عجیب و غریب قرآن سنا"

اسی طرح حق تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کہ جنّات کہتے تھے کہ قرآن قلب بیماران کیلئے راہنما ہے نیز فرمایا:

یَّهْدِیْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا

"قرآن نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے پس ہم اس پر ایمان لائے اور ہرگز اپنے رب کا کوئی شریک نہیں ٹھہرائیں گے"

پس قرآن کی ہر نصیحت دنیا کی تمام نصیحتوں سے بہتر ہے۔ اس کا ہر لفظ تمام الفاظ سے بہتر، اس کا ہر حکم تمام احکام سے زیادہ مؤثر، اس کی ہر نہی تمام نہیوں سے افضل، اس کا ہر وعدہ تمام وعدوں سے زیادہ دلربا، اس کی ہر وعید (دھمکی) سب وعیدوں سے زیادہ جاں گداز، اس کا ہر قصہ تمام قصوں سے زیادہ خوب صورت، اس کی ہر مثال تمام مثالوں سے زیادہ واضح ہے۔ قرآن نے ہزاروں دلوں کو شکار کیا ہے اور ہزاروں جانوں کو اس کے لطائف نے پامال کیا ہے اس نے ہزاروں دنیا داروں کو ذلیل اور ہزاروں ذلیل و خوار لوگوں کو معزز بنایا ہے۔ جب حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سنا کہ انکی بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں تو تلوار نکال کر ان کو قتل کرنے کیلئے روانہ ہو گئے۔ ادھر حق تعالیٰ نے سورہ طٰہٰ کا لشکر کمیں گاہ میں بٹھا دیا۔ جب بہن کے دروازہ پر پہنچے اور اندر سے ان کی بہن یہ آیات پڑھ رہی تھیں۔

طٰهٰ ۝ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى

" اے رسول پاک ہم نے قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ اس سے مشقت میں مبتلا ہو جائیں۔"

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہوش اڑ گئے اور شکار کرنے کی بجائے شکار ہو کر رہ گئے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ جب کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے یہ آیت پڑھی :

اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا

" تحقیق ہمارے ہاں بیڑیاں، آتش دوزخ اور گلے میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے۔"

تو آپؐ بے ہوش ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ جب کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ " بے شک تیرے رب کا عذاب آنے والا ہے اور اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔"

تو آپؓ نعرہ لگا کر بے ہوش ہو گئے اور لوگ ان کو اٹھا کر گھر لے گئے اور خوف خدا سے ایک ماہ بیمار رہے جب حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی۔

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ " ان کے لئے دوزخ کے بچھونے اور اوپر بالا پوش ہوں گے۔"

تو اس قدر روئے کہ معلوم ہوتا کہ انکی جان نکل جائے گی اس کے بعد کھڑے ہو گئے جب لوگوں نے کہا کہ استاد بیٹھ جائیں تو فرمایا کہ اس آیت کی ہیبت مجھے بیٹھنے نہیں دیتی۔ جب حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے یہ

آیت پڑھی گئی۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

"اے ایمان والو وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے۔"

تو آپ نے کہا :

"یاالٰہی ہم جو کچھ کہتے ہیں تجھ سے کہتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں تیری توفیق سے کرتے ہیں پھر ہمارا قول و فعل کہاں"۔ جب حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ "یاد کر اپنے رب کو جب بھول جائے۔"

تو کہنے لگے کہ ذکر اس وقت کیا جاتا ہے جب آدمی غافل ہو جاتا ہے یعنی غفلت کے بعد ذکر کا نمبر آتا ہے لیکن سارا جہان اس کے ذکر میں مست ہے یہ کہہ کر نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے کہ تعجب ہے اس جان پر جب کلام حق سنے اور جسم سے نکل نہ جائے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں یہ آیت پڑھ رہا تھا :

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ

"ڈرو اس دن سے جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

تو ہاتف نے آواز دی کی آہستہ پڑھو کیونکہ چار فرشتے اس کی ہیبت سے جاں بحق ہو گئے ہیں میں ایک دن حضرت شیخ ابوالعباس شقانی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ یہ آیت پڑھ کر رو رہے تھے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ "اللہ تعالیٰ نے ایسے عبد کی مثال دی جو کسی دوسرے کی ملکیت میں ہے اور کسی کام کے کرنے پر قادر نہیں۔"

وہ اس قدر روئے کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید رحلت کر گئے جب افاقہ ہوا تو

میں نے پوچھا کہ یا شیخ یہ کیسی حالت ہے آپ نے فرمایا گیارہ سال ہوئے اس مقام تک پہنچا ہوں اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

کسی نے حضرت ابوالعباس عطا رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ روزانہ کس قدر قرآن پڑھتے ہیں تو فرمایا کہ پہلے ایک دن رات میں دو ختم قرآن کرتا تھا اب چودہ سال ہوئے ہیں کہ ابھی سورہ انفعال تک پہنچا ہوں۔

ایک دفعہ حضرت ابوالعباس قصاب رحمتہ اللہ علیہ نے ایک قاری کو بار بار سورہ یوسف کی آیات پڑھنے کا حکم دیا اور پھر بارگاہ رب العزت میں یوں مناجات کیں۔

"بار خدایا میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے زیادہ ظالم ہوں اور تو یوسف علیہ السلام سے زیادہ مہربان ہے۔ لہٰذا تو میرے ساتھ ایسا سلوک کر جیسا حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کیا۔"

اس کے باوجود تمام مسلمان خواہ نیک ہوں یا بد قرآن سننے پر مامور ہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ

"جب قرآن پڑھا جائے تو خاموشی سے سنو ......"

نیز فرمایا :

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ

"میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو ہمارا کلام سنتے ہیں اور اچھی طرح اس کی پیروی کرتے ہیں۔"

یعنی اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں اور تعظیم سے سنتے ہیں نیز فرمایا :

الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ "وہ لوگ ایسے ہیں کہ جب اللہ کا

ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے قلوب پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے"۔

نیز فرمایا :

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ

"ایمان والوں کے قلوب اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں یاد رکھو کہ اللہ کے ذکر میں اطمینان قلب ہے"۔

غرضیکہ اس قسم کی آیات بہت ہیں جو اس قول کی تصدیق کرتی ہیں۔ پھر اس کے برعکس ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو قرآن سنتے ہیں اور پرواہ نہیں کرتے مثلاً خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ

"اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب اور کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے"۔

نیز فرمایا کہ قیامت کے دن اہل دوزخ کہیں گے کہ :

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ

"اگر ہم کلام حق سنتے اور سمجھتے تو آج دوزخ میں نہ ہوتے"۔

نیز فرمایا :

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً ......

"اور ان میں بعض (کلام الٰہی) سنتے ہیں لیکن ہم نے ان کے قلوب پر پردے ڈال دیئے ہیں ...."۔

نیز فرمایا :

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ

"ان کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہتے ہیں ہم نے سنا اور وہ نہیں سنتے"۔

یعنی دل سے نہ سنا اس قسم کی آیات بہت ہیں قرآن میں۔

روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور کیا میں آپ کو پڑھ کر سناؤں حالانکہ آپ پر قرآن نازل ہوا ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں دوسرے سے سننا پسند کرتا ہوں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ سننے والا کامل حال ہوتا ہے پڑھنے والے سے۔ کیونکہ قاری پر حال طاری ہو یا نہ ہو سننے والے پر حال طاری ہو جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ بولنے میں ایک گونہ تکبر پایا جاتا ہے اور سننے میں ایک گونہ تواضع۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ سورت ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورت ھود کے آخر میں یہ آیت ہے کہ :

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ "جو حکم دیا گیا ہے اس پر ثابت قدم رہو۔"

دراصل انسان حق تعالی کے احکام کی کماحقہ تعمیل سے عاجز ہوتا ہے کیونکہ بندہ توفیق الہی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ حکم سنا کہ "میرے حکم پر پورے اترو" تو آپ حیرت زدہ ہوئے اور سوچا کہ میں کس طرح احکام الہی پر پورا اتر سکتا ہوں اس سے اس قدر رنجیدہ خاطر ہوئے کہ قوت جاتی رہی اور غم روزانہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایک دن ہاتھ زمین پر ٹیک کر اٹھے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور یہ کیا حال ہے ؟ آپ تو ابھی جوان اور تندرست ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سورت ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے یعنی یہ بات سننے سے میری طاقت جاتی رہی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ :

" ایک دفعہ میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک جماعت میں بیٹھا تھا جس میں کمزور اور مفلس مہاجرین تھے جو اپنا ننگا پن چھپانے کیلئے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے اور ایک قاری قرآن پڑھ رہا تھا کہ رسول خدا صلی

اللہ علیہ و آلہ وسلم آپہنچے آپ نے سلام کہکر پوچھا کہ تم لوگ کیا کر رہے تھے ہم نے عرض کیا کہ حضور ہم قاری سے قرآن سن رہے تھے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا کئے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے نفس پر صبر کر کے ان کے پاس بیٹھوں پھر آپ ہمارے ساتھ اس طرح بیٹھ گئے کہ درمیان میں کوئی فرق نہ رہا۔ پھر آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرما کر ہمیں حلقہ بنا کر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور غریب مہاجرین کے درمیان کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ اے غریب مہاجرین میں تم کو خوشخبری سناتا ہوں کہ تم قیامت کے دن اپنے دولت مند بھائیوں سے نصف دن پہلے بہشت میں جاؤ گے اور اس دن کی مقدار پانچ سو سال ہو گی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ حضرت زرارہ رضی اللہ عنہ جو ایک جلیل القدر صحابی تھے ایک جماعت کی امامت کرا رہے تھے۔ تلاوت قرآن کے دوران انہوں نے ایک ایسی آیت پڑھی جس کی ہیبت اور جلال کی تاب نہ لا سکے اور نعرہ لگا کر گر گئے اور جاں بحق ہوئے۔

اسی طرح حضرت ابو جہیمی رضی اللہ عنہ جو تابعی تھے کے سامنے حضرت صالح مری رضی اللہ عنہ نے ایک آیت پڑھی۔ انہوں نے سن کر ایک چیخ لگائی اور فوت ہو گئے۔ حضرت ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک دن میں کوفہ کے علاقے میں ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت کو نماز پڑھتے دیکھا جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے ادب کے طور پر سلام کیا۔ اس نے کہا کیا تم قرآن جانتے ہو میں نے کہا ہاں جانتا ہوں۔ اس نے کہا ایک آیت پڑھو میں نے ایک آیت پڑھی تو چیخ مار کر گر گئی اور جاں بحق ہوئی۔

حضرت احمد بن حواری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں صحرا

میں جا رہا تھا کہ ایک نوجوان کو موٹی گدڑی پہنے ہوئے دیکھا اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ احمد اچھا ہوا آپ آگئے مجھے کچھ سماع سناؤ تا کہ جان قربان کر دوں۔ میں نے اللہ تعالٰی کے الہام سے یہ آیت پڑھی۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا .....

"جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور اس پر جم جاتے ہیں تو"۔

اس نے کہا اے احمد خدا کی قسم تم نے وہی آیت پڑھی جو اس وقت فرشتے میرے سامنے پڑھ رہے تھے یہ کہتے ہی گر گئے اور جاں بحق ہوئے۔ اس قسم کی بیشمار روایات ہیں جو اختصار کی خاطر بیان نہیں ہو سکتیں۔

اشعار کا سماع

یاد رہے کہ شعر کا سننا مباح ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سنا ہے نیز اصحاب رسولؐ نے بھی اشعار کہے بھی ہیں اور سنے بھی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ :

ان من الشعر حکمتہ "شعر میں حکمت ہے"۔

نیز فرمایا :

الحکمتہ ضالتہ المومن حیث وجدھا فھو احق بھا "حکمت مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے جہاں ملے اس کا وہ سب سے زیادہ حق دار ہے"۔

نیز فرمایا :

اصدق کلمتہ قالھا العرب قول لبید

الا کل شئی ماخلا اللّٰہ باطل
و کل نعیم لا محالتہ زائل

"ایام جہالت کا سب سے اچھا قول لبید شاعر کا ہے جس نے کہا ہے کہ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے اور ہر نعمت زوال پذیر ہے۔"

شرح اس حدیث سے صوفیاء وحدت الوجود ثابت کرتے ہیں۔ یعنی وجود حق تعالیٰ کے سوا کوئی وجود ہی نہیں۔

ترجمہ عمر بن شرید رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ کیا تم امیہ بن ابی صلت کے اشعار سنا سکتے ہو تو میں نے آپ کو شعر سنائے۔ جب ایک شعر ختم ہوتا تو آپ فرماتے کہ اور سناؤ۔ اس قسم کی بہت روایات ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اصحاب کا سماع سننا ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے متعلق بہت غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بعض لوگ تمام قسم کے اشعار کا سننا حرام سمجھتے ہیں اور دن رات مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں اور بعض لوگ تمام اشعار کو حلال سمجھتے ہیں اور دن رات محبوب کے حسن اور خدوخال کی تعریف میں غزلیں سنتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف دلائل پیش کرتے ہیں میرا مقصد نہ ان حضرات کی تائید ہے نہ تردید۔ لیکن مشائخ عظام اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول پیش کرتے ہیں۔

کلام حسنہ حسن و قبحہ قبیح

"شعر ایک کلام ہے جس کا حسن اچھا ہے اور جس کی برائی بری ہے۔"

یعنی جس چیز کا نثر میں سننا حلال ہے مثلاً حکمت کی باتیں' پند و نصائح اور ذات حق کے دلائل و شواہد ان کا نظم میں سننا بھی حلال ہے۔ اسی طرح حسن و جمال کو دیکھنا جو محل آفت ہے اور خطرناک ہے اس کا نثر و نظم دونوں میں بیان حرام ہے جو لوگ ان چیزوں کا سننا حلال سمجھتے ہیں ان کے نزدیک حسن و جمال کو

چھونا بھی حلال ہونا چاہئے اور یہ صریحاً کفر اور بے دینی ہے اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ محبوب کے حسن و خدو خال و زلف میں میں حق تعالیٰ کو دیکھتا ہوں اور حق کا طالب ہوں تو اسی طرح دوسرا شخص کہہ سکتا ہے کہ حسن مجازی کے چھونے اور قرب حاصل کرنے میں خدا کا قرب حاصل کرتا ہوں تو اس سے شریعت باطل ہو جاتی ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ **العینان تزنیان** "دونوں آنکھیں زنا کرتی ہیں" یہ حکم بھی اٹھ جائے گا اور غیر محرم عورتوں کا چھونا بھی جائز ہو جائے گا اور تمام شرعی احکام ختم ہو جائیں گے تو یہ کھلی گمراہی ہے۔

چنانچہ جب جاہل لوگوں نے صوفیاء کو سماع میں مستغرق دیکھا جو حال کی وجہ سے بے خود تھے تو انہوں نے سمجھا کہ شاید یہ لوگ خواہشات نفس سے سماع سنتے ہیں۔ لہٰذا وہ جاہل خود بھی خواہشات نفس کی وجہ سے سماع کو حلال سمجھنے لگ گئے۔ وہ یہ دلیل پیش کرنے لگے کہ اگر سماع حرام ہوتا تو صوفیاء سماع نہ سنتے۔ لہٰذا جاہلوں نے ان کے ظاہر کی تقلید اختیار کر لی اور ان کے باطنی کیفیات کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔ یہ زمانہ کی بہت بڑی آفت ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کی پوری وضاحت بعد میں آئے گی۔

فصل

خوش آوازوں اور خوش الحانی کا سننا

رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے :

زینوا اصواتکم بالقرآن "قرآن کی تلاوت خوش الحانی سے کرو۔"

نیز خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے :

يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ "زیادہ کرتا ہے پیدائش میں جیسا چاہے"۔

مفسرین کا قول ہے کہ اس سے مراد حسن صوت ہے۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے :

" جو شخص داؤد علیہ السلام کی آواز سننا چاہے وہ ابو موسیٰ اشعری کی آواز سنے۔"

احادیث میں آیا ہے کہ بہشت میں بھی اہل بہشت کو سماع سنایا جائے گا۔ وہ اس طرح کہ ہر درخت سے مختلف دلکش اور سریلی آواز سنائی دے گی۔ جب مختلف قسم کی آوازیں مل جائیں گی تو اس سے طبیعت کو لذت حاصل ہو گی۔ اس قسم کا سماع عام انسانوں بلکہ جانوروں میں پسندیدہ ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ انسان کی روح ایک لطیف چیز ہے اور لطیف کلام کو سن کر محظوظ ہوتی ہے یہ حکماء کا قول ہے جو میں نے بیان کیا ہے اسی طرح اہل علم اور محققین کے بھی اس بارے میں بہت اقوال ہیں۔ انہوں نے سریلی آوازوں کی دلکشی پر کتابیں لکھی ہیں اور خوش الحانی کی کافی تعریف کی ہے۔ چنانچہ ان کے فن (موسیقی) کے آثار آج باجوں کی شکل میں ظاہر ہیں جو انہوں نے خواہشات نفسانی اور شیطان کی پیروی میں ایجاد کئے ہیں۔ وہ یہ حکایت بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن اسحاق موصلی باغ میں گا رہا تھا اور ایک بلبل بھی گا رہی تھی۔ لیکن بلبل اس کے راگ سے اس قدر مست ہوئی کہ گر کر مر گئی۔ اس قسم کی حکایات بہت سننے میں آئی ہیں اس سے میری مراد صوفیاء کے اس قول کو بیان کرنا ہے کہ سریلی آوازوں سے تمام جاندار خوشی اور راحتِ حاصل کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں عرب

کے قبائل میں سے ایک قبیلہ کے پاس گیا اور ایک امیر کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔ وہاں ایک حبشی غلام کو دیکھا کہ زنجیروں سے جکڑا ہوا دھوپ میں تڑپ رہا ہے یہ دیکھ کر میں نے چاہا کہ امیر سے کہہ کر اس کی جان رہائی کراؤں جب کھانا آیا تو امیر بھی مہمان کی عزت کی خاطر کھانے میں شریک ہوا۔ لیکن میں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ عربوں کے نزدیک اس سے بڑی کوئی چیز نہیں کہ کوئی شخص ان کے کھانے سے انکار کرے جب اس نے مجھ سے وجہ پوچھی تو میں نے کہا مجھے آپ کے ساتھ ایک امید ہے اس نے کہا میرا سارا مال و متاع تیرا مال ہے تو کھانا کھا۔میں نے کہا مجھے تمہارے مال کی ضرورت نہیں آپ صرف اس غلام کو آزاد کر کے میری خدمت پر لگا دیں اس نے کہا پہلے اس کا جرم سن لو پھر اس کی سفارش کرنا اور جب تک تو میرا مہمان ہے میرے تمام املاک پر تجھے اختیار ہے میں نے کہا اس کا جرم کیا ہے اس نے کہا یہ غلام حدی خوان اور بہت خوش الحان ہے میں نے کچھ اونٹ دے کر اس کو غلہ لانے کیلئے بھیجا اس نے ہر اونٹ پر دو اونٹوں کا بوجھ ڈالا اور راستے میں حدی گاتا رہا جس سے مست ہو کر اونٹ دوڑتے رہے یہاں تک کہ تھوڑے عرصے میں وہ دگنا غلہ لے کر آ گیا۔ لیکن جب غلہ اونٹوں سے اتارا گیا وہ اونٹ گر کر مر گئے یہ واقعہ سنکر مجھے بہت تعجب ہوا اور میں نے امیر سے کہا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں سچ ہے لیکن مجھے اس کا ثبوت چاہئے۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ چند لوگ اونٹ لے کر آئے اور کوئیں پر ان کو پانی پلانے کا قصد کیا۔ امیر نے ان لوگوں سے پوچھا کہ کتنے دنوں سے ان اونٹوں نے پانی نہیں پیا۔ اس نے کہا تین دن سے امیر نے اس غلام کو حدی خوانی کا حکم دیا۔ جب اس نے حدی شروع کی تو اونٹ اس قدر مست ہوئے کہ پانی پینا بھول گئے یہاں تک کہ ایک ایک کر کے وہاں سے چلے گئے اس کے بعد اس نے غلام کو آزاد کر کے میرے حوالہ کر دیا۔

اور یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جب اونٹ اور گدھے کے ساتھ راستے میں کوئی شخص گانا گاتا جائے تو وہ بہت تیز رفتاری سے چلتے ہیں۔ ملک خراسان اور عراق میں شکاری لوگ رات کو ہرنوں کا شکار کرنے جاتے ہیں تو ایک باجا بجاتے ہیں اس کی آواز سن کر ہرن مست ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ اسے پکڑ لیتے ہیں۔ ہندوستان میں بعض لوگ جنگل میں جا کر ایک قسم کا گانا گاتے ہیں۔ جب ہرن ان کی آواز سنتے ہیں تو خود بخود ان کی طرف چلے آتے ہیں یہاں تک کہ مست ہو کر ہرن آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور لوگ ان کو پکڑ لیتے ہیں۔ نیز چھوٹے بچے کے سامنے جب لوری دی جاتی ہے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں اور حکماء کا قول ہے کہ اس قسم کے بچے جو لوری سے سکون حاصل کرتے ہیں بڑے ہو کر ہونہار ہوتے ہیں۔ چنانچہ ملک عجم میں جب ایک بادشاہ فوت ہوا تو اس کا دو سال کا بچہ وارث ہوا۔ لیکن اس کو تخت نشین کرنے سے پہلے وزیروں نے وہاں کے ایک حکیم بوزر جمہر سے مشورہ طلب کیا۔ حکیم نے کہا کہ بچے کے سامنے سرود کا انتظام کیا جائے۔ جب سرود شروع ہوا تو بچے نے محظوظ ہو کر ہاتھ اور سر ہلانا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر بوزر جمہر نے کہا کہ یہ بچہ سلطنت کے لائق ہے۔

غرضیکہ سریلی آواز اور خوش الحانی کے اثرات کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ سریلی آواز یا خوش الحانی اور ساز کوئی اچھی چیز نہیں تو یا تو وہ جھوٹ بولتا ہے یا منافق ہے یا وہ اس حس سے محروم ہے اور انسانوں اور صوفیوں کے زمرے سے باہر ہے۔

ایک اور طبقہ ہے جو سماع سے اس لئے منع کرتا ہے کہ یہ شریعت کے خلاف ہے لیکن تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر لہو و لعب (کھیل کود) کا سامان نہ ہو اور اس سے بدکاری کا اندیشہ نہ ہو تو سماع سننا مباح ہے (یعنی جائز) اس کے ثبوت میں بہت احادیث ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

روایت ہے کہ میرے پاس ایک لونڈی گا رہی تھی کہ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ جب اس لونڈی کو معلوم ہوا تو بھاگ گئی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تبسم کی وجہ دریافت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے پاس ایک لونڈی گا رہی تھی جب اس نے تمہیں دیکھا تو بھاگ گئی۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا جب تک کہ وہ چیز نہ سن لوں جو حضور ۔نے سنی ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے لونڈی کو بلایا تو وہ گانے لگی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سنتے رہے۔ اسی طرح بہت سے صحابہ کرام سے اس قسم کی روایات موجود ہیں۔ شیخ عبدالرحمٰن سلمیؒ نے ان سب کو جمع کرکے کتاب تیار کی ہے جس کا نام کتاب السماع ہے لور سماع کا جواز ثابت کیا ہے۔ لیکن صوفیاء کرام کی مراد سماع سے فقہی جواز یا عدم جواز نہیں ہے بلکہ ان کی غرض سماع سے روحانی فوائد کا حصول ہے۔ جواز کا طلب کرنا عوام کا کام ہے۔

ایک دفعہ میں شہر مو میں مقیم تھا۔ وہاں کے ایک عالم نے کہا کہ میں نے سماع کے جواز میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں نے کہا اس سے دین میں بڑی خرابی پیدا ہو گی کہ آپ نے ایک لہو چیز کو جائز کردیا ہے جو تمام بدکاریوں کی جڑ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ اس کو جائز نہیں سمجھتے تو پھر کیوں سنتے ہیں۔ میں نے کہا اس کے کئی وجوہات ہیں۔ اگر اس کا اثر گناہ پر آمادہ کرے تو یہ حرام ہے اگر نہ کرے تو حرام نہیں ہے۔ اگر اس کا اثر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے۔

شرح مثلاً اگر مقوی غذا کھانے سے شہوت کو ابھار آئے تو اس کا کھانا ترک کر سکتا ہے۔ اگر خطرہ پیدا نہ ہو تو کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ مقوی غذا بذات

خود حرام نہیں ہے۔

فصل

سماع کے احکام

یاد رہے کہ جس طرح لوگوں کی طبائع مختلف ہوتی ہیں سماع کے احکام ہر طبیعت کے لئے مختلف ہیں اس لئے یہ زیادتی کی بات ہے کہ ہر شخص پر ایک ہی حکم لاگو کردیا جائے مختصر یہ کہ سماع سننے والوں کے دو گروہ ہیں ایک گروہ وہ ہے جو کلام کے مطالب کو سمجھتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جس کو فقط آواز سے سروکار ہے۔ ان دونوں میں فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ سماع کا سننا اس کے اثرات پر منحصر ہے۔ اگر اثر اچھا ہوتا ہے تو اس کے لئے سماع جائز ہوتا ہے۔ اگر اثر برا ہوتا ہے تو اس کیلئے سماع ناجائز ہے۔ جس شخص کی طبیعت میں فساد ہوتا ہے سماع اس کے اندر فساد پیدا کرتا ہے۔ مثلاً حضرت داوٗد علیہ السلام کے سماع کو لیجئے۔ حق تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیفہ بنایا تو ان کو خوش الحانی کا معجزہ عطا فرمایا۔ ان کے گلے کو حق تعالیٰ نے ساز بنایا یہاں تک کہ جنگل کے جانور اور پرندے آپ کی آواز سن کر جمع ہوجاتے تھے اور بہتا ہوا پانی تھم جاتا تھا۔ روایت ہے کہ جس جنگل میں حضرت داوٗد علیہ السلام نغمہ سرائی کرتے تو ایک ماہ تک جنگل کے جانور کچھ نہیں کھاتے تھے اور بچے نہ روتے تھے نہ کھانا کھاتے تھے۔ اور آپ کی آواز سن کر کئی لوگ جاں بحق ہو جاتے تھے یہاں تک کہ ایک مرتبہ سات آدمی جن میں مرد اور عورت شامل تھے مردہ پائے گئے۔ اور بارہ ہزار بوڑھے جاں بحق ہوئے۔ حق تعالیٰ نے چاہا کہ حق کی خاطر اور ہوس کی خاطر سماع سننے والوں میں فرق کیا جائے یہ دیکھ کر شیطان نے حق تعالیٰ سے اپنی مجلس سماع قائم کرنے کی

اجازت طلب کی تو اجازت مل گئی۔ چنانچہ اس نے بانسری اور طنبور ایجاد کئے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی مجلس کے مقابلے میں اپنی مجلس قائم کی۔ یہ دیکھ کر لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے ایک نیک دوسرے بد۔ جو لوگ برے تھے انہوں نے شیطان کی مجلس کو پسند کیا اور جو نیک تھے وہ حضرت داؤد علیہ السلام کی مجلس کی طرف مائل ہوئے۔ پھر وہ لوگ جو اہل باطن تھے ان کے دل میں حق تعالیٰ کے سوا کچھ نہ تھا چنانچہ جب وہ ابلیس کے مزامیر سنتے تھے تو اسے حق تعالیٰ کی طرف سے آزمائش تصور کرتے اور جب حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز سنتے تھے تو اسے حق تعالیٰ کی ہدایت سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سب سے کنارہ کش ہوگئے اور تمام متعلقات سے علیحدہ ہوگئے اور حق کو حق سمجھا اور باطل کو باطل۔ اب جس شخص کا سماع ایسا ہو وہ جو کچھ سنے اس کے لئے حلال ہے۔ اور جھوٹے دعویداروں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ سماع ہمیں اس حقیقت کے مطابق نظر نہیں آتا جو اس کی ہے اور یہ قول محال ہے کیونکہ ولایت کا کمال یہ ہے کہ ایک ولی اللہ جیسا کہ کسی چیز کی حقیقت ہے اسی مطابق اس کو دیکھے تاکہ اس کا مشاہدہ صحیح ہو۔ اگر کوئی شخص اشیاء کو ان کی حقیقت کے مطابق نہیں دیکھ سکتا تو اس کا مشاہدہ صحیح نہیں ہے۔ کیا تجھے علم نہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ **اللّٰھم ارنا حقائق الاشیاء کماھی** (یا اللہ ہمیں حقیقت اشیاء سے آگاہ فرما جیسا کہ وہ ہیں)۔

لہٰذا جب ایک ولی اللہ ہر چیز کو اس کی حقیقت کے مطابق دیکھتا ہے تو لازماً وہ سماع کو اسی طرح جانتا ہے جو اس کی لغت اور شرع کے مطابق حقیقت ہے اور جو لوگ ہوا اور شہوت کی وجہ سے مزامیر پر شیفتہ ہوجاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت سماع کے برخلاف سنتے ہیں۔ اگر شرع کے مطابق سنتے تو گمراہ نہ ہوتے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ نضر بن حارث نے قرآن کے متعلق کہہ دیا ہے کہ

پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ لیکن کاتب وحی حضرت عبداللہ بن سعد ابی سرح رضی اللہ عنہ نے قرآن سن کر کہا کہ اللہ تعالیٰ پاک اور بابرکت ہے۔ بہترین خالق۔ بعض لوگوں نے آیہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ..... (آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں بلکہ وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے) کے غلط معنی سمجھ کر اس کو رویت باری تعالیٰ کی نفی قرار دیا۔ بعض لوگوں نے آیہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (پھر وہ عرش پر مسلط ہوا) سے حق تعالیٰ کے لئے مکان اور جہت ثابت کرنے کی کوشش کی اور بعض لوگوں نے آیہ پاک وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا سے جہت اور مکان کی دلیل پیش کی چونکہ ان کے قلوب گمراہی سے بھرے ہوئے تھے کلام حق کا سننا ان کے لئے مفید نہ ہوا۔ لیکن ایک موحد (خدا کو ایک جاننے والا) نے جب کسی شاعر کا شعر دیکھا تو شاعر کی عقل کو پیدا کرنے والے خدا تعالیٰ کے کمال کا مشاہدہ کیا اور فعل کو دیکھ کر فاعل کا اقرار کیا۔ پس ایک گروہ کلام حق سن کر گمراہ ہوا اور دوسرا گروہ باطل میں بھی سیدھے راستے پر قائم رہا۔ یہ ایسی واضح بات ہے کہ اس کا انکار کھلا مکابرہ ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل

سماع کے متعلق مشائخ کے اقوال

سماع کے متعلق مشائخ کے لطیف اقوال اس قدر زیادہ ہیں کہ اس کتاب میں پورے بیان نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ جس قدر ممکن ہوا بیان کیا جائے گا تاکہ بفضلہ تعالیٰ پورا فائدہ ہو۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" سماع حق تعالٰی کا فیضان ہے جو قلوب کو حق تعالٰی کی طرف ابھارتا ہے۔ جس نے اس کو حقیقی معنوں میں سنا حق کو پالیا اور جس نے اس کو نفسانی خواہشات سے سنا وہ گمراہ ہوا۔"

اس قول سے اس بزرگ کا یہ مطلب نہیں کہ سماع سنتے ہی وہ واصل باللہ ہو جائے گا بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ سماع کو حق تعالٰی کے قرب کے لئے سنے نہ کہ آواز کی خوبی کے لئے۔ تاکہ اس کا قلب فیضان حق سے مالا مال ہو جائے پس جس کا قلب فیضیاب ہو گا وہ صاحب کشف و مشاہدہ ہو گا۔ اور جو شخص حظ نفس کی خاطر سنے گا وہ حق تعالٰی سے محجوب ہو گا (یعنی مشاہدہ حق سے محروم ہو گا)۔

حضرت شیخ ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" سماع کا ظاہر فتنہ ہے اور باطن عبرت ہے۔ جو اہل معرفت کے اشارات کو سمجھتا ہے اس کے لئے سماع عبرت اور حلال ہے ورنہ باعث خرابی ہے"۔ یعنی جس کا دل مکمل طور پر حق تعالٰی میں غرق نہیں سماع اس کے لئے فتنہ ہے۔ حضرت ابوعلی رود باری رحمتہ اللہ علیہ سماع کے متعلق ایک سوال کا یوں جواب دیتے ہیں۔

" کاش کہ ہم اس قسم کے سماع کو ترک کرتے کیونکہ ہر چیز کا حق ہوتا ہے جب کسی چیز کا حق ادا نہ ہو تو خسارہ کی بات ہے۔"

ایک بزرگ کا قول ہے : "سماع پوشیدہ اسرار و رموز کو ابھارتا ہے۔" تاکہ قرب حق حاصل ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باطنی اسرار کا چھپا رہنا طالبان حق کے لئے بہت بری بات ہے۔ بات یہ ہے کہ اگرچہ انسان اپنے محبوب حقیقی سے جدا ہوتا ہے پھر بھی اس کی محبت اور طلب اس کے دل میں ہوتی ہے جو سماع کے

ذریعے اجاگر ہوتی ہے۔ ورنہ دب کر رہ جاتی ہے۔ اور میرے شیخ علیہ رحمہ فرماتے ہیں۔

" سماع عاشقوں کا زاد راہ ہے۔ لیکن جو خدا رسیدہ ہو گیا اس کو سماع ضروری نہیں کیونکہ واصل کے لئے سماع بلاضرورت ہے کیونکہ سننا غیب کے متعلق ایک خبر کے برابر ہوتا ہے اور جب غیب' غیب نہ رہا بلکہ حاضر ہو گیا تو پھر سننے کا کیا فائدہ ۔"

حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

" ایسے سماع کو ہم کیا کریں گے جو منقطع ہوجائے کیونکہ سماع منقطع ہوجائے تو اس کا اثر جاتا رہتا ہے۔"

اس سے ظاہر ہے ان کی ہمت کس قدر بلند تھی۔ جب بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو سارا جہان اس کے لئے سماع بن جاتا ہے اور پتھر اور مٹی سے وہ سماع سنتا ہے۔

شرح سماع کے منقطع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب سماع بند ہو تو فیضان بند ہو جائے اور سماع کے منقطع نہ ہونے سے مراد وہ بلند روحانی مقام ہے کہ جہاں سالک کو مشاہدہ دوام حاصل ہوتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی حق سے غیب نہیں ہوتا اس وقت کیا ہوتا ہے وہ ہر وقت اور ہر آن لذت مشاہدہ میں سرشار ہوتا ہے اور کائنات کی ہر آواز اس کے لئے سماع بن جاتی ہے جس سے وہ وجد دوام میں رہتا ہے اور یہ مقام بہت بلند ہے بلکہ بلند ترین مقام یہی ہے۔
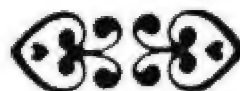
فصل

سماع کے بارے میں صوفیہ کا اختلاف

سماع کے متعلق مشائخ محققین میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ سماع جدائی کی دلیل ہے جہاں مشاہدہ مفقود ہے کیونکہ جب دوست واصل ہوتا ہے دوست کے ساتھ اور اس کی نظر دوست کے رخ انور پر ہوتی ہے تو پھر سماع یعنی دوست کے متعلق خبر کا سننا بے معنی ہوتا ہے اس لئے سماع کے شوق کا مطلب یہ ہے کہ شائق ابھی جدا ہے' واصل نہیں ہوا۔ بالفاظ دیگر سماع مبتدیوں کی علامت ہے تاکہ حالت مہجوری میں سماع کے ذریعے کچھ سکون قلب حاصل ہو۔

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ سماع مقام حضوری (وصل) کی دلیل ہے کیونکہ محبت کا خاصہ یہ ہے وہ پورا قبضہ چاہتی ہے یعنی انسان کے پورے جسم پر حاوی ہو چنانچہ جس طرح عاشق کا دل محبت کے مزے لیتا ہے' اس کا باطن مشاہدۂ حق میں سرشار ہے اور اس کا روح واصل باللہ ہے اور اس کا جسم عبادت میں مشغول ہے اس کے کان کے لئے بھی سماع سے محظوظ ہونے کی ضرورت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ سماع اس لئے آلۂ حضوری (وصل) ہے کہ ہر وقت حضوری ہی حضوری میں مستغرق رہے اور ایک لمحہ غیب ہونے (یعنی غیر حاضر ہونے) کا سوال بھی نہ ہو۔ اس لئے سماع کی دو قسمیں ہوئیں ایک یہ کہ قوال سے سماع سنے دوسرے یہ خود قول حق سنے جو سماع قوال سے سنتا ہے وہ واصل نہیں جدا ہے جو قول حق سنتا ہے وہ واصل ہے یہی وجہ ہے کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں مخلوق کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس سے کوئی بات سنوں۔ یا اس کے متعلق بات کہوں

سوائے خاصان خدا کے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شرح سماع کی جو قسمیں اوپر بتائی گئی ہیں یہ دونوں قسمیں حالت وصل اور فنا سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی قسم کا وہ سالک ہے جو واصل باللہ تو ہے لیکن اب تک اس پر حقیقت وحدت الوجود واضح نہیں ہوئی اور جو کچھ سنتا ہے غیر سے سنتا ہے اس سے اوپر وہ مقام وحدت ہے جہاں پہنچ کر ہر چیز میں اس کو ذات حق کا جلوہ نظر آتا ہے اور جب قوال سے سنتا ہے تو گویا قول حق سنتا ہے۔ اس وقت وہ قول حق کو قوال کی زبان سے سنتا ہے۔

فصل

حقیقت سماع میں بزرگوں کے مراتب کا بیان

یاد رہے کہ سماع سننے والے بزرگوں کے مختلف مدارج و مقامات ہوتے ہیں اور ہر بزرگ اپنے مقام کے مطابق سماع سے ذوق حاصل کرتا ہے۔ جس طرح کہ ایک تائب کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ جو چیز سنتا ہے اس کی ندامت میں اضافہ ہوتا ہے یا ایک عاشق ہے جس کے عشق میں ہر چیز سے اضافہ ہوتا ہے یا ایک مومن ہے جس کے ایمان میں ہر چیز سے اضافہ ہوتا ہے یا ایک مرید ہے جو ہر وقت تحقیق روح میں لگا رہتا ہے یا ایک محب ہے جو ہر چیز سے منقطع ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ سماع کی مثال آفتاب کی سی ہے جو جس چیز پر چمکتا ہے اس چیز کی صلاحیت کے مطابق اس کے اندر اثر پیدا کرتا ہے۔ ایک چیز کو وہ جلا (روشنی) دیتا ہے دوسری کو جلا دیتا ہے (یعنی خاکستر بناتا ہے)۔ کسی چیز کو وہ پگھلاتا ہے اور کسی چیز کو پالتا ہے۔ چنانچہ سماع سننے والوں کے تین گروہ ہیں۔ اول مبتدی' دوم

متوسط، سوم منتہی۔ لُمعؒ میں ہر گروہ کی سماع کی حالت علیحدہ فصل میں بیان کرتا ہوں تاکہ تم سمجھ سکو۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

فصل

یاد رہے کہ چونکہ سماع واردات حق میں سے ایک وارد ہے اور چونکہ انسان کا جسم مٹی کا ایک پتلہ یا کھلونا ہے اس کے اندر اسرار ربانی اور رموز حقانی کی استطاعت نہیں ہے اس لئے بعض لوگ سماع میں بے ہوش ہو کر جان دے دیتے ہیں یہ میرا مشاہدہ ہے۔

میں نے سنا ہے کہ روم کے ایک شفاخانہ میں ایک ایسا آلہ ایجاد کیا گیا ہے جس کا نام "انکلیون" ہے۔ یہ ایک قسم کا باجا ہے جو ہفتے میں دو بار بیمار کو سنایا جاتا ہے جس سے وہ تندرست ہو جاتا ہے اور جب کسی کو ہلاک کرنا مقصود ہو تو اس کو دیر تک سناتے ہیں جس سے وہ مر جاتا ہے۔ اگرچہ موت کا وقت مقرر ہے تاہم اس کے لئے کوئی سبب بن جاتا ہے لیکن جب طبیب لوگ وہ باجا سنتے ہیں تو وہ نہیں مرتے کیونکہ وہ اس کے عادی بن جاتے ہیں اور ہندوستان میں میں نے دیکھا کہ زہر میں ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے جو زہر سے نہیں مرتا بلکہ زہر سے زندگی حاصل کرتا ہے۔ نیز میں نے ترکستان میں ایک شہر دیکھا جہاں ایک پہاڑ میں آگ لگ گئی اور وہ جل رہا تھا اور پتھر سے نوشادر نکل رہا تھا لیکن اس آگ کے اندر ایک چوہا تھا جب وہ آگ سے باہر نکلا تو مر گیا۔ ان مثالوں کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ مبتدی کے جسم کے اندر حق تعالیٰ کے فیضان کی برداشت کی طاقت نہیں ہوتی شروع میں سماع کے وقت وہ اضطراب میں مبتلا ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کو سکون مل جاتا ہے کیا تجھے معلوم نہیں کہ شروع میں جب رسول خدا صلی اللہ علیہ

و آلہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو قابل برداشت نہ تھی لیکن بعد میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ جب وحی نہ آتی تھی تو آپؐ بے چین ہوجاتے تھے ان حکایات سے ظاہر ہے سماع میں مبتدیوں کو بے قراری ہوتی ہے لیکن منتہیوں کو قرار ملتا ہے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا ایک مرید تھا جو سماع میں بے چین ہوجاتا تھا اور دوسروں کو تنگ کرتا تھا۔ جب حضرت شیخ سے اس بات کی شکایت کی گئی تو آپ نے اس سے فرمایا کہ آئندہ اگر تم نے سماع میں بے قراری کا اظہار کیا تو تجھے اپنے پاس نہیں آنے دوں گا۔

حضرت ابو محمدؒ حریری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو سماع میں دیکھا کہ اس کے لب بند ہیں اور جسم کے ہر بن مو سے چشمے ابل رہے ہیں۔ دوسرے دن بھی بے ہوش رہا۔ معلوم نہیں آخر کیا ہوا۔

ایک دفعہ ایک شخص نے سماع میں نعرہ لگایا تو اس کے مرشد نے اس کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ لیکن اس نے مرشد کے زانو پر سر رکھا اور جاں بحق ہوا۔ شیخ ابو مسلم بیان کرتے ہیں کہ ایک درویش سماع میں بہت بے قرار ہوا کرتا تھا۔ جب کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اٹھ بیٹھو تو وہ اٹھا اور اٹھتے ہی جاں بحق ہوگیا۔

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں دریائے دجلہ کے کنارے جا رہا تھا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک محل کی چھت پر ایک لونڈی گا رہی ہے اور محل کے نیچے ایک نوجوان درویش کھڑا وہ اشعار سن رہا تھا۔ اسنے لونڈی کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ اشعار دوبارہ گائے۔ جب اس نے وہ اشعار دہرائے تو اس جوان نے نعرہ لگایا اور گر کر مرگیا۔ یہ دیکھ کر وہ امیر چھت سے نیچے اتر آیا' مردہ درویش کو دفن کرایا اور اپنا سارا مال راہ خدا میں تقسیم کر کے جنگلوں میں نکل گیا لیکن آجکل لوگوں کا یہ حال ہے دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ ہم حق کی خاطر سماع سنتے ہیں لیکن بدکاری

میں مبتلا ہوتے ہیں اور ہلاک ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ کسی نے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ کیا ہم اس خیال سے گرجا جاسکتے ہیں کہ عیسائیوں کی ذلت دیکھیں اور عبرت حاصل کریں اور اپنے ایمان کا شکریہ ادا کریں۔ آپ نے فرمایا ہاں اس شرط پر جاسکتے ہو کہ جب تم گرجا سے باہر آؤ تو چند لوگوں کو وہاں سے لاکر مسلمان بنا دو ورنہ نہیں جاسکتے غرضیکہ جب ایک عبادت گزار شراب خانے چلا جائے تو شرابی بن جاتا ہے اور جب ایک شرابی درویش کے ساتھ جاتا ہے تو عبادت گزار بن جاتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں بغداد میں ایک درویش کے ساتھ جا رہا تھا ہم نے ایک گانے والے کو ایک شعر گاتے ہوئے سنا۔ اس درویش نے شعر سنتے ہی نعرہ مارا اور جاں بحق ہوگیا۔ اسی طرح حضرت ابو علی رودباریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک درویش کو دیکھا کہ ایک شخص کا گانا سن رہا تھا ایک شعر پر اس نے نعرہ لگایا اور مرگیا۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ پہاڑ کا سفر کر رہا تھا۔ میرے دل میں جذبہ پیدا ہوا اور میں نے ایک شعر پڑھا۔ یہ سن کر حضرت شیخ نے فرمایا کہ پھر پڑھو۔ جب میں نے دوبارہ پڑھا تو آپ پر وجد طاری ہوگیا اور اس زور سے پتھر پر پاؤں مارا کہ پاؤں پتھر میں اس طرح دھنس گیا جیسے موم میں۔ اس کے بعد آپ بے ہوش ہوگئے۔ جب ہوش آیا تو فرمایا کہ میں بہشت کے باغوں کی سیر کر رہا تھا۔

اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک درویش آذربائیجان کے پہاڑوں میں جا رہا تھا اور چند اشعار پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس کی حالت متغیر ہوگئی اور پتھر کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھا تو اس کی جان نکل گئی۔ رحمتہ اللہ علیہ۔

فصل

مشائخ کا ایک گروہ قصائد و اشعار کا سننا اور قرآن کو ایسی خوش الحانی سے پڑھنا کہ حروف کا مخرج صحیح نہ رہے مکروہ سمجھتا ہے اور مریدین کو اس سے پرہیز کی ہدایت کرتا ہے خود بھی سختی سے پرہیز کرتا ہے۔ ان مشائخ کے بھی آگے کئی گروہ ہیں اور ہر گروہ نے اور ہی دلیل پیش کی ہے۔

ایک گروہ وہ ہے جس کے پاس سماع کی حرمت کے متعلق کئی روایات ہیں یہ حضرات سلف صالحین کے تبع اور مقلد ہیں۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی خادمہ شیریں کو گانے پر تنبیہہ کرنا' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس صحابی کو چابک لگانا جو گا رہا تھا' اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر اس وجہ سے اعتراض کرنا کہ ان کے پاس گانے والی لونڈیاں تھیں۔ نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اس حبشی عورت کے دیکھنے سے منع فرمانا جو گا رہی تھی اور یہ فرمانا کہ وہ شیطان کی ساتھی ہے وغیرہ۔ مشائخ کا یہ گروہ کہتا ہے کہ ہماری سماع کو کمزور کہنے میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں اور اس سے پہلے کے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے یہاں تک کہ ایک گروہ نے اسے مطلق حرام قرار دیا ہے اور اس بارے میں وہ ابوالحارث بنانی کی روایت پیش کرتے ہیں کہ میں سماع بہت شوق سے سنتا تھا۔ ایک رات ایک شخص میرے دروازے پر آیا اور کہنے لگا کہ حق تعالیٰ کے عشاق کی ایک جماعت آپ کے دیدار کی منتظر بیٹھی ہے اگر تکلیف نہ ہو تو تشریف لے چلیں۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک جماعت پر پہنچے جنہوں نے ایک مرد پیر کے گرد حلقہ باندھ رکھا تھا۔ انہوں نے میری بہت تعظیم کی۔ اس بزرگ نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو

کچھ شعر پڑھے جائیں۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ چنانچہ دو آدمیوں نے خوش الحانی سے اشعار پڑھنا شروع کئے یعنی ایسے اشعار جو عام طور پر ہجر و فراق کے متعلق ہوتے ہیں۔ ان اشعار کو سن کر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور نعرے مارنے لگے اور لطیف اشارات کرنے لگے یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا اور وہ لوگ صبح تک اسی حالت میں رہے۔ اس وقت اس بوڑھے نے کہا کہ یا شیخ آپ نے مجھ سے یہ دریافت نہیں کیا کہ میں کون ہوں اور یہ جماعت کن لوگوں کی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کے رعب کی وجہ سے میں سوال نہیں کرسکا اس نے کہا کہ میں عزازیل ہوں جو ابلیس کے نام سے مشہور ہے اور یہ لوگ میری اولاد ہیں۔ میرے اس عمل میں دو فوائد ہیں ایک تو میں اپنی سابقہ بزرگی پر آنسو بہاتا ہوں دوسرے اس سے میں عابد لوگوں کو گمراہ کرتا ہوں۔ ابوالحارث کہتے ہیں اس کے بعد سماع کی محبت میرے دل سے جاتی رہی۔

اور میں یعنی علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ میں نے شیخ ابوالعباس اشقانی رحمتہ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ سماع میں مشغول تھے اور میں نے ان کے درمیان جنات کو برہنہ ناچ کرتے دیکھا اور تمام لوگ ان کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔

شرح صالحین کے مندرجہ بالا گروہ نے سماع کو مکروہ کہا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ نے اگرچہ حرام بھی کہا لیکن گانا کئی قسم کا ہوتا ہے۔ احادیث میں بھی بری قسم کے گانوں کی ممانعت آئی ہے اور آج کل بھی اچھے گانے بھی ہو رہے ہیں اور برے بھی ہو رہے ہیں۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ برے گانوں کی وجہ سے اچھے کلام کو بھی ترک کردیا جائے۔ جیسے دودھ' آٹے اور گھی وغیرہ میں ملاوٹ کی وجہ سے مطلقاً ان چیزوں کا استعمال ترک نہیں کیا جاتا بلکہ صحیح اشیاء کو تلاش کرلیا جاتا ہے اور یہ جو ابوالحارث نے شیطان کی مجلس سماع دیکھی تو تی

الواقع یہ شیطان کی مجلس تھی لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تمام مجالس سماع ایسی ہوتی ہیں جن میں بڑے بڑے مشائخ اور صحابہ کرام نے شرکت فرمائی ہے اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اچھی قسم کا سماع سننا احادیث میں ثابت ہے۔ جن مشائخ نے سماع کی بعض اقسام کو مکروہ کہا ہے وہ انہوں نے یا تو احتیاط کی وجہ سے کہا ہے یا ان کی طبیعت کے خلاف تھا کیونکہ ہر شخص کی اپنی طبیعت ہوتی ہے اور پسند اور ناپسند مختلف ہوتی ہے۔ بعض خاموش طبع اور زاہد خشک ہوتے ہیں اور شعر و سخن کو پسند نہیں کرتے' بعض کا مزاج عاشقانہ ہوتا ہے جو شعر و سخن کو پسند کرتے ہیں اس طرح صحابہ کرام میں سے بھی بعض شعر و سخن کو پسند کرتے تھے' بعض خاموش طبع ہونے کی وجہ سے اس سے پرہیز کرتے تھے چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خاموش طبع تھے اس لئے سلسلہ نقشبندیہ جو ان سے جاری ہوا کے اکثر مشائخ سماع نہیں سنتے لیکن سماع کو حرام بھی نہیں کہتے اور تاریخ کی کتابوں سے ثابت ہے کہ بعض مشائخ نقشبندیہ علیہم رحمہ نے سماع سنا ہے۔ اسی طرح حضرت داتا صاحب علیہ رحمہ نے بھی اچھے سماع کو اچھا کہا ہے اور برے کی مذمت فرمائی ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے سردار حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ سماع کے متعلق فرماتے ہیں کہ "من نہ انکار کنم نہ ایں کار کنم" (یعنی میں نہ سماع کو حرام کہتا ہوں نہ سنتا ہوں)۔

ترجمہ ایک گروہ مشائخ کا ایسا ہے جس نے اپنے مریدین کو گمراہی سے بچانے کی خاطر سماع سے پرہیز کیا تاکہ وہ ان کی تقلید میں معصیت میں مبتلا نہ ہوجائیں' توبہ کا خیال چھوڑ دیں اور ان کی نفسانیت کو قوت نہ ہو۔ وہ سماع کے قائل نہیں تھے اور نہ سماع سنا۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے ایک مرید سے سماع سے توبہ کرائی اور فرمایا کہ تو اگر اپنا دین سلامت رکھنا چاہتا ہے تو توبہ کر

اور سماع جو صوفی لوگ سنتے ہیں اس سے پرہیز کر۔ جب تک تو جوان ہے اپنے آپ کو سماع کا اہل نہ سمجھ اور جب تو بوڑھا ہوجائے تو دوسروں کو اپنی مثال سے گنہگار نہ کر۔

شرح اس کے ساتھ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے اقوال سماع کی اباحت میں بھی مشہور ہیں ہوسکتا ہے کہ ان کا وہ خاص مرید سماع کا اہل نہ ہو۔ جیسے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے جو خود سماع نہیں سنتے تھے اپنے ایک نوجوان مرید کو سماع سننے کا حکم دیا کیونکہ اس مرید کی طبع میں سماع کا ذوق تھا اور سماع نہ سننے کی وجہ سے اس کی روحانی ترقی میں رکاوٹ ہو رہی تھی۔

ترجمہ بعض کے نزدیک سماع کے دو گروہ ہیں ایک لاہی دوسرا الٰہی۔ لاہی (یعنی کھیل کود والے) عین فتنہ میں مبتلا ہیں اور یہ لوگ خوف زدہ رہتے ہیں (اپنے گناہوں کی وجہ سے)۔ دوسرا گروہ جو الٰہی ہے وہ لوگ ریاضات و مجاہدات میں مشغول رہتے ہیں۔ مخلوقات سے تعلق نہیں رکھتے تاکہ فتنوں میں مبتلا نہ ہوں' اس لئے وہ بے خوف ہوتے ہیں کیونکہ وہ نہ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں نہ اس سے۔ سب سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔

ایک اور گروہ ہے جو اس لئے سماع سے پرہیز کرتا ہے تاکہ عوام ان کی وجہ سے گنہگار نہ ہوں اور ان کے عقائد خراب نہ ہوں۔ یہ طریقہ بھی بہت اچھا ہے کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

"اچھا مسلمان وہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دے جن کی ضرورت نہ ہو۔" کیونکہ غیر ضروری اور بے فائدہ باتوں میں مشغول ہونا وقت کا ضائع کرنا ہے۔ چنانچہ دوست ایک دوسرے کا وقت ضائع نہ کریں۔

اور صوفیوں کے ایک خاص گروہ کا کہنا ہے کہ سماع خبر ہے اور اس کی

لذت مراد کا پالینا ہے۔ لیکن یہ بچوں کا کام ہے کیونکہ جب مشاہدہ حاصل ہوگیا تو پھر خبر کی کیا قدر۔ اصل چیز مشاہدہ ہے۔

شرح صوفیاء کے اس گروہ نے صحیح فرمایا ہے کہ اصل چیز مشاہدہ ہے اور ہجرو فراق کی وجہ سے سماع سننا اس وقت تک ضروری ہے جب تک مشاہدہ حاصل نہ ہو۔ جب ہجرو فراق وصل میں تبدیل ہوگیا تو پھر واویلا اور سوز و گداز کیسا۔ لیکن قرب اور وصل کے بھی بیشمار مراتب ہیں اس لئے بعض مشائخ حالت وصل میں بھی وصل کا کلام سن کر محفوظ ہوتے ہیں اور مراقبہ فنا کی مزید در مزید گہرائیوں میں چلے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ فنا فی اللہ یا بالفاظ دیگر سیر فی اللہ کی کوئی حد نہیں۔ جتنی منازل طے کی جائیں ان سے آگے اور منازل ہیں۔ علاوہ ازیں بعض حضرات جو مقام بقاباللہ حاصل کرلیتے ہیں وہ بیک وقت فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہوتے ہیں۔ اس مقام کو جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے جامعیت' عبدیت' عبودیت' نزول وغیرہ جیسے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس مقام کا سالک بیک وقت واصل بھی ہوتا ہے اور مہجور بھی۔ اس لئے سماع میں وہ حضرات کلام ہجرو فراق سے بھی محفوظ ہوتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں نیز کلام وصل و فنا سن کر بھی مزید منازل طے کرتے ہیں البتہ بعض حضرات ایسے ہوتے ہیں جو عمر کے آخری چند سالوں میں ہدایت خلق سے فراغت پاکر اور خلفاء مقرر کر کے ذات حق میں شاغل ہو جاتے ہیں یعنی ایک کے ساتھ ایک ہو جاتے ہیں اس آخری قسم کے مقام کو فردانیت کہا جاتا ہے اور اس مقام کے سالک کو فرد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ بلند ترین مقام ہے اس مقام پر سماع سننا محال ہوجاتا ہے اور جیساکہ ایک بزرگ نے حضرت داتا علیہ رحمہ سے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ سماع اور کوے کی آواز تمہارے لئے برابر ہوگی۔ اس وقت سے وہی مقام فردانیت مراد ہے جہاں پر خورد و نوش اور نوم وغیرہ بھی مفقود ہوتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ اس

مقام کو کتاب "شرح تعرف" میں یوں بیان فرمایا گیا ہے :

تفرد بالله فريد فريد
فظل وحيد والمشوق وحيد

چنانچہ حضرت مخدوم علی ہجویری قدس سرہ' العزیز اسی بلند ترین مقام سے کلام فرمارہے ہیں۔

فصل

وجد 'وجود اور تواجد کے بیان میں

یاد رہے کہ وجد اور وجود دو مصدر ہیں ایک کا مطلب ہے غم۔ دوسرے کا معنی ہے پالینا۔ لیکن فاعل دونوں کا ایک جیسا ہے (واجد) اس لئے کہ ان کے درمیان فرق کا سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے صوفیاء کرام جب وجد اور وجود کے الفاظ بیان کرتے ہیں تو ان کی مراد دو حال ہوتے ہیں جو ان کو سماع میں پیش آتے ہیں۔ اول حالت نایافت یعنی غم' دوم حالت یافت (یعنی وصال)۔ حالت غم جدائی کی وجہ سے طاری ہوتی ہے اور حالت یافت وصال کے وقت۔ حزن اور وجد (اگرچہ ہم معنی ہیں) انکے درمیان یہ فرق ہے کہ حزن اس غم کا نام ہے جس کا تعلق انسان کے اپنے ساتھ ہو اور وجد اس غم کا نام ہے جس کا تعلق دوسروں سے ہو۔ یہ دونوں صفات طالبان حق کی ہیں جو تغیرپذیر ہوتی ہیں کبھی کیسی' کبھی کیسی لیکن ذات حق تغیرپذیر نہیں۔

اور کیفیت وجد کا بیان کرنا الفاظ میں نہیں آتا۔ وجد کا بیان کرنا اس لئے مشکل ہے کہ یہ وہ الم (غم) ہے جو حالت وصل میں طاری ہوتا ہے۔ کسی نے

خوب کہا ہے "الم کو قلم سے بیان نہیں کیا جاسکتا"۔ بس وجد ایک راز ہے طالب اور مطلوب کے درمیان جس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس طرح یا اس طرح ہے۔ کیونکہ یہ ایک طرب (حالت انبساط) ہے جو مشاہدۂ حق کے وقت پیدا ہوتی ہے اور طرب کو طلب (جدائی) میں نہیں محسوس کیا جاسکتا۔ پس وجود (وصال) محبوب کا فضل ہے محب پر جس کا الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ میرے نزدیک وجد وہ غم ہے جو یا تو خوشی کی حالت سے پیدا ہوتا ہے یا مایوسی کی حالت سے۔ اور وجود کا نام ہے غم کے مٹ جانے کا دل سے اور پالینا مراد کا۔ اور واجد وہ ہے جو یا تو جدائی اور حجاب کی حالت میں تڑپتا ہے یا وصال کی حالت میں سکون حاصل کرتا ہے۔ مشائخ کا اس بات پر اختلاف ہے کہ آیا کمال وجد میں ہے یا وجود میں۔ بعض مشائخ کا خیال ہے کہ وجود مریدوں کی صفت ہے اور وجد عارفین کی (یعنی وجود مبتدیوں کا مقام ہے اور وجد **منتہیوں** کا) اب چونکہ مریدین سے عارفین کا مقام زیادہ بلند ہے اس لئے وجد افضل ہے وجود سے۔ اس وجہ سے کہ جو چیز حاصل کی جاسکتی ہے وہ قابل ادراک ہوتی ہے اور ہم جنس ہوتی ہے اور ادراک کا تقاضا حد سے ہے لیکن حق تعالیٰ بے حد (لا محدود) ہے۔ پس جو کچھ بندہ حاصل کرتا ہے وہ محض ایک ذائقہ کی طرح ہے اور جو چیز کہ حاصل نہیں کی جاسکتی اور جس سے بندہ عاجز آجاتا ہے وہ ہے حقیقت جو سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں ہوسکتی۔

ایک گروہ کے نزدیک وجد سے مراد مریدین (مبتدی) کا سوز و گداز ہے اور وجود سے مراد کاملین کا انعام ہے اور چونکہ کاملین کا درجہ مریدین سے زیادہ بلند ہے مرید کے سوز و گداز سے کاملین کا سکون زیادہ افضل ہے۔ یہ بات مندرجہ ذیل حکایت سے جلدی سمجھ میں آجائے گی۔

حکایت ایک دفعہ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ غلبہ حال کی حالت میں حضرت

جنید رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے تو حضرت شیخ کو غمگین پایا۔ جب آپ سے دریافت کیا کہ یا شیخ یہ کیا حال ہے ؟ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ **من طلب وجد۔** (جس نے طلب کیا وہ غمگین ہوا) اس پر شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا **لا بل من وجد طلب** (نہیں بلکہ جو غمگین ہوا اس نے پایا)۔

اس مضمون پر مشائخ نے بہت گفتگو کی ہے کیونکہ ایک بزرگ نے وجد کی نشاندہی فرمائی ہے اور دوسرے نے وجود کی۔ لیکن میرے نزدیک قول جنید رحمتہ اللہ علیہ زیادہ معتبر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بندہ کو معلوم ہے کہ اس کا مطلوب اس کا ہم جنس نہیں تو اس کا غم و اندوہ اور بھی زیادہ ہوتا ہے اس کی وضاحت پہلے بھی اس کتاب میں ہو چکی ہے۔ غرضیکہ اس بات پر تمام مشائخ متفق ہیں کہ غلبہ علم، غلبہ وجد سے زیادہ قوی ہے اس لئے کہ جب وجد کا غلبہ ہوتا ہے انسان محل خطر میں ہوتا ہے اور جب علم کا غلبہ ہوتا ہے انسان محل امن میں ہوتا ہے اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ طالب کو چاہئے کہ تمام احوال (کیفیات) میں پابند علم و شرع رہے کیونکہ جب وجد کی وجہ سے مغلوب الحال ہوتا ہے تو اس کا شعور ختم ہو جاتا ہے (یعنی بے شعور ہو جاتا ہے) اور جب بے شعور ہوتا ہے تو سزا و جزا مرفوع ہو جاتی ہے چنانچہ اس وقت وہ مجانین (جمع مجنون) کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے نہ کہ اولیاء و مقربین کے زمرہ میں۔ لیکن جب علم، حال پر غالب ہوتا ہے تو بندہ حدود اوامر و نواہی (شرع) میں ہوتا ہے اور باعزت و باوقار اور شکرگزار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب بندہ مغلوب الحال ہوتا ہے تو حدود شرع سے باہر اور عزت و وقار سے محروم ہوتا ہے اور یہ حالت نقص و معذوری ہے اور مغروری بھی۔ چنانچہ عین اسی کے مطابق حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ راستے صرف دو ہیں۔ علم و عمل۔ وہ عمل جو علم کے بغیر ہو اگرچہ نیک ہو جہل ہے اور خام ہے۔ اور وہ علم جو عمل کے بغیر ہو پھر بھی باعث

عزت و شرف ہے۔ چنانچہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق فرمایا ہے کہ :

" شبلی مست ہے اگر ہوشیار ہوجائے تو ایسا امام ہوگا جس سے خلقت فائدہ اٹھائے گی۔"

شرح یہاں مست سے مراد مغلوب الحال ہے جو مقام فنا فی اللہ کا خاصہ ہے لیکن مقام بقا باللہ میں ہوشیاری ہی ہوشیاری ہے۔ چنانچہ اولیائے امت کی زبردست اکثریت کا مقام بقا باللہ رہا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فنا جس سے مراد وصل ہے سے محروم ہوجاتے ہیں بلکہ اصحاب بقا بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتے ہیں اور باقی باللہ بھی۔ جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس مقام کو جامعیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یعنی عبدیت اور الوہیت یا نزول و عروج کا حسین امتزاج ہے۔ اس مقام پر سالک بیک وقت واصل بھی ہوتا ہے اور مہجور بھی جیساکہ عارف شیرازی شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

عجب ایں نیست کہ سرگشتہ بود طالب دوست
عجب این است کہ من واصل و مہجورم

(تعجب کی یہ بات نہیں کہ عاشق سرگشتہ اور حیران ہوتا ہے تعجب کی بات یہ ہے کہ میں بیک وقت واصل بھی ہوں مہجور بھی)

ترجمہ روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ محمد بن مسروق رحمتہ اللہ علیہ اور ابوالعباس بن عطا رحمتہ اللہ علیہ اکٹھے سماع سن رہے تھے اور قوال کے شعر پر وجد کررہے تھے لیکن حضرت جنیدؒ سکون سے بیٹھے تھے۔ چنانچہ باقی حضرات نے پوچھا کہ یا شیخ آپ کو اس سماع سے وجد نہیں آیا تو آپ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی۔ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً .....

" اور تو پہاڑوں کو دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ یہ جامد کھڑے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح تیزی سے چل رہے ہیں"۔

لیکن تواجد کیا ہے تکلف اور کوشش سے وجد کو لانا ہے حق تعالیٰ کی نوازشات و انعامات کو یاد کر کے۔ نیز ایک گروہ ایسا ہے جو رسم کا پابند ہے۔ وہ صرف صوفیوں کی ظاہری حرکات اور رقص وغیرہ اور ان کے اقوال کی تقلید کرتے ہیں اور یہ بالکل ناجائز ہے۔

ایک اور گروہ صوفیائے محققین کا ہے جو ان حرکات اور رسوم کے ذریعے مشائخ عظام کے بلند درجات اور مقامات کے طلبگار ہیں۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا ارشاد ہے :

من تشبہ بقوم فھو منھم "جس نے کسی قوم کی مشابہت کی اسی کا ہوا"۔

نیز آپ نے فرمایا :

"جب تم قرآن پڑھو تو گریہ کرو گریہ نہ آئے تو کوشش سے گریہ کرو"۔ اس حدیث کے مطابق کوشش کر کے وجد کرنا جائز ہے۔ یہی وجہ ہے ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ میں ہزار قدم جھوٹ کے ساتھ چلوں تو ممکن ہے ایک قدم سچ کا ہو جائے۔

شرح حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے اوپر جو آیت قرآن پاک نقل فرمائی ہے اس سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پہاڑ بظاہر خاموش کھڑے ہیں لیکن دراصل گردش کر رہے ہیں' اسی طرح میں بھی بظاہر خاموش ہوں لیکن میرے اندر طوفان برپا ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے پہاڑوں کی گردش سے کیا مراد لی ہے۔ اگرچہ کرۂ ارض کا سورج کے گرد گردش کرنا زمانہ حال میں اہل

مغرب کو معلوم ہوا۔ اہل معرفت کو کئی صدیاں پہلے یہ بات معلوم تھی کہ زمین گردش کر رہی ہے اور اس کے ساتھ پہاڑ بھی گردش کر رہے ہیں۔

فصل

رقص اور اس کے متعلقات کے بیان میں

یاد رہے کہ شریعت اور طریقت میں رقص کی کوئی اصل نہیں ہے کیونکہ یہ تمام عقلاء کے نزدیک اگر اچھی طرح کیا جائے تو لہو ہے اور بری طرح کیا جائے تو لغو ہے اور مشائخ عظام میں سے کسی نے اس کو اچھا نہیں سمجھا اور نہ اس میں غلو (زیادتی) کی ہے فرقہ حشویہ نے اس کے متعلق جتنے دلائل پیش کئے ہیں وہ سب باطل ہیں لیکن پھر بھی بیہودہ لوگوں نے اس کی تقلید کی ہے اور اس میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ بلکہ اس کو مذہب بنا دیا ہے۔ میں نے عوام کا ایک گروہ دیکھا ہے جو یہ کہتا ہے کہ تصوف رقص کا نام ہے۔ ایک گروہ ہے جو اس کی حقیقت ہی کا منکر ہے غرضیکہ رقص کرنا شرعاً" اور عقلاً" برا ہے اور ناممکن ہے کہ افضل لوگ اس کو اچھا سمجھیں۔

لیکن جب کلام سننے سے دل میں جوش اور دماغ میں خروش (خفقان) پیدا ہو اور سخت اضطراب کی حالت میں انسان بے قابو ہوجائے تو یہ اور بات ہے یہ رقص نہیں بلکہ جا نگدازی اور جان کنی کا وقت ہوتا ہے اور جو شخص اس کو رقص کہتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ دراصل یہ ایک حال ہوتا ہے جس کو زبان سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جس نے اس کا مزہ نہیں چکھا وہ اسے سمجھ نہیں سکتا۔

لڑکوں پر نظر کرنا

نوجوان لڑکوں (کے حسن و جمال) کو دیکھنا یا ان کی صحبت اختیار کرنا بری بات ہے اور جو اس چیز کو جائز رکھتا ہے غلط رکھتا ہے اور جو دلائل اس بارے میں پیش کرتے ہیں سب باطل ہیں۔ میں نے جاہلوں کا ایک گروہ دیکھا ہے جو اولیاء کرام سے یہ جرم منسوب کرتے ہیں اور اس وجہ سے ان کے منکر ہوتے ہیں حالانکہ مشائخ عظام نے ان باتوں کو آفت قرار دیا ہے اور یہ چیز (حسن پرستی) حلولیوں کا مذہب ہے اللہ ان پر لعنت بھیجے۔

شرح حلولی سے مراد وہ لوگ ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان میں اتر آتے ہیں۔ یہ عقیدہ عام طور پر بدھ' ہندو اور عیسائی مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ ہندو' رام کرشن کو اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا اوتار بلکہ خدا مانتے ہیں لیکن اولیائے اسلام نے حلول و اتحاد دونوں کی مذمت کی ہے۔ اتحاد کا مطلب بھی وہی ہے کہ خدائے بزرگ لوگوں کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے۔ یہ عقائد اسلامی توحید کے خلاف ہیں۔ عام طور پر لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ عقیدہ وحدت الوجود کو بھی کم فہم لوگ حلول سمجھتے ہیں حالانکہ حلول اور وحدت الوجود کے درمیان بہت فرق ہے۔ عقیدہ حلول وحدت الوجود کی رو سے بھی غلط اور کفر ہے مثلاً وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا وجود' وجود حق تعالیٰ میں شامل ہے کوئی الگ وجود نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر چیز خدا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز خدا نہیں لیکن کوئی چیز خدا سے جدا بھی نہیں ہے۔ مثلاً زید کا ہاتھ زید سے جدا نہیں ہے لیکن ہاتھ کو زید نہیں کہا جاسکتا۔ بالفاظ دیگر جز کو کل کا درجہ نہیں دیا جاسکتا حلول کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی شخص یا بت میں اتر آیا ہے۔ یہ عقیدہ وحدت الوجود میں اس لئے

ناجائز اور غلط ہے کہ اس سے دو وجود لازم آتے ہیں حالانکہ عقیدہ وحدت الوجود کی رو سے وجود ایک ہے جو حق تعالیٰ کا وجود ہے باقی تمام اشیائے کائنات اسی ایک وجود میں شامل ہیں ان کا علیحدہ کوئی وجود نہیں۔ اگر ان کا خدا سے علیحدہ وجود تسلیم کیا جائے تو شرک لازم آتا ہے اور خداوند تعالیٰ کا وجود محدود ہو جاتا ہے کیونکہ اگر کائنات یا اشیائے کائنات کا وجود خداوند تعالیٰ کے وجود سے علیحدہ اور خارج ہے تو پھر وجود حق محدود ہو جاتا ہے یعنی کائنات میں نہیں باقی ہر جگہ ہے اس سے محدودیت لازم آتی ہے حالانکہ اسلام میں خداوند تعالیٰ کا وجود لامحدود ہے اور لامحدود کو محدود قرار دینا کفر ہے۔ چنانچہ گفتگو اس بات سے شروع ہوئی تھی کہ حلولی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خوبصورت لڑکوں کے اندر خدا اتر آیا ہے یہ حلول ہے جو کفر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وجود ایک ہے جو وجود باری تعالیٰ ہے باقی تمام اشیائے کائنات کا وجود ظلی' وہمی اور اضافی ہے حقیقی نہیں اور وجود باری تعالیٰ میں شامل ہے جیسے سمندر کی موجیں' لہریں' جھاگ' بلبلے اور برف کے ٹکڑے دراصل سمندر ہی تو ہے۔ لہٰذا حسن بشری کو خدا تعالیٰ کی قدرت کا جلوہ کہا جا سکتا ہے' خدا نہیں کہا جا سکتا۔

آداب سماع

یاد رہے کہ سماع کے آداب یہ ہیں۔

۱۔ جب تک سماع کی ضرورت محسوس نہ ہو نہ سنا جائے۔

۲۔ اس کو عادت نہ بنایا جائے۔

۳۔ سماع کافی وقفوں کے ساتھ سنا جائے تاکہ اس کی عظمت دل سے نہ اٹھ جائے۔

۴۔ محفل سماع میں اہل سماع کے شیخ یعنی پیر کا موجود ہونا ضروری ہے۔

۵۔ محفل سماع میں عوام کا گزر نہ ہو۔

٦۔ قوال باوقار ہو۔ (باحرمت باشد)۔

۷۔ سامعین کا دل دنیاوی خیالات سے پاک ہو یعنی سماع کے وقت طبیعت کھیل تماشے کی طرف راغب نہ ہو۔

۸۔ تکلف سے کام نہ لیا جائے بلکہ جب طبیعت آمادہ ہو اس وقت سنے۔

۹۔ جب کیفیات کا غلبہ ہو تو کوشش سے اسے دبانا نہیں چاہئے اور جب غلبہ نہ ہو تو کوشش سے اسے ابھارنا نہیں چاہئے بلکہ حالت کے تابع رہنا چاہئے۔

۱۰۔ اگر طبیعت ہلنے کا تقاضا کرے تو ہلو ورنہ خاموش رہو اور یہ کہ طبیعت کے زور اور وجد کی خواہش میں تم فرق سمجھ سکو۔

۱۱۔ سماع سننے والے کے اندر اتنی قابلیت ہو کہ مشاہدۂ حق اور فیضان حق کو قبول کر سکے اور جب فیضان حق کا غلبہ ہو تو کوشش سے اسے کم نہ کرے اور غلبہ کم ہو تو تکلف سے اسے نہ ابھارے۔

۱۲۔ جب اس پر حال طاری ہو جائے تو نہ کسی سے امداد طلب کرے اور نہ امداد دینے والے کی امداد کو رد کرے۔

۱۳۔ اگر قوال کا کلام اچھا ہے تو اس کی تعریف نہ کرے اگر برا ہے تو مذمت نہ کرے اور نہ کسی شعر کو ناموزوں کہے۔ اس سے دل میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی نہ کہے کہ اچھی طرح پڑھو۔ اور دل میں اس کے خلاف جھگڑا نہ کرے قوال کو درمیان میں نہ دیکھے بلکہ خدا کے حوالہ کر دے۔ اور اچھی طرح سنے۔

۱۴۔ اگر کسی پر حال طاری ہو اور خود اس پر طاری نہ ہو تو اپنی محرومی پر غور کرے تاکہ اس کو بھی اس سے حصہ ملے۔

اور میں علی بن عثمان الجلابی یہ سمجھتا ہوں کہ مبتدی کو سماع سے روکا جائے تاکہ اس کی طبیعت پریشان نہ ہو۔ نیز ان عورتوں کو جو مکانوں کی چھتوں پر

بیٹھتی ہیں ان کی وجہ سے سماع سننے والوں پر حجاب پڑ جاتے ہیں۔ نیز امردوں (یعنی بے ریش بچوں) کو بھی شامل نہیں کرنا چاہئے۔ اس کو جاہل صوفیوں نے اپنا مذہب بنا لیا ہے۔ خداوند تعالیٰ ہم سب کو ان خرابیوں سے بچائے۔ (آمین)۔

شرح جاہل صوفیوں نے اس کو اپنا مذہب بنا لیا ہے۔ یعنی حسن پرستی کو مذہب بنا لیا ہے۔ جو غیر شرع ہے غیر اللہ سے دل لگانا باعث حجاب ہوتا ہے نہ کہ باعث وصال حق۔ کوچہ تصوف میں عشق مجازی کو ترک کرنا پڑتا ہے تاکہ عشق حقیقی غالب آجائے۔ (سب توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے)۔

شرح کشف المحجوب تمام شد

فہرست قرآنی آیات

آیت	نمبر آیت	صفحہ
ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ـ ـ ـ	۳	۸۳۲
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۲۹	۴۱
" " " " ـ ـ ـ ـ ـ ـ	//	۱۴۸
" " " " ـ ـ ـ ـ ـ ـ	//	۴۵۱
" " " " ـ ـ ـ ـ ـ ـ	//	۶۷۲
" " " " ـ ـ ـ ـ ـ ـ	//	۸۹۵
اِلَّا عِبَادَكَ ..... ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۴۰	۳۳۶
اِنَّ عِبَادِيْ .... ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۴۲	۵۸۷
" " " " ـ ـ ـ ـ ـ ـ	//	۸۹۶
۱۶ سُوْرَةُ النحل		
ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ ـ ـ ـ ـ	۷۵	۱۶۹ / ۹۳۶
اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ـ ـ ـ ـ ـ	۹۰	۸۳۴
مَا عِنْدَكُمْ ..... ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۹۶	۶۲۳
فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـ ـ ـ	۹۸	۱۲۴
۱۷ سُوْرَةُ بنی اسرآءیل		
سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا ـ ـ ـ ـ ـ	۱	۶۰۰ / ۹۰۳
اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ـ ـ	۷	۳۷۱
وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۷۰	۸۳۴
وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى ـ ـ ـ ـ	۷۲	۴۷۱
وَمَآ اُوْتِيْتُمْ ..... ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۸۵	۱۵۹
قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ .... ـ ـ ـ ـ	//	۱۵۹ / ۴۵۱
// // // // // // ـ ـ ـ ـ	//	۶۷۱ / ۶۷۵
۱۸ سُوْرَةُ الكهف		
وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۲۴	۹۲۶
وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ـ ـ	۲۸	۱۸۳
هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ـ ـ ـ ـ ـ	۴۴	۵۹۱

۱۹ سُورۃ مریم		
اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا - - - - - - - - -	۳	۲۳۳
وَهُزِّیْۤ اِلَیْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَیْكِ رُطَبًا جَنِیًّا - - -	۲۵	۶۲۳
اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا - - -	۹۶	۸۱۶
۲۰ سُورۃ طٰهٰ		
طٰهٰ ۝ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤی .... - - - -	۱،۲،۳	۵۷۴
" " " " " " " " " - - - - - -	//	۷۶۶
" " " " " " " " " - - - - - -	//	۹۲۵
اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی - - - - - - - -	۵	۳۹۸ / //
فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ - - - - - - - - - -	۱۲	۸۷۲
رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۝ وَیَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ - - - - -	۲۶،۲۵	۲۳۲
فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا - - - - - - -	۱۱۵	۲۷۳
۲۱ سُورۃ الانبیاء		
وَمَا جَعَلْنٰهُمْ .... - - - - - - -	۸	۷۸۳
۲۲ سُورۃ الحج		
ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ - - - - - - - -	۶۲	۹۰۸
مَا قَدَرُوا .... - - - - - - - - -	۷۴	۶۸۵
۲۳ سُورۃ المؤمنون		
اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا - - - - - -	۱۱۵	۷۸۳
۲۴ سُورۃ النور		
قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ - - - - - - -	۳۰	۲۸۱ / ۸۰۴
وَتُوْبُوْۤا اِلَی اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ - - - - - -	۳۱	۳۱۳
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ - - - - - -	۳۵	۱۶۰

۲۵ سُورۃ الفُرقان

لَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا وَّلَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوۡرًا ـ	۳	۵۱۹/۸۳۹
اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۴۵	۱۶۳
وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ہَوۡنًا وَّاِذَا خَاطَبَہُمُ الۡجٰہِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا	۶۳	۲۰۹
" " " " " " " " " " " "	"	۴۷۸
" " " " " " " " " " " "	"	۸۳۵
یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۶۴	۳۷
" " " " " " ـ ـ ـ ـ ـ ـ	"	۱۸۴

۲۶ سُورۃ الشُّعَرآء

فَاِنَّہُمۡ عَدُوٌّ لِّیۡۤ اِلَّا رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۷۷	۷۵۵

۲۷ سُورۃ النَّمل

قَالَ عِفۡرِیۡتٌ مِّنَ الۡجِنِّ اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِکَ ـ ـ ـ	۳۹	۶۲۲
اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۴۰	۶۲۳
اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۴۴	۴۷۸
وَتَرَی الۡجِبَالَ .... ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۸۸	۹۵۶

۲۹ سُورۃ العَنکبوت

وَمَنۡ جَاہَدَ فَاِنَّمَا یُجَاہِدُ لِنَفۡسِہٖ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ـ ـ ـ	۶	۳۷۱
قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۴۶	۸۴۴
وَالَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا ـ ـ ـ ـ ـ	۶۹	۵۷۱
" " " " " " ـ ـ ـ ـ ـ	"	۵۷۳
" " " " " " ـ ـ ـ ـ ـ	"	۵۷۵
" " " " " " ـ ـ ـ ـ ـ	"	۹۰۷

۳۰ سُورۃ الرُّوم

فَاِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	۵۲	۱۴۱
اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	"	"

۳۲ سُوْرَةُ السَّجْدَة		
تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ — — — — — — —	۱۶	۳۷
" " " " " — — — — — — — —	"	۱۸۱
۳۳ سُوْرَةُ الْاَحْزَاب		
وَالذّٰكِرِيْنَ ..... — — — — — — — — —	۳۵	۷۶۵
اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا — — — — — — — —	۷۲	۱۳۶
۳۵ سُوْرَةُ فَاطِر		
يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ — — — — — — —	۱	۹۳۲
يٰاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ — — —	۱۵	۱۸۸
اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا — — — — — — —	۲۸	۱۵۱
فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ — — — — — — —	۳۲	۸۹۳
اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ — — — — — — —	۳۸	۱۶۲
۳۶ سُوْرَةُ يٰسٓ		
وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ — — — — — — —	۶۵	۸۳۵
۳۷ سُوْرَةُ الصّٰٓفّٰت		
وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ — — — — — — — —	۹۶	۱۶۵
وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ — — — — — — — —	۱۶۴	۵۲۳
" " " " " " — — — — — — — —	"	۸۷۲
۳۸ سُوْرَةُ صٓ		
نِعْمَ الْعَبْدُ — — — — — — — — —	۳۰	۱۹۲
" " "..... — — — — — — — — —	"	۷۳۳
" " " — — — — — — — — —	۳۲	۱۹۲
اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا — — — — — — — —	"	۶۵۸
اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ — — — — — — — —	۷۶	۸۴۸

آیت	نمبر آیت	صفحہ
٦١ سُورۃ الصَّف		
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ	۲	۹۳۶
٦٢ سُورۃ الجُمُعَۃ		
مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ	۵	۲۳۶
٦٦ سُورۃ التَّحرِیم		
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَھْلِیْكُمْ نَارًا	۶	۸۱۱
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ	۸	۷۳۱
٦٧ سُورۃ المُلک		
لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ	۱۰	۹۲۸
٧٠ سُورۃ المعارج		
الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰى صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ	۲۳	۲۹۲
٧٢ سُورۃ الجنّ		
فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا	۱	۹۲۳
یَّھْدِیْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا اَحَدًا	۲	″
وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِیْقَةِ لَاَسْقَیْنٰھُمْ مَّآءً غَدَقًا	۱۶	۳۶
″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″	″	۴۰۶
٧٣ سُورۃ المُزَّمِّل		
قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَهٗ	۲، ۳	۸۲۳
اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا	۶	۵۸۳
اِنَّ لَدَیْنَا اَنْكَالًا وَّجَحِیْمًا وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِیْمًا	۱۲، ۱۳	۹۲۵
٧٤ سُورۃ المُدَّثِّر		
وَثِیَابَكَ فَطَھِّرْ	۴	۴۴۳

۷۹ سُوْرَۃُ النّٰزِعٰت		
وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ــ ــ ــ ــ	۴۰، ۴۱	۱۲۶
وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى	〃	۵۸۶
اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ	۴۴	۳۲۶
۸۳ سُوْرَۃُ الْمُطَفِّفِيْن		
كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ــ ــ ــ ــ ــ ــ	۱۴	۱۲۹
〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ــ ــ ــ ــ ــ ــ	〃	۹۱۷
۸۷ سُوْرَۃُ الْاَعْلٰى		
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ	۱۷	۶۴۴
۸۸ سُوْرَۃُ الْغَاشِيَة		
اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ	۱۷	۱۶۳
۸۹ سُوْرَۃُ الْفَجْر		
وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ	۱۷	۱۶۳
۹۳ سُوْرَۃُ الضُّحٰى		
وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۙ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ــ ــ ــ ــ ــ	۱۰، ۱۱	۸۵۰
وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ	۱۱	۸۴۶
۹۴ سُوْرَۃُ اَلَمْ نَشْرَحْ		
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ	۱	۲۳۴
۱۰۳ سُوْرَۃُ الْعَصْر		
وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِىْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ــ ــ ــ ــ ــ	۱، ۲، ۳	۱۲۵

قول

"حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ"

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ
جس کا کوئی مُرشد نہ ہو اُسے کشف المحجوب کے مُطالعہ
کی برکت سے مُرشد کامل مل جائے گا۔

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور